# حکایتِ دار و رسن

راہِ مولیٰ میں اسیری
کی
سرگزشت

محمد الیاس منیر

ساہیوال پاکستان میں
کلمہ طیبہ کی حفاظت کے 'جرم' میں طویل عرصہ تک راہِ مولیٰ میں
قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کرنے کی سرگزشت

# حکایتِ دارورسن

تحریر

**محمد الیاس منیر**

مربی سلسلہ عالیہ احمدیہ، اسیر راہ مولا ساہیوال

پیشکش

**فضل تعلیمی ٹرسٹ**

پاکستان، امریکہ، جرمنی، کینیڈا

نام کتاب: حکایتِ دار و رسن (راہِ مولیٰ میں اسیری کی سرگزشت)

مصنف: محمد الیاس منیر، اسیر راہ مولیٰ ساہیوال

ناشر: فضل تعلیمی ٹرسٹ پاکستان، امریکہ، جرمنی، کینیڈا

سن اشاعت: جون 2014ء

سرورق: عطاء الرافع احمد باسل

مطبع:
Appel & Klinger-Druck & Medien GmbH
Bahnhofstraße 3a, 96277 Schneckenlohe

قیمت: 10 یورو

ملنے کا پتہ:
Fam. Munir
Margarete-Steiff-Str. 8
60438 Frankfurt am Main
Germany

ISBN # 978-3-00-046217-7

انتساب

# سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ

کے نام

جن کی دل گداز دعاؤں اور محبت وشفقت کا سہارا
اسیرانِ راہِ مولیٰ کو ہر لمحہ نصیب رہا

# فہرست

صادق آں باشد کہ ایامِ بلا
مے گزارد با محبت با وفا

صادق وہ ہوتا ہے جو اِبتلاؤں کے دن محبت اور وفاداری سے گزارتا ہے

گر قضا را عاشقے گردد اسیر
بوسد آں زنجیر را کز آشنا

اگر قضائے الٰہی سے عاشق قید ہو جاتا ہے تو وہ اُس زنجیر کو چومتا ہے
جس کا سبب آشنا ہے

(الہامی اشعار حضرت مسیح موعود علیہ السلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَ عَلٰی عَبْدِهِ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھوالناصر

لندن

14/5/22

پیارے مکرم محمد الیاس منیر صاحب (مربی سلسلہ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے سنا ہے کہ آپ نے دورِ اسیری کی یادوں پر مشتمل کتاب لکھی ہے جس کو میں نے ابھی تک دیکھا تو نہیں لیکن بہرحال جماعت کے جو اسیران ہیں ان کی قربانیوں کی ایک لمبی تاریخ ہے اور 1984ء کے آرڈیننس کے بعد جو اسیر راہ مولیٰ ہوئے اور جن کے لئے بڑی خطرناک سزائیں بھی جاری ہوئیں ان میں آپ بھی شامل تھے لیکن اللہ کے فضل اور حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی دعاؤں سے آپ اس میں سے گزرے بھی اور پھر اللہ نے رہائی کے سامان بھی پیدا فرما دیئے۔ اس دور میں آپ نے جو قربانیاں دیں اللہ آپ کی آئندہ نسلوں کو بھی توفیق دے کہ وہ دین کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ اللہ کرے کہ یہ کتاب پڑھنے والوں کے اندر قربانیوں کی ایک نئی روح پھونکنے کا ذریعہ ثابت ہو۔ اللہ آپ کو جزاء دے کہ آپ نے اس میں اسیری کے واقعات کو اکٹھا کر کے آئندہ نسلوں کے ایمان و ایقان میں جلا پیدا کرنے کے سامان کر دیئے ہیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

والسلام

خاکسار

[signature]

خلیفۃ المسیح الخامس
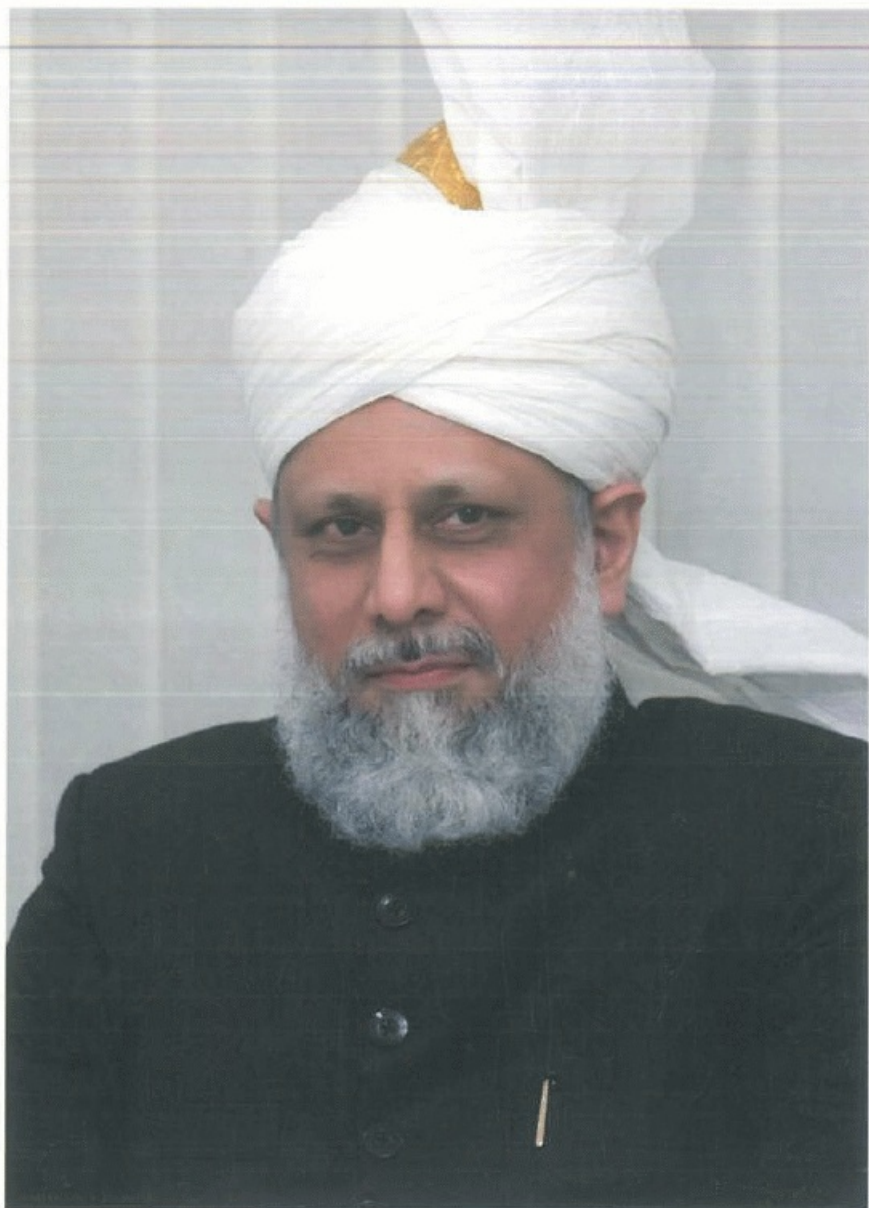
سیدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

کے دائیں طرف مکرم رانا نعیم الدین صاحب اور بائیں طرف خاکسار محمد الیاس منیر بر موقع جلسہ سالانہ برطانیہ 2003ء

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی خدمت میں خاکسار محمد الیاس منیر، جنوری 2006ء

رہائی کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ سے خاکسار محمد الیاس منیر کی پہلی ملاقات، مسجد نور فرانکفورٹ مئی 1995ء

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں خاکسار محمد الیاس منیر داستانِ اسیر کا ابتدائی مسودہ پیش کرتے ہوئے

رات بھر پگھلا دعا میں اشک اُس کا وجود
تب کہیں یہ صبح نکلی ہے چمن پہنے ہوئے
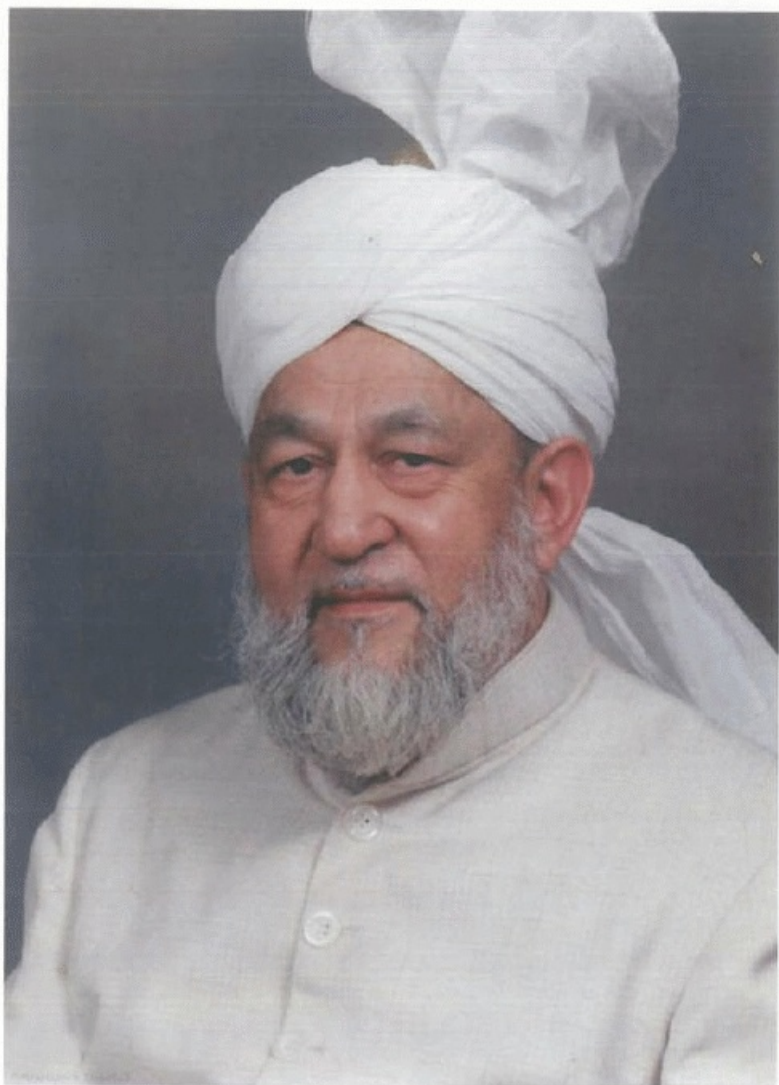
سیدنا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ

# پیارے آقا کی خواہش

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ ھوالناصر

وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ

28.8.1364
1985

پیارے عزیزم الیاس منیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے سبھی خط میرے دل میں اتر جاتے ہیں لیکن گذشتہ ایک خط نے تو دل میں اتر کر ادھم بھی بہت مچایا۔ مگر مجھے یہ ادھم بہت اچھا لگا

آپ کی سرگزشت بھی ان دنوں زیر مطالعہ ہے۔ چند صفحے پڑھتا ہوں تو جذبات سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہوں کہ مزید پڑھنا بس کی بات نہیں رہتی۔ اللہ صبر بہت عطا فرما رہا ہے۔

انشاء اللہ اسے مناسب وقت پر بکثرت شائع کرواؤں گا۔

اللہ آپ سب کا اور آپ سب کے سب پیاروں کا حامی و ناصر ہو اور دونوں جہان کی حسنات سے آپ سب کا دامن بھر دے۔ سب اسیروں کو میری محبت بھرا سلام اور پیار

اللہ کرے جلد تر میں آپ سب کو اپنے لینے آؤں۔

خدا حافظ ۔ والسلام خاکسار مرزا طاہر

## احمدیہ لٹریچر میں قیمتی اضافہ

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے خطبہ جمعہ فرمودہ مسجد فضل لندن میں ارشاد فرمایا:

''ایک دوست نے ایک دفعہ مجھے لکھا بڑے درد سے کہ اب تو یوں لگتا ہے کہ اصحاب کہف کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ میں نے اس کو لکھا کہ تم نے تو بڑی مبارک بات کی ہے اس میں درد کی کیا بات ہے۔ اصحاب کہف کا دَور تو وہ دَور تھا کہ ہمیشہ عیسائیت اس پر رشک کرتی رہے گیا... اصحاب الکھف و الرقیم کہ وہ زیر زمین جانے والے لوگ رقیم بھی تھے۔ وہ زیر زمین جا کر سو نہیں جایا کرتے تھے جس طرح جانور سو جایا کرتے ہیں بلکہ وہ لکھتے رہتے تھے۔ کوئی سنانے والا نہیں تھا تو وہ ... اپنے دل کے خیالات .... لکھتے رہتے تھے۔ یعنی ایک لحہ بھی ان کا ضائع نہیں ہوتا تھا اور جماعت احمدیہ پر بھی جہاں جہاں یہ دَور ہے وہاں اس آیت کی انگلی آپ کو اشارہ کر کے بتا رہی ہے کہ آپ کو بیکار نہیں رہنا، ہر حالت میں آپ کو اپنے وقت کا حساب دینا ہے۔ اگر کوئی سننے والا نہیں ہے جسے آپ بات سنا سکیں تو رقیم بن جائیں، علمی کاموں میں ترقی کریں، جماعت احمدیہ کے حق میں اور اسلام کے حق میں جو مضامین خدا تعالیٰ آپ کو سجھاتا ہے وہ لکھنے شروع کریں۔ خطوط لکھنا شروع کریں...... تحریر کی جو زبان ہے وہ بہت لمبا عرصہ چلتی ہے۔ کلمات تو کچھ عرصہ کے بعد آہستہ آہستہ یادوں سے مٹ جاتے ہیں......

چنانچہ انہی تحریروں میں سے ہمارے ایک عزیز بہت ہی پیارے خادمِ سلسلہ الیاس منیر صاحب کی بعض تحریریں ہیں جو یہاں میں نے اکٹھی کی ہیں۔ وہ اصحاب کہف بھی ہیں واقعۃً بھی اصحاب کہف بن گئے ان معنوں میں کہ خدا کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور رقیم بھی بن گئے کیونکہ انہوں نے اپنے جیل کی ساری داستان شروع سے آخر تک اپنے ہاتھ سے لکھ کر مختلف وقتوں میں مجھے بھجوائی۔ اب اُس کی آخری قسط کل موصول ہوئی اور اُس وقت مجھے خیال آیا کہ واقعۃً ظاہری طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے جماعت احمدیہ میں اصحاب الکھف والرقیم پیدا فرما دیئے۔ عمداً میں نے اس کی اشاعت روکی ہوئی ہے کسی مصلحت کے پیشِ نظر لیکن وہ جب اشاعت ہوگی تو جماعت کے لٹریچر میں ایک بڑا قیمتی اضافہ ہوگا اور جماعت کی تبلیغ کیلئے بھی انشاء اللہ بہت ہی ممد و مفید ثابت ہوگی جب بھی وہ کتاب شائع ہوگی۔''[1]

---

[1] خطبہ جمعہ فرمودہ 20 رفروری 1987ء بحوالہ خطبات طاہر جلد 6 صفحہ 121-120

## پردیس میں اِک رُوح گرفتارِ بلا ہے

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی اسیرانِ راہ مولیٰ کے لئے بے قراری کی کیفیت کا علم ذاتی طور پر ہر اُس احمدی کو ہے جسے ہماری اسیری کے دوران حضورؒ کے خطبات اور خطابات سننے کا موقع ملا۔ کوئی ایسا موقع نہ ہوتا جب حضور انورؒ اسیران کا دلی سوز کے ساتھ تذکرہ نہ فرماتے۔ انہی یادوں میں سے چند اقتباس بطور نمونہ ہدیۂ قارئین ہیں۔ 1990ء کے جلسہ سالانہ برطانیہ کی آخری اجتماعی دعا سے قبل حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''وہ اسیرانِ راہِ مولیٰ یاد دلاتا ہوں جو آپ کو بھی نہیں بھولتے اور مجھے بھی نہیں بھولتے لیکن ان کا تذکرہ ضروری ہے۔ ان کی یادوں کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ شہداء کو خدا تعالیٰ نے زندہ قرار دیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ شہداء قوموں کی زندگی کے ضامن ہوا کرتے ہیں۔ جو قومیں اپنی زندگی کو بھول جائیں وہ کیسے زندہ رہ سکتی ہیں۔ پس شہدائے احمدیت بھی زندہ ہیں اور اسیرانِ راہِ مولیٰ بھی آزاد ہیں اور وہ جو خدا کی رضا کو چھوڑ کر مزے لوٹ رہے ہیں وہ حقیقت میں غلام اور قید ہیں۔ پس ان آزاد روحوں کو یاد رکھو جو قید کی آزاد روحیں ہیں۔ اپنے شہید زندوں کو بھی یاد رکھو اپنی دعاؤں میں ان کو آج بھی یاد رکھو، کل بھی یاد رکھو۔ جہاں تک بس چلتا ہے خدا تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری جاری رکھو خدا تعالیٰ ان کی تکلیفوں کو دور کرے اور ہمارے دُکھ ٹال دے، آمین''۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے 9 جون 1986ء کو خطبہ عیدالفطر میں سیدنا بلالؓ فنڈ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''اس سکیم کے ساتھ ہی میری توجہ پاکستان میں راہِ مولیٰ میں دکھ اٹھانے والوں کی طرف مبذول ہوئی۔ ان کی خاطر ایک تحریک کی گئی تھی سیدنا بلالؓ فنڈ کی اس میں جماعت کے مخلصین نے بڑی محبت اور عشق کے جذبے سے اور احترام کے جذبے سے جس حد تک توفیق ملی پیش کیا...... لیکن اس کے خرچ کی راہ میں کچھ مشکلات بھی درپیش ہیں۔ عجیب جماعت ہے یہ کہ جس کی قربانی کرنے والوں کو جب جماعت کی طرف سے مدد پیش کی جاتی ہے تو وہ پسند نہیں کرتے۔ سوائے اس کے کہ ایک سخت مجبوری کی صورت ہو اور اس صورت میں بھی بڑے احترام اور عزت کے ساتھ پردہ پوشی کے رنگ میں ان کے لئے کچھ پیش کیا جاتا ہے تو اس نیت سے قبول کرتے ہیں کہ جب بھی ہمیں خدا توفیق دے گا۔ اس سے بڑھ کر جماعت کو واپس

کریں گے۔اور ہزار ہا ایسا احمدی پھیلا ہوا ہے جس نے خدا کی راہ میں دکھ اٹھائے اور کلمہ طیبہ کی خاطر، اس کی حفاظت کی خاطر، اس کی عزت اور ناموس کے لئے ...... انہوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ان کو سیدنا بلال ؓ فنڈ کا فیض کیسے پہنچایا جائے۔ یہ سوال تھا۔وہ تو لینے پر آمادہ نہیں۔ بعض ایسے ہیں راہ مولیٰ کے اسیر جن کے گھروں میں محض ہمدردی کا اور پیار اور محبت کا اظہار کرنے والوں کا بعض اوقات اتنا ہجوم ہوتا رہا کہ ان کو غیر معمولی مہمان نوازی کے اخراجات اٹھانے پڑے۔ایسی مثالیں ہیں جب ان کو جماعت کی طرف سے پیش کیا گیا تو انہوں نے قبول کرلیا احترام میں، اس لئے کہ ان کو یہ کہا گیا تھا کہ میں نے بھجوایا ہے۔بڑی محبت اور پیار سے قبول کیا۔ایک ہاتھ سے لیا اور دوسرے ہاتھ سے وہ سیدنا بلال ؓ فنڈ میں اپنے خاندان کی طرف سے ھدیۃً پیش کر دیا تو کس طرح جماعت کی محبت کا تحفہ ان کو پہنچاؤں یہ مسئلہ تھا جو مجھے درپیش تھا۔قرآن کریم کی اشاعت کے اس پروگرام کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے میرا دل کھول دیا۔اور ایک بہت ہی پیارا خیال میرے دل میں پیدا ہوا کہ سیدنا بلال ؓ فنڈ سے ایک سو زبانوں میں ساری دنیا کو قرآن کریم کا یہ تحفہ پیش کیا جائے اور یہ سارے اسیر اور یہ سارے راہ مولا میں تکلیف اٹھانے والے لازماً اس میں شامل ہو جائیں گے۔ان کی طرف سے دنیا کو یہ تحفہ ہوگا اور اس سے بہتر جواب ان کے اوپر مظالم کا اور الٰہی جماعتیں دے ہی نہیں سکتیں ...... یہ جو واقعہ ہے یہ تاریخ میں ایک عجیب واقعہ ہوگا اس لئے میں نے یہی سوچا کہ سیدنا بلال ؓ فنڈ کا سب سے اچھا مصرف یہی ہے کہ اس رنگ میں راہ مولا میں دکھ اٹھانے والوں کی طرف سے خدا تعالیٰ کا شکرانہ ادا کیا جائے کہ اس نے ان کو یہ عظیم سعادت بخشی۔اور اس شکرانے کے اظہار کے طور پر ساری دنیا میں اشاعت اسلام کے کام کو آگے بڑھا دیا جائے ...... پس آج کی عید کے موقع پر ایک یہ بھی تحفہ میں آپ کو پیش کرتا ہوں کہ آپ کی ان قربانیوں کا بہترین مصرف خدا نے مجھے سمجھا دیا اور یہ تحفہ اس شان کے ساتھ ان راہ مولا میں دکھ اٹھانے والوں کو پیش کیا جائے گا کہ تاریخ مڑ کر دیکھے گی اور دعائیں دے گی اُن کو بھی جنہوں نے یہ تحفہ پیش کیا اور ان کو بھی جنہوں نے تحفہ قبول کیا اور پھر خدا کی راہ میں پیش کر دیا اور ہمیشہ کے لئے دنیا کی سعادتوں اور عزتوں اور شرف کا سامان مہیا کر گئے۔پس انشاء اللہ تعالیٰ اس سو سال کے اختتام سے پہلے جو عنقریب اختتام تک پہنچنے والے ہیں یعنی جماعت کے سو سال کم سے کم ایک سو زبانوں میں آج کے راہِ مولیٰ میں دکھ اٹھانے والے احمدیوں کی طرف سے یہ قرآن کریم کے تراجم تحفہ کے طور پر پیش کر دیے جائیں گے ...... پس جماعت کی، اسلام کی، بنی نوع انسان کی بہبود کی

اور خصوصاً راہ مولیٰ میں دکھ اٹھانے والوں کے لئے اور ان کی خیر و برکت کے لئے کثرت کے ساتھ دعا کریں اور ان دعاؤں کو بعد میں بھی ہمیشہ کرتے چلے جائیں۔ یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ خدا کے وعدے کبھی جھوٹے نہیں ہو سکتے۔ کچھ وقت تو لگ جاتا ہے، کچھ دیر تو ہو جاتی ہے مگر لازماً خدا کی نصرت کے وعدے ضرور اور بالضرور آپ کے حق میں پورے ہوں گے۔ کوئی نہیں جو ان وعدوں کو ٹال سکے۔ ایک ملک میں نہیں تمام عالم میں خدا کی نصرت آپ کی مدد کو آنے والی ہے اور حیرت انگیز نشان آپ کی امداد میں دکھائے اور خدا آپ کو اسلام کی عالمی فتح حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)''[1]

مؤرخہ 4 دسمبر 1987ء کو خطبہ جمعہ میں شفاعت کا مضمون بیان فرمانے کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے اسیران کے ساتھ اس کا تعلق یوں باندھا:

''اس پہلو پر غور کرتے ہوئے مجھے اسیران راہ مولا کا خیال آیا۔ بہت دعائیں کی ہیں اُن کے لئے، ساری جماعت دعائیں کر رہی ہے اور بہت دلوں میں درد ہے اور ساری دنیا کی جماعت کے دلوں میں درد ہے اور ابھی تک اُن کا ابتلا لمبا ہو رہا ہے۔ مجھے اس شفاعت کے مضمون پر غور کرتے ہوئے خیال آیا کہ کیوں نہ اُن کی خاطر ہم ہر دوسرے اسیر سے تعلق رکھنا شروع کر دیں۔ اسیران سے خواہ وہ راہ مولیٰ کے اسیر ہوں یا کسی قسم کے اسیر ہوں، اسیران کی بہبود کے لئے کچھ نہ کچھ کریں تاکہ خدا کے فرشتوں سے ہمارا تعلق قائم ہو جائے۔ اُن فرشتوں سے تعلق قائم ہو جائے جن کو اسیری کے مضمون پر مامور فرمایا گیا۔ جو اسیروں کی رَستگاری کا موجب بنا کرتے ہیں اور خدا کے ہاں جو مختلف قوانین جاری ہیں اُن میں ایک یہ بھی قانون ہے کہ غلامی کو دور کرنے کے لئے خدا کے بعض نظام جاری ہیں۔ وہ بعض دفعہ ہزاروں سال کی حرکت کے بعد مکمل ہوتا ہے ان کا دَور اور بعض دفعہ چھوٹی حرکتوں میں ان کا دور مکمل ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی اپنی ذات میں بہت وسیع مضمون ہے۔ بہر حال یہ تو قطعی بات ہے کہ اسیروں کی رستگاری کا جو نظام ہے وہ بھی ایک نظام ہے کوئی اتفاقی حادثات کا نتیجہ نہیں ہے اور اس میں خدا کے بعض فرشتے ملاء اعلیٰ پر مامور ہیں اس کے تابع پھر اَن گنت فرشتے دوسرے کام کر رہے ہیں۔ تو ہم ان کے لئے دعائیں تو کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارا اُن فرشتوں سے واقعۃً تعلق ہے؟ ہم تو ان سے دعائیں اپنی محبت کے نتیجے میں کر رہے ہیں جو

[1] خطبات طاہر، خطبات عیدین صفحہ 59 تا 64

ہر احمدی کو دوسرے احمدی سے ہو چکی ہے اور یہ محبت اتنی بڑھ چکی ہے کہ ذی القربیٰ کا مضمون اس میں آ جاتا ہے یعنی ہماری محبت اسی نوع کی ہوگئی ہے جیسے ماں کو بچے سے محبت ہوتی ہے۔ اس لئے ایک نفسانی تمنا جو ہے وہ بھی تو داخل ہوگئی۔ ہم مجبور ہیں، اختیار ہی کوئی نہیں ہمیں۔ ہم اُن کے لئے غم کرنے پر، اُن کے لئے دعائیں کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں لیکن خدا کے کتنے اور بندے ہیں لکھوکھا بندے ہیں جو اسیری کے دُکھ سہہ رہے ہیں اُن میں مجرم بھی بہت ہوں گے کچھ معصوم بھی ہیں بلکہ بعض ممالک میں تو لاکھوں معصوم بندے ہیں خدا کے۔ اُن بیچاروں کے لئے چونکہ وہ خدا کی خاطر اسیری نہیں اجر کا بھی کوئی وعدہ نہیں۔ بڑے ہی مظلوم لوگ ہیں۔

جماعت احمدیہ کو اگر ساری دنیا میں اس طرف توجہ پیدا ہو اور جیل خانوں میں جو لوگ جا سکتے ہیں نظام کے تابع جو پروگرام بنائے جا سکتے ہیں وہاں اسیروں سے رابطے پیدا کئے جائیں۔ اُن کے دُکھ معلوم کئے جائیں۔ میں جانتا ہوں کہ سمندر میں قطرہ کے برابر کوشش ہوگی مگر ہمارے قطرہ کے دائرہ میں ہمارے مسائل تو حل ہو جائیں گے جو ہمارا مقصد ہے وہ تو پورا ہو جائے گا۔ ایک اور مقصد بھی پورا ہوگا اس سے ہمارے اندر ایک جلا پیدا ہوگی، ہماری انسانی قدریں پہلے سے زیادہ چمک اُٹھیں گی۔ لیکن نیت یہ رکھیں کہ ہم اسیروں سے براہ راست تعلق قائم کریں تا کہ اُن فرشتوں کی نظر میں آ جائیں جو اسیری کے کاموں پر مامور ہیں اور جس طرح ہم نے عملاً دنیا میں مشاہدہ کیا ہے کہ جس خدمت کے کام پر کوئی خاص تعلق سے اپنے دائرۂ خدمت کو وسیع کرتا ہے خدا کے فرشتوں کا لازماً اُس سے تعلق ہوتا ہے اور اس کے حق میں معجزے دکھاتے ہیں۔ اِس طرح خدا تعالیٰ کے وہ فرشتے جو اس کام پر مامور ہیں ہمارے ان بھائیوں کے لئے اعجاز دِکھائیں اور اس حد تک آپ اس مضمون کو آگے بڑھائیں کہ شفاعت کے مضمون میں یہ مضمون داخل ہو جائے اور آسمان پر خدا کے فرشتے اس کے حضور شفاعت کریں کہ ان راہ مولا میں اسیری کے دُکھ اُٹھانے والوں کے اب دِن آسان فرما دے، آمین۔''[1]

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ خطبہ عیدالاضحیہ بیان فرمودہ مؤرخہ 28 اپریل 1996ء میں اسیران راہ مولیٰ کو عید کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] (خطبات طاہر جلد 6 صفحہ 834-835)

''سب سے پہلے تو اُن احمدی مظلوموں کو عید کی مبارک باد پیش کرتا ہوں جو دراصل اس قربانی کی روح کی آخری مثال آج اس دنیا میں پیش کر رہے ہیں۔ آخری صورت میں بدرجہ اعلیٰ اِس مثال کو پیش کر رہے ہیں جنہوں نے حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کے عشق کے گیت گائے، جنہوں نے توحید کا نعرہ بلند کیا، جنہوں نے حضرت محمد مصطفی ﷺ کی صداقت کے اعلان کئے اور اس جرم میں اور محض اس جرم میں ان پر ہتک رسولؐ کے مقدمے قائم کئے گئے اور پھانسی کے پھندے ان کی آنکھوں کے سامنے لہرائے گئے اور آج وہ جیلوں کی کوٹھڑیوں میں قید ہیں، اُن کی سب آزادیاں چھین لی گئی ہیں۔ پس یہ ہیں وہ قربانی کرنے والے جن پر کوئی جبر کی تلوار چل نہیں سکتی۔ وہ جیل کے دروازے جو ہمیشہ ان پر کھولے گئے اور بار بار ان کو کہا گیا کہ ہمارے جبر کو قبول کرو تو ہم طوع کے رستے کھولیں گے، خوشی کے ساتھ تم باہر نکل آؤ۔ انہوں نے اس پیش کش کے منہ کو ٹھوکر مار کر اسے اپنی جوتیوں کی نوکوں پر لیا اور کہا کہ تم جو کر سکتے ہو کر گزرو ہمیں اِس قید مذلت جسے تم قید مذلت سمجھ رہے ہو اس سے زیادہ پیاری ہے جس کو تم آزادی کی عزتیں سمجھتے ہو۔ لاکھ آزادی کی عزتیں اس قید مذلت پر قربان ہوں جو ہمارے اللہ کی خاطر اس کی محبت میں ہم نے قبول کی ہیں اس لئے جو کر سکتے ہو تم کر گزرو جو ہم کرتے ہیں، جو ہمیں سکھایا گیا ہے ہم وہی کرتے رہیں گے۔

پس سب سے زیادہ عید کی مبارک باد کے حقدار یہ لوگ ہیں جو زیادہ قربانیاں دینے والے ہیں، جو ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا ایک مجسمہ بن کر آج پاکستان کی جیلوں میں تاریک کوٹھڑیوں میں مقفل کر دیئے گئے۔ یہ وہ آزاد روحیں ہیں جن کو کوئی مقفل نہیں کر سکتا۔ انہی سے دنیا نے آزادی کے راز سیکھنے ہیں، انہی کی قربانیوں کے فیض سے قیدیوں اور قیدی روحوں کو آزاد کیا جائے گا۔ مگر یہ دَور ایسا دَور ہے جس میں ہم میں سے چند نے یہ قربانیاں پیش کیں اور سب کے نام روشن کر دیئے۔ پس آپ ان کے لئے دعائیں کریں، ان پر سلام بھیجیں، ان پر ہمیشہ ہمیشہ محبت کی نگاہیں ڈالتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے سلامتی بھیجتے رہیں اور دعائیں کرتے رہیں ان کے لئے بھی ان کے پیاروں کے لئے بھی جو اس عید میں ان سے ان کے وصل کی لذت سے محروم ہیں''۔[1]

---

[1] خطبات طاہر، خطبات عیدین صفحہ 605 تا 606

## کشکول میں بھر دے جو مرے دل میں بھرا ہے

جو دَرد سِسکتے ہوئے حَرفوں میں ڈھلا ہے
شاید کہ یہ آغوشِ جُدائی میں پلا ہے
غَم دے کے کسے فکر مریضِ شبِ غم ہے
یہ کون ہے جو دَرد میں رَس گھول رہا ہے

یہ کِس نے مِرے دَرد کو جینے کی طلب دی
دِل کس کے لئے عمرِ خِضر مانگ رہا ہے
ہر روز نئے فکر ہیں ، ہر شَب ہیں نئے غم
یا رَبّ یہ مِرا دِل ہے کہ مہمان سَرا ہے

ہیں کس کے بدن دیس میں پابند سَلاسِل
پَردیس میں اِک رُوح گرفتارِ بَلا ہے
کیا تُم کو خبر ہے رہِ مَولا کے اَسیرو!
تُم سے مجھے اِک رِشتۂ جاں سب سے سوا ہے

آ جاتے ہو کرتے ہو ملاقات شب و روز
یہ سلسلۂ ربطِ بَہم صُبح و مَسا ہے
اَے تنگیٔ زِندان کے سَتائے ہوئے مہمان
وَا چشم ہے ، دِل باز ، درِ سینہ کھلا ہے

تُم نے مِری جلوت میں نئے رَنگ بھرے ہیں
تُم نے مِری تنہائیوں میں ساتھ دیا ہے
تُم چاندنی راتوں میں مِرے پاس رہے ہو
تُم سے ہی مری نقرئی صبحوں میں ضیا ہے
کس دِن مجھے تم یاد نہیں آئے مگر آج
کیا روزِ قیامت ہے! کہ اِک حشر بپا ہے
یادوں کے مُسافر ہو تمناؤں کے پیکر
بھر دیتے ہو دِل، پھر بھی وہی ایک خَلا ہے
سینے سے لگا لینے کی حسرت نہیں مٹتی
پہلو میں بٹھانے کی تڑپ حد سے سوا ہے
یا رَبّ یہ گدا تیرے ہی دَر کا ہے سَوالی
جو دان مِلا تیری ہی چوکھٹ سے مِلا ہے
گُم گشتہ اَسیرانِ رَہِ مَولا کی خاطر
مدت سے فقیر ایک دُعا مانگ رَہا ہے
جِس رَہ میں وہ کھوئے گئے اُس رَہ پہ گدا ایک
کشکول لئے چلتا ہے لب پہ یہ صَدا ہے
خیرات کر اَب اِن کی رِہائی مرے آقا!
کشکول میں بھر دے جو مرے دِل میں بھرا ہے
میں تُجھ سے نہ مانگوں تو نہ مانگوں گا کسی سے
میں تیرا ہوں، تُو میرا خدا میرا خدا ہے

(کلام طاہر، صفحہ ۶۴۔۶۵ جدید ایڈیشن)

# پیش لفظ

## استاذی المکرم مسعود احمد خان صاحب دہلوی

عزیز القدر برادرم مکرم مولانا محمد الیاس منیر جماعت احمدیہ پاکستان کے اُن جری و دلیر اور قابل فخر مردان کار میں سے ایک ہیں جنہوں نے عظیم المرتبت بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے احمدیت یعنی حقیقی اسلام کی خدمت و اشاعت کے لئے راہ مولیٰ میں زندگی وقف کی اور وقف کے تقاضوں کو نبھانے اور پورا کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اور اس دوران پیش آنیوالے بڑے کٹھن ابتلاؤں اور امتحانوں میں کمال صبر و استقامت کا مظاہرہ کر کے سرخروئی حاصل کرنے کی توفیق پائی۔

اِن ابتلاؤں اور امتحانوں میں سب سے کڑا اور صبر آزما امتحان انہیں اس وقت پیش آیا جب ایک انتہائی سخت گیر فوجی ڈکٹیٹر کے عہدِ حکومت میں کسی خطا یا قصور کے بغیر محض احمدی ہونے کی بناء پر اُنہیں ان کے متعدد ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار کیا گیا اور طویل عرصہ تک انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ عدو شر بر انگیزد کہ خیر ما در آں باشد کے مطابق اُنہیں اُن کثیر التعداد اسیرانِ راہِ مولیٰ میں شمولیت کا غیر معمولی شرف حاصل ہوا جنہوں نے عشق و وفا کی پُر پیچ و پُر صعب راہوں میں پیش آنے والے مصائب و آلام اور صعوبتوں کو عین راحت جانا اور انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کر کے فداکاری و جاں نثاری کی درخشاں مثالیں قائم کر دکھائیں۔

بڑے سے بڑا اور کڑے سے کڑا امتحان پیش آنے پر بھی محترم مولانا محمد الیاس منیر کے پائے ثبات میں ذرا بھر بھی لغزش نہ آئی اور اس کے دوران کوہ استقامت کا نمونہ پیش کرنے کی سعادت ان کے حصہ میں آئی۔ اِس سے بڑا ابتلاء کیا ہوسکتا تھا کہ وہ جو اپنے باصفا و باوفا ساتھیوں سمیت کسی خطا یا قصور کے بغیر قید و بند کی صعوبتیں خندہ پیشانی اور خوشدلی سے برداشت کر رہے تھے ان میں سے بشمول محترم مولانا محمد الیاس منیر دو معصوم و بے قصور احمدیوں کو بالآخر تختۂ دار پر کھینچے جانے کا سراسر ظالمانہ حکم سنایا گیا۔ ان دونوں نے سزائے موت کے اس فیصلہ کو بھی اپنی خوش بختی سمجھتے ہوئے دِلی بشاشت اور خندہ پیشانی سے سنا اور اپنے قادر مطلق مولیٰ سے کہا تو یہ کہا: سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

محترم مولانا محمد الیاس منیر اور ان کے ساتھی محترم رانا نعیم الدین صاحب کو پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا تو اپنے آقا سیدنا حضرت اقدس المصلح الموعودؓ کا یہ منظوم ارشاد پیش نظر تھا ۔

دشمن کو ظلم کی برچھی سے تم سینہ و دل برمانے دو ۔۔۔ یہ درد رہے گا بن کے دوا تم صبر کرو وقت آنے دو
یہ عشق و وفا کے کھیت کبھی خوں سینچے بغیر نہ پنپیں گے ۔۔۔ اِس راہ میں جان کی کیا پروا، جاتی ہے اگر تو جانے دو

جہاں اُس زمانہ میں بیسیوں شہدائے احمدیت نے عشق و وفا کے کھیتوں کو اپنے خون سے سینچ کر ان میں سرسبز و شاداب

سدا بہار کھیتیاں اُگا دکھائیں (اور عشق و وفا کے کھیتوں کو اپنے خون سے سینچنے کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے) وہاں محترم مولانا محمد الیاس منیر اور محترم رانا نعیم الدین نیز ان کے دیگر ساتھی بھی علی الترتیب سزائے موت اور سزائے عمر قید کا حکم سن کر جانوں کی قربانی دینے اور سزائے قید بھگتنے کے لئے اپنے دل میں تیار ہو گئے۔ بے خوف ہو کر انہوں نے تو اپنے عزم کے رو سے اپنی جانیں اپنے رب کے حضور پیش کر دیں اور اس طرح اپنے عزمِ مصمم کو پورا کر دکھایا۔لیکن ان کے آقا سیدنا حضرت اقدس مصلح موعودؓ نے اپنے اُس تفصیلی ارشاد میں یہ بھی فرمایا تھا ۔

یہ زخم تمہارے سینوں کے بن جائیں گے رشکِ چمن اُس دن　　ہے قادرِ مطلق یار مرا، تم میرے یار کو آنے دو

جو سچے مومن بن جاتے ہیں موت بھی اُن سے ڈرتی ہے　　تم سچے مومن بن جاؤ اور خوف کو پاس نہ آنے دو

انہوں نے اپنے آقاؓ کے ارشاد کی رُو سے خوف کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا۔ چنانچہ وہ دن بھی آیا کہ ان کا قادر مطلق خدا ان کی مدد کو آ پہنچا اور ان کے سینوں کے زخم واقعی رشک چمن بن گئے اور دار و رسن کی موت جو لحہ بہ لحہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھی خود ان سے ڈر کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ اُن کے قادرِ مطلق خدا نے سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کو ایک رؤیائے صادقہ کے ذریعہ یہ بشارت دی کہ موت ان دونوں سچے مومنوں سے ڈر کر بھاگ جائے گی اور وہ ایک دن اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہائی پا کر حضورؒ سے آملیں گے سو جیسا کہ مولانا محمد الیاس منیر نے تفصیل سے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے بالآخر ایسا ہی ظہور میں آیا۔

عزیز القدر محترم مولانا محمد الیاس منیر نے اپنی اس کتاب میں ان کے خود اسیر راہ مولیٰ بننے ،قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے اور دار و رسن تک رسائی کی نوبت آنے کا قطعی امکان پیدا ہونے اور حسب بشارت الٰہی بالآخر قید سے رہائی پانے کے واقعات اور اس ضمن میں ہونے والے غیر معمولی الٰہی تصرفات کے ایمان افروز حالات و واقعات کو بہت پُر اثر انداز میں بیان کر کے جماعت احمدیہ کی آئندہ نسلوں کی رہنمائی کے لئے انہیں محفوظ کر دکھایا ہے تا کہ وہ بھی ان راہوں پر چلنے کا عزم و حوصلہ اپنے اندر پیدا کر کے قربانیاں پیش کرتی چلی جائیں یہاں تک کہ تاریکی کے فرزندوں کے پھیلائے ہوئے اندھیرے ہمیشہ کے لئے نابود ہو جائیں اور حق کے ساری دنیا میں پورے طور پر غالب آنے سے کرۂ ارض کا چپہ چپہ اپنے رب کے نور سے چمک اُٹھے۔

صاحب کتاب نے تو راہِ مولیٰ میں پیش آنے والے ایمان افروز واقعات تحریر کر کے اپنا فرض ادا کر دیا۔ احباب جماعت اور بالخصوص نئی نسلوں کے نوجوانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ان ایمان افروز واقعات کو ذوق و شوق اور عقیدت و ارادت سے پڑھیں۔ یہ واقعات ان کے لئے اشاعتِ حق اور خدمت و فدائیت کی راہ میں خود اپنے جوہر دکھانے اور نئی منزلیں طے کرنے میں مہمیز کا کام دیں گے۔ انشاء اللہ العزیز و باللہ التوفیق۔

خاکسار
مسعود احمد دہلوی

# مقدمہ کے مختلف مراحل ایک نظر میں

☆ 26/اکتوبر 1984ء: نمازِ فجر سے پہلے احمدیہ مسجد واقع مشن چوک ساہیوال پر ایک مقامی مدرسہ ''جامعہ رشیدیہ'' اور پولی ٹیکنیکل کالج کے اساتذہ اور طلبہ نے ہلّہ بول کر مسجد کے باہر اور اندر سے کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات نیلے پینٹ سے مٹائیں، یہ برش اور پینٹ اپنے ساتھ لائے تھے۔ خود حفاظتی اقدام کے طور پر خادم و محافظ مسجد مکرم رانا نعیم الدین صاحب کی فائرنگ سے دو حملہ آور موقع پر ہلاک ہو گئے۔

☆ اُسی روز ساہیوال کے تھانہ اے ڈویژن میں گیارہ احمدیوں کے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہوا اور سات افراد کو دھوکہ سے تھانہ لے جا کر گرفتار کر لیا۔

☆ 9/نومبر 1984ء: پولیس نے 14 روزہ جسمانی ریمانڈ مکمل ہونے پر جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

☆ 16 فروری 1985ء: ملٹری کورٹ نمبر 62 (ملتان) نے ساہیوال میں مقدمہ کی سماعت شروع کی تاہم بعد ازاں ہمیں ملتان منتقل کروا کر 2/مارچ کو جملہ گرفتاران پر دفعہ 302 کے تحت اقدامِ قتل کی فردِ جرم لگا کر 4 جون 1985ء تک مقدمہ کی سماعت کی۔

☆ 16 جون 1985ء: ملٹری کورٹ نے فیصلہ کیا کہ ایک ملزم چوہدری اسحاق صاحب کو رہا کیا جائے اور دو (محمد الیاس منیر اور رانا نعیم الدین) کو سزائے موت اور باقی چار ملزمان کو سات سات سال قید کی سزائیں دی جائیں۔

☆ 8/اکتوبر 1985ء: پنجاب کے گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل غلام جیلانی خان نے ملٹری کورٹ کا فیصلہ نظرِ ثانی کے لئے واپس بھجوا دیا تا کہ قانونی سقم دور کئے جائیں کیونکہ حملہ آوروں نے مسجد کے اندر آ کر کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات مٹائی تھیں جس پر رانا نعیم الدین صاحب نے اپنے دفاع کے لئے گولی چلائی۔ اس لئے مقدمہ دفعہ 302 کی بجائے دفعہ 304 کا ہے۔

☆ 21/اکتوبر 1985ء: ملٹری کورٹ نے نظرِ ثانی کرتے ہوئے سزاؤں کو کم کرنے کی بجائے اُن میں اضافہ کر دیا پھانسی والوں کو بھاری جرمانے بھی کر دیئے اور دیگر چاروں کی سزا عمر قید تک بڑھانے کے ساتھ جرمانے بھی کر دیے۔

☆ 15 فروری 1986ء: صدرِ پاکستان اور فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق نے فوجی عدالت کی اِن سزاؤں کی توثیق کی اور اسیران کو یہ سزائیں اُس وقت سنائی گئیں جب مارشل لاء اُٹھ جانے کے بعد مذکورہ فوجی عدالت تحلیل ہو چکی تھی۔

☆ 14 فروری 1987ء: صدرِ پاکستان نے ہماری طرف سے دائر کردہ نظرِ ثانی کی پٹیشن رد کرتے ہوئے فیصلہ بحال رکھا اور اسے ساہیوال جیل کو براہ راست بھجوادیا تا پھانسی جلدی دی جاسکے۔

☆ 18 فروری 1987ء: لاہور ہائی کورٹ نے ملٹری کورٹ اور صدر کے حکم کے خلاف رِٹ پٹیشن سماعت کے لئے منظور کی اور پھانسی کی سزا پر عمل درآمد روکتے ہوئے حکمِ امتناعی جاری کیا تاہم رٹ پٹیشن کی سماعت سالہا سال تک سرد خانہ میں پڑی رہی۔

☆ 17/اگست 1988ء: پھانسی کا حکم جاری کرنے والا نمرودِ وقت ضیاء الحق مردِ خدا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی طرف سے دیئے گئے مباہلہ کے چیلنج کے نتیجہ میں اپنی ہی آگ میں جل کر خاکستر ہوگیا۔

☆ 7/دسمبر 1988ء: ملک بھر میں عام اِنتخابات کے بعد برسرِ اقتدار آنے والی پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بے نظیر بھٹو سے اللہ تعالیٰ نے ایسا اقدام کروایا کہ اس کے نتیجہ میں اسیران کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہوگئی۔

☆ 19 مارچ 1994ء: لاہور ہائی کورٹ نے اسیرانِ ساہیوال کی رِٹ پٹیشن کی سماعت کے بعد رہائی کا حکم جاری کیا۔

☆ 20 مارچ 1994ء: بروز اتوار ہم اسیران ساہیوال، فیصل آباد اور راولپنڈی کی جیلوں سے رہا ہو کر ربوہ پہنچے جہاں دارالضیافت میں محترم صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب امیر مقامی و ناظرِ اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ کی سرکردگی میں ہزاروں احباب وخواتین نے اِستقبال کیا، الحمدللہ۔

☆ پہلا باب

# سانحہ ساہیوال

☆ پس منظر

☆ اصل واقعہ

☆ واقعہ کے بعد کے چند گھنٹے

جس طرح بہت سی گرمی کے بعد آسمان پر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بادل کے نمودار ہو جاتے ہیں اور پھر وہ جمع ہو کر ایک تہ بتہ بادل پیدا ہو کر یکدفعہ برسنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی مخلصین کے دردناک تضرعات جو اپنے وقت پر ہوتے ہیں رحمت کے بادلوں کو اُٹھاتے ہیں اور آخر وہ ایک نشان کی صورت پر زمین پر نازل ہوتے ہیں۔ غرض جب کسی مرد صادق ولی اللہ پر کوئی ظلم انتہا تک پہنچ جائے تو سمجھنا چاہئے کہ اب کوئی نشان ظاہر ہوگا۔

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است　　　زیر آں گنجِ کرم بنہادہ است

(راز حقیقت، روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۱۵۷)

# راہِ مولیٰ کے اسیروں کی سرگزشت

تاریخ اسلام میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا نام نامی سنہری حروف میں رقم ہے۔ آپ وہ اولین نوجوان صحابی ہیں جنہوں نے مکہ کی ایک نواحی گھاٹی میں چھپ کر نماز پڑھنے والے معصوم مسلمانوں پر مشرکین مکہ کے اچانک حملہ کے وقت اونٹ کی ایک ہڈی سے ایک حملہ آور کو مار گرایا تھا۔ آپ کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے پہلا دفاعی تیر چلانے کی سعادت آپ کو ہی نصیب ہوئی[1]۔ آخرین کے اِس دور میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے مہدی علیہ السلام کی جماعت سے دشمنی رکھنے والے جب آپ کے عالمگیر مشن پر حملہ آور ہوئے اور اُن کی جماعت کو مٹانے کے مذموم عزائم پورے کرنے کے لئے طرح طرح کی شرمناک کارروائیاں کرنے لگے حتی کہ کلمہ طیبہ کی بے حرمتی کرنے سے بھی گریز نہ کیا تو اولین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آخرین نے بھی کلمہ طیبہ کی حفاظت کی خاطر بے مثال جرأت و استقامت کا مظاہرہ کیا اور اس راہ میں بے شمار مثالی قربانیاں پیش کرتے ہوئے نئی تاریخ رقم کی۔ بہت سے اس راہ میں جیلوں میں دھکیلے گئے اور مدتوں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ کتنے ہی کلمہ کی خاطر ماریں کھاتے ہوئے اپنے عشق کا اظہار کرتے رہے۔ کلمہ طیبہ کی بے حرمتی کرنے والوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہو کر حفاظت کرنے اور اس کے نتیجہ میں ممتاز رنگ میں قربانی پیش کرنے کی یہ غیر معمولی سعادت جماعت احمدیہ ساہیوال کے خادم مسجد محترم رانا نعیم الدین صاحب کے حصہ میں بھی آئی۔ یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا جب بدنامِ زمانہ اَحراری مولویوں نے اپنے پچاس ساٹھ چیلوں کے ساتھ حملہ کر کے مسجد احمدیہ ساہیوال کی پیشانی پر لکھے ہوئے کلمہ طیبہ، آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کو مٹانے کی ناپاک جسارت کی، مسجد میں داخل ہو کر اُودھم مچایا اور اس کی بے حرمتی کی۔ جب اُنہیں ایسا کرنے سے روکا گیا تو بپھرا ہوا یہ ہجوم اور بھی مشتعل ہو گیا۔ چنانچہ اس نازک صورت حال میں خادم مسجد رانا صاحب موصوف مسجد کے محافظ کی حیثیت سے اپنا حق دفاع استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے جس کے نتیجہ میں حملہ آور ''مجاہدین'' میں سے دو موقع پر ہی ڈھیر ہو گئے۔

اِس سانحہ کے نتیجہ میں راقم الحروف سمیت جماعت احمدیہ ساہیوال کے حسب ذیل گیارہ اُفراد کے خلاف ایک سرتاپا جھوٹا مقدمہ پولیس میں درج کروا دیا گیا:

---

[1] اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، ذکر سعد بن مالکؓ

۱۔مکرم ملک محمد دین صاحب، ریٹائرڈ انسپکٹر پولیس

۲۔مکرم رانا نعیم الدین صاحب، خادم مسجد ساہیوال

۳۔مکرم چوہدری محمد اسحاق صاحب، نمبردار

۴۔مکرم پروفیسر محمد طفیل صاحب، گورنمنٹ کالج ساہیوال

۵۔مکرم چوہدری حفیظ الدین صاحب، ایڈووکیٹ

۶۔مکرم چوہدری شاہد نصیر باجوہ صاحب، ایڈووکیٹ

۷۔مکرم لطف الرحمٰن صاحب، بینک مینیجر

۸۔مکرم حاذق رفیق طاہر صاحب، تاجر

۹۔مکرم عبدالقدیر صاحب

۱۰۔مکرم محمد نثار صاحب، طالب علم

۱۱۔خاکسار محمد الیاس منیر، مربی سلسلہ ساہیوال

اِس مقدمہ کی سماعت مارشل لاء کی ایک خصوصی عدالت نمبر 62 ملتان نے کی۔ اِس عدالت نے 'اوپر کے اشاروں' کی تعمیل میں ایک بہیمانہ فیصلہ کیا جسے آمرِ وقت جنرل محمد ضیاء الحق نے بطورِ خاص اپنے دستخطوں کے ساتھ نافذ کرنے کا اعلان کیا مگر وہ اس فیصلہ پر عمل درآمد کی حسرت لئے ذلت و رسوائی کے ساتھ راہیٔ ملک عدم ہوا اور ہم، جنہیں پیارے آقا نے 'اسیرانِ راہِ مولیٰ' جیسا پیارا خطاب عطا فرمایا تھا، باعزت بری ہو کر اپنے گھروں کو لوٹے، الحمدللہ علی ذٰلک۔

آئندہ صفحات میں قارئین کی خدمت میں اُن دس سالوں پر محیط امتحان و ابتلاء کی سرگزشت پیش کی جا رہی ہے جس میں سے جماعت احمدیہ مذکورہ بہیمانہ فیصلہ کے نتیجہ میں گزری۔ اُمید ہے قارئین تمام اسیران راہِ مولیٰ کیلئے دعا کرتے رہیں گے۔ اُن اسیران کے لئے بھی جن کے بدن دیس میں پابندِ سلاسل تھے اور ان کے لئے بھی جن کی روحیں دیس بدیس گرفتارِ بلا تھیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، آمین۔

## سانحہ ساہیوال کا پس منظر

اِس سانحہ کا پس منظر بننے والے واقعات کا آغاز ٹھیک چھ ماہ پہلے ہوا جب 26 اپریل 1984ء کو نمرودِ وقت جنرل ضیاء الحق نے جماعت احمدیہ کو اپنی دانست میں مکمل طور پر ختم کر دینے کیلئے ایک نہایت بھیانک اور ظالمانہ کارروائی کی۔ اُس نے تعزیرات پاکستان میں ترامیم کرنے کی غرض سے آرڈیننس نمبر 20 جاری کیا جسے اِمتناعِ قادیانیت آرڈیننس کا نام دیا گیا۔ اس آرڈیننس کے تحت پاکستان میں بسنے والے تمام افرادِ جماعت احمدیہ پر زبانی، تحریری یا تصویری کسی بھی طرح اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کی ظالمانہ پابندی لگا دی گئی اور اس کے ساتھ اِسلامی شعائر کا استعمال بھی اُن کے لئے جرم قرار دے دیا گیا اور خلاف ورزی کرنے والے کے لئے تین سال تک قید بامشقت اور جرمانہ کی سزا مقرر کر دی گئی۔

اس آرڈیننس کے نتیجہ میں جہاں جماعت احمدیہ کو اصحابِ کہف کی داستان دُہراتے ہوئے قانونی گرفت سے بچنے کی

غرض سے احتیاط کی غیر معمولی فصیل میں محصور ہونا پڑا وہاں پاکستان کے ملّانوں کو جماعت کے خلاف اپنی مفسدانہ کارروائیاں تیز کرنے کی نہ صرف چھوٹ مل گئی بلکہ حکومت کی جانب سے ان کی کھلم کھلا پشت پناہی بھی کی جانے لگی۔ جگہ جگہ ایسے واقعات ہونے لگے کہ احمدیوں کی ’مسلمانہ حرکات‘ سے اسلام کے نام نہاد ٹھیکہ دار ملّانوں کی ’دِل شکنی‘ کے نام پر تھانوں میں افرادِ جماعتِ احمدیہ کے خلاف سراسر جھوٹے مقدمات درج ہونے لگے۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں

رفتہ رفتہ اِن ملاؤں کی چیرہ دستیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ انہوں نے احمدیہ مساجد کی پیشانیوں پر لکھے ہوئے کلمہ طیبہ کو بھی مٹانا شروع کر دیا۔ اس فتنہ پردازی کے آغاز میں گوجرانوالہ اور چنیوٹ میں پے در پے ایسے واقعات ہوئے۔ پولیس کو شکایات کی گئیں مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اِن دو شہروں کے بعد ساہیوال میں بھی ایسی ہی ناپاک حرکت کا منصوبہ بنایا گیا جس پر عمل درآمد کی ذمہ داری ساہیوال میں قائم بدنام زمانہ احراریوں کے ایک مدرسہ جامعہ رشیدیہ کے ”عُلَمَاؤُهُم“ نے سنبھالی۔ پہلے تو وہ ہمارے علاقہ کے تھانیدار صاحب سے ملے اور ان سے مطالبہ کیا کہ مسجد احمدیہ سے کلمہ طیبہ مٹایا جائے مگر انہوں نے دوٹوک جواب دیتے ہوئے انہیں کہا:

”اگر میں نے وردی پہنی ہوئی ہے تو کیا میں اِتنا ہی کافر ہو گیا ہوں کہ کلمہ مٹاتا پھروں؟“

یہ بات تھانہ A ڈویژن کے ایس ایچ او انسپکٹر قاضی ایاز احمد صاحب نے 26 ستمبر 1984ء کی رات راقم الحروف کی موجودگی میں امیر صاحب اور بعض عہدیدارانِ جماعت ساہیوال سے باتیں کرتے ہوئے خود بتائی تھی۔ اُس روز عشاء کی نماز کے بعد ایک احمدی نوجوان میرے پاس آیا اور اطلاع دی کہ آج رات مسجد پر حملہ ہونے والا ہے۔ ہمارے اس احمدی نوجوان کو یہ خبر اس کے ایک دوست نے دی تھی جو جامعہ رشیدیہ کے پاس ہی واقع ٹیکنیکل کالج میں پڑھتا تھا۔ جامعہ رشیدیہ والے فسادفی الارض کے ”کارخیر“ میں اِس کالج کے طلبہ کو بھی شامل کر لیا کرتے تھے۔ ہمارے احمدی نوجوان کا وہ دوست اُس رات جامعہ رشیدیہ میں منعقد ہونے والی اُس کانفرنس میں موجود تھا جہاں اِس حملہ کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ میں نے یہ اِطلاع امیر جماعت ساہیوال محترم ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب تک اُسی وقت پہنچائی تو انہوں نے فوری طور پر ایس پی صاحب کو آگاہ کر دیا۔ پھر کیا تھا، ایک گھنٹہ کے اندر اندر پولیس کی بھاری نفری ہماری مسجد کے سامنے پہنچ گئی۔ اِس اثناء میں بہت سے مقامی احباب جماعت بھی مسجد میں جمع ہو گئے۔ اس موقع پر تھانیدار موصوف بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دیر تک مسجد میں رہے اور مولویوں کی ان حرکات پر اظہار خیال کرتے رہے۔

اُس رات یقیناً اُن لوگوں کو مسجد کے باہر پولیس کی موجودگی کا علم ہو گیا ہو گا چنانچہ وہ حملہ کرنے نہیں آئے۔ اس کے چند روز بعد تک مسجد کے سامنے پولیس کا پہرہ رہا مگر آہستہ آہستہ ڈیوٹی کرنے والے سپاہیوں کی تعداد میں کمی ہوتی گئی اور ٹھیک ایک ماہ بعد 26 اکتوبر کو جب مسجد پر حملہ ہوا تو اُس وقت یہ ڈیوٹی کاغذی کارروائی کے طور پر ہی رہ گئی تھی اور اُس دن ہمارے خدام کے سوا کوئی بھی پہرہ پر نہ تھا۔

مسجد پر حملہ ہو گیا!

خاکسار 25 اکتوبر کو رات دس بجے کے قریب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک کتاب کا مطالعہ کر کے سویا۔ میرا بیٹا عزیزم طارق الیاس جو میرے ساتھ سویا ہوا تھا علی الصبح اچانک جاگ اُٹھا۔ میں نے اُسے اس کی والدہ کے ساتھ لٹا دیا اور خود وضو کر کے نوافل ادا کرنے لگا۔ قریباً پونے پانچ بجے فجر کی اذانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو میں بستر پر آ کر لیٹ گیا اور عزیزم طارق کو اپنے ساتھ پھر لٹا لیا تا کہ میری اہلیہ میرے مسجد میں جانے سے پہلے نماز پڑھ لے۔ چنانچہ وہ اُٹھیں اور وضو کر کے نماز فجر ادا کرنے لگیں۔ اِسی دوران میں یک لخت ایک زبردست دھماکہ کی آواز آئی۔ میں نے بستر سے اُٹھتے ہوئے طارق کو پرے کیا تو وہ رونے لگ پڑا، جس پر اسے تھپتھپایا۔ اِتنے میں اہلیہ نے سلام پھیر کر عزیزم طارق کو سنبھال لیا۔ اُس لمحہ میرے منہ سے جو پہلا بے ساختہ فقرہ نکلا وہ تھا:

''مسجد پر حملہ ہو گیا ہے''

اور ساتھ ہی میں مسجد جانے کے لئے دوڑا۔ میں اپنے مکان کے کمروں میں سے بھاگتے ہوئے گزر رہا تھا کہ ایک اور زوردار دھماکہ کی آواز سنائی دی۔ جب میں اپنی بیٹھک کا دروازہ کھول کر مسجد کے صحن میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ محترم رانا نعیم الدین صاحب بڑے جلال سے للکار رہے ہیں:

'کون ہو تم کلمہ مٹانے والے؟ کہاں ہو تم کلمہ مٹانے والے!' وغیرہ۔

میں نے اس سے پہلے کبھی رانا صاحب کو اردو بولتے نہیں سنا تھا اور وہ بھی ایسی کڑک دار آواز میں کہ گویا سارے ماحول پر چھائے ہوئے تھے۔ یہ صورت حال میرے لئے غیر معمولی تھی کیونکہ اُس وقت تک مجھے علم نہ تھا کہ ہوا کیا ہے؟ میں نے دیکھا کہ ڈیوٹی دینے والے خدام رانا صاحب کے گھر کے دروازے کے پاس کھڑے تھے جو مسجد کے صحن میں کھلتا تھا۔ ان کے علاوہ مجھے اور کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی رانا صاحب اسی طرح للکارتے ہوئے مسجد کے ہال میں داخل ہو گئے کہ کہاں ہو تم کلمہ مٹانے والے؟ چند ثانیوں کے بعد ایک اور زوردار دھماکہ کی آواز نے ماحول کو مزید خوفزدہ کر دیا اور ساتھ ہی چند آدمی مسجد کے شمالی حصہ میں بنی ہوئی وضو والی جگہ میں سے نکل کر دُم دبا کر بیرونی دروازے کی

طرف بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ ابھی تک مجھے کچھ سمجھ نہ آئی تھی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے چنانچہ مسجد کے احاطہ میں کھڑے خدام اُن بھاگنے والوں کے پیچھے پیچھے باہر نکلے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی مسجد سے باہر چلا گیا اور اُن حملہ آوروں کو مشن چوک کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا جو کچھ فاصلے پر ہوٹلوں کے قریب کھڑے رکشوں میں سوار ہو کر غائب ہو گئے۔ میں نے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے مسجد کے بیرونی دروازے کے بالکل سامنے سڑک کے عین کنارے پر ایک آدمی گرا ہوا نظر آیا جو کراہ رہا تھا۔ اس دروازے کے اوپر والے حصہ پر نظر پڑی تو کلمہ مٹا ہوا تھا۔ اندر آیا تو مسجد کے اندرونی دروازوں کی پیشانیوں پر لکھا ہوا کلمہ طیبہ اور آیات قرآنیہ بھی مٹی ہوئی دکھائی دیں اور عین اِن مٹی ہوئی آیات کے نیچے مسجد کے شمالی دروازے کے سامنے فرش پر ایک نوجوان چاروں شانے چت پڑا تھا۔ خدام سے پوچھا یہ کیا ماجرا ہوا ہے تو انہوں نے جو کچھ مختصراً بتایا اس سے مجھے علم ہوا کہ بھاگنے والے دراصل مسجد پر حملہ آور ہوئے تھے۔

## واقعہ کی تفصیلات لمحہ بہ لمحہ!

خاکسار تو فائرنگ کی آواز سن کر اِس واقعہ کے آخری لمحات میں موقع پر پہنچا تھا تاہم وہاں پر موجود خاکسار کے اسیر ساتھیوں نے جو کچھ بعد میں بتایا اس کی روشنی میں جملہ حالات کچھ یوں رونما ہوئے:

نماز فجر سے بہت پہلے محترم رانا نعیم الدین صاحب اُٹھے اور مسجد کے بیرونی گیٹ کے سامنے ڈیوٹی پر موجود عزیزان ماہد منظور صاحب، عبد القدیر صاحب اور محمد نثار شاہد صاحب کے پاس آکر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اُس وقت ماہد منظور صاحب کہنے لگے کہ اب صبح ہو گئی ہے اس لئے میں تو چلتا ہوں اور وہ گھر چلے گئے۔ باقی دونوں خدام کے ساتھ باتوں کے دوران رانا صاحب نے اچانک دیکھا کہ کچھ لوگ مسجد کی سڑک کے دائیں طرف سے اور کچھ بائیں طرف سے آرہے ہیں۔ یہ لوگ مسجد سے کچھ فاصلہ پر آکر رُکنے والے رکشاؤں سے اُترے تھے اور مسجد کے قریب پہنچ کر اکٹھے ہو گئے۔ یہ دیکھ کر رانا صاحب چونکے اور اپنے تجربہ کی بناء پر صورت حال بھانپ گئے اور فوری طور پر مسجد کے اندر واقع اپنے گھر چلے گئے۔ عین اُسی وقت دائیں بائیں سے آنے والے لوگوں میں سے چند ایک نے یک دم آگے بڑھ کر نثار اور عبد القدیر کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور ان کی باقی ساتھیوں نے مسجد پر دھاوا بول دیا۔ پہلے مرحلہ پر اِن حملہ آوروں نے ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھ کر مسجد کے بیرونی دروازے کی پیشانی پر لکھے کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر برش کے ساتھ رنگ پھیر دیا۔ اس کے بعد یہ حملہ آور مسجد کے اندر داخل ہو گئے جہاں صحن میں صرف ایک ہی بلب روشن تھا کیونکہ اُن دنوں مسجد کے ہال میں مرمت کی وجہ سے بجلی کا سارا نظام معطّل تھا۔

احاطہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد یہ حملہ آور مسجد کے صحن اور ہال میں داخل ہو گئے اور یہاں بھی ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہو کر دروازوں کی محرابوں پر لکھی ہوئی مقدس تحریریں مٹانے لگے۔ اس پر رانا صاحب موصوف نے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی مگر بپھرے ہوئے یہ مفسد اور بھی مشتعل ہو گئے۔ اس پر محترم رانا صاحب نے اپنی لائسنسی بندوق سے ہوائی فائر کیا کہ شاید اسی طرح یہ لوگ ڈر کر باز آ جائیں (یہ وہی فائر تھا جس کی آواز مجھے سب سے پہلے اپنے کمرے میں سنائی دی تھی) لیکن اپنی مذموم حرکت سے باز آنے کی بجائے ان کے لیڈر نے نعرہ لگایا کہ "ڈرو مت، یہ پٹاخے ہیں اور آگے بڑھ کر اسے پکڑ لو"۔ چنانچہ اس صورتحال میں محترم رانا صاحب کو اپنے دفاع میں بندوق سیدھی کر کے فائر کرنا پڑا۔ (یہ وہی فائر تھا جس کی آواز میں نے گھر سے مسجد کی طرف بھاگتے ہوئے گھر میں ہی سنی تھی) اس کے نتیجہ میں ایک حملہ آور ڈھیر ہو گیا جس پر ان میں بھگدڑ مچ گئی اور کچھ مسجد کے اندر بھی چلے گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے رانا صاحب بھی انہیں للکارتے ہوئے مسجد میں داخل ہو گئے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں اپنے گھر سے مسجد کے صحن میں داخل ہوا تھا۔ مسجد کے اندر جا کر انہوں نے شمالی جانب والی کھڑکیوں میں سے دیکھا کہ چند حملہ آور ان کے عین سامنے وضو والی جگہ پانی کی ٹینکی کی اوٹ میں چھپے ہوئے ہیں تو انہوں نے کھڑکی میں سے ایک اور فائر کر دیا (یہ وہی تیسرا فائر تھا جس کی آواز میں نے مسجد کے صحن میں پہنچنے کے بعد سنی تھی) اس پر وہ تین چار حملہ آور باہر کی طرف بھاگے تھے جنہیں میں نے بھی دیکھا تھا۔ وہ مقتول جس کی چھاتی میں فائر لگا تھا اور مسجد کے سامنے سڑک کے کنارے گر کر ٹھنڈا ہو گیا تھا، انہی میں شامل تھا، علاوہ ازیں ایک اور حملہ آور بھی زخمی ہوا جسے یہ لوگ رکشا میں ڈال کر اپنے ساتھ لے بھاگے، یہ زخمی چند دن کسی ہسپتال میں زیر علاج رہنے کے بعد چل بسا۔ چونکہ ایف آئی آر میں صرف چھ افراد کے مسجد جانے کا ذکر تھا، اس لیے انہیں اس شخص کی موت کو بھی چھپانا پڑ گیا بلکہ اس کی بھنک تک کسی کان میں پڑنے نہ دی گئی۔

ان حملہ آوروں کے بد اِرادوں کے متعلق ایک شہادت بھنڈاری چوک کے قریب چارہ کی دکان والے نے یوں دی کہ یہ رکشے پہلے اِس چوک میں کونے پر واقع محترم قاضی نثار احمد صاحب کے گھر کے سامنے رُکے تو کسی نے اس گھر کی طرف اشارہ کیا جس پر دوسرے نے کہا کہ نہیں پہلے اُدھر مار لو پھر اِدھر آئیں گے۔ گویا ان کے اِرادے اُس سے کہیں بڑھ کر تھے جو وہ کر پائے۔

### واقعہ کے بعد چند گھنٹے

اِس خوفناک صورتِ حال میں خاکسار نے ڈیوٹی پر موجود خدام میں سے عزیزان محمد حاذق رفیق اور محمد نثار کو مسجد کے بالکل قریب رہائش پذیر مکرم میاں محمد عاشق صاحب (مرحوم) جو جماعت کے جنرل سیکرٹری بھی تھے، کی طرف بھیجا کہ

محترم امیر صاحب کو فوری طور پر بذریعہ فون اطلاع کی جاسکے۔ عزیزم عبدالقدیر کو اُن کے گھر واقع حسین بخش کالونی بھجوادیا اور خود وہاں اکیلا رہ گیا کیونکہ مکرم رانا صاحب بھی اپنے مکان میں جا چکے تھے۔ اُس لمحہ میں نے رانا صاحب سے ملنا ضروری سمجھا چنانچہ میں نے مسجد کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کر کے مکرم رانا صاحب کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد رانا صاحب نے دروازہ کھولا تو انہیں سخت گھبراہٹ کے عالَم میں پایا کیونکہ قتل کی وجہ سے سارے ماحول پر سخت وحشت طاری تھی۔ اس پر میں نے گلے لگا کر اُنہیں حوصلہ دِلایا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اِس موقع پر میرے منہ سے یہ الفاظ بے ساختہ نکلے:

"فکر نہ کریں، میری اور آپ کی آزمائش شروع ہوگئی ہے"

بعد ازاں میں نے اپنے گھر جا کر بیگم کو اس واقعہ کے بارہ میں مختصراً بتایا اور اُسے بچوں سمیت اپنے ہمسایہ مکرم پروفیسر طفیل صاحب کے گھر بھجوادیا اور خود مسجد کے صحن میں دوبارہ آگیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ملک منصور احمد صاحب (مرحوم) نماز کے لئے آئے ہیں۔ میں نے فوراً انہیں واپس بھجوادیا تا کہ وہ قریب کے گھروں میں جا کر اس واقعہ کی اطلاع کریں اور خود مسجد کا بیرونی دروازہ پھر بند کر کے صحن میں دعائیں کرتے ہوئے ٹہلنے لگا۔ اُس دوران میری عجیب کیفیت تھی۔ مسجد کے صحن میں پڑی حملہ آور "مجاہد" کی نعش دیکھ کر زبان پر بار بار یہ فقرہ آرہا تھا "کون ہیں یہ تیری تحریر مٹانے والے!!" اُس وقت میں نے اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ کی دُعا بڑی کثرت کے ساتھ کی۔ محترم ملک صاحب موصوف تھوڑی ہی دیر میں واپس آگئے اور وہ بھی میرے ساتھ ٹہلنے لگے۔ اسی دوران میں جب ہم ایک دفعہ مہمان خانہ والے کمرے میں آئے اور باہر نظر پڑی تو وہاں چند پولیس والے اُس شخص کو اُٹھا کر چارپائی پر ڈال رہے تھے جو باہر مسجد کے سامنے گر کر اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ وہ اُس کی نعش اُٹھا کر مشرق کی سمت لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کسی کار کا ہارن سنائی دیا، مہمان خانہ کی کھڑکی سے دیکھا تو سامنے محترم ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب امیر جماعت ساہیوال کی کار کھڑی تھی۔

محترم امیر صاحب نے مسجد میں داخل ہوتے ہی رانا نعیم الدین صاحب سے واقعہ کے بارہ میں مختصراً دریافت کیا اور فوراً ہی تھانہ اے ڈویژن تشریف لے گئے۔ تھانہ میں انہیں کوئی نہ ملا تو وہ پولیس چوکی واقع مشن روڈ چلے گئے لیکن وہاں بھی اُس وقت ایسا کوئی اہلکار موجود نہ تھا جسے اس واقعہ کی رپورٹ کرتے۔ اس کے بعد امیر صاحب اور کچھ احبابِ جماعت بھی مسجد میں تشریف لے آئے۔ اسی دوران میں پولیس کو بھی واقعہ کی اطلاع ہو چکی تھی اور تھوڑی دیر میں ڈی ایس پی صدر، نواز احمد صاحب اور ایس ایچ او تھانہ A ڈویژن قاضی ایاز احمد صاحب گارد کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔

مسجد میں داخل ہوتے ہی ڈی ایس پی صاحب کی نظر مسجد کے صحن میں گر کر ہلاک ہو جانے والے کی نعش پر پڑی تو بے ساختہ ان کے منہ سے Oh! There is one more! کے الفاظ نکلے۔ پھر پوچھا "Who Fired?" اِس پر ہم میں سے رانا صاحب آگے آئے اور بڑی دلیری سے کہا ''میں نے کیا ہے''۔ انہوں نے مزید پوچھا ''کس بندوق سے؟ لاؤ وہ بندوق!'' رانا صاحب نے بندوق لا کر ایس ایچ او کو پکڑا دی۔ ڈی ایس پی صاحب نے مزید پوچھا ''لائسنس کہاں ہے؟'' رانا صاحب نے لائسنس بھی لا کر ڈی ایس پی صاحب کو پیش کر دیا۔ پھر پوچھا ''خالی کارتوس کہاں ہیں؟'' رانا صاحب نے تین خالی کارتوس بھی لا کر انہیں دے دیئے۔ پھر ڈی ایس پی صاحب نے تھانیدار صاحب سے کہا ''انہیں (یعنی رانا صاحب کو) گاڑی میں بٹھا کر لے جاؤ'' چنانچہ رانا صاحب نے اپنے گھر کو تالا لگایا اور کسی تردّد کے بغیر فوراً پولیس کی گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی وہاں سے چلی گئی۔

اس کے بعد ایس ایچ او صاحب نے مجھ سے تفصیلات پوچھیں تو میں نے بتایا کہ میں تو واقعہ کے وقت موجود نہ تھا بلکہ اس کا شور سن کر آیا تھا۔ اتنے میں عزیزم حاذق وہاں آ گئے تو قاضی صاحب نے اچانک انہیں سوالیہ انداز میں پوچھا کہ رات ڈیوٹی پر کون کون تھا؟ انہوں نے جواب دیا ''میں تو سویا ہوا تھا اور بعد میں آیا تھا''۔ تاہم انہوں نے ڈیوٹی پر موجود دیگر خدام کے نام لکھوا دیئے۔ یہ ابتدائی رپورٹ ایس ایچ او صاحب نے مہمان خانہ کے دروازے میں کھڑے ہو کر ڈی ایس پی صاحب کی موجودگی میں لکھی۔ اِس کے بعد جب میں نے خدام کے نام دیکھے تو ماجد منظور کے بارہ میں یہ وضاحت لکھوائی کہ وہ وقوعہ سے پہلے ہی اپنے گھر چلے گئے تھے جسے قاضی ایاز صاحب نے نوٹ کر لیا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے کہا کہ موقع پر موجود خدام کو بلوایا جائے چنانچہ انہیں بلوانے کے لئے عزیزم عبدالقدیر اور عزیزم نثار کی طرف آدمی بھجوا دیئے گئے۔ اس دوران میں گھر گیا جہاں میری بیگم مکرم پروفیسر طفیل صاحب کے گھر سے واپس آ کر بچوں کے لئے دودھ بنانے میں مصروف تھی، اس نے مجھے بھی ناشتہ کرنے کے لئے مجبور کیا تو چند لقمے لے لئے۔ اُس وقت میں نے بیگم کو آئندہ پیش آسکنے والے حالات کے حوالہ سے حوصلہ دیتے ہوئے کہا کہ چند ماہ پہلے ربوہ میں معمولی سا واقعہ ہوا تھا تو بالکل بے تعلق افراد کو بھی پکڑ لیا گیا تھا۔ اب کم از کم مجھے تو ضرور پکڑیں گے لیکن گھبرانا نہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اپنا بے حد فضل فرمایا اور میری بیگم کو اِس واقعہ کے نتیجہ میں پیش آنے والے طویل ابتلاء کے دوران غیر معمولی حوصلہ اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنے کی توفیق ملی جس کا اظہار و اعتراف ہر کسی نے کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور کے خطوط سے یہ خوشکن خبر ملتی رہی کہ اللہ کے فضل سے طاہرہ شاندار صبر اور زبردست حوصلہ کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ الحمدللہ وجزاہا اللہ احسن الجزاء۔

چند منٹ بعد میں گھر سے واپس مسجد میں آیا تو ہمارے احمدی فوٹو گرافر مکرم حاجی حمید احمد صاحب پولیس کی اجازت سے مسجد کے اندر پڑی نعش کی تصاویر اُتار رہے تھے۔ اس کے بعد ہسپتال لے جانے کے لیے نعش اُٹھائی گئی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ:

☆ مقتول کے دائیں ہاتھ میں ایک برش تھا جو اُسی نیلے پینٹ سے لتھڑا ہوا تھا جس سے کلمہ طیبہ اور دیگر تحریرات مٹائی گئی تھیں۔ مزید حیران کن بات یہ کہ باہر جا کر گرنے والے مقتول کے ہاتھ میں اُسی رنگ کا ڈبہ تھا۔

☆ مقتول کو گولیاں صرف سر میں لگی تھیں جبکہ فائر کے نشان نعش والی جگہ کے بالکل سامنے مسجد کے دروازے پر زمین سے صرف ایک میٹر اونچائی تک تھے۔ سوال یہ تھا کہ پھر گولیاں اس کے سر میں کیسے لگیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ نوجوان تھا جو کندھوں پر چڑھ کر کلمہ مٹا رہا تھا جیسا کہ اس کے ہاتھ میں موجود برش سے بھی ثابت ہوتا ہے اور جب اندھیرے میں یہاں بھگدڑ مچی تو یہ نوجوان کندھوں سے نیچے گر پڑا ہوگا اور گرتے ہوئے اس کا سر کارتوس کے چھرّوں کی زد میں آ گیا ہوگا۔ اس طرح سے تقدیر الٰہی کا خاص نشانہ وہی دو شخص بنے جو اللہ کی غیرت کو جوش میں لانے والی اس سیاہ حرکت میں براہ راست ملوث تھے، ایک وہ جو کلمہ مٹا رہا تھا اور دوسرا وہ جس کے ہاتھ میں رنگ کا ڈبہ تھا اور پہلے کی مدد کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس ماحول میں ہوا جہاں روشنی نہ ہونے کے باعث معین طور پر کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا اور فائر کرنے والے کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کسی خاص شخص کو نشانہ بنا سکتا۔

نعش اُٹھا کر لیجانے اور ابتدائی نوعیت کی تفتیشی کارروائی کرنے کے بعد تھانیدار قاضی ایاز صاحب نے محترم امیر صاحب سے کہا کہ آج چونکہ جمعہ کا روز ہے اور موجودہ صورت حال بڑی خطرناک ہے اس لئے آپ شہر میں بسنے والے احمدیوں کے گھروں اور پتہ جات کی فہرست بنا کر ہمیں دے دیں۔ اس پر محترم امیر صاحب اپنے رفقائے کار محترم میاں عمر احمد صاحب، ملک غلام احمد صاحب اور میجر (ر) منظور احمد صاحب کے ہمراہ محترم میاں عاشق صاحب کے گھر چلے گئے جہاں صورت حال سے نمٹنے کے لئے باہمی مشورے ہوتے رہے۔ تاہم میں ابھی مسجد میں ہی تھا کہ ہائی سٹریٹ کی طرف سے بپھرے ہوئے ایک جلوس کے نعروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اُس وقت مسجد میں میرے ساتھ محض چند خدام تھے اور ہمیں یقین ہوگیا کہ اب یہ وحشی جلوس مسجد پر حملہ آور ہو کر ہماری تکہ بوٹی کر دے گا کیونکہ ہمارے پاس حفاظت کا کچھ بھی سامان نہ تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ اپنی بیگم اور بچوں کو پھر پروفیسر طفیل صاحب کے گھر بھجوا دیا اور خود خدام کے پاس آ کر ان کے حوصلے بلند کرنے لگا۔ ہم اضطراری کیفیت میں ڈوب کر دعائیں کرنے لگے۔ چند منٹ بعد جلوس کا یہ شور کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ قریباً 150 افراد پر مشتمل جلوس جامعہ رشیدیہ

سے آیا تھا اور اب سیدھا سول ہسپتال کی طرف چلا گیا ہے۔ بہر حال یہ لمحات شدید خوف کے لمحات تھے جنہیں سچے وعدوں والے ہمارے اللہ نے امن میں بدل دیا، الحمدللہ۔ اس کے بعد پی ڈی ایس پی صاحب اور مجسٹریٹ درجہ اول آئے۔ قبل ازیں ڈی سی صاحب بھی سارے موقع کا معائنہ کر کے جا چکے تھے۔ اول الذکر افسران نے بھی موقع کا معائنہ کیا اور مجسٹریٹ صاحب نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ آج نماز جمعہ آپ لوگ یہاں نہ پڑھیں اور مسجد سرِ دست بند کر دیں تا کہ کسی قسم کا فساد نہ ہو۔ اس کے تھوڑی دیر بعد محترم امیر صاحب تشریف لائے تو انہیں مجسٹریٹ صاحب کی یہ ہدایت پہنچا دی جس سے امیر صاحب نے اتفاق کرتے ہوئے مسجد خالی کروا کر تالا لگوا دیا۔ اس کے بعد مسجد میں موجود سب خدام محترم میاں محمد عاشق صاحب کے گھر چلے گئے۔ میں نے امیر صاحب کی ہدایت کے مطابق اپنے بیوی بچوں کو اپنے ایک رشتہ دار مکرم عبدالحق صاحب ناصر (جو ہمارے خاندان میں 'خالو عبدالحق' کے حوالہ سے معروف ہیں) کے گھر پہنچانے کے لئے مکرم ندیم الرحمٰن صاحب سے کہا جو ہمیں اپنی گاڑی میں وہاں لے گئے۔ بچوں کو خالو جان کے گھر چھوڑنے کے بعد میں بھی ندیم صاحب کے ساتھ واپس آ کر میاں عاشق صاحب کے گھر موجود عہدیداران کے ساتھ لائحہ عمل طے کرنے میں شامل ہو گیا۔

☆ دوسرا باب

# گھر سے حوالات تک

☆ پولیس کی حراست میں

☆ تھانہ اے ڈویژن

☆ تھانہ ملکہ ہانس

☆ سنٹرل جیل ساہیوال

☆ ڈسٹرکٹ جیل ملتان

خدا تجھے آپ تمام آفات سے بچائے گا اگرچہ لوگ نہیں چاہیں گے کہ تو آفات سے بچ جائے یہ اس زمانہ کی پیشگوئی ہے جبکہ میں ایک زاویہ گمنامی میں پوشیدہ تھا اور کوئی مجھ سے نہ تعلق بیعت رکھتا تھا نہ عداوت۔ بعد اس کے جب مسیح موعود ہونے کا دعویٰ مَیں نے کیا تو سب مولوی اور اُن کے ہم جنس آگ کی طرح ہو گئے اُن دنوں میں میرے پر ایک پادری ڈاکٹر مارٹن کلارک نام نے خون کا مقدمہ کیا اس مقدمہ میں مجھے یہ تجربہ ہو گیا کہ پنجاب کے مولوی میرے خون کے پیاسے ہیں

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۲۴۲)

# گھر سے حوالات تک

کمال جرأت اور سچائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اِس واقعہ کی ذمہ داری قبول کرنے والے مکرم رانا نعیم الدین صاحب (خادم مسجد) کی گرفتاری کے بعد بھی اگرچہ حکومت سے کسی خیر کی توقع نہ تھی اور صورت حال کی سنگینی ونزاکت کا پوری طرح احساس تھا مگر یہ حقیقت بھی ہر کس وناکس پر عیاں تھی کہ یہ افسوس ناک واقعہ مقتولین کے کئی میل دور سے آ کر حملہ کرنے کے نتیجہ میں رونما ہوا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ روزِ روشن کی طرح عیاں اس سچائی کو کلیۃً چھپا کر سرتا پا جھوٹی کہانی گھڑ کر درجن بھر افراد جماعت کے خلاف مقدمہ قائم کر دیا جائے گا اور سراسر دھوکہ کی راہ سے اِن افراد جماعت کو گرفتار بھی کر لیا جائے گا مگر یہ سب کچھ ہوا اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہوا۔ اسی کا تذکرہ اس باب میں ہوگا۔

## پولیس کی حراست میں

پولیس اور دیگر اعلیٰ افسران کے کہنے پر ہم نے مسجد خالی کر دی تھی اور گیارہ بجے کے قریب جس وقت میں بچوں کو مکرم عبدالحق ناصر صاحب کے گھر چھوڑ کر محترم میاں عاشق صاحب کے مکان پر پہنچا تو وہاں محترم امیر صاحب چند دیگر احباب کے مشورہ سے احمدیوں کے مکانوں کی حفاظت کا انتظام کرانے کے لئے ایس پی صاحب کے نام ایک درخواست لکھوا رہے تھے۔ اِسی دوران فون کی گھنٹی بجی تو محترم میاں عاشق صاحب نے فون اُٹھایا۔ یہ فون تھانہ اے ڈویژن سے ایس ایچ او قاضی ایاز احمد کا تھا۔ اس فون کے بعد حالات نے ایک تاریخی موڑ لیا، وہ کہہ رہے تھے:

"کمشنر صاحب آ رہے ہیں اور ان کا حکم ہے کہ جو نوجوان باہر ڈیوٹی پر تھے اُن کی گواہیاں لینے کی ضرورت ہے، اس لئے اگر وہ موجود ہیں تو میں آ کر اُنہیں لے جاتا ہوں"

اس فون کے تھوڑی ہی دیر بعد قاضی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے پہلے عزیزم عبدالقدیر صاحب اور عزیزم محمد نثار صاحب کو ساتھ چلنے کو کہا اور واپس جانے لگے تو اچانک انہوں نے حاذق رفیق صاحب اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ اس پر میں نے محترم امیر صاحب سے پوچھا تو آپ نے فرمایا 'جاؤ، جاؤ'۔ وہاں امیر صاحب کے بڑے بیٹے مکرم لطف الرحمٰن بھی موجود تھے انہوں نے بھی کہا کہ تھوڑی دیر کی بات ہے چلے جائیں، ابھی آپ واپس آ جائیں گے۔ چنانچہ ہم چاروں ساتھی پورے اِطمینان سے باہر آ کر سرخ رنگ کی DATSUN PICKUP میں بیٹھ گئے اور یہ گاڑی ہمیں لے کر

ایک ایسے سفر پر روانہ ہوگئی جس کا پہلا سٹاپ اگرچہ چند قدموں اور لمحوں پر تھا مگر آخری دس سال بعد آیا۔ اُس وقت ہمارے وہم وگمان یا ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہی ہماری گرفتاری ہے۔ ہر چند کہ ہم گرفتاری کے لئے ذہنی طور پر تیار تو تھے مگر اُس موقع پر اِس کا احساس نہ تھا، بعد ازاں ہمارے دو اَور ساتھیوں کو بھی اِسی طرح دھوکہ سے گرفتار کیا گیا۔

## تھانہ اے ڈویژن میں

ہماری مسجد تھانہ اے ڈویژن کی حدود میں واقع تھی اسی لئے ہمیں یہیں لایا گیا۔ یہاں پہلے ایس ایچ او صاحب کے دفتر میں گئے جہاں ڈی ایس پی نواز صاحب کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی وہاں موجود تھے۔ ڈی ایس پی صاحب نے بڑی ہمدردی سے پوچھا 'آ گئے، چائے پئیں گے' ہم نے کہا نہیں، شکریہ۔ پھر انہوں نے اپنے عملہ سے کہا 'انہیں بٹھائیں' جس پر ہمیں ایس ایچ او کے دفتر کے ساتھ ہی ایک کمرا چھوڑ کر کانسٹیبلوں کی بارک کے ایک چھوٹے سے رہائشی کمرے میں بٹھا دیا گیا اور یہاں ہم لگے انتظار کرنے کہ کب ہمیں کمشنر صاحب کے سامنے واقعات کی گواہی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ جب ہمیں تھانہ لایا گیا تھا تو قریباً دن کے بارہ بجے کا وقت ہوگا جس کے بعد وہاں بیٹھے بیٹھے ایک بج گیا، دو بج گئے، جمعہ کا وقت بھی گزر گیا۔ ہم نے نماز کے لئے پوچھا تو ہمیں اجازت دے دی گئی کہ تھانہ کی مسجد میں نماز ادا کر لیں۔ چنانچہ ہم سب نے وہاں جا کر باجماعت نمازِ ظہر ادا کی اور پھر آ کر اُسی کمرے میں بیٹھ گئے جہاں لوہے کی ایک چارپائی تھی اور لکڑی کے دو تین صندوق۔ ہم چاروں ساتھی رات گئے تک اِنہی پر بیٹھتے، اُٹھتے اور لیٹتے ہوئے وقت گزارتے رہے۔

اِس دوران بعض واقف کار سپاہی جو کچھ دن پہلے تک ہماری مسجد کے پہرہ کی ڈیوٹی پر رہے تھے، آتے رہے اور ان سے سلام دعا ہوتی رہی۔ تین بجے کے قریب قاضی ایاز صاحب آئے تو ہم نے پوچھا کہ ہمیں کمشنر صاحب کے سامنے کب پیش کرنا ہے۔ کہنے لگے میں تو آپ سے بھی زیادہ جلدی میں ہوں لیکن کمشنر صاحب آئیں تو بات بنے۔ تاخیر ہو جانے کا انہیں بھی احساس تھا چنانچہ انہوں نے فون کر کے گھر سے کھانا بھی منگوایا۔ بھوک تو تھی مگر کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا تاہم کچھ نہ کچھ زہر مار کیا۔ اِسی دوران تھانہ کے منشی عبدالرزاق سپاہی نے آ کر ہمیں پوچھا کہ اپنے دوسرے ساتھی رانا نعیم الدین صاحب کو کھانا نہیں دینا؟ اُس وقت ہمیں پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ رانا صاحب بھی یہیں کہیں ہیں۔ چنانچہ انہیں بھی ہم نے کھانا بھجوایا۔ پھر عصر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ ہم نے یہ نماز بھی تھانہ کی مسجد میں باجماعت ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر واپس آ رہے تھے کہ تھانہ میں اچانک ہل چل مچ گئی۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ سپاہی بندوقیں لے کر تھانہ کے

برج پر چڑھ گئے اور تھانہ کا بڑا گیٹ بند کر کے باقی سپاہیوں نے بھی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں مگر تھوڑی دیر میں یہ شور شرابہ ختم ہو گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اُس وقت مولوی حضرات ہسپتال سے اپنے ''مجاہدین'' کی پوسٹ مارٹم شدہ نعشیں لے کر بڑے جلوس کی شکل میں ہائی سٹریٹ پر سے ہوتے ہوئے جامعہ رشیدیہ جا رہے تھے۔

ہمیں اسی کمرے میں مختلف پہلوؤں پر کروٹیں لیتے شام ہو گئی۔ نمازِ مغرب اور پھر نمازِ عشاء بھی تھانہ کی مسجد میں ہی باجماعت ادا کی۔ اِس دوران پُرجوش قرأت کرنے کا خوب لطف آیا۔ عشاء کے بعد ہمیں اس کمرے سے ملحقہ بارک میں منتقل ہونے کو کہا گیا۔ چنانچہ ہم اس بارک کی پہلی دو چار پائیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں آ کر علم ہوا کہ محترم رانا نعیم الدین صاحب بھی اِسی بارک کے ایک کونے میں ہیں، ہم نے دور سے دیکھا کہ انہیں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ عشا کے بعد کھانا آیا، ہم نے کھایا اور رانا صاحب کو بھی بھجوایا۔ اس دوران میں محترم ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب امیر جماعت ساہیوال، محترم میاں محمد عمر صاحب اور لطف الرحمان صاحب ہمارے پاس آئے اور ہماری خیریت دریافت کی اور ہمیں حوصلہ دلایا۔ اس کے بعد ہم نے کوشش کی کہ قاضی ایاز صاحب سے ملاقات ہو سکے تاکہ اُنہیں بتائیں کہ کل عزیزم نثار صاحب کے امتحان PTC کا آخری پرچہ ہے اس لئے کم از کم اِسے تو جانے دیں لیکن قاضی صاحب کے متعلق ہمیں یہی کہا جاتا رہا کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔ اس کے بعد کھانے کے برتن لینے کے لئے کوئی صاحب آئے تو میں نے باہر نکل کر تھانہ کے منشی صاحب سے کہا کہ ہمیں قاضی صاحب سے ملنے دیا جائے کیونکہ گھر کی چابیاں وغیرہ دینی ہیں لیکن انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں بتا دیں ہم پیغام اُنہیں دے دیں گے، آپ مل نہیں سکتے۔ ہم بے چینی سے قاضی صاحب کا انتظار کرتے رہے کیونکہ ہمیں عزیزم نثار احمد کا فکر تھا مگر وہ برابر کہے جا رہا تھا کہ کوئی بات نہیں اللہ فضل کرے گا۔ اِسی اِنتظار میں رات کے قریباً دس بج گئے۔ اِتفاق سے منشی عبدالرزاق ہمارے پاس آیا تو ہم نے اُسے بتایا کہ نثار صاحب کا کل صبح آخری پرچہ ہے تو کہنے لگا کہ اب تو پرچے یہیں ہوں گے، اس جواب پر ہم ٹھٹکے۔ اِس دوران مکرم حاذق صاحب کو کمرے سے باہر نکلنے کا موقع ملا تو انہوں نے دیکھا کہ ایس ایچ او صاحب کے دفتر میں کچھ مولوی حضرات بیٹھے ہیں۔ یہی وہ وقت تھا جب دن بھر کی کاوشوں کے بعد تیار کی گئی FIR درج کرائی جا رہی تھی کیونکہ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں دفتر تھانہ میں طلب کیا گیا۔ ہم منشی صاحب کے پاس گئے تو ہماری تلاشی لینے لگے، گھڑیاں اتار لیں، کچھ رقم عبدالقدیر صاحب کے پاس تھی جس کے متعلق پہلے ایک سپاہی نے کہا جمع کرا دو لیکن منشی صاحب نے کہا نہیں اس کے پاس ہی رہنے دو۔ میرے پاس بھی سو روپے کا ایک نوٹ تھا جو میرے پاس ہی رہا۔ غالباً ان کا خیال ہوگا کہ اگر یہ رقم جمع ہو گئی تو پھر باقاعدہ ریکارڈ پر آ جائے گی اور جلد یا بدیر واپس کرنی پڑے گی اور اگر انہی کے پاس یہ رہتی

ہے تو دراصل یہ پولیس والوں کی ہی ہے۔ اس کے بعد ہمارے نام اور ضروری کوائف نوٹ کر کے ہمیں بیرونی گیٹ کے بالکل ساتھ والے مردانہ حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اُس لمحہ ہم سب نے زندگی میں پہلی بار حوالات کو اندر سے دیکھا۔ ہمیں بند کیا گیا تو میں نے دعا کی، اے اللہ! ہمیں اس جگہ کی وحشت سے اپنی پناہ میں رکھنا اور جتنے دن بھی یہاں رہیں وقار سے گزار دینا، آمین۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد رانا صاحب کو جو اسی بارک کے دوسرے کنارے پر حراست میں تھے، دفتر میں لے گئے اور پھر واپس لا کر زنانہ حوالات میں بند کر دیا۔ اِس کا علم ہمیں اُس وقت ہوا جب بعد میں رانا صاحب نے ہمیں اپنی آپ بیتی سنائی۔ یاد رہے کہ سرکاری طور پر جو دستاویزات ہمیں ملیں ان کے مطابق یہ FIR صبح کے چھ بجے درج ہوئی تھی جبکہ حقیقتاً اُس وقت رات کے دس بجے تھے جب FIR کا تھانہ میں باقاعدہ اندراج ہوا گویا مقدمہ کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی گئی۔

چوں خشت اول نہد معمار کج      تا ثریا می رود دیوار کج

حوالات کے اس کمرے میں ہم داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف وحشت کا منظر ہے یہاں صرف دو تین گندے مندے ٹاٹ پڑے تھے جو بعد میں ہمیں بڑے اچھے لگنے لگے تھے۔ پہلے تو ہم بالکل دم بخود ان ٹاٹوں پر بیٹھ گئے اور کچھ ثانیے بالکل خاموشی سے جائزہ لینے میں گزرے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ دینے تو ہم آئے تھے گواہی لیکن پہنچا دیئے گئے کہاں؟ بہر حال اب اس قسم کی سوچ فضول تھی۔ چنانچہ ہم اُٹھے اور دو ٹاٹوں کو سیدھا کر کے نیچے بچھا لیا اور چاروں ساتھی لیٹ گئے۔ تیسرے ٹاٹ کو اوپر لینے لگے تھے کہ باہر سے سنتری نے کہا کہ اسے بھی نیچے ہی بچھا لو اوپر لینے کے لئے کمبل مل جائیں گے۔ اس پر ہم اُٹھے اور اس تیسرے ٹاٹ کو بھی نیچے بچھا لیا۔ کمبل تو کیا ملتے، کچھ دیر بعد کسی نے بڑے ترش اور سخت پولیسانہ لہجہ میں کہا 'اُوئے تِنّوں ٹاٹ تھلّے وَچھا لئے جے، اک کڈ دیوُ' (یعنی تینوں ٹاٹ نیچے بچھا لئے ہیں، ایک نکال دو) اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بہت قیمتی چیز پر ہم نے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہو! اس پر ہم اُٹھے اور تیسرا ٹاٹ جسے ہم نے اپنے نیچے لمبے رُخ بچھایا ہوا تھا، نکال کر باہر دے دیا اور اقبال کے شعر کا یہ مصرع حالتِ حاضرہ کی نسبت سے تبدیلی کے ساتھ "ہو ہاتھ کا سرہانہ، ٹاٹ کا ہو بچھونا" پڑھ کر لیٹ گئے۔ اس کے بعد کسی پہر ہمیں کمبل تو دیئے گئے مگر نہیں معلوم کہ کب!

## پوچھ گچھ کا آغاز

ہم کروٹیں لے رہے تھے کہ کسی نے حوالات کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا کہ قدیر کون ہے؟ باہر نکل! اُس وقت پتہ چلا کہ دو کمبل بھی مل گئے ہوئے ہیں۔ قدیر صاحب کو باہر لے گئے اور ہم قدیر صاحب کے لئے دعائیں کرتے ہوئے پھر

لیٹ گئے۔ یہ اندازاً ڈیڑھ دو بجے رات کا وقت ہوگا اور تیسرا موقع تھا کہ قدیر صاحب کو بلایا گیا تھا: پہلی دفعہ اُس وقت جب ہم دن کے بارہ بجے یہاں لائے گئے تھے اور ڈی ایس پی صاحب نے انہیں دفتر میں ہی روک کر پوچھ گچھ کی تھی۔ پھر سہ پہر چار بجے کے قریب بھی قدیر صاحب کو بلایا گیا تھا۔ خیر تھوڑی دیر بعد قدیر صاحب واپس آ گئے تو ہم پھر سو گئے۔ صبح نماز سے کچھ پہلے اس آواز کے ساتھ بیدار ہوئے کہ اوئے قدیر کیہڑا اے! باہر نکل۔ پھر قدیر صاحب کو لے گئے، اس کے بعد ہم تینوں اُٹھے اور نماز فجر ادا کی۔ اس کے ساتھ ہی ایک سپاہی نے حاذق صاحب اور نثار کو طلب کیا چنانچہ یہ دونوں دوست بھی چلے گئے تو میں اکیلا یہ دعا کرنے لگا:

اَللّٰھُمَّ اَیِّدھُم بِرُوحِ القُدُس ، اَللّٰھُمَّ اَیِّدھُم بِرُوحِ القُدُس، اَللّٰھُمَّ اَیِّدھُم بِرُوحِ القُدُس

## میری باری

دن چڑھنے لگا تو قدیر صاحب واپس آ گئے اور اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہنے لگے کہ یہ تو مارتے بھی ہیں ابھی ان کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ میرے نام بھی پروانہ آ گیا۔ چنانچہ مجھے تھانہ کے دفتر میں لے جایا گیا۔ میں زیر لب دعائیں کر رہا تھا کہ اے اللہ! ہمیں صبر و استقامت اور ثبات قدم عطا فرما، ہمیں ہر قسم کے تشدد کو پوری بشاشت اور ہمت کے ساتھ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمانا، آمین۔ میں جب دفتر میں پہنچا تو مجھے ریکارڈ روم میں لے جایا گیا جہاں ایک شخص درمیان میں بچھی ہوئی چارپائی پر کمبل کی قسم کا کوئی کپڑا اوڑھے سو رہا تھا۔ مجھے ساتھ لانیوالے سپاہی نے اُس سوئے ہوئے شخص کو حوالات کی چابیاں دیں، اُس نے کپڑے کے نیچے سے اپنا منہ نکال کر مجھے دیکھا اور چابیاں سنبھالتے ہوئے مجھے مخمور اور تحکمانہ لہجے میں کہا کہ ”کھونجے ہو کے بیٹھ اوئے“ مجھے اس کی سمجھ نہ آئی۔ میں اس کے قدموں کی طرف کھڑا تھا، وہیں بیٹھنے لگا تو اس پر وہ بڑے ہی کرخت لہجے میں بولا: ”نکر وچ بیٹھ اوئے“ یعنی کونہ میں ہو کر بیٹھو! میرے پیچھے ایک پرانا سا یاماہا موٹر سائیکل کھڑا تھا چنانچہ میں وہاں سے ہٹ کر موٹر سائیکل اور دیوار کے درمیان فرش پر بیٹھ گیا۔ میں زیر لب دعائیں کرتا جا رہا تھا کہ اے اللہ! ہمیں استقامت اور بشاشت عطا کریو۔ مجھے خوب یاد ہے میں پورے اعتماد کے ساتھ یہاں بیٹھا تھا۔ اس دوران میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو ایک کونے میں نیلے روغن والا ایک ڈبہ اور برش بھی پڑا تھا غالب خیال ہے کہ یہی وہ رنگ اور برش تھا جن سے حملہ آوروں نے ہماری مسجد سے کلمہ طیبہ مٹایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُن حملہ آور ”مجاہدین“ کے خون اور مٹی کا مرکب بھی ایک ٹھیکری میں پڑا تھا جس کے پاس ہی تین جوڑے جوتیوں کے بھی پڑے تھے جنہیں یہ ”مجاہدین“ مسجد میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ میں یہاں فرش پر کافی دیر بیٹھا رہا اور ماحول کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ متواتر دعائیں کرتا رہا۔ پھر

دوسرے کمرے سے کرخت آواز آئی کہ اسے چھوڑ آؤ، اُسے لے آؤ اور اس کے ساتھ ہی اس کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی سپاہی نمودار ہوا جو مجھے حوالات سے لایا تھا۔ اُس نے مجھے باہر آنے کو کہا، میں اُٹھ کر تھانہ کے دفتر والے بڑے کمرے میں آ گیا۔ یاد رہے کہ مجھ سے پہلے حاذق صاحب کا بیان لیا جا رہا تھا۔ وہاں سامنے منشی صاحب کی جگہ کے ساتھ کونے میں صدر جماعت چک 99/6R محترم چوہدری محمد اسحاق صاحب کو بیٹھے دیکھا۔ میں نے سمجھا کہ یہ نمبردار اور علاقہ کی بااثر شخصیت ہونے کے ناطہ ہمیں چھڑانے کے لئے آئے ہیں۔ اُس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ چوہدری صاحب موصوف بھی ہماری طرح ہی یہاں لائے گئے ہیں۔ خیر میں اُس بڑے کمرے سے ہو کر ایس ایچ او آفس میں لایا گیا جہاں شمالی دیوار کے ساتھ سفید بالوں والا پکی عمر کا بھاری بھرکم ایک پولیس افسر بیٹھا تھا۔ بعد میں تعارف پر اُس کا نام محمد افضل خاں معلوم ہوا۔ یہ سب انسپکٹر تھا اور بقول خود ملتان سے اس تفتیش کے لئے بلایا گیا تھا۔

میرا بیان

اب یہ خاں صاحب تھے اور میں تھا۔ میرے پیچھے وہی سپاہی آ کر کھڑا ہو گیا جو ہمیں لا اور لے جا رہا تھا۔ میں نے اس کے رویہ سے یہ اندازہ لگایا کہ اس سپاہی کے یہاں موجود ہونے کی غرض دورانِ بیان مارنا پیٹنا اور کراری قسم کی گالی گلوچ سے تواضع کرنا تھی۔ گویا 'زورِ بازو' اور 'زورِ زباں' کے بل بوتے پر اپنی مرضی کا بیان حاصل کرنا تھا۔ میں وہاں اپنا وجود خدا کے حوالہ کر کے کھڑا تھا کہ جو کچھ بھی ہو بہر حال سہنا پڑے گا یہی وجہ تھی کہ میں مار پیٹ سے بالکل بے فکر تھا۔ اگر مارا پیٹا جاتا تو وہ میری توقع کے عین مطابق ہوتا لیکن اللہ کا کچھ ایسا فضل ہوا کہ دو تین بار موقع پیدا ہونے کے باوجود مجھے یہ ہاتھ تک نہ لگا سکے۔ فَالحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِی عَصَمَنِی مِنْ کُلِّ شَرٍّ۔

جب سوال وجواب شروع ہوئے تو افضل خاں نے پہلے مجھ سے میرے ذاتی کوائف پوچھے۔ نام، ولدیت، قوم، سکونت، تعلیم، ملازمت، تنخواہ، بھائیوں کے کوائف اور یہ کہ وہ کہاں ہیں؟ غرضیکہ ہمارے خاندان کے جملہ حالات پوچھ کر پھر کہا کہ اب بتاؤ واقعہ کیا ہوا؟ میں نے کہا میں سویا ہوا تھا، دھماکہ کی آواز سن کر باہر آیا تو کچھ نہ تھا (میری مراد تھی کہ سب کچھ ہو چکا تھا)۔ اِس پر مجھے غلیظ قسم کی گالی نکال کر کہنے لگا ''تو یہاں آیا کیا کرنے ہے؟ وڈا گواہی دین آیا اے''۔ جب اُس نے مجھ سے گواہی کی بات کی تو میں نے کہا کہ 'میں تو گواہ تھا ہی نہیں مجھے تو قاضی صاحب یہ کہہ کر لائے تھے کہ وقوعہ کے بعد کے واقعات تو بتاؤ گے'۔ پھر تھوڑی دیر بعد مجھ سے دوبارہ پوچھ گچھ شروع کی اور پوچھا کہ اُس وقت تم کہاں تھے؟ میں نے پھر کہا میں اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا، پوچھا پھر کیا ہوا۔ میں نے کہا، میں نے پٹاخے کی آواز سنی۔ اس پر وہ چیخ پڑا کہ ''اوتھے وخت پے گیا تے توں کہندا ایں کہ پٹاخے چلّے'' (میرے منہ سے پٹاخے

کے الفاظ اس وجہ سے نکلے تھے کہ عزیزم عبدالقدیر اور نثار نے یہ بتایا تھا کہ جب رانا صاحب نے ہوائی فائر کیا تو اس وقت ان 'مجاہدین' نے کہا تھا کہ یہ پٹاخے ہیں ان سے نہ ڈرو آگے بڑھو اور اپنا کام کرو) اُس موقع پر بھی مارنے کو وہ سپاہی کودا مگر مار نہ سکا نہ معلوم کس وجہ سے۔ پھر میں نے کہا کہ مجھے بندوق چلنے کی آواز آئی تو میں اُٹھ کر باہر آیا تو وہاں کچھ نہ تھا (میری مراد یہ تھی کہ کوئی ہنگامہ نہ تھا) اس پر وہ تھانیدار بڑے زور سے بولا ''اوئے او تھے دو بندے مر گئے تے توں کہندا ایں کہ کجھ نئیں سی''۔ میں نے کہا میرا مطلب ہے کہ وہ بھاگ چکے تھے۔ اِس پر وہ پھر سخت لہجہ میں بولا کہ ''اوئے توں اوس جگہ توں کتنی دُور سُتّا پیا سی'' (تم کتنی دور سوئے ہوئے تھے) میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کہنے لگا ''اوئے کِنّے گز 50 یا 60 کِنّی دُور''۔ ''میں تصور میں گزوں کا حساب لگانے لگا تو اتنے میں پولیس وردی میں ملبوس گورے رنگ کے ایک صاحب آئے اور ایس ایچ او والی کرسی پر بیٹھ گئے اور میرے متعلق ہدایت کی کہ اسے فوراً دوسرے کمرے میں لے جاؤ گویا وہ کوئی خفیہ بات کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اس سپاہی کے مارنے سے بچ گیا جو میرے پیچھے کھڑا تھا اور مجھے مارنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے دوبارہ واپس لایا گیا۔ اس وقت قاضی ایاز صاحب بھی وہاں موجود تھے اور میرا بیان اس دفعہ قدرے سکون کے ساتھ قلمبند کیا گیا۔ میں نے بتانا شروع کیا کہ میں اپنے گھر سے مسجد میں آیا تو...... اتنا کہا تھا کہ میری بات کاٹتے ہوئے پوچھنے لگا ''اس وقت آپ کی جماعت کے کون کون سے لوگ تھے؟'' میں نے اس وقت تو غور سے نہیں دیکھا تھا کہ کون کون تھے تاہم میں نے قدیر حاذق اور نثار کے نام بتائے جن کے متعلق اس وقت مجھے یاد تھا نیز رانا صاحب کے متعلق بتایا کہ یہ اس وقت مسجد کے صحن کے درمیان بندوق لئے کھڑے تھے۔ پھر پوچھنے لگا کہ یہاں آکر تم نے کیا کیا؟ میں نے کہا میں بھی باہر نکلا اور دیکھا کہ تین چار آدمی مشن چوک کی طرف بھاگے جا رہے ہیں اور وہ ہوٹلوں کے قریب کھڑے رکشوں تک نظر آئے۔ پھر میں نے حاذق و نثار کو میاں عاشق صاحب کے گھر بھیجا تا کہ وہ امیر صاحب کو فون کر کے اطلاع کریں اور بعد میں قدیر کو حسین بخش کالونی بھیجا۔ پوچھنے لگا پھر کیا ہوا؟ میں نے کہا میں نے دروازہ بند کر لیا اور مسجد کے صحن میں ہی رہا۔ پھر کچھ دیر بعد ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب آئے اور مجھ سے واقعہ کی تفصیل پوچھ کر رپورٹ لکھوانے تھانہ چلے گئے اور بعد ازاں پولیس آ گئی۔ اس پر میرا بیان ختم ہوا۔ بیان کے دوران کسی موقع پر افضل خان نے مجھے یہ الفاظ بھی کہے کہ ''اوئے یاد رکھ میں تینوں ایسا ٹنگاں گا کہ تُوں یاد رکھیں گا، ایس لئے صحیح صحیح گل دس دے۔'' میں نے کہا کہ مجھے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں! مجھے خوب یاد ہے کہ جب اس نے یہ الفاظ کہے اُس وقت اس کا لہجہ بڑا ہی دُرشت اور خوفناک تھا۔ مگر اس وقت میری حالت اس کے بالکل برعکس تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بڑے اعتماد کے ساتھ کھڑا رہا اور میرے ذہن

پر اس کی اس خوفناک دھمکی کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ یہ محض اور محض خدا کا ہی فضل تھا۔ اس کے بعد وہی سپاہی مجھے دفتر سے لے کر باہر آیا تو دیکھا کہ سورج نکل چکا تھا اور قریباً آٹھ بجے کا وقت تھا۔ عین اُس وقت چوہدری اسحاق صاحب کو تھانہ کے دفتر کے دوسرے دروازہ سے نکال کر ایک اور سپاہی اُسی بارک کی طرف لے جا رہا تھا جس میں ہم گذشتہ رات دس گیارہ بجے تک رہے تھے۔ ہمارا Cross ہوا تو میں نے اس خیال کی بناء پر کہ چوہدری صاحب ہمارے لئے آئے ہیں، ان سے بات کرنی چاہی تو چوہدری صاحب نے چلتے چلتے بس ہاتھ سے اشارہ ہی کیا۔ اس کے بعد مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا جہاں تینوں ساتھی حاذق، نثار اور قدیر موجود تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے واقعات سنائے اور میں نے بھی ان کی طرح اُنہیں اپنے بیان کی تفصیلات بتائیں۔ حاذق صاحب کے بیان کے مطابق انہیں تھپڑ اور سوٹیاں مارنے کے علاوہ ٹانگوں کو چوڑا کرا کے ہاتھ اوپر کرائے رکھے تا کہ کچھ 'مفید مطلب' باتیں اُگلوا سکیں مگر کوئی بات ہوتی تو کہتے، ان جھوٹوں کی طرح تو ہم جھوٹی کہانیاں بنانے سے رہے۔

## تفتیشی ٹیم میں تبدیلی

جب وقوعہ ہوا تو تھانیدار جناب قاضی ایاز احمد صاحب نے معمول کے مطابق تفتیش شروع کی۔ موصوف شکل وصورت سے بھی شریف انسان لگتے تھے اور اپنے عمل سے تو بہر حال انہوں نے اپنی دیانتداری کا ثبوت دیا جیسا کہ اوپر ذکر گزر چکا کہ وقوعہ سے ایک ماہ قبل انہوں نے مولویوں سے کہا تھا کہ اگر میں نے وردی پہن ہی لی ہے تو اتنا کافر ہو گیا ہوں کہ کلمہ مٹاتا پھروں اور پھر اب کے بھی انہوں نے بحیثیت متعلقہ تھانیدار اس واقعہ کی ابتدائی کارروائی کے طور پر جو کچھ کیا وہ سب حقیقت پر مبنی تھا مثلاً مقدمہ کی نہایت اہم اور بنیادی دستاویز ''نقشہ موقع ملاحظہ'' پورے طور پر درست بنا ڈالا جو ''علمائے دین'' اور حکام بالا کو کسی قیمت پر منظور نہ تھا۔ اُن کی اِس ''حرکت'' کے بعد حکام کو اُن پر اعتبار نہ رہا اور یہ خطرہ محسوس کرنے لگے کہ آئندہ نہ جانے یہ تھانیدار کتنی سچی باتیں یا حرکتیں کر جائے! چنانچہ اس کا صلہ انہیں یہ دیا گیا کہ راتوں رات انہیں اس ڈیوٹی سے ہٹا کر نئی تفتیشی ٹیم مقرر کر دی گئی جس کا سربراہ تھانہ نور شاہ کے ایس ایچ او (SHO) ملک تصدق کو مقرر کر دیا گیا۔ اُس ایس ایچ او نے تفتیش کا رُخ اپنے آقاؤں کی منشاء اور مرضی کے مطابق موڑنے کی پوری کوشش کی اور زبردستی مدعی بن جانے والوں کی ہر طرح سے ناجائز مدد کی اور ہمیں جس قدر نقصان پہنچایا جا سکتا تھا پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ اُس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

## دو مزید احباب کی گرفتاری

اِسی دوران باہر سے ہمیں ناشتہ بھیجا گیا۔ ہم نے رانا صاحب جو اُس وقت تک ہمارے ساتھ نہ تھے کو بھی ناشتہ کرایا

اور خود بھی کیا۔ اس کے قریباً آدھ پون گھنٹے کے بعد اچانک ہمارے حوالات کا دروازہ کھلا اور ہماری آنکھوں نے عجیب نظارہ دیکھا کہ افراتفری کے عالم میں تھانہ کے کسی کمرے سے لا کر چوہدری محمد اسحاق صاحب نمبردار وصدر جماعت 99/6R اور ساہیوال جماعت کے ایک بزرگ سابق انسپکٹر پولیس محترم ملک محمد دین صاحب کو بھی اندر دھکیل دیا گیا۔ ہم دیکھتے ہی رہ گئے کہ یہ کیا ہوا ہے! پھر ایک آدمی نے ہمیں آ کر کہا کہ اپنی چیزیں درست کر لو لیکن ہمارے پاس چیزیں تھیں ہی کونسی جنہیں درست کرتے بہرحال ہم نے کمبل اور ٹاٹ درست کر لئے۔ اس نادر شاہی حکم کی وجہ ہمیں 9 بجے کے قریب اُس وقت معلوم ہوئی جب ہمارے حوالات کے بالکل ساتھ والا مین گیٹ اچانک کھلا اور یکدم ایک افسر چار پانچ آدمیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا اور ہمارے نام پوچھنے لگ گیا۔ جب سب کے نام پوچھ لئے تو ان آدمیوں میں سے ایک نے کہا وہ لمبا مونچھوں والا بھی؟ تو اُس افسر نے جواب دیا فکر نہ کرو، وہ بھی آ جائے گا۔ اس کے بعد یہ سب لوگ چلے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ افسر موصوف AC ساہیوال تھے اور اُن کے ساتھ مقدمہ کے چار گواہ اور ایک بدنام قسم کا پیشہ ور وکیل عبدالمتین چوہدری تھا جو دراصل اس لئے آئے تھے کہ ہمارے چہروں سے واقف ہو جائیں اور بعد میں پہچاننے میں مشکل نہ ہو۔ (عبدالمتین چوہدری نامی وکیل اسی قسم کے حالات و معاملات کی تلاش میں ہی رہتا اور جب بھی اس قسم کی کوئی صورت پیدا ہوتی تو فوراً کوئی فورم بنا کر اُس کا کرتا دھرتا بن کر خوب کمائی کر لیتا۔ اب بھی راتوں رات مجلس تحفظ ختم نبوت ساہیوال کا جنرل سیکرٹری بن گیا اور مولویوں کو اپنے پیچھے لگا کر خوب کمائی کر گیا) اس کے بعد ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا کہ ہم دیر تک دم بخود بیٹھے رہے۔ کوئی چاہتا تو آہستہ آہستہ بات کر لیتا کیونکہ یہ سب کچھ ہمارے لئے نہ صرف نیا تھا بلکہ ہم میں سے کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا ہو گا۔

## حوالات کی حالت

جس جگہ ہمیں بند کیا گیا، وہ تھانہ کے بڑے بیرونی دروازے کے پہلو میں قریباً 30/35 فٹ لمبا اور 10 فٹ چوڑا کمرا تھا۔ اس کی تین اطراف مضبوط دیواروں سے بنی ہوئی تھیں اور سامنے خوفناک آہنی سلاخیں تھیں، یہ مستطیل کمرا حوالات کہلاتا ہے۔ مقدمہ قائم ہونے کے بعد جیل بھیجنے سے پہلے تک زیرِ تفتیش ملزموں کو یہاں حراست میں رکھا جاتا ہے۔ یوں تو اس کے سامنے کی طرف موٹی موٹی آہنی سلاخیں ہی کسی شریف آدمی کو وحشت زدہ کرنے کے لئے کافی تھیں مگر جب اس کے شمالی جانب قائمہ زاویہ میں بمشکل ایک میٹر اونچی دیوار بنا کر Toilet میں تبدیل کی گئی چھوٹی سی جگہ میں جانا پڑا تو ہمیں شدید قسم کے جھٹکے کے ساتھ ایک مرتبہ پھر احساس ہوا کہ ہم کہاں پر ہیں۔ یہاں گند کے ساتھ گندی قسم کے کیڑوں کی تہہ بھی جمی ہوئی تھی۔ ہمیں ننگے پاؤں اس غلیظ بیت الخلاء میں جانا پڑتا اور انہی پیروں سے ''شاہی

کمبلوں'' پر آ کر بیٹھنا، لیٹنا اور سونا ہوتا تھا کیونکہ ہماری جوتیاں حوالات سے باہر ہی اُتروا لی گئی تھیں۔ شروع میں تو کافی وقت کا سامنا رہا مگر بعد میں ہم اس کے عادی ہو گئے نیز ہمیں ایک عدد چپل اندر رکھنے کی بھی اجازت مل گئی تھی۔ یہاں دو گھڑے پڑے تھے جن میں صبح سویرے ایک ماشکی آ کر ہمارے ہر قسم کے استعمال کے لئے پانی ڈال دیتا۔ بعد میں حوالات کے ''آثارِ قدیمہ'' سے ایک تیسرا گھڑا بھی دریافت ہو گیا۔ ہم اسے بھی بھروا لیتے رہے اور بیت الخلائی استعمال کے لئے پانی اس میں سے لیتے۔

## شہر کے حالات

حیرانی اور تعجب کے عالم میں کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟ ایک دوسرے کو اپنے اپنے چشم دید واقعات دبی آوازوں میں سناتے سناتے اور وقت کو دھکا دیتے ہوئے ہم دوپہر تک جا پہنچے۔ پولیس والے بڑی شد و مد کے ساتھ تھانہ میں آ جا رہے تھے، جیپیں اور موٹر سائیکل بھی آ جا رہے تھے کیونکہ آج ساہیوال میں ہڑتال کروائی جارہی تھی اور نام نہاد مجلس ختم نبوت والے جلوس بھی نکال رہے تھے، اس اعتبار سے آج کا دن خاصا اہم تھا۔ ہمیں شہر میں بسنے والے احمدیوں کے جان و مال اور گھروں کا بہت فکر تھا کیونکہ اِن نام نہاد مسلمانوں کے سابقہ کارنامے اور تاریخ ہمارے سامنے تھی۔ ہمارے جتنے مرضی آدمی مارے جائیں کچھ نہیں ہوتا لیکن انہیں معمولی سی رگڑ بھی لگ جائے تو قیامت آ جاتی ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام　　　وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اور اب جبکہ اُن کے دو ''مجاہدین'' (اگرچہ کلمہ طیبہ مٹاتے ہوئے ہی) مارے گئے تھے تو ان کے منہ جھاگ سے بھرنے ہی تھے تاہم اللہ تعالیٰ بھی آسمان سے تدابیر کر رہا تھا چنانچہ اس نے اپنے فضل سے ہمارے اس قسم کے خدشات کو دور فرما دیا، الحمد للہ۔

اگرچہ ہم حوالات میں تھے مگر مختلف ذرائع سے باہر کی دُنیا سے بھی کسی حد تک باخبر تھے۔ چنانچہ موصولہ اطلاعات کے مطابق جمعہ کا دِن اور پھر پورا ہفتہ پُر ہَول اور پُر خطر خدشات کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل سے بخیریت گزر گیا۔ دُشمن کا سارے ملک اور خصوصاً ساہیوال میں کسی بھی احمدی کے جان و مال کو نقصان نہ پہنچا سکنا ہمارے لئے بالکل غیر متوقع تھا۔ یہ کیسے ہوا؟ اِس کا علم اُس وقت ہوا جب ہم نے اپنے اس واقعہ کے فوراً بعد والا حضور اقدس رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ خطبہ جمعہ سنا جس میں آپ نے جماعت کو بتایا کہ:

جن دنوں پاکستان کے حالات کی وجہ سے بعض شدید کرب میں راتیں گزریں تو صبح کے وقت الہاماً بڑی

شوکت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "السلام علیکم" اور ایسی پیاری ایسی روشن آواز تھی اور آواز مرزا مظفر احمد کی معلوم ہو رہی تھی یعنی بظاہر جو میں نے سنی آواز اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے کمرے کی طرف آتے ہوئے السلام علیکم کہتے ہوئے باہر سے ہی شروع کر دیا السلام علیکم کہنا اور اندر داخل ہونے سے پہلے السلام علیکم کہتے ہوئے آنے والے ہیں۔ تو اس وقت تو خیال بھی نہیں تھا کہ یہ الہامی کیفیت ہے کیوں کہ میں جاگا ہوا تھا پوری طرح لیکن جو ماحول تھا اس وقت اس سے تعلق کٹ گیا تھا۔ چنانچہ فوراً میرا ردعمل ہوا کہ میں اُٹھ کر باہر جا کر ملوں ان کو اور اسی وقت وہ کیفیت جو تھی وہ ختم ہوئی اور مجھے پتہ چلا کہ یہ تو خدا تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ السلام علیکم کا وعدہ دیا ہے بلکہ ظفر کا وعدہ بھی ساتھ عطا فرما دیا ہے کیونکہ مظفر کی آواز میں "السلام علیکم" پہنچانا یہ ایک بہت بڑی اور دوہری خوشخبری ہے اور پہلے بھی ظفر اللہ خاں ہی خدا تعالیٰ نے دکھائے اور دونوں میں ظفر ایک قدرِ مشترک ہے۔

تو اس لئے میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں، یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ظلم کی آگ بھڑکانا بند کر دیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام کے مخالفین نے ظلم کی آگ بھڑکانی بند تو نہیں کی تھی بھڑکانے کے نتیجہ میں خدا نے فرمایا تھا یٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (الانبیاء:۷۰) چنانچہ آگ شاید اور بھی بھڑکائیں لیکن یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ آگ اسی طرح آپ کی بھی غلام ہوگی جیسے مسیح موعود علیہ السلام کی غلام بنائی گئی تھی اور خدا تعالیٰ کی سلامتی کا وعدہ آپ کی حفاظت فرمائے گا۔ بالکل بے خوف ہوں اور شیروں کی طرح غراتے ہوئے اس میدان میں آگے سے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس الہام کے بعد مجھے کامل یقین ہے ایک ذرہ بھی اس میں شک نہیں، سارے میرے خوف خدا نے دور فرما دیئے ہیں اور میں کامل یقین رکھتا ہوں کہ یہ چند مولویوں کی لعنتیں کیا چیز ہیں ساری دنیا کی زمین اگر لعنتیں ڈالیں گے، کروڑوں اربوں لعنتیں بھی اگر زمین سے اُٹھیں گی تو خدا کی قسم زمین کی لعنتیں آپ کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکیں گی۔ میرے خدا کا ایک سلام ایسی قوت رکھتا ہے کہ ساری لعنتیں اس سے ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جائیں گی اور ناکام اور نامراد ہوں گی۔

خدا کی آواز میں السلام علیکم جماعت کو میں پہنچانا چاہتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ یہ سلامتی آپ کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ کوئی نہیں جو اس سلامتی کو مٹا سکے۔ یہ کیا چیز ہیں ان کی گالیاں کیا چیز ہیں؟ ان کا ایک

ہی جواب ہے پہلے سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آپ آگے بڑھیں، زیادہ شان کے ساتھ اسلام کا قافلہ شاہراہِ غلبۂ اسلام پر آگے سے آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہ شور وغوغا، یہ تو قافلوں کے مقدر میں لکھا ہوا ہے، ان کی آوازیں بے معنی اور حقیر ہیں اور یہ پیچھے رہ جانے والی آوازیں ہیں۔ ہر منزل پر نئے شور آپ سن سکتے ہیں لیکن ہر منزل کے شور مچانے والے پیچھے رہتے چلے جائیں گے۔ ایک ہی علاج ہے کہ اپنی رفتار کو تیز سے تیز تر کردیں یہاں تک کہ ان کا شور وغوغا آپ کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔ اس تیزی کے ساتھ غلبہ اسلام کی شاہراہ پر آگے بڑھتے چلے جائیں کہ دیکھتے دیکھتے وہ وعدہ جو اس آیت میں کیا گیا ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ آپ کے ذریعہ ہاں آپ کے ذریعہ وہ دن ہم اپنی آنکھوں کے ساتھ اُبھرتا ہوا دیکھیں، وہ سورج اپنی آنکھوں کے سامنے اُبھرتا ہوا دیکھیں کہ اسلام سارے ادیان پر غالب آچکا ہو اور میرے آقا ومولا آپ کے آقا ومولا ہمارے آقا ومولا حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا پر غالب آچکے ہوں۔ ایک ہی خدا ہو اور ایک ہی رسول ہو اور ایک ہی راجدھانی ہو اور وہ اسلام کی راجدھانی ہو۔ (آمین)[1]

حوالات میں پہلی شب جو تھوڑی بہت آنکھ لگی تو اُس دوران خاکسار نے بھی خواب دیکھا کہ صبح اخبار آیا ہے اور ہم سب بڑھ چڑھ کر اپنے اِس واقعہ کی خبر تلاش کرتے ہیں مگر خبر نہیں ملتی۔ چنانچہ عجیب اتفاق ہوا کہ صبح ناشتہ کے بعد تھانہ کے گیٹ پر متعین سنتری کے پاس اخبار دیکھ کر ہم نے اسے کہا کہ ذرا دکھاؤ تو اس نے ہمیں اخبار دے دیا۔ ہم نے جلدی جلدی اس پر نظریں دوڑائیں مگر اس میں خلافِ توقع ہمارے اس واقعہ کی محض ایک چھوٹی سی خبر تھی جو نہ ہونے کے برابر تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس واقعہ کے فوراً بعد ملکی اخبارات کے سربراہوں کو اعلیٰ حکام نے بلا کر یہ پیغام دیا تھا کہ جس اخبار نے یہ خبر دی وہ اپنا اخبار بند سمجھے۔ یہ امر قابل غور وفکر ہے کہ ایسا کیوں کہا گیا۔ یقیناً اسی لئے کہ یہ سب دم بخود اور حیران وپریشان تھے کہ خبر دیں تو کیا دیں!؟ کلمہ مٹانے گئے اور قتل ہو گئے!! فاعتبروا یا اُولی الابصار۔

## مکرم رانا نعیم الدین صاحب پر تشدد

حوالات میں پہلے روز دو پہر ہوئی اور کھانا آیا تو ساتھ ہی محترم رانا نعیم الدین صاحب کو بھی لا کر حوالات میں ہمارے ساتھ بند کر دیا گیا۔ آپ کو ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں جنہیں اندر آ کر کھول دیا گیا۔ آپ اُس وقت خاصے شکستہ حال نظر

---

[1] خطبہ جمعہ ۱۶ر نومبر ۱۹۸۳ء بحوالہ خطبات طاہر جلد ۳ صفحہ ۶۸۱، ۶۸۲

آرہے تھے۔ آپ نے بتایا کہ انہیں رات دو بجے کے قریب کسی دوسرے تھانے لے گئے تھے اور وہاں انہیں تشدد کے ذریعہ اپنے مطلب کی باتیں کہنے پر مجبور کرتے رہے۔ ان کے جسمانی حالت سے بخوبی علم ہو رہا تھا کہ کافی تشدد کیا گیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ان سے جو باتیں کہلوانے یا اُگلوانے کی کوشش کرتے رہے وہ مندرجہ ذیل تھیں۔

۱۔ میاں محمد عمر صاحب (ریٹائرڈ PDSP) اور ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب (امیر جماعت) بھی وقوعہ کے وقت وہاں موجود تھے۔

۲۔ انہوں نے ہی تمہیں فائر کرنے کو کہا۔

۳۔ ان کی میٹنگز میں کیا فیصلے یا باتیں ہوتی تھیں۔

۴۔ حضرت صاحب کا نظامِ حفاظت کیا ہے۔

۵۔ سلسلہ کا نظام کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

رانا صاحب نے بتایا کہ ان کا اندازہ ہے کہ انہیں تھانہ صدر واقع سیٹلائیٹ ٹاؤن لے جایا گیا تھا جہاں بید اور مخصوص قسم کے چھتروں کے ساتھ ان پر تشدد کیا گیا۔ علاوہ ازیں ٹیکے لگانے اور چیرے دینے کی دھمکیاں دیتے رہے اور اس بات پر بھی مجبور کرتے رہے کہ تم کہو 'میں نے فائر نہیں کئے'، 'تم کیوں مانتے ہو'، 'تم بھاگ کیوں نہیں گئے؟' وغیرہ۔ ایسی باتیں کہنے پر مجبور کرتے رہے جن سے پولیس کو مدد مل سکے اور وہ جماعتی عہدیداروں کو گرفتار کر سکے نیز اپنی FIR کے مطابق تفتیش کو چلا سکے۔ اسی طرح ایک روز مغرب کی اذان کے وقت تفتیشی افسران پھر رانا صاحب کو نکال کر لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد تھانہ کے دفتر کی طرف سے چیخوں اور آہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ چھانٹے کی طرح بید لگنے کی آوازیں بھی آتی رہیں، ظاہر ہے کہ رانا صاحب پر تشدد ہو رہا تھا۔ ہم سب فکرمندی کے ساتھ رانا صاحب کے لئے دعائیں کرنے لگ گئے۔ پُردرد آوازوں کا سلسلہ کافی دیر جاری رہا۔ پھر اچانک افسران کو افراتفری میں تھانہ سے باہر جاتے دیکھا اور ساتھ ہی آوازیں بند ہوگئیں اور کچھ دیر میں رانا صاحب بھی واپس حوالات میں بھیج دیئے گئے۔ واپس آکر رانا صاحب نے بتایا کہ ان کے ٹخنوں اور گھٹنوں پر بید مارتے ہوئے اپنی مرضی کی باتیں مجھ سے کہلوانے کی کوشش کرتے رہے۔ علاوہ ازیں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دینے کی دھمکیاں دیتے رہے اور آخر میں ان کی ٹانگوں کو قینچی بنا کر درمیان میں ایک چھڑی اٹکا دی اور اس حالت میں انہیں باندھنے لگے تھے کہ غیبی مدد فون کی گھنٹی بجنے کی صورت میں ظاہر ہوئی اور انہوں نے فون سنا تو انہیں چھوڑ کر باہر کہیں جانا پڑ گیا۔ تاہم جاتے جاتے کہہ گئے کہ "باقی خبر بعد میں آکر لیتے ہیں اور ہماری واپسی تک تم فیصلہ کر لو کہ ہمیں یہ باتیں بتانی ہیں یا نہیں!"

رانا صاحب کے ساتھ اس ظالمانہ سلوک کا ہم سب پر بھی بہت اثر ہوا چنانچہ ہم سب نے رانا صاحب کے لئے خوب دعائیں کیں۔ رَبِّ اِنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ . . . چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہم مغلوب بندوں کی دعاؤں کو قبول فرمایا اور باقی رات خیریت سے گزار دی اور وہ ظالم اپنی دھمکی کے مطابق رانا صاحب کو دوبارہ لینے نہ آئے۔

## حوالات میں وقت گزاری

بس اسی خوف وہراس کے عالم میں وقت گزرتا رہا۔ فجر کی نماز ادا کر کے لیٹ جاتے، ناشتہ آتا تو منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر لیتے اور اس کے بعد پولیس اہلکاروں کو آتا جاتا دیکھتے رہتے۔ ایک روز ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا اور نماز ظہر ادا کی تو اس کے بعد کوئی لیٹ گیا، کوئی بیٹھ گیا، کوئی چہل قدمی کرنے لگا۔ بہر حال ہر کوئی وقت گزارنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ کرنے لگا اور چونکہ ہر ایک پر تشویش کے ساتھ ساتھ تجسس کی کیفیت بھی طاری تھی، اس لئے تھوڑی دیر بعد آپس میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ محترم رانا صاحب بہت دُکھے ہوئے تھے، وہ ہمیں کہنے لگے دعا کرو، دعا کرو، ابھی پتہ نہیں کیا کیا ہمارے ساتھ انہوں نے کرنا ہے۔ اس پر سب اپنی اپنی جگہوں پر خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ چوہدری اسحاق صاحب نے یہ دعا یاد کروائی

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ جَھْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْکِ الشَّقَاءِ وَسُوْءِ الْقَضَاءِ وَشَمَاتَۃِ الْاَعْدَاءِ

ہم سب نے یہ دعا ترجمہ کے ساتھ یاد کر لی اور دوران اسیری اکثر و بیشتر اس کا ورد کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ چوہدری صاحب مرحوم کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ الغرض اسی طرح سہ پہر ہو گئی اور پھر رات چھا گئی۔ آج کا دن پولیس والوں کے لئے بے حد مصروف رہا اور تھانہ میں افسران کا ہر وقت آنا جانا لگا رہا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے آج ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔ نمازِ عشاء ادا کر کے ہم نے ٹاٹ اور کمبل درست کئے اور سونے کی کوشش میں لگ گئے۔ نوجوان تو بہت جلد نیند کی آغوش میں چلے گئے مگر ان بزرگان کی رات آنکھوں میں کٹی جنہیں ایسے حالات کا تجربہ تھا۔

اگلے روز صبح ہونے سے پہلے ہی ہم بیدار تھے۔ نمازِ فجر پڑھی اور پھر لیٹ گئے، کاروبارِ زندگی کا آغاز ہوا تو ناشتہ آ گیا۔ پھر یہ دوسرا دن بھی پہلے دن کی طرح گزرنا شروع ہوا اور ہم میں سے کسی کو بھی پولیس نے تفتیش کے لئے نہ بلایا اور یہ امر بالکل غیر متوقع تھا بلکہ اس کے برعکس قاضی ایاز احمد صاحب انسپکٹر نے آ کر تسلی دی کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ بہتر کر رہے ہیں اور جو خدا کر رہا ہے وہ بھی بہتر کرے گا۔ لیکن عجیب صورت یہ تھی کہ کوئی سپاہی واقف، ناواقف ہماری طرف ٹھیک طرح دیکھنے کو بھی تیار نہ تھا البتہ چوہدری اسحاق صاحب کے بعض غیر از جماعت واقف کار مثلاً ڈاکٹر غازی، شفقت رسول (ASI) اور اسلم زمیندارہ سپرے والا وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ ہمارے لواحقین میں سے کوئی بھی سوائے کھانا

لانے والے کے نہ آیا اور کھانا لانے والے کو بھی ہمارے ساتھ ملاقات کی اجازت نہ تھی تاہم آج کسی طرح برادرم ملک نعیم الدین صاحب نے اپنے ابا جان مکرم ملک محمد دین صاحب تک رسائی حاصل کر لی۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ ان کا بیٹا نعیم بتا رہا تھا کہ مولوی صاحب یعنی میرے ابا جان (مکرم محمد اسمٰعیل منیر صاحب) آ گئے ہیں۔ اس سے بڑی تسلی ہوئی کہ چلو طارق بیٹے کو تو سنبھال لیا ہوگا ورنہ اس نے کافی تنگ کرنا تھا۔ سوموار کی رات تک کوشش اور جدوجہد کی گئی کہ کسی طرح ابا جان کی ملاقات ہو جائے مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ چونکہ ابا جان منگل کو بچوں کو لے کر واپس ربوہ جا رہے تھے اس لئے آخری کوشش کے طور پر آپ سوموار کی رات اذانِ عشاء کے وقت تھانہ آ گئے اور دُور سے ہی آپ سے اس حال میں میری ملاقات ہوگئی کہ آپ باہر گیٹ میں کھڑے تھے اور میں حوالات کی سلاخوں کے اِدھر۔ غالباً اُسی وقت ملک نعیم الدین صاحب نے ہمیں کپڑے لا کر دیئے۔ جن میں میرا سویٹر اور گرم چادر بھی تھی۔ چادر نے خوب کام دیا اور ساری سردیاں بلکہ بہت دیر تک کام دیتی رہی۔

## تھانہ ملکہ ہانس

### ایک تھانہ سے دوسرے تھانہ!

دو تین دنوں میں حوالات تھانہ اے ڈویژن میں ہمارے معمولات ڈگر پر چل پڑے تھے۔ نمازیں پڑھنا، کھانا کھانا، لیٹنا، سونا، چہل قدمی کرنا، تھانہ کے دفتر پر پوری طرح نظر رکھنا کہ کون آ رہا اور کون جا رہا ہے، خاص طور پر تفتیشی افسر ملک تصدق پر ہماری نظر رہتی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہفتہ، اتوار، سوموار اور منگل کے چار دن گزار دیئے تاہم 30 اکتوبر بروز منگل کی شام ہونے سے پہلے ہی ہمیں پولیس کے تیور کچھ بدلے ہوئے محسوس ہونے لگے کیونکہ اُس روز غیر معمولی طور پر بظاہر بغیر کسی وجہ کے CIA سٹاف کا عملہ یہاں آیا تھا جس سے ہم بھانپ گئے کہ ہمارے ساتھ کچھ اور ہونے والا ہے۔ چنانچہ سب زیرِ لب خصوصی دعاؤں میں لگ گئے اور ہمارے تمام خدشات اُس وقت درست ثابت ہوئے جب شام ہوتے ہی حوالات کی سلاخوں کے ساتھ آ کر کھڑے ہونیوالے سپاہیوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیوں کی جھنکار سنائی دی اور ساتھ ہی ایک سپاہی نے کہا 'آؤ اِدھر'، اُس وقت ہم سب کو سپاہیوں نے سلاخوں کے باہر سے ہی ہتھکڑیاں لگائیں۔ ہم میں سے صرف رانا صاحب کو دونوں ہاتھوں میں لگائیں اور باقی سب کو ایک ایک ہاتھ میں یعنی ہتھکڑی کا ایک ایک سیٹ دو دو افراد کو لگایا گیا۔ ہم نے سمجھا شاید مقدمہ کی ذمہ داری کے حساب سے رانا صاحب کے

دونوں ہاتھوں میں لگائی گئی ہیں۔ یہ تو اُس وقت تک علم ہی نہ تھا کہ رانا صاحب کے ہاتھ میں تو مدعی پارٹی نے ڈنڈا تک نہیں پکڑایا۔

ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ہاتھوں کو دین محمد مصطفی ﷺ کی خاطر لوہے کا یہ زیور پہننا نصیب ہوا۔ گو اِس سے پہلے ہتھکڑی لگنے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اور معاشرتی طور پر اسے ہم بہت برا سمجھتے تھے مگر اِس وقت ایسا کوئی احساس نہ ہوا بلکہ ہر کسی نے خوشی سے ہتھکڑی لگوائی۔ زندگی کا یہ پہلا تجربہ بڑا خوشگوار محسوس ہوا، ہماری زبانوں پر اُس وقت یہ دعا تھی:

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْراً وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ[1]

ہمیں یقین تھا کہ اب ہمیں یہ جس جگہ لے جا رہے ہیں وہاں تشدد یا دیگر ذرائع سے تفتیش کریں گے، اِس لئے ہم اپنے جسموں کو کسی بھی قسم کے تشدد کے لئے بالکل تیار کئے ہوئے تھے اور ہمارے لبوں پر یہ دعا تھی کہ خدا ہمیں اِستقامت بخشے اور بشاشت کے ساتھ ہر قسم کے تشدد کو برداشت کرنے کی توفیق دے، آمین۔

ہتھکڑیاں لگانے کے بعد ہمیں حوالات سے نکالا گیا تو تھانہ کا بیرونی گیٹ بند تھا اور تھانہ میں کوئی غیر متعلق شخص موجود نہ تھا، بس ایک ٹویوٹا پک اپ موجود تھی جس میں ہمیں بٹھا دیا گیا۔ قاضی ایاز صاحب نے سپاہیوں سے کہا انہیں گن کر کمبل دے دو اور گن کر بوقت واپسی وصول کر لینا۔ چنانچہ سات کمبل ہمارے ساتھ ہی گاڑی میں رکھ دیئے گئے۔ پھر مسلح سپاہیوں نے ہمیں دھکیل دھکیل کر خود سوار ہونا شروع کیا جس کے نتیجہ میں ہم چھوٹی سی گاڑی میں اِس بری طرح Pack ہو کر رہ گئے کہ ہمارے لئے ہلنا جلنا تو دُور کی بات، سانس لینا بھی دُشوار ہو گیا۔ گاڑی کے اگلے حصہ میں ڈرائیور کے ساتھ انسپکٹر ملک تصدق اور سب انسپکٹر افضل خاں بیٹھے تھے۔ جب سب سوار ہو چکے تو گاڑی کا پچھلا پردہ گرا دیا گیا، تھانہ کا گیٹ کھلا اور گاڑی باہر نکل کر بائیں طرف مڑی اور پھر ہائی سٹریٹ پر آ کر شمالی جانب مڑ گئی۔ اُس وقت چوہدری اسحاق صاحب نے فوراً کہا کہ ''ملکہ ہانس''! لیکن دوسروں کا خیال تھا کہ ہمیں لاہور لے جائیں گے۔ قریباً آدھ گھنٹے کے بعد جب سفر کا اختتام ہوا تو مکرم چوہدری صاحب کی بات درست نکلی اور ہم تو تعمیر شدہ بڑے شاندار تھانہ ''ملکہ ہانس'' میں لا اُتارے گئے۔ (یاد رہے ''شاندار'' پچھلے تھانہ کے مقابلہ پر تھا) ہم وہاں پہنچے تو اذان عشاء کی آواز تھانہ کی مسجد سے بلند ہوئی۔ ہمیں گاڑی سے اُتار کر سیدھا تھانے کے حوالات میں بند کر کے سلاخوں کے باہر لکڑی کے کواڑ بھی بھیڑ دیئے گئے گویا ہم باہر دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی کوئی باہر سے ہمیں دیکھ سکتا تھا۔

---

[1] سورۃ البقرہ آیت: ۲۵۱

## تھانہ ملکہ ہانس کی حوالات

یہ تھانہ نوتعمیر شدہ تھا چنانچہ اس میں حوالات بھی جدید قسم کا تھا۔ قریباً 10 فٹ چوڑا اور 15 فٹ لمبا وہ کمرا جس میں ہمیں رکھا گیا خواتین کے لئے مخصوص تھا۔ اس کا گیٹ بھی نئی قسم کا تھا اور سب سے بڑی سہولت اس میں یہ تھی کہ یہاں فلش سسٹم والا بیت الخلاء تھا اور اس کے ساتھ علیحدہ غسل خانہ بھی اور ہر وقت ٹونٹی میں پانی بھی۔ سبحان اللہ! حوالات، پولیس اور یہ سہولتیں! ہمارے لئے یہ سب کچھ حیرانی کا باعث تھا۔ یہ سارا کمرا پختہ تھا، فرش دیواریں بہت اچھی اور پنکھا بھی لگا ہوا تھا اور سلاخوں کے باہر لکڑی کے کواڑ بھی تھے جنہیں پردہ کی خاطر بند رکھا جاتا تھا اور ہمیں انہی بند دروازوں کے پیچھے رکھا گیا تھا۔ یہاں بند ہونے کے بعد ہم نے سب سے پہلے کمبل بچھائے اور پھر کچھ دیر تک یونہی بیٹھے رہے پھر صورت حال کی اس تبدیلی پر اعلیٰ سطحی کمیٹی جو ہم ساتوں سینئر اسیر ممبران پر مشتمل تھی، غور کرنے لگی۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی کسی نتیجہ تک نہ پہنچ سکا کہ اب ہمارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ پھر ہم نمازِ عشاء پڑھ کر جو لیٹے تو ہم میں سے اکثر کی آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح ہم اُٹھے اور نماز فجر باجماعت اَدا کی۔ پھر سب اپنے اپنے کمبلوں میں گھس گئے اور دیر تک سوئے رہے۔ پھر اُٹھے اور حالات حاضرہ وغیر حاضرہ پر باہم گفتگو کرنے لگے۔ ہمیں باہر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر کسی نے باہر کا نظارہ کرنا ہوتا تو غسل خانہ میں جا کر ایڑھیوں کے بل اُونچا ہو کر اس کی چھوٹی سی کھڑکی سے دیکھ لیتا جہاں سے صرف تھانہ کے اندر بنا ہوا چھوٹا سا باغیچہ اور اس سے پرے مال خانہ ہی نظر آتا اور بس! خیر دس بجے کے قریب ہمارا دروازہ کھلا اور ساتھ ہی چائے کے برتنوں کی آواز آئی۔ دیکھا تو سپاہی ہمارے لئے چائے لائے تھے جس کے ساتھ چند ایک رَسک بھی تھے، چائے بڑی اچھی تھی۔ ہم نے ایک ایک کپ چائے پی اور وقت گزارنے کے مختلف حیلے کرنے لگے۔ قریباً اڑھائی بجے ہمارے لئے دوپہر کا کھانا لایا گیا۔ یہ کھانا بھی اچھا تھا اور چونکہ بدھ تھا اس لئے سبزی تھی ورنہ بعد میں جتنے دن بھی یہاں رہے ہمیں باقاعدگی سے ہر وقت بڑی اچھی طرح بنا ہوا چھوٹے گوشت کا سالن ملتا رہا جس کے ساتھ گرم گرم تازہ تندوری روٹی بہت مزا دیتی۔ علاوہ ازیں پیاز اور مولی بھی بطور سلاد ساتھ ہوتی۔ ہم نے کھانا کھایا اور نماز ظہر پڑھ کر لیٹ گئے۔ دُعائیں کرتے رہے، ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے رہے حتیٰ کہ عصر کی اَذان ہوئی تو نماز کے لئے پھر تیاری پکڑی اور علیٰ ہٰذا القیاس مغرب کی نماز بھی پڑھ کر بیٹھے تھے کہ تھوڑی دیر میں شام کا کھانا آ گیا۔ ہم نے کھانا کھا کر عشاء پڑھی اور پھر ظاہر ہے سونے کے سوا کوئی اور کام نہ تھا۔ ہم جتنے دن ملکہ ہانس کے تھانہ میں رہے ہمارا یہی معمول رہا۔ اِس طرح سے ہم مَردوں نے اس زنانہ حوالات میں ''مردانگی'' کے ساتھ وقت گزارا۔ ملک صاحب کی توعید ہی ہو

گئی تھی کیونکہ انہیں نہانے کا خوب موقع ملا اور ہم سب بھی اس دوران ہر روز غسل کرتے رہے۔ اس کے علاوہ بیت الخلاء کی بھی سہولت سب سے زیادہ اہم تھی۔

یہاں پہلے روز دن چڑھنے پر تھانہ کے ایس ایچ او مشتاق شاہ صاحب ہمارے پاس آئے اور دروازے میں کھڑے ہو کر بڑی ہمدردی اور شفقت کے ساتھ ہم سے باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے ہمارا حال پوچھا ہمدردی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ آپ میرے مہمان ہیں اس لئے کسی قسم کی ضرورت ہو، کوئی شکایت ہو تو مجھے فوراً بتائیں، میرا کمرا آپ کے بالکل ساتھ ہے۔ چنانچہ اس سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی اور حیرت بھی! ہم سب ان کے لئے ممنون ہوئے اور اب بھی ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے، آمین۔ ہم نے گرفتاری کے بعد حوالات میں پہلا جمعہ یہیں تھانہ ملکہ ہانس میں پڑھا اور خوب دعائیں کیں۔ 26/اکتوبر والا جمعہ تو ہم میں سے کوئی بھی پڑھ نہ سکا تھا۔

تھانہ ملکہ ہانس میں اسیری کے چار دنوں کی خاص بات بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے قتل کی خبر تھی۔ یہ 31/اکتوبر 1984ء کی رات تھی جب میں حوالات کے دروازہ کے بالکل ساتھ سر رکھ کر سویا ہوا تھا کہ زمین پر کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو دروازے کی سلاخوں کے بالکل ساتھ باہر ایک سنتری کھڑا تھا۔ ظاہر ہے اکیلا بوریت کا شکار ہو رہا ہوگا تو اس نے بندوق کا بٹ میرے سرہانے زمین پر مار کر مجھے جگایا تا میں اس کے ساتھ باتیں کرسکوں اور اس کا یہ مشکل وقت بھی کٹ جائے۔ پہلے تو اس نے ہمارے اس واقعہ کے بارہ میں پوچھا پھر از راہِ ہمدردی کہنے لگا کہ آپ کو یہ قتل کر کے کیا فائدہ ہوا؟ کیونکہ اب آپ لوگ جیل کاٹیں گے اور آپ کی عمریں ضائع ہو جائیں گی، وغیرہ۔ اس پر اسے بتایا کہ ہم نے اُنہیں گھر جا کر تو نہیں مارا! اگر وہ قتل ہوئے ہیں تو ہم پر حملہ آور ہونے کے نتیجہ میں ہوئے ہیں۔ اس میں ہمارا کیا قصور؟ بہر حال اس کی سوچ بھی اس لحاظ سے درست تھی کہ قتل کے مقدمات میں ملزم پارٹی بہر حال پس کر رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد میں نے پوچھا کہ باہر کی کوئی نئی تازی سناؤ تو اس نے بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے قتل کی سنسنی خیز خبر سنا ڈالی۔ اس پر میں کیا دیگر ساتھی بھی جو بظاہر سوئے ہوئے تھے، یکدم اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ کچھ واقعات تو اس نے اُسی وقت سنا ڈالے اور باقی کے لئے اس سے درخواست کی کہ جب دوپہر کا کھانا آئے تو تازہ روٹیاں تازہ اخبار میں لپیٹ کر لے آنا۔ اللہ اس کا بھلا کرے کہ اُس شریف آدمی نے ایسا ہی کیا اور اس طرح سے ہم نے کئی روز کے بعد اخبار بھی دیکھ لیا اور اس خوفناک واقعہ کی تفاصیل سے بھی آگاہ ہو گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ تھانہ ملکہ ہانس میں ہم پر تشدد کیا جائے گا اور تفتیشی کارروائی مکمل کی جائے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ چار راتیں اور چار دن یہاں گزار کر ہفتہ کی شب یعنی 3 نومبر کو ساہیوال کے اُسی تھانہ واپس لے جائے گئے۔

## تھانہ Aڈویژن ساہیوال میں واپسی

تھانہ ملکہ ہانس میں جمعہ پڑھنے کے بعد ہمیں پوری توقع تھی کہ ہمیں ساہیوال واپس لے جائیں گے لیکن ہفتہ کی صبح بھی یہاں طلوع ہوئی۔ CIA سٹاف کی گارڈ کے افسر ASI چوہدری شریف سے پوچھا تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لیکن اُسی روز مغرب کی نماز کے بعد ہمیں ہتھکڑیاں لگادی گئیں اور واپس جانے کی تیاری ہوگئی اور آدھ گھنٹے کے سفر کا اختتام تھانہ Aڈویژن ساہیوال میں جا کر ہوا۔ ہمیں خیال تھا کہ شاید ہمیں جیل لے جائیں گے لیکن ابھی تھانے کے حوالات میں ہماری قسمت لکھی تھی جہاں یہ شعر لکھا ہوا تھا ۔

آنیوالی خوشیوں کا احساس تو ہے  ہر انسان کے پاس یہی اک آس تو ہے

تھانہ ملکہ ہانس سے ہمیں اُسی طرح گاڑی میں چھپا کر روانہ کیا گیا جس طرح وہاں لے جایا گیا تھا۔ جب ہم یہاں تھانہ اے ڈویژن واپس پہنچے اور گاڑی سے باہر نکلے تو ہمارے لئے حوالات کا وہی دروازہ کھلا تھا مگر کچھ تبدیلی کے ساتھ۔ تبدیلی یہ تھی کہ حوالات کی سلاخوں پر پھٹے پرانے کمبل اور ٹاٹ لٹکا کر پردہ کیا ہوا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہاں ہمارے لئے گھر سے آئے ہوئے کھانے کے ٹفن پڑے تھے جس سے اندازہ ہوگیا کہ ہماری واپسی کی اطلاع ہمارے لواحقین کو ہو چکی ہے۔ اس دفعہ ہم اندر آتے ہوئے ایک دو جوتیاں بھی ساتھ لے آئے جس سے بیت الخلاء جاتے یا حوالات میں پھرتے ہوئے وہ کوفت نہ ہوتی جو بغیر جوتوں کے ہوتی تھی تاہم بیت الخلاء کی حالت پہلے والی ہی تھی۔ ہمارے یہاں آنے کے بعد ہمارے تفتیشی افسر ملک تصدق صاحب نے ہمارے لئے پانی کا انتظام کروایا اور اپنی طرف سے پورے طور پر ہمارا خیال رکھنے کی اداکاری کی تھی۔ ہمیں ایک دو کمبل بھی اور دلوائے کیونکہ اب پچھلے پہر کسی حد تک ٹھنڈ محسوس ہونے لگ گئی تھی۔

گو یہاں واپس آکر گھر کا احساس ہوا کیونکہ کھانا گھر سے آتا اور اپنے کسی نہ کسی عزیز کا چہرہ بھی دیکھنے کو مل جاتا مگر تھانہ ملکہ ہانس کی یاد بھی ہر دم آتی کیونکہ یہاں نہانا تو درکنار وضو کے لئے بھی پانی راشن پر ملتا۔ ماشکی صبح سویرے بس ایک مرتبہ آتا اور دو گھڑے بھر کر چلا جاتا۔ ماشکی کے ساتھ ہی خاکروب بھی ایک مرتبہ آتا۔ دونوں کے کردار میں اپنے اپنے پیشہ کے اعتبار سے شمال جنوب کا فرق تھا۔ ماشکی اگرچہ بوڑھا اور ضعیف تھا مگر محنتی اور خوددار تھا۔ ہم نے اُسے ایک روز کچھ روپے دینے چاہے تو اس نے صاف انکار کر دیا جبکہ خاکروب کا رویہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

## اسیری میں پہلی ملاقات

تھانہ ملکہ ہانس سے واپسی کے دوسرے تیسرے روز دس گیارہ بجے ہم میں سے کسی نے دیکھا کہ ہمارے وکلاء مکرم

ملک غلام احمد صاحب اور مکرم چوہدری ناصر احمد سراء صاحب تھانہ آئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سپاہی نے آ کر حوالات کا دروازہ کھولا اور ہمیں باہر نکل کر دفتر چلنے کو کہا۔ ہم وہاں گئے تو ہمارے یہ دونوں مہربان دوست بے اختیار ہمارے ساتھ لپٹ گئے۔ پھر ہمیں اِسی دفتر میں بٹھا کر تفتیشی افسران نے اپنی موجودگی میں ان سے ملاقات کرائی۔ قریباً 15/20 منٹ کی اس ملاقات میں ڈھیر ساری باتوں کا علم ہوا۔ سب سے پہلے تو یہ علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے عام احباب جماعت کی حفاظت فرمائی اور ملک بھر میں کسی بھی جگہ اس واقعہ سے ہمارے مخالفین کو کسی قسم کا فائدہ اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ دوسرے اُنہوں نے بتایا کہ حضرت امیر المؤمنین رحمہ اللہ تعالیٰ کو اس کی فوری اطلاع کر دی گئی تھی اور حضور کی امامت میں ساری جماعت دعائیں کر رہی ہے کہ کوئی چارہ نہیں اب دعا کے سوا۔ اسی روز ہمیں پہلی مرتبہ اس وقوعہ کے نتیجہ میں درج کرائے جانے والے پرچہ کے بارے میں مختصراً علم ہوا۔ اُس موقع پر تفتیشی افسر انسپکٹر تصدق ملک نے مکرم ناصر سراء صاحب کی کسی بات پر بڑے یقین دلانے والے انداز میں بار بار کہا 'آپ دیکھیں گے کہ اس تفتیش کا نتیجہ آپ کے ذہن کے بالکل اُلٹ ہوگا'۔ بعد میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ یہ تفتیش واقعی ہمارے ذہنوں میں موجود تصور کے بالکل اُلٹ ہوئی کیونکہ ہم میں سے کسی کے ذہن میں دور تک بھی وہ کچھ نہ تھا جو بعد میں ہوا۔

## نماز کا جرم

اس ملاقات کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی طرح نمازیں پڑھنے کا ذکر آ گیا تو تھانیدار قاضی ایاز صاحب نے بتایا کہ ہمیں کافی تنگ کیا جاتا رہا کہ یہ مرزائی یہاں نمازیں کیوں پڑھتے ہیں گویا یہ بھی سنگین جرم ہے۔ یہ بات سن کر دل بے اختیار کہہ اٹھا کہ خوب! ہمیں جہاں بھی رکھیں گے پچھتائیں گے۔

## تفتیشی افسروں کے سامنے ایک مرتبہ پھر

ملکہ ہانس سے واپسی کے ایک دو روز بعد کی بات ہے کہ شام کے وقت رانا نعیم الدین صاحب کو متعلقہ افسران دفتر تھانہ میں لے گئے اور دیر تک پوچھ گچھ کرتے رہے۔ اِسی دوران ایک افسر حوالات میں آیا اور برادرم حاذق صاحب کو ایک طرف کر کے کچھ پوچھتا رہا۔ اُس وقت مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم نماز پڑھ کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ ایک سپاہی نے دروازہ کی چابیاں چھنکارتے ہوئے کہا 'الیاس کیہڑا اے'۔ چنانچہ میں اُٹھا اور چند لمحوں میں دفتر تھانہ میں تھا جہاں مجھ سے مختلف سوالات پوچھے گئے۔ پہلے تو میرے دفتر میں داخل ہوتے ہی افضل خان نے یہ سوال داغا کہ ''او الیاس جیہڑی بندوق اوس دن تیرے گھر وچ سی او کتھے اِی؟'' میں نے جواب دیا کہ جناب جب سے میں پیدا ہوا ہوں آج تک ائیرگن کے سوا کوئی بندوق چلا کر نہیں دیکھی۔ پھر پوچھنے لگے کہ رانا صاحب نے وہ بندوق بعد میں

تمہیں دے دی تھی؟ میں نے کہا نہیں، رانا صاحب تو فوراً اپنے گھر کے اندر چلے گئے تھے۔ پھر کہنے لگے کہ تم جب باہر آئے تو رانا صاحب کہاں تھے؟ میں نے کہا کہ جناب مسجد کے صحن میں۔ اس کے بعد قاضی ایاز صاحب کہنے لگے کہ بات کھول کر بتلاؤ فکر نہ کرو یہ ریکارڈ پر نہیں آئے گی۔ میں جانتا تھا کہ یہ بھی اس کا ایک داؤ ہے، بہر حال مجھے جو باتیں معلوم تھیں وہی بتائی تھیں، جھوٹ تو بنانے سے رہا۔ اس کے بعد قاضی صاحب کہنے لگے کہ دیکھو تم ایک امام مسجد ہو......
ابھی ان کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ کسی وجہ سے افضل خان نے بات کاٹ کر کہا کہ قاضی صاحب کا مطلب ہے کہ تم امام مسجد ہو اس لئے تمہیں سچ سچ باتیں بتانی چاہئیں۔ میں نے کہا کہ جناب میرے بیان میں ایک ذرہ بھی جھوٹ نہیں ہے ہم نے تو بالکل صحیح واقعات بتائے ہیں۔ اِس کے بعد قاضی صاحب نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ میرا مطلب ہے کہ تم امام مسجد ہو تم اذان دینے اور صفیں وغیرہ بچھانے کے لئے وقت سے پہلے مسجد میں نہیں آتے؟ میں نے کہا جناب پہلی بات یہ کہ ہماری مسجدوں میں آجکل اذان ہوتی ہی نہیں اور دوسرے یہ کہ صفیں بچھانے کے لئے علیحدہ آدمی مقرر ہوتا ہے اور میں تو اکثر سنتیں بھی گھر پر ادا کر کے عین وقت پر نماز پڑھانے کے لئے آیا کرتا ہوں۔ اس پر قاضی صاحب نے اپنے مخصوص تفتیشی انداز میں مجھ سے اُگلوانے کے لیے کہا خیر آپ کے ہاں اذان تو ہوتی تھی! اِس پر میں نے انہیں مخاطب کر کے زوردار انداز میں کہا کہ جناب 26 راپریل 1984ء کو آرڈیننس نافذ ہوا تھا اور اُس روز عشاء کی اذان آخری تھی جو ہو چکی تھی۔ اُس کے بعد آج تک ہماری مسجد میں ایک مرتبہ بھی اذان نہیں دی گئی۔ میں وہاں رہتا ہوں اور اس بات کی پوری طرح سے ضمانت دے سکتا ہوں کہ یہ اِلزام بالکل غلط ہے۔ میرے اِس جواب پر سب مایوس ہو کر کہنے لگے چلو جی پھر اس کو بند کر دیں۔ کسی دوسرے نے پوچھا کہ اُسے بھی؟ تو جواب ملا کہ اُسے بھی بند کر ہی دو۔ (مراد مکرم رانا نعیم الدین صاحب سے تھی) ہم اُس وقت حیران تھے کہ اذان کے بارہ ہم سے اتنے زیادہ سوال کیوں کئے جا رہے تھے کیونکہ اُس وقت تک ہمیں یہ پتہ ہی نہ تھا کہ پرچہ کی بناء ہی اذان پر رکھی گئی ہے۔

اِدھر میں دفتر سے نکلا اور اُدھر دفتر کے ساتھ والے کمرے سے رانا صاحب برآمد ہوئے اور ہمیں ایک ساتھ حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ہمارا اندر آنا تھا کہ ہمارے باقی ساتھی ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے اور ہم سے آپ بیتی پوچھنے لگے۔ پھر ہم سب نے نمازِ عشاء پڑھی اور سونے کی سرتوڑ کوششوں میں مصروف ہو گئے مگر نیند کہاں؟ ہم سب کا خیال تھا کہ اب رانا صاحب کو پھر نکال کر لے جائیں گے اور باقی ساتھیوں سے بھی مزید پوچھ گچھ کریں گے مگر ہمارے مولیٰ نے ہماری دعاؤں کو سنا اور اپنے فضل سے رات بخیریت گزار دی اور ہمارے اندیشوں کو دور کر دیا۔ کرب ناک کیفیت کے ساتھ یہ میری پہلی رات تھی۔ اس کے بعد ہم میں سے کسی کو کسی بھی بات پوچھنے کے لئے پھر حوالات سے نہیں نکالا گیا۔

حوالات میں اسیری کے دوسرے ہفتے منگل یا بدھ کی شام مغرب سے ذرا پہلے تفتیشی ٹیم کے ارکان افضل خان سب انسپکٹر اور ASI اختر علوی ہمارے پاس آئے اور باہر کھڑے کھڑے ہم سے ہمارے کوائف پوچھ کر نوٹ کرنے لگے۔ اُس وقت انہوں نے پہلی مرتبہ ہمارے حُلیے بھی درج کئے۔ جاتے ہوئے چوہدری اسحق صاحب سے کہہ گئے کہ آج رات آپ کو گھروں کی سیر بھی کرائیں گے۔ اِن کی اس بات سے ہم سب کو تشویش ہوئی اور ہم مختلف اندازے لگانے لگے۔ رات بھیگنے لگی اور دس گیارہ بجے کا عمل ہوگا کہ حوالات کا دروازہ کھولا گیا اور چوہدری اسحق صاحب کو ہتھکڑی لگا کر نکال لیا گیا۔ اس پر ہم سب اُٹھ کر دعائیں کرنے لگے۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد چوہدری صاحب کو واپس لا کر حوالہ حوالات کیا گیا تو اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ انہیں گھر چلنے کو کہا گیا تھا تاکہ ریوالور قبضہ میں لیں لیکن آپ اس حالت میں گھر جانے پر راضی نہ ہوئے بلکہ گھر فون کر کے ریوالور مع لائسنس پولیس کے حوالہ کرنے کو کہہ دیا جس پر انسپکٹر ملک تصدق (تفتیشی افسر) ان کے گھر جا کر ہر دو اشیاء لے آیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ FIR میں ایک مقتول پر فائر کی ذمہ داری چوہدری صاحب پر بھی ڈالی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ اُنہوں نے اپنے ریوالور سے اس پر فائر کیا تھا۔

## ہماری پہچان کرانے کی ایک اور کوشش

جمعرات کو دس گیارہ بجے صبح ہمارے احمدی وکیل مکرم ناصر سراء صاحب دوسری مرتبہ تھانہ آئے اور ملک تصدق صاحب کے ہمراہ حوالات میں ہی ہمارے ساتھ ملاقات کی اور حال واحوال پوچھ کر ملک صاحب سے کہنے لگے کہ ان کی شیو ہی کروا دیتے۔ ملک تصدق نے غیر معمولی طور پر فوراً کہا کہ آج بارہ بجے کے بعد نائی کو بلوا کر کرادیں گے۔ چند منٹ کی ملاقات کے بعد مکرم ناصر صاحب واپس چلے گئے اور ہمارے درمیان یہ بحث چھوڑ گئے کہ شیو کروائیں یا نہ کروائیں۔ محترم ملک محمد دین صاحب کا موقف تھا کہ جس انداز سے آج اس نے کہا ہے کہ بارہ بجے کے بعد کروا دیں گے، اُس دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ دراصل یہ شناخت پریڈ کے لئے ہماری پہچان کروانا چاہتے ہیں اس لئے ہمیں حجامتیں نہیں بنوانی چاہئیں۔ چوہدری صاحب اور دیگر احباب کہتے تھے کہ نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ملک صاحب کہتے کہ آخر ہم نے پہلے بھی تو اُن سے کہا تھا کہ ہماری داڑھیاں بنوا دیں مگر یہ نہیں مانے تھے۔ اب جبکہ ہمارا ریمانڈ ختم ہو رہا ہے حجامتیں بنانے کا کیا مطلب؟ یہ بحث کافی گرما گرم ہوگئی۔ مجھے تو سچی بات ہے پتہ ہی نہ تھا کہ شناخت پریڈ کیا ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقت میں ملک صاحب کے سوا کسی کو بھی پتہ نہ تھا کہ شناخت پریڈ ہوتی کیا ہے اگرچہ سارے ہی شناخت پریڈ کی اصطلاح استعمال کر رہے تھے۔ اِسی لئے ملک صاحب کے رویہ میں سختی بھی تھی۔ اس پر میں نے کچھ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔

اُسی روز بارہ بجے کے قریب تھانہ کے صحن میں سپاہیوں نے چار پائیاں بچھانی شروع کر دیں۔ اس کا نوٹس صرف ملک صاحب نے ہی لیا اور کہا کہ یہ تیاری ہمارے لئے ہے! لیکن حقیقتِ حال سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے اور خصوصاً حُسنِ ظن رکھنے کی وجہ سے اس خطرناک چال کی طرف ہماری توجہ بالکل گئی ہی نہیں۔ دوپہر کا کھانا کھایا پھر نمازِ ظہر ادا کر کے ہم بیٹھے تھے کہ ایک ASI نے آ کر ہمارا دروازہ کھولا اور ہمیں کہا کہ باہر چلو تو ہم سب باہر چلے گئے جہاں قاضی ایاز صاحب نے ہمیں اُن چار پائیوں پر بیٹھنے کو کہا اور خود سامنے بچھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہم چار پائیوں پر ساتھ ساتھ ہو کر بیٹھ گئے تو قاضی صاحب کہنے لگے بھئی! کھلے ہو کر بیٹھیں۔ میں نے کہا کہ نہیں ٹھیک ہیں۔ پھر انہوں نے زور دے کر کہا کہ ادھر یہ چار پائی بھی خالی ہے اور میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ تم اِدھر آ جاؤ۔ ان کا انداز اگرچہ بظاہر مخلصانہ تھا مگر پُر اَسرار بھی تھا۔ اس پر جس جگہ مجھے بیٹھنا پڑا وہ تھانہ کے دفتر کے بالکل قریب تھی اور میرا رُخ بھی اُس کے برآمدہ میں کھلنے والے دروازے کی طرف تھا۔ جب ہم بیٹھ گئے تو قاضی صاحب نے حجام بلانے کو کہا۔ اس پر ہمارے ملک صاحب نے کہا کہ اب تو رہنے ہی دیں کیونکہ اب ہم نے جیل چلے ہی جانا ہے، کیا کرنا ہے حجامتیں بنوا کر۔ برادرم حاذق صاحب نے بھی ان کی تائید کی مگر وہ تو ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت سب کچھ کر رہے تھے جسے انہوں نے ہر صورت میں پورا کرنا تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب کہنے لگے چلیں ملک تصدق صاحب سے پوچھ لیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ شیو کروا ہی لیں کیونکہ پتہ نہیں پرسوں آپ کو کہاں بھیجتے ہیں، کرائمز برانچ بھیجتے ہیں یا ڈسٹرکٹ جیل یا مارشل لاء والے آپ کو لے جاتے ہیں۔ ہمارے پاس تو آپ 9 نومبر تک ہی ہیں، اس لئے بہتر ہے کہ شیو کروا ہی لیں۔

قاضی صاحب کا انداز اِس قدر ہمدردانہ تھا کہ ہم نے کہہ دیا ٹھیک ہے جیسے آپ چاہتے ہیں۔ پھر قاضی صاحب نے دفتر سے کاغذ اور قلم منگوایا اور مجھے کہنے لگے اچھا جی اپنا نام پتہ لکھواؤ۔ میں نے بولنا شروع کیا اور قاضی صاحب لکھتے ہوئے بڑی عیاری سے بولے کہ بھئی کوئی افسر آ جائے تو کہنے والے تو ہوں گے کہ جی! ہم تو کام کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ گویا حجامتیں بنوانے کی اجازت تو نہیں مگر ہم چوری چوری ایسا کر رہے ہیں۔ اُن کا انداز ایسا تھا جیسے ہم پر بہت بڑا احسان کر رہے ہوں۔

چند لمحوں کے بعد دو حجام آئے اور انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ایک چار پائی پر بیٹھ کر حاذق نے شیو بنوانی شروع کی تو اس کے ساتھ ہی سنتری نے ہمارے پاس کھڑے ASI کو بلایا تو وہ گیٹ پر گیا جہاں اس نے کسی سے بات

کی پھر قاضی صاحب کے کان میں آ کر کچھ کہا اور قاضی صاحب اسے کوئی ہدایت دے کر دفتر محرر میں چلے گئے اور ASI دوبارہ گیٹ کی طرف چلا گیا۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ گیٹ سے چار پانچ آدمی داخل ہوئے جن میں ایک وہ بھی تھا جو پہلے روز صبح آیا تھا اور اس کے متعلق کہتے تھے کہ یہ عبدالمتین چوہدری ہے اور یہ نام نہاد مجلس تحفظ ختم نبوت ساہیوال کا سیکرٹری ہے، میں نے اسے پہچان لیا۔ جب دوسروں پر نگاہ ڈالی تو وہ بھی بالکل وہی چار آدمی تھے جو اُس پہلے دن سے ہماری شکل وصورت اپنے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ سب دراصل اس جھوٹے مقدمہ کے جھوٹے گواہ تھے۔ اِس کے بعد میں نے اپنی توجہ مسلسل دفتر تھانہ کی طرف رکھی۔ پہلے تو میں نے دیکھا کہ قاضی ایاز نے دفتر تھانہ میں ایک بنچ اُن جھوٹے گواہوں سے اُٹھوایا جو شرقاً غرباً پڑا تھا اور اس کو دفتر کے شرقی جانب والے دروازہ کے سامنے شمالاً جنوباً رکھنے کو کہا۔ یہ دروازہ برآمدہ میں کھلتا تھا اور نسبتاً اندھیرے میں ہونے کی وجہ سے ہمیں دیکھنے کے لئے بہترین کمین گاہ تھا۔ پھر چاروں آدمی اِس بنچ پر بیٹھ گئے اور قاضی صاحب پس منظر میں چلے گئے۔

پھر میں نے دیکھا اور سنا کہ انہیں ہمارے نام بتائے جا رہے تھے۔ آواز آہستہ ہونے کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ پہلا اچھی طرح سے نام اور شکلیں یاد کرانے کے بعد پیچھے ہو گیا اور دوسرا شخص اگلے سرے پر آ گیا۔ اِس طرح باری باری سب کو مشق کرائی گئی۔ جب ہماری حجامتیں ختم ہونے کو تھیں تو یہ تمام ''مہمان'' ایک لائن میں دفتر سے نکل کر گیٹ کے راستہ تھانہ سے باہر چلے گئے۔ ان کی چال میں فاتحانہ انداز تھا گویا جھوٹ کو ثابت کرنے کے لئے ایک ناقابل تسخیر قلعہ میں دراڑیں ڈال آئے ہوں۔ ان کا یہ فعل ان کے جھوٹ پر خود گواہ ہے مگر کیا کریں یہ لوگ تو اِس کو بھی کارِثواب سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے علماء کے نزدیک مقدمات میں جھوٹی گواہیاں دینا شرعاً جائز ہے۔

اس کے بعد ہمیں حوالات میں واپس بند کر دیا گیا اور ہمارا واپس بند ہونا تھا کہ محترم ملک صاحب برس پڑے۔ ''میں نے نہیں کہا تھا کہ یہ ہماری شناخت کروانے کا پروگرام ہے!..........'' اب تو ملک صاحب کا حق تھا وہ جتنا بھی بولتے کم تھا۔ میں نے پوچھا کہ اب ہوگا کیا؟ اس پر مجھے بتایا گیا کہ جب ہم عدالت کے ذریعہ شناخت پریڈ کا مطالبہ کریں گے تو یہ گواہ ہمیں شناخت کر لیں گے کیونکہ شناخت پریڈ میں ملزم کو حق ہوتا ہے کہ اپنے ساتھ جتنے مرضی اپنے ہم شکل کھڑے کر لے اور پھر گواہ کو بلا کر کہا جاتا ہے کہ ان میں سے اصل ملزم کو تلاش کرے۔ اگر گواہ سچا ہو تو وہ اصل ملزم کی شناخت کر لے گا ورنہ وہ منہ کی کھائے گا۔ اِس وضاحت کے بعد مجھے اصل حقیقت معلوم ہوئی اور میں نے کہا پھر آپ اس کو شناخت پریڈ کیوں کہہ رہے تھے؟ یہ کہیں کہ ہماری پہچان کرائی جا رہی تھی۔ بہرحال اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ یوں بھی ہم خواہ کتنا ہی انکار کرتے پولیس نے یہ کارروائی کر کے ہی رہنا تھی۔

9 نومبر 1984ء کو دوسرا جمعہ تھا جو ہم نے حوالات میں ہی پڑھا۔ صبح حسب معمول ناشتہ کے بعد ہر روز کی طرح وقت گزرنے لگا جیسے برف پگھلتی چلی جاتی ہے مگر اب مشکل یہ تھی کہ موسم گرم نہیں رہا تھا بلکہ سردی کی طرف مائل تھا، جب برف تیزی سے نہیں پگھلتی۔ بہر حال دوپہر کا وقت ہوا تو گھر سے کھانا آ گیا۔ کھانا کھا کر ہم نے جمعہ کی تیاری کی، خطبہ میں میں نے سورۃ البقرہ کی آیات وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ۔۔۔ الخ پڑھیں اور ترجمہ کر کے ایک دو فقرے کہے اور نماز پڑھا دی۔ ان آیات کا پڑھنا اور ترجمہ سنانا بڑا ہی مؤثر رہا۔ جمعہ کے بعد چوہدری اسحاق صاحب کے ایک دوست حاجی سعید آئے انہوں نے بتایا کہ آپ کا ریمانڈ آج ختم ہو رہا ہے اور آپ کا مقدمہ سپیشل ملٹری کورٹ کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ اس خبر نے ہم سب کو تشویش میں ڈال دیا مگر ملک صاحب نے کہا کہ مارشل لاء والے بھی کچھ دیکھ کر ہی فیصلہ کرتے ہیں، فکر نہ کریں اتنے پاگل نہیں ہیں۔

اُسی روز نمازِ مغرب کے بعد اِنسپکٹر قاضی صاحب بھی ہمارے پاس آئے اور باہر کھڑے ہو کر ہمیں کہنے لگے کہ آپ کا ریمانڈ آج ختم ہو چکا ہے اور کل آپ ڈسٹرکٹ جیل ساہیوال بھجوائے جا رہے ہیں۔ میں تو کسی کام سے کل اوکاڑہ ہوں گا تاہم آپ کا انتظام کر آیا ہوں وہاں بہت اچھا انتظام ہو گیا ہے۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ ہمیں جیل بھجوایا جا رہا ہے کیونکہ سب کہتے تھے کہ جیل میں حوالات کی نسبت بہت سہولت ہوگی، آزادی ہوگی اور خوف و ہراس نہیں ہوگا لیکن انسان کی ہر خواہش اور ہر خیال تو پورا نہیں ہو جایا کرتا، ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

## جیل بھجوانے سے پہلے بھی پہچان کرائی

دس نومبر 1984ء کی صبح ہوئی، سورج چڑھ آیا تو اُدھر ہمارا ناشتہ بھی آ گیا۔ ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی ہمیں ہتھکڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ پھر ہمیں جیل لے جانے کے لئے ہتھکڑیاں لگائی جانے لگیں۔ اس دوران حوالات کی سلاخوں پر لٹکائے گئے کمبل ہٹا دیئے گئے تھے۔ ہتھکڑیاں ابھی لگ رہی تھیں کہ حاذق کو باہر بلا لیا گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک فوری ہدایت کے ذریعہ تھوڑی دیر پہلے ہٹائے گئے کمبلوں کو پھر سے سلاخوں پر ڈال کر پردہ کر دیا گیا اور اس کے بعد کچھ افراد کے تھانہ کے اندر آنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ملک صاحب نے خیال آرائی کی کہ ہو نہ ہو کہیں ان گواہوں کو بلا کر پھر پہچان کروانے کا پروگرام نہ ہو۔ اس کے تھوڑی دیر بعد نثار اور قدیر کو باری باری بلا لیا گیا۔ اِس پر ملک صاحب نے مزید خیال ظاہر کیا کہ یہ مجھے آخر میں بلائیں گے کیونکہ ایک تجربہ کار تھانیدار ہونے کے ناطہ میری طرف سے کسی بھی مرحلہ پر Stand لینے یا اعتراض داغنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ ملک صاحب کی فراست پر قربان جاؤں کہ ان کی دونوں

باتیں درست ثابت ہوئیں۔ مجھ سے پہلے رانا نعیم الدین صاحب کو آواز پڑی، پھر مجھے بلایا گیا لیکن مجھے ہتھکڑی نہیں لگائی گئی۔ حوالات سے نکال کر مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے جایا گیا جس میں ایک لمبا میز شرقاً غرباً پڑا تھا۔ اس کے جنوبی طرف ملک تصدق انسپکٹر اور افضل خان سب انسپکٹر بیٹھے تھے جبکہ چار افراد اُس میز کے شمالی طرف ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنے اوپر کپڑے یا صافے وغیرہ لے رکھے تھے مگر پھر بھی چھپ نہ سکے اور ہمیں پتہ چل گیا کہ یہ وہی چار گواہ ہیں جو پہلے بھی دو مرتبہ ہمیں دیکھنے کے لئے آچکے ہیں۔ اب مجھے اس میز کے شرقی طرف ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا گیا اور واضح طور پر میرا نام بولا گیا اور افضل خان نے میرا نام ایک بڑے سفید کاغذ پر لکھا اور پھر مجھے ملک تصدق نے کہا کہ تم اگر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے ہو تو کرو۔ اس کا انداز ایسا جابرانہ تھا جیسے مجھ سے آخری خواہش پوچھی جارہی ہو اور اس کے بعد کوئی موقع نہ ہوگا۔ خیر اصل مقصد ان کا پورا ہو چکا تھا یعنی جھوٹے گواہوں کو بالکل قریب بٹھا کر میری پہچان اور تعارف کروانا تھا سو وہ ہو گیا۔ اُنہیں میری آواز بھی سنا دی گئی تا کہ کسی طرح سے کوئی کمی نہ رہے۔ یہ سب کچھ ایسے طور پر اور ایسے موقع پر اچانک کیا گیا کہ اس صورت حال میں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے، اپنے آپ کو کسی بھی طرح چھپا نہیں سکتے تھے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ایسے واقعات ظاہر کر کے اور ایسی حرکتوں کا دشمنوں کو موقع دے کر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ دیکھو تمہیں جھوٹ گھڑنے اور پھر اُسے ثابت کرنے کے لئے ہر ممکن موقع دیا جارہا ہے مگر پھر بھی دیکھنا کہ تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکو گے، کامیابی مسیح کے غلاموں کو ہی نصیب ہوگی، انشاء اللہ العزیز۔ بعد میں حاذق نے بتایا کہ جب اُسے بلا کر اندر بٹھایا تو عین اُس وقت یہ جھوٹے گواہ وہاں دفتر میں ڈرامائی انداز میں لائے گئے اور اُنہوں نے آتے ہی کہا ' ہمارا سائیکل گم ہو گیا ہے پرچہ درج کرلیں'۔ گویا ہر بات میں اور ہر مرحلہ پر جھوٹ بول بول کر انہوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی مگر آخر ناکام رہے۔

اس مرحلہ میں سے گزارنے کے بعد ہمیں ایک پک اپ گاڑی میں بٹھایا گیا جس کے پردے گرا دیئے گئے اور ہم سے زیادہ تعداد میں مسلح سپاہی ہمارے ساتھ سوار ہوئے اور چند منٹ کے سفر کے بعد ہمیں سنٹرل جیل ساہیوال کے سامنے لا اُتارا گیا۔ ضروری کارروائی کے بعد ہمیں سپردِ جیل کر دیا گیا جہاں ہماری ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ ایسا آغاز تھا جس کا انجام خدا کو ہی معلوم تھا۔ چنانچہ ہم نے اسی پر توکل کرتے ہوئے پوری بشاشت اور حوصلہ سے اس میں قدم رکھا۔

## حوالات (تھانہ) کے متعلق مجموعی تاثرات

پندرہ دن ہم نے حوالات میں خدا خدا کر کے گزارے، چلنے پھرنے کے لحاظ سے زندگی بھر کبھی اتنے پابند نہ ہوئے

تھے۔ ہر روز شہر کے طول وعرض میں سائیکل چلانا اور سیر کرتے ہوئے دور تک چلتے چلے جانا اپنا معمول تھا اور پھر یک دم چند گزوں تک زندگی کے تمام معمولات محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ بڑا عجیب اور مشکل تجربہ تھا۔ اس پر مستزاد حوالات کے اندر بیت الخلاء کا گند اور بد بو جبکہ حوالات کے باہر تھانہ کے کیا سپاہی، کیا افسر اور کیا ماتحت عملہ، سب کے مونہوں سے بکا جانے والا گند۔ بات بات پر موٹی قسم کی غلیظ گالیاں، ایسی گالیاں کہ اُن کی 'لغوی' ترکیب کا تصور تک نہیں ہوسکتا۔ پانی محدود مقدار میں ہوتا، دن میں صرف ایک مرتبہ منہ ہاتھ دھونے کا موقع ملتا اور پانچوں وقت نمازوں کے لئے تیمم کرتے اور سلاخوں کے درمیان سے کھانا پکڑ کر کھاتے غرضیکہ زندگی کا پہلا تجربہ ہونے کے ناطہ ہمارے لئے یہ انتہائی مشکل وقت تھا اور ہماری بالکل وہی کیفیت تھی جو کسی شاعر نے بیان کی ہے ۔

بے خطا تو نے میری خوشی چھین لی　　زندہ رکھا مگر زندگی چھین لی

لیکن اس کے باوجود ہمیں اپنے مولیٰ کی طرف سے ہر حالت میں راضی برضا رہنے کی توفیق بھی ملی، ہمیں کوئی افسوس نہیں تھا اور ہوتا بھی کیوں؟ جبکہ ہمارے ضمیر بالکل صاف تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہم پوری طرح مطمئن تھے اور اگلے دس سالوں کے دوران یہی ہمارا زادِ راہ رہا!!

# سنٹرل جیل ساہیوال

سنٹرل جیل ساہیوال کا نام پنجاب کی سخت ترین جیلوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسے 1869ء میں انگریزوں نے تعمیر کیا تھا۔ یہ جیل پرانے طرزِ تعمیر کے مطابق مٹی کے لیپ والی موٹی دیواروں سے بنی ہوئی ہے۔ اس کے فرش بھی بس کچی پکی اینٹوں کے ہیں۔ بیت الخلاء بھی پرانی طرز کے ہیں جو قیدی کے لئے سب سے زیادہ اذیت ناک ہیں۔ اس جیل کی اونچی اونچی کچی دیواریں مجسم خوف و ہراس ہیں۔ اس اجمالی خاکہ کی آنکھوں دیکھی اور ہڈ بیتی تفصیل پڑھنے کے لئے آیئے میرے ساتھ رہیے۔

## جیل کے اندر۔ زندگی میں پہلی بار

دس نومبر 1984ء کی صبح ہم سب کی زندگیوں میں پہلا موقع تھا کہ ہم پابندِ سلاسل ہونے کی حالت میں جیل کے اندر داخل ہوئے۔ ہمیں ڈیوڑھی میں سے گزار کر جیل کے اندر کی جانب کھڑا کر دیا گیا جہاں کچھ دیر بعد ہماری تلاشی لی گئی۔ دو تین ملازموں نے خوب اچھی طرح ہماری جانچ پڑتال کی، سر سے پاؤں تک خوب کھنگالا، ہماری جوتیاں تک نہ صرف اُتروا کر بلکہ پٹخ پٹخ کر دیکھیں۔ ہمارے پاس موجود نقدی جمع کر لی گئی، اس کے علاوہ اَور کوئی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہ ہو سکی۔ اس کارروائی کے بعد ہم منظور نامی ایک حوالدار کے حوالے کر دیئے گئے۔ یہ حوالدار صاحب ہمیں لے کر پوچا کی ہوئی صاف ستھری سیدھی سڑک پر ہو لئے۔ (پوچ سے مراد زمین پر جھاڑو دینے کے بعد ایک بڑے سے گیلے ٹاٹ کو گھسیٹتے ہوئے اس طرح پھیرنا ہے کہ زمین پر ایک لیپ سا ہو جائے) ہم راستہ میں جیل کے عجیب و غریب ماحول کو دیکھتے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے اس سڑک پر سکول آیا پھر لنگر خانہ، لکڑی گودام اور رسی او بارک۔ یہاں بعض قیدی ایک دیوار پر پوچا کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر رانا نعیم الدین صاحب کہنے لگے 'تم سے بھی یہی کام لینا ہے بچّو!' میں نے دل میں کہا جو بھی کرنا پڑے انشاء اللہ کریں گے اور امام مہدی علیہ السلام کے غلام بن کر کریں گے، تاہم دل میں خواہش تھی کہ ہم سب کو اکٹھے ہی کوئی کام دے دیں۔ اس سے میرے دل میں یہ مقصد تھا کہ سارا کام ہم نوجوان کر لیا کریں گے اور اپنے بزرگ ساتھیوں کی بچت ہو جائے گی۔

## گھنٹی گھر یا چکر

کسی بھی جیل خانہ میں ڈیوڑھی کے بعد سب سے اہم دفتر گھنٹی گھر یا چکر کہلاتا ہے۔ یہ جیل کے اندرونی انتظام کا مرکز

ہوتا ہے یہاں سے قیدیوں کی مختلف بارکوں میں گنتی ڈالی جاتی ہے اور یہیں تمام قیدیوں کی ٹکٹیں (سروس بک) ہوتی ہیں جن میں ان کے جملہ کوائف وحالات تیز ان کی قید کا حساب ہوتا ہے۔ رات کو سارے جیل کی چابیاں بھی یہیں جمع ہوتی ہیں اور اندرون جیل استعمال ہونے والے جملہ ہتھیار بھی یہیں رکھے جاتے ہیں۔

## پابہ جولاں چلو!

ہم ڈیوڑھی سے روانہ ہوئے تو چلتے چلتے گھنٹی گھر یا چکر پہنچے تو ہمارے انچارج حوالدار نے کسی کو آواز دیتے ہوئے کہا کہ لوہار سے کہو سات بیڑیاں لے کر 7 بلاک آجائے۔ ہم نے یہ بات سنی تو سمجھے کہ اپنے کسی کام کے لئے منگوار ہے ہوں گے اس لئے سُنی اَن سُنی کر دی لیکن جب دوسری مرتبہ اس نے آواز دی اور ''سات بیڑیوں'' کا لفظ خاص طور پر نوٹس میں آیا تو احساس ہُوا کہ یہ بیڑیاں ہمارے لئے ہی منگوائی جارہی ہیں! ہم حیران وششدر رہ گئے کہ ہم نے کونسا جرم کیا ہے، کیا قصور کیا ہے جو ہمیں بیڑیاں لگائی جارہی ہیں؟ لیکن ہم کر ہی کیا سکتے تھے سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر ڈال دیتے۔ خیر چلتے چلتے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ اس سے پہلے ہم نے حوالدار صاحب سے پوچھا کہ ہمیں علیحدہ رکھیں گے یا عام قیدیوں کے ساتھ؟ کہنے لگے کہ آپ کو جہاں رکھا جارہا ہے وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ یہ Punishment Cell ہے جسے جیل کی زبان میں قصوری یا 14 چکی یا 7 بلاک بھی کہتے ہیں۔ گو سارے جیل میں ہی بظاہر صفائی تھی مگر یہاں پہنچے تو غیر معمولی صفائی دیکھنے میں آئی۔ غالباً اس لئے بھی کہ صفائی کرنے والوں کے سوا اور کوئی یہاں آجا نہیں سکتا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہمیں اس کے صحن میں روک دیا گیا۔ حوالدار صاحب بھی کرسی منگوا کر بیٹھ گئے اور ہم ان کے سامنے بالکل اُسی طرح بیٹھے تھے جیسے پرائمری سکول میں اُستاد محترم کے سامنے بیٹھا کرتے تھے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وہاں کرسی پر شفیق اُستاد بیٹھے ہوتے تھے اور یہاں ہمیں بیڑیوں کے اِنتظار میں بٹھایا گیا تھا۔ اس دوران حوالدار صاحب ہمارے ساتھ ہمدردانہ انداز میں باتیں کرنے لگے اور ہمارے کیس کے متعلق پوچھنے لگے جس پر ملک صاحب نے جواب میں اپنا واقعہ بیان کرنا شروع کیا مگر ساہیوال کے رہنے والوں کے لئے تو ایک ہی فقرہ کافی تھا کہ مشن چوک والا واقعہ اور بس! کافی اِنتظار کے بعد ایک لوہار صاحب بیڑیاں اور اپنے اَوزار اُٹھائے یہاں آگئے اور اپنی دکان لگا کر ہمیں طلب کیا۔ سب سے پہلے میں آگے ہوا اور میرے پاؤں بیڑیوں سے جکڑ دیئے گئے لیکن خدا کی قسم! عجیب لطف وسرور محسوس ہوا۔ حضرت شہزادہ سید عبداللطیف صاحب شہید رضی اللہ عنہ یاد آگئے جنہیں ایک من چوبیس سیر وزنی بیڑیوں میں جکڑا گیا تھا۔ اس کے مقابلہ میں تو اس بیڑی کا کوئی زیادہ وزن نہ تھا جو ہمیں ڈالی جارہی تھی۔

میں نے آج تک بیڑی دیکھی تو نہ تھی تاہم اس کے متعلق تھوڑا بہت سنا تھا اور ذہن میں تاثر یہ تھا کہ اسے کمر میں بھی FIX کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جب لوہار میرے پیروں میں اسے FIT کر چکا تو میں نے کہا کہ اوپر؟ وہ کہنے لگا نہیں اوپر تو کچھ نہیں کرتے۔ چنانچہ اُس وقت مجھے بہت حد تک تسلی ہوئی کہ چلو اٹھ بیٹھ تو سکیں گے! بیڑی کی شکل کی وضاحت کے لئے نقشہ حاضر ہے۔
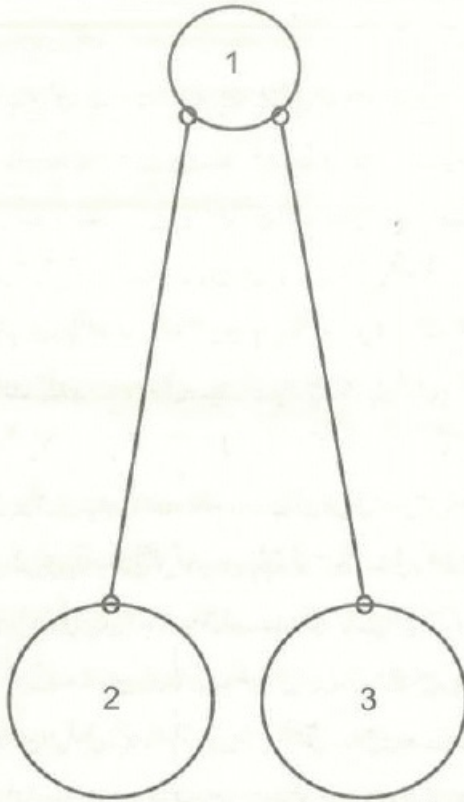
بیڑی کے حلقہ نمبر 2 اور 3 کو ٹخنوں کے اوپر دونوں ٹانگوں کے گرد ڈال کر لوہے کی ربٹ سے پکا بند کر دیا جاتا ہے۔ ان حلقوں کے ساتھ دو موٹی سلاخیں لگی ہوتی ہیں جن کے دوسرے سرے حلقہ نمبر 1 میں جڑے ہوتے ہیں گویا حلقہ نمبر 1 دونوں سلاخوں کا سنگم ہے اور اسے اوپر اٹھا کر رکھنا ہوتا ہے۔ چاہے ہاتھ سے پکڑے رکھیں، چاہے اِزار بند کے ساتھ باندھ لیں۔ جنہیں لمبی مدت کے لئے بیڑیاں لگتی ہیں وہ تو باقاعدہ چمڑے کا کمر بند بنوا لیتے ہیں اور بیڑی کو اس کے ساتھ یوں لٹکائے پھرتے ہیں جیسے یہ ان کی جھنکار ہو۔

## چکی

جب ہم وہاں بیٹھے تھے تو حوالدار صاحب نے کسی قیدی کو کہا جاؤ اور وارڈ نمبر 3 میں سات چکیاں تیار کر دو۔ ہم چکی کے لفظ سے بس اِسی قدر متعارف تھے کہ چکی میں آٹا پیسا جاتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ اب ہم سے آٹا پسوائیں گے۔ چلو کوئی بات نہیں ورزش ہی سہی! اس پر اُس قیدی نے آکر رپورٹ دی کہ اتنی ٹوٹی ہوئی ہیں اور اتنی صحیح ہیں۔ اس پر ہمیں اور بھی یقین ہو گیا کہ آٹا ہی پسوائیں گے۔ بہر حال جب چکیاں تیار ہو گئیں تو ہمارے لئے برتن ISSUE کرنے کا آرڈر بھی ہو گیا اور جب ہم سب کو بیڑیاں پہنائی جا چکیں تو ہمیں وارڈ نمبر 3 میں لے جایا گیا جہاں ہم نے دیکھا کہ شروع کے کمروں میں کافی خوفناک قسم کے آدمی بند تھے۔ ہمیں آگے چلتے چلے جانے کو کہا گیا۔ ہم خیال کر رہے تھے

کہ ہمیں آخر میں کسی بڑے سے کمرے میں بند کریں گے لیکن کچھ کمرے گزرنے پر حکم ملا کہ ایک آدمی ادھر آجائے کیونکہ اب خالی کمروں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ عزیزم شاراس کمرے میں چلا گیا پھر اگلے کمرے میں مَیں داخل ہو گیا۔ اسی طرح باقی ساتھی ایک ایک کر کے اگلے کمروں میں بند کر دیئے گئے۔ یہاں آکر دیکھا تو کسی چکی کا وجود نہ تھا۔ بعد میں پوچھنے پر پتہ چلا کہ کمرے کو دراصل 'چکی' اِس لئے کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے یہاں بند قیدیوں سے کام لینے کے لئے ہر کمرے میں آٹا پیسنے والی چکی لگا رکھی تھی جسے اگرچہ موجودہ دور میں ہٹا دیا گیا ہے مگر اس کی نسبت قائم رہی اور علیحدہ کمروں کے لئے بطور اصطلاح ''چکی'' کا لفظ ہی استعمال ہوتا چلا آ رہا ہے اور قیدی نے آکر جو کہا تھا کہ 'اِتنی ٹوٹی ہوئی ہیں' اِس سے مراد تھا کہ وہ کمرے قابل استعمال نہیں تھے۔ یہ دراصل 7 بلاک تھا جسے 14 چکی بھی کہتے تھے۔ اِس کی تین وارڈیں تھیں اور ہر وارڈ میں پچیس پچیس کمرے تھے۔ یہ دراصل جیل کے اندر جیل تھی اور یہاں جیل کے اندر جرائم کے مرتکب ہونے والوں کو بطور سزا رکھا جاتا۔ اسی طرح ایسے حوالاتیوں کو بھی یہاں رکھا جاتا جن پر کسی بھی طور پر خطرناک ہونے کا لیبل لگا ہوتا۔ اس کی پہلی وارڈ میں نسبتاً کم خطرناک قیدی رکھے جاتے، دوسری وارڈ میں عموماً سزائے موت کے خطرناک قیدی ہوتے اور تیسری وارڈ میں انتہائی خطرناک نوعیت کے مجرم رکھے جاتے۔ ہمیں سب سے پہلے اسی تیسری وارڈ میں رکھا گیا، اسی سے ہماری ''خطرناکی'' کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس طرح سے بند کر دیئے جانے پر ہم سب ساتھی حیران رہ گئے کہ ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ جیل میں جا کر سہولت ہو جائے گی، آزادی ہوگی اور تھانہ کے حوالات کی طرح پریشانی یا مشکل نہیں ہوگی۔ لیکن یہ تو 'آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا' والی بات ہو گئی۔ ایک تو بیڑیاں اور پھر علیحدہ علیحدہ کمروں میں بند! کریلا وہ بھی نیم چڑھا! ایک دفعہ تو ہر طرف خاموشی طاری ہو گئی اور ظاہر ہے کہ ہر کوئی اپنے رب سے باتیں کر رہا ہوگا۔ بہر حال میں نے اِسی کیفیت میں اپنے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ کمرا قریباً آٹھ فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا تھا، دیواریں اور فرش پختہ تو ضرور تھے مگر پرانے بھی تھے۔ کمرے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی ایک قیدی آیا اور کمرے میں ایک میلا کچیلا ٹاٹ اور کھجور کے پتوں کا جھاڑو پھینک گیا، اس کے علاوہ یہاں اور کچھ نہ تھا۔ میں بڑا حیران ہوا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا، یاالٰہی! یہ ماجرا کیا ہے! آخر ہم نے کونسا جرم کیا ہے اور اگر جرم کا الزام ہم پر لگایا بھی گیا ہے تو بھی کونسا جرم ثابت ہو چکا ہے جو ہمیں اس قسم کی سزا دی جا رہی ہے!! لیکن ایک بات میں ضرور کہتا ہوں کہ اس ساری کیفیت کے باوجود دل کو عجیب حوصلہ تھا اور کوئی غیبی طاقت ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت اور اس کے لئے جرأت و ہمت پیدا کئے ہوئے تھی۔ یہ اسی کی برکت تھی کہ دلِ ناتواں مقابلہ کرتا رہا۔ میں کچھ دیر تو اِدھر اُدھر یعنی 8x12 فٹ کے رقبہ پر ٹہلتا رہا پھر اپنی گرم چادر زمین پر بچھا

کر لیٹ گیا۔ ابھی چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ یکا یک مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو یہ چادر ہے جبکہ میرے ساتھیوں کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ اس خیال نے مجھے مزید لیٹنے نہ دیا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور سوچا کہ اس طرح تو وقت نہیں گزرے گا چنانچہ میں نے جھاڑو پکڑا اور گو کمرا صاف ہی تھا لیکن پھر بھی جھاڑو دینے لگا کہ کچھ نہ کچھ تو مصروفیت ہوگی۔ بیڑی کی مہربانی سے جھاڑو دینے میں کچھ دیر تو ضرور لگی مگر پھر بھی کتنی دیر؟ آخر کمرا تھا ہی کتنا بڑا؟ جلد ہی فارغ ہوگیا، اب کیا کروں؟ ایسے میں اللہ تعالیٰ کے حضور مناجات کرنے لگا اور مختلف دعاؤں میں مشغول ہوگیا۔

اس کے بعد ایک شخص آیا جس کے متعلق بعد میں علم ہوا کہ وہ جمعدار ہے۔ اُس نے مٹی کی ایک چھوٹی سی کنالی سلاخوں سے گزار کر دروازے کے اندر رکھ دی اور کہا کہ یہ پیشاب کرنے کے لئے ہے۔ میں نے پوچھا ''اور بیت الخلاء؟'' تب پتہ چلا کہ سب کچھ اس کمرے کے اندر ہی ہوگا اور اِسی کنالی میں۔ پھر ایک قیدی نے آ کر سیاہ رنگ کے دو کمبل جو بالکل نئے لگ رہے تھے اور نیلے رنگ کی ایک دری، جس کا عرض قریباً دو فٹ اور طول پانچ چھ فٹ ہوگا، لا کر مجھے دی۔ یہ دری بھی بالکل نئی تھی، بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی ٹھیک ٹھاک چیزیں جیل میں اور پھر اس کال کوٹھری میں مل رہی ہیں۔ بہر حال ان میں سے ایک کمبل دُہرا کر کے جس کا عرض دو فٹ ہی رہ گیا ہوگا، پہلے سے موجود ٹاٹ پر بچھا لیا اور اس کے اوپر دری۔ اِس طرح سے میرا بستر مکمل ہوگیا۔ ایک کمبل رات کو اوپر لینے کے لئے رکھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور قیدی آیا اور کھانے پینے کے برتن لایا۔ یہ برتن ایلومینیم کے بنے ہوئے تھے اور ان میں بڑے سائز کی ایک پلیٹ، ایک ڈُلو (پانی پینے کے لئے مگ یا کپ کی طرح کا ایک برتن) اور ایک گہرا پیالہ شامل تھا۔ اسکے ساتھ ہی جیل کی طرف سے ملنے والے سامان کی ترسیل کا کام مکمل ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا دینے والا ایک قیدی آیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس سے دال اور روٹی لے تو لی تھی مگر کھائی تھی یا نہیں یہ پوری طرح یاد نہیں۔ سالن دینے کا بھی یہاں عجیب طریقہ دیکھا۔ سالن ایک ڈول میں ہوتا جسے چکی کے سامنے بنے ہوئے چھوٹے سے برآمدے کے دروازے پر رکھ کر اس رزق کی تقسیم پر مامور قیدی دور سے ہی آواز دیتا: ''سالن لے لو!'' اگر کمرے سے آواز آتی کہ ہاں دے دو۔ تو وہ ایک کُپی میں سالن ڈال کر برآمدہ میں آتا اور دروازے کے سامنے آ کر پرنالے کی طرح کے ایک برتن کو، جس کے ایک طرف تنگ سا منہ بنا ہوتا جبکہ دوسری طرف والا حصہ چوڑا ہوتا، سالن ڈالنے کے لئے سلاخوں کے درمیان سے گزار کر اندر کر دیتا ہے اور کمرے میں موجود قیدی اس کے نیچے اپنا برتن رکھ دیتا اور سالن دینے والا کھلی جگہ پر سالن سے بھری کُپی اُنڈیل کر پیچھے سے اُس پرنالہ کو اونچا کر دیتا۔ اِس طرح سے سالن بہتا ہوا سلاخوں کے اُس پار اس پرنالہ کے نیچے رکھے ہوئے برتن میں آ گرتا۔ چاول پکے

ہوتے تو پلیٹ میں ڈال کر دروازے کے اوپر یا نیچے سے بچی ہوئی جگہ کے راستے اندر کر دیئے جاتے یا پھر دو پلیٹوں کو ایک دوسرے پر موندھ کر سلاخوں میں سے پکڑا دیئے جاتے۔

## بیڑی کے ساتھ وضو کرنے اور نماز پڑھنے کا تجربہ

پہلے دن انہی تجربات سے گزرتے ہوئے نمازِ ظہر کا وقت ہونے پر اذان کی آواز آئی تو وضو کرنے کا بھی نیا تجربہ ہوا کہ پانی باہر پڑے گھڑوں میں تھا اور میں سلاخوں کے اندر۔ وہی کپ ذریعہ مواصلات تھا جسے ڈُلو کہتے تھے۔ پیروں میں بیڑی بھی تھی جسے سنبھال کر بڑے محتاط طریقہ سے دروازے کے سامنے بیٹھا (احتیاط اس لئے تھی کہ پہلا دن تھا اور بیڑی کے ساتھ کام کرنے کا طریقہ اور تجربہ نہیں تھا ورنہ ہمارے سامنے آنے جانے والے بعض قیدی بھی ہماری طرح پابند سلاسل تھے مگر وہ بغیر کسی مشکل کے لٹو کی طرح گھوم پھر رہے ہوتے کیونکہ وہ اس کے عادی ہو چکے تھے) بہر حال دروازہ کے سامنے بیٹھ کر ایک ایک کپ کر کے پانی اندر لانا شروع کیا اور معمول سے کہیں زیادہ دیر تک سلاخوں، بیڑی، ڈُلو اور گھڑے سے برسرِ پیکار رہنے کے بعد وضو مکمل ہوا تو نماز پڑھی۔

ایک دو دن تو اسی طرح بیڑی کے مسائل میں اُلجھے رہے مگر اس کے بعد جب تجربہ ہو گیا تو یہ بیڑی بھی اپنی غلام ثابت ہوئی اور اس سے وضو کرتے ہوئے کام بھی لینے لگا اور وہ یوں کہ جب وضو کے لئے دروازے کے سامنے بیٹھتا تو بیڑی کے اوپر والے سرے کو بچھا کر سامنے دروازے کے نچلے حصہ پر لٹکا دیتا۔ اِس طرح وضو کے دوران پانی والا ڈُلو اس بیڑی کے اوپر رکھنے کی جگہ بن جاتی ورنہ وضو کرتے ہوئے پانی لے کر ڈُلو کو نیچے گندے فرش پر رکھنا پڑتا جبکہ یہی ڈُلو گھڑے کا ڈھکن بھی تھا۔ تاہم بعد میں جب بیڑی اُتر گئی تو یہ ''سہولت'' بھی جاتی رہی، واقعی سچ ہے: 'ضرورت ایجاد کی ماں ہے'۔ وضو کرنے کے بعد بیڑی کے ساتھ نماز پڑھنے کا بھی تجربہ عجیب رنگ لئے ہوئے تھا۔ دو تین نمازوں کے بعد جو پرچہ ترکیب اِستعمال تیار ہوا، اُس کی تفصیل اِفادۂ عام کے لئے درج کی جاتی ہے:

> نماز کے لئے تیار ہو کر جائے نماز پر آ جائیں اور سیدھے کھڑے ہو کر بیڑی کے اوپر والے حصہ کو اس طرح چھوڑیں کہ وہ جائے نماز پر قبلہ رخ بچھ جائے اور اس کے وہ حلقے جو ٹخنوں کے اوپر فِٹ ہیں اندر کی طرف کر لیں، اب پیر ہلائے بغیر نماز شروع کر دیں۔ جب تک قیام رکوع اور قومہ کی حالت میں ہیں اور پیر نہیں ہلاتے تو پتہ بھی نہیں لگے گا کہ آپ کے پیر پابند سلاسل بھی ہیں! بیڑی اپنے وزن پر ہو گی لیکن سجدہ میں جانے اور بین السجدتین بیٹھنے کے لئے پھر تبدیلی کرنی ہو گی۔ یہ تبدیلی کھڑے ہونے کی حالت میں نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کا تعلق بیٹھنے کے ساتھ ہے۔ بہر حال یہ بھی تجربہ کے ساتھ اتنی آسان ہو جاتی ہے کہ اگر

ایک دفعہ سیٹ ہو جانے کے بعد انسان تھوڑا بہت ہلتا بھی رہے تو بھی محسوس نہیں ہوتا کہ بیڑی لگی ہے یا نہیں کیونکہ بیڑی کے حلقوں اور سلاخوں کو اس طرح سیٹ کر لیا جاتا ہے کہ وہ ٹخنوں کے نیچے ہوں جہاں نسبتاً جگہ گہری اور گوشت والی ہوتی ہے۔ باقی رہا سلاخوں کا مسئلہ تو وہ اندر کی طرف ہوتی ہیں اور ٹانگوں کے نیچے قبلہ رخ ہی بچھی ہوتی ہیں۔

اُڑدی!

نماز سے فارغ ہو کر تسبیحات وغیرہ کیں اور پھر کبھی لیٹ کر اور کبھی اپنی چند مربع گز 'وسیع و عریض جاگیر' میں ٹہل کر وقت گزارنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ایک وارڈر نے آ کر نام پوچھا اور پھر ایک لمبے سے پرچے پر نظر ڈال کر میرا نام تلاش کیا اور مجھے 17 نمبر سنا کر چل دیا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ جواب ملا ''اب تم نے 17 نمبر چکی میں جانا ہے''۔ کچھ دیر بعد ہمیں اگلے کمرے میں جانے کے لئے تیار رہنے کو کہہ دیا گیا۔ میں اس کے لئے تیار بیٹھا تھا کہ یکدم ایک نمبردار اور دو تین مشقتی آ گئے۔ کمرا کھولا اور مجھے باہر آنے کو کہا۔ میں نے بستر وغیرہ اٹھانا چاہا تو مشقتی نے اُٹھا لیا اور اسی طرح باقی چیزیں یعنی پلیٹ اور پیالہ وغیرہ ایک دوسرے مشقتی نے اور میں اس کمرے سے نکل دوسرے کمرے میں جا بند ہوا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ آج ہمارا یہاں پہلا دن تھا اور بغیر کسی ترتیب کے ان کمروں میں آ گئے تھے اس لئے اب جو ترتیب دفتر کی طرف سے بن کر آئی ہے اس کے مطابق ہمیں ان کمروں میں مستقل طور پر رکھا جائے گا لیکن اگلے روز اُسی وقت پھر ایک سپاہی نے آ کر یہی عمل دُہرایا تو میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ تبدیلی یہاں ہر روز ہوتی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس تبدیلی کے لئے ایک خاص لفظ بولا جاتا ہے لیکن ہمیں وہ لفظ سمجھ نہ آیا۔ بہت دنوں بعد جا کر پتہ لگا کہ یہ لفظ ''اُڑدی'' ہے۔ چنانچہ جیل میں یہ محاورہ عام ہے کہ ''اُڑدی آ گئی ہے''، ''تمہاری اُڑدی کہاں لگی ہے'' وغیرہ۔ چونکہ ہم قصوری وارڈ میں تھے اس لئے یہاں کے دستور کے مطابق روزانہ اُڑدی ضروری تھی۔ جیل والوں کے پیشِ نظر اس کا کیا مقصد اور کیا فائدہ ہے، یہ تو وہی بہتر جانتے ہوں گے مگر ہمیں اس کا یہ فائدہ نظر آیا کہ اس طرح سے ہمیں کھلی فضاء میں چند سانس لینے نصیب ہو جاتے۔ چند قدم ادھر سے اُدھر چل لیتے، چند لمحوں کے لئے اپنے ساتھیوں کی شکل دیکھ لیتے اور ہاتھ ملا کر اگلے دن تک کے لئے رخصت ہو جاتے۔

جیل کے اندر جیل میں بند ہونے کے باعث پہلے دن تو میں یہ سمجھا کہ اب ہمیں کالے پانی بھیج دیا گیا ہے اور نہ جانے یہاں کیا حال ہوتا ہے! ہمیں دن اور تاریخ کا بھی علم ہوتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ میں نے سوچا کہ تاریخ کا حساب رکھنے کے لئے اپنے کمروں میں ایک کونے پر تاریخ لکھنی شروع کر دی جائے۔ یعنی ہر روز صبح اُٹھ کر اس دن کی تاریخ وہاں لکھ دیا

کروں گا چنانچہ پہلے دن میں نے ایسا ہی کیا لیکن ہمیں دوسرے کمرے میں جانا پڑا تو وہاں جا کر لکھی اور اگلے دن صبح اُٹھ کر پھر لکھی لیکن شام کو جب علم ہوا کہ یہاں تو ہر روز ہی کمرے تبدیل ہوا کریں گے تو یہ خیال چھوڑ دیا۔

اُڑدی لگنے کے بعد اس نئے کمرے میں آکر میں نے اپنا بستر سیٹ کیا جو ایک ٹاٹ، ایک دری اور دو تین کمبلوں پر مشتمل تھا۔ اُس وقت میرے پاس کوئی کتاب تھی نہ رسالہ اور نہ ہی کوئی ایسی چیز جس سے دل بہلا سکتا چنانچہ اسی طرح وقت گزار رہا تھا کہ تین بجے سہ پہر کے قریب کھانا تقسیم کرنے والا آ گیا۔ اُس نے دو بڑی بڑی روٹیاں دیں اور پلیٹ میں دال ڈال دی۔ میں نے ان دونوں چیزوں کو کھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ بعد از کوشش بسیار تھوڑی سی روٹی کے ساتھ دال سے بھری پلیٹ کا محض ایک کونہ ہی خالی کر پایا تھا کہ سیر ہو گیا۔

مشققتی!

یہاں ایک نیا لفظ 'مشققتی' سننے میں آیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پتہ چلا کہ جیل میں سزا کے طور پر جو کام قیدیوں سے لیا جاتا ہے اُسے 'مشقت' کہتے ہیں۔ اور ایسے قیدی جن کی سزا تھوڑی ہو اُنہیں جیل میں غیر مستقل نوعیت کے چھوٹے موٹے کاموں پر لگا دیا جاتا ہے مثلاً پوچا کرنا، جھاڑو دینا، سامان لانا لیجانا یا قیدیوں کا کھانا پکانا اور برتن وغیرہ دھونا۔ اس قسم کے کاموں پر مقرر کئے گئے قیدیوں کو جیل کی اصطلاح میں 'مشققتی' کہا جاتا ہے۔

اچانک ملاقات

کھانا کھانے اور نمازِ عصر کے بعد یونہی بیٹھا تھا کہ اچانک دو صاحبان میرے کمرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ میں نے غور سے دیکھا تو ان میں سے ایک تو ہمارے مکرم میاں نصیر احمد صاحب آف چک نمبر 137/9-L تھے جبکہ دوسرے صاحب میرے لئے اجنبی تھے۔ یہ دونوں اُس وقت اپنے اپنے زیرِ سماعت مقدمات کی وجہ سے اِسی جیل میں بطور حوالاتی بند تھے۔ دوسرے صاحب کا تو پتہ نہیں تھا البتہ نصیر صاحب اپنے ایک مقدماتی حریف کے قتل میں ملوث ہونے کے باعث جون 84ء سے جیل میں تھے۔ ان کے اس واقعہ کو جو سراسر ذاتی نوعیت کا تھا، مخالفین نے مذہبی رنگ دینے کی پوری کوشش کی تھی اور مقتول کو جس کے متعلق ایک زمانہ گواہ تھا کہ وہ پرلے درجہ کا بدمعاش تھا، نعمت علی تیلی سے نعمت علی شہید محض اس لئے بنا دیا گیا کہ اس کے قتل کا الزام ایک احمدی پر تھا اور اس کے لئے ختم نبوت کا پلیٹ فارم استعمال کر کے ضلع ساہیوال میں جماعت کے خلاف شورش پیدا کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی گئی تھی۔

ان دونوں دوستوں سے اس طرح اچانک اور بالکل غیر متوقع ملاقات سے غیر معمولی خوشی ہوئی۔ انہوں نے ہمیں حوصلہ دلایا اور باہر کے حالات سے مختصراً آگاہ کیا۔ یہ دونوں ایک ایک دو دو منٹ کے لئے ہر ساتھی کے پاس گئے اور

پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے واپس چلے گئے۔ فجز اہم اللہ احسن الجزاء۔ اس کے بعد ان کے لئے دوبارہ یہاں آنا تو ممکن نہ ہو سکا تاہم دوران اسیری ان سے ملاقات رہی اور خوب رہی۔

## جیل میں پہلی رات

نمازِ مغرب کے بعد میں لیٹ گیا، اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا! لیٹتے ہی نیند نے آ لیا پھر پتہ نہیں کتنی دیر سویا رہا۔ جب آنکھ کھلی اور باہر دیکھا تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ بس کمرے میں ایک عدد بلب جل رہا تھا جسے دن رات مسلسل جلتا دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس بلب کا کام ہی جلنا ہے، صبح جلنا، شام جلنا، کام اپنا مدام جلنا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سارے جیل کی بجلی کا ایک ہی بٹن تھا اور وہ بھی ڈیوڑھی میں۔ میں اُٹھا اور باہر پڑے گھڑے سے پانی لینے کی کوشش کی جس سے کچھ کھٹکا ہوا تو ایک سپاہی (ملازم جیل) اِس آواز کو سن کر فوراً میرے کمرے کے سامنے آ گیا۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے انتہائی خفیہ ذرائع سے کسی کے فرار ہونے کی خبر ملی ہو! میں نے اُس سے وقت پوچھا تو بولا: چلو چلو سو جاؤ۔ میں نے پھر بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے ڈرایا کہ یہاں رات کو بات کرنے کی اجازت نہیں۔ جیل میں ہم بالکل نئے تھے اِس لئے اس کی بات مان لی اور خاموشی سے وضو کر کے نمازِ عشاء ادا کی اور سو گیا تاہم بعد میں جب گھر کے بھیدی ہو گئے تو رات گئی تک بھی یہاں محفل لگی رہتی۔

## جیل میں دوسرا دِن

نمازِ فجر کے بعد میں ابھی لیٹا ہوا تھا کہ ذرا روشنی ہونے پر ایک صاحب آئے جو اپنی ڈیوٹی ادا کرتے ہوئے ہر کمرے کے سامنے آ کر آواز لگاتے 'اُٹھو بھئی جوان'! اور ایک چھڑی کے ساتھ باہر والے دروازے کی چوکھٹ کو کھٹکھٹاتے ہوئے آگے چلتے چلے گئے۔ یہ صاحب بعد میں ہر روز ہی آتے اور اپنے مخصوص انداز میں آواز لگاتے چلے جاتے کہ 'اُٹھو بھئی جوان!' مگر میں نے کبھی ان کی شکل نہیں دیکھی کیونکہ میں ان کے آنے سے بہت پہلے نماز ادا کر کے دوبارہ سو چکا ہوتا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ایک شخص آ کر میرے کمرے کے سامنے رُکا اور ساتھ ہی بڑا سا ڈول زمین پر رکھنے کی آواز آئی پھر آواز آئی چائے لے لو بھئی۔ چائے کے لفظ سے جسم میں یک دم چُستی آئی اور اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا پھر جیل کے تصور کے ساتھ چائے کا تصور ذرا گدلا سا ہو گیا اور میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ لوں یا نہ لُوں! اس پر اس نے کہا 'بھئی لینی ہے تو جلدی کرو'۔ چنانچہ میں بیڑی کو سنبھالتے ہوئے اُٹھا اور ڈلو میں چائے ڈلوائی لیکن اُسے دیکھتے ہی طبیعت خراب ہو گئی اور چائے سے بھرا ڈلو وہیں رکھ دیا۔ یہ چائے تھی یا برتنوں کا دھوون! میں پھر بستر میں چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو دیکھا کہ ایک وارڈر کے ساتھ جمعدار ہے جو کمرے میں آیا اور اُس کنالی کو جسے

یہاں کی زبان میں گملا کہتے تھے، اُٹھا کر باہر لے گیا اور صاف کر کے تھوڑی دیر میں واپس رکھ گیا۔ اس کے بعد میں بستر سے نکلا۔ مشقتیوں نے کمرے سے باہر پڑے گھڑے تازہ پانی سے بھر دیئے ہوئے تھے، جس سے منہ ہاتھ دھویا اور تر و تازہ ہو کر اپنے کمرے میں آنے والی تھوڑی بہت دھوپ میں اپنا بستر سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ اب بھوک لگ رہی تھی مگر کچھ بھی کھانے کو نہ تھا۔ پڑھنے کو بھی کچھ نہ تھا کہ اسی طرح ہی وقت گزارنے کی کوشش کرتا۔

## ملاحظہ

اُسی دِن دوپہر کو ایک صاحب ایک بڑا سا رجسٹر اٹھائے ہوئے آئے اور میرے کوائف نوٹ کرنے شروع کر دیئے اور آخر میں میرے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا میرے کوائف کے سامنے لگا کر مجھ سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے کہ کل آپ کا ملاحظہ ہوگا۔ ہمارے لئے 'ملاحظہ' کی اِصطلاح بھی بالکل نئی تھی چنانچہ اگلے روز عملاً تجربہ ہوا تو پتہ چلا کہ جیل میں آنے والے ہر نئے شخص کے کوائف نوٹ کر کے پہلے اُسے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور پھر سپرنٹنڈنٹ صاحب جیل کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، جہاں اُسے اپنا نام، ولدیت، پیشہ اور جرم وغیرہ بآوازِ بلند بتانا ہوتا ہے۔ اس عملِ تخیر کو جیل کی زبان میں 'ملاحظہ' کہتے ہیں۔

## پابہ جولاں ہی نہیں دست بہ زنجیر بھی!

اگلے دن 12 ر نومبر کی صبح ہی صبح ہمارے کمروں کے دروازے کھول دیئے گئے اور ہمیں باہر نکلنے کو کہا گیا کیونکہ آج ہمیں ملاحظہ کے لئے پیش کیا جانا تھا۔ چنانچہ ہم سب اپنی اپنی بیڑیاں سنبھالتے ہوئے خوشی خوشی باہر نکلے۔ ہمیں ''ملاحظہ'' کی نہیں بلکہ اس بات کی خوشی تھی کہ چلو چند لمحے ان کمروں سے باہر اپنے ساتھیوں کے ساتھ گزریں گے۔ ابھی ہم 7 بلاک کے بیرونی گیٹ کے پاس پہنچے تھے کہ ہمیں رُکنے کو کہا گیا۔ یہاں ہمارے ہاتھوں کو ہتھکڑیاں لگانی شروع کر دی گئیں اور یہ وہی جگہ تھی جہاں ہمیں پہلے روز بیڑیاں لگائی گئی تھیں۔ اِس سے پہلے جیل سے باہر جس کی قسم کی ہتھکڑیاں پولیس لگاتی رہی اس کے برخلاف اِن ہتھکڑیوں کے ساتھ زنجیر نہیں تھی۔ بہر حال ہمارے دونوں دونوں ہاتھوں کو ہتھکڑیوں سے جکڑ دیا گیا۔ پابہ جولاں تو پہلے ہی تھے، دست بہ زنجیر بھی کر دیئے گئے۔ ہم نے افسرِ مجاز سے اس کی حکمت پوچھی تو اس نے کہا کہ 7 بلاک کے قیدیوں کے متعلق ہدایت اور دستور ہے کہ انہیں جب بڑے صاحب یعنی سپرنٹنڈنٹ جیل کے سامنے پیش کیا جائے تو ہتھکڑیاں لگا کر پیش کیا جائے کیونکہ اس بلاک میں رکھے جانے والے کوئی معمولی مجرم نہیں ہوتے اور چونکہ اُن سے کسی بھی حرکت کا خطرہ ہو سکتا ہے اس لئے انہیں پوری طرح جکڑ کر یہاں لایا اور پیش کیا جاتا ہے۔ تب ہمیں سمجھ آئی کہ ہم اِن دنوں ملک بھر سے تشریف لائے ہوئے نامی گرامی خطرناک ڈاکوؤں،

چوروں، قاتلوں، غداروں اور سمگلروں کے درمیان بس رہے تھے اس لئے ہمیں بھی انہی نگاہوں سے دیکھا جارہا تھا اور ویسا ہی شمار کیا جارہا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں میں دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر لوہے کا یہ زیور پہنے ہوئے ہمارا یہ قافلہ 7 بلاک کے دروازے سے نکل کر ڈیوڑھی کی طرف جانے والی ایک کچی سڑک پر روانہ ہوا جسے جھاڑو دے کر اور پوچا کر کے خوب 'چمکایا' ہوا تھا۔ یہاں ہم بڑی مشکل سے چل رہے تھے کیونکہ ابھی بیڑی سنبھالنی بھی نہ آتی تھی اور اُسے پکڑنے والے ہاتھ بھی باندھ دیئے گئے تھے۔ تاہم پوری احتیاط سے خراماں خراماں چلتے رہے اور اردگرد کے لوگ ہمیں دیکھتے رہے۔ ہر کوئی حیران تھا کہ یہ کیسے خطرناک مجرم ہیں جو بظاہر تو ایسے نہیں لگتے! یہ تاثر شاید اس لئے بھی تھا کہ ابھی تک ہمارے متعلق لوگوں کو پوری تفصیلات کا علم نہ تھا ورنہ ہمارے متعلق ختم نبوّت والوں نے جو بڑے بڑے اشتہار شائع کئے ان کی جلی سُرخی میں تو یہی درج تھا کہ 'قادیانی غنڈوں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے دو مسلمانوں کو شہید کر دیا'۔

7 بلاک سے ڈیوڑھی تک کا مختصر فاصلہ مگر طویل مسافت طے کرنے کے بعد جب ہم ملاحظہ والی جگہ پہنچے تو ہمیں ڈیوڑھی کی جنوبی طرف جانے کو کہا گیا۔ ہم کوٹ موقع (جیل کی بڑی بیرونی دیوار) کے ساتھ ساتھ چل پڑے تو تھوڑا آگے جا کر ایک پلاٹ آ گیا جو سڑک سے قریباً دو فٹ گہرا تھا، اِس میں اُتر کر ہمیں اپنی چادریں، جوتیاں اور جرابیں اُتارنے کا حکم ملا۔ لیکن ہماری ٹانگوں میں بیڑیاں تھیں اور ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے اِس لئے ہمیں یہ سب کچھ اُتارنے میں خاصی محنت کرنی پڑی۔ صرف چادریں ہی اُتارتے ہوئے ہم کئی زاویوں پر جھکے اور مختلف شکلوں میں ڈھلے۔ جوتے اور جرابیں اُتارنے کے لئے ہمیں کیسی کیسی پوزیشن لینی پڑی ہوگی اس کا اندازہ قارئین خود ہی لگالیں۔ جوتے اُتارے تو زمین کی ٹھنڈک ہمارے پیروں میں سے ہوتی ہوئی سارے جسم میں سرایت کر گئی۔ ایک تو موسم سردی کا اور دوسرے وقت صبح سویرے کا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ زمین پر چھڑکاؤ بھی کیا ہوا تھا اور چوتھے یہ کہ ہم ننگے پاؤں تھے۔ اس طرح سے ہمیں بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں جکڑ کر اس ماحول اور زمین پر گویا پھینک دیا گیا۔ پھر پہلے اسی پلاٹ میں جیل کے رجسٹر میں مندرج ترتیب کے مطابق کھڑا کیا گیا جو مندرجہ ذیل تھی۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ رانا نعیم الدین | ۲۔ محمد نثار | ۳۔ محمد حاذق | ۴۔ محمد الیاس منیر |
| ۵۔ چوہدری محمد اسحٰق | ۶۔ عبد القدیر | ۷۔ ملک محمد دین | |

اِس کے بعد ہمیں لائن بنا کر ڈیوڑھی کی جانب چلنے کو کہا گیا۔ ڈیوڑھی سے ذرا اِدھر ''کوٹ موقع'' (جیل کی بڑی بیرونی دیوار یا فصیل) کے سایہ میں ایک خیمہ نصب تھا جس کے سامنے والے حصہ کو اُٹھا کر کیبن سا بنا دیا گیا تھا اور اُس کیبن میں ایک میز اور دو تین کرسیاں بچھا کر دفتر کا سا سماں پیدا کر دیا گیا تھا۔ اُس کیبن کے سامنے کچھ فاصلہ پر ہمیں اور

ہمارے علاوہ دوسرے ''ملاحظہ'' والے حوالاتیوں کو سیدھی قطار میں بٹھا دیا گیا۔ ہم یہاں قریباً گیارہ بجے تک دم سادھے بٹھائے رکھے گئے۔ یہاں سُرخ ٹوپیاں پہنے نمبرداروں کی فوج موجود تھی جو ہر قسم کے نظم و نسق کے ذمہ دار تھے۔ (یہ نمبردار سینئر قیدیوں میں سے مقرر ہوتے اور جیل کے اندر ہر جگہ قیدیوں کو کنٹرول کرنے کا کام ان سے لیا جاتا) اس کے علاوہ ایک دو اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ صاحبان بعض سپاہیوں کے ہمراہ بڑے صاحب یعنی سپرنٹنڈنٹ جیل کا اِنتظار کر رہے تھے۔ اچانک ہلکا سا 'ہوشیار' کرایا گیا اور پھر ایک باوردی افسر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ چہرہ لئے تشریف لائے۔ اُن کے کندھوں پر تین ستارے تھے اور یہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ضیاء اللہ تھے۔ انہوں نے آتے ہی میز پر پڑا رجسٹر کھولا اور ادھر ہم سب بیٹھے ہوؤں کو کھڑا کر دیا گیا۔ پھر باری باری ہر حوالاتی کو پکڑ کر پوچھا جانے لگا کہ تیرا ناں (تمہارا نام)، پیئو دا ناں (باپ کا نام) اور اس کے ساتھ ہی صاحب رجسٹر پر دستخط کرتا اور حوالاتی کو اس قطار کے ساتھ ہی ایک دوسری قطار میں کھڑا ہونے کو کہا جاتا۔

## یہ مرزائی ہیں!!

ملاحظہ شروع ہوا تو ہماری باری سے پہلے تین چار دوسرے حوالاتی پیش کئے گئے۔ جب ہماری باری آئی تو رانا نعیم الدین صاحب کو دیکھتے ہی ڈپٹی صاحب نے قلم رجسٹر کی طرف لے جانے کی بجائے منہ میں دبا لیا اور پوچھا ان کو ہتھکڑیاں کیوں لگائی ہیں؟ کسی ماتحت نے جواب دیا سر! یہ مرزائی ہیں اور 7 بلاک سے آئے ہیں۔ اس پر صاحب نے کچھ کہے بغیر رجسٹر پر دستخط کئے اور اسی طرح سب کا باری باری ملاحظہ کیا۔ اس کے بعد صاحب واپس چلے گئے تو ہمیں اجازت دینے کی بجائے پھر اُسی پہلی جگہ قطار میں جا بیٹھنے کو کہا گیا جہاں پہلے ہم قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ابھی بڑے صاحب نے ملاحظہ کرنا ہے۔

اِنتظار بسیار کے بعد جبکہ ہمیں زمین کی ٹھنڈک کا احساس بھی کم ہونے لگا اور سورج بھی سر چڑھ کر چمکنے لگا تو ڈیوڑھی میں ہوشیار! ہوشیار! کا شور برپا ہو گیا! ہم بھی ہوشیار ہوئے تو پتہ چلا کہ بڑا صاحب آ گیا ہے۔ ہم حیران رہ گئے کہ اِتنی ٹور ہے صاحب کی! صاحب ڈیوڑھی سے برآمد ہونے کے بعد سیدھا جیل کے اندر چلا گیا اور جیل کا دورہ کر کے قریباً آدھے گھنٹہ کے بعد ملاحظہ والے خیمہ کے پچھلی جانب پہنچا تو اس کی آواز کچھ ایسی سنائی دی جیسے کسی ماتحت کو ڈانٹ رہا ہو، پھر آواز آئی چلو اب ملاحظہ کراؤ۔ صاحب کا خیمہ کی طرف آنا تھا کہ اِدھر کھڑے کیا افسر، کیا ملازم اور کیا قیدی سب کے سب ہوشیار ہو گئے۔ ایک ملازم نے بآوازِ بلند کہا ہوشیار!! ہمیں ایک دفعہ پھر کھڑا کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی ملاحظہ شروع ہوا، اِس بڑے صاحب کا نام مفتی سرفراز احمد تھا اور فوج میں کیپٹن ہوا کرتا تھا اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے

وقت اُدھر ہی تھا۔ بھارتی جیل میں قید کاٹنے کے بعد وطن واپس آ کر جیل کی نوکری کر لی تھی۔ ہمارا یہ ملاحظہ لودھی کے نام کے ایک اسسٹنٹ سپر نٹنڈنٹ نے کرایا۔ اُس کے ہاتھ میں ہمارے ٹکٹ تھے اور باری آنے پر یہ افسر بڑی بے دردی کے ساتھ ہر ایک کا نام بولتا پھر کہتا: پیو دا ناں (یعنی باپ کا نام بتاؤ!)، ہم نام بولتے تو وہ پوچھتا تاریخ پیشی؟ ہم کہتے '24 نومبر' تو وہ ہمارے جرم یعنی 109, 148/149, 302 اور 77MLO پڑھ کر سناتا اور ادھر صاحب بہادر رجسٹر پر دستخط کرتے اور ہمیں فارغ کر کے پیچھے بھیج دیا جاتا جہاں ہمیں پھر ایک قطار میں بٹھا دیا جاتا۔ ملاحظہ ختم ہونے کے فوراً بعد اپنے ٹھکانہ کی طرف ہماری واپسی کا سفر شروع ہوا۔ ہمیں ہمارا نگران بار بار کہے جا رہا تھا کہ جلدی کرو، میرے وقفہ کا وقت شروع ہو چکا ہے اور میں نے تمہیں بند کر کے گھر جانا ہے لیکن کیسے جلدی کرتے! ہم پا بہ جولاں ہی نہیں دست بہ زنجیر بھی تھے جس کی وجہ سے ایک حد تک ہی تیز چل سکتے تھے۔ ہم واپس پہنچے تو ہماری ہتھکڑیاں کھول دی گئیں اور اپنے اپنے کمروں میں چلنے کو کہا گیا۔ چنانچہ ہم اپنی اپنی بیڑیوں کو سنبھالتے ہوئے اپنے کمروں میں جا بند ہوئے جہاں ہمیں لنگر کا کھانا Serve کیا گیا جسے ہم نے بڑے شوق سے کھایا کیونکہ اب تک اس کھانے سے کافی حد تک مانوس ہو کر سمجھوتہ کر چکے تھے اور بھوک بھی خوب چمکی ہوئی تھی۔ کھانا کھا کر معمول کے مطابق لیٹنے، سونے، بیٹھنے اور تھوڑا بہت چل پھر کر وقت گزارنے کا عمل شروع ہو گیا۔ کبھی کبھار اپنے ساتھیوں سے ''فضائی رابطہ'' پر گفتگو بھی کر لیتے۔

جیل میں تیسرے دِن تک ہم میں سے کسی کی بھی اپنے عزیزوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بس نے اپنے ایک نگران سے پوچھا کہ آیا ہماری ملاقات نہیں ہوا کرے گی؟ (ہمارے ساتھ اب تک جو سلوک ہو رہا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ہمیں حوالات کی طرح یہاں بھی ملاقات سے محروم ہی رکھا جائے گا!) اُس نے جواب دیا: نہیں تو، آپ کی ملاقات ضرور ہو گی۔ چنانچہ اگلے روز ایک شخص نے آ کر پوچھا کہ چوہدری اسحق کون ہے؟ اس پر اُسے چوہدری صاحب کی چکی کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ جس پر چوہدری صاحب کو چکی سے باہر نکال کر باہر لے گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کی ملاقات ہے جس پر ہم سب بڑی بے چینی سے چوہدری صاحب کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہاء نہ تھی کہ کسی کی تو ملاقات آئی ہے۔ کافی دیر بعد چوہدری اسحاق صاحب واپس آئے تو انہوں نے اُحباب جماعت کی تڑپ اور ہمارے لئے جس اذیت میں وہ مبتلا تھے، اس کا مختصراً حال بتایا اور کیس کے سلسلہ میں کی جانے والی کوششوں کا ذکر کیا جس میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ساتھ رابطہ بھی شامل تھا۔ انہوں نے کہا کہ بس آپ صبر کریں، حوصلہ رکھیں، ہمت کا مظاہرہ کریں اور یہ کہ سب احباب محبت بھرا اسلام کہتے تھے۔ چند لمحوں کی اس ملاقات کے بعد چوہدری صاحب پھر اپنی چکی میں بند کر دیئے گئے۔

## بیڑی سے نجات

اگلے روز یعنی 14 نومبر کو رانا نعیم صاحب اور حاذق صاحب کی ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے واپس آ کر مجھے بتایا کہ تمہاری ملاقات کل ہوگی۔ ان دوستوں کی ملاقاتیں ایک بجے کے قریب ہوئی تھیں لیکن جمعرات کو دس بجے ہی ہماری ملاقات کا پرچہ آ گیا۔ میرے ساتھ محترم ملک محمد دین صاحب، عزیزم محمد نثار صاحب اور عزیزم عبدالقدیر صاحب کو بھی ملاقات کے لئے نکالا گیا۔ جب ہم بیڑیاں سنبھالتے ہوئے اپنے وارڈ سے نکل کر 7 بلاک کے بیرونی دروازے کے قریب پہنچے تو ہمیں یہیں ٹھہرنے کو کہا گیا۔ ہم نے سمجھا کہ شاید ہیڈ وارڈر صاحب کا اِنتظار ہے کیونکہ وہی ساتھ لے جایا کرتے ہیں۔ ہم وہیں کھڑے تھے کہ ملک صاحب بولے کہ یار میری بیڑی تو پتہ نہیں کیسی ہے، ہروقت پھنسی یعنی اُلجھی رہتی ہے۔ (بیڑی کا الجھنا بے حد تکلیف دیتا ہے کیونکہ اِس کے اُلجھنے کی وجہ سے انسان کے لئے چلنا پھرنا تو دور کی بات، ٹانگیں ہلانا بھی مشکل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ آرام سے بیٹھنا بھی ممکن نہیں رہتا)۔ اِس سے قبل بھی اپنی چکی میں بند ہونے کی حالت میں ہر روز ہی ملک صاحب آواز دیتے کہ میری بیڑی پھنسی ہوئی ہے مگر ان کی مدد کرنا ہمارے لئے ممکن نہ ہوتا۔ اب جبکہ ہم آمنے سامنے تھے میں نے ملک صاحب کی بیڑی کو دیکھا تو بالکل ویسا ہی پایا جیسے میری بیڑی بھی شروع میں پھنس جایا کرتی تھی اور اس کو صحیح کرنے کا طریق مجھے تو آ گیا ہوا تھا جس کے مطابق میں نے بیٹھ کر ملک صاحب کی بیڑی کے نچلے حلقوں کو خاص طریق سے گھمایا تو وہ بالکل صحیح ہوگئی۔ اس پر ملک صاحب کہنے لگے بس اتنی سی بات تھی؟ میں نے کہا جی ہاں پھر انہیں اس کا طریقہ سمجھا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اکرم نامی ڈیوڑھی منشی پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اندر داخل ہوا اور کہا کہ انہیں لے کر کیوں نہیں چلتے، ڈپٹی صاحب بار بار بلا رہے ہیں!؟ اس کے ہاتھ میں ملک صاحب کے نام کی چِٹ بھی تھی۔ ہمارے نگران رفیق بھٹی نے کہا کہ لوہار کو بلایا ہے وہ آ کر بیڑیاں اُتارے گا تبھی یہ جائیں گے۔ ہم یک دم چونک پڑے اور پوچھا کیا ہماری بیڑیاں اُتر جائیں گی؟ انہوں نے کہا ہاں۔ ہمیں یقین نہ آیا، خوشی سے چھلانگیں مارنے کو جی چاہا مگر ابھی بیڑیاں لگی ہوئی تھیں!! اُس وقت ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب ہم نے واقعۃً لوہار کے ہاتھوں اپنی بیڑیاں اُترتی دیکھیں۔ اُس نے دیکھتے ہی دیکھتے ہم سب کی بیڑیاں اُتار دیں۔ ملاقات کے لئے ہمارے روانہ ہونے کے بعد باقی ساتھیوں کی بیڑیاں بھی اُتار دی گئیں۔ کچھ دیر تک بیڑیوں کے بغیر ہمیں عجیب سا لگتا رہا جیسے کسی چیز کی کمی ہو۔ لوہے کی جھنکار تھی نہ چلتے ہوئے بار بار جھک کر بیڑی کو سنبھالنے اور درست کرنے کی ضرورت رہی تھی۔ جسم بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُسی روز صبح چوہدری محمد اسحٰق صاحب نے ہمیں بتایا کہ مجھے خواب میں ایک بزرگ ملے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ تم درود شریف پڑھو،

تمہاری یہ مشکل دور ہو جائے گی۔ چنانچہ صبح سے ہم درود شریف پڑھنے میں مصروف تھے چنانچہ ہماری یہ مشکل، بہت بڑی مشکل دُور ہو گئی۔ یہ یقیناً اسی کی برکت تھی۔ الحمدللہ ثمّ الحمدللہ۔

## پہلی ملاقات

آج پہلی مرتبہ ملاقات کے لیے ڈیوڑھی گیا تو دیکھا کہ بہت سے احباب جماعت تشریف لائے ہوئے تھے۔ ربوہ سے ابا جان مکرم محمد اسماعیل منیر صاحب، میرے خسر محترم محمد شفیق صاحب، برادرم مکرم امداد الرحمٰن صاحب بنگالی مربی سلسلہ، ناظر صاحب اصلاح وارشاد کے نمائندہ مکرم حبیب اللہ باجوہ صاحب، چوہدری ابراہیم صاحب آف انصار اللہ غرضیکہ ربوہ سے پوری ویگن بھر کر دوست آئے ہوئے تھے۔ گوجرانوالہ سے ماموں عبد المجید صاحب، منڈی بہاؤالدین سے بہنوئی مکرم ظہور الدین بابر صاحب، لاہور سے خالو محمود خان صاحب اور عزیزم محمد امجد صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ان سے کاغذ اور پنسل لیکر میں نے سب سے پہلے تو وہاں کھڑے کھڑے حضور رحمہ اللہ کی خدمت میں خط لکھا اور سر میں پھیرنے کے لئے اُن سے چھوٹی سی کنگھی بھی لی۔

ملاقات کے دوران سب دوستوں کے والہانہ اظہارِ محبت وشفقت کو دیکھ کر ایمان میں بے پناہ اضافہ اور نیا ولولہ پیدا ہوا۔ اِسقدر جوش وجذبہ کا مجھے تصور بھی نہ تھا۔ ہر کوئی نچھاور ہوئے جا رہا تھا لیکن درمیان میں جالی حائل تھی جس کے سوراخوں میں سے صرف اُنگلی کا پہلا پورا ہی نکل سکتا تھا اور اُسی سے ہی ہر کسی سے سلام کرتا رہا تاہم جالی کے اوپر نیچے کچھ ایسی درزیں موجود تھیں جن سے چھوٹی موٹی چیز لی جا سکتی تھی۔ ہماری بیڑیاں اُترنے کا علم ہمارے ملاقاتیوں کو ملاقات کے دوران ہی ہوُا۔ اسی وجہ سے وہ پہلے ہماری ٹانگوں اور پیروں کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے رہے تاکہ ہمیں احساس دلائے بغیر ہماری حالت کا مشاہدہ کرلیں۔ کئی دوستوں کو بیڑیاں اُترنے کا یقین نہ آیا تو میں نے شلوار اونچی کر کے انہیں اپنے ٹخنے دِکھائے تب انہیں یقین آیا۔ ملاقات کے بعد واپسی کا سفر شروع ہوا لیکن اس سے پہلے ملاقاتیوں کا بھجوایا ہوا سامان آیا تو اس کی تلاشی کرائی۔ واپس پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے ملے، باہر کی خبریں بالخصوص حضورؒ کا خواب کہ "مرزا مظفر احمد آئے ہیں اور السلام علیکم کہتے ہیں" سنایا اور بیڑیاں اُترنے کی مبارکباد دی اور پھر اپنے کمروں میں بند کردیئے گئے۔

چونکہ 7 بلاک کے وارڈ نمبر 3 میں خطرناک ترین مجرموں کو رکھا جاتا تھا اور وہ بھی بیڑیاں لگا کر، اس لئے آج شام جب 'اُڑدی' لگی تو ہماری گنتی وارڈ نمبر 3 سے وارڈ نمبر 1 میں ڈال دی گئی اور شاید اس لئے بھی کہ پانچ دِنوں کے بعد ہماری خطرناکی میں کسی قدر کمی واقع ہو گئی تھی۔ یہ پہلے پانچ دِن ہم نے کیسے گزارے، ہمیں بھی پتہ نہیں تاہم یہ یقین

ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بے اِنتہا فضل سے ہم سب کو ہی حوصلہ اور ہمت کے ساتھ یہ دن گزارنے کی توفیق دی۔

اسیری کے ان ابتدائی ایام میں پہلے دو تین دن تو ہاتھ دھونے کے لئے صابن بھی نہ تھا۔ ایک دن علم ہوا کہ نثار کو گھر سے ماسٹر صاحب (نثار صاحب کے ایک غیر از جماعت ہمسائے جو جیل میں ملازم تھے) کے ذریعہ صابن کی ایک ٹکیہ آئی ہے۔ میں نے اس سے تھوڑا سا ٹکڑا مانگا تو اس نے صابن کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر بھیج دیا اور اس طرح کئی دنوں کے بعد میں نے صابن سے منہ ہاتھ دھویا تھا۔

## ایک نیا تجربہ

ایک خاص بات ان ایام کی یہ ہے کہ اس دوران طبیعت میں شدید ہیجان رہا کہ مولیٰ! یہ کیا ہو رہا ہے ہم نے آخر کیا قصور کیا ہے! اسی طرح حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ رضی اللہ عنہا کا یہ شعر بڑی کثرت سے وِردِ زبان رہا ے

مولیٰ! سَمومِ غم کے تھپیڑے پَیہ پَیہ — اب اِنتظامِ دفعِ بلیات چاہیئے

علاوہ ازیں سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اِس شعر کے الفاظ میں بڑے زور اور کثرت سے دعا کی کہ

جلد آ پیارے ساقی! اب کچھ نہیں ہے باقی — دے شربتِ تلاقی حرص و ہوا یہی ہے

ایک روز مغرب کی نماز کے دوران سجدہ میں ''جلدی'' کے مفہوم پر مشتمل بڑے جوش سے دعا کر رہا تھا اور سارے جسم میں سخت ارتعاش تھا اور بڑا جوش تھا کہ اچانک میرے دل سے 'لَا تَسْتَعْجِلُوا، لَا تَسْتَعْجِلُوا' (جلدی نہ مانگو، جلدی مت کرو) کے الفاظ بلند ہو کر بڑی تیزی کے ساتھ میرے کانوں سے ٹکرائے اور ایک دم میرے سارے جسم پر سکتہ طاری ہو گیا، سارے جسم میں ٹھہراؤ آ گیا۔ یہ میرے دل کی آواز تھی یا میرے خیالات کی اِصلاح کے لئے ایک تنبیہ تھی جو خدا نے میرے سمجھانے کے لئے میرے دِل میں ڈالی۔ میری زندگی میں ایسا تجربہ پہلی مرتبہ ہوا، اِس کے بعد میں نے نہایت پُرسکون ہو کر نماز پڑھی۔ وہ دن اور آج کا دن میں 'جلدی' کا لفظ اپنی دعاؤں میں دوبارہ نہیں لایا بلکہ اس کا ذرا سا مفہوم رکھنے والے الفاظ میں بھی دعا کرنے سے حتی المقدور پوری پوری احتیاط کی اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس کے بعد یہی کہا کہ جلدی طلب نہ کرو اور اپنی دعاؤں سے جلدی کے الفاظ نکال دو، یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو عقلِ کل ہے، وہ حکمت بالغہ کا بھی مالک ہے جبکہ ہم نادان ہیں، اُس کی مصلحتوں اور قدرتوں کو کیا سمجھیں۔ اس نے ہماری بھلائی اور ترقی کے لئے جو منصوبہ سوچ رکھا ہے وہ ہمارے لئے انتہائی مفید ہونے کے ساتھ ساتھ نہ معلوم کتنا طویل ہے۔ اس لئے ہمیں عاجزی اور پوری فرمانبرداری کے ساتھ اپنے عہدِ وفا کو نبھاتے ہی چلے جانا چاہیے، چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ!

## دوسرے قیدیوں سے ملنے جلنے کی سہولت

ابتداء میں کچھ دن ہمیں وارڈ کے بالکل آخری کمروں میں رکھا گیا تا کہ ہم باقی لوگوں کے ساتھ مل جل نہ سکیں لیکن ایک روز جو'اُڑدی' آئی تو باقی لوگوں کیساتھ ہمارے کمرے ملا جلا دیئے گئے۔ ہم بکھر جانے پر اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے افسوس کر ہی رہے تھے کہ وہی آدمی دوبارہ آیا اور اس نے نئی 'اُڑدی' سنائی جس میں ہمیں حسب سابق دیگر قیدیوں سے الگ ہی رکھا گیا تھا اور ہماری 'اُڑدی' آپس میں ہی لگائی گئی تھی۔ تاہم جب جمعرات کو ہماری بیڑیاں اُتر گئیں اور ہمیں وارڈ نمبر 3 سے وارڈ نمبر 1 میں منتقل کیا گیا تو اُس روز پھر ہماری اُڑدی ملا جلا کر لگائی دی گئی۔ اس طرح ہمارا دیگر قیدیوں سے تعارف ہونے لگا جن میں بعض سیاسی قیدی تھے اور بعض بارڈر کراس کرنے کے جرم میں سزا یافتہ تھے۔ پہلے روز میرے دائیں طرف ایک سردار صاحب تھے اور بائیں طرف والے سیل میں بہاولنگر کا ظاہر شاہ نامی ایک قیدی تھا۔ بند ہونے کے تھوڑی دیر بعد ظاہر شاہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور علیک سلیک کے بعد گفتگو شروع ہوئی تو ہمارے وقوعہ کی باتیں سن کر وہ بے اختیار بولا: 'پھر تو آپ آدمی نہیں سؤر مار کر آئے ہیں'۔ خیر باتیں کرتے ہوئے نماز کا وقت ہو گیا تو میں نے اس سے کہا کہ میں تو اب نماز پڑھنے لگا ہوں تو وہ بولا کہ اس نے تو نمازیں چھوڑ دی ہوئی ہیں کیونکہ اُس نے بہت سے فرقے دیکھے ہیں کسی میں بھی سکون میسر نہیں آیا۔ بس یہ بات کرنے کی دیر تھی کہ اپنا اصل مضمون شروع ہو گیا۔ اسے جماعت کا تعارف کرایا اور نماز کی اہمیت اور اس کی روح بتا کر اسے نماز پڑھنے کی تلقین کی۔ اس مضمون پر رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں جنکا اُس پر خاطر خواہ اثر ہوا، الحمدللہ۔

اِس وارڈ میں وارڈ نمبر 3 سے زیادہ رونق تھی جس کی دو تین وجوہ تھیں: ایک تو یہ کہ ادھر ایک ہی مقدمہ میں سزا یافتہ چھ سات ساتھی اکٹھے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ادھر کوئی خطرناک یا عادی مجرم نہیں تھے بلکہ عام طور پر پڑھے لکھے اور سمجھدار قیدی تھے۔ تیسرے یہ کہ اس وارڈ میں 13 نمبر چکی تک تو سامنے کے علاوہ درمیان میں بھی دیواریں تھیں مگر ہماری چکیوں کے درمیان دیوار نہ تھی جس کی وجہ سے دروازے میں بیٹھ کر دوسرے ساتھی کے ساتھ بآسانی گفتگو ہو سکتی تھی چنانچہ یہاں رات گئے تک گپ شپ رہتی، گانے گائے جاتے، لطائف چلتے اور جاندار قہقہے بلند ہوتے۔ گویا جیل کے اندر جیل ہونے کے باوجود زندگی اور زندہ دِلی کا نظارہ ہوتا اور ظاہر ہے یہ سب کچھ دراصل وقت کو دھکا دینے کیلئے ہی تھا۔

علاوہ ازیں یہاں سے سامنے والی وارڈ نمبر 2 کے قیدیوں سے بھی براستہ روشن دان رابطہ ممکن تھا جہاں اکثر سزائے موت کے ایسے قیدی رکھے جاتے تھے جن کی اپیلیں تو زیر سماعت ہوتیں مگر وہ خطرناک بھی ہوتے۔ یا پھر ایسے سزائے

موت یافتہ قیدی ہوتے جن کی تاریخ لگ گئی ہوتی یعنی جن کی رحم کی آخری اپیل بھی مسترد ہو چکی ہوتی اور انہیں پھانسی دینے کی تاریخ مقرر ہو چکی ہوتی، انہیں یہاں لایا اور آخری دن تک رکھا جاتا۔ ان پر پکا پہرہ ہوتا یعنی ایک وارڈر (جیل پولیس کا سپاہی) ہر وقت اس کے کمرے کے سامنے باہر کھڑا رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہتا اور اس کی ضروریات کا خیال بھی رکھتا۔ ایسے قیدی سزا سے ایک دن پہلے یہاں سے شام کے وقت نکالے جاتے اور آخری ملاقات کے لئے سکول کے احاطہ میں لیجائے جاتے پھر وہاں سے پھانسی گھاٹ والے پھانسی پہرہ کی آخری چکی میں لے جا کر بند کر دیئے جاتے ہیں، جہاں سے اگلے روز صبح صبح نکال کر سزا دے دیئے جاتے ہیں۔ جس روز سزا دیتے اُس روز نعش کو ورثاء کے سپرد کر دیئے جانے تک سارے جیل کی گنتی نہ کھلتی۔ جتنا عرصہ ہم 7 بلاک میں رہے، اُس دَوران میں تو چار پانچ قیدیوں کو سزائے موت دی گئی تاہم بعد میں جب تک پھانسی گھاٹ والی وارڈ میں رہے، ایک کے سوا کسی کو جیل کے پھانسی گھاٹ میں سزا نہ ہوئی۔

## گھر کا کھانا

کچھ دِنوں تک تو ہم جیل کا کھانا ہی کھاتے رہے پھر گھر سے کھانا آنے کی اِجازت مل گئی۔ کئی دِنوں تک اُبلی ہوئی دال کے ساتھ روٹی کھاتے رہنے کے بعد گھر کا کھانا کھایا تو گھر کی قدر معلوم ہوئی، الحمدللہ۔ یوں تو یہاں گوشت بھی ہفتہ میں ایک مرتبہ پکتا تھا مگر ایسا سالن ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ جو یخنی نما پانی پر مشتمل ہو اور اس میں اُبلے ہوئے گوشت کی عجیب وغریب ماہیت کی معدودے چند بوٹیاں!

جب تک ہمارے کھانے کے ساتھ چائے کی منظوری نہیں ہوئی تھی اُس وقت تک ہمارے کھانے کے ساتھ دودھ آتا رہا جسے کھانے کے ساتھ ہی ہر ایک کو اس کے ڈَبّو میں ڈال کر دے دیا جاتا۔ دودھ ٹھنڈا ہوتا اور کھانے کے بعد خاص طور پر اس حالت میں کہ سلاخوں کے پیچھے تنگ کمرے میں 24 گھنٹے بند رہنا ہوتا، پینے کو جی تو نہ کرتا تھا مگر پی لیتے کہ گھر سے آیا ہے اور پھر دودھ ہے بھی اللہ کا خاص تحفہ! چند روز بعد دودھ بند ہو گیا اور چائے آنی شروع ہو گئی جو موسم کے مطابق ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، الحمدللہ۔ ہم نے موسم سرما کے سترہ دنوں کی ریکارڈ مدت کے بعد چائے پی! اِس سے پہلے موسم سرما تو ایک طرف رہا شاید موسم گرما میں بھی کبھی اِتنا لمبا وقفہ نہ ہوا ہو گا۔ ہر چند کہ جیل میں صبح کے وقت چائے Serve تو ہوتی تھی مگر اُسے پینے کو کسی کا دل نہ چاہتا۔ پہلے پہل تو گھر سے آنے والی چائے ایلومینیم کے ڈَبّو میں ہی پیتے رہے، جس میں پڑی رہنے سے کھانا کھاتے کھاتے ٹھنڈی ہو جاتی لیکن کچھ دنوں بعد محترم ملک صاحب ملاقات پر گئے تو پلاسٹک کے چھ کپ لے آئے۔

گھر سے کھانا آنے کے ضمن میں عرض کردوں کہ دسمبر 84ء سے 16 فروری 86ء کی دوپہر تک کھانا تیار کرنے اور ہمیں پہنچانے کی غیر معمولی خدمت ہمارے اسیر ساتھی مکرم ملک محمد دین صاحب کے بیٹے برادرم مکرم ملک نعیم الدین صاحب بڑی محنت، صبر اور ذمہ داری سے سرانجام دیتے رہے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ یہ دونوں اب اس دنیا میں نہیں ہیں، ملک صاحب تو دورانِ اسیری ہی وفات پا کر شہادت کا رُتبہ پا گئے جبکہ ان کے بیٹے برادرم مکرم نعیم الدین صاحب 2002ء میں ایک طویل تکلیف دہ بیماری کے باعث انتقال کر گئے، اللہ تعالیٰ ہر دو کے ساتھ مغفرت کا سلوک فرمائے، آمین۔

### وارڈ نمبر 1 کی چکیاں

یوں تو وارڈ نمبر 1 میں نسبتاً کم سختی تھی مگر یہاں نئی قسم کے مسائل تھے جن میں چکی کے فرش پر سے پانی کے نکاس کا مسئلہ بہت گھمبیر تھا۔ اکثر چکیوں کے فرش خراب تھے اور پانی باہر جانے کی بجائے اندر کی طرف آتا۔ ایک دو چکیوں میں تو پانی کا بہاؤ بستر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا چنانچہ ایک دو مرتبہ کے تلخ تجربہ کے بعد یہ طریق اختیار کر لیا تھا کہ جس روز ایسی چکی میں اُڑدی لگتی، اُس روز بند ہونے سے پہلے باہر ہی وضو کر لیتے اور اگلے روز تک تیمم کے احکام پر عمل کرتے۔

یہاں آنے کے دوسرے دن ہمیں پیشاب وغیرہ کرنے کے لئے دی گئی کنالیاں واپس لے لی گئیں اور ان کی بجائے ٹین کے بنے ہوئے زنگ آلود پرانے مستطیل شکل کے ڈبے دے دیئے گئے جن کو پترے کہتے تھے یہ پترے معلوم نہیں کب کے بنے سٹور میں پڑے تھے۔ ان کے جوڑ اچھی طرح ملے ہوئے نہ تھے جس کی وجہ سے ان میں سے پانی نکلتا رہتا تھا بلکہ ان میں رہتا ہی نہ تھا اور ہماری چکیوں کے فرشوں کے متعلق تو آپ پڑھ چکے ہیں کہ اکثر کی نشیب اندر کی طرف تھی۔ پیشاب کرنے کے لئے بھی چونکہ دروازے کے سامنے والی جگہ استعمال کرنی ہوتی اس لئے ہوتا یہ کہ اِدھر پیشاب کرتے اُدھر ہمارے فرش پر گندا پانی پھیل جاتا۔ اس طرح سے پانی اندر کی طرف بہتے چلے آنے کی وجہ سے صورت حال ناقابلِ بیان حد تک تکلیف دہ ہوتی گویا قیدیوں کو ذہنی، روحانی اور جسمانی ہر طرح سے تنگ کرنے کا یہ بھی ایک طریق تھا اور بہت ہی گھٹیا طریق! مگر ہم جیل اندر جیل میں تھے، کیا کر سکتے تھے؟

### مطالعہ کا آغاز

وارڈ نمبر 1 میں آنے کے بعد اِردگرد کے قیدیوں سے پرانے رسالے اور اخبار لے کر پڑھنے شروع کئے، اِس طرح وقت گزارنے کا معقول ذریعہ میسر آ گیا۔ پھر دوسری ملاقات پر مجھے درثمین، تذکرۃ الشہادتین اور تحدیث نعمت مل گئیں

جن سے میں حقیقی مطالعہ کے ماحول میں آ گیا۔ اِن کتابوں نے غیر معمولی لطف دیا اور بڑا گہرا اَثر چھوڑا۔ یقین کیجئے کہ اِن کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی رسالہ یا ڈائجسٹ کو ہاتھ لگانے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ تذکرۃ الشہادتین نے ہمیں آئندہ حالات کے لئے تیار کر دیا اور تحدیث نعمت اپنے تفصیلی واقعات کے اعتبار سے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ یہ بڑی ہی گہری اور عمدہ اور شستہ تحریر والی معلوماتی کتاب ہے جس میں جگہ جگہ روحانی تربیت کے سامان ہیں۔ جب مصنف کتاب حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحبؓ مرحوم اپنی ہر خوبی اور کارنامے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے اس کا احسان قرار دے کر سَجَدَلَکَ جَسَدِیْ وَ رُوْحِیْ وَجَنَانِیْ کے مناظر پیش کرتے ہیں تو پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ اتنے بلند مراتب پر فائز رہنے والا شخص بھی اس طرح اپنی کم مائیگی اور خاکساری کا اظہار کر سکتا ہے! چوہدری صاحب موصوف نے اس مؤثر انداز میں اپنی یہ آپ بیتی سپردِ اشاعت کر کے ہم سب پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کارِ عظیم کی جزائے عظیم عطا فرمائے، آمین۔

## تازہ نظر

وارڈ نمبر 1 میں پہلے دن میرے ساتھ والے کمرے میں بند قیدی ظاہر شاہ نے مجھے پوچھا کہ قادیانی کسے کہتے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمیں ہی کہتے ہیں تو اس نے کہا کہ آپ کے متعلق شرعی کورٹ میں جو مقدمہ ہوا تھا اس کا تفصیلی فیصلہ کل کے جنگ میں شائع ہوا ہے۔ میں نے پوچھا تمہارے پاس وہ اخبار ہے؟ اُس نے اِثبات میں جواب دیا تو میں نے کہا کہ پھر مجھے بھی بھیجو۔ اس نے اپنے سے ایک دو چکیاں دور بند قیدی کو آواز دے کر کہا کہ ذرا 'تازہ نظر' بھجواؤ۔ میں نے پوچھا یہ 'تازہ نظر' کیا ہے! کہنے لگا کہ یہاں اخبار کی اجازت نہیں ہے اور ہم خفیہ طور پر منگواتے ہیں اور خفیہ ہی رکھتے ہیں اور خفیہ زبان میں اس کا نام 'تازہ نظر' رکھا ہوا ہے، میں نے کہا بہت خوب! قیدیوں نے بھی اپنے کام نکلنے کے لئے کیسی راہیں نکال رکھی ہیں پھر اس نے مجھے وہ اخبار بھجوایا۔ اس طرح میں نے جیل میں پہلی مرتبہ اَخبار دیکھا اور پڑھا۔ اُس میں بعض احباب جماعت کی طرف سے آرڈیننس 20 کے خلاف دائر کی گئی رِٹ پٹیشن پر سماعت کے بعد شرعی عدالت کے فیصلہ کی ایک قسط تھی۔

## جمعہ کی بجائے نمازِ ظہر

میری پہلی ملاقات جمعرات 15 ر نومبر کو ہوئی تھی جس سے اَگلے روز جمعہ تھا اور اُسی روز پہلی مرتبہ میں نے جیل میں کپڑے تبدیل کئے۔ اگر چہ نہا تو نہ سکا کیونکہ اُس روز جس چکی میں تھا وہاں نہانا ممکن نہ تھا تاہم اچھی طرح سے وضو کر کے کپڑے تبدیل کر لئے اور یہ میری زندگی کا پہلا جمعہ تھا جو میں چھوڑنے پر مجبور تھا اور کیا خبر تھی کہ اس کے بعد سالوں

تک جمعے اِسی طرح آئیں گے۔ بہر حال جمعہ کے وقت تیار ہو کر نمازِ ظہر ہی ادا کی اور وہ بھی اکیلے۔ یہاں اِس وارڈ میں آنے کے بعد اگرچہ نہانے کی صورت تو پیدا ہو گئی تھی اور میرے ساتھی ایک ایک مرتبہ نہا بھی چکے تھے مگر مجھے پورے ایک ہفتہ کے بعد ایسی چکی ملی جس میں نہایا جا سکتا تھا جو چکی نمبر 22 تھی! اِس میں بھی گو پانی اپنے آپ تو باہر نہ جاتا تھا مگر کمرے میں پھیلتا بھی نہیں تھا۔ چنانچہ 23 نومبر کو بروز جمعہ ایک ریکارڈ مدت کے بعد میں نے غسل کیا۔ حوالات میں صرف ایک مرتبہ نہایا تھا وہ بھی تھانہ ملکہ ہانس میں۔ اللہ بھلا کرے سہیل نامی مشقتی کا جو یہاں ہمارے لئے پانی بھر بھر کر لاتا۔ یہ فوجی جوان تھا اور کورٹ مارشل ہونے کے بعد ایک سال کی سزا کاٹ رہا تھا۔ بہت سلجھا ہوا جوان تھا اور ہماری غیر معمولی خدمت کرتا تھا، جہاں بھی ہو اللہ اسے خوش رکھے، آمین۔

اُس روز سہیل نے نہانے کے لئے پانی کا ٹب بھر دیا اور ایک نیکر بھی لا کر دی جسے پہن کر میں نہانے لگا تو سردی کا غیر معمولی احساس ہوا کیونکہ اب موسم بہت حد تک بدل چکا تھا اور ویسے بھی کمرے میں بیٹھے بیٹھے کچھ زیادہ ہی ٹھنڈ لگتی تھی۔ اِس لئے میں نے بستر سے ایک ٹاٹ نکال کر دروازے پر لٹکا لیا اور پردے کے ساتھ ساتھ دروازے سے آنیوالی ٹھنڈی ہوا سے بچنے کی بھی صورت ہو گئی۔ بہر حال پانی تازہ تھا اس لئے گرم گرم تھا۔ نہا کر تازگی اور فرحت محسوس ہوئی، جسم ہلکا پھلکا لگنے لگا۔ صاف کپڑے پہنے اور تیار ہو کر کسی کے آنے کی بجائے دِن کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

### بڑے صاحب کا دَورہ

جیل میں یہ دوسرا بدھ تھا اور نومبر 84ء کی 21 تاریخ کہ صبح ہوتے ہی یہاں گہما گہمی کا سماں تھا۔ کیا مشقتی اور کیا خاکروب سبھی جلدی جلدی اپنے اپنے فرائض تازہ استری شدہ وردیوں میں ملبوس جیل ملازمین کی نگرانی میں سرانجام دیتے جا رہے تھے۔ ہر طرف صفائیاں ہو رہی تھیں، سامان اِدھر سے اُدھر کیا جا رہا تھا، نالیوں میں فینائل ڈالی جا رہی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج بڑے صاحب (یعنی سپرنٹنڈنٹ جیل) کا ہفتہ وار دَورہ ہے۔ یہ دورہ کیا ہوتا ہے، کچھ تو اس کا حال آپ نے پڑھ لیا اور باقی یہ ہے کہ 'صاحب' ہر روز جیل کے کسی نہ کسی حصہ کا دورہ کرتا ہے اور ہر قیدی کے پاس جاتا ہے تا کہ قیدیوں کا حال دریافت کر سکے اور اگر کسی قیدی نے کوئی شکایت کرنی ہو یا اُسے کوئی ضرورت ہو تو وہ اس بارہ میں صاحب کے ساتھ براہِ راست بات کر سکتا ہے مگر جیل کی 'حدِ ادب' میں رہتے ہوئے۔ تاہم یہ صاحب کی ہی مرضی ہوتی ہے کہ اس کی بات کس طرح اور کس حد تک سنتا ہے نیز یہ کہ اُس کا مسئلہ حل ہوتا ہے یا نتیجہ اُس قیدی کی چمڑی اُدھڑنے کی صورت میں نکلتا ہے!! بہر حال اِس عمل کو جیل کی اِصطلاح میں 'سوال' کرنا کہتے ہیں اور یہی سوال اصل میں دورہ کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

قیدی کی طرف سے دورہ کی تیاری یہ ہوتی ہے کہ اِس دوران اُسے اپنا سامان سمیٹ کر سٹور میں بھجوانا ہوتا ہے۔ اُس کے پاس اُس کا صرف ایک ٹین (قیدی کا صندوق جو گھی والے کنستر پر کنڈی والا ڈھکن لگا کر بنایا جاتا ہے اور قیدی اس میں اپنی اشیاء رکھتا ہے) ہوتا ہے اور وہ بھی اُس سے دور باہر صحن میں سامنے والی دیوار کے ساتھ کھول کر رکھ دیا جاتا ہے، پانی والا گھڑا اور اس کی جوتی بھی اس ٹین کے ساتھ رکھی جاتی ہے۔ اس طرح سے قیدی کو مکمل طور نہتہ ہو کر کمرے کے اندر دروازے کے سامنے اپنا بستر عموداً بچھا کر پورے ادب کے ساتھ اُس پر جامد و ساکت بیٹھ رہنا ہوتا ہے۔ بستر کی تیاری اِس طرح ہوتی ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے دیا گیا ایک کمبل نیچے بچھانا ہوتا ہے اور دوسرا تہ کر کے سرکاری دری میں ایک خاص انداز میں لپیٹ کر سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ اِس سارے عمل کو 'پریڈ' لگانا کہتے ہیں۔ پہلے دن عنایت نامی ایک قیدی نمبردار نے آ کر ہمیں پریڈ لگانی سکھائی اور واضح کر دیا کہ آئندہ ہر بدھ کو اِسی طرح لگایا کرنی ہے۔

دورہ والے دِن تمام متاثرہ قیدیوں کو قریباً 2/3 گھنٹے اِسی طرح رہنا ہوتا۔ کوئی پانی پی سکتا اور نہ ہی پیشاب کرنے جا سکتا بلکہ یہاں تک کرفیو نافذ رہتا کہ کسی قیدی کا اپنی جگہ سے اُٹھ کر جانا تو در کنار اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے زیادہ ہلنے جلنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ دورہ دستور کے مطابق ہر روز ہی جیل کے کسی نہ کسی حصہ کا ہوتا ہے اور عموماً ہر حصہ کی ہفتہ وار باری مقرر ہوتی ہے تاہم لنگر خانہ کا دورہ ہر روز ہوتا۔ واضح رہے کہ اپنی اپنی باری پر جیل کے ہر حصہ میں دورہ کی پوری تیاری کی جاتی تھی یعنی صفائی ستھرائی کے ساتھ پریڈ وغیرہ ہر صورت میں لگائی جاتی تھی مگر یہ ضروری نہ تھا کہ صاحب بہادر ہر ہفتہ اُس جگہ کا دورہ کریں بھی۔ چنانچہ ہمارے یہاں آنے کے بعد کتنے ہی بدھ گزر گئے اور ہر بدھ کو پوری تیاری بھی کرتے رہے مگر دورہ نہ آتا۔

آخر کار ایک روز دورہ آ ہی جاتا جو کسی طوفان سے کم نہ ہوتا! صاحب کے وارڈ میں داخل ہوتے ہی چیف، جو آگے آگے ہوتا تھا، پورے زور سے چنگھاڑتا 'پریڈ ہوشیار!' اِس کے بعد سارے ماحول پر خوفناک قسم کا سناٹا چھا جاتا۔ قیدی تو قیدی چھوٹے بڑے ہر ملازم کا بھی سانس رُک جاتا۔ اس ماحول میں 'صاحب بہادر' اپنے ماتحتوں کی فوج کے ہمراہ ہر کمرے کے سامنے آتا، کمرے کے اندر جھانکتا اور واپس چلا جاتا۔ اِس دوران قیدی کو اپنی جگہ آلتی پالتی مار کر بیٹھے رہنے کی ہدایت ہوتی اور اگر اُسے کوئی سوال کرنا ہوتا تو اُس وقت اُسے صرف ایسی حالت میں کرنے کی اجازت ہوتی کہ اس کی گردن پوری طرح جھکی ہو اور آواز میں ذلت آمیز عاجزی ہو۔ جب بھی صاحب 7 بلاک کا دورہ کرتا تو وہ سوال کرنے والوں میں سے کسی نہ کسی کو لازماً آزاد کر دیتا یعنی 7 بلاک سے نکال کر اس کی گنتی کسی اور عام بارک میں ڈال دیتا جہاں اُسے نسبتاً آزادی ہوتی۔ یہی اِس ہفتہ وار دورہ کا بہت بڑا فائدہ ہوتا علاوہ ازیں اُس دن پوری طرح

صفائی بھی ہوجاتی ہے، ہر چیز کی ترتیب درست کردی جاتی جس کا اثر عموماً سارا ہفتہ ہی رہتا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جیلوں میں بالعموم ہر طرف ظاہری صفائی نظر آتی ہے۔

## میرے معمولات

میری دوسری ملاقات 20 نومبر کو ہوئی جو مکرم چوہدری ناصر احمد سراء صاحب ایڈووکیٹ نے کی۔ اگر چہ باقاعدہ طور پر اس پندرواڑھے کی ملاقات 22 نومبر کو ہوئی تھی جب ربوہ، گوجرانوالہ اور لاہور سے بھی بہت سے اعزہ واقرباء اور دوست احباب تشریف لائے تھے۔ ان ملاقاتوں کے بعد ہمیں اپنا بستر بشمول رضائی رکھنے کی اجازت بھی مل گئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ کھانے پینے اور لکھنے پڑھنے کے لئے کافی مواد آچکا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے مطابق دن بھر مصروف رہنے کے لئے پروگرام بنالیا جس کے مطابق صبح سویرے نمازِ فجر پڑھنے کے بعد پھر سوجاتا اور جب ذرا روشنی ہوتی تو اُٹھ کر بستر میں ہی بیٹھ جاتا اور مؤطا امام مالک کا مطالعہ شروع کردیتا۔ اس کے کبھی پانچ کبھی چھ اور کبھی دس تک صفحات کا مطالعہ کرتا۔ اس دوران جمعدار آکر صفائی کرجاتا تو گھڑوں میں بھرے تازہ پانی سے منہ ہاتھ دھوتا اور اپنے آپ کو ٹھیک ٹھاک کر کے اپنا بستر اس طرح بچھاتا کہ جس قدر دھوپ کمرے میں آئے، اُس سے بھرپور استفادہ کیا جا سکے۔ پھر میں تلاوت قرآن پاک کرتا اور روزانہ ایک پارہ پڑھ لیتا۔ اس کے بعد کوئی اور کتاب پڑھنے لگتا۔ اتنے میں دس بج جاتے اور کھانا آجاتا۔ پھر مطالعہ کرتا اور چہل قدمی کرتے ہوئے درود شریف کا ورد کرتا اور صبح کے علاوہ شام کے وقت بھی ہلکی پھلکی ورزش کرتا۔ ایک روز ورزش کر رہا تھا کہ ہمارے ہیڈ وارڈر صاحب تلاشی لینے آگئے۔ مجھے ورزش کرتے دیکھ کر پوچھنے لگے کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے جواب دیا ''خونِ غیر مسلم کو گرما رہا ہوں''۔ اس پر وہ ناراض نگاہ سے دیکھنے لگے تو میں نے کہا جناب اور کیا کہوں؟ آئین اور قانون کی رُو سے خونِ مسلم تو کہہ نہیں سکتا!

مغرب سے پہلے شام کا کھانا آجاتا۔ کھانا کھا رہے ہوتے کہ مغرب کی اذانیں شروع ہوجاتیں۔ نمازِ مغرب پڑھ کر حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی ساری دعاؤں کا حسبِ توفیق وِرد کرتا۔ اتنی دیر میں عشاء کا وقت ہوچکا ہوتا چنانچہ عشاء پڑھ کر سونے کے لئے لیٹ جاتا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیشہ دعاؤں کے پاکیزہ ماحول میں گہری اور میٹھی نیند میسر آجاتی، الحمدللہ۔

## جیل کے حالات

جن دنوں کتابیں میسر ہوتیں، خوب مصروف رہتا لیکن جب کتابیں نہ ہوتیں تو پھر وقت گزارنا مشکل ہوجاتا۔ کبھی کسی

مشقتی کو بلا لیا تو کبھی کسی وارڈر کو، کبھی کوئی نمبردار اور کبھی کھانا لے کر آنے والا 'لانگری' قابو آ جاتا تو اُس سے کوئی نہ کوئی بات چھیڑ دیتا اور کسی نہ کسی بہانہ اُسے اپنے پاس کھڑا رکھتا تا اُس سے باتیں کر کے معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ وقت بھی گزار سکوں۔ اُسے اپنے پاس زیادہ سے زیادہ دیر تک کھڑا کرنے کے لئے مختلف حیلے بہانے ڈھونڈھتا جن میں سے سب سے کارگر حیلہ کھانے کے لئے کچھ پیش کرنا ہوتا، اِس بہانہ سے وہ دوبارہ بھی آ جایا کرتا۔

کبھی یہاں ڈیوٹی پر آئے ہوئے وارڈروں کو کھڑا کر کے ان سے جیل کے حالات پوچھتا، اس کا حدودِ اربعہ دریافت کرتا۔ اس طرح سے جیل کے اندر جیل میں بند ہونے کے باوجود جیل کی تصوراتی سیر کرتا رہتا اور یہ باتیں معلوم کر کے حیران ہوتا کہ کس قدر وسیع انتظام ہے! جیلوں کے وسیع انتظام میں قیدیوں کے رہنے کے لئے کوٹھڑیاں اور بارکیں جبکہ کام کرنے کے لئے بڑی بڑی فیکٹریاں بھی ہیں جہاں قیدیوں سے باقاعدہ پیشہ وارانہ کام لیا جاتا ہے۔ ابتدائی طور پر یہاں قیدیوں کو قالین، کمبل، کپڑا، بان، ٹاٹ اور میٹ وغیرہ نیز بہت سی چھوٹی چھوٹی دیگر مصنوعات بنانی سکھائی جاتی ہیں پھر ان سے وسیع پیمانہ پر بنوا کر بازار میں فروخت کی جاتی ہیں اور اس طرح سے معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ شنید کے مطابق یہ آمد اس قدر ہوتی ہے کہ اس سے پاکستان کی تمام جیلیں اپنے خرچ پر چلنی چاہئیں۔

یہ فیکٹریاں ہر سنٹرل جیل میں موجود ہیں جہاں لمبی سزائیں بھگتنے والے قیدیوں سے ہفتہ میں چھ روز صبح سات سے چار بجے سہ پہر تک کمر توڑ کام لیا جاتا ہے۔ ان میں عام طور پر آٹھ سے پچیس سال تک کے سزا یافتہ قیدیوں کو ان کاموں پر لگایا جاتا ہے اور تھوڑی قید والوں کو ایسے کاموں پر لگایا جاتا ہے جو سائڑ ہوں (یعنی ایسے عارضی کام جن کے لئے کسی فنی مہارت کی ضرورت نہ ہو) مثلاً صفائی کرنا، پوچا کرنا، مرمت کرنا، لنگر کا کام، پھانسی پہرہ اور 14 چکی (7 بلاک) میں مشقت وغیرہ۔ ہر قیدی کو لباس جیل کی طرف سے دیا جاتا ہے جو سُرخی مائل نسواری رنگ کے کھدر کی شلوار قمیص پر مشتمل ہوتا ہے اور اس قمیص پر سینہ کے مقام پر بائیں طرف بیضوی شکل کی سبز رنگ کی مہر لگی ہوتی ہے جو جیل کی نشانی ہوتی ہے۔ یہ لباس قیدی کو مشقت کے دوران پہننا ضروری ہوتا ہے۔ جمعہ کے روز چھٹی ہوتی ہے اور اُس دن کوئی بھی لباس پہنا جا سکتا ہے۔

ساہیوال کی اِس جیل میں قیدیوں کی مجموعی تعداد دو سے اڑھائی ہزار کے درمیان رہتی جن میں سے قریباً 1200 قیدی اور باقی حوالاتی ہوتے۔ قیدی سنٹر سیکشن یعنی سنٹرل جیل میں اور حوالاتی ڈی سیکشن یعنی ڈسٹرکٹ جیل میں رکھے جاتے۔ سنٹر سیکشن میں قیدی بارکوں کے علاوہ چکیوں کے بھی کئی وارڈ تھے جن میں نو عمر لڑکوں اور سزائے موت کے قیدیوں کو رکھا جاتا جبکہ D سیکشن میں ہسپتال اور B کلاس بارک بھی تھی۔ اس جیل میں A کلاس کا ان دنوں ایک ہی قیدی تھا اور وہ

جنرل تجمل حسین تھے جو جنرل ضیاء کا تختہ اُلٹنے لگے تھے۔ ایک روز انہیں ڈیوڑھی سے اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھا، ان کے لئے بڑا گیٹ کھولا گیا جبکہ عام قیدی کو گیٹ کی چھوٹی کھڑکی سے ہی گزارا جاتا۔ شاید قواعد میں A کلاس قیدی کے لئے اس اعزاز کی گنجائش موجود ہو یا پھر جیل کے افسران کو یہ دھڑکا لگا رہتا ہوگا کہ اگر ان سے اچھا سلوک نہ کیا گیا تو کہیں کل کلاں یہی قیدی تخت کے مالک بن گئے تو ان کا کیا بنے گا!

## قیدی ٹکٹ

جیل میں داخل ہوتے ہی ہر قیدی اور حوالاتی کے کوائف پر مشتمل ایک کتابچہ تیار کیا جاتا ہے جسے 'ٹکٹ' کہا جاتا ہے۔ حوالاتی کا ٹکٹ طبع شدہ فارم کی صورت میں یا کبھی محض ایک سادہ کاغذ ہی ہوتا ہے جبکہ قیدی کا ٹکٹ باقاعدہ ایک مجلد کاپی کی صورت میں ہوتا ہے تاکہ قیدی کے طویل عرصہ قید میں اس کا ساتھ دے سکے۔ اس ٹکٹ پر قیدی یا حوالاتی کا مکمل تعارف اور اس کے حالات و واقعات پر مشتمل ریکارڈ ہوتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملاقات کے لئے یہ ٹکٹ ضروری ہوتا ہے۔ ملاقات کے لئے جاتے ہوئے پہلے منشی سے اس پر تاریخ کی مہر لگوانا ہوتی ہے پھر اس مہر کے مطابق ملاقاتوں پر مقرر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ صاحب دستخط کرتے ہیں تب کہیں جا کر ملاقات کے لئے قیدی کو ڈیوڑھی میں داخل کیا جاتا ہے۔ ایک پندرواڑھے میں صرف ایک دفعہ ہی ملاقات ہوسکتی تھی اور اگر اس پندرواڑھے میں ملاقات ہو چکی ہو تو اس ٹکٹ کے مطابق اس کی دوبارہ ملاقات نہ ہو پاتی تاہم اِس کے لئے دوسرے حربے بروئے کار لانے پڑتے جن میں ''بابا'' پیش پیش ہوتا ہے۔ (اس قوم کی ذہنی پستی ملاحظہ ہو کہ جیل میں رشوت کے لئے دیئے جانے والے کرنسی نوٹ کو'بابا' کہتے ہیں کیونکہ اس پر بابائے قوم کی تصویر ہوتی ہے)۔

## عدالت میں ہماری پیشیاں

24 نومبر 1984ء سے اے سی صاحب کی عدالت میں جوڈیشل ریمانڈ کے لئے ہماری پیشیاں شروع ہوئیں۔ جوڈیشل ریمانڈ سے مراد وہ عرصہ حراست ہوتا ہے جس کے دوران ملزمان کا معاملہ پولیس کے ہی زیر تفتیش ہوتا ہے اور چونکہ قانونی طور پر کسی ملزم کو جسمانی ریمانڈ پر پولیس اپنے پاس 14 دن سے زیادہ نہیں رکھ سکتی اس لئے اُسے جیل بھجوا دیا جاتا ہے یہاں بھی اُسے کسی فرد جرم کے بغیر 14 دن سے زیادہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اِس لئے متعلقہ پولیس ہر دو ہفتہ کے بعد ملزمان کو عدالت میں پیش کر کے مزید مہلت کی درخواست کرتی ہے کہ ابھی تفتیش مکمل نہیں ہو سکی اور جب تفتیش مکمل ہو جائے تو ملزمان کا چالان عدالت میں پیش کر کے اُنہیں سپردِ عدالت کر دیتی ہے جہاں ان کے مقدمہ کی باقاعدہ سماعت ہوتی ہے۔ چنانچہ ہمیں بھی جوڈیشل ریمانڈ کے لئے متعدد بار عدالت میں پیش کیا جاتا رہا اور تفتیش مکمل ہونے پر

23 دسمبر 1984ء کو ہمارا چالان عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ (یاد رہے کہ تفتیش اور سماعت مقدمہ تک ملزم حوالاتی کہلاتا ہے اور فیصلہ کے بعد سزا سنائے جانے پر قیدی ہو جاتا ہے)۔

ابتداء میں پیشیوں کے لئے ہمیں پورے حفاظتی انتظامات میں لایا جاتا تھا۔ ہمارے لئے خصوصی گاڑی آتی جو جیل سے سیدھی عدالت کے دروازہ کے سامنے آکر رُکتی اور عدالت میں پیشی کے فوراً بعد ہم واپس جیل بھجوا دیئے جاتے۔ ایک دو پیشیوں کے بعد اس میں کچھ تبدیلی ہوئی اور ہمیں عام حوالاتیوں کے ساتھ بڑی بس میں لایا اور لے جایا جانے لگا اور عدالت میں بھی اپنی باری کے اِنتظار تک 'بخشی خانہ' میں رکھا جانے لگا۔ (ملزموں کو عدالت میں پیش کرنے کے لئے اپنی باری کے انتظار تک جس جیل نما کمرے میں رکھا جاتا ہے اُسے ''بخشی خانہ'' کہتے ہیں۔ یہ کمرا عدالتوں کے احاطہ میں ہی ہوتا ہے)۔ یکم جنوری 1985ء کی پیشی والے دِن تو گاڑی مہیا نہ ہوسکنے کے باعث ہمیں جیل سے عدالت پیدل بھی لایا گیا۔ اُس روز ہم عدالت کی طرف آ رہے تھے کہ سڑک پر چوہدری اسحٰق صاحب کے بھائی مکرم عیسٰی صاحب سے ملاقات ہوگئی اور اُن کے ذریعہ بہت سے احباب جماعت کو ہمارے اس طرح آنے کی اطلاع ہوگئی چنانچہ بخشی خانہ میں آکر ہمارے بند ہونے کی دیر تھی کہ احباب بڑی کثرت سے آنے شروع ہوگئے۔ ہمارے لئے چائے اور ناشتہ آگیا پھر دوپہر کا کھانا بھی یہیں آگیا۔ گو ہمارے لواحقین کو اس کی خبر تو نہ تھی کہ ہمیں اس طرح لایا جائے گا تاہم سب اکٹھے ہوگئے اور سب کے ساتھ خوب کھل کر ملاقات ہوئی۔ عدالت سے فارغ ہونے کے بعد ہمیں پھر پیدل ہی لے جایا گیا۔ واپسی کے اِس سفر کا بھی عجیب نظارہ اور مزہ تھا کیونکہ دوست احباب بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جیل تک گئے اور آزادانہ ماحول میں خوب باتیں اور ملاقاتیں ہوئیں۔ جیل کی ملاقات میں تو مصافحہ سے بھی محرومی ہوتی، یہاں بار بار مصافحہ کر رہے تھے۔ یہ ہمارے لئے اپنی نوعیت کا پہلا موقع تھا اس لئے سبھی بے حد خوش اور پُرجوش تھے۔ A.C ساہیوال کے پاس اس قسم کی ہماری آخری پیشی 10 فروری 1985ء کو ہوئی پھر 14 فروری 85ء کو ہمیں Charge Sheet دے کر اطلاع کردی گئی تھی کہ ہمارے مقدمہ کی سماعت 16 فروری سے خصوصی ملٹری کورٹ نمبر 62 میں شروع ہوگی۔

## ہمارے واقعہ سے متعلق عوام کے خیالات

جب ہمیں جیل اور بخشی خانہ میں لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ عوام الناس ہمارے واقعہ سے متعلق کیا سوچتے ہیں اور حیرت ہوئی کہ آوازِ خلق کس طرح نقارہ خدا بن کر اِس زمانہ کے مولویوں کے خلاف گواہ بنی ہوئی تھی۔ جب ہمیں پہلی مرتبہ عام بس میں عدالت لے جایا گیا تو اُس روز پیشی کے لئے ہمارے ساتھ جانے والے تین

میں سے دو ملزمان کو تھانے بھجوا دیا گیا اور تیسرا ملزم جو ہمارے ساتھ واپس جیل گیا وہ تھا تو کوئی چرسی لیکن جب اپنا تعارف کرائے بغیر اُس سے اپنے واقعہ کے متعلق پوچھا تو کہنے لگا کہ اس کا تو شہر میں بڑا شور پڑا تھا۔ ہم نے پوچھا شور کیسا؟ تو کہنے لگا 'یہی کہ کلمہ مٹانے آئے تھے اور مارے گئے'۔ ایسے کئی تبصرے بعد میں بھی سنے۔ ماہ جون 85ء میں مشن چوک کے قریب کی ایک دوکان 'کبھی جوس' والوں کا ایک لڑکا رمضان آرڈیننس کی خلاف ورزی کے جرم میں جیل آیا۔ وہ نوعمر وارڈ میں تھا تو ایک روز ہماری طرف بھی آ گیا۔ کسی طرح ہمارے واقعہ کا ذکر ہوا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہاں ہوا کیا تھا۔ کہنے لگا کہ گولیاں چلی تھیں اور دو مولوی مرے تھے۔ میں نے کہا وہ مرے کیوں تھے؟ بے ساختہ کہنے لگا وہ کلمہ مٹانے آئے تھے۔ میں نے کہا وہ تو کہتے ہیں کہ کلمہ انہوں نے نہیں مٹایا۔ اس پر بے ساختہ بولا 'اور کس نے مٹایا تھا؟ سب جگہ تو یہی مشہور ہے کہ انہوں نے ہی کلمہ مٹایا'۔ یہ مکالمہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ حقیقت کا تو بچہ بچہ کو بھی علم ہو چکا تھا مگر اِن بدقسمت اور کمبخت مولویوں کو ذرا شرم نہ آئی کہ داڑھیاں رکھ کر، منبر رسول کے دعویدار بن کر اِتنا جھوٹ بولا، اِتنا جھوٹ بولا کہ الامان والحفیظ۔ (اِس جھوٹ کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی)

### اللہ کا احسان

ایک امر جو مجھ پر اللہ تعالیٰ کے مستقل احسان کی صورت میں اُن دِنوں ظاہر ہوا تحدیث نعمت کے طور پر اُس کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ آنکھوں کے حوالہ سے ہے۔ اُس کا پس منظر یہ ہے کہ ہمیں یہاں آ کر بالخصوص شروع شروع میں پڑھنے کو صرف ڈائجسٹ ہی میسر آ سکے اور بالکل ہی فارغ رہنا ہمارے لئے دوبھر تھا، اس لئے ہم سب ہی ان رسالوں کو پڑھتے رہتے۔ ان رسائل کی کتابت بہت باریک ہوتی ہے اس لئے انہیں پڑھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ ان رسالوں کے بکثرت مطالعہ کی وجہ سے میری آنکھیں دُکھنے لگیں اور ساتھ ہی اِن میں چیپڑ بھی آنے لگا اور بوقت مطالعہ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا۔ اس کی وجہ سے مجھے خاصی پریشانی ہوئی گو بعد میں دوسری کتب کے آجانے سے اِن رسالوں کا مطالعہ کم تو ہو گیا مگر آنکھوں میں یہ تکلیف جاری رہی۔ ایک روز مغرب سے تھوڑی دیر پہلے کا واقعہ ہے کہ حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خاں صاحب ؓ کی تصنیف لطیف ''تحدیث نعمت'' کا مطالعہ کر رہا تھا کہ آنکھوں میں تکلیف بڑی شدت سے محسوس ہوئی یہاں تک کہ میرے لئے کتاب پر نظر ڈالنا بھی مشکل ہو گیا۔ چونکہ اس کتاب میں متعدد مواقع پر ایسے واقعات مذکور ہیں کہ جونہی چوہدری صاحب کو کوئی مشکل پیش آئی، آپ فوراً خدا تعالیٰ کے حضور سربسجود ہو گئے۔ یہی واقعات میرے لئے اُس وقت مشعل راہ بنے اور میں نے بھی اُسی وقت بیٹھے بیٹھے سامنے گھٹنوں پر پڑی کتاب پر منہ گرا دیا اور اللہ میاں سے دعا کی: یا اللہ! میری آنکھوں کو صحت دے اور طاقت دے کہ میں کثرت

سے کتابوں کا مطالعہ کرسکوں۔ اِس مضمون اور مفہوم کی دعا تھوڑی دیر تک کرتا رہا پھر میں نے سر اٹھایا اور آنکھیں کھولیں تو آنکھوں میں پانی اور دَرد کا نام ونشان تک نہ تھا۔ میں نے تجربہ کے طور پر اچھی طرح سے آنکھیں کھول کر کتاب کے الفاظ پر نظر ڈالی تو بغیر کسی دِقت کے اور شام کے وقت روشنی کم ہونے کے باوجود میں درست طور پر پڑھ سکتا تھا اور لطف تو یہ ہے کہ اس کے بعد اب تک مجھے دوبارہ ایسی تکلیف نہیں ہوئی۔ الحمدللہ۔ یہ واقعہ میں نے بطور خاص 'تحدیثِ نعمت' کے لئے لکھا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اثرات سے مجھے زندگی بھر مستفید کرتا رہے، آمین۔

## والدہ محترمہ چوہدری اسحٰق صاحب کی وفات

دسمبر 84ء کے آخر کی بات ہے کہ ایک رات چوہدری محمد اسحٰق صاحب کے ایک واقف کار وارڈر (جیل پولیس کے اہل کار) نے آکر یہ اِنتہائی تکلیف دہ اور افسوس ناک خبر سنائی کہ اُن کی والدہ محترمہ وفات پا گئی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ غمناک خبر سننے کے بعد محترم چوہدری صاحب نے کمال صبر اور حوصلہ کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے دل چوہدری صاحب سے ہمدردی کے جذبات سے بھر آئے کہ والدہ کا آخری سفر ہے اور چوہدری صاحب اپنے شہر میں بلکہ اپنے گھر کے بالکل پڑوس میں ہونے کے باوجود اس موقع پر تجہیز وتکفین کے اِنتظامات کرنا تو درکنار، ان کے آخری دیدار اور جنازہ میں شمولیت تک سے محروم ہیں۔ یہ موقع بڑا ہی جذباتی تھا اور اس کا صحیح اندازہ اور احساس وہی کرسکتا ہے جسے اس صبر آزما مرحلہ سے گزرنا پڑے۔ میں نے اُسی وقت ایک چٹ لکھی جس میں چوہدری صاحب سے تعزیت کی اور صبح نمازِ جنازہ غائب پڑھنے کا پروگرام دیا۔ میں اُس رات چوہدری صاحب سے کچھ فاصلہ پر تھا یعنی ہمارے درمیان تین چار چکیاں تھیں اس لئے "فضائی رابطہ" پر بھی بات نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ اسی چٹ پر اِکتفاء کرنا پڑا جسے ایک ملازم کے ذریعہ انہیں پہنچا دیا گیا۔ میں نے اپنے طور پر پروگرام بنایا کہ اگلے روز صبح صبح ہیڈ وارڈر صاحب کو کہوں گا کہ تھوڑی دیر کے لئے ہمیں کھول دے اور ہم ایک چکی میں اکٹھے ہو کر مکرم چوہدری صاحب سے تعزیت کر کے نمازِ جنازہ غائب بھی ادا کرلیں۔ چنانچہ میں اپنے اس پروگرام کے مطابق صبح سویرے آنیوالے ہیڈ وارڈر کے اِمدادی (ہیڈ وارڈر کا نائب) سے بات کرنے لگا تو اُسی دوران ایک نمبردار نے آکر میرا دروازہ کھول دیا۔ میں اُس اِمدادی سے یہ بات کر رہا تھا اور وہ مجھے کہہ رہا تھا کہ باہر تو نکلو اور جا کر دیکھو! چنانچہ میں حیرانی کے عالم میں باہر نکلا اور چوہدری صاحب کی چکی میں گیا تو وہاں ہمارے دیگر ساتھی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ چوہدری صاحب سے تعزیت کے بعد ہم نے نمازِ جنازہ غائب ادا کی۔ یہ پہلی نمازِ جنازہ غائب تھی جو ہم نے جیل میں ادا کی۔ اس کے بعد کتنے ہی بزرگوں، اعزہ واقرباء اور دوست احباب کی جدائی کے زخم لگے اور کتنی ہی نماز ہائے جنازہ غائب ادا کرنی پڑیں، ان کا ذکر اپنے اپنے موقع پر آتا رہے گا۔

14 چکی میں رہتے ہوئے ہم یہاں کے ماحول سے کافی حد تک مانوس ہو گئے تھے چنانچہ کچھ اس اُنس کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ اکثر لوگ ہمارے ساتھ 'احتیاط' سے ہی پیش آتے، ہم دعوت الی اللہ میں بھی دلیر ہو گئے تھے۔ چنانچہ میں نے یہ فریضہ سرانجام دینے کی ایک تدبیر سوچی اور کسی حد تک اس پر عمل بھی کیا۔ اور وہ یہ کہ میں کسی نہ کسی سپاہی یعنی وارڈر، نمبردار یا مشقتی کو اپنے پاس بلا لیتا اور کچھ نہ کچھ کھانے کو پیش کرتا جس سے وہ میرے پاس کھڑا رہنے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر اپنے واقعہ سے بات شروع کرتا جس پر وہ خود ہی سوال کرتا کہ اگر آپ وہی کلمہ پڑھتے اور لکھتے ہیں تو کیا وجہ اور کیا فرق ہے کہ مُلّاں اُسے مٹاتے پھرتے ہیں۔ اسی بات کا مجھے انتظار ہوتا چنانچہ اس کے بعد ساری تفصیل بیان کرنے کی کوشش کرتا لیکن یہ تدبیر تو صرف ایسے لوگوں کے لئے تھی جو ہمارے پاس آ جاتے تھے۔ سوال یہ تھا کہ دوسرے قیدی جو 14 چکی میں بند تھے اُن تک ہماری تبلیغ کس طرح پہنچے؟ اس کے لئے میں نے یہ طریق اختیار کیا کہ جس طرح 14 چکی کے دستور کے مطابق ہر کوئی دوسرے ساتھی یا واقف کار سے اونچی آواز میں باتیں کرتا تھا، اُسی طرح میں نے بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ ہر روز کسی نہ کسی مسئلہ کو لے لیتا اور پہلے اپنے ساتھیوں سے اس سے متعلق دریافت کرتا اور پھر باآواز بلند انہیں وہ مسئلہ سمجھانے کی کوشش کرتا۔ اس امید پر کہ ہماری باتیں کوئی نہ کوئی تو سنے گا ہی اور اس کے ذہن میں کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہی پڑے گی جو اس کے ذہن میں محفوظ رہے گا اور وقت آنے پر اپنا پھل لائے گا۔ انشاء اللہ۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس سے کتنا فائدہ ہوا اور میں اپنے مقصد کو کس حد تک حاصل کر سکا لیکن اتنی خوشی تو ضرور ہے کہ 14 چکی جہاں خالص جرائم کا ماحول ہوتا تھا، جہاں ملک بھر کے نامی گرامی مجرم لا کر بند رکھے جاتے تھے، جس کی فضا میں ان خطرناک قیدیوں کی سانسیں اور باتیں ہی رچی رہتی تھیں، اُس ماحول اور اُس فضا کو ہم نے اللہ، اس کے رسول ﷺ اور ان کے پیارے مہدی علیہ السلام کی باتوں سے بسانے کی توفیق پائی اور وہ جگہ جہاں عام حالات میں کوئی بھی احمدی پہنچ کر تبلیغ نہیں کر سکتا، وہاں ہم نے دعوت الی اللہ کا فریضہ سرانجام دینے کی توفیق پائی، الحمدللہ ثم الحمدللہ۔

جہاں تک نہ پہنچی ہو آوازِ حق وہاں جا کے قرآں سنائیں گے ہم

دعوت الی اللہ کے علاوہ میں نے اپنے تین نوجوان ساتھیوں کی دینی معلومات بڑھانے کے لئے ایک پروگرام بھی شروع کیا اور ایک کاغذ پر ہر روز جماعت کی ابتدائی تاریخ کے اہم واقعات اور بعض اہم امور مختصراً مگر معین طور پر لکھتا اور وہ کاغذ ہر ایک کو پہنچا کر درخواست کرتا کہ اسے یاد کر لیں اور گاہے بگاہے ان کا امتحان بھی لیتا۔ اس طرح سے میں

نے کئی ایک اسباق ان ساتھیوں کو دیئے۔ اس کے جلد بعد ہم سب 5 چکی میں آ گئے جہاں یہ سلسلہ زبانی اور بالمشافہ درس وتدریس میں تبدیل ہوگیا۔

## چڑیوں سے دوستی

14 چکی یعنی 7 بلاک میں وقت گزارنا ایک مشکل ترین سوال تھا جس کے حل کے لئے ہم مختلف طریقے تلاش کرتے رہتے۔ کچھ دِنوں کے بعد ایک ایسا حل نکل آیا جو مصروفیت بھی تھی اور کھیل کا کھیل بھی۔ اِس کا سبق برادرم حاذق صاحب سے لیا اور وہ یہ تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے آدھی پونی روٹی بچا لیتا اور جب خاموشی کے اوقات ہوتے یعنی مشقتی وغیرہ اِدھر اُدھر آ جا نہ رہے ہوتے اُس وقت روٹی کے پورے بنا بنا کر اپنے دروازے کے سامنے پھینکنے لگتا اور پانچ، دس منٹ کے اندر اندر چڑیوں کو اس کی اطلاع ہو جاتی اور ایک کے ساتھ دوسری اور دوسری کے ساتھ تیسری چڑیا آ کر پورے چگنے لگتیں۔ تھوڑی ہی دیر میں 20/25 چڑیاں آ جاتیں اور ان سے اتنی رونق ہو جاتی کہ دل خوش ہو جاتا۔ چنانچہ میں کچھ پورے دروازے میں پھینک دیتا جن میں سے بعض اندر گر جاتے اور بعض بالکل میرے قریب۔ چنانچہ چڑیاں چگتے چگتے اندر بھی آ جاتیں اور میرے پاس پڑے ہوئے پورے بھی چگنے لگتیں۔ یہ دیکھ کر میرا دل ایک ناقابلِ بیان سرور اور لطف سے بھر جاتا۔ چڑیوں کو چگتا دیکھ کر دِل میں بڑی شدت سے خواہش پیدا ہوتی کہ کاش یہ چڑیاں میرے ساتھ اتنی مانوس ہو جائیں کہ یہ میرے پاس بلا خوف و خطر کھیلتی رہا کریں اور میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نظاروں سے محظوظ ہوتا رہا کروں۔

## فَهُوَ يَشْفِينِ

14 چکی یا 7 بلاک میں رہائش کی صورتِ حال کا تفصیلی ذکر گزر چکا ہے جس کے پیشِ نظر خارش وغیرہ ہو جانے کا خطرہ بہت زیادہ تھا کیونکہ اس کی پوری وجوہات وہاں موجود تھیں یعنی نہانے کا موقع نہ ملنا، ہر وقت بند رہنا، اوپر سے موسم سرما وغیرہ۔ مستزاد یہ کہ صاف کپڑے بھی ہفتہ میں ایک بار بدلنے کو ملتے۔ گو کمرے پختہ تھے مگر ان میں جگہ جگہ سے پلستر اُکھڑا اور فرش ٹوٹا ہوا ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ دراڑیں پڑی ہوئی تھیں جن میں مختلف جراثیم کی افزائش کے جملہ انتظامات موجود تھے۔ اس صورت حال میں کچھ دِنوں کے بعد مجھے خارش محسوس ہونے لگی، پہلے پہل ٹانگوں پر پھر باقی جسم پر ہلکی ہلکی خارش رہنے لگی۔ شروع میں تو میں نے پرواہ نہ کی لیکن ایک دو روز مسلسل یہ کیفیت رہی تو اس موذی بیماری کی اذیت اور اثرات کا تصور کر کے خاصی فکر ہوئی مگر میں کر کیا سکتا تھا۔ باقاعدگی سے نہانے کی صورت تھی اور نہ ہی ایسی سہولت میسر تھی کہ مالش کر کے دھوپ کھا لیتا اور اگر یہ سہولت میسر بھی ہو جاتی تو نہا تا کہاں جا کر؟ دوا کی بھی کوئی

صورت نہ تھی چنانچہ وہی اپنا دعا کا ہتھیار استعمال کیا اور اللہ تعالیٰ سے بار بار عرض کیا کہ یا اللہ! تو خوب جانتا ہے کہ ہم کن حالات میں ہیں اور اگر یہ بیماری لگ گئی خواہ اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی وجہ سے ہی تو ہمارا کیا حال ہوگا؟ اس قسم کی دعا کرتے ایک دو دن ہی گزرے تھے کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ خارش کہاں گئی، الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ اِس کے بعد میں نے یہ معمول بنالیا کہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جسمانی صحت کے لئے خاص دعا کرنے لگا کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر قسم کے جسمانی عوارض اور تکالیف سے پوری طرح محفوظ رکھے تاکہ ہمارے جسم اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو باحسن طریق برداشت کرنے کے لئے مستعد رہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم میں سے کسی کو بھی ایسی تکلیف یا مرض لاحق نہیں ہوا جس کی وجہ سے اسیری کے سفر میں کوئی روک پیدا ہوئی ہو، الحمدللہ۔

### ہمارے دو ساتھی ''گورا'' وارڈ میں

14 چکی میں ہم نوجوان تو جیسے تیسے گزارا کر رہے تھے مگر یہ جگہ ہمارے بزرگ ساتھیوں کے لئے خاصی مشکل تھی جس کا احساس ہمیں رہتا تھا۔ چنانچہ محترم ملک محمد دین صاحب اور محترم چوہدری اسحق صاحب کے عزیزوں اور دوستوں نے کوشش کر کے ان کی B کلاس لگوادی تھی جس کے نتیجہ میں ہمارے یہ دو ساتھی پہلے B کلاس وارڈ میں منتقل کر دیئے گئے پھر انہیں کچھ دن ہسپتال میں رکھا گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے انتظامیہ کے لئے انہیں عام قیدیوں کے ساتھ رکھنا مشکل تھا اس لئے بالآخر انہیں جیل کی ایک الگ تھلگ جگہ 'گورا وارڈ' میں منتقل کر دیا گیا۔

یہ گورا وارڈ دراصل جیل کے دور دراز کونہ میں الگ تھلگ ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جسے انگریزی دورِ حکومت میں اُن قیدیوں کے لئے بنایا گیا تھا جن کا تعلق حکمران انگریز قوم سے ہوتا تھا، اِسی وجہ سے اِس کا نام 'گورا وارڈ' پڑ گیا تھا۔ یہاں سہولتوں کا معیار باقی جیل سے مختلف اور امتیازی تھا۔ اب یہاں اُن قیدیوں کو رکھا جاتا ہے جنہیں الگ تھلگ رکھنا یا کوئی سہولت دینا مقصود ہو۔ حکام چونکہ ہمارے دونوں ساتھیوں کو B کلاس کے عام قیدیوں میں رکھنا نہیں چاہتے تھے، اِس لئے اُن کی گنتی اس وارڈ میں ڈال دی تھی جہاں وہ فروری 85ء تک رہے۔

### 7 بلاک یعنی 14 چکی سے نجات

ساہیوال جیل کی سخت ترین جگہ 7 بلاک میں موسم سرما کے سرد ترین 67 دن اور راتیں گزارنے کے بعد 16 جنوری 1985ء کو سپرنٹنڈنٹ صاحب نے دورہ کے دوران ہمارے متعلق یہ حکم جاری کر ہی دیا کہ انہیں 5 چکی میں منتقل کر دیا جائے۔ جس کی تعمیل اگلے روز 17 جنوری 85ء کو علی الصبح ہوئی۔ ہم اُس روز آنیوالی ملاقات کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ ہمیں اچانک کھول دیا گیا اور سامان سمیٹنے کو کہا گیا جس پر کچھ سامان مشقتیوں نے اور کچھ ہم نے خود اُٹھایا اور ہمیں گنتی

گھر سے گزارتے ہوئے سنٹر سیکشن کے دفتر میں لے جایا گیا جہاں پہلے ہمارے کوائف درج کئے گئے پھر ہمیں 5 چکی پہنچا دیا گیا۔ یہاں پہنچ کر ہم نے اپنا سامان رکھا ہی تھا اور ابھی چکیوں کی صفائی کا پروگرام بنا رہے تھے کہ سب کو ملاقات کا پیغام ملا۔ چنانچہ ہم سامان اُسی طرح رکھ کر ملاقات کے لئے چلے گئے۔ آج ہم نے دوہری خوشی کے ساتھ ملاقات کی اور سب کو اپنی 14 چکی سے آزادی کا بتایا جس پر ہمارے سب ملاقاتی بھی بہت خوش ہوئے اور ان کے کرب میں کسی قدر کمی ہوئی۔

## 5 چکی میں

5 چکی دراصل ساہیوال جیل کے سنٹر سیکشن میں اُن بارکوں میں سے ایک تھی جن میں سزا یافتہ قیدیوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کے لئے لمبی قطاروں میں کمرے بنائے گئے تھے۔ چونکہ وہ بارک جس میں ہمیں رکھا گیا تھا ترتیب کے لحاظ سے پانچویں نمبر پر تھی اِس لئے اسے 5 چکی کہا جاتا تھا۔ جب ہم یہاں لائے گئے تو یہ بارک خالی اور ویران پڑی تھی بلکہ اسے گرایا جانے والا تھا۔ اس کے اکثر کمرے خستہ حال تھے اور ہمارے ہوتے ہوئے اسے گرانا بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ ہر چند کہ یہ خستہ حال اور ویران بارک تھی تاہم ہمارے لئے بڑی اچھی ثابت ہوئی کیونکہ یہاں کسی اور کا عمل دخل نہ تھا اور اس کا احاطہ بھی بہت وسیع تھا جس میں سارا دن خوب آزادی سے چلنے پھرنے کا موقع ہوتا۔ اس کے وسط میں ایک نلکا تھا جس کے ساتھ ایک مسجد بھی تھی جس پر گھنے درختوں کا سایہ رہتا۔ اِس مسجد کے اِردگرد اُگی ہوئی گھاس سارے دِن کی مختلف سرگرمیوں کے لئے بہت عمدہ جگہ تھی۔ یہاں ہم باجماعت نمازیں پڑھتے، درس وتدریس ہوتی، کھانا کھاتے، کھیلتے اور دوپہر کے وقت آرام کرتے۔

### جیل میں پہلی باجماعت نمازِ جمعہ

5 چکی میں ہم 17 رجنوری کو آئے اور اگلے ہی روز جمعہ تھا۔ ہم نے کئی مہینوں کی محرومی کے بعد اُس روز جمعہ پڑھا اور جیل میں یہ ہمارا پہلا جمعہ تھا جو ہم نے ''باجماعت'' ادا کیا۔ اس کے بعد جب تک ہم یہاں رہے، یہ سلسلہ جاری رہا۔ جمعہ کے دن محترم چوہدری اسحٰق صاحب اور محترم ملک محمد دین صاحب بھی 'گوراوارڈ' سے ہمارے پاس تشریف لے آیا کرتے تھے۔ اِن کے علاوہ محترم میاں نصیر احمد صاحب آف 137/9L ساہیوال بھی' جو ماہِ جون 84ء سے اپنی زمینوں کے مقدمہ کے حریف نعمت علی تیلی کے قتل کے الزام میں جیل میں تھے، جمعہ کے لئے ہمارے ہاں آجاتے۔ اِسی طرح

پاکستان کے ایک احمدی نوجوان خالد احمد صاحب (برادرم عبدالقدیر صاحب کے رشتہ دار) بھی آجایا کرتے تھے۔ غرضیکہ ہمارے ہاں جمعہ کے دن خوب رونق ہو جاتی اور حضور کے پرجوش اور جلالی خطبات سن کر اپنے ایمان تازہ کرتے، نئے ولولے اور نئی اُمنگیں دِلوں میں جنم لیتیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور خوب دعائیں کرتے، الحمد للہ علی ذلک۔

## خطبات جمعہ فرمودہ حضور اقدسؒ کی ترسیل

خطبہ جمعہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا عمدہ انتظام یہ فرمادیا کہ 17 رجنوری کو ہونے والی ملاقات میں برادرم نعمت اللہ صاحب بشارت مربی سلسلہ (حال مبلغ سلسلہ ڈنمارک) نے حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے فرمودہ تین خطبات جمعہ کے مکمل متن بھجوادیئے اور چونکہ برادرم موصوف صیغہ زود نویسی میں ڈیوٹی کر رہے تھے اس لئے انہوں نے خطبات کے مسوّدات بھجوانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اِس طرح سے ہر ملاقات پر حضور کے تازہ ترین مکمل خطبات مل جاتے جنکی وجہ سے مجھے بہت سہولت ہو جاتی اور ہم سب ساتھیوں تک خلیفہ وقت کی آواز بھی پہنچ جاتی۔

اُس دور کے خطبات جمعہ جیسا کہ سب جانتے ہیں، بہت پُرجوش اور ولولہ انگیز ہوا کرتے تھے چنانچہ یہ خطبات ہمارے دِلوں کو خوب گرماتے اور ہمارے لئے بہت ہی ایمان افروز ثابت ہوتے۔ اِس طرح سے ہم جیل کے اندر ہونے کے باوجود حضور کے خطبات سے مسلسل مستفید اور فیضیاب ہوتے رہے، اللہ تعالیٰ برادرم موصوف کو اس نیکی کی بہترین جزاء عطا فرمائے۔ آمین۔ ان کے ساتھ برادرم محترم حبیب الرحمٰن زیروی صاحب (انچارج خلافت لائبریری حال نائب ناظر اشاعت) بھی اُن خطبات کو فوٹو اسٹیٹ کر کے ہمیں بھجوانے کی خدمت سرانجام دیتے رہے، اللہ انہیں بھی اس کی بہترین جزاء عطا فرمائے، آمین۔

## حسنِ تواتر

خطبات کے نتیجہ میں حضور انور رحمہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ کا ایک اَور ذریعہ میسر آ گیا تھا۔ اس ذریعہ نے پیارے آقا کے ساتھ ذہنی اور روحانی تعلق کو بے حد مضبوط کر دیا تھا۔ بہت بعد 6 مئی 1987ء کا واقعہ ہے کہ محترم رانا صاحب کے ساتھ مل کر حضور (رحمہ اللہ تعالیٰ) کے خطبات کے خلاصے پڑھے جن سے کئی خوشخبریوں کا علم ہوا، عرفان کے کئی نکتوں سے آگاہی ہوئی اور ایک امر خاص طور پر بے حد خوشی کا باعث ہوا، وہ یہ کہ حضور نے اپنے مارچ کے کسی خطبہ جمعہ میں احباب کو یہ دعا بکثرت پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ یُبَلِّغُنِیْ حُبَّکَ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَّفْسِیْ وَمِنْ اَھْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ۔

یعنی اے اللہ! میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اُس کی محبت بھی جو تجھ سے محبت کرتا ہے اور میں تجھ سے ایسے عمل کی توفیق مانگتا ہوں جو مجھے تیری محبت تک پہنچا دے۔ اے اللہ! اپنی محبت میرے دل میں اتنی ڈال دے جو میری اپنی ذات، میرے حال، میرے اہل اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ ہو۔

اگرچہ حضور یہ خطبہ ارشاد فرما چکے تھے مگر مجھے اس کا ابھی علم نہ تھا چنانچہ اس خطبہ کے پڑھنے سے پہلے میں نے حضور رحمہ اللہ کی خدمت اقدس میں ایک خط لکھا تو اسی دعا کو خط کا مرکزی نکتہ بنایا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس دعا کا مصداق بنا دے، آمین۔ اس حسن تواتر کو دیکھ کر میرا جی بہت خوش ہوا، یہ محض اللہ کا فضل ہے جو اس نے حضور کے خطبہ کی روشنی مجھے خود پہنچادی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ میں جو کچھ ہوں خلافت کی برکت سے ہوں، خلافت میرے جسم کی رگوں میں دوڑتی ہوئی روح اور جان ہے۔ اگر اس کو نکال لیا جائے تو میں لاشئ محض ہوں، خدا کرے کہ مجھے اللہ تعالیٰ اس اِنعام کی قدر کرنے کی توفیق بخشے اور اسی طرح مجھے یہ بات نصیب رہے کہ خلافت کی طرف سے جونہی کوئی حکم ملے، میں مجسم تعمیل بن جاؤں، آمین۔

## خطبات کی اشاعت

ابتداء میں تو اِن خطبات کا فیض ہم تک ہی محدود رہا لیکن بعد میں ہم نے یہ خطبات جیل میں بعض شریف النفس دوستوں کو بھی پڑھنے کے لئے دینے شروع کر دیئے تھے۔ انہی میں سے پیپلز پارٹی ساہیوال کے ایک لیڈر جناب رانا شوکت صاحب جو کسی دور میں وزیر مشیر بھی رہ چکے تھے، جنوری 85ء میں ساہیوال جیل میں لائے گئے تھے۔ انہیں ایک خطبہ جمعہ دیا جواُن کے پاس ہی رہا۔ ان کا ذکر اس لئے خصوصاً کر رہا ہوں کہ ان کے متعلق محترم ملک محمد دین صاحب نے بتایا کہ ان کے ساتھ جماعت کے حوالہ سے جو گفتگو ہوئی تو انہوں نے واضح طور پر تسلیم کیا کہ ہم سے 74ء میں غلطی ہوئی جو آپ کو غیر مسلم قرار دیا۔ آخر ان کے دل کی گواہی سامنے آ ہی گئی اور اس کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔

## ملک صاحب ہمارے پاس آ گئے

17 فروری 85ء کو دن کے بارہ بجے خبر ملی کہ محترم ملک محمد دین صاحب جن کی گنتی گورا وارڈ میں تھی، ہمارے پاس آ گئے ہیں اور وہ سامان سمیت بیرونی دروازے پر بیٹھے تحریری حکم کے منتظر ہیں۔ ہم دوڑ کر باہر گئے تو واقعی ملک صاحب وہاں موجود تھے۔ چنانچہ ہم ملک صاحب کا سامان اُٹھا کر اندر لے آئے، ایک چکی کھلوا کر اُس کی صفائی کروائی اور اس میں ملک صاحب کا سامان لگا دیا۔ ملک صاحب کے ہمارے پاس آ جانے کی ہمیں خوشی بھی ہوئی اور فائدہ بھی۔ ایک تو محترم ملک صاحب بڑے باذوق انسان تھے اور بہت سے عمدہ اشعار، محاورے اور ضرب الامثال آپ کو یاد تھیں

جو موقع ومحل کے مطابق آپ استعمال کرتے رہتے۔ دوسرے آپ ایک کامیاب پولیس انسپکٹر ہونے کے ناطہ بے حد تجربہ کار اور جہاندیدہ انسان تھے، آپ کے مشورے اور نصائح جگہ جگہ ہمارے کام آتیں۔ علاوہ ازیں آپ کے پاس سرکار کی طرف سے اجازت یافتہ ریڈیو بھی تھا جس سے دیگر پروگراموں کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ سے بھی باخبر رہنے لگے خصوصاً الیکشن کے دنوں میں تو ہر کوئی اسی سے کان لگائے ہوتا تھی کہ صبح صبح جب ہماری گنتی کھلتی تو BBC کے پروگرام سننے کے لئے ملک صاحب کی چکی میں جمع ہو جاتے اور رات کو ملک صاحب ریڈیو لیکر اپنے دروازے میں کھڑے ہو جاتے اور ہم سب کو خبریں سنواتے۔

## اوکاڑہ کے احمدیوں پر کلمہ کا مقدمہ

ملک صاحب کے ہمارے پاس آنے کے ایک دو روز بعد کی بات ہے، ہم شام کا کھانا کھانے بیٹھے تھے کہ ساتھ والی وارڈ سے ایک لڑکے نے آ کر بتایا کہ آپ کے دس بارہ ساتھی اَور آئے ہیں۔ اِس پر ہم حیران رہ گئے کہ ہمارے اِتنے زیادہ ساتھی کہاں سے آ گئے اور کیوں؟ ہم نے کھانا وہیں چھوڑ دیا اور اپنی وارڈ کے بیرونی دروازہ پر ان کا انتظار کرنے لگے۔ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے مغرب کے بعد وہ ہم تک پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ اوکاڑہ کے خدام ہیں جن پر کلمہ کا بیج لگانے کے جرم میں مقدمہ ہوا ہے اور احمدی ہونے کی بناء پر ان کی گنتی ہمارے ساتھ ہی ڈال دی گئی ہے۔ یہاں پہنچنے پر ہم نے ان کا استقبال کیا، ہاتھ منہ دھلانے کے بعد انہیں ماحضر کھانا پیش کیا اور ان کی کہانی سنی جس کے مطابق انہیں کلمہ طیبہ کے بیج لگانے کے جرم میں دفعہ 298C کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کی کل تعداد گیارہ تھی جن میں اوکاڑہ شہر میں متعین مربی سلسلہ مکرم رانا محمود احمد صاحب اور قائد مجلس اوکاڑہ شہر بھی شامل تھے۔ کھانے اور چائے کے بعد ان کے سونے کا انتظام کیا اور ایک ایک کمرے میں پانچ پانچ ساتھیوں کو بند کروادیا، اِس طرح سے بستروں کی کمی کسی حد تک پوری ہوگئی۔ اگلے روز صبح ہی صبح محترم میاں عاشق صاحب نے ناشتہ کا سامان بھجوادیا۔ ناشتہ کے بعد تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ ان میں سے اکثر تجارت پیشہ ہیں جن کا کام جیل آنے کے باعث بند ہوگیا تھا اور ایک دوست مکرم ملک عبدالرشید صاحب بینک ملازم تھے۔ چند ایک کے سوا باقی غیر شادی شدہ تھے۔ ان سب دوستوں کی وجہ سے سارا دِن خوب رونق لگی رہی۔ نمازوں کی باجماعت ادائیگی اور درس کے علاوہ کبھی نظمیں سنتے سناتے تو کبھی حالات حاضرہ پر تبصرے ہوتے۔ ان میں اکثر نوجوان تھے اور ہمارے پاس گراؤنڈ بھی بہت وسیع تھا جس میں انہوں نے باڑی کی لکیریں کھینچ لیں اور خوب مزے سے کھیلتے رہے۔ اگلے روز عصر کے وقت خبر ملی کہ اِن کے 12 ساتھی اَور آ گئے ہیں، کچھ ہی دیر میں یہ احباب بھی ہمارے درمیان تھے۔ اس طرح سے یہاں 5 چکی میں ہماری اچھی خاصی جماعت قائم ہوگئی۔

## کلمہ لکھنے کی جیل میں سزا

کلمہ کیس میں آئے ہوئے ادکاڑہ کے احباب کی ملاقات آنے پر انہیں ڈیوڑھی کے سامنے سکول کے احاطہ میں رکھا گیا تھا جہاں اُن میں سے کسی نے دیوار پر کوئلہ سے کلمہ طیبہ لکھ دیا جسے دیکھ کر انتظامیہ نے اِس کا سختی سے نوٹس لیتے ہوئے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے سامنے ملاحظہ کے لئے پیش کردیا جنہوں نے پہلے تو ان کی خوب ڈانٹ ڈپٹ کی، ڈرایا دھمکایا پھر اُن میں سے دو احباب کو جنہوں نے اِس 'جرم' کا اِرتکاب کیا تھا، بیڑی لگا کر 7 بلاک میں بند کرنے کا حکم سنا دیا۔ اِس صورتِ حال سے سخت پریشانی ہوئی تاہم اللہ تعالیٰ نے یوں فضل فرمایا کہ اُسی شام اِن سب کی ضمانت ہوگئی اور مغرب کے وقت چند دن اسیران راہِ مولیٰ رہنے کا اعزاز پانے کے بعد سب کے سب رہا کر دیئے گئے، الحمد للہ۔

## قومی اِنتخابات

جنرل ضیاء الحق نے 1977ء میں مارشل لاء لگاتے وقت 90 دِنوں کے اندر اندر قومی انتخابات کروانے کا جو وعدہ کیا تھا قریباً 90 مہینوں کے بعد پورا کیا اور فروری 85ء کے آخری ہفتہ میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرا ہی دیئے۔ محترم ملک صاحب کے ریڈیو کی وجہ سے انتخابی سرگرمیوں سے ہم بھی باخبر رہے۔ تازہ ترین صورتحال سے ہم پوری طرح باخبر رہے۔ خاص طور پر جماعت احمدیہ کے معاند اور سیاسی قلابازوں راجہ ظفر الحق، غلام دستگیر اور میر علی احمد تالپور کی قلابازیاں لگتے سنا اور اُنہیں عبرت کا نشان بنتے دیکھا تو دِل اللہ کی حمد سے لبریز ہوگئے جس نے اِس الٰہی جماعت کو ظلم وستم کا نشانہ بنانے والے صاحب اقتدار جغادریوں کو اِنِّیْ مُهِيْنٌ مَنْ اَرَادَ اِهَانَتَكَ کا نشان بنا کر رکھ دیا۔ جونہی ہمیں ریڈیو سے ان کے بری طرح ناکام ہونے کی خبر ملی تو دِلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی پھر اس پر بی بی سی کے زبردست تبصرے سن کر اور بھی لطف آیا جن میں سے یہ فقرے خاص طور پر یاد رہے کہ

> 'صدر ضیاء کے چار سینئر وزراء کی بری طرح سے ناکامی اِس بات کا واضح ثبوت ہے کہ پاکستان کے عوام صدر ضیاء کی پالیسیوں سے قطعاً متفق نہیں۔ اس کے نامزد کردہ اطلاعات ونشریات کے وزیر راجہ ظفر الحق کو اس انتخاب میں منہ کی کھانی پڑی ہے، راجہ ظفر الحق ہی وہ وزیر ہیں جن کے سپردان محکموں کے علاوہ گذشتہ آٹھ سال کے دوران ملک میں ہونے والے اسلامائزیشن کے عمل کی نگرانی کا کام بھی تھا، وغیرہ'۔

الیکشن کے اس نتیجہ کو دیکھ کر مجھے اپنا وہ خواب یاد آ گیا جس میں خاکسار نے اپنے آپ کو محفوظ جگہ پر دیکھا تھا جبکہ اردگرد زلزلہ کی وجہ سے اونچے اونچے مینار گر رہے تھے۔ الیکشن سے ایک روز قبل صدر ضیاء کی تقریر بھی سنی تھی جس کا یہ فقرہ ہم الیکشن کے نتائج کے ساتھ دُہراتے رہے کہ میری دعائیں اس الیکشن میں حصہ لینے والے وزراء کے ساتھ ہیں۔

# ڈسٹرکٹ جیل ملتان

ملکی انتخابات کی گرما گرمی میں فروری کا مہینہ ختم ہوا تو بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا اور 'مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں' کے مصداق جیل کی صعوبتیں سہولتیں لگنے لگی تھیں۔ اسی کیفیت میں وقت گزرتا چلا گیا اور 16 رفروری 85ء کو ہمارے مقدمہ کی سماعت مارشل لاء کی خصوصی عدالت میں شروع ہو گئی تھی اور ہم دو ہفتوں کے بعد عدالت میں اگلی پیشی کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک روز ایک واقعہ نے ہماری زندگی میں پیدا ہو جانے والی روانی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ یہ واقعہ تھا ہماری ساہیوال جیل سے ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں اچانک منتقلی کا۔

## ساہیوال سے ملتان

یہ یکم مارچ 85ء کی صبح تھی اور جمعہ کا روز کہ اچانک محترم چوہدری الحق صاحب اپنی B کلاس وارڈ سے غیر متوقع طور پر ہمارے پاس آئے اور قدرے گھبراہٹ کے ساتھ کہنے لگے کہ سنا ہے ہمارا چالان ملتان جا رہا ہے یعنی ہمیں ملتان منتقل کیا جا رہا ہے! میں نے بے ساختہ کہا کہ پھر کیا ہے؟ اس کے بعد دیگر ساتھیوں کو پتہ چلا تو سبھی تشویش کا اظہار کرنے لگے تاہم ہر کسی کا خیال تھا کہ کیس ساہیوال کی بجائے ملتان میں سماعت ہو گا، اسی لئے ہمیں وہاں لے جایا جا رہا ہو گا اور بس! ابھی تک تو یہ غیر سرکاری خبر تھی تاہم تھوڑی دیر بعد ہمارا دوپہر کا کھانا جب خلاف معمول صبح ہی صبح آ گیا تو اس خبر کی تصدیق ہونے لگی پھر گھنٹہ ڈیڑھ بعد ہیڈ وارڈر نے آ کر باقاعدہ اطلاع دی اور ہمیں فوری طور پر رخت سفر باندھ لینے کو کہا چنانچہ ہم نے اپنا اپنا سامان باندھا اور ڈیوڑھی کی طرف چل دیئے۔ یہ سب کچھ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ ہر کوئی حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم ڈیوڑھی پہنچے تو وہاں ہمیں لے کر جانے کے لئے پولیس والے بھی پہنچ گئے جنہوں نے پہلے ہمارے دونوں دونوں ہاتھوں کو خوب کس کر ہتھکڑیاں لگائیں اور پھر کہنے لگے کہ اب اپنا اپنا سامان اُٹھاؤ اور باہر گاڑی میں سوار ہونے کے لئے چلو۔ ڈیوڑھی تک تو کچھ سامان قیدی مشقتی ہمارے ساتھ اُٹھا لائے تھے اور کچھ ہم خود کہ ہمارے ہاتھ کھلے تھے مگر اب کیسے اُٹھاتے! مگر ہمیں سپاہیوں نے بڑی سفاکی سے کہا کہ

'یہ ہم نے نہیں، تم نے ہی اٹھانا ہو گا'

چنانچہ ہم نے اپنے اپنے بستر، کنستر اور دیگر اشیاء اُٹھا اُٹھا کر ڈیوڑھی کے اندر اور پھر اس کے بیرونی دروازے کے باہر کھڑی گاڑی کے سامنے لے جانی شروع کیں۔ اس دوران ہاتھ پاؤں باندھ کر مارنے والی بات خوب یاد آئی! سب سامان باہر لایا جا چکا تو پھر اسے ایک میٹر سے زیادہ اونچی گاڑی میں جس طرح چڑھایا، یہ ہمیں جانتے ہیں!

دفتری کارروائی سے فارغ ہو کر جیل سے باہر نکلے تو وہاں بہت سے احباب جماعت ہمیں الوداع کہنے کے لئے جمع تھے جن سے کھلی فضا میں ملاقات ہوئی۔ محترم ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب امیر جماعت ساہیوال بھی آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں ملتان لے جانے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہاں بھی جماعت کو اطلاع کر دی گئی ہے اور جیل کے باہر ہمیں کچھ احباب ملیں گے بھی جن کی نشانی یہ ہوگی کہ انہوں نے کلمہ طیبہ کے بیج لگائے ہوں گے۔ اس موقع پر سبھی اعزہ و اقارب کی کیفیت بڑی جذباتی تھی، انہوں نے بے حد محبت کے ساتھ الوداع کہا۔ اور ہم پولیس لائن سے ہوتے ہوئے عازمِ ملتان ہوئے۔ اگرچہ ہمارے ساتھ اس بس میں بھی بہت سے مسلح اور غیر مسلح سپاہی سوار تھے مگر اس کے علاوہ بھی پولیس کی ایک وین ہمارے پیچھے آتی رہی جیسے انتہائی خطرناک مجرموں کا قافلہ لے جایا جا رہا ہو!!

گاڑی میں بیٹھنے کے لئے لکڑی کے سادہ پھٹوں پر مشتمل سیٹیں تھیں جنہوں نے سارا راستہ اپنا احساس خوب دلایا۔ ہمارے گارد انچارج عزیز الرحمٰن سب انسپکٹر نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ہماری ہتھکڑیاں نصف کر دیں یعنی ایک ایک ہاتھ کھول دیا جس سے ہمیں بہت سہولت ہوگئی اور اپنی نوعیت کا پہلا سفر ہونے کے باوجود کوئی غیر معمولی تکلیف نہ ہوئی، الحمدللہ۔ راستہ میں خانیوال کے بائی پاس پر وقفہ کیا گیا جہاں بیت الخلاء استعمال کرنے کی اجازت دی گئی اور چائے بھی پلائی گئی، فجزاہم اللہ۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو صبح ساڑھے نو بجے شروع ہونے والا ہمارا یہ تاریخی سفر قریباً اڑھائی بجے نشتر ہسپتال ملتان کے قرب میں واقع ڈسٹرکٹ جیل ملتان کے سامنے پہنچ کر ختم ہوا۔

پولیس گارد نے ہمیں جیل انتظامیہ کے حوالہ کیا تو ابتدائی دفتری کارروائی کے بعد جیل انتظامیہ نے اپنی معمول کی کارروائی شروع کر دی۔ پہلے تفصیل سے ہماری بدنی تلاشی لی گئی پھر ہمیں باہر پلاٹ میں بٹھا کر باری باری اپنے سامان کی تلاشی کروانے کو کہا گیا۔ یہ عمل اتنا طویل ہوتا چلا گیا کہ نمازِ ظہر کے بعد جب عصر کا وقت بھی گزرنے لگا تو بعض ساتھیوں نے وہیں نماز ادا کر لی اور جو بعد میں فارغ ہوئے انہوں نے مغرب سے متصل وقت میں نمازیں ادا کیں۔ اس دوران ایک شخص نے آ کر ہمیں کھانا پہنچایا جو باہر سے احبابِ جماعت نے بھجوایا تھا۔ اِسی موقع پر پختہ عمر کے ایک صاحب جن کے ہمراہ ایک نوجوان بھی تھا، تشریف لائے اور اپنا تعارف کرایا کہ وہ احمدی ہیں اور سنٹرل جیل ملتان کے دفتر میں ملازم ہیں۔ ان کے ساتھ آنے والا نوجوان ان کے بڑے بیٹے تھے۔ موصوف نہایت شریف النفس انسان تھے اور بعد میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی ہو گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ نمازِ جمعہ پر ہمارے یہاں آنے کا اعلان ہوا ہے جسے سن کر سیدھے چلے آئے ہیں۔ ان کے پاس گرم چائے کا ایک بڑا سا تھرماس تھا جو اُس شام بہت کام آیا، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

تلاشی کے دوران مکرم چوہدری اسحٰق صاحب کے سامان سے حضور اقدس کے بھجوائے ہوئے کچھ چاکلیٹ بھی نکلے تھے جن کے متعلق سرکار کا حکم جاری ہوا کہ یہ جیل کے اندر نہیں جاسکتے البتہ حکام نے اتنی اجازت دے دی کہ انہیں یہیں کھالیں۔ چنانچہ ہم سب نے وہ چاکلیٹ مزے لے لے کر کھائے کہ حضور اقدس کا تحفہ تھا اور ساتھ ہی جیل حکام کی کم ظرفی اور سخت گیری پر حیران بھی ہوہو جاتے رہے۔

## ڈسٹرکٹ جیل ملتان

ملتان میں دو جیلیں ہیں۔ ایک ڈسٹرکٹ جیل کہلاتی ہے اور دوسری سنٹرل جیل۔ مکمل طور پر کچی مگر ضرورت سے بھی زیادہ موٹی موٹی دیواروں والی ڈسٹرکٹ جیل شہر میں واقع وہ پرانی جیل ہے جسے انگریزوں نے 1870ء کے لگ بھگ تعمیر کیا تھا۔ اب یہ صرف حوالاتیوں کو حراست میں رکھنے کے کام آتی ہے۔ اس میں قیدی صرف اُتنے ہی رکھے جاتے ہیں جتنے جیل کے چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے کام مثلاً صفائی، پکوائی وغیرہ کے لئے ضروری ہوں اور وہ بھی چھوٹی قید والے ورگرنہ قیدیوں کا اصل مقام سنٹرل جیل ہے جو شہر سے ذرا ہٹ کر ہے۔

تلاشی کے مراحل میں سے گزر کر ہم جیل کے اندر پہنچے تو شام ہو چکی تھی اور اُس وقت تک سب حوالاتی اور قیدی بند کئے جاچکے تھے، اس لئے ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ ہمیں ڈیوڑھی سے 'چکر' (جیل کا اندرونی اور انتہائی طاقتور دفتر) میں لایا گیا جہاں سے پتہ چلا کہ آج کی رات ہماری گنتی بارک نمبر 2 میں ہوگی جہاں "نئے ملاحظہ" والے رکھے جاتے ہیں۔ ہم اپنا سامان اُٹھائے اُس بارک کے سامنے پہنچے تو دو تین نمبر دار اپنی نمبرداری جگانے آگئے اور لگے ہماری ایک بار پھر تلاشی لینے! ہم نے کمال بے نیازی سے اپنا سامان وہاں رکھتے ہوئے انہیں اپنا 'فرض منصبی' پورا کرنے کی دعوت دی تو وہ اپنا سامنہ لے کے رہ گئے۔ اُن کے ساتھ چند ایک ملازم بھی تھے۔ یہ دیکھ کر ان میں سے سینئر ملازم بولا جانے دو انہیں! چنانچہ ہم نے اپنا سامان اُٹھایا اور بارک کے اندر چلے گئے۔

اِس بارک کو درمیان سے ایک دیوار کے ذریعہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصہ میں نئے آنے والے اُس وقت تک رکھے جاتے تھے جب تک کہ ان کا ملاحظہ نہ ہو جاتا۔ اِسی اعتبار سے اُنہیں 'نیا ملاحظہ' کہا جاتا اور دوسرا حصہ قیدیوں کے لئے مخصوص تھا۔ ہم اِس بارک میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اصطبل نما جگہ ہے جہاں پھٹے پرانے غلیظ قسم کے ٹاٹوں پر چالیس پچاس افراد بے بسی کے عالم میں بند پڑے تھے۔ دیواروں میں کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں جن میں موٹی اور مضبوط سلاخیں نصب تھیں۔ دیواریں تیل، گھی، پان کتھے اور نہ جانے کس کس قسم کے داغوں کے باعث خاص قسم کے تجریدی آرٹ کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ بارک کے ایک کونے میں ایک گھر اسا بنا ہوا تھا جس میں پانی کا ایک نل

بھی تھا۔ اس کے نیچے بعض لوگ نہاتے ہوئے بھی پائے گئے۔ یہاں پانی وافر مقدار میں اور مسلسل آتا رہتا تھا جبکہ ساہیوال جیل میں وقت کا پابند تھا۔ بارک کے آخر پر ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس کے پیچھے اندھیرا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حوالاتی اس میں خالی ہاتھ جاتے مگر واپس آتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں گرم گرم چائے کے گلاس ہوتے۔ ہم نے سمجھا کہ یہ کچن ہوگا چونکہ ہمارے پاس وافر مقدار میں چائے موجود تھی اس لئے ہمیں اُدھر جانے کی ضرورت نہ پڑی مگر جب ہم نے وضو کرنے کے لئے غسل خانہ کا کسی سے پوچھا تو اُسی دروازہ کی طرف اشارہ کیا گیا۔ ہم وہاں گئے تو پتہ چلا کہ یہ کمرادر اصل بیت الخلاء ہے مگر اس کی کھڑکی کے ساتھ ہی پچھواڑے میں واقع قیدی بارک کی بھی کھڑکی ہے جہاں سے قیدی اپنے واقف کاروں یا گاہکوں کو چائے بنا بنا کر سپلائی کرتے تھے جو نواردوں کے لئے اُس وقت ایک غیر معمولی نعمت ہوتی۔

ہم نے اپنا سامان رکھنے کے بعد نمازیں ادا کیں۔ تھوڑا بہت کھانا کھانے کی کوشش کی اور اپنے اپنے بستر درست کر چکے تو کسی نے آواز دی 'اسحاق کون ہے؟' مکرم چوہدری اسحاق صاحب آگے بڑے تو انہیں حکم ملا کہ اپنا سامان اُٹھاؤ اور B کلاس میں چلو۔ اُنہوں نے بہتیرا کہا کہ اب مجھے یہیں رہنے دو صبح چلا جاؤں گا مگر جواب ملا یہ ناممکن ہے، اس پر انہیں جانا ہی پڑا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد پھر ایک حکم آیا کہ جن جن کی کل صبح مارشل لاء عدالت میں پیشی ہے وہ باہر آجائیں! اس پر ہمارے ساتھ تین چار اور بھی باہر نکل آئے اور ہم سب کو ہانک کر ہسپتال لے جایا گیا جہاں ہمارا طبی معائنہ کیا گیا۔ یہ طبی معائنہ کیا تھا، ہسپتال کے ایک کمرے کے باہر جوتے اُتروا کر باری باری اندر جانے کے لئے ہمیں تیار کر کے کھڑا کر دیا گیا۔ اُس کمرے میں بس اُتنی ہی روشنی تھی جتنی شام کے وقت بغیر بجلی کے ہو سکتی ہے۔ اس اندھیرے میں ایک صاحب ایک بڑا سا رجسٹر کھولے میز کرسی پر براجمان تھے۔ ہم باری باری اندر جاتے تو ہمیں ایک سٹینڈ پر کھڑے ہونے کا حکم ملتا، ہم تعمیل کرتے تو صاحب موصوف سر اُٹھا کر دیکھتے اور ہماری 'سربلندی' کو اِنچوں کے پیمانے میں ناپتے ہوئے بڑے تحکمانہ انداز میں اپنی طرف بلاتے اور دیگر کوائف لکھ کر چھٹی دے دیتے۔ جیل کے دیگر عملہ کی طرح یہ صاحب بھی اپنی جگہ پورے فرعون بن کر بیٹھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ان کی ہمارے ملک صاحب کے ساتھ جھڑپ بھی ہوگئی مگر چند دِنوں بعد جب انہیں ہمارے متعلق پتہ چلا تو یہ بھی دیگر عملہ کی طرح ہمارے ساتھ رشتہ داریاں تک نکالنے لگے اور وہ یوں کہ آپ کے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب میری بھابھی کے رشتہ داروں کے رشتہ دار ہیں اور یہ کہ میں بھی جھنگ کی اُسی گلی کا رہنے والا ہوں جس گلی کے محترم ڈاکٹر صاحب موصوف رہنے والے ہیں! ہوئی نا بات 'رشتہ داری' نکالنے کے فن کی!

ملتان آنے کے اگلے روز ہی فوجی عدالت میں سماعت مقدمہ کے لئے ہماری پیشی تھی جس سے فارغ ہو کر واپس جیل پہنچے تو ہسپتال کے اُس حصہ میں گئے جہاں چوہدری اسحق صاحب کی بی کلاس کا کمرا تھا۔ یہاں ہم نے پانی پیا، چائے بنائی اور سامنے پلاٹ میں نمازِ ظہر با جماعت ادا کی۔ دراصل اِنتظار تھا کہ ہمیں اُس جگہ کا پتہ چلے جہاں ہماری گنتی ڈالی گئی ہے تا اپنی مستقل جگہ پر اپنا سامان رکھ کر کچھ آرام کریں کیونکہ گذشتہ سفر (ساہیوال تا ملتان)، نئے ملاحظہ میں رات، کینال ریسٹ ہاؤس سے جیل تک کا پیدل سفر اور بے یقینی کی صورتِ حال، اِن سب مراحل نے بُری طرح تھکا دیا تھا۔ ساڑھے تین بجے کے قریب ایک نمبردار نے آ کر ایک عجیب سا لفظ بول کر بتایا کہ آپ کی گنتی وہاں ڈالی گئی ہے اس لئے اپنا سامان اُٹھائیں اور چلیں! یہ اجنبی سا لفظ تھا 'کورائٹین'۔

ہم نے اپنا اپنا سامان ایک مرتبہ پھر سمیٹا، اپنے کندھوں پر لادا اور جیل کے مختلف راستوں اور گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ایک خوفناک احاطہ میں پہنچے۔ یہ تھا کورائٹین! جس میں ہماری گنتی ڈالی گئی تھی۔ یہ جگہ ڈیوڑھی کے پاس جیل کے ایک کونے میں تھی اور ایک طرح کے تصوری پہرہ کا حکم رکھتی تھی اور صرف خاص خاص مجرموں کو ہی یہاں رکھا جاتا تھا۔ یہاں کچی دیواروں اور کچے فرشوں پر مشتمل کل دس چکیاں (کمرے) تھیں جن کے سامنے بھی اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ اِن کی وجہ سے چکیوں میں نہ صرف روشنی کم آتی تھی بلکہ ہوا کے آنے میں بھی روک تھیں۔ اِن دیواروں میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے دروازے ٹیکسلا کے کھنڈرات کی یاد دِلاتے تھے۔ ان میں ہمارے علاوہ آٹھ دس اَور بھی لوگ بند تھے جس کی وجہ سے ابتداء میں ایک ایک کمرے میں تین تین افراد بھی بند کئے جاتے رہے تاہم بعد میں گنتی کم ہونے پر ہم اکیلے اکیلے بھی بند کئے جاتے رہے۔

یہاں بیت الخلاء صرف ایک تھا مگر تھا فلش سسٹم کی سہولت کے ساتھ! جس کی بدولت اس پہلو سے ہمیں اطمینان ہوا۔ علاوہ ازیں یہاں پانی سارا دِن آتا رہتا جبکہ ساہیوال میں یہ سہولتیں ناپید تھیں۔ تاہم بعض دوسرے پہلو عجب شان رکھتے تھے مثلاً ہمیں اپنے پاس کسی قسم کا کوئی سامان رکھنے کی اجازت نہ تھی بلکہ شام کو بند ہونے سے پہلے ہر چیز سٹور کے طور پر مخصوص کئے گئے کمرے میں جمع کروانے کا حکم تھا۔ یہاں تک کہ اگر کسی نے اپنے زائد کپڑے سرہانے کے طور پر رکھے ہوئے تھے تو A/S صاحب سخت ناراض ہوتے۔ برادرم عبدالقدیر صاحب نے بتایا کہ ایک روز ان کی چکی میں زائد جوتا دیکھ کر حکم ہوا کہ اسے سٹور میں رکھا کرو!

کورائٹین میں آتے ہی ہمارے متعلق سب کو بتا دیا گیا تھا کہ یہ مرزائی ہیں چنانچہ بعض لوگ تو ہمارے ساتھ بات

کرنے سے بھی کتراتے جبکہ بعض بات چھیڑ بھی دیتے کہ آپ کون ہیں، کیسے ہیں؟ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہتیں۔ اس طرح سے لوگوں سے تعارف ہوا تو اُن سے جیل کے حالات پوچھے اور کورائٹین کی تفاصیل معلوم کیں۔ جس سے بھی کوئی مذہبی بات ہوتی وہ حیرت سے یہی پوچھتا کہ آپ کی نماز تو بالکل ہمارے جیسی ہے کیا قرآن بھی وہی ہے؟ اسی بات کا تو ہمیں انتظار ہوتا چنانچہ ہم اپنی کہانی انہیں سناتے اور جماعت کا مختصراً تعارف کراتے ہوئے اپنے عقائد کے متعلق بتاتے۔ اس پر وہ حیران ہوتے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو یہ کہتے کہ بھئی ان میں اور ہم میں تو کوئی بھی فرق نہیں ہے۔

## علی جان افغانی

کورائٹین میں ہمارے ساتھ مختلف الجرائم لوگ آتے اور جاتے رہے لیکن ایک شخص کی یاد مجھے ہمیشہ رہے گی، اس کا نام علی جان افغانی تھا۔ تین سال پہلے افغان پناہ گزین کے طور پر آیا تھا کہ خانیوال اسٹیشن پر پولیس کے قابو آ گیا۔ اردو اسے نہ آتی تھی اور اس کے بقول پولیس اُسے اِدھر اُدھر لئے پھرتی رہی پھر دو تین پیشیوں میں ہی اس کا مقدمہ مکمل ہوا اور چار سال قید کا پروانہ مل گیا۔ اس طرح سے شہر مجبوراں کی شہریت سے نوازا جانے والا 26، 27 سالہ یہ شخص اب ہمارے پاس بطور مشققتی کام کرتا تھا۔ اس کے سپرد ہمارے احاطہ کی صفائی اور اس میں کوچی پوچا کرنا تھا۔ یہ شخص بڑا ہی جفاکش، خوددار اور فرض شناس ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت شریف الطبع، نمازی، روزہ دار اور دیانت دار تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمارے انچارج کو کسی قسم کا فکر نہ ہوتا۔ اس کی فرض شناسی کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک رات بہت تیز بارش ہوئی۔ صبح اُٹھے تو گنتی کھلنے سے پہلے علی جان یہاں ڈیوٹی پر موجود تھا۔ میں نے پوچھا علی جان! آج اتنی جلدی؟ جواباً بڑی متانت سے اپنی مخصوص اردو میں کہنے لگا 'میں تو ساری رات سویا ہی نہیں، یہی سوچتا رہا کہ دیواریں خراب ہوگئی ہوں گی، ان پر کوچی کرنی ہوگی، پوچا کرنا ہے اور کل دورہ بھی ہے'۔ میں انگشت بدنداں رہ گیا!

علی جان اپنے مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھا۔ اسے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے فارسی اُشعار سناتا تو وہ بے اختیار سر دُھننے لگتا لیکن براہِ راست کسی تبلیغی گفتگو سے گریز کرتا۔ ایک دِن فارغ وقت میں اُسے لے کر میں بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ جب وہ تفصیلات بتا چکا تو انہی کے حوالہ سے میں نے کچھ سوالات کئے مگر اُس بیچارہ کا دینی علم زیادہ نہ تھا جس کی وجہ سے وہ کسی بھی بات کا جواب نہ دے پایا۔ ایسی دو تین مجالس ہوئیں تو ایک روز خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک بغیر کسی سیاق وسباق کے بولا کہ اب تم اپنے مسلک کے بارے میں بتاؤ! مجھے اور کیا چاہئے تھا چنانچہ اُسے جماعت کا تعارف کرایا۔ جس سے وہ ہمارے قریب آ گیا اور نمازوں کے بعد ہم درس دیتے تو ہمارے پاس بیٹھ کر سنتا اور ہر بات میں دلچسپی لیتا۔ جہاں بھی ہو اللہ تعالیٰ اس کی ہدایت کے سامان فرمائے، آمین۔

## کوراٹین میں معمولات

کوراٹین کی بعض اور باتیں بھی ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ایک تو یہاں قواعد و ضوابط کی رُو سے روزانہ تلاشی ہوتی تھی کیونکہ یہ نیم قصوری پہرہ تھا۔ یہاں جسے بھی رکھا جاتا اس کا مقدر تھا کہ اُسے ہر ممکن طور پر تنگ کیا جائے اور پریشان رکھا جائے۔ کبھی ہیڈ وارڈر تلاشی لے لیتا اور کبھی اس حصہ کا انچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے بنفس نفیس آ تا۔ ایک روز تو انہوں نے عجیب تماشا کیا کہ عصر کی نماز کے بعد جب بند ہونے کا وقت تھا تو میں بیت الخلاء جانے کے لئے اپنی چکی سے نکل کر باہر صحن میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے تمام ساتھی باہر صحن میں بے حس و حرکت کھڑے ہیں اور سامنے ان کے ہمارا انچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ غیر معمولی غصہ کے عالم میں کھڑا ہے جس نے مجھے بھی ان کے ساتھ کھڑا ہونے کا حکم دیا اور ساتھ ہی بڑے تحکمانہ انداز سے ہیڈ وارڈر سے کہا کہ ان سب کی جامہ تلاشی لو! چنانچہ بڑی تفصیل سے ہماری جامہ تلاشی ہوئی۔ شکر ہے کہ اُس روز کسی کے بھی پاس کوئی نقدی نہ تھی جبکہ کسی اور غیر قانونی چیز کا تو سوال ہی نہ تھا۔ شروع میں تو ہم اِس عجیب و غریب معمول پر سٹپٹائے کیونکہ ہمیں کچھ علم نہ ہوتا کہ کس وقت یہ لوگ آ کر ہماری تمام سیٹنگ درہم برہم کر دیں! لیکن چند دنوں میں کچھ تو ہم عادی ہو گئے اور کچھ ہم نے احتیاطی و دفاعی "انتظامات" بھی کر لئے۔

## سپرنٹنڈنٹ کا دورہ

یہاں کا یہ بھی معمول تھا کہ سپرنٹنڈنٹ کا دورہ ہفتہ میں دو بار ہوتا جو ساہیوال جیل کی طرح یہاں بھی قیامت سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ ہیڈ وارڈر خوب اکڑی ہوئی وردی پہن کے آتا اور مشقتیوں اور حوالاتیوں پر حکم چلا رہا ہوتا۔ یہاں سے اُٹھو، وہاں سے اُٹھو، یہاں بیٹھو، وہاں نہ بیٹھو وغیرہ۔ غرضیکہ دورہ کے لئے بھرپور تیاری کی جاتی، صفائی وغیرہ تو مشقتی کرتے جبکہ اپنے کمرے ہمیں خود تیار کرنے ہوتے۔ اس کے لئے ہمیں اپنی تمام اشیاء سٹور میں رکھنی ہوتیں، پانی کا گھڑا اور جوتے شیڈ میں ترتیب کے ساتھ لگانے ہوتے، اپنا اپنا ٹینا (ٹین کا کنستر جسے جیل میں صندوق کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے) اپنی چکی کے سامنے کھول کر رکھنا ہوتا اور اپنا ٹکٹ دروازہ پر لٹکا کر چکی کے اندر درمیان میں دری پر آلتی پالتی مار کر مکمل خاموشی کے ساتھ بیٹھنا ہوتا تھا۔ دورہ آتا تو اُس کے ساتھ افسروں، حوالداروں، سپاہیوں اور قیدی نمبرداروں کی فوج ہوتی۔ جونہی دورہ کا یہ جلوس کسی احاطہ میں داخل ہوتا، ایک نمبردار لوہے کے ایک لٹھ کو ہر دروازے کی سلاخوں پر رگڑتا چلا جاتا جس سے 'کڑکڑ' کی دلخراش آواز پیدا ہوتی۔ اس طرح سے دراصل دورہ کے لئے ہوشیار کیا

جاتا کہ 'باادب، باملاحظہ ہوشیار! صاحب بہادر تشریف لا رہے ہیں'۔ دورہ کے دوران ہر قیدی 'جل توں جلال توں، آئی بلا ٹال توں' کا وِرد کرتا رہتا کیونکہ اِس دوران کسی بھی قیدی کے سامان اور جسم وجان تک کی تلاشی لی جاسکتی تھی۔ پہلے دورہ پر تو صاحب بہادر ہم احمدیوں میں سے جس کی چکی کے سامنے بھی گیا، ٹکٹ سے اعمال نامہ پڑھ کر حکم دیتا گیا کہ اسے کھولو! دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی افسر اور ماتحت اندر آجاتے اور ہمیں ایک طرف کھڑا کر کے کچھ ہماری جامہ تلاشی کرنے لگتے اور کچھ ہمارے بستر کو اُلٹ پلٹ کر اچھی طرح سے جھاڑتے اور باقی ہمارے ٹینے کو اُلٹا کر کمال بے دردی سے ساری چیزیں بکھیر دیتے۔ ایسا وحشیانہ اور خوفناک قسم کا آپریشن کیا جاتا کہ اس کی زد میں آئے ہوئے قیدی کے اوسان خوانخواہ خطا ہو جاتے اور اگر اِس دوران کسی سے کوئی بھی ممنوعہ چیز برآمد ہو جاتی تو اس کے ساتھ وہ سلوک ہوتا جو اُسے عمر بھر یاد رہتا۔

## میری شامت

یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے کہ ایک دورہ والے دِن مبلغ بیس روپے کا ایک نوٹ میری جیب میں رہ گیا۔ اگرچہ جیل میں رقم رکھنے کی اجازت تو نہیں ہوتی تاہم افسران کو بھی خوب علم ہوتا ہے کہ قیدیوں کے پاس پیسے ہوتے ہیں تبھی تو اندر سے کمائی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اندر آنے والی کنٹین سے کھلے عام خریداری پیسوں کے ذریعہ ہی ہوتی تھی۔ بہرحال اُس روز میری تلاشی ہوئی تو بیس روپے کا وہ نوٹ قابو آگیا۔ نوٹ کیا، میں ان کے قابو آگیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جو اُس وقت دورہ کر رہا تھا، انتہائی گراوٹ پر اُتر آیا اور عبدالغنی نامی اس کا ساتھی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جلتی پر تیل ڈالتے ہوئے بولا 'جی! انہیں ابھی سمجھ نہیں آئی'۔ اس پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے مجھے اگلے روز ملاحظہ پر طلب کر لیا۔ بڑے صاحب کے حضور مجھے اس جرم میں پیش کیا گیا کہ میری جیب میں میرے اپنے 20 روپے تھے!! میری باری آنے پر بڑا صاحب کسی قدر اچھی طرح ہی پیش آیا مگر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے یہ برداشت نہ ہوا چنانچہ اُس نے زور دے کر صاحب کو بھڑکایا۔ میں نے معذرت کی کہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے، آئندہ شکایت نہیں ملے گی۔ جس پر صاحب کہنے لگا کہ اچھا 'آئندہ ہوا تو 4 پہرہ میں بیڑی لگا کر اُلٹا لٹکا دوں گا' پھر اُس نے میرے ٹکٹ (سروس بک) پر اس مقدمہ کا فیصلہ لکھا جس میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ

رقم بحق سرکار ضبط، ایک تہائی برآمد کرنے والے کو ملے گی

اِس طرح سے میری یہاں سے خلاصی ہوئی اور میرے ساتھیوں کی پریشانی دور ہوئی، الحمدللہ۔ اس موقع پر مجھے صاحب کے سامنے پیش ہونے اور کھڑے ہونے کا مؤدب طریق بھی سکھایا گیا۔ مجھے صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تو میں اپنی

سمجھا اور طریق کے مطابق ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا کہ میرے نزدیک کسی بڑے کے سامنے مؤدب ہو کر کھڑے ہونے کا یہی طریق ہوتا ہے مگر جس نمبردار نے مجھے پکڑا ہؤا تھا اس کی نظر میری اس ہیئت پر پڑی تو اس نے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر کھولنا چاہا۔ میں نے کچھ مزاحمت کی تو اُس نے بڑے زور سے میرے ہاتھوں کو کھولا اور سمجھایا کہ اس طرح ہاتھ کھلے چھوڑ کر صاحب کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو اس نے یہ دیکھ کر کہ میں تو صاحب سے آنکھیں چار کر کے بات کر رہا تھا، اپنا ہاتھ میری گدی پر ٹکا دیا اور پیچھے سے میرے سر کو زور سے دباتا چلا گیا تا آنکہ میں اس پوزیشن پر جا پہنچا کہ میں صاحب کی طرف دیکھ نہ سکتا تھا۔ یہ تھا ملاحظہ میں صاحب کے سامنے پیش ہونے کا طریق جس کا سبق مجھے اُس روز ملا!

کورائین کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ یہاں ہر جمعہ کے روز صبح صبح کچھ نمبردار آتے اور کسیوں کے ساتھ ہر چکی میں کھدائی شروع کر دیتے۔ ان کا مقصد تو غالباً یہ معلوم کرنا ہوتا ہوگا کہ کسی نے فرار ہونے کے لئے سرنگ کھودنی شروع نہ کی ہو مگر اسے بھی انہوں نے قیدیوں کو تنگ کرنے کا ذریعہ بنالیا ہؤا تھا۔ چنانچہ جب اس مقصد کے لئے آتے تو قیدی کا سامان ادھر ادھر پھینک کر اس طرح کھدائی کرتے جیسے یہاں فصل کی کاشت کی جانی مقصود ہو۔ بہر حال اس عمل کے بعد ہمارا مشفق علی جان بڑی محنت سے ساری چکیوں میں زمین ہموار کرتا اور پانی چھڑک کر اسے درست کر دیتا۔

## قرآنی دعاؤں کا معجزہ

یوں تو ہم پہلی رات سے ہی زمین پر سو رہے تھے لیکن موسم سرما ہونے کی وجہ سے حشرات الارض سے بچے ہوئے تھے۔ اب یہاں آئے تو موسم گرما کا آغاز ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کیڑے مکوڑوں کے نکلنے کا موسم بھی آ گیا تھا۔ چند ہی دنوں میں ہم نے دیکھا کہ رات ہوتے ہی عجیب و غریب قسم کی شکل و صورت اور رنگ و نسل کے کیڑے ایسی آزادی سے ہمارے اردگرد گھومنے پھرنے لگتے گویا انہیں احساس ہی نہیں، کچھ پتہ ہی نہیں کہ یہ جیل ہے اور خاص طور پر رات کو تو بہر حال یہاں ہر ایک کو بند ہونا پڑتا ہے مگر انہیں کسی قاعدہ قانون کی پرواہ نہ ہوتی۔ شروع شروع میں تو ہمارا یہ معمول رہا کہ جہاں اور جس وقت جس قسم کے کیڑے کو دیکھا جوتی پکڑ کر اسے ٹھکانے لگا دیتے۔ مگر کتنوں کو مارتے اور کب تک مارتے، آخر ہم نے سونا بھی ہوتا۔ ایک دو مرتبہ تو ایسے واقعات ہوئے کہ عام کیڑوں سے بڑھ کر بچھوؤں تک نوبت پہنچ جاتی رہی اور مختلف چکیوں سے کئی بچھو گرفتار بھی کئے گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ بچھو پکڑے جانے کے سارے واقعات دن کے وقت ہی پیش آئے مگر رات بھی تو ہم ان سے امن میں نہیں تھے چنانچہ اس کا میں نے تو یہ نسخہ سوچا کہ نمازِ عشاء کی آخری دو رکعات میں معوذتین تلاوت کرتا اور خاص طور پر مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ پر غور کرتے ہوئے پڑھ کر خدا

کے حضور تمام مخلوقات کے شر سے بچنے کی اِلتجاء کرتا۔ چنانچہ میرا یہ طریق آخر تک رہا کہ یہ دعا کرتے ہوئے مضمون کو ہر قسم کی موذی مخلوق تک وسیع رکھتا۔ ظاہر ہے مخلوقات میں کیڑے مکوڑے بھی شامل ہیں اور وہ بھی جو مَنْ تَحتَ اَدِیمِ السَّمَاءِ کے مصداق ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب بھی خطرناک کیڑوں کی ہمارے کمروں میں آمد ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان سے باخبر کردیا اور اُس کا یہ سلوک ہمارے ساتھ شروع سے ہی رہا۔ 14 چکی میں گو فرش پختہ تھے اور دیواریں بھی پکی تھیں لیکن فرش پر بھی اور دیواروں میں بھی خوفناک دراڑیں تھیں، جن سے کیڑے نکلتے رہتے تھے۔ یہاں بالکل اِبتدائی دِنوں کی بات ہے کہ کم ازکم تین بار مجھے لمبے لمبے کیڑے نظر آئے، کبھی بستر کے قریب، کبھی کمرے کے درمیان میں مگر خدا تعالیٰ نے ہر دفعہ حفاظت فرمائی اور کبھی کسی کو بستر پر چڑھنے نہیں دیا اور جب کبھی بستر پر کوئی کیڑا آ ہی گیا تو اس سے حفاظت کا بھی عجیب رنگ میں انتظام فرمایا، لیجئے اس کا واقعہ بھی سن لیں۔

ملتان سے ساہیوال جیل واپسی کے بعد 5 چکی میں رمضان کی ایک رات کا واقعہ ہے۔ گرمی شدت کی وجہ سے صرف نیکر پہن کر سویا ہوا تھا کہ اچانک کسی انجانے اور لاشعوری اَلارم کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا رُخ دروازہ کی طرف تھا مگر اچانک میری نظر عقبی دیوار کی طرف پھری تو میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ کا ایک موٹا سا خوفناک کیڑا تیزی سے دوڑتا ہوا میرے بستر کی طرف آرہا تھا اور اس کا گزر عین اُس جگہ سے ہونا تھا جہاں میری کمر تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں اُچھل کر ایک طرف ہوگیا اور جب وہ بستر پر سے گزر کر کھرے میں پہنچا تو میں نے جوتی لے کر اس کی خبر لی اور ٹھکانے لگا دیا۔ مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ وہ کتنا خطرناک کیڑا تھا اور اُس کا ارادہ کیا تھا مگر مجھے اتنا یاد ہے کہ اِس طرح گہری نیند سے اچانک بیدار کئے جانے پر میرا دل خدا تعالیٰ کے شکر سے بھر گیا کہ اس نے کس طرح سوتے ہوئے بھی میری حفاظت فرمائی۔ میں نے اسے الٰہی مدد اور نصرت یقین کیا اور اِس وعدہ کو عملاً پورا ہوتے ہوئے مشاہدہ کیا کہ تم سو رہے ہوگے اور خدا تمہارے لئے جاگ رہا ہوگا۔ پھر میں سجدلت جسدی، روحی وجنانی کی کیفیت میں ڈوب گیا۔

اس کے علاوہ ایک اور واقعہ بھی ہے جو اس سے بڑھ کر ہے اور وہ بھی اِسی 5 چکی کا ہی ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا کہ ایک رات بجلی نہ ہونے کی وجہ سے پوری طرح اندھیرا تھا اور چاند تاروں کی بھی لو تک نہ تھی۔ رات کے کسی پہر پیشاب کی حاجت سے میری آنکھ کھلی۔ میں اُٹھا اور دروازے کے سامنے پیشاب کرنے کے لئے بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہوئے میرا بایاں گھٹنا دیوار کے ساتھ چھو گیا جس کے ساتھ ہی یک دم شدید ٹیس اُٹھی اور ساری ٹانگ میں درد کی لہر دوڑ گئی کہ کسی

بھڑ نے ڈنگ مارا تھا۔ جس پر فوری طور پر ہر میسر علاج کیا مگر درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ بالآخر بستر پر آ کر سورہ فاتحہ اور درود شریف پڑھ کر اپنا لعاب اُس جگہ لگا دیا اور لیٹ گیا۔ جب اُٹھا تو درد کیا وہ واقعہ تک یاد نہ تھا۔ الحمدللہ علی ذٰلک۔ محترم چوہدری محمد علی صاحب کا یہ شعر اُس وقت زبان پر آ گیا ؎

ایک سچے کی خاکِ پا ہوں میں　　　　فکر میرا نہ اس قدر کرنا

لندن میں جلسہ سالانہ

اپریل کے انہی دنوں میں جب ہم ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں تھے، لندن میں جلسہ سالانہ (یو۔ کے) ہوا۔ جس کی رپورٹنگ بی بی سی کے ذریعہ سننے کا موقع ملا۔ غالباً جلسہ سے دوسری یا تیسری صبح سویرے بی بی سی کی نشریات سن رہے تھے کہ خبروں کے بعد جہاں نما کی سرخیوں میں جماعت کے جلسہ کی تفصیلات دینے کا بھی ذکر تھا۔ پھر کیا تھا، سب ساتھیوں اور کورانٹین میں موجو غیر از جماعت دوستوں کو بھی بلا لیا اور پھر جلسہ کی تفصیلات کا ذکر سب نے بڑی دلچسپی سے سنا۔ اسی نشریہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کے طویل اختتامی خطاب کا بھی ذکر تھا، ختم نبوت کے مضمون پر مشتمل اس معرکہ آرا خطاب کے ایک اقتباس کا ریکارڈ بھی سنایا۔ یہ آواز، یہ مبارک الفاظ ہمارے لئے بڑے ہی روح پرور تھے۔ اللہ تعالیٰ بی بی سی والوں کا بھلا کرے جن کی بدولت ہمیں اپنے آقا کی آواز سننے کا موقع میسر آیا۔ دو یا تین دنوں کے بعد شام کو ہم جب بند ہوئے تو ساتھ والی چکی سے محترم ملک صاحب نے آواز دی کہ جلسہ کی خبر پھر بی بی سی سے آ رہی ہے جسے انہوں نے سنانے اور ہم نے سننے کی کوشش تو کی مگر درمیانی دیواروں کی وجہ سے صاف سنائی نہ دے رہا تھا۔ ملک صاحب نے بتایا کہ اردو کے علاوہ فارسی اور ہندی میں بھی خبر آئی ہے۔ اگلی صبح جب بی بی سی کی نشریات اسی زبان میں جاری تھیں، میں نے ریڈیو لگایا تو جماعت احمدیہ کا ذکر پھر غور سے سننے لگا تو ایک تبصرہ تھا جو پاکستان میں جماعت احمدیہ کے حالات پر مشتمل تھا۔ پھر اردو کی خبریں شروع ہوئیں تو ابتداء میں ہی جہاں نما کے پروگرام کی تفصیل بتاتے ہوئے جماعت احمدیہ کے نمائندوں کی لندن میں پریس کانفرنس کا بھی بتایا۔ چنانچہ اس قبل از وقت اطلاع سے ہم سب پھر اکھٹے ہو گئے اور ریڈیو کے گرد جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ جہاں نما کے اس پروگرام میں جلسہ سالانہ لندن کے موقع پر اکھٹے ہونے والے دنیا بھر کے 37 ممالک کے احمدی نمائندگان کی منعقدہ پریس کانفرنس کا حال بڑی تفصیل سے سنایا گیا۔ اسی دوران پریس کانفرنس کی صدارت کرنے والے ہمارے امریکن نژاد احمدی جناب برادر مظفر احمد صاحب (مرحوم) نیشنل پریذیڈنٹ امریکہ کی آواز میں ان کی تقریر کا ایک حصہ بھی سنایا گیا۔

ان ہر دو تقاریب کی اس قدر وسیع پیمانے پر اشاعت کے ذریعہ احمدیت کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پہنچ رہا تھا اور

یہ دراصل جماعت پر آنے والے ابتلاء کا ثمرہ ہے۔ خدا تعالیٰ کے فرشتے احمدیوں کی مظلومیت اور معصومیت کو دیکھ کر پتہ نہیں کون کون سے تار ہلا رہے تھے کہ ہمارا تعارف اور پیغام ہر خاص و عام تک پہنچ رہا تھا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ ان نشریات کے ذریعہ حضور رحمہ اللہ کے بابرکت منظوم کلام کے یہ الفاظ بڑے پرشوکت انداز میں پورے ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔

یہ صدائے فقیرانہ حق آشنا، پھیلتی جائے گی شش جہت میں سدا

تیری آواز اے دشمنِ بد نوا! دو قدم دور دو تین پل جائے گی

## جیل میں یوم مسیح موعود علیہ السلام

ہم ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں ہی تھے کہ اسی دوران میں 23 مارچ کا مبارک دن بھی آیا۔ اُس روز یعنی یوم مسیح موعود علیہ السلام اور یوم پاکستان کے موقع پر چوہدری اسحٰق صاحب نے مٹھائی منگوا کر کورانٹین کے سب 'رہائشیوں' میں تقسیم کی۔ ہم اسیران نے اپنے طور پر ایک مجلس لگائی اور یوم مسیح موعود علیہ السلام کے حوالہ سے یادیں تازہ کیں اور اپنے ایمانوں کو گرمایا۔

25 مارچ کو ہماری ملاقات آئی جس کے لئے ربوہ سے متعدد دوست آئے ہوئے تھے۔ اُس روز برادرم اکرم خالد صاحب کیمیکل انجینئر کی کوششوں سے میرے دونوں بیٹے عزیزان طارق اور خالد اندر آ گئے اور اس طرح سے گذشتہ 5 ماہ کے بعد پہلی مرتبہ بیٹوں کو پیار کرنے اور ان کو گود میں اٹھانے کا موقع ملا۔ الحمدللہ۔ ماشاءاللہ اب تو خالد بھی ہوشیار ہو گیا ہوا تھا۔ میں اسے تین ماہ سے بھی کم عمر میں چھوڑ کر آیا تھا، اُس وقت تو صرف لیٹتا ہی تھا مگر اب بیٹھنے بھی لگا تھا اور طارق نے بھی ماشاءاللہ خوب ترقی کر لی تھی اور بڑے صاف لہجہ میں باتیں کرنی سیکھ لیں تھیں، الحمدللہ۔ اِس سے پہلے 6 مارچ کو میری ملاقات ہوئی تھی۔ اُس دن صرف اباجان ہی آئے تھے اور جماعت ملتان کے بے شمار دوست بھی تشریف لائے تھے۔ ان دوستوں کی کیفیت دیکھ کر دل اور دماغ حمد و شکر کے جذبات سے معمور ہو کر اللہ کے حضور یہ کہتے ہوئے جھک جاتا کہ اے اللہ! تو نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو کیسی عظیم الشان جماعت عطا فرمائی ہے، حضرت اقدس کی برکت کے طفیل ان کے دلوں میں ہماری کس قدر محبت ڈال دی ہے۔

## ماموں کی دعوت ولیمہ

مؤرخہ 29 مارچ 1985ء کو گوجرانوالہ میں میرے سب سے چھوٹے ماموں مکرم عبدالباسط صاحب کی شادی تھی اور 30 مارچ کو دعوتِ ولیمہ۔ اِس تقریب میں شمولیت کی دلی خواہش تھی مگر ایسا نہ ہو سکا اور یہ خواہش حسرت بن کر رہ گئی تاہم

دعاؤں کے ذریعہ اس تقریب میں پورے طور پر شریک رہا۔ اللہ تعالیٰ اس تعلق اور رشتہ کو ہر لحاظ سے جماعت اور ہمارے خاندان کے لئے بابرکت اور مشمر بثمرات حسنہ کرے، آمین۔

ایک طرف میں اس تقریب میں شامل نہ ہو سکنے کی وجہ سے بے قرار تھا تو دوسری طرف سب رشتہ دار بھی مجھے یاد کرتے رہے۔ اس کا عملی اظہار 31 مارچ کی صبح اُس وقت ہوا جب ہم کھانا کھا کر مقام عدالت پر پہنچے۔ آج صبح کا کھانا خلافِ معمول ایک بڑی سی 'پنڈ' میں آیا جسے کھولا تو مٹھائی کا ڈبہ بھی ساتھ تھا۔ مزید دیکھا تو بڑے بڑے برتنوں میں زردہ پلاؤ تھا اور مرغ کا سالن تھا جس کی پکوائی غیر معمولی تھی۔ معمول سے ہٹی ہوئیں یہ سب باتیں ہم سب کو محسوس تو ہوئیں مگر پتہ کچھ نہ تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ ملک صاحب نے کہا کہ یہ تو کسی شادی کا لگتا ہے۔ میں نے مذاق سے کہا کہ ماموں کی کل دعوت ولیمہ تھی، اسی کا ہوگا لیکن اس کا ہمیں وہم وگمان بھی نہ تھا کہ اس گرمی میں 250 میل کے فاصلے سے ہمارے لئے کھانا آئے گا۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی لیکن جب ہم سماعت کے لئے کینال ریسٹ ہاؤس پہنچے تو ایک نوجوان نے گوجرانوالہ کے حوالہ سے تعارف کرایا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ کھانا ولیمہ کا ہی تھا جسے یہ نوجوان لے کر آیا تھا۔ پھر عزیزم شبیر احمد نے ساری تفصیل بتائی کہ رات میں گوجرانوالہ سے کھانا لے کر روانہ ہوا اور علی الصبح امیر صاحب ملتان کی کوٹھی پر پہنچ گیا تھا۔ ولیمہ کا وہ کھانا ایک مرتبہ تو بغیر علم کے کھا چکے تھے، واپس جا کر علم ہونے پر کھانے کا دوبارہ مزہ لینے لگے اور پھر سب رشتہ دار یاد آنے لگے، اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

اگلی پیشی تک کا وقفہ اگرچہ طویل تھا مگر درمیان میں متعدد ملاقاتوں کی برکت سے بڑا خوشگوار گزرا۔ ان میں سے ایک ملاقات تو 4 اپریل کو ہوئی جب ابا جان بعض احباب جماعت کے ساتھ ربوہ سے اور نانی جان قریباً سارے خاندان کو لاہور اور گوجرانوالہ سے لے کر آئیں۔ نانی جان کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے کہ بیماری اور بڑھاپے کے باوجود اتنا لمبا اور تکلیف دہ سفر کر کے یہاں پہنچیں تھیں۔ آپ کو جالی کے اُس پار بیٹھے دیکھ کر میرے دل میں ماں کی محبت اور قدر ایک طوفانی جذبہ کے ساتھ بیدار ہوئی اور اس کیفیت نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نانی جان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

## پیارے آقا کی طرف سے چاکلیٹ کا تحفہ

اسی ملاقات پر پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی طرف سے چاکلیٹ کا تحفہ بھی ملا جسے اپنے ملاقاتیوں میں بھی بطور تبرک تقسیم کیا۔ پیارے آقا گاہے گاہے ہمیں خوبصورت اور مزیدار چاکلیٹوں کا تحفہ بھجواتے رہتے تھے جو دراصل حضورؒ کی محبتوں اور شفقتوں کے سمندر سے اُٹھنے والے جذبات کا معمولی سا اظہار ہوتا۔ یہ تحفہ بھجواتے ہوئے متعلقہ

احباب کو حضورؒ کا ارشاد ہوتا کہ کچھ چاکلیٹ اسیران کو اپنے سامنے کھلا کر مجھے لکھو کہ انہوں نے کھائے ہیں، سبحان اللہ، اللہ اکبر والحمد للہ رب العالمین۔ حضورؒ کے ہر خط اور ہر پیغام اور ہر اظہارِ محبت پر آنحضور ﷺ کا بخاری شریف میں درج یہ ارشاد یاد آ جاتا جس میں آپ ﷺ نے آخری زمانہ میں ایک جماعت کی خبر دی ہے اور اس کی صداقت کی نشانی یہ بتلائی ہے کہ اس جماعت کے افراد اپنے امام سے اور ان کا امام اپنے افرادِ جماعت سے بے پناہ محبت کرے گا۔ حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہم ناچیزوں کے ساتھ یہ محبت و شفقت بھرا تعلق اسی ارشادِ نبوی ﷺ کی تصدیق کرتا ہے۔ اللہ کرے کہ ہم افرادِ جماعت کو بھی اس ارشاد کے دوسرے حصہ کو پورا کرنے کی توفیق ملے یعنی اپنے امام کے ساتھ حقیقی طور پر والہانہ محبت اور فدائیت کا تعلق نصیب ہو، آمین۔

## پنکھے لگوانا جیل میں!

ہم نے آج تک ملتان کی گرمی کا مزا نہیں چکھا تھا، اس لئے ہمیں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ اپریل کے آخر تک وسطی پنجاب میں تو موسم گرما کافی حد تک برداشت ہو جاتا ہے مگر یہاں اُس کے مقابل پر دھوپ میں ناقابل بیان حد تک حدت اور شدت آ چکی تھی۔ سارا دن جو لُو چلتی وہ تو ایک طرف رہی، رات کے وقت بعض اوقات ایسی گرم ہوا چلتی کہ یوں لگتا جیسے پنکھے کی مدد سے کسی بھٹی کی گرم ہوا پھینکی جا رہی ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ کمروں میں پنکھے بھی نہ تھے اور جیل والے کہتے کہ خود لگوا لو۔ جبکہ ہم تو واپس جانے کے لئے سامان باندھے بیٹھے تھے۔ اِس لئے خیال تھا کہ اگر لگوانے ہی ہیں تو ساہیوال چل کے لگوائیں گے مگر آج کل کرتے کرتے دِن گزرنے لگے، گرمی اپنی شدت کو پہنچنے لگی اور ہم یارِ نہاں میں نہاں ہو کر دعائیں کرنے لگے کہ اے اللہ! تو نے سخت سردی کا موسم بھی بے کسی و بے بسی کے عالم میں خیریت سے گزار دیا تھا، اب گرمی کو برداشت کرنے کی توفیق بھی تو نے ہی دینی ہے۔ چنانچہ ہمارے رب نے ہماری اِلتجا کو سنا اور پنکھوں کے بغیر بھی اِن تنور نما کمروں میں ہمارے شب و روز خوشگوار طور پر گزرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسموں کو ایسا کر دیا کہ گرمی کی شدت و حدّت کا اِحساس جاتا رہا اور صبر و شکر کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے پنکھے کی ہوا میں بڑے مزے سے وقت گزرتا رہا، الحمد للہ۔ یہ تو ہماری کیفیت تھی جبکہ ہمارے لواحقین کے لئے ہماری اس حالت کا تصور کرنا بھی مشکل تھا چنانچہ انہوں نے جیل انتظامیہ سے منظوری لے کر ہمارے کمروں میں پنکھے لگوا دیئے اور 16 رمئی سے ہمیں پنکھوں کی ہوا میسر آ گئی مگر وہی بات ہوئی کہ صرف تین ہفتوں کے بعد 4 رجون کو ہماری ساہیوال واپسی ہو گئی اور ہمیں نئے پنکھے اِس دُکھ کے ساتھ وہاں چھوڑ کر آنے پڑے کہ کسی اور قیدی کے کام آنے کی بجائے ہمارے وہاں سے آ جانے کے فوراً بعد یہ پنکھے غائب ہو جانے تھے۔

## محترم ملک محمد دین صاحب کا آپریشن

ملک صاحب موصوف کو ہرنیا کی تکلیف تھی جس میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جب ساہیوال میں تھے تب آپ کا طبی معائنہ ہوا تھا اور ڈاکٹر کی رپورٹ پر DIG جیل خانہ جات نے آپ کے آپریشن کا حکم بھی جاری کر دیا تھا مگر ملتان آنے کے بعد آپ کا خیال تھا کہ واپس ساہیوال جا کر ہی آپریشن کروائیں گے۔ جب یہاں قیام لمبا ہوتا گیا اور آپ کی تکلیف میں بھی شدت آ گئی تو آپ 16 مئی 1985ء کو نشتر ہسپتال بھجوا دیئے گئے جہاں آپریشن ہونے کے چند دِنوں بعد آپ بخیریت واپس آ گئے، الحمدللہ۔

## جیل میں پہلا رمضان اور وہ بھی ملتان کی گرمی میں!

ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں ہمیں مقدمہ کی سماعت کے لئے منتقل کیا گیا تھا اس لئے 30 اپریل 1985ء کو مقدمہ کی کارروائی مکمل ہونے پر اُمید تھی کہ ہمیں واپس ساہیوال بھیج دیا جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہماری واپسی میں تاخیر ہوئی تو ماہ مئی کے تیسرے ہفتے رمضان المبارک کا آغاز بھی یہیں ہو گیا۔ یہ رمضان ہمارے لئے تاریخی اہمیت رکھتا تھا۔ موسم گرما میں رمضان کا تجربہ تو تھا مگر جیل میں رمضان کا یہ پہلا تجربہ تھا اور وہ بھی ملتان کی گرمی میں! مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے میں بھی ہمیں رمضان غیر معمولی لطف و سرور کے ساتھ گزارنے کی توفیق ملی، الحمدللہ۔

جہاں تک جیل کے عمومی ماحول کا تعلق ہے تو یہ ہر خاص و عام پر اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ یہاں انسان ہر قسم کی آزادی سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنے مزاج، اپنی عادات اور اطوار نیز وضع داری کے مطابق معمول کی زندگی گزارنے سے قاصر رہتا ہے اور جب رمضان بھی ایسی پابندیوں کے ماحول میں گزارنا پڑے جہاں نہ تراویح کا انتظام ہو اور نہ مل بیٹھ کر سحری و افطاری کا لطف تو طبیعت جھنجلا کر رہ جاتی ہے۔ اِس صورت حال میں سب سے بڑا مسئلہ کھانے کی ترسیل کا تھا۔ ہمارے لئے کھانا باہر سے آتا تھا مگر رات کے وقت اِس کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے شام کے لئے جو کھانا آتا، اُسی کے ساتھ سحری کا کھانا بھی آ جاتا جسے ملتان کی گرمی میں اول تو اگلی صبح تک محفوظ رکھنے کا سوال ہوتا۔ اگرچہ ہمارے پاس کولر تو تھے مگر اس کے باوجود بعض اوقات اگلی صبح تک کھانا صحیح نہ رہتا اور اگر رہ جاتا تو سحری کے وقت اسے گرم کر کے ہر ساتھی تک پہنچانے کا سوال اس سے بھی اہم ہوتا۔ کھانا سنبھالنے اور تقسیم کرنے کی ذمہ داری تو برادرم حاذق صاحب نے لے رکھی تھی جسے وہ بڑے شوق اور ذمہ داری سے نبھاتے مگر وہ بھی کیا کر سکتے تھے جب صبح تک کھانا ہی خراب ہو چکا ہوتا یا دوسرے ساتھیوں تک کھانا پہنچانے کے لئے کوئی شخص ہی وہاں میسر نہ ہوتا!! ایک روز تو ایسا ہوا کہ خاکسار کو سحری کے وقت کھانا پہنچا، کھانا شروع کیا تو پہلے لقمہ سے ہی کھٹاس کی وجہ سے منہ کا ذائقہ بگڑ گیا۔ جائزہ لیا تو سالن

خراب ہو چکا تھا مگر اُس وقت کیا ہو سکتا تھا چنانچہ اُس روز ہم سب نے صرف پانی کے ساتھ ہی روزہ رکھا اور گرمی کا طویل دن گزارا، الحمدللہ۔ اسی روز کی بات ہے کہ دن کے دس گیارہ بجے جب بھوک اور گرمی خوب تنگ کر رہی تھی، میں تلاوت کر کے اپنی چکی میں لیٹ گیا۔ اس دوران کیا دیکھتا ہوں کہ کسی نے مجھے سرخ رنگ کے شربت سے بھرا گلاس دیا ہے جسے میں نے پی لیا اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی تو اس شربت کا ذائقہ میری زبان پر تھا اور اس کی فرحت مجھے لطف دے رہی تھی، فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

جب تک ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں رہے، صبح کی نماز ہم باجماعت ادا کرتے کیونکہ یہاں ہمیں صبح کے ملگجے میں ہی کھول دیا جاتا تھا۔ ہم باہر نکل کر ٹھنڈی اور کھلی فضا میں نماز فجر باجماعت ادا کرتے پھر درس القرآن ہوتا۔ جس میں ایک آیت کی تلاوت کر کے اس کا ترجمہ مختصر وضاحت کے ساتھ خاکسار سمجھاتا۔ اس درس کے بعد ہر ایک اپنے اپنے پروگرام کے مطابق مصروف ہو جاتا۔ رمضان کے دوران تو اکثر دوست اس کے بعد سو جاتے پھر سات آٹھ بجے اُٹھ کر نہاتے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور جب سورج کی تپش سے کمرے تنور بننے لگتے تو پانی چھڑک کر ٹھنڈا کرتے۔ میں تو بستر وغیرہ ایک طرف کر دیتا اور کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی بچھا کر سارا وقت گزارتا۔ باقی دوست بھی حسب حالات وقت گزاری کرتے اور ہمارے ملک صاحب مرحوم ہمیشہ یہ کہتے ہوئے ہمارے حوصلے بلند رکھتے: شب سمور گزشت ولب تنور گزشت! دوپہر کو باہر نکل کر نمازِ ظہر باجماعت ادا کرتے اور گرمی سے بچنے کے لئے پھر کمروں میں بند ہو جاتے۔ عصر سے پہلے 'اُڑدی' لگانے کا مرحلہ طے کرنا ہوتا جس سے فارغ ہو کر سب نہاتے اور عصر کی نماز پڑھتے اور پھر جلد ہی بند ہونا ہوتا۔ گویا رمضان کے ایام میں جب ہم کھلے ہوتے تو روزہ ہوتا اور جب بند ہوتے تو روزہ کھل جاتا اور اگلی صبح ہمارے کھلنے سے پہلے تک کھلا رہتا۔

رمضان میں نماز تراویح اور تہجد کی باقاعدگی سے توفیق ملی مگر انفرادی طور پر۔ صبح پونے تین بجے اُٹھتا اور پونے چار بجے کھانا شروع کرتا اور پندرہ بیس منٹ میں سحری مکمل کر لیتا۔ ہمارا یہ سارا کاروبار اندازہ سے ہی چلتا تھا کیونکہ ہمارے پاس گھڑی تو ہوتی نہ تھی۔ اگر اتفاق سے ملازم سامنے سے گزرتا تو اس سے وقت پوچھ لیتے اور ملازم صاحبان عام طور پر وقت پورے طور پر درست نہیں بتاتے تھے (شاید یہ جیل کی طرف سے انہیں ہدایت تھی کیونکہ میں نے اکثر نوٹ کیا کہ صحیح وقت نہیں بتاتے تھے) یوں تو جیل کی طرف سے یہ انتظام موجود تھا کہ چکر میں لگے ہوئے لاؤڈ سپیکر پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اعلان ہوتا کہ اب اتنے منٹ باقی ہیں اور اب اتنے اور آخر میں اعلان ہوتا کہ ''اب کھانا کھانا چھوڑ دیں، سحری کا وقت ختم ہو گیا ہے''۔ مگر یہ اعلان بھی اُسی دن سنائی دیتے جس دن پنکھے کے بغیر والی چکی میں ہوتا اور جب

پنکھے والی چکی میں ہوتا اور بند کمروں میں تیز رفتار پنکھے چل رہے ہوتے تو ان کے شور کی وجہ سے باہر کی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور اکثر اوقات جیل کا سائرن بجتا تو پتہ چلتا کہ روزہ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

ایک ایک کر کے روزے گزرنے لگے اور پھر یوں لگا جیسے پلک جھپکنے میں سارے کے سارے گزر گئے ہیں۔ کچھ محسوس ہی نہیں ہوا کہ ہم کہاں ہیں اور کس سخت ماحول میں روزے رکھ رہے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا کہ ہم ساہیوال میں بیٹھے جیل میں آنے والے رمضان کا تصور کر کے کانپ گئے تھے اور ایک یہ وقت کہ لسی یا دہی وغیرہ تو بہت دور کی بات سارا رمضان ہم نے سحری یا افطاری کسی بھی وقت چائے تک نہ پی لیکن ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ یا سر درد کا احساس تک نہ ہوا جو عام طور پر چائے نہ ملنے سے ہو جایا کرتا ہے، الحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ یہ خدا تعالیٰ کی خاص رحمت اور اُس کا خاص فضل تھا جس کے سہارے ہی ہم نے جہادِ اکبر کا یہ میدان بھی سر کیا۔ ان ایام میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی روزانہ بارہ تیرہ پاروں کی تلاوت کی توفیق دی اور ساتھ ہی تفسیر کبیر کے مطالعہ کا نئے سرے سے آغاز کرنے کی بھی توفیق ملی، الحمد للہ۔

## ایک بار پھر سنٹرل جیل ساہیوال میں

### ملتان سے واپسی سفر

ملتان میں سماعت مکمل ہونے کے بعد 4 جون 85ء کی صبح ہمیں اطلاع ملی کہ ساہیوال لیجانے کے لئے ہماری گارد لگ گئی ہے۔ چنانچہ ہم نے فوری طور پر اپنا سامان باندھا اور "اُٹھو اب کوچ کرو" کا نعرہ لگاتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف چل دیئے۔ گو اُس دن ہم روزے سے تھے مگر سفر سے عین پہلے ہم نے اِفطار کر لیا تھا۔ ڈیوڑھی پہنچ کر ہمیں پہلے تو ہتھکڑیاں لگائی گئیں پھر اپنا سامان پولیس گاڑی میں لادنے کو کہا گیا۔ اگرچہ ہمارے ایک ایک ہاتھ کو ہتھکڑی لگائی گئی تھی مگر ایک ایک ہتھکڑی کے ساتھ دو دو افراد کو باندھ دیا گیا تھا۔ اِسی حالت میں ہم نے اپنا سامان معمول سے کچھ زیادہ اونچی گاڑی میں لادا۔ گرمی اس قدر تھی کہ ہم اِتنے میں ہی پسینہ سے شرابور ہو گئے۔ یہاں باہر احباب جماعت بھی کافی تعداد میں جمع تھے جنہوں نے نہ صرف ہمیں اپنی پر خلوص دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا بلکہ سرکار کی طرف سے اجازت ملنے پر سامان لادنے میں بھی ہماری مدد کی۔

یہاں سے ہماری گاڑی روانہ ہوئی تو پتہ چلا کہ ملتان سے ہمارے احباب مکرم چوہدری عبدالرحیم صاحب اور مکرم انوار الحسن صاحب بھی ایک علیحدہ گاڑی میں ہمارے ساتھ ساہیوال تک جا رہے ہیں۔ احباب جماعت کے اخلاص اور

محبت کا یہ عالم تھا کہ ملتان شہر میں ہی ایک پٹرول پمپ پر تیل لینے کے لئے گاڑی رُکی تو ملتان کے مکرم عبد الحفیظ صاحب ایڈووکیٹ اور مکرم شمس الاسلام صاحب اپنے بیٹوں کے ساتھ ہمارا تعاقب کرتے کرتے یہاں پہنچ گئے۔ یہاں انہیں گاڑی کے اندر آنے کی اجازت مل گئی چنانچہ کچھ دیر ہمیں ان کے ساتھ بھی مل بیٹھنے کا موقع مل گیا۔

ملتان سے باہر نکل کر کچھ ہی دور پہنچے تھے کہ ہماری بس رک گئی۔ انچارج گارد نے بتایا کہ ہمارے ساتھ جس کار نے جانا ہے، انہوں نے یہاں رُک کر انتظار کرنے کو کہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ملک فاروق کھوکھر صاحب کی HONDA کار کو ان کے بھائی مکرم ملک زبیر صاحب ڈرائیو کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے جس میں ان کے ساتھ مکرم انیس الرحمٰن بنگالی صاحب مربی سلسلہ، مکرم چوہدری عبد الرحیم صاحب اور مکرم چوہدری انوار الحسن صاحب تھے (یہ تینوں احباب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین)۔ پھر ہمارا یہ قافلہ اس طرح سے روانہ ہوا کہ مکرم چوہدری انوار الحسن صاحب ائیر کنڈیشنڈ کار سے اُتر کر ہمارے ساتھ آ بیٹھے اور سارا راستہ ہمارے ساتھ ہی سفر کیا۔ موصوف ہمارے ملتان آنے کے چند روز بعد اپنے کسی محکمانہ مقدمہ کی وجہ سے اسی جیل میں لائے گئے تھے اور چند ہفتہ سرکاری مہمان رہے تھے۔ اس دوران ہمارے ساتھ انہیں خاص اُنس ہو گیا تھا کہ اِن کا بیشتر وقت ہمارے ساتھ ہی گزرتا تھا۔

راستہ میں متعدد جگہوں پر رُک کر وقفہ کیا اور کھانا وغیرہ کھایا۔ ایک جگہ رُکے تو یقین نہ آیا کہ یہ پاکستان ہی ہے! سڑک کے کنارے یہ ایک خوبصورت ائیر کنڈیشنڈ ریستوران تھا مگر اندر داخل ہوئے تو کیا ملازم اور کیا مالک سبھی 'احترام رمضان' میں بستر بچھائے خواب خرگوش میں مست تھے! اِس ریستوران میں گھنٹہ ڈیڑھ کے قیام کے دوران ہمارے نام پر پولیس نے بھی خوب موجیں کیں۔ صرف ایک پولیس حوالدار اس دوران محروم رہا اور وہ بھی اپنی جہالت کی وجہ سے کہ اس نے سفر میں بھی روزہ رکھا ہوا تھا۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو سنٹرل جیل ساہیوال کے سامنے پہنچ کر ہی بریک لگی۔ گاڑی سے اُترے تو مقامی احباب ہمارے منتظر تھے جن سے ملاقات کرنے کے بعد داخلِ جیل ہوئے تو وہی روزِ اول والا معاملہ تھا، ہر کوئی آنکھیں نکال نکال کر ہمارے ساتھ پیش آ رہا تھا۔ جب کہتے بھئی ہم یہاں سے ہی گئے ہوئے ہیں تو جواب ملتا کہ اب وہ دَور نہیں، اب لعلوانی صاحب (نئے سپرنٹنڈنٹ جیل کا نام) کا دَور ہے۔ یہ تو خیر چند دِن میں ہی پتہ چل گیا کہ یہ نیا دَور تھا یا پرانا تاہم اُس وقت مسئلہ اِن ملازموں سے نمٹنے اور اِس مرحلہ سے گزرنے کا تھا جو آخر کار طے ہو ہی گیا۔

## ایک مرتبہ پھر 7 بلاک میں

ملتان سے ساہیوال واپس آنے پر ڈیوڑھی میں جو استقبال ہوا سو ہوا مگر اندر آ کر تو پھر سے ہمیں دہشت گرد اور عادی

مجرم قرار دے کر اُسی قصوری پہرہ 7 بلاک میں بند کر دیا گیا جہاں بالکل ابتدائے اسیری میں 68 راتیں کاٹ چکے تھے۔ اس خبر کے پتہ چلنے پر پہلے تو ایک جھٹکا سا لگا پھر حکام سے پوچھا: بھئی، بیڑیاں لگانی کیوں بھول رہے ہو؟ اس پر وہ کچھ کچھ شرمندہ ہوئے! جب ہمیں پہلی مرتبہ یہاں رکھا گیا تھا تو اُس وقت سخت سردی تھی اور اب اس شدت کی گرمی کہ الحفیظ والامان! پھر یہی نہیں بلکہ اب کے ہمیں ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں تین تین کے بنچوں میں بند کیا گیا۔ ہم یہاں بند تو ہو گئے مگر ہمیں کوئی پتہ نہ تھا کہ یہ کتنی لمبی آزمائش ہوگی لیکن اس یقین کی دولت سے مالا مال تھے کہ اللہ تعالیٰ اس آزمائش سے بھی سرخرو ہی کر کے نکالے گا، انشاء اللہ۔ اِس لئے ہم سب پورے حوصلہ میں تھے۔ یاد رہے کہ یہاں ہم چھ افراد کو رکھا گیا تھا، ساتویں ساتھی مکرم چوہدری اسحق صاحب کو بوجہ B کلاس پہلے دِن ہی 6 چکی میں بھجوا دیا گیا تھا۔

اپنی اپنی چکی میں بند ہونے کے بعد ہم نے ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا اور ملازموں سے راہ و رسم بڑھائی تو پتہ چلا کہ اسی بلاک میں فیروز والہ ضلع گوجرانوالہ کے ایک احمدی دوست برادرم نصر اللہ گورایہ صاحب (استاذی المکرم مولانا فضل الٰہی بشیر صاحب مبلغ سلسلہ کے بھانجے) بھی ہیں۔ اُن سے باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ برابر کی چکی سے فیصل آباد کے ہمایوں نامی ایک صاحب بھی ہمارے ساتھ رابطہ میں آ گئے۔ ہمارے احمدی ہونے کا علم ہوا تو اُنہوں نے بتایا کہ وہ گزشتہ سال ہمارے حکیم مولوی خورشید احمد صاحب (مرحوم) صدر عمومی ربوہ کے ساتھ فیصل آباد جیل میں رہے ہیں اور ان کے ساتھ خوب اچھا وقت گزار چکے ہیں۔ افطاری کے وقت نصر اللہ صاحب نے تخم بالنگو (تخم ملنگاں) والا شربت بھجوایا جسے برف کے بغیر پینا گویا کڑوی دوا پینے کے مترادف تھا۔ اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 7 بلاک میں قیدی کس طرح گزارا کرتے ہیں! انہوں نے کھانے سے متعلق بھی پوچھا تو ہم نے بتایا کہ باہر سے آتے ہوئے ہمیں مکرم ملک نعیم الدین صاحب نے روٹیاں تو پکڑائی تھیں اور سالن کے بارہ میں بتایا تھا کہ وہ سامان کے ساتھ بھجوا دیں گے، اس لئے فکر نہ کریں آ جائے گا۔ کچھ دیر بعد ہمایوں صاحب نے پھر پوچھ لیا کہ سالن آیا کہ نہیں؟ نفی میں جواب سن کر انہوں نے از خود ایک پلیٹ میں گھی اور شکر ملا کر بھجوا دی جس کے ساتھ ہم نے رات کا کھانا کھایا، شکر کیا، نمازیں پڑھیں اور اگلے دِن کے لئے تیار ہو کر سو گئے۔ اگلی صبح بہت ہی صبح قریباً ڈیڑھ دو بجے کھانا تقسیم کرنے والے نے آ کر جگایا اور ہم نے کھانا لے کر رکھ لیا۔ پھر اُٹھے اور باجماعت تہجد ادا کی۔ اسی دوران باہر دروازہ کے سامنے کوئی ملازم کچھ رکھ گیا تھا، نماز سے فارغ ہو کر دیکھا تو دو پلیٹیں تھیں جن میں سے ایک میں دہی تھا اور دوسرے میں خربوزے کے چند ٹکڑے۔ یہ برادرم نصر اللہ صاحب نے بھجوائے تھے۔ دہی کا اُس وقت اور اُس جگہ میسر آنا اور وہ بھی غیر متوقع طور پر، ہمارے لئے غیر معمولی نعمت تھا۔ ہم نے بس اُسی دہی کے ساتھ تھوڑی روٹی کھائی اور پانی پی کر روزہ رکھ لیا، الحمد للہ۔

ایسی جگہ جہاں سارا دن بند رہنا ہو اور باقاعدہ بیت الخلاء بھی نہ ہو، اکھٹے بند ہونے کا ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس لئے بیت الخلاء کے استعمال میں سخت تکلیف دہ صورت حال تھی۔ بعد میں احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس طرح سے دراصل آئندہ آنے والے حالات کے لئے ہمیں تیار بھی کر رہا تھا جیسا کہ آئندہ صفحات میں ذکر آئے گا کہ کس کس اذیت ناک صورت حال سے ہمیں گزرنا پڑا۔ ہر چند کہ ہم تکلیف میں تھے مگر پریشان بالکل نہ تھے بلکہ ہنسی خوشی یہ لمحات گزارتے رہے۔ منگل کے روز ہم یہاں آئے تھے اور خیال تھا کہ اگلے روز بدھ کو صاحب بہادر کا دورہ ہوگا تو اُن سے کہیں گے کہ ہماری گنتی پرانی جگہ 5 چکی میں ہی ڈال دیں مگر صبح ہوئی تو دورہ کے کوئی آثار نہ تھے۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ دورہ تو گزشتہ روز منگل کو ہو چکا کیونکہ نئے صاحب نے دورہ کا نظام الاوقات بدل دیا ہے۔ اس پر ہمیں پھر جھٹکا سا لگا کہ اب یہاں سے نجات کے لئے پورا ہفتہ انتظار کرنا پڑے گا۔ سوچا تو احساس ہوا کہ یہ اس لئے ہے کہ خدا تعالیٰ ہر قسم کے ظاہری سہاروں کے بت توڑنا چاہتا ہے تا کہ ہم خفیف سے شرک سے بھی بچے رہیں۔ سارے دورِ اسیری میں اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر غیر اللہ کا سہارا لینے سے اپنے فضل کے ساتھ بچایا۔ کونسی بات ہمارے حق میں تھی! مقدمہ کے اندراج سے لے کر آخر تک مخالفوں نے ہر قسم کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کئے، تفتیش کا نتیجہ ہمارے خلاف، کسی وجہ کے بغیر فوجی عدالت میں ہمارے مقدمہ کی سماعت، یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ خدا تعالیٰ مخالفوں کو ہر قسم کے مکروں اور حربوں کا موقع دے کر پھر ہمیں اس خطرناک اور خوفناک صورتِ حال میں سے نکال کر بچائے تو اُس کی قدرت کا پتہ چلے گا اور اسے فتح مبین کہا جا سکے گا، انشاء اللہ العزیز۔ بہر حال اس چھوٹے سے واقعہ میں بھی ہمارے لئے گہرا سبق تھا اور گویا خدا تعالیٰ نے ہمیں جھنجوڑا تھا کہ دیکھو میرے علاوہ کسی اور طرف نہیں دیکھنا۔ اللہ کرے کہ ہم سب اس امتحان میں سو فیصد کامیاب ہوں، آمین ۔

میں تیرا ہوں، تُو میرا خدا، میرا خدا ہے　　میں تجھ سے نہ مانگوں تو نہ مانگوں گا کسی سے

موسم سرما میں جب ہم یہاں تھے تو سوچا کرتے تھے کہ گرمیوں میں یہاں چوبیس گھنٹے بند رہنے والوں کا کیا حال ہوتا ہوگا کیونکہ یہ کمرے پختہ سیمنٹ کے تھے جو دھوپ میں تپتے ہوں گے تو ٹھنڈا ہونے کا نام نہیں لیتے ہوں گے اور اب ہم عین اُس وقت یہاں تھے جب گرمی اپنے عروج پر تھی۔ یہاں آنے کے اگلے روز سورج اپنی بھرپور تپش اور تمازت کے ساتھ بلند ہونے لگا تو ہم بھی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے 'ہمہ یاراں' کا نعرہ لگاتے ہوئے تیاری کرنے لگے۔ دن چڑھتا گیا مگر دھوپ کا کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں ہے۔ یہ ہمارے لئے حیرت کی بات تھی کیونکہ ہم تو اس انتظار میں تھے کہ

'غالب کے اُڑیں گے پرزے' مگر یہاں ایسا کوئی تماشا نہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ اِن کمروں کے معماروں نے انہیں اِس طرز پہ بنایا ہوا ہے کہ گرمیوں کی دھوپ ان کے اندر آ کر ان کے باسیوں کو کہیں عملاً کباب سیخ نہ بنا ڈالے۔ اُس لمحہ اصحابِ کہف کی یاد بھی آئی جن کے بارہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ وہ ایسی طرز پر اپنے گھر تعمیر کرتے تھے کہ موسم گرما میں دھوپ سے پوری طرح بچا جا سکے اور سرما میں اس سے زیادہ سے زیادہ اِستفادہ کیا جا سکے اور یہ جیل بھی تو اصحابِ کہف کی نسل نے ہی تو تعمیر کی تھی۔

اِس پہلے روز ہم میں سے بعض کی ملاقات بھی آئی جس سے حالات حاضرہ کا تو کسی قدر علم ہوا لیکن 7 بلاک سے نجات کی کوئی صورت نہ بنی اور مکمل طور پر تہی دست، پسینہ سے شرابور اور بحالت روزہ ہمارا یہ سفر جاری رہا۔ بڑی مشکل سے نمازِ ظہر کا وقت ہوا تو ہم نے باہر دھوپ میں پڑے مٹکے سے پانی لے لے کر وضو کیا اور نماز ادا کی۔ پھر عصر کا وقت تھا کہ ہونے کا نام ہی نہ لیتا، یہ وقت سب سے کڑا تھا کہ گرمی کی شدت اپنے عروج پر تھی۔ بہر حال یہ وقت بھی گذر گیا اور اُڑدی کا سندیسہ ملا جس سے قدرے سکون ہوا کہ چلیں اسی بہانہ چند لمحے باہر کھلی فضاء میں گذریں گے اور ساتھیوں کے چہرے دیکھیں گے مگر یہ لمحے بھی ہوا کی طرح اُڑ گئے اور ہم کمرے بدل کر دیکھتے ہی دیکھتے بند ہو گئے جس کے بعد شام کے کھانے کی تقسیم شروع ہو گئی۔ غیر معمولی طور پر معیاری کھانا دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ پوچھنے پر علم ہوا کہ اُس روز ساری جیل کے لئے ساہیوال شہر کے مشہور خاندان 'فرشتوں' نے اپنی روایت کے مطابق کھانا بھجوایا تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی وافر مقدار میں پانی کے ساتھ اِفطاری کی اور اس طرح سے زندگی کا ایک اور یادگار روزہ مکمل ہوا، الحمدللہ۔

## ملاحظہ

اگلے روز سحری اور نماز کے بعد ہم لیٹے تھے کہ دروازہ کھلنے کی آواز نے اُٹھا دیا۔ باہر دیکھا تو سامنے کھڑے ہیڈ وارڈر نے ملاحظہ کے لئے تیار ہونے کا حکم سنایا جس پر ہم فوری طور پر اُٹھے اور تیاری کر کے گھنٹی گھر کی طرف چل دیئے جہاں پہلے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے ہمارا ملاحظہ کیا پھر ڈیوڑھی کے سامنے بڑے صاحب کے ملاحظہ کے لئے بٹھا دیا گیا۔ یہاں انتظار کرتے کرتے کئی گھنٹے گزر گئے مگر صاحب بہادر نے آنے کا نام نہ لیا اور بالآخر گیارہ بجے کے قریب اِعلان ہوا کہ آج ملاحظہ نہیں ہوگا۔ اِس پر ہماری جو کیفیت ہوئی بیان سے باہر ہے کیونکہ ہم تو اس خیال سے خوشی خوشی یہاں آئے تھے کہ چلو آج ملاحظہ کے ساتھ 7 بلاک سے ہماری جان چھوٹ جائے گی مگر ایسا نہ ہو سکا اور طرّہ اس پر یہ کہ اگلے روز جمعہ تھا یعنی چھٹی کا دِن! گویا اب بات ہفتہ پر جا پڑی تھی۔ 7 بلاک میں تو لمحہ لمحہ گزارنا مشکل تھا کجا اب مزید دو تین دن! بہر حال چارونا چار ہم واپس اپنی جگہ لوٹے جہاں ہمیں ملاحظہ تک ہر صورت میں وقت گزارنا تھا۔

## 7 بلاک میں باجماعت نمازِ جمعہ

اگلے روز جمعہ تھا، پہلے پہر ہم نے ایک ایک جوڑا کپڑوں کا دھویا اور حسبِ توفیق و حالات غسل بھی کیا مگر یہ نہ پوچھیے کہ کیسے! بہر حال پوری مسنون تیاری کے ساتھ ہم نے یہاں نہ صرف یہ کہ جمعہ پڑھا بلکہ دو جگہ پڑھا کیونکہ ہم تین تین کے گروپ میں علیحدہ علیحدہ دو کمروں میں تھے۔ جمعہ کی ادائیگی کے لئے پہلے تو ہم اُڑدی کا انتظار کرتے رہے تاکہ نئے کمروں میں جا کر ہی شروع کریں اور یہ نہ ہو کہ اِدھر ہم خطبہ شروع کریں اُدھر اُڑدی والے آدھمکیں کہ چلو اُڑدی لگاؤ! چنانچہ انتظارِ بسیار کے بعد جب سورج اچھا خاصا ڈھل چکا تو ہم نے فیصلہ کیا کہ اب جمعہ پڑھ لیا جائے۔ ہم نے جمعہ شروع کیا تو وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ابھی خطبہ ہو رہا تھا کہ اُڑدی والا منشی آ گیا اور افراتفری مچ گیا۔ ہم نے جلدی جلدی خطبہ ختم کیا اور نماز اگلے کمرے میں جا کر ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر متعدد گفتنی و ناگفتنی مراحل طے کرتے ہوئے اگلے کمرے میں منتقل ہونے کے بعد جمعہ کی نماز مکمل کی اور اس طرح سے 7 بلاک کی تاریخ میں شاید یہ پہلا موقع ہوگا کہ یہاں باجماعت جمعہ ادا کیا گیا ہو، الحمدللہ۔

## 7 بلاک سے نجات

اگلے روز ہفتہ کی علی الصبح ملاحظہ کے لئے ہمیں پھر نکال لیا گیا مگر اب کے ہمیں کہا گیا کہ اپنا سامان بھی لے لیں کیونکہ آج ہمیں یہاں واپس نہیں لایا جانا تھا بلکہ ملاحظہ کے بعد ہمیں اپنے مستقل مستقر پر لیجائے جانے کا پروگرام تھا۔ آج کئی دنوں کا ملاحظہ اکھٹا تھا جس کی وجہ سے تاخیر یا التواء کا خطرہ موجود تھا مگر اللہ نے یوں فضل فرمایا کہ ہم جو آخر پر بیٹھے تھے اُٹھا کر ملاحظہ کے لئے پہلے پیش کر دیئے گئے۔ صاحب بہادر نے ہماری گنتی اُسی پرانی جگہ یعنی 5 چکی میں ڈالنے کی ہدایت کی اور ہمیں ملاحظہ کے عمل میں سے گزارنے کے بعد سیدھا وہاں بھجوا دیا گیا۔ جہاں ہم فیصلہ سنائے جانے تک رہے اور بڑے سکون کے ساتھ ہمارا یہ دَور یہاں گزرا۔ یہ بہت بڑا احاطہ تھا جہاں شروع میں تو صرف ہم ہی تھے تاہم بعد میں دو چار 'نامی گرامی' بھی یہاں رکھے گئے۔

## ساہیوال جیل میں رمضان کا اختتام

ملتان سے واپسی پر ہمارے ساتھ جو گزری اُس کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔ ابتدائی ایام 7 بلاک میں گزرے جہاں ہم مکمل طور پر تہی دست تھے، صرف روزے رکھ سکتے تھے یا زبانی تلاوت قرآن کریم کر سکتے تھے سو وہ ہم کرتے رہے۔ 5 چکی میں آنے کے بعد باجماعت نمازوں اور تلاوت کا خوب موقع ملا، یہاں تک کہ پچھلی ساری کمی اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی، الحمدللہ۔ میں تو محترم ملک محمد دین صاحب کو ساتھ بٹھا کر تلاوت شروع کر دیتا اور ملک صاحب اسے

ساتھ کے ساتھ دیکھتے چلے جاتے۔ سحری اور افطاری کا بھی بہت اچھا انتظام ہو گیا تھا جس کی وجہ سے رمضان کا آخری نصف بہت سہولت کے ساتھ گزرا۔ روزانہ درس القرآن بھی ہوتا رہا اور اسی تسلسل میں 29 رمضان المبارک کی اجتماعی دعا کے لئے ہم اکٹھے ہوئے تھے کہ اتفاق سے اس وقت محترم چوہدری اسحٰق صاحب بھی بی کلاس سے آ گئے چنانچہ ہم سب نے جماعتی روایات کے مطابق اجتماعی دعا کی اور اس طرح سے جماعت احمدیہ سنٹرل جیل ساہیوال بھی باقی جماعت ہائے احمدیہ عالمگیر کے دوش بدوش رہی۔

## جیل میں پہلی عید الفطر

عید سے ایک روز پہلے محترم امیر صاحب ساہیوال خصوصی ملاقات کے لئے تشریف لائے اور بتایا کہ پیارے آقا نے آپ کو عید کے تحائف بھجوائے ہیں جو کپڑوں، مٹھائی اور فروٹ پر مشتمل ہیں اور ساتھ حضور رحمہ اللہ کی طرف سے عید مبارک کے پیار بھرے خطوط بھی ہیں۔ ہم حضور اقدس کی محبت و شفقت کی بارش میں نہا گئے اور یوں لگا جیسے علیم صاحب کا یہ شعر حضور انور کے لئے بھی ہو، اس نے تنہا کبھی نہیں چھوڑا، وہ بھی زنداں میں ہے اسیر کے ساتھ! اسی موقع پر حضور انور نے ہمیں ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ میری عید کی خوشیوں پر آپ کے غم کا سایہ رہے گا۔ حضور اقدس کی بھجوائی ہوئی مٹھائی میں اس قدر برکت پڑی کہ ہم سب نے بطور تبرک اپنے ملاقاتیوں میں تقسیم کرنے کے علاوہ جیل میں بھی دیگر قیدیوں کو کھلائی۔

اگلے دن عید الفطر تھی اور ہم نے علی الصبح اُٹھتے ہی تیاری کر لی اور حضور رحمہ اللہ کے ارسال فرمودہ نئے کپڑے پہن کر اپنے احاطہ کے صحن میں بنائی ہوئی 'عید گاہ' میں پہنچ گئے۔ ہم نے 07:30 بجے صبح عید کا وقت مقرر کیا تھا۔ اس کے مطابق چوہدری اسحٰق صاحب کے علاوہ ملک نصیر صاحب 137/9L والے بھی پہنچ گئے۔ اس طرح سے ہماری نمازِ عید میں کل آٹھ افراد شامل ہوئے۔ نماز کے بعد خطبہ ہوا جس میں خاکسار نے سورۃ مائدہ کی اَللّٰهُمَّ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ والی آیات پڑھ کر مختصر سی نصائح کیں۔ خطبہ کے بعد ہم سب نے پرسوز اجتماعی دعا کی جس میں پیارے آقا کی بیقراری، اضطراب اور اپنے عزیزان کی مہجوری کا تصور کر کے خوب مناجاتیں کرنے کی توفیق پائی۔ وَاللّٰهُ الْمُتَقَبِّلُ وَالْمُسْتَجِيْبُ۔

ہم نے اس تاریخی عید کے بابرکت دن حضور کے ارشاد کے مطابق غرباء کی خدمت میں تحائف بھی پیش کئے اور سکون اور خوشی کی بے پناہ لذت سے محظوظ ہوئے۔ خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے جیل میں بھی ہمیں یہ توفیق بخشی کہ ہم حضور کے اس ارشاد پر عمل کر سکیں۔ عید کے روز ہمارا کھانا گھر سے گیارہ بارہ بجے کے قریب آیا جو روسٹ مرغ پر مشتمل

تھا اور اتنا زیادہ تھا کہ ہم نے بہت سارا حصہ ملحقہ 'نو عمر وارڈ' کے لڑکوں کو دے دیا۔ اُن بچوں میں سے اکثر کو گھر کے کھانے کی سہولت بھی میسر نہ تھی چنانچہ انہوں نے بڑی خوشی سے کھایا اور انہیں مزے سے کھاتے ہوئے دیکھ کر ہمیں بھی بے حد خوشی ہوئی۔ اسی دوران واقف کار ہیڈ وارڈر، نمبردار اور وارڈروں نے آنا شروع کر دیا کہ جی عید مبارک! ان کا مطلب صاف ظاہر تھا! چنانچہ ہر ایک کے ساتھ حسب حالات و واقعات معاملات چلتے رہے۔

ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے تو ایک وارڈر نے ایک ''پنڈ'' (بڑی سی گٹھڑی) لا کر حاذق صاحب کو دی اور کہا کہ یہ آپ کے گھر سے کھانا آیا ہے۔ اب ہم تو اتنے سیر تھے کہ مزید کھانے کی بالکل گنجائش نہ تھی تاہم قدر افزائی کے لئے ایک ایک لقمہ ضرور چکھ لیا اور باقی کھانا تقسیم کر دیا۔ گو ہم آزادی کی نعمت سے اس عید کے روز محروم تھے اور اپنے شہر میں ہوتے ہوئے بھی اپنے عزیزوں اور احباب کے درمیان عید نہیں منا سکے تھے مگر ہمیں جیل کے اندر رہتے ہوئے بھی نماز عید اور عید کی خوشیوں کے حصول کا جو موقع ملا وہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کا نشان بن گیا جس سے غیروں نے بھی استفادہ کیا۔ غرضیکہ اس طرح سے ہم نے بحالت پابند سلاسل عید کی خوشی منائی اور یہ دراصل نتیجہ تھا ہمارے پیارے آقا کی اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں مقیم احباب جماعت کی درد بھری دعاؤں کا۔ مجھے یقین ہے کہ دنیا بھر میں جس جس جگہ بھی احباب جماعت نے عید کی نماز پڑھی ہوگی، وہاں وہاں ہمارے لئے دل گداز دعائیں بھی ہوئی ہوں گی۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس روز بے شمار جگر ہماری خاطر خون ہوئے ہوں گے۔ ایسے میں ہمیں کسی قسم کے دکھ یا تکلیف یا رنج یا کمی کا احساس کیونکر ہو سکتا تھا؟ ہمیں تو فرشتوں نے اپنے ہالہ میں لے رکھا تھا اور ہمارے لئے ان کے یہ کلمات ایک غیر معمولی ڈھارس تھے:

اَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا ، اَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا

اس سے بڑی عید اور کیا ہو سکتی ہے! کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہم نے کسی سے کم عید منائی۔ اگر کوئی کمی تھی بھی تو خدا تعالیٰ نے محسوس ہونے ہی نہیں دی اور میرے خیال میں حقیقی عید ہوتی بھی یہی ہے جس میں انسان کا ضمیر مطمئن اور پُر سکون ہو، الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ ہمیں ایسی عید کی لذت سے بھی آشنا ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی عید کے موقع پر پیارے آقا سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے لندن میں جو خطبہ عید ارشاد فرمایا اس میں اسیران راہ مولیٰ کی خوب عید بنائی، آپ نے فرمایا:

''پس میں ان نوجوان نسلوں کو جو اپنی ماؤں سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیسی عید منائیں بتاتا ہوں کہ تم ربوہ کے مجبور باسیوں کی سی عید مناؤ اور اسی عید پر راضی رہو کہ ایسی عیدیں خوش نصیبی سے کسی قوم کو نصیب ہوا کرتی

ہیں۔ایک دوست نے ربوہ کے باسیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک بہت ہی اچھا تبصرہ ان پر کیا۔وہ سب باتیں لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: ’ربوہ اداس تو ہے مگر اس میں مجھے موجیں مارتے ہوئے طوفان نظر آتے ہیں اللہ تعالیٰ ان طوفانوں کو اپنے خاص فضلوں سے نوازے‘‘۔حضورؒ مزید فرماتے ہیں:

ہاں تم وہی عید مناؤ جو سکھر کے مظلومین کی عید ہے۔وہ عید مناؤ جو ان خدا کی راہ میں اپنے رب کی محبت میں قید ہونیوالوں کی عید ہے کہ جب ان کو ہتھکڑیاں پہنائی جاتی تھیں تو وہ ان کو چومتے تھے اور نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے تھے اور پولیس اور وہ ظالم جو تماشا دیکھتے تھے وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کس قسم کی مخلوق ہے؟ کس ملک کے باشندے ہیں؟ ایسے نظارے تو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

ہاں تم وہی عید مناؤ جوان سپوتوں کی عید ہے جو ضلع تھرپارکر میں اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے رحم اور اس کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ اسلام کا جھنڈا سر بلند کئے ہوئے ہیں۔جنہوں نے نہ اپنا سرنگوں ہونے دیا ظلم وتشدد کے سامنے۔نہ کلمہ توحید کا سرنگوں ہونے دیا، نہ احمدیت کا سرنگوں ہونے دیا۔انہوں نے ماریں کھائیں اور بے ہوش ہو گئے لیکن اپنی بلالی شان کو انہوں نے زندہ رکھا۔وہ ان ویران بستیوں میں ہی پیدا ہوئے تھے جہاں اور لوگ پیدا ہوئے لیکن انہوں نے اپنے نور سے ان تاریک بستیوں کو روشن کر دیا اور ان مردہ بستیوں کو نئی زندگیاں عطا کیں۔

پس میں ان نوجوان نسلوں سے کہتا ہوں جو اپنی ماؤں سے پوچھتی ہیں کہ ہم کیسی عید منائیں؟ کہ تم تھرپارکر کے نوجوانوں کی عید مناؤ۔ان مخلصین کی عید مناؤ جن پر آئندہ احمدیت کی آنے والی نسلیں ہمیشہ فخر کرتی رہیں گی، جن پر ہمیشہ خدا کی رحمتیں برستی رہیں گی۔جنہوں نے آسمان پر نئے درخشندہ ستاروں، نئی کہکشاؤں کو جنم بخشا ہے۔جو گیت گاتے ہوئے جیلوں میں جاتے رہے اور جیلوں کی مسموم فضاؤں کو، زہر آلود فضاؤں کو نئی تازگی بخشتے رہے اور نئی پاکیزگی عطا کرتے رہے۔وہ یہ گیت گاتے رہے۔

اسی کلمہ طیبہ پڑھنا ایں اسی جیلاں توں نئیں ڈرناں ایں

یہ غزل کا ایک شعر ہے۔مجھے معلوم ہوا اور اس سے مجھے بہت لطف آیا کہ ایک احمدی نوجوان نے یہ غزل کہی پنجابی میں اور اسے بڑی کثرت کے ساتھ فوراً تمام نوجوانوں نے اپنا لیا اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے جب وہ جیلوں کی جانب لے جائے جاتے تھے تو وہ کلمہ طیبہ کے بعد یہی نظمیں پڑھتے جاتے تھے اور جیلوں میں بڑی سُریلی آواز میں وہ انہی نظموں کا ورد کرتے رہے۔

پس میں ان نوجوان نسلوں سے کہتا ہوں جو اپنی ماؤں سے پوچھتی ہیں کہ ہم کیسی عید منائیں؟ تمہیں اگر عید کا اسلوب نہیں، اگر تم عید کے منانے کے آسمانی انداز سے بے خبر ہو تو ان نوجوانوں سے سیکھو اور وہی عید مناؤ جو سکھر کے احمدی ماؤں کے ان لعلوں کی عید ہے۔ ان سے عید منانے کے گر سیکھو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے ابتلا پر صبر اور شکر اور رضائے باری تعالیٰ کی خاطر دکھ اٹھانے کا رستہ نہ چھوڑو۔ یہی کامیابیوں کا رستہ ہے اور یہی وہ رستہ ہے جس پر حقیقی عیدیں نصیب ہوا کرتی ہیں۔ وہ عجیب عید ہے جو ان لوگوں نے وہاں منائی اور منا رہے ہیں۔ ان کے واقعات اتنے عظیم الشان ہیں اور اتنے پیارے ہیں کہ ان کے ذکر سے ایک مجلس نہیں کئی مجلسیں زینت پکڑ سکتی ہیں۔ ایک نوجوان لکھتے ہیں کہ

’’جب ہمیں قید کر کے لے جایا گیا تو زنجیریں پہنا دی گئیں اور میری ہتھکڑی اتنی تنگ تھی کہ اس کی وجہ سے سارا باز و سوج گیا اور سیٹوں پر بھی نہیں بلکہ وین کے نیچے بٹھایا گیا۔ گرمی اتنی شدید تھی اور آدمی اتنے زیادہ تھے کہ بظاہر کوئی دوسرا انسان جب اس کا تصور کرے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اس قدر شدید تکلیف میں ہم سفر کر رہے تھے مگر وہ باہر کا انسان نہیں جانتا کہ ہمارے دلوں پر اُس وقت کیا گزر رہی تھی؟ ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کے ترانے گا رہے تھے۔ ہم اتنے خوش تھے اور اپنے رب سے اتنا راضی تھے کہ باہر کا انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔‘‘ وہ کہتے ہیں کہ

’’جب ہمیں مٹھی کی جیل میں پہنچایا گیا تو اس وقت مجھے امیر مقرر کیا گیا اس قافلے کا جو جیل میں داخل ہو رہا تھا۔ میں آپ کو اطلاع دیتا ہوں کہ ہر احمدی نوجوان نے حیرت انگیز تعاون کیا۔ ان کے حوصلے بلند ہیں اور کلمہ طیبہ کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں، ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ کلمہ کی حفاظت کریں گے اور حضرت محمد مصطفی ﷺ کا نام روشن سے روشن تر کرتے چلے جائیں گے۔ حضور دعا کریں اللہ سب خدام کو ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہم سب لڑکے نماز تہجد اور فرض نمازیں باجماعت ادا کرتے ہیں اور اپنے خدا سے رو رو کر دعائیں کرتے ہیں کہ احمدیت کی فتح کو جلد لائے اور ہمیں احمدیت کی خدمت کی توفیق عطا فرماتا رہے۔ دعا ہے کہ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر قائم رہے۔ اس کلمہ کی خاطر ہمیں اپنی جان بھی قربان کرنی پڑے تو خدا کی قسم! ہم ثابت قدم رہیں گے۔ خدا کی قسم! اس کلمہ کی خاطر اپنی جان، اپنا مال، اپنی اولاد، اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ ہم

اپنی جانیں دے دیں گے لیکن اللہ اور اس کے رسول کا پیارا نام نہیں مٹنے دیں گے۔‘‘

یہ ہیں اس قوم کے نوجوان۔ پس جس قوم کی بچیاں ایسی ہوں جن کا ذکر گزر رہا ہے اور جس قوم کے نوجوان ایسے ہوں جن کا ذکر گزر رہا ہے کون ہے جو ان کو مٹا سکے؟ ایسے لوگوں کو مٹانے والے ہمیشہ صفحہ ہستی سے خود مٹ جاتے ہیں۔ ایک کے بعد وہ قومیں عبرت کا نشانہ بن کر تاریخوں کی یادیں بن گئیں۔ لیکن ایسی بھیانک یادیں کہ جن پر جب بھی نظر پڑتی ہے تو انسان حسرت کے ساتھ ان لوگوں کو دیکھتا ہے کہ کس طرح یہ محروم اور بدنصیب لوگ روشنی پانے کے باوجود بھی اندھے رہے۔ دن چڑھنے کے باوجود بھی اندھیری راتوں میں بھٹکتے رہے اور انہوں نے اپنے پہلوں سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

جو مختلف واقعات وہاں سے ملتے رہے ان میں سے ایک خط ایک احمدی نومسلم کا بھی ہے...... یہ ہیں نثار احمد مورائی جو نوکوٹ میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کا جب میں خط پڑھ رہا تھا تو مجھے سندھ کی ایک رسم یاد آگئی۔ سندھ میں یہ رسم ہے کہ جب کوئی شخص نہایت ہی کمینی، ذلیل، اخلاق سے گری ہوئی، انسانیت سے گری ہوئی حرکت کرتا ہے تو اسے وہ پنجہ دکھاتے ہیں اور اس کا نام انہوں نے ’’گھلاّ‘‘ رکھا ہوا ہے۔ ’’گھلاّ‘‘ دینا یا ’’گھلاّ‘‘ دکھانا۔ میں تو چونکہ ان رواجوں سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ اس کی حکمتیں نہیں جانتا تھا۔ میں نے کسی سے پوچھا یہ کیا چیز ہے کیونکہ یہ اتنا شدید ردعمل پیدا کرتا ہے ’’گھلاّ‘‘ کہ ’’گھلاّ‘‘ دکھانے پر بعض لوگ جانیں دے دیتے ہیں لڑ کر، کٹ مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، ایسی ذلت کا نشان سمجھا جاتا ہے تو جب میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ پانچ انگلیاں پانچ لعنتوں کا نشان ہیں۔ جب ایک مجبور آدمی اور بے کس آدمی کسی اور طریق سے اپنے ظلم کا بدلہ نہیں لے سکتا تو وہ ظالم کو پھر اس طرح تھپڑ مارتا ہے اس کے منہ پر۔ وہ اسے ’’گھلاّ‘‘ دکھا دیتا ہے کہ میری طرف سے یہ پانچ لعنتیں ہیں تم اب جو چاہتا ہے مجھ سے کر گزر۔ یہ نومسلم جن کو اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ احمدیت کی برکت سے شرک سے اجتناب کی توفیق ملی، جو بتوں کی پرستش کیا کرتا تھا اور اسے جماعت احمدیہ کے سرفروشوں نے کلمہ توحید پڑھا دیا اور اس کا ظاہر اور اس کا باطن روشن کر دیا۔ مشرکوں سے وہ موحدین میں داخل ہو گیا اور موحدین سے وہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے والا بن گیا اور خدا کے فضل سے اسے ہر رنگ میں اسلام کی عظیم الشان خدمت کی توفیق ملتی رہی..... تو کہتے ہیں کہ

’’ان صاحب (ڈپٹی کمشنر تھرپارکر) نے میرے کلمہ کو گویا پاکستان کے لئے ایک عظیم خطرہ تصور کیا اور نظر بندی کا حکم دیا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ ان کو سی (C) کلاس دی جائے اور جیلر کو بھی یہ ہدایت تھی کہ جتنی تکلیفیں پہنچا سکتے ہو ان کو پہنچاؤ، کسی سے ملنے نہ دو، اپنے جیب سے اگر ان کے پاس پیسے ہیں تو کھانا کھائیں ورنہ ان کو کھانا بھی پیش نہیں کیا جائے گا اور پانی کی بھی شدید تکلیف پہنچائی جائے‘‘

غرضیکہ بعض ان میں سے ایسے تھے جن کو 24،24 گھنٹے تک نہ کھانا دیا گیا، نہ پانی دیا گیا۔ تو لکھتے ہیں بڑے آرام سے، بغیر کسی گھبراہٹ اور بغیر کسی جذباتی اشتعال کے کہ ’’بڑا لطف آرہا تھا۔ وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ کے فضل سے احمدیت نے کلمہ کی نعمت عطا کی تھی اسے وہ لوگ جو خود مسلم بنتے ہیں اور احمدیوں کو غیر مسلم بنانے کے درپے ہیں وہ زبردستی جبر وتشدد کے ذریعہ اس کے سینے سے کلمہ نوچنے کی کوشش کررہے تھے۔‘‘

یہ وہ احمدی واقف زندگی بھی تھے اور اب بھی واقف زندگی ہیں۔ یہ وہ ہیں کہ جیسا میں نے بیان کیا ہے ان کو ہندوؤں سے احمدی مسلمان ہونے کی توفیق ملی اور ان کا ایک ہاتھ بچپن میں کٹ گیا تھا۔ ایک ہی ہاتھ تھا وہ بھی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اگر یہ چاہتے بھی تو وہ اس ایک ہاتھ سے بھی وہ ’’کھلاً ‘‘ نہیں دے سکتے تھے۔ مگر میں نے کہا ہے کہ اللہ کی شان دیکھو یہ واقعہ اپنی ذات میں خدا کی طرف سے ایک ’’کھلاً ‘‘ ہے جو ان ظالموں کے منہ کے سامنے رکھا گیا۔ خدا کی تقدیر کا یہ ’’کھلاً ‘‘ ان کو بتا رہا ہے کہ تم کیسے مسلمان ہو کہ آج کلمہ توحید کو مٹانے کے درپے ہو چکے اور اپنے ہاتھوں سے کلمہ توحید تم نے ان کے سپرد کر دیا جن کو تم غیر مسلم کہا کرتے تھے، جن کو تم اسلام کا دشمن اور وطن کا دشمن قرار دیا کرتے تھے۔

پس! خدا کی تقدیر نے ایک ایسا ’’کھلاً ‘‘ دکھایا ہے جو ہمیشہ ہمیش کے لئے جاری رہے گا...... مگر جماعت احمدیہ کسی ’’کھلے ‘‘ کی قائل نہیں، کسی لعنت کی قائل نہیں۔ خدا کی تقدیر جو لعنتیں خود فیصلہ کر کے ان پر نازل کرے، اس سے بھی ہمارا دل دکھتا ہے۔ اور اس سے بھی ہمارا دل دکھتا رہے گا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ وہ لعنت نازل ہو یا نہ ہو۔ چند سرغنہ لوگوں کو خدا کی تقدیر پکڑے یا نہ پکڑے ہم موجودہ حالات سے راضی ہیں اور یہی ہماری عید ہے۔ وہ دیکھو کس شان کا قافلہ ہے جو کلمہ ہائے توحید بلند کرتا ہوا پا بجولاں ہونے کے باوجود بڑی شان اور بڑی عظمت کے ساتھ شاہراہ ترقی اسلام پر گامزن ہے اور اسے کسی قسم کی کوئی ظلم وستم

کی داستان، کسی قسم کی کوئی ظلم وستم کی واردات اس ترقی کی راہ پر آگے سے آگے بڑھنے سے باز نہیں رکھ سکتی
ان کے اس حال کو دیکھ کر مجھے تو دجلہ کی تعریف میں کہے گئے ایک شاعر کا شعر یاد آ گیا۔ وہ کہتا ہے ؎

دجلہ را امروز رفتار عجب مستانی ایست
پائے از زنجیر کف برلب مگر دیوانی ایست

کہ دیکھو! دیکھو! دجلہ کی عجیب شان ہے! کس مستی کے عالم میں بہہ رہا ہے! لہروں کی زنجیریں اس کے پاؤں کو روکے ہوئے ہیں اور ہونٹوں پر کف جاری ہے۔ لیکن اس کے باوجود عجیب مستانہ انداز میں آگے سے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ پس احمدیوں کا یہ قافلہ بھی اس مستانہ وار دجلہ کی یاد دلاتا ہے دیکھنے والا تو یہی کہے گا ''مگر دیوانی ایست'' شاید دیوانے ہو گئے ہیں مگر ہاں ہاں خدا کی راہ کے دیوانے ہیں۔ دنیا کے فرزانوں کی دیوانگی ان کو نصیب نہیں ہوئی۔ الحمد للہ رب العالمین، پس یہ عجیب شان کا قافلہ ہے جو آگے سے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہم نہ لعنتوں کے قائل ہیں نہ لعنتیں ہمیں خوش کریں گی کیونکہ جب خدا کی لعنت کسی قوم کو پکڑ لیتی ہے تو خدا کے بندے اس پر کبھی خوش نہیں ہوا کرتے۔ ہاں نشان کے پورا ہونے کی راہ سے، اس نظریہ سے ضرور ان کے دلوں کو فرحت نصیب ہوتی ہے لیکن انسانوں کے دکھ سے سب سے زیادہ دکھ خدا کے پاک بندے اُٹھایا کرتے ہیں۔

پس یہ قافلہ تو آگے بڑھے گا۔ میں نوجوان نسلوں سے کہتا ہوں کہ تم بھی صبر اور رضا کے گر سیکھو ان قافلہ والوں سے، ان نوجوان نسلوں سے، یہ بھی تو نوجوان نسلیں ہیں جنہوں نے اسلام کے نام کو عجیب شان کے ساتھ سر بلند کر رکھا ہے۔ تم صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو اور توکل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو اور ان کے سامنے سر نہ جھکاؤ جو غیر اللہ ہیں، خدا کے سامنے سر جھکاؤ۔ ان کے سامنے آنسو نہ بہاؤ جو غیر اللہ ہیں۔ خدا کے حضور آنسو بہاؤ اور انبیاء کی طرح یہی عرض کرو کہ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ میں تو وہ ہوں جو اپنا غم اور اپنے دکھ اور اپنے آنسو صرف خدا کی راہ میں بہاتا ہوں۔ تم بھی بعض راتوں کی دعاؤں کی طرح میرے ساتھ مل کر خدا سے یہ عرض کرو:

کہاں تک اب ان پہاڑ جیسی راتوں کو تیشۂ بے کسی سے کاٹوں
میری محبت کے خواب آ جا غمِ جدائی کو خاک کر دے

اے اللہ! یہ اندھیری راتیں تیشہ بے کسی سے کاٹتے کاٹتے، بے بسی سے کاٹتے کاٹتے بعض دفعہ دل ہاتھ سے نکلتا ہے۔ تو ہی ہے جو صبر عطا فرما اور اب ان آزمائشوں کو ختم فرمادے اور محبت کے خواب بن کے آجا اور ان دکھوں کی راتوں کو خواب بنا دے۔ نہیں! نہیں! اے ہمارے آقا! تو صبح کا سورج بن کر طلوع ہو۔ فتح وظفر کا سورج بن کر طلوع ہو جس کی روشنی سے تمام اندھیرے اور تمام ظلمتیں باطل اور زائل ہو جائیں۔ اے ہمارے آقا! تو چاند بن کر آ، ہم پر طلوع فرما جس کی محبت کی ٹھنڈی چاندنی ہمارے دلوں کو تسکین بخشے۔ وہی ہماری جنت ہے پس ہم اس جنت سے بھی راضی ہیں آج جو جنت تو ہمیں عطا فرما رہا ہے۔ اُس جنت سے بھی راضی ہوں گے جو صبح نصر کی جنت ہوگی اور صبح ظفر کی جنت ہوگی۔ پس اے ہمارے اللہ، ہمارے آقا! ہماری ان قربانیوں کو قبول فرما، ہمیں اپنی محبت کی عید عطا کر اس سے بہتر اور کوئی عید نہیں جو ہمیں مرغوب ہے۔"

خطبہ ثانیہ اور دعا کے بعد فرمایا:

ساہیوال کے مظلومین کا ذکر رہ گیا تھا۔ دعا میں تو مجھے یاد آ گئے تھے کیونکہ اجتماعی دعا میں، امام کی دعا میں باقی سب کی دعائیں بھی شامل اور سب کی دعا میں امام کی دعا شامل ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کی طرف سے بھی وہ دعا میں یاد رکھے گئے لیکن آئندہ ان کو بھی اپنے طور پر بھی، انفرادی طور پر بھی یاد رکھیں۔"[1]

### 5 چکی میں فیصلہ تک

مقدمہ کا فیصلہ سنائے جانے تک حوالات کا وقت اِسی 5 چکی میں گزرا۔ یہ عرصہ اللہ کے فضل سے جیل کے حالات کی مناسبت سے بہت اچھا گزرا۔ یہاں ہم نے اپنا نظام الاوقات بنالیا ہوا تھا جس کے مطابق سارے دن کی مصروفیات جاری رہتیں۔ ہم صبح سویرے اُٹھ کر اپنے اپنے طور پر ورزش کرتے، میں تو باقاعدہ جاگنگ کرتا جبکہ بزرگان تیز پیدل چلتے اور پسینہ ٹھنڈا ہونے پر باہر نلکے تلے خوب مزے سے نہاتے۔ پھر ناشتہ کر کے تلاوت قرآن کریم اور دیگر کتب کے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے۔ نمازیں باجماعت ادا کرتے، کھانا اکھٹے کھاتے، بحث مباحثے، سیاسی تجزیے و تبصرے بھی ہوتے اور باہم کھیلیں بھی کھیلتے۔ موسم گرما کے ایام میں زیادہ تر چکیوں کے اندر وقت گزرتا جہاں ہم پانی چھڑک کر قدرتی ٹھنڈک والا ماحول بنا لیتے۔ یہاں ابتداء میں پنکھے نہ تھے تاہم چند دنوں بعد جماعت کی طرف سے ہر

---

[1] خطبات طاہر، خطبات عیدین صفحہ 42 تا 50

چکی میں پنکھے کا انتظام کر دیا گیا جس سے موسم کی شدت اور حدت میں بہت حد تک کمی آ گئی اور موسم گرما خوشگوار طور پر گزرنے لگا۔ جب موسم سرما شروع ہوا تو دن کا اکثر حصہ باہر دھوپ میں گزرتا اور رات کے وقت ہم چکیوں میں چائے بناتے تو انگیٹھی جلانے سے کمرا خوب گرم ہو جاتا۔

ملتان سے آنے کے بعد کچھ عرصہ تک ہم چھ ساتھی ہی تھے اور ہماری ہفتہ وار اُردی لگتی تھی۔ پھر کچھ دنوں بعد ہمارے ساتویں ساتھی مکرم چوہدری محمد اسحاق صاحب بھی ادھر آ گئے۔ انہیں بی کلاس کی وجہ سے مستقل چکی الاٹ کر دی گئی۔ کچھ دنوں بعد تھانہ گوگیرہ صدر کے تھانیدار امان اللہ صاحب اپنے ایک سپاہی طارق کے ساتھ یہاں لائے گئے۔ وہ چند ماہ یہاں قیام کے بعد ضمانت ہو جانے پر رہا ہوئے تو اوکاڑہ کے ایک اور صاحب جن کا نام احمد حسن شاہ تھا، لائے گئے۔ یہ صاحب کسی دربار کے گدی نشین تھے جسے اوقاف کی تحویل میں لے لیا گیا تھا۔ یہ نفسیاتی طور پر مریض ہو چکے تھے جس کی وجہ سے ان کے ساتھ بہت عجیب وقت گزرا۔ ان کے علاوہ دیپال پور کے دو کھرل راجپوت بختاور اور اکبر بھی کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہے۔ یہ ماموں بھانجا قتل اور بعض دیگر خوفناک قسم کے جرائم میں ملوث اور سزا یافتہ تھے۔ ان دونوں کو بعد میں سزائے موت بھی سنائی گئی تاہم 1988ء کی عام معافی سے یہ بھی مستفید ہوئے۔ یہاں آنے والا آخری ساتھی لاہور کا مشہور بدمعاش ملاں مظفر تھا۔ یہ سابق خطیب بادشاہی مسجد لاہور کا بیٹا تھا مگر اپنے فن میں کمال تک پہنچا ہوا ایسا جوان تھا کہ جیل انتظامیہ بھی اس سے خوف کھاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بے حد احسان ہے کہ اُس نے ہمیں بیرکوں سے بچائے رکھا۔ اس طرح سے ہم گندے اور اخلاقی جرائم میں ملوث مجرموں کی صحبت سے محفوظ رہے، الحمد للہ۔ اگرچہ ہمارے ساتھ رہنے والے یہ چند لوگ بھی کوئی کم نہ تھے مگر یہ اخلاقی جرائم میں ملوث نہ تھے۔ اس اعتبار سے ہمیں بہت حد تک سکون رہا لیکن اس کے باوجود ان میں ہم میں بُعد المشرقین تھا۔

خاکسار نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مربوط بنیادوں پر مطالعہ کا آغاز کر دیا اور پہلے مؤطا امام مالک کا مطالعہ کیا پھر دیگر کتب کے ساتھ ساتھ باقاعدگی سے تفسیر کبیر کا دَور شروع کر دیا اور جب تک یہاں رہے سورہ عنکبوت تک مطالعہ مکمل بھی کر لیا۔ روزانہ اخبارات و جرائد اس کے علاوہ تھے۔ مطالعہ کے بعد اپنے ساتھیوں کو بھی باہمی گفتگو اور درس وغیرہ کے ذریعہ اس سے مستفیض ہونے کا موقع دیتا۔

پس وقت اسی طرح اپنی پوری رفتار سے گزرتا رہا اور ہم اس سواری پر ''عالَم برزخ'' کی منازل طے کرتے رہے۔ ہمارے سفر کا یہ وہ حصہ تھا جسے طے کرنے والا ہر مسافر دھڑکتے دل اور لرزتے جسم کے ساتھ طے کیا کرتا ہے۔ اس راہ میں ہر قدم پر سوئے دل کو پریشان رکھتے ہیں اور معمولی سی آہٹ پر بھی راہی کے کان کھڑے ہو جاتے

ہیں۔ وہ کسی بھی خبر سننے کے لئے بے تاب اور سخت بے قرار ہوتا ہے۔ خبر سنانے والا کتنا ہی بے اعتبار کیوں نہ ہو، اُس کی ہر بات پر ایمان لانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ ذرا سی خبر سے نہال اور ذرا سی خبر سے نڈھال ہو جاتا ہے۔ اُس کی کیفیت اُس طالب علم کی سی ہوتی ہے جس کے امتحان کا نتیجہ نکلنے ہی والا ہوتا ہی مگر اس فرق کے ساتھ کہ سکول کے کسی امتحان کے نتیجہ کا تعلق طالب علم کے صرف ایک یا دو سال سے ہوتا ہے جبکہ دفعہ 302 کے مقدمہ میں ملوث کئے گئے شخص کی یہ گھڑیاں اُس کی زندگی اور موت کے سوال سے عبارت بن کر گزرتی ہیں!!

☆ تیسرا باب

# مقدمہ کی سماعت

☆ ابتداء ساہیوال میں

☆ مکمل سماعت ملتان میں

☆ ایک روز جائے وقوعہ پر

(ساہیوال میں عدالتی کارروائی اور موقع ملاحظہ)

کپتان ڈگلس صاحب ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں میرے پر خون کا مقدمہ دائر کیا گیا میں اُس سے بچایا گیا بلکہ بریّت کی خبر پہلے سے مجھے دیدی گئی۔ اور قانون ڈاک کے خلاف ورزی کا مقدمہ میرے پر چلایا گیا۔ جس کی سزا چھ ماہ قید تھی اس سے بھی میں بچایا گیا اور بریّت کی خبر پہلے سے مجھے دے دی گئی۔ اسی طرح مسٹر ڈوئی ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں ایک فوجداری مقدمہ میرے پر چلایا گیا آخر اس میں بھی خدا نے مجھے رہائی بخشی اور دشمن اپنے مقصد میں نامراد رہے اور اس رہائی کی پہلے مجھے خبر دی گئی۔ پھر ایک مقدمہ فوجداری جہلم کے ایک مجسٹریٹ سنسار چند نام کی عدالت میں کرم دین نام ایک شخص نے مجھ پر دائر کیا اس سے بھی میں بَری کیا گیا اور بریّت کی خبر پہلے سے خدا نے مجھے دے دی۔ پھر ایک مقدمہ گورداسپور میں اسی کرم دین نے فوجداری میں میرے نام دائر کیا اس میں بھی میں بَری کیا گیا اور بریّت کی خبر پہلے سے خدا نے مجھے دی اسی طرح میرے دشمنوں نے آٹھ حملے میرے پر کئے اور آٹھ میں ہی نامراد رہے۔

(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۸۹ حاشیہ)

# مقدمہ کی سماعت

ہمارا یہ مقدمہ غیر معمولی طور پر ایک خصوصی فوجی عدالت کے سپرد کیا گیا کیونکہ ہمارے مخالفین کو صاف نظر آ رہا تھا کہ عام سول عدالت میں ان کے لئے اس مقدمہ کو جیتنا ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل ضرور ہوگا۔ چنانچہ ملک میں نافذ مارشل لاء سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایسی عدالت کا اِنتخاب کیا گیا جس سے اپنی مرضی کا فیصلہ کروایا جاسکتا تھا اور جسے کہیں بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اِس عدالت نے نہایت سرعت کے ساتھ قریباً ساڑھے تین ماہ میں ہمارے اس مقدمہ کی سماعت مکمل کر کے اپنا فیصلہ متعلقہ حکام کو بھجوا دیا۔ اس باب میں اس مقدمہ کی سماعت کا تفصیل سے ذکر ہے۔

## چارج شیٹ

14 فروری 1985ء کی شام عصر کی نماز کے بعد ہم معمول کے مطابق اپنی اپنی جگہ مصروف تھے کہ اچانک ہم سب کو ڈیوڑھی لے جایا گیا جہاں ایک سرکاری اہل کار نے ہمیں بتایا کہ ہمارا مقدمہ خصوصی فوجی عدالت نمبر 62 ملتان کے سپرد کر دیا گیا ہے اور سماعت کا آغاز پرسوں یعنی 16 فروری 1985ء کو دن کے گیارہ بجے ہوگا۔ ساتھ ہی انہوں نے ہمیں Charge Sheet کی ایک ایک کاپی پکڑائی جس میں ہم پر عائد کئے گئے الزامات درج تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہمیں پتہ چلا کہ ہم پر کیا کیا الزامات لگا کر اس مقدمہ میں ملوّث کیا گیا ہے۔ سرکاری اہلکار سے ان کا تعارف پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کا نام شاہ حسین ہے اور پولیس کے پراسیکیوشن ڈیپارٹمنٹ میں انسپکٹر ہیں۔ یہ بڑے باوقار، مہذب اور سلجھے ہوئے انداز میں بڑی شائستہ اور ہمدردانہ زبان و لہجہ میں ہمارے ساتھ مخاطب رہے اور آخر میں جب انہوں نے اس امر کی تسلی کر لی کہ ہمیں ہر بات سمجھ آ گئی ہے، ہم سے چارج شیٹ کی وصولی اور عدالت کی کارروائی کے آغاز کی اطلاع ہو جانے سے متعلق ایک تحریر پر دستخط کروائے اور بار بار ہمارے لئے دعائیہ کلمات ان کی زبان سے ادا ہوتے رہے۔ آخر میں ہم نے ان سے ذاتی طور پر گزارش کی کہ براہ کرم اس کی اطلاع ہمارے لواحقین میں سے کم از کم محترم میاں عمر صاحب کو کر دیں جس کا انہوں نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا علاوہ ازیں ہمیں بتایا کہ ہم جیل حکام سے بھی کہیں کہ وہ اِطلاع کریں کیونکہ وہ اس کے پابند ہیں۔ تاہم انہوں نے ذاتی طور پر بھی مکرم میاں صاحب کو اطلاع کر دی۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

یہ کارروائی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں ہوئی۔ ہم نے اُس کمرے سے باہر نکل کر ملاقات والے کمرے

میں ایک میز کے گرد اکھٹے ہو کر اپنی چارج شیٹ کا مطالعہ کیا۔ اس پر سب سے پہلے اِس مقدمہ میں ملوث کئے گئے اگرچہ سبھی گیارہ ملزمان کے نام اور پتہ جات درج تھے تاہم اس فہرست کی اِبتداء میں ہم گرفتار شدہ سات ملزمان کے نام ہی حسب ذیل ترتیب سے درج تھے:

۱۔ محمد الیاس منیر ۲۔ رانا نعیم الدین ۳۔ عبدالقدیر ۴۔ محمد نثار

۵۔ محمد حاذق ۶۔ چوہدری محمد اسحاق ۷۔ ملک محمد دین

فوجی عدالت کے صدر ہمیں دورانِ سماعت اِسی ترتیب کے مطابق کمرے میں آنے کا کہا کرتے تھے اور اسی ترتیب سے بٹھایا کرتے اور آخر تک ہر جگہ یہی ترتیب قائم رہی۔

اِس چارج شیٹ میں ہم سب ملزمان پر تین الزامات عائد کئے گئے تھے۔ پہلے دو الزامات P.P.C کی دفعات 302 اور 148 کے تحت تھے اور تیسرا دفعہ 149 کے تحت تھا۔ پہلے اِلزام میں کہا گیا تھا کہ آپ لوگوں نے 26/ اکتوبر 1984ء کی صبح حدود تھانہ A Division میں غیر قانونی طور پر جمع ہو کر اشتراکِ نیت سے قاری محمد بشیر کو فائر کر کے ہلاک کیا اور دوسرے اِلزام میں بھی یہی مضمون تھا صرف نام کا فرق تھا یعنی اظہر رفیق کے قتل کا اِلزام تھا۔ تیسرے الزام میں ہمیں مجمع خلافِ قانون کا مرتکب قرار دیا گیا تھا نیز یہ کہ ہم نے قتل کرنے میں ایک دوسرے کی اعانت کی تھی۔ اس چارج شیٹ کے مضمون میں کوئی پیچیدہ بات نہ تھی، بڑی آسانی سے مگر اِنتہائی لاپرواہی اور ڈھٹائی کے ساتھ ہم پر یہ الزامات عائد کر دیئے گئے تھے۔ بعد میں ایک موقع پر اِس موضوع پر گفتگو کے دوران ہمارے بزرگ وکیل محترم میاں عمر صاحب نے تبصرہ کیا کہ فوجیوں کی Charge Sheet اِسی طرح کی ہوتی ہے۔

**FIR جھوٹ کا پلندہ**

ہم جب تک تھانہ حوالات میں بند تھے، اس مقدمہ کے بارہ میں ابھی تک بالکل اَندھیرے میں رہے۔ ہمیں قطعاً علم نہ تھا کہ پرچہ کیا ہوا ہے، کس کے خلاف ہوا ہے اور اس کی نوعیت کیا ہے؟ ہر چند حملہ ہماری مسجد پر ہوا تھا اور ہمارا ہی حق بنتا تھا کہ مقدمہ کا اندراج ہماری طرف سے ہو مگر جہاں انصاف کا نام ونشان نہ ہو، وہاں حق کو کون دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس مقدمہ میں سب سے پہلا خون انصاف کا تو اسی پہلے مرحلہ پر کیا گیا جب مقدمہ کا اندراج حملہ آوروں کی طرف سے کیا گیا اور سارے دن کی محنت، سوچ بچار اور ساہیوال کے چوٹی کے وکلاء کی مشترکہ مشاورت سے تیار کی گئی FIR اُس روز رات گیارہ بجے تھانہ میں پیش کی گئی۔ تاہم قانونی اغراض کے لئے سفید جھوٹ بولتے ہوئے اس کے اندراج کا وقت چھ بجے صبح لکھا گیا۔

سنٹرل جیل ساہیوال کی ڈیوڑھی جہاں قیدیوں کے لواحقین کو ملاقات کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑتی ہے

محترم ملک محمد دین صاحب اپنی اہلیہ کی وفات (1987) پر چند گھنٹوں کے لئے گھر لے جائے گئے

مکرم رانا نعیم الدین صاحب

خاکسار محمد الیاس منیر

میں تری خاک سے لپٹا ہوا اے ارض وطن
اُن ہی عشاق میں شامل ہوں جو معتوب آئے

مکرم میاں حاذق رفیق طاہر صاحب

مکرم چوہدری عبد القدیر صاحب
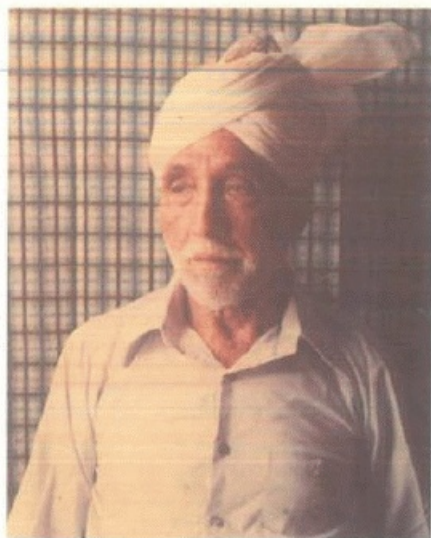
مکرم پروفیسر محمد طفیل صاحب

مکرم ملک محمد دین صاحب
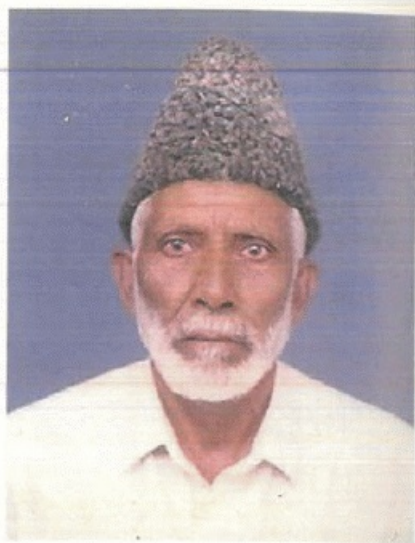
مکرم چوہدری حفیظ الدین صاحب ایڈووکیٹ کے بائیں طرف اُن کے بھائی مکرم منیر الدین مسعود صاحب

جرمنی کے شہروں فرانکفورٹ اور بون میں نکالے جانے والے پُرامن احتجاجی جلوسوں کے مناظر

حیرت کا مقام ہے کہ اس قدر محنت کے بعد تیار کی گئی FIR کی صورت میں جو نتیجہ نکلا وہ محض جھوٹ کا پلندہ تھا۔ اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی ایک بات بھی سچی نہ تھی بلکہ یہ قانونی نوعیت کی غلطیوں کا بھی مجموعہ تھی اور غلطیاں بھی ایسی فاش قسم کی کہ ایک عام آدمی بھی اس FIR کو پڑھتے ہی سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ قارئین کی معلومات میں اضافہ کے لئے اس کا اصل متن درج ذیل ہی کہ اسے پڑھیں اور ''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے'' کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کریں:

ابتدائی اطلاعی رپورٹ نسبت جرم قابل دست اندازی پولیس رپورٹ شدہ زیر دفعہ ۱۵۴ مجموعی فوجداری نمبر

مقدمہ ۸۴/۲۲۶ تھانہ اے ڈویژن ضلع ساہی وال تاریخ ووقت وقوعہ ۸۴۔۱۰۔۲۶

تاریخ ووقت رپورٹ ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴۔ ۵:۳۰ بجے صبح رپٹ نمبر ۳۷

تھانہ سے روانگی کی تاریخ ووقت بذریعہ سپیشل رپورٹ

نام وسکونت اطلاع دہندہ و مستغیث

درخواست ازاں عبداللطیف ولد حافظ عبدالرشید قوم جٹ چیمہ سکنہ حال جامعہ رشیدیہ غلہ منڈی ساہی وال

مختصر کیفیت جرم (معہ دفعہ) ومال اگر کچھ کھویا گیا ہے

جُرم ۳۰۲، ۱۴۸۔ ۱۴۹ ات۔پ

جائے وقوعہ وفاصلہ تھانہ سے اور سمت

بیت الحمد نزد مشن ہسپتال جانب مشرق بفاصلہ ایک فرلانگ بیت نمبر 8

کارروائی متعلقہ تفتیش اگر اطلاع درج کرنے میں کچھ توقف ہوا ہو تو اس کی وجہ بیان کی جاوے۔

توقف ندارد

دستخط انگریزی محمد ایاز عہدہ S.H.O

بخدمت جناب S.H.O انسپکٹر صاحب تھانہ A ڈویژن ساہی وال۔ جناب عالی گذارش ہے کہ قاری بشیر احمد مدارس جامعہ رشیدیہ ساہی وال کے پاس اطلاع آئی کہ قادیانی ساہی وال میں مشن ہسپتال کے شمالی گیٹ تقریباً سامنے واقعہ اپنے مرکز کو مسجد کا نام دیتے ہیں اور یہ وہاں اذان دیتے ہیں۔ قاری بشیر احمد نے گذشتہ شام کہا کہ چند دوست وہاں جاکر آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور کانوں سے سُنتے ہیں کہ وہ واقعی وہاں اذان دیتے ہیں۔ اور اگر ایسا ہی ہو تو اس واقعہ کی اطلاع پولیس کو دیں گے۔ چنانچہ قادیانی آرڈیننس کی

خلاف ورزی کا پتہ کرنے کے لئے ہم آج صبح قریباً چار بجکر پینتالیس منٹ پر قادیانیوں کے اُس مرکز اور مشن ہسپتال کے درمیان گذرنے والی سڑک پر قادیانی مرکز کے دروازے ہیں میں قاری بشیر احمد۔ اظہر رفیق۔ جاوید اقبال۔ عبدالرزاق اور محمد حنیف پہنچ گئے۔ چنانچہ صبح پانچ بجے سے چند منٹ پہلے اذان کی آواز قادیانی مرکز کے اندر سے آئی۔ ہم نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ پروفیسر طفیل اذان دے رہا تھا۔ ہمیں دروازے میں کھڑے دیکھ کر محمد دین ریٹائرڈ تھانیدار جو قادیانی مرکز کے اندر موجود تھا نے آواز دیکر کہا شیر و آجاؤ جس پر لُطف الرحمٰن مسلح ریوالور۔ الیاس منیر مسلح بارہ بور بندوق اور اسحٰق مسلح ریوالور قادیانی مرکز میں نکل آئے جس پر مسمی نعیم الدین۔ محمد فاروق رفیق طاہر۔ نثار اور قدیر نے کہا کہ ان کو ختم کردو ورنہ یہ ہمارے خلاف پرچہ دینگے۔ ہم سڑک پر آگئے۔ الیاس منیر نے ہمارے پیچھے دوڑ کر بندوق بارہ بور سے فائر کیا جو قاری بشیر احمد کو بائیں بازو اور چھاتی پر لگا۔ قاری بشیر احمد نیچے گرنے لگے تو اظہر رفیق اُسکی جانب بڑھنے لگا تو لُطف الرحمٰن نے ریوالور سے فائر جو ان کے ماتھے پر بائیں جانب لگا۔ اظہر رفیق پر دوسرا فائر ریوالور سے اسحاق نے کیا جو اُسے چہرے کے بائیں جانب لگا اور وہ گر گیا۔ اتنے میں حفیظ الدین اور شاہد نصیر باجوہ وہاں آگئے۔ انہوں نے کہا کہ کھڑے کیا دیکھتے ہو ان کو اندر لے جاؤ اور دروازوں پر لکھا ہوا کلمہ اور آیات قرآنی مٹا دو۔ جس پر مسمیان نعیم الدین، حاذق رفیق طاہر اور پروفیسر طفیل، قاری بشیر احمد کو گھسیٹ کر اپنے اندر قادیانی مرکز میں لے گئے۔ اظہر رفیق کو نثار اور قدیر گھسیٹ کر لے گئے اور اُنہوں نے قادیانی مرکز کا دروازہ بھی بند کر لیا۔ میں جاوید اقبال محمد حنیف اور عبدالرزاق کو قادیانی مرکز کے دروازے کے سامنے کھڑے کر کے آپ کو اطلاع دینے آیا ہوں لہٰذا کارروائی کی جاوے۔ ملزمان نے ہم مشورہ ہو کر قتل عمد کا ارتکاب کیا ہے لہٰذا حق رسی کی جاوے۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴ء۔ عرضے عبداللطیف ولد حافظ عبدالرشید (حال) وارد جامعہ رشیدیہ غلہ منڈی ساہی وال دستخط اردو عبداللطیف۔

از تھانہ:۔ مسمی عبداللطیف مندرجہ خانہ نمبر ۲۔ بحاضری تھانہ آکر تحریری درخواست پیش کی۔ جس پر رپورٹ ابتدائی اطلاع ہذا مرتب ہوئی۔ مضمون درخواست سے متذکرہ بالا سے سر درست جرم ۳۰۲، ۱۴۸۔۱۴۹ ت۔ پ۔ پایا جا کر حسب حال مقدمہ ہذا درج رجسٹر ہوا۔ میں مع اختر علی علوی ASI،

پرویز اقبال نمبر ۶۱C ۷، سرفراز احمد ۱۰۴۸C، حسن علی نمبر ۴۴۲C، محمد علی نمبر ۲۳IC معہ عبداللطیف مدعی مقدمہ روانہ موقعہ کا ہوتا ہوں۔ تفتیشی بیگ ہمراہ لیا گیا ہے۔ سرفراز احمد نمبر ۱۰۴۸C کو ایک ضرب رائفل معہ ۱۰ ضرب کارتوس اور حسن علی نمبر ۴۴۳C کو ایک ہتھکڑی مال خانہ از تھانہ سے تقسیم کرائی گئیں ہیں۔ سپیشل رپورٹ ہائے بخدمت افسران مجاز بدست عبدالرزاق نمبر ۸۶۱IC ارسال ہو رہی ہیں۔ پرت چہارم برائے مدعی ہوا ہے۔

دستخط انگریزی قاضی محمد ایاز انسپکٹر .S.H.O تھانہ A۔ ڈویژن ساہی وال ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴

پرت چہارم وصول شد دستخط اُردو عبداللطیف۔

نوٹ: نقل مطابق اصل ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل محرر تھانہ A ڈویژن ساہی وال ۲۶ اکتوبر ۱۹۸۴۔[1]

اس FIR کو پڑھ کر واضح ہو گیا کہ محترم ملک محمد دین صاحب جو پہلے دن سے کہہ رہے تھے بالکل درست تھا کہ

۱۔ یہ مقدمہ کچھ بھی نہیں کیونکہ گھر میں ہر شخص کو حفاظت خود اختیاری کا حق حاصل ہے اور گھر کی تعریف میں علاوہ رہائشی مکان کے مسجد، گوردوارہ، گرجا وغیرہ عبادت گاہیں سبھی کچھ آتا ہے۔

۲۔ انہوں نے وقوعہ مسجد سے باہر کا بنانا ہے تبھی ان کا کام بنے گا۔

چنانچہ FIR سے ان کی یہ بات بعینہٖ ثابت ہوئی اور وقوعہ باہر کا ہی بنایا گیا۔ یہ کہانی شروع سے آخر تک مضحکہ خیز باتوں کا مجموعہ تھی اور ہر جملہ پر انسان حیران ہو ہو جاتا ہے کہ یہ FIR تیار کرتے ہوئے ان کی عقلوں پر کیسے پردے پڑ گئے تھے! مثلاً اس میں لکھا ہے کہ

'ملک محمد دین صاحب کے للکارنے پر کچھ ملزمان وہاں آئے تو ملک صاحب نے کہا کہ چونکہ انہوں نے تمہاری اذان سن لی ہے اب جا کر یہ تمہارے خلاف پرچہ دے دیں گے، اس لئے انہیں ختم کر دو۔'

کیسی احمقانہ بات ہے کہ 298B کی معمولی سی تعزیر سے بچنے کی خاطر تعزیرات پاکستان کی سب سے بڑی دفعہ 302 کو قبول کر لو۔ (298B کی سزا صرف تین سال ہے جبکہ دفعہ 302 کی سزا موت ہے اور اُس کے ساتھ جرمانہ بھی ہو سکتا ہے) پھر یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ ملزمان حملہ کرنے والوں میں سے صرف دو 'ٹھیکیداروں' کو ختم کر کے ہی مطمئن ہو گئے کہ اب پرچہ نہیں ہو سکے گا۔ اِس میں یہ دلچسپ بات بھی لکھی تھی کہ جب وقوعہ کے وقت گھمسان کا گویا رَن پڑا ہوُا تھا تو الیاس منیر نے ہمارے پیچھے دوڑ کر بندوق بارہ بور سے فائر کیا جو قاری بشیر کو بائیں بازو اور چھاتی پر لگا! گویا وہ بارہ

---

[1] کتاب ایف آئی آر صفحہ 385-384 ناشر: نظارت اشاعت

بور کا فائر نہ ہوا بلکہ جدید قسم کا میزائل تھا جو گھوم کر اپنے نشانہ پر لگا۔ قارئین اس کا مطالعہ کر کے خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیسے کیسے غیر معقول فقرات اس میں درج ہیں۔ بہر حال اتنی مضحکہ خیز یہ FIR ہے کہ جہاں اس کے ہر ہر جملہ پر بے اختیار ہنسی آتی ہے وہاں اس کے خالقوں کی عقلوں پر رونا بھی آتا ہے لیکن ان کا کیا قصور کیونکہ انہوں نے تو اپنی عقلوں کے گھوڑے پوری ذہانت اور فطانت سے دوڑائے تھے۔ قصور ہے تو کمبخت جھوٹ کا ہے جس کے پاؤں نہیں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ محترم ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب (مرحوم) امیر جماعت ساہیوال کی اُنہی دنوں ایس پی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اقرار کیا کہ اس FIR میں کم از کم 19 غلطیاں ہیں۔

## مقدمہ ساہیوال میں ملوث کیے گئے افرادِ جماعت کا مختصر تعارف

اس موقع پر ان تمام گیارہ افرادِ جماعت کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے جنہیں اس مقدمہ میں سراسر ناجائز اور ظالمانہ طور پر ملوث کیا گیا۔ یہ سبھی احباب جماعت طویل عرصہ تک مختلف صورتوں میں تختۂ مشق ستم بنے رہے۔ اللہ تعالیٰ سبھی کو اپنے فضلوں سے نوازے اور قربانیوں کا سلسلہ ان کی نسلوں کو بھی جاری رکھنے کی توفیق بخشے، آمین۔

### ۱۔ مکرم ملک محمد دین صاحب شہید ساہیوال

اسیران راہ مولا میں سے شہادت کا رتبہ پانے والے بزرگوار مکرم ملک محمد دین صاحب ۱۹۱۱ء میں محترم فقیر محمد صاحب (برادرِ اصغر محترم حافظ حامد علی صاحبؓ صحابی حضرت مسیح موعود علیہ السلام) کے ہاں تھیہ غلام نبی ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے میٹرک کرنے کے بعد پولیس میں ملازمت اختیار کر لی اور ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر پولیس ہو کر ۱۹۷۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ آپ کی شادی محترمہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ کے ساتھ ہوئی جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بیٹے اور سات بیٹیاں عطا فرمائیں جو سب شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔

مقدمہ ساہیوال ۱۹۸۴ء کے ظالمانہ فیصلہ کے مطابق موصوف کو عمر قید کی سزا سنائی گئی جسے آپ نے ساہیوال سنٹرل جیل میں گزارا۔ تاہم اس سے قبل دوران سماعت ساڑھے تین ماہ ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں بھی گزرے۔ دوران اسیری پہلے ۱۹۸۵ء میں آپ کا ہرنیا کا آپریشن ہوا پھر ۱۹۸۷ء میں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا، جنازہ میں شمولیت کے لئے صرف چند گھنٹوں کے لئے آپ کو پولیس کی حراست میں گھر لے جایا گیا۔ آپ اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے اکثر بیمار رہنے لگے تھے بالآخر نومبر ۱۹۹۱ء میں آپ کو علالت کی وجہ سے ہسپتال داخل کیا گیا تو چند دنوں کے بعد ۸۰ سال کی عمر میں ۲۴ نومبر کو سول ہسپتال ساہیوال میں آپ اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے اور احمدیہ قبرستان ساہیوال میں مدفون ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے آپ کو شہدائے احمدیت میں شامل فرمایا اور

ایک خطبہ میں محترم ملک صاحب موصوف کا ان الفاظ میں تذکرہ فرمایا:

ملک محمد دین صاحب شہید ساہیوال: وفات نومبر ۱۹۹۱ء۔ محترم ملک محمد دین صاحب فیض اللہ چک کے ایک نواحی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد کا نام فقیر علی تھا۔ تقسیم ہند کے بعد آپ کا خاندان ساہیوال شہر میں آباد ہوا۔ آپ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ پولیس میں بھرتی ہوئے اور ۱۹۷۶ء کو انسپکٹر پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں سانحہ ساہیوال مسجد کے بعد جن گیارہ بے گناہ افراد کے خلاف جھوٹا مقدمہ قائم کیا گیا ان میں سے ایک آپ بھی تھے۔ آپ کو رات کے وقت دھوکہ کے ساتھ آپ کے گھر سے پولیس نے اس حال میں گرفتار کیا کہ آپ کو جوتا تک پہننے کی مہلت نہ دی اور اس کے بعد سات سال تک آپ ساہیوال اور ملتان کی جیلوں میں اسیر راہ مولا رہے۔

دوران اسیری پیرانہ سال میں آپ نے طرح طرح کی صعوبتیں بڑی خندہ پیشانی اور جذبہ ایمانی کے ساتھ برداشت کیں۔ آپ کو ۱۹۸۵ء میں جب ایک فوجی عدالت کی طرف سے دی گئی پچیس سالہ قید کی سزا سنائی گئی تو آپ نے بے اختیار کہا "پچھتر سال تو میری عمر ہو چکی ہے اب پچیس سال مزید کہاں میں قید و بند میں رہوں گا۔ آخر نومبر ۱۹۹۱ء میں سات سال قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے جیل ہی میں آپ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر کے شہادت کا عظیم مرتبہ پالیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم نے دو بیٹے اور چار بیٹیاں یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ کے سب بچے شادی شدہ اور صاحب اولاد اور خوش حال ہیں۔[1]

## ۲۔ مکرم رانا نعیم الدین صاحب

سانحہ ساہیوال کے مرکزی کردار مکرم رانا نعیم الدین صاحب یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو بمقام کاٹھ گڑھ ضلع ہوشیار پور مکرم منشی فیروز دین خان صاحب صحابی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ نے مڈل تک تعلیم حاصل کی اور کچھ عرصہ پولیس میں ملازمت کی۔ بعدہ فرقان فورس میں خدمات انجام دیں اور بالآخر پہلے سندھ میں اور اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک عملہ حفاظت خاص میں خدمت کی توفیق پائی۔ بوقت وقوعہ آپ ہڑپا ضلع ساہیوال میں اپنی زمین کے معاملات کی نگرانی کے سلسلہ میں ساہیوال میں مقیم تھے اور احمدیہ مسجد میں بطور خادم مسجد بھی خدمت کر رہے تھے کہ ۲۶ راپریل ۱۹۸۴ء کی شب مسجد پر حملہ کے دوران دفاع کرتے ہوئے دو حملہ آوروں کی ہلاکت آپ کے ہی دفاعی فائر

---

[1] خطبہ جمعہ ۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء مطبوعہ الفضل انٹرنیشنل ۳ تا ۹ ستمبر ۱۹۹۹ء ص ۵

سے ہوئی۔ جس کے بعد گیارہ افراد جماعت کے خلاف دائر کیے جانے والے مقدمہ قتل میں آپ کو بھی گرفتار کیا گیا اور اس مقدمہ کے ظالمانہ فیصلہ کے مطابق موصوف کو سزائے موت سنائی گئی جسے آپ نے سنٹرل جیل ساہیوال و فیصل آباد میں گزارا۔ تاہم اس سے قبل دوران سماعت ساڑھے تین ماہ ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں بھی گزرے۔ مارچ ۱۹۹۴ء میں رہا ہونے کے بعد سے آپ لندن میں مقیم ہیں اور رکن عملہ حفاظت خلیفۃ المسیح لندن کے طور پر بڑے جوش جذبہ، اخلاص اور ہمت و ذمہ داری کے ساتھ خدمت بجالا رہے ہیں۔

آپ کی شادی محترمہ سائرہ صاحبہ سے ہوئی جن سے آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں عطا فرمائیں جو سب کے سب شادی شدہ ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آپ کی اہلیہ اور ایک بیٹی کی ربوہ میں وفات ہوگئی۔

## ۳۔ مکرم عبدالقدیر صاحب

مکرم عبدالقدیر چوہدری صاحب ۱۹۶۰ء بمقام ساہیوال مکرم چوہدری عبدالرحیم مجاہد صاحب مرحوم کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ نے مقامی سکول سے میٹرک کیا اور والد صاحب کی زمین کی دیکھ بال کر رہے تھے کہ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں مسجد احمدیہ ساہیوال پر حملہ ہوا تو اس وقت میں حفاظت کی ڈیوٹی دینے کے جرم میں گرفتار کیے گئے۔ جس کے بعد فوجی آمر کی طرف سے مسلط کیے جانے والے ظالمانہ فیصلہ کے نتیجہ میں موصوف کو عمر قید کی سزا سنائی گئی جسے آپ نے ساہیوال سنٹرل جیل میں بڑی بشاشت اور ہمت و جوانمردی کے ساتھ گزارا۔ دوران سماعت ساڑھے تین ماہ ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں بھی گزرے تاہم آپ کی رہائی دیگر اسیران کے ساتھ ساہیوال سنٹرل جیل سے ہی ہوئی۔ رہائی کے بعد آپ کی شادی ساہیوال کے ایک نہایت مخلص دوست مکرم ملک منیر احمد صاحب سیکرٹری مال کی سب سے چھوٹی بیٹی کے ساتھ ہوئی۔ پھر جلد ہی آپ پہلے لندن گئے پھر ٹورنٹو، کینیڈا چلے گئے جہاں آپ نے مستقل سکونت اختیار کی۔ اس وقت آپ کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اور آپ کپڑے کی ایک فیکٹری میں ملازمت کرتے ہیں۔ ان کے والدین کو نامعلوم ظالموں نے ساہیوال میں رات کے وقت ان کے گھر آ کر گلہ دبا کر شہید کر دیا تھا۔

## ۴۔ مکرم محمد نثار شاہد صاحب

مکرم محمد نثار شاہد صاحب ساہیوال میں محترم محمد گلزار صاحب کے ہاں پیدا ہوئے۔ سانحہ مسجد احمدیہ ساہیوال کے وقت آپ پی ٹی سی کا امتحان دے رہے تھے۔ آپ کو بھی مقدمہ ساہیوال کے ظالمانہ فیصلہ میں عمر قید کی سزا سنائی گئی جسے آپ نے ساہیوال سنٹرل جیل اور ڈسٹرکٹ جیل ملتان میں گزارا۔ آپ کی شادی رہائی کے بعد ہوئی پھر جلد ہی براستہ لندن کینیڈا چلے گئے جہاں آپ اپنے اہل و عیال کے ساتھ بیری، کینیڈا میں مقیم ہیں اور ٹیکسی کے مالک ہیں۔

## ۵۔ محترم محمد حاذق رفیق طاہر صاحب

محترم محمد حاذق رفیق طاہر صاحب، محترم میاں محمد عاشق صاحب مرحوم سابق جنرل سیکرٹری و سیکرٹری مال ساہیوال کے بیٹے ہیں۔ موصوف کی پیدائش ساہیوال میں ہوئی اور یہیں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے صرافی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ عرصہ بیرون ملک بھی بسلسلہ روزگار رہے، بوقت وقوعہ آپ کی تین بیٹیاں تھیں۔ مقدمہ ساہیوال کے ظالمانہ فیصلہ میں موصوف کو بھی عمر قید کی سزا سنائی گئی جسے آپ نے ساہیوال سنٹرل جیل میں غیر معمولی صبر و استقامت، ہمت اور بہادری سے گزارا۔ اس وقت آپ مع اہل وعیال ٹورنٹو، کینیڈا میں واقع احمدیہ بلڈنگ میں رہائش پذیر ہیں۔

## ۶۔ محترم چوہدری محمد اسحٰق صاحب نمبردار

محترم چوہدری محمد اسحٰق صاحب نمبردار چک نمبر 99/6R ضلع ساہیوال کو بھی ناجائز طور پر اس مقدمہ میں ملوث کر کے گرفتار کیا گیا اور آپ پر بھی فوجی عدالت میں ہمارے ساتھ مقدمہ چلایا گیا تاہم آپ کو فوجی عدالت نے بری قرار دیا اور ۱۶ر فروری ۱۹۸۶ء کو آپ سنٹرل جیل ساہیوال سے رہا کر دیئے گئے۔ اس کے جلد بعد آپ اپنے بچوں کے پاس امریکہ چلے گئے جہاں چند سال بعد آپ وفات پا گئے۔

## ۷۔ محترم چوہدری حفیظ الدین صاحب ایڈووکیٹ

محترم چوہدری حفیظ الدین صاحب ایڈووکیٹ محترم چوہدری نورالدین صاحب جہانگیر کے ہاں ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ مقامی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد ٹی آئی کالج ربوہ اور ساہیوال میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۳ء میں ایل ایل بی کرنے کے بعد وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ آپ کا شمار ساہیوال کے ماہر اور کامیاب وکلاء میں ہوتا تھا۔ آپ کی شادی سلسلہ کے بزرگ محترم شیخ مبارک احمد صاحب سابق مبلغ مشرقی افریقہ، برطانیہ و امریکہ کی بیٹی محترمہ بشریٰ صاحبہ کے ساتھ ہوئی جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بیٹے اور دو بیٹیاں عطا فرمائیں۔ آپ مقامی جماعت میں مختلف عہدوں پر فائز رہے اور خدمت دین کی توفیق پائی۔

مقدمہ ساہیوال میں آپ کو بھی ملوث کیا گیا مگر پولیس آپ کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ تاہم جولائی ۱۹۸۵ء میں آپ نے از خود گرفتاری پیش کی جس کے بعد آپ کے خلاف بھی خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ کی سماعت ہوئی اور چند ماہ بعد ۲۵ر دسمبر ۱۹۸۵ء کو آپ کی باعزت بریت کے اعلان کے بعد رہا کر دیا گیا۔ آپ نے اسیری کا یہ عرصہ سنٹرل جیل ملتان میں نہایت وقار کے ساتھ خدمت خلق کرتے ہوئے گزارا۔ رہائی کے بعد آپ نے طویل عرصہ وکالت کی مختلف حیثیتوں سے خدمت دین کی توفیق پائی اور بالآخر ۹ر اپریل ۲۰۰۹ء کو آپ وفات پا گئے۔

## ۸۔ محترم چوہدری شاہد نصیر باجوہ صاحب

محترم چوہدری شاہد نصیر باجوہ صاحب ساہیوال کے ایک چک نمبر 30 / 11L کی معروف شخصیت محترم چوہدری نصیر احمد باجوہ صاحب کے بیٹے ہیں اور زمیندارہ کے ساتھ ساتھ وکالت کے پیشہ سے منسلک ہیں۔ مقدمہ ساہیوال میں آپ کو بھی جھوٹے طور پر ملوث کیا گیا مگر پولیس آپ کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ تاہم جولائی ۱۹۸۵ء میں آپ نے از خود گرفتاری پیش کی۔ جس کے بعد آپ کے خلاف بھی خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ کی سماعت ہوئی اور چند ماہ بعد ۲۵ دسمبر ۱۹۸۵ء کو آپ کی باعزت بریت کے اعلان کے بعد رہا کر دیا گیا۔ آپ نے اسیری کا یہ عرصہ سنٹرل جیل ملتان میں نہایت جوانمردی اور وقار کے ساتھ گزارا۔

## ۹۔ محترم پروفیسر محمد طفیل صاحب

محترم پروفیسر محمد طفیل صاحب ۱۹ راگست ۱۹۲۹ء بمقام فیض اللہ چک ضلع گورداسپور کو محترم بدر الدین صاحب کے ہاں پیدا ہوئے۔ اپنی ذاتی کاوشوں کے نتیجہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ایم اے فارسی کر کے تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ مختلف شہروں تعیناتی کے بعد بوقت وقوعہ آپ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ملی خدمات بجالا رہے تھے اور اپنی اہلیہ، دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کے ہمراہ مسجد احمدیہ ساہیوال کے ہی ایک مکان میں بطور کرایہ دار رہائش پذیر تھے اور مختلف جماعتی عہدوں پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ امام الصلوۃ بھی تھے۔ نہایت شریف النفس، بے ضرر، اعلیٰ علمی ذوق کے مالک اور مخلص فدائی احمدی تھے۔

مقدمہ ساہیوال میں جھوٹے طور پر ملوث کیے گئے مگر پولیس آپ کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ اس دوران آپ کو جرمنی اور کینیڈا کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ مانٹریال میں صدر جماعت رہے۔ یادِ وطن نے ستایا تو بے خطر واپس لوٹ آئے۔ لاہور میں کئی سال تک مقیم رہے اور یہیں مورخہ ۲۹ راکتوبر ۲۰۱۰ء کو لاہور پاکستان میں وفات پائی اور بہشتی مقبرہ ربوہ میں تدفین ہوئی۔ مقامی جماعت ساہیوال میں ابتداء سے ہی مختلف جماعتی اور تنظیمی عہدوں پر فائز ہونے کی سعادت حاصل رہی۔ آپ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل حکومت وقت کی طرف سے آپ کو مقدمہ ساہیوال سے بری قرار دے دیا گیا تھا۔

## ۱۰۔ محترم ملک لطف الرحمٰن صاحب

محترم ملک لطف الرحمٰن صاحب، سابق امیر جماعت ساہیوال محترم ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب کے سب سے بڑے بیٹے ہیں اور بینک میں اعلیٰ عہدے پر تھے کہ مقدمہ ساہیوال میں جھوٹے طور پر ملوث کیے گئے مگر پولیس آپ کو بھی

گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ اس دوران آپ کو کینیڈا کا سفر اختیار کرنا پڑا جہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے اور وینکوور میں اس وقت کامیابی کے ساتھ وسیع کاروبار چلا رہے ہیں۔ حکومت وقت کی طرف سے آپ کو بھی مقدمہ ساہیوال سے بری قرار دے دیا جا چکا ہے۔

### ۱۱۔ خاکسار محمد الیاس منیر، مربی سلسلہ

خاکسار کی ۶ راگست ۱۹۵۷ء کو پیدائش ہوئی تو خاکسار کے والد محترم مولانا محمد اسمٰعیل منیر صاحب، مبلغ سلسلہ خدمت دین کی خاطر مع اہل وعیال سری لنکا میں مقیم تھے۔ ایک سال بعد واپس ربوہ آ گئے تو خاکسار نے یہیں پرورش پائی اور جماعت کے عظیم ادارہ تعلیم الاسلام سکول میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء میں میٹرک کرنے کے بعد زندگی وقف کر کے جامعہ احمدیہ ربوہ میں داخل ہوا جہاں سے ۱۹۸۱ء میں شاہد کی ڈگری حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوا۔ ایک سال تخت ہزارہ ضلع سرگودھا میں بطور مربی سلسلہ خدمت کی توفیق پائی۔ ۱۹۸۳ء میں ساہیوال تعینات کیا گیا۔ یہیں ۱۹۸۴ء میں گرفتاری ہوئی اور اسیری کا یہ دور شروع ہوا جس کی سرگزشت اس کتاب میں درج ہے۔

رہائی کے بعد خاکسار کو جرمنی آنا پڑا جہاں تا حال مختلف شعبوں اور جماعتوں میں خدمت کی توفیق پا رہا ہوں، و باللہ التوفیق۔ انجام بخیر کے لیے قارئین سے درخواست دعا ہے۔

## فوجی عدالت میں پہلی بار

16 رفروری کو ساہیوال کے Canal Rest House میں خصوصی فوجی عدالت نمبر 62 ہماری موجودگی میں پہلی مرتبہ لگی۔ اُس روز ہمیں صبح ہی صبح باندھ کر اور ایک خصوصی گاڑی میں لاد کر احاطہ کینال ریسٹ ہاؤس میں پہنچایا گیا۔ یہاں ہمارے لائے جانے سے پہلے ہی کثیر تعداد میں نام نہاد مجاہدین ختم نبوت جمع ہو چکے تھے اور پولیس کی بھی بھاری نفری امن و امان کی صورت حال سے نبٹنے کے لئے موجود تھی، کچھ احمدی احباب بھی آئے ہوئے تھے۔ اس سارے منظر کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے حق و باطل کے درمیان معرکہ ہونے والا ہے۔ طویل انتظار کے بعد فوجی عدالت کے ممبران بھی آئے اور بڑے طمطراق کے ساتھ اپنی گاڑیوں سے اُتر کر ریسٹ ہاؤس کی عمارت میں چلے گئے اور کچھ دیر بعد ہمیں طلب کیا گیا تو پولیس کی اونچی سی گاڑی سے بندھے ہاتھوں کے ساتھ گرتے پڑتے اُترے اور عمارت کی پچھلی طرف سے عدالت کے سامنے پہنچا دیئے گئے جو ایک چھوٹے سے کمرے میں لگی تھی اور یہ کمرا آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ گو زائد تو کوئی نہ تھا لیکن جتنے بھی تھے کمرے کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ لگ رہے تھے۔

کمرے کے ایک طرف بڑی سی میز لگی تھی جس کے پیچھے تین کرسیاں تھیں۔ ان میں سے ایک خالی تھی جبکہ دو کرسیوں

پر فوجی افسران براجمان تھے۔ ہمارے اندر آنے سے قبل اِستغاثہ کے وکیل ملک فضل کریم صاحب ارکانِ عدالت سے کچھ باتیں کر رہے تھے اور اس سلسلہ میں کچھ حوالے وغیرہ بھی دکھا رہے تھے جن کی معاونت ساہیوال کا ایک مشہور رسوائے زمانہ وکیل عبدالمتین چوہدری کر رہا تھا۔ یہ شخص ہمارے واقعہ کے فوراً بعد راتوں رات نام نہاد مجلس تحفظِ ختم نبوت کا جنرل سیکرٹری بن گیا تھا۔ اُسے رُسوائے زمانہ اس لئے لکھا کہ جب ہم گاڑی میں بیٹھے تھے تو یہ بھی وہاں اِدھر سے اُدھر گھوم رہا تھا۔ چونکہ ملک محمد دین صاحب کے خلاف یہ بعض پریس کانفرنسوں میں بہت کچھ کہہ چکا تھا اور ملک صاحب اپنی گرفتاری کا ذمہ دار بھی اُسی کو ٹھہراتے تھے اس لئے ہماری باتوں میں اس کا نام بھی آ گیا جس پر ہمارے پاس ڈیوٹی پر موجود ایک سپاہی چونکا اور کہنے لگا کہ یہ (عبدالمتین) بڑا 'پیڈا' ہے یعنی سخت جان ہے۔ پوچھا کہ کس طرح کہنے لگا کہ میں نے اسے ایک مرتبہ صدر چوک (ساہیوال) کے قریب بڑی پھینٹی لگائی تھی۔ میں مارتا گیا اور یہ مسلسل کہتا گیا کہ سر! ایک منٹ میری بات تو سن لیں مگر میں رُکا نہیں بلکہ خوب مرمت کی۔ ہم نے پوچھا اس نے کیا کیا تھا؟ کہنے لگا 'ٹانگے کے پیچھے' بھاگ رہا تھا جو اس کا مشغلہ تھا۔ یہ سن کر ہمیں ایک مرتبہ پھر حیرت ہوئی کہ ایسے بدنام زمانہ لوگ آج نام نہاد مجلس تحفظ ختم نبوت کے مدارالمہام بنے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ اسلام کی خدمت کا نعرہ لگا کر آج قوم کے اعصاب پر مسلط ہونا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو خادمِ اِسلام ثابت کر رہے ہیں، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ذکر کر رہا تھا کہ کمرۂ عدالت میں ہمارے داخل ہونے سے پہلے وکیل اِستغاثہ کی عدالت سے گفتگو کا جس کے متعلق بعد میں پتہ چلا کہ یہ گفتگو دراصل اس بارہ میں تھی کہ ملزمان پر P.P.C کی دفعہ نمبر 298B کا بھی چارج لگتا ہے جبکہ پولیس کارروائی میں یہ دفعہ لگنے سے رہ گئی ہے۔ یعنی اذان دینے کا جرم تو ملزمان پر لگایا ہی نہیں گیا اور اپنے موقف کی تائید میں وہ کسی کتاب کو کھول کر قانون کی کوئی شق بھی دکھا رہے تھے۔ یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ ہمارے جس 'مجرمانہ فعل' پر سارے ڈرامہ کی بنیاد رکھتے ہیں، قانون کا اِطلاق کرتے وقت اسے ہی بھول جاتے ہیں۔ ایسے ہی موقع کے لئے کہا جاتا ہے کہ ''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے''۔ جب انہوں نے اپنی بات مکمل کر لی تو ممبران عدالت نے کہا کہ آپ یہ کتاب ہمیں دیدیں ہم دیکھیں گے۔ بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس جرم کو شامل چارج شیٹ کرنے کے لئے اُس وقت ایک تحریری درخواست بھی دی گئی تھی۔

### کلمہ طیبہ سے دل شکنی کی شکایت

جب یہ بات ختم ہو گئی تو ہمارے ان مخالف وکلاء نے عدالت کی توجہ ایک اور نہایت ''گھمبیر مسئلہ'' کی طرف مبذول

کرائی جس سے ان کی رذالت، کمینگی اور سفلہ پن کا بخوبی علم ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ وکیل اِستغاثہ اپنی عینک درست کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر عدالت سے مخاطب ہوکر کہنے لگا کہ ایک اور گزارش ہے! عدالت نے کہا: کیا؟ تو انگریزی میں گویا ہوئے۔

Sir, some of the accuseds are still wearing the stickers of Kalima-e-Tayyeba

جس کا تفسیری ترجمہ ماحول اور وکیل اِستغاثہ کے انداز و کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ یوں بنے گا: جناب اِتنا کچھ ہونے کے باوجود بعض ملزمان تو ابھی بھی اپنے سینوں پر کلمہ طیبہ کے بیج لگائے ہوئے ہیں۔ دُھائی خدا کی، اب تو انہیں منع کیجئے اور اِن کے سینوں سے کلمہ کے ان بیجوں کو نوچئے۔ اِنہوں نے تو ظلم کی اِنتہا کردی ہے اور ابھی تک ہمارے دلوں کو جلانے سے یہ باز نہیں آرہے۔ خدا کے واسطے کچھ کیجئے اسلام کو شدید خطرہ ہے اور ایک عظیم چیلنج ہے۔ اگرچہ زبان قال سے تو انہوں نے ایک ہی جملہ کہا تھا مگر درحقیقت وہ یہ سب کچھ زبان حال سے اُس وقت کہہ گئے تھے اور اُن کی صحیح ترجمانی یہی ہے۔

ہم نے ان صاحب کے منہ سے یہ جملہ سنا تو حیران ہوتے چلے گئے کیونکہ ابھی تک ہماری نظریں ان کے بظاہر شریفانہ اور مہذب وضع قطع کی وجہ سے انہیں ایک اچھا انسان تصور کررہی تھیں مگر جب انہوں نے یہ بات کہی تو ان کے ڈھول کا پول کھل گیا۔ لیکن شاید وہ یہ سب کچھ کہنے اور کرگزرنے پر مجبور تھے، آخر انہوں نے مولویوں سے پیسہ کھایا ہوا ہوگا۔ بعض اطلاعات کے مطابق انہوں نے 30 ہزار روپے تو فیس ہی لی تھی، واللہ اعلم۔ ان کی یہ بات سن کر صدرِ عدالت ہماری طرف دیکھے بغیر بڑے طنزیہ انداز میں مسکرائے اور کہنے لگے ''اچھا!'' اُس وقت تو ہمیں کچھ نہ کہا تاہم بعد میں پولیس کو یہ بیج اُتروانے کی ہدایات دے دی گئیں جن کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔

اِس کے بعد صدرِ عدالت نے کہا کہ Complainant عبداللطیف کہاں ہے؟ وہ پیچھے کرسی پر بیٹھا تھا، اسے عدالت کے سامنے لایا گیا۔ ہم نے آج پہلی دفعہ اس کو دیکھا۔ اِس سے پہلے ہمیں قطعاً علم نہ تھا کہ وہ ہے کون شخص جس نے F.I.R درج کرائی ہے جب کہ اس کذاب کا بیان تھا کہ وہ سب ملزمان کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا ہے۔ جب عبداللطیف سامنے آیا تو صدرِ عدالت نے کہا کہ آپ کی درخواست D.M.L.O. ملتان نے قبول کرتے ہوئے آپ کے درج کرائے ہوئے مقدمہ کی سماعت خصوصی فوجی عدالت نمبر 62 ملتان کے سپرد کی ہے۔ اِس عدالت کا صدر میں لیفٹیننٹ کرنل منیر الرحمان ہوں اور میرے ساتھ میجر شہزاد ہیں۔ تیسرے ممبر ایک میجسٹریٹ ہونگے جن کی تقرری ہوئی تھی لیکن انہیں دیگر مصروفیات کی وجہ سے رخصت دے دی گئی ہے اس لئے اب کسی اَور کی تقرری ہوگی۔ پھر انہوں

نے بتایا کہ اس مقدمہ کی باقاعدہ سماعت 2/مارچ سے شروع ہوگی۔ آج آپ کو صرف تعارف کے لئے ہی بلایا گیا ہے، اس دوران وکلاء وغیرہ کا انتظام کرلیا جائے وغیرہ۔ آخر میں کرنل صاحب نے سب حاضرین کو مخاطب کر کے بڑے ہی معصومانہ اور منقیانہ انداز میں کہا کہ ہم مقدمہ کی سماعت کریں گے اور جو بھی صورت ہوئی پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں گے، آخر ہم نے بھی خدا کو جان دینی ہے۔ اُن کے آخری الفاظ بظاہر خاصے پر اثر تھے اور اُس وقت حقیقت پر مبنی ہی لگ رہے تھے، واللہ اعلم بالصواب۔

اس کے بعد صدرِ عدالت نے P.D.S.P کو حکم دیا کہ مقدمہ کی دستاویزات اور نقول وغیرہ Defence counsel یعنی وکلائے صفائی کو دی جائیں۔ اس پر P.D.S.P. صاحب نے سرکاری وکیل جناب رانا فرزند علی صاحب کو اشارہ کیا جنہوں نے ہماری طرف سے پیش ہونے والے وکلاء حضرات محترم میاں عمر احمد صاحب چغتائی (مرحوم)، محترم ملک غلام احمد صاحب اور محترم چوہدری ناصر احمد سراء صاحب کو مقدمہ کی دستاویزات کی نقول فراہم کیں۔ اِن میں گواہان استغاثہ کے بیانات، نقشہ موقع ملاحظہ، پوسٹ مارٹم رپورٹ، بندوق کے ٹیسٹ کا رزلٹ وغیرہ شامل تھے۔ اس کے بعد ایک دو غیر رسمی سی باتیں ہوئیں اسی دوران محترم ملک نصیر صاحب آف لاہور (انہیں ملک محمد دین صاحب کے بیٹے ملک معین الدین صاحب ذاتی حیثیت سے اپنے والد صاحب کے وکیل کے طور پر لائے تھے لیکن بعد میں موصوف کسی پیشی پر نہ آئے) نے اوقات کار سے متعلق بات کی۔ انہوں نے کہا کہ مجھے لاہور سے آنا ہوگا اس لئے واپسی کے لئے اگر معقول وقت مل جائے تو بہتر ہوگا۔ صدرِ عدالت نے کہا کہ ہم نے تو یہاں آکر رہنا ہے آپ بھی یہاں آکر رہیں، جب تک ہو سکا ہم کام کیا کریں گے۔ اسکے بعد انہوں نے اجازت لے کر ملک صاحب سے وکالت نامہ پر دستخط کروائے اور وکالت نامہ عدالت کو پیش کر دیا۔

ہمارے وکیل مکرم ملک غلام احمد صاحب نے ہمیں یہاں سماعت کے لئے آنے پر کھانا کھلانے کی اجازت مانگی مگر عدالت نے انکار کر دیا تاہم ملنے کی اجازت مانگی تو عدالت نے کہا کہ ملزمان کو کسی ساتھ والے کمرے میں لے جائیں جہاں یہ ان سے ملاقات کرلیں۔ چنانچہ ہمیں کمرۂ عدالت سے ملحقہ ایک دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں ہمارے وکلاء حضرات نے ہمارے ساتھ مختصر سی ملاقات کی اور بعض ضروری ہدایات دے ہی رہے تھے کہ عدالت کی طرف سے پیغام آ گیا کہ انہیں عدالت میں پیش کیا جائے۔ جب ہم کمرۂ عدالت میں گئے تو میاں عمر صاحب سے کرنل صاحب کوئی بات کر رہے تھے۔ جتنی بات ہم نے سنی وہ یہ تھی کہ انہیں کہہ دیں کہ آئندہ کلمہ طیبہ کے بیج لگا کر عدالت میں نہ آیا کریں۔ ہم میں سے نثار صاحب، عبد القدیر اور خاکسار کے علاوہ غالباً رانا صاحب نے بھی کلمہ طیبہ کا بیج لگایا ہوا تھا

چنانچہ محترم میاں عمر صاحب نے ہمیں اُسی وقت عدالت کی یہ ہدایت پہنچادی جس کے بعد جیل جانے کے لئے ہمیں فارغ کردیا گیا۔ واپس جانے کے لئے ہم ابھی گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ ہمارے نگران سردار صاحب سب انسپکٹر پولیس گاڑی میں آئے اور کہنے لگے کہ جنہوں نے کلمہ کے بیج لگائے ہوئے ہیں انہیں اُتار کردے دیں اور اپنے نام بھی لکھوا دیں۔ چنانچہ ہم نے نام بھی لکھوا دیئے اور مجبوراً بیج بھی اُتار کردینے پڑے۔ اِس دوران سردار صاحب نے بتایا کہ عدالت نے جیل میں فون کرکے پوچھا ہے کہ کیا یہ ملزمان جیل سے ہی کلمہ کے بیج لگا کر آئے ہیں تو جیل والوں نے صاف انکار کردیا ہے اور کہا ہے کہ یہاں سے لگا کر نہیں گئے۔ انہوں نے جو ہمارے نام لکھے اس سے ہمارا خیال ادھر گیا کہ شاید یہ اب 298/B کا بھی مقدمہ درج کریں گے جیسا کہ پنجاب کے مختلف شہروں میں بیسیوں احمدیوں کے خلاف اُن دنوں بیج لگانے کی وجہ سے مقدمات قائم کئے جا چکے تھے لیکن ہمارے ساتھ ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ غالباً مولویوں کا زیادہ زور نہیں چل سکا ہوگا یا یہ کہ ہمارے سرکاری تحویل میں ہونے کی وجہ سے اس 'ارتکاب جرم' کی ذمہ داری خود سرکار پر ہی آتی ہوگی۔

آج کی کارروائی کے لئے پہلے تو ہم پریشان تھے کیونکہ Charge Sheet ملنے کے بعد اپنے وکلاء سے کوئی ملاقات نہ ہوسکی تھی اور ہمیں کچھ بھی اندازہ نہ تھا کہ عدالت میں کیسے پیش ہونا ہے اور کیا کہنا ہے، وغیرہ۔ اِس لئے ہر ایک کے دِل میں دھڑکا سا لگا تھا کہ جانے کیا ہو! چنانچہ کارروائی کے بعد سب اس لحاظ سے مطمئن تھے کہ آج ہم سے کسی قسم کا کوئی سوال نہ کیا گیا اور اب ہم وکلاء حضرات سے مل کر تفصیلات پوچھ لیں گے کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ ہمیں تو عدالتوں کے Procedure کا قطعاً علم نہ تھا اور اس حوالہ سے بنیادی معلومات چاہتے تھے کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ چنانچہ ہمیں بتایا گیا کہ پہلے دن تو صرف اور صرف عائد شدہ الزامات سے حقیقت پر مبنی اِنکار ہی کرنا ہے کیونکہ ہم پر لگائے گئے الزامات سرتا پا جھوٹ کا پلندا تھے، اِس کے علاوہ کوئی اور کارروائی نہیں ہوگی۔

## مقدمہ کی باقاعدہ سماعت ملتان میں

پہلے روز یعنی 16 فروری 85ء کی عدالتی کارروائی کے موقع پر ساہیوال میں فریقین کی طرف سے جمع ہوجانے والے ہجوم کے پیشِ نظر ہمارے مقدمہ کی سماعت ملتان میں کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے لئے ہمیں یکم مارچ کو ملتان جیل منتقل کیا گیا اور اس سے اگلے ہی روز مقدمہ کی سماعت کا باقاعدہ آغاز ہوگیا جس کے لئے ہمیں 2 مارچ 85ء کی صبح پولیس

کے سخت پہرے میں کینال کالونی ملتان کے ریسٹ ہاؤس میں لایا گیا جہاں ہمیں فوجی عدالت نمبر 62 کے سامنے پیش کیا گیا۔ جیل سے یہاں تک پہنچنے کی داستان بہت طویل ہے کیونکہ کسی کو بھی اِس مقامِ عدالت کا علم نہ تھا اور پولیس گارڈ ہمیں نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرتی رہی، کبھی چھاؤنی میں اور کبھی سول عدالتوں کے علاقہ میں، جس سے بھی اِس عدالت کا پوچھتے جواب نفی میں ملتا۔ گھنٹہ بھر کی تلاش کے بعد آخرکار اتفاق سے ایک ایسا شخص ملا جسے اِس عدالت کا علم تھا تو وہ ہمارے لئے خضرِ راہ ثابت ہوا چنانچہ وہ ہمارے ساتھ سوار ہو کر ہمیں یہاں پہنچا گیا۔

یہاں پہنچے تو ملتان کے چند ایک احباب جماعت پہنچے ہوئے تھے جن میں سے مکرم انیس الرحمٰن صاحب بنگالی مربی سلسلہ (مرحوم) اور مکرم چوہدری عبدالرحیم صاحب (مرحوم) سے میں متعارف تھا۔ انہوں نے ہمارے لئے کھانے اور چائے کا انتظام کیا ہوا تھا جس سے ہم ''پولیس کے تعاون'' سے ریسٹ ہاؤس کے گراسی پلاٹ میں بیٹھ کر پوری طرح مستفید ہوئے، الحمدللہ وجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ کچھ دیر بعد ساہیوال سے بھی وکلاء پہنچ گئے اور اس طرح سے یہاں خوب رونق بن گئی۔ سبھی کی محبت اور جوش وجذبہ ہمارے لئے اِس کٹھن سفر کا زادِ راہ تھا۔ ساہیوال سے آنے والے احباب صدر انجمن کی وین میں آئے تھے کہ مقدمہ کی سماعت کے ایام کے دوران آنے جانے کے لئے انجمن نے یہ گاڑی ساہیوال جماعت کو دے دی تھی۔

یوں تو دوستوں سے ملتے ہوئے وقت کا اندازہ نہ رہا تاہم خاصی تاخیر سے اس جگہ ایک فوجی جیپ 'مارشل لاء ڈیوٹی' کا جھنڈا لگائے نمودار ہوئی۔ اس جیپ میں ہماری عدالت کے ارکان تھے۔ ان کے آنے کے تھوڑی دیر بعد ہمیں بلاوا آ گیا اور ہم اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی اُس عمارت کی طرف روانہ ہوئے جس میں عدالت لگی تھی۔ ہم کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے تو سامنے عدالت کے صدر لیفٹیننٹ کرنل منیر الرحمٰن اور اُن کے ساتھی میجر شہزاد بیٹھے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک نوجوان سے مجسٹریٹ بھی تھے جن کی بطور سول ممبر تقرری ہوئی تھی۔ اراکین عدالت نے سب سے پہلے اپنا تعارف کرایا اور پھر باری باری انہوں نے حلف اٹھایا کہ

''ہم خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر ایمان سے اقرار کرتے ہیں کہ ہم پوری دیانتداری سے مقدمہ کا فیصلہ کریں گے اور شبہ کی صورت میں افواج پاکستان کے قانون کے مطابق فیصلہ کریں گے''

ان کے بعد سٹینوگرافر نے بھی حلف اٹھایا کہ وہ مقدمہ کی کارروائی کسی کو نہیں بتائے گا۔ اس تقریب حلف برداری کے بعد ہماری باری آئی۔ ہم سے پوچھا گیا کہ آپ کو اس عدالت پر کوئی اعتراض تو نہیں، مکمل اعتماد ہے؟ اس پر ہماری طرف سے پیش ہونے والے وکلاء محترم میاں عمر صاحب اور ملک غلام احمد صاحب نے کہا کہ کوئی اعتراض نہیں

ہمیں اعتماد ہے۔ یاد رہے کہ اس مقدمہ میں مذکورہ بالا حضرات ابتدائی اور امدادی وکلاء کی حیثیت سے پیش ہوتے رہے جبکہ ہمارے بڑے وکلاء محترم خواجہ سرفراز احمد صاحب (مرحوم) اور محترم مجیب الرحمٰن صاحب اصل کارروائی شروع ہونے پر شامل سماعت ہوئے تھے۔ پھر عدالت نے ہمیں پوچھا کہ آپ پر لگائے گئے الزامات سے آپ کو انکار ہے یا اقبالِ جرم کرتے ہیں؟ ہم سب نے جواب دیا کہ یہ الزامات غلط ہیں، ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کرنل صاحب اپنے سامنے پڑے ایک فارم پر No لکھتے ہوئے ہم سے یوں مخاطب ہوئے:

'اگر آپ اقرار یا اعتراف کر لیتے تو بھی اِستغاثہ کے گواہ ضرور بلائے جاتے کیونکہ یہ عدالت آپ کو موت تک کی سزا دے سکتی ہے اِس لئے مقدمہ کی کارروائی بہر حال پوری کی جاتی تھی'

ان کی اس بات سے صاف انداز ہ ہوتا تھا کہ عدالت سمجھتی تھی کہ ہم نے جھوٹ بولا ہے جس کی ضرورت نہ تھی۔ گویا کرنل صاحب پہلے دن سے ہی ''مائل بہ کرم'' تھے جس کے نظارے دورانِ مقدمہ ہم دیکھتے ہی چلے گئے۔ میں نے کرنل صاحب کی اس بات کے متعلق جو تبصرہ کیا ہے وہ دراصل اُن کے اُس خاموش اظہار کی عکاسی ہے جو بات کرتے ہوئے اُن کے لب ولہجہ سے عیاں تھا جسے الفاظ میں بعینہٖ بیان کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ ایک محسوس و مشہود امر تھا جسے ہماری آنکھوں نے دیکھا اور اس نظارہ کو ہمارے حافظہ نے محفوظ کیا۔ اس کے بعد صدرِ عدالت نے پولیس کو ہمارے متعلق ہدایات دیں اور اچھی طرح سمجھایا کہ انہیں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں، کچھ کھانے پینے کی اجازت نہیں اور یہ کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنے سینہ پر کلمہ طیبہ کا سٹکر لگایا تو میں تم لوگوں کو پکڑوں گا۔ ایک سپاہی نے کہا کہ 'سر! ضروری تو نہیں کہ ہر دفعہ ہماری ہی ڈیوٹی ہو، اس لئے اِن باتوں کی پابندی کس طرح ہوگی؟' کرنل صاحب نے آرڈر جاری کیا: یہ تمہارا کام ہے کہ جس کی ڈیوٹی ہو اُسے بتاؤ اور بس!

ان امور سے فارغ ہو کر عدالت نے ہمارے وکلاء سے پوچھا کہ کوئی قابلِ وضاحت بات! ہمارے وکلاء کی طرف سے نفی میں جواب پر عدالت 4 مارچ تک برخاست کر دی گئی۔ باہر نکل کر دوستوں سے دُور سے سلام ہوُا۔ اس کے بعد جیل لے جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے مگر دیر تک کوئی گاڑی نہ آئی۔ اس پر پولیس ہمیں پیدل ہی لے کر جیل کی طرف چل پڑی۔ ہم اس حال میں کہ پابند سلاسل تھے، ایک لمبا اور تکلیف دہ سفر طے کرنے کے بعد بمشکل تمام جیل پہنچے۔ یہ راستہ بھرے بازاروں میں سے تھا بلکہ مشہور نشتر ہسپتال بھی راستے میں آیا جہاں بہت زیادہ ہجوم تھا اور ہر جگہ لوگ کھڑے ہو ہو کر عجیب وغریب نگاہوں سے دیکھنے لگتے مگر ہمیں کوئی ندامت نہ تھی بلکہ ہم خدا تعالیٰ کی حمد کرتے اور درود شریف کا وِرد کرتے ہوئے اور پورے وقار اور فخر سے اپنا سر بلند کیے یہ سفر طے کرتے ہوئے ہر مقام سے گزرتے

رہے گویا 'ادبرہانا! ایہہ نعمتاں کتھوں' کا مضمون سیالکوٹ کی طرح یہاں ملتان کے گلی کوچوں میں بھی جاری تھا، الحمدللہ اور فیض کا کہا بھی پورا ہورہا تھا۔

آج بازار میں پابجولاں چلو ۔ دست افشاں چلو ، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو ، خوں بداماں چلو ۔ راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو ۔ پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

## ہماری پہچان کرانے کا سلسلہ

جیسا کہ اوپر ذکر گزر چکا ہے کہ دورانِ تفتیش متعدد مرتبہ گواہان کو ہماری پہچان کرائی جا چکی تھی مگر انہیں جھوٹے ہونے کی وجہ سے پھر بھی تسلی نہ تھی جس کی وجہ سے یہ سلسلہ آخر دم تک جاری رہا۔ سماعت کے پہلے روز عدالت میں جانے کے لئے جب ہم گراسی پلاٹ سے اُٹھ کر کمرے کی طرف چلے تو ہمارے مدعیان اور گواہان کمرے کے سامنے برآمدہ کے ایک کونے میں اکٹھے ہوگئے۔ اُس وقت میری نظر ان پر پڑی تو ان میں عبدالمتین وکیل بھی کھڑا تھا جس کے ہونٹ بڑی تیزی سے ہلتے چلے جارہے تھے۔ اس کی نظریں ہماری طرف تھیں جبکہ ذہن اپنے پیچھے کھڑے گواہوں کی طرف تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ یہ ان جھوٹے گواہوں کو ہمارے نام رٹا رہا ہے اور ایک دفعہ پھر ہماری اچھی طرح پہچان کرا کے ہماری شکلیں یاد کرا رہا ہے تاکہ اگر عدالت میں ان گواہوں سے مطالبہ ہوجائے کہ

'اگر تمہیں ان ملزمان کو پہلے سے جاننے کا دعویٰ ہے تو ذرا ان کے نام تو بتلاؤ!'

تو انہیں کچھ تو پتہ ہو!!! ہم نے مشاہدہ کیا کہ یہ صورت ہر دفعہ پیشی کے موقع پر جاری رہنے لگی اور اُس وقت خود بخود ختم ہوگئی جب چشم دید گواہان کی گواہیاں ختم ہوگئیں۔

## کمرۂ عدالت

مؤرخہ 4 مارچ 1985ء کو مقدمہ کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ ہم کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ممبران عدالت کی جگہ کے بالمقابل دیوار کے ساتھ کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ ہم السلام علیکم کہہ کر اندر داخل ہوئے تو صدرِ عدالت نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کو کہا جس پر بڑی حیرت ہوئی۔ ایسی سہولت بالکل غیر متوقع تھی، خاص طور پر مارشل لاء عدالتوں کے بارے میں تو سنتے تھے کہ ملزم کے ساتھ بھی مجرم کا سا سلوک ہی ہوتا ہے۔ عدالت کی اس مہربانی سے ہمیں بہت فائدہ ہوا اور عدالت کی دی ہوئی اس سہولت کے نتیجہ میں مقدمہ کی طویل کارروائی کے دوران ہمیں کھڑے نہ رہنا

پڑتا جبکہ عام طور پر ملزمان کو عدالتوں میں کھڑا رکھا جاتا۔ صرف دو دِن یعنی 30 اپریل اور یکم جون کو ہمارے لئے کرسیوں کا انتظام نہ تھا۔ 30 اپریل کو تو اُسی وقت اُسی عمارت میں ایک اور فوجی عدالت بھی خانیوال کے سات قتلوں والے مقدمہ کی سماعت کر رہی تھی جس کی وجہ سے کرسیوں کی کمی تھی۔ چنانچہ ہمارے کمرۂ عدالت میں داخل ہونے پر کرنل صاحب ہم سے مخاطب ہوئے کہ آج آپ کو کھڑا ہونا پڑے گا کیونکہ دوسری عدالت کی وجہ سے کرسیاں میسر نہیں۔ ساتھ ہی ان کے دل میں جانے کہاں سے رحم آیا اور کہنے لگے کہ اگر آپ بیٹھنا چاہیں تو نیچے فرش پر بیٹھ جائیں، اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں، ہم نے فوراً کہا ٹھیک ہے اور اس کے ساتھ ہی ہم سب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ باقی رہا یکم جون کا معاملہ تو اس دن کارروائی ہی بڑی مختصر سی تھی۔ ہم سے صرف یہی پوچھا تھا کہ رحم کی درخواست تو نہیں کرنا چاہتے۔ شاید اس لئے بھی کرسیوں کا تردد نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال ہم عدالت کے ممنون ہیں کہ اس نے ہمارے لئے یہ انتظام کر کے ایک غیر معمولی سہولت دی۔ فجزاہ اللہ۔

کمرۂ عدالت میں ایک طرف عدالت کے ممبران بیٹھتے، ان کے میز پر ہی دائیں طرف اسٹینو (زود نویس) بیٹھتا اور اس کے بعد استغاثہ کے سرکاری وغیر سرکاری وکلاء بیٹھتے جبکہ بائیں طرف وکلائے صفائی (Defence counsel) بیٹھتے اور سامنے دیوار کے ساتھ ہمیں (یعنی ملزمان کو) بٹھایا جاتا اور درمیان میں خالی جگہ پر عدالت کے سامنے ایک کرسی دھری ہوتی تھی جس پر بیان دیتے وقت گواہ کو بٹھایا جاتا۔ عدالت کے سامنے ایک دروازہ تھا جو کوریڈور میں کھلتا تھا اس میں فریقین کے تین تین ممبران کو کارروائی سننے کے لئے کرسیوں پر بیٹھنے کی اجازت تھی۔

## عدالتی کارروائی کا آغاز

کمرۂ عدالت میں داخل ہونے پر سب سے پہلے ہماری حاضری لگی۔ اس کے بعد ہمارے وکیل محترم جناب مجیب الرحمٰن صاحب جو آج پہلی مرتبہ تشریف لائے تھے، نے ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو شروع کی اور تان اس بات پر آ کر توڑی کہ جناب آج کارروائی کسی اَور دن تک ملتوی کر دیں۔ کارروائی ملتوی کرانے کے لئے محترم مجیب صاحب نے مختلف قسم کی وجوہات پیش کیں اور Manual of Pakistan Miltary Law کے حوالہ سے یہ بتایا کہ التوا ہمارا حق ہے مگر کرنل صاحب ان کی بات کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے کہا جناب میرا یہ مارشل لاء عدالت کا پہلا مقدمہ نہیں ہے، پچاس مقدمے کر چکا ہوں اور سبھی بڑی فراخ دِلی سے وقت دیتے رہے ہیں۔ پھر آپ نے یہ نکتہ اُٹھایا کہ آج ہمارے دوسرے ساتھی مکرم خواجہ سرفراز احمد صاحب (مرحوم) جو چار ملزمان کے وکیل ہیں، نہیں آسکے۔ اس لئے آج کارروائی بہت مشکل ہے خصوصاً اس لئے بھی کہ خواجہ صاحب Principal accused الیاس منیر

کے بھی وکیل ہیں! لہٰذا مہلت دے دیں لیکن کرنل صاحب نہ مانے بلکہ سخت برہم ہو کر مجھے پوچھنے لگے کہ تمہارا وکیل کیوں نہیں آیا؟ میں نے کہا کہ میری ملاقات 16 فروری کے بعد ایک مرتبہ اپنے ابا جان سے ہوئی تھی جنہیں میں نے صورت حال بتائی تھی۔ اُنہوں نے وکیل کا انتظام بھی کیا مگر یہاں آ کر مجھے پتہ چلا ہے کہ میرے وکیل نے مجھے ساہیوال جیل میں تار بھیج دیا تھا کہ وہ اس تاریخ پر نہیں آسکیں گے، اب اس میں میرا کیا قصور؟ مگر وہ اور بھی زیادہ جوش میں آ کر کہنے لگے نہیں، وکیل کو ہر صورت میں آنا چاہیے! یہ کوئی بات نہیں ہے اور یاد رکھو کہ مجھے اختیار ہے کہ میں ابھی فون کر کے کسی سرکاری وکیل کو بلالوں جو تمہاری وکالت کرے۔ میں نے کہا لیکن مجھے تو اُس پر اعتماد نہیں ہوگا۔ اس موقع پر ہمارے وکلاء نے اس بارہ میں یہ صورت حال بتائی کہ انہوں نے ساہیوال کے وکلاء کرنے کی کوشش کی مگر مولویوں نے انہیں دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ خبردار! جو تم نے احمدیوں کے مقدمہ کی پیروی کی۔ اس پر مجیب صاحب نے پھر مداخلت کر کے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی مگر کرنل صاحب نے اپنی رَٹ جاری رکھی تو مجیب صاحب جلال میں آ گئے۔ اِس صورت حال میں کرنل صاحب نے جھنجلا کر عدالت کو تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر دیا۔ عدالت دوبارہ لگی تو محترم مجیب صاحب نے کوئی دوسرا قانونی نکتہ پیش کر کے التواء کی درخواست کی مگر عدالت نے اسے بھی بڑی درشتی کے ساتھ رد کر دیا۔ اس پر مجیب صاحب نے سرکار کی طرف سے ملنے والی نقول مقدمہ غصہ سے میز پر مارتے ہوئے کہا کہ

’یہ نقول ہمیں ملی ہیں، جنہیں میں عینک لگا کر بھی نہیں پڑھ سکتا!
لہٰذا تیاری ممکن نہیں تھی اس وجہ سے بھی قانوناً اِلتوا کا حق بنتا ہے‘

مجیب صاحب کا اندازِ گفتار دیکھنے اور سننے کے لائق تھا، گویا ایک شیر تھا جو گرج رہا تھا! چنانچہ یہ معرکہ آرا گفتگو حتمی ثابت ہوئی اور اس کے بعد عدالت کو اپنے موقف سے ہٹنا پڑا اور قرار پایا کہ آج صرف رسمی کارروائی ہوگی۔

کارروائی کے آغاز میں سرکاری وکیل نے Opening Address پڑھا۔ ابھی اُس نے عنوان کے بعد دو سطریں ہی پڑھی تھیں کہ یہ الفاظ آ گئے کہ

All the accuseds are Qadianis and the followers of Mirza Ghulam Ahmad...........

اِن الفاظ کا اُس کے منہ سے نکل کر مجیب صاحب کے کانوں سے ٹکرانا تھا کہ مجیب صاحب یکدم جھپٹ کر عدالت سے مخاطب ہوئے اور پورے جلال میں آ کر تقریر کرنی شروع کر دی کہ

’جناب! یہ کیا ہوا؟ مقدمہ 302 کا ہے جو فوجداری مقدمہ ہے، اِس میں قادیانیت کا کیا ذکر؟ یہ کیا مذاق

ہے کہ ملزمان 302 کے ہیں اور ایڈریس میں کہا جاتا ہے مرزا غلام احمد قادیانی فلاں سن میں پیدا ہوئے،

1901ء میں دعویٰ کیا.........‘

غرضیکہ مجیب صاحب چند لمحوں اور ایک ہی سانس میں پتہ نہیں کیا کیا کہہ گئے۔ آپ کے اس انداز بیان نے سارے ماحول پر سناٹا طاری کر دیا۔ ہم دل ہی دل میں خوش ہوئے جا رہے تھے کہ خوب مجیب صاحب! بالکل ٹھیک کیا۔ اس پر سرکاری وکیل نے یہ جواز پیش کیا کہ سر! چونکہ مقدمہ میں 298B بھی ہے اس لئے اس کے حوالہ سے ان کی جماعت کا یہ تعارف اس ایڈریس میں لکھا گیا ہے۔ اس پر مجیب صاحب بولے کہ جناب ملزمان پر لگائی گئی Charge Sheet میں 298B کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا یہ مقدمہ اس دفعہ کے تحت نہیں بلکہ زیر دفعہ 302 چلایا جا رہا ہے۔ اس پر اس نے مزید کہا کہ ہم نے درخواست دی ہوئی ہے کہ 298B بھی لگائی جائے یعنی اذان دینے کی۔ اس پر مجیب صاحب نے کہا کہ جب وہ دفعہ لگے گی تو دیکھی جائے گی۔ اس پر عدالت نے اپنی رولنگ دیتے ہوئے کہا کہ مجیب صاحب کی بات درست ہے، آپ فی الحال اِسے نہ پڑھیں بلکہ اس مضمون کے بعد سے شروع کریں۔ مجیب صاحب نے کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ اس ایڈریس کے 4 صفحات غیر متعلق ہیں، اس لئے انہیں حذف کرنے کا حکم دیا جائے۔ کرنل صاحب نے جواب دیا کہ چونکہ ان کی درخواست DMLA صاحب کے پاس گئی ہوئی ہے، ایک دو روز میں اس کا فیصلہ ہو کر آ جائے گا، اس لئے جب وہ فیصلہ ہو جائے گا تو پھر اس کے مطابق کر لیں گے۔ اس پر مجیب صاحب نے ان چار صفحات کو ایڈریس میں لگا تو رہنے دیا مگر پورے پورے صفحے پر کراس لائن لگا کر اپنا غصہ ٹھنڈا کیا۔

اس معرکہ کی وجہ سے کارروائی کچھ دیر تک تعطل کا شکار رہی اور محترم مجیب الرحمٰن صاحب کی بات تسلیم کئے جانے کے بعد سرکاری وکیل کو بقیہ ایڈریس پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس ایڈریس میں سرتاپا وہی جھوٹ بھرا ہوا تھا جو FIR اور اِستغاثہ کے گواہوں کے بیانات زیر دفعہ 161 میں تھا۔ اس میں کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ وہی رام کہانی تھی کہ اسلام کے یہ ’ٹھیکیدار‘ قادیانیوں کی مسجد میں گئے جہاں اُنہوں نے دیکھا اور سنا کہ اذان دی جا رہی تھی گویا اسلام شدید خطرہ میں تھا اور پھر وہاں ان ’ٹھیکیداروں‘ میں سے دو کو ’جام شہادت‘ نوش کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔

پہلا گواہ

اس ایڈریس کے پیش کئے جانے کے ساتھ ہمارے مقدمہ کی کارروائی باقاعدہ طور پر شروع ہو چکی تھی۔ اگرچہ اُس روز حسب معاہدہ کارروائی اِسی ایڈریس کے پڑھے جانے تک ہی محدود رہی تاہم اِستغاثہ کا ایک ابتدائی گواہ سپاہی جاوید اقبال بھی پیش ہوا جو ساہیوال شہر کے تھانہ A Division میں متعین تھا اور ہماری مسجد احمدیہ بھی اِسی تھانہ کی حدود میں

واقع ہے۔اس کی گواہی اس وجہ سے تھی کہ ایک نعش کو اس کی نگرانی میں مسجد احمدیہ سے ہسپتال بھجوایا گیا تھا اور دوسرے یہ کہ یہی سپاہی مقتولین کے کپڑے ہسپتال سے تھانہ لایا تھا۔علاوہ ازیں تفتیش کے دوران بندوق اور خون وغیرہ کو کیمیکل ٹیسٹ کے لئے اسی کے ہاتھ لاہور بھجوایا گیا تھا۔

ہر گواہ سے گواہی لیتے وقت سب حاضرین عدالت کو چند منٹ کے لئے اپنی اپنی جگہ پر کھڑا ہونا پڑتا تھا کیونکہ اس دوران گواہ سے حلف یا قسم لی جاتی۔حلف کے الفاظ ایک گتے پر خوشخط لکھے ہوئے تھے۔یہ گتہ ہر گواہ کے ہاتھ میں تھما دیا جاتا اور وہ اس سے باآواز بلند ان الفاظ کو پڑھ کر حلف اٹھاتا۔اس کے الفاظ یہ تھے:

''میں..........ولد..........خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر ایمان سے اقرار کرتا ہوں کہ میں جو کچھ بیان کروں گا سچ کہوں گا اور سچ کے علاوہ کچھ نہ کہوں گا۔''

یہ حلف تو اپنی جگہ ہر گواہ اُٹھاتا رہا مگر میں بھی حلفاً کہتا ہوں کہ جتنے گواہ بھی استغاثہ کی طرف سے پیش ہوئے یوں لگا جیسے اُنہوں نے اِس قسم کے الفاظ پر مشتمل حلف اُٹھایا ہوا ہو کہ جو کچھ کہوں گا جھوٹ کہوں گا اور جھوٹ کے سوا کچھ نہ کہوں گا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اِس پہلے گواہ نے بیان دیا کہ ''میں 26 ر اکتوبر تھانہ A ڈویژن میں تھا کہ صبح 6 بجے کے قریب عبداللطیف نے ایک تحریری درخواست پیش کی جس میں اِس واقعہ کا ذکر تھا۔اس پر ایس ایچ او صاحب کے ساتھ میں جائے وقوعہ پر پہنچا جہاں سے مجھے قاری بشیر کی نعش کے ساتھ ہسپتال بھجوا دیا گیا۔میری سپرداری کے دوران نعش کے ساتھ کسی قسم کی کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی گئی۔پھر کپڑے اور نعش سے نکلنے والے چھرّے وغیرہ لے کر تھانہ آیا جہاں انہیں متعلقہ افسران کے سپرد کر دیا۔''

اس بیان کے بعد جب مکرم مجیب الرحمٰن صاحب سے گواہ پر جرح کرنے کے لئے سرکاری وکیل نے کہا تو آپ نے جواب دیا کہ یہ کوئی رسمی گواہی نہیں ہے، اِس کے ساتھ تو بہت سی Recovery بھی ہے یعنی کپڑے وغیرہ اس لئے میں تو آج جرح نہیں کروں گا کیونکہ آج میرے دوسرے ساتھی مکرم خواجہ صاحب بھی نہیں ہیں۔اس پر کرنل صاحب نے مجیب صاحب کا مؤقف تسلیم کیا اور سرکاری وکیل سے مخاطب ہو کر کہا کہ واقعی اس میں تو بہت کچھ ہے، اس لئے اگلی سماعت میں جرح ہوگی۔تاہم گواہی کے بعد مجیب صاحب نے مقتولین کے کپڑوں کو طلب کیا جو ایک گٹھڑی میں بند تھے اور مطالبہ کیا کہ گواہ کپڑے علیحدہ علیحدہ کر کے دکھائے۔چنانچہ اُس نے دونوں مقتولوں کے کپڑے علیحدہ علیحدہ کئے۔اِن سب کو کھول کر عدالت اور وکلاء کو دکھایا اور ہر ایک پر حوالہ کا نمبر لگایا گیا اور اس حوالہ کو ریکارڈ پر بھی لایا گیا۔

جب گواہ کپڑے دکھا رہا تھا تو خون کی وجہ سے سارے کمرے کی فضا متعفن ہوگئی اور خود گواہ بھی ان خون آلود کپڑوں کو احتراز کی حد تک احتیاط سے ہاتھ لگا رہا تھا گویا وہ ڈر رہا تھا۔ گھبرایا ہوا تو وہ صاف نظر آ رہا تھا، اُس کے چہرہ کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا اور درجہ حرارت زیادہ نہ ہونے کے باوجود بھی اُس کے چہرہ پر پسینہ نظر آ رہا تھا گویا چہرہ اُس کے دل کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اسے کپڑوں کو اس طرح بچ بچ کر ہاتھ لگاتے دیکھ کر کرنل نے کہا ڈریں نہیں، یہ پاک خون ہے۔ اس پر مجیب الرحمٰن صاحب نے ایک واقعہ سنایا اور ان کا واقعہ شروع ہونے پر کرنل نے عدالت کے برخاست ہونے کا اعلان کر دیا تا کہ اِس واقعہ کو کارروائی کا حصہ نہ سمجھ لیا جائے۔ مکرم مجیب صاحب نے نپولین کے متعلق بتایا کہ جنگ کے دوران ایک موقع پر اسے سرخ روشنائی کی ضرورت پڑی۔ اس نے اپنے خادم سے روشنائی لانے کو کہا۔ خادم نے تلاش بسیار کے بعد آ کر کہا کہ جناب اس وقت تو ملتی نہیں۔ نپولین نے آگ بگولہ ہو کر کہا کہ مجھے ہر قیمت پر سرخ روشنائی چاہئے خواہ کسی کا خون ہی کیوں نہ ہو۔ وہ باہر نکلا تو وہاں ایک عورت نظر آئی۔ اُس نے اندر آ کر کہا کہ ایک Lady ہے اس کا خون مہیا کر دوں۔ نپولین نے غصہ سے کہا کیا وہ سرخ نہیں ہوگا! جس پر اُس نے اُسی عورت کا خون نپولین کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اِس واقعہ سے دراصل مجیب صاحب نے ان سب پر بہت لطیف مگر گہری چوٹ کی تھی جسے ان میں سے اکثر بشمول فوجی دماغ سمجھ نہ سکے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کو سن کر بلند ہونے والے قہقہے بالکل پھوکے اور بودے تھے۔ اس کے ساتھ ہی آج کی عدالتی کارروائی اختتام پذیر ہوئی اور 7 مارچ تک ملتوی رہی۔

## ملتان میں تیسری پیشی

7 مارچ 1985ء کو عدالت لگی تو ملتان میں ہماری اس تیسری پیشی کے موقع پر محترم مجیب الرحمٰن صاحب کے علاوہ سیالکوٹ سے محترم خواجہ سرفراز احمد صاحب (مرحوم) بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ ہماری پیشی والے دن کینال ریسٹ ہاؤس کے ماحول کا عجیب نظارہ ہوتا۔ ایک پلاٹ میں ہمارے مخالفین 'ٹھیکیداران اسلام' جمع ہوتے۔ اُن میں سے کچھ تو ایک کار میں آتے جن میں پبلک پراسیکیوٹر صاحب شامل ہوتے اور باقی بے چارے پتہ نہیں کس کس طرح سفر کرتے ہوئے پہنچتے۔ اُن کی اکثریت تو ملتان سے ہی ہوتی اور وہ بھی زیادہ تر بڑے بوڑھے ہی ہوتے۔ یہ لوگ چاولوں کا ایک دیگچہ بھی پکا کر لے آتے تھے جو اِن 'پروانوں' کے لئے گویا بمنزلہ 'شمع' ہوتا۔

اُن کے مقابل پر ان سے کہیں زیادہ تعداد میں ہمارے احباب جماعت جمع ہوتے جن میں انصار و خدام اور بچے تک شامل ہوتے۔ ان پر محبت و فدائیت اور وارفتگی کا عجیب عالم طاری ہوتا۔ یہ درویشوں کی طرح کمرۂ عدالت کے

قریب ہی گھر سے لائی ہوئی نائیلون کی صفیں بچھا کر بیٹھے دعائیں کرتے رہتے۔ جب بھی موقع ملتا ایک ایک کر کے ہم سے ملنے چلے آتے اور بعض اوقات تو دیکھا دیکھی ساری رونق ہمارے گرد آ جمع ہوتی۔ یہ سب دوست ایسی جذباتی کیفیت میں ہوتے کہ بس ہمارے لئے بچھے جا رہے ہوتے۔ اللہ ان سب کو اجرِ عظیم سے نوازے، آمین۔

## ہماری پہچان کرنے کا انوکھا انداز

مخالفین کی ایک اور عجیب حرکت کا حال بھی سناتا چلوں اور وہ یہ کہ جیل سے لا کر عدالت کی کارروائی شروع ہونے تک ہمیں کینال ریسٹ ہاؤس کے ایک پلاٹ میں بٹھایا جاتا، اس کے بالکل ساتھ ایک مسجد بنی ہوئی تھی جس کی شمالی دیوار کے ساتھ وضو کا انتظام تھا اور وہ دیوار سیمنٹ کی جالی کی تھی۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ اس دیوار کی دوسری طرف یعنی مسجد کے اندر کچھ لوگ کھڑے ہیں اور مسلسل ہماری طرف دیکھے جا رہے ہیں اور کسی قدر اُن میں حرکت بھی ہوتی ہے۔ گویا یہ لوگ اُس جالی دار دیوار کو کمین گاہ بنا کر اس میں سے ہمیں دیکھ دیکھ کر ہمارے نام اور چہرے یاد کر کے 'پکا' رہے تھے۔ اِس اندازہ کی صحت کا ثبوت یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مقدمہ کے چشم دید گواہان بھی عین اُس وقت مسجد سے نکلتے جب ہمیں عدالت میں بلایا جاتا نیز یہ کہ جب سماعت مقدمہ میں گواہیاں مکمل ہو چکیں تو یہ صورت حال بھی ختم ہو گئی۔ ہم سب ان کی اِس بچگانہ حرکت پر حیران ہوتے کہ اِن لوگوں نے کب سے ہماری پہچان کرنی شروع کی ہوئی ہے مگر انہیں اپنے آپ پر اعتماد ہی نہیں حالانکہ عدالت میں بھی سارا دن یہ لوگ ہمارے سامنے بیٹھے رہتے، ہمارے قریب سے آتے جاتے، ہمیں کمرۂ عدالت میں جاتے ہوئے سامنے کھڑے ہو کر نام بنام ہماری پہچان یاد کرتے اس کے باوجود بھی یہ حرکت کیوں؟ اور اس کی کیا ضرورت؟ دراصل بات یہ ہے کہ جھوٹے کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے اسی لئے وہ اپنی طرف سے احتیاط کا کوئی پہلو اور موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے۔

## نیلے رنگ کا پینٹ

آج 7 مارچ کی پیشی میں سب سے پہلے تو گذشتہ سماعت میں گواہی دینے والے P.W.No. 1 یعنی گواہ استغاثہ نمبر ایک مسمّی جاوید اقبال پر جرح ہوئی۔ اُسے عدالت میں بلایا گیا تو آج بھی کل کی طرح اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا بلکہ کل سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ ہمارا تو خیال تھا کہ اس پر لمبی جرح ہو گی مگر مجیب صاحب تو بالکل ہی خاموش رہے تاہم خواجہ صاحب اُٹھے اور مقتولین کے کپڑوں والی گٹھڑی کمرۂ عدالت میں کھول کر دکھانے کا مطالبہ کیا۔ گواہ نے گٹھڑی کھولی اور دونوں مقتولین کے کپڑے علیحدہ علیحدہ کر کے دکھائے۔ اِس پر خواجہ صاحب نے انہیں اپنے ہاتھوں سے اُٹھایا اور بڑی بے

تکلفی سے کھول کر دیکھا اور اس پر لگے ہوئے نیلے پینٹ کے نشانات کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا کیا یہ واقعی نیلے پینٹ کے نشانات لگے ہوئے ہیں؟ اُس نے اثبات میں جواب دیا اور خواجہ صاحب نے انگریزی میں سٹینو کو جواب املا کروایا:

Yes, blue paint is also stained on the clothes of Qari Bashir.

اور ساتھ ہی گواہ کو فارغ کر دیا۔ اس پر ہم سب حیران ہوئے کہ اتنی جلدی گواہ کو چھوڑ دیا اور دوسرے یہ کہ سوال کیا تھا؟ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ خواجہ صاحب کے اس سوال کی اہمیت یہ تھی کہ قاری بشیر کے کپڑوں پر نیلے Paint کی موجودگی سے صفائی کے موقف کی تائید ہوتی تھی جس کا ذکر FIR میں نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ خواجہ صاحب اس طرح سے یہ بات ریکارڈ پر لے آئے تا کہ سند رہے! اس موقع پر صدر عدالت نے ڈنگ مارنے کی کوشش کی اور بڑے معصومانہ انداز میں کہا کہ یہ پینٹ کے نشان ہیں یا نیلی روشنائی کے!؟ اس پر خواجہ صاحب نے یوں تسلی کرائی کہ جناب! نہیں، یہ پینٹ کے ہی ہیں اور اُسی پینٹ کے ہیں جو اظہر رفیق کے کپڑوں پر بھی لگا ہوا ہے۔ اِس پر کرنل کو خاموش ہونا پڑا۔

مسجد احمدیہ پر گارد

پہلے گواہ پر جرح کے بعد منشی محمد ارشد نے محرر تھانہ A ڈویژن کی حیثیت سے اپنے بیان میں صرف مقدمہ سے متعلقہ اشیاء (بندوق، ریوالور اور چھرے وغیرہ) کی وصولی، حفاظت اور تجربات کے لئے لاہور بھجوانے کا ذکر کیا۔ اس کا بیان کسی قسم کی بنیادی حیثیت کا حامل نہیں تھا بلکہ صرف دفتری کارروائی کے طور پر تھا۔ تاہم محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے جرح کے لئے ایک میدان ڈھونڈ نکالا جس کے حوالہ سے بعض سوالات کر کے عدالت کے ذہن کو اس واقعہ کی اصل وجوہات کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی اور اُس پس منظر کو ریکارڈ پر لے آئے جس میں یہ وقوعہ ہوا۔ چنانچہ آپ نے جو سوالات محرر تھانہ سے کئے اُن کا خلاصہ اور مرکزی نقطہ یہ تھا کہ کیا اُن دنوں بیت الحمد پر کوئی پولیس گارد تھی؟ اگر تھی تو کس مقصد کیلئے تھی، کب سے تھی اور کب تک رہی؟

منشی کے جوابات بڑی بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔ اس نے تسلیم کیا کہ ہاں، بالکل گارد وہاں تھی اور اس واقعہ سے پہلے سے لگی ہوئی تھی اور دسمبر تک جب میں تھانہ A ڈویژن میں رہا، وہاں گارد متعین تھی۔ تاہم اُس نے اُن اسباب سے لاعلمی کا اظہار کیا جن کی بناء پر گارد لگی ہوئی تھی اور اس بات سے بھی کہ آیا وہ گارد مسلح تھی یا غیر مسلح۔ اس کے باوجود اُس کے بیان سے دو مفید باتیں مل گئیں۔ ایک یہ کہ گارد کے علاوہ سول لباس میں بھی پولیس کی نگرانی جاری رہتی اور دوسرے یہ کہ اُس واقعہ کی رات بھی گارد متعین تھی۔ یہ بات وہ باتوں باتوں میں لاشعوری طور پر کہہ گیا۔ اس پر ہمارے ''کرم فرما'' کرسیٔ انصاف پر بیٹھنے کا دعویٰ کرنے والے صدر عدالت لیفٹیننٹ کرنل صاحب نے فوراً گواہ کو

جھنجوڑا ''تم زائد باتیں کیوں کرتے ہو؟ ایسے مت کرو ورنہ مجیب صاحب تمہیں پھنسا لیں گے۔'' چنانچہ اسی ذہنیت نے منشی کے اس فقرہ کو ریکارڈ پر نہیں آنے دیا اس کے بعد تو گواہ کو بار بار Feed کرنا کرنل کا معمول ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یاد رہے کہ یہ وہی کرنل صاحب ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کی قسمیں کھا کر انصاف کرنے کا حلف اٹھایا تھا اور پہلے روز اس بات کا بڑے معصومانہ انداز میں اظہار کیا تھا کہ ''آخر ہم نے بھی خدا کو جان دینی ہے!!''

اس کے بعد قاری منظور احمد مدرس سکول غلہ منڈی ساہیوال کا بیان تھا جس نے قاری بشیر کی نعش شناخت کرنے کی گواہی دی۔ اس پر کوئی جرح نہ ہوئی۔ یہ شخص سخت متعصب اور مخالف تھا اور اس کا متعصبانہ رویہ پہلے دن سے ہی ہمیں نظر آ رہا تھا۔

تیسری گواہی اختر علی علوی (ASI) کی تھی جو بڑی عمر کے تھے اور تھانہ A ڈویژن میں متعین ہونے کی وجہ سے تفتیش کے دوران ہمارے مقدمہ سے متعلق رہے تھے۔ انہوں نے نعشوں کو لانے اور لے جانے نیز کپڑوں اور دیگر اشیاء کی برآمدگی کے بارہ میں گواہی دی اور ان کے بیان کا آخری حصہ مکرم چوہدری اسحٰق صاحب کا ریوالور برآمد کرنے سے متعلق تھا۔ اس سے قبل اِن لوگوں کے جھوٹ بولنے کے سلسلہ میں تفصیل لکھی جا چکی ہے مگر یہاں پھر اس کا تذکرہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ انہوں نے ایسا پکا ارادہ کیا ہوا تھا کہ جان جاتی ہے تو جائے جھوٹ نہیں چھوڑنا۔ چنانچہ علوی صاحب نے بیان دیا کہ 7 نومبر کو چوہدری اسحٰق کو لے کر ہم ان کے گھر گئے حالانکہ چوہدری صاحب کو یہ لوگ ان کے گھر لے کر گئے ہی نہیں تھے۔ چلو مان لیا کہ کارروائی ڈالنے اور اپنے بیان کو مربوط بنانے کے لئے یہ جھوٹ ضروری تھا لیکن کیا یہ جھوٹ بھی ضروری تھا کہ گھر پہنچ کر اسحٰق نے گاڑی سے اُتر کر اپنے گھر کی Bell بجائی! کتنی سچی بات ہے کہ ایک جھوٹ چھپانے کے لئے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں! یہی وجہ تھی کہ میں نے اس وقت خاص طور پر اختر علوی صاحب کے چہرے کی کیفیت نوٹ کی۔ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اُن کی آواز میں کھوکھلا پن تھا، بے یقینی اور عدم اعتماد کی کیفیت تھی۔ اگرچہ یہ الفاظ انہوں نے اپنی طرف سے خاص طور پر زور دیتے ہوئے کہے تھے مگر اس قابل بھی نہ سمجھے گئے کہ اِن پر کوئی جرح ہوتی۔

اس کے بعد سب انسپکٹر CIA سٹاف محمد نعیم اور فراز علی سپاہی کے بیان ہوئے۔ اول الذکر کا بیان چار مفرور ملزمان (مکرم پروفیسر محمد طفیل صاحب، مکرم چوہدری حفیظ الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ، مکرم شاہد نصیر باجوہ صاحب ایڈووکیٹ اور مکرم لطف الرحمٰن صاحب) کی گرفتاری کے سلسلہ میں اس کی کوششوں پر مشتمل تھا جبکہ آخر الذکر نے رانا نعیم الدین صاحب کی بندوق اور اس کے متعلقات کی برآمدگی سے متعلق بیان دیا اور دیگر گواہوں کی طرح جھوٹ کا

سہارا لیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یہ سب کچھ رانا صاحب نے اپنی گرفتاری کے وقت پیش کیا تھا۔ اس کے بیان میں صرف زندہ کارتوسوں کی برآمدگی کے متعلق ہی دو جھوٹ تھے۔ ایک یہ کہ ان کی گرفتاری کے وقت نہ ڈی ایس پی صاحب نے ان زندہ کارتوسوں کا مطالبہ کیا اور نہ ہی رانا صاحب نے پیش کئے تھے بلکہ یہ تو ہمارے تھانہ ملکہ ہانس سے واپسی کے بعد دوسری یا تیسری رات پولیس نے میاں محمد عاشق صاحب جنرل سیکرٹری ساہیوال جماعت سے رانا صاحب کے کوارٹر کی چابی لیکر ضبط کئے تھے۔ دوسرے یہ کہ رانا صاحب کی بیلٹ کارتوسوں سے بھری ہوئی تھی یعنی پورے 25 کارتوس تھے جن میں سے تین تو استعمال ہو چکے تھے اور 22 باقی تھے جو سب کے سب انہوں نے قبضہ میں لے لئے تھے جبکہ گواہ نے بیان دیا کہ صرف چار کارتوس پیش کئے گویا باقی 18 کارتوس پولیس اہلکار جھوٹ بول کر ہضم کر گئے۔

ان ہر دو گواہان پر بھی کوئی جرح نہ ہوئی۔ اب تک استغاثہ کے چھ گواہ ہو چکے تھے جن کی حیثیت محض رسمی محکمانہ کارروائی کی تھی۔ اس کے بعد عدالت نے 13 مارچ تک عدالت کے التواء کا اعلان کیا تو ہم کمرۂ عدالت سے باہر آ گئے جہاں حسبِ معمول بہت سے احباب جماعت حالتِ دعا میں منتظر اور چشم براہ تھے۔ ہم نے ان سے ملاقاتیں کیں اور پھر سرکاری گاڑی کا انتظار کرنے لگے لیکن گاڑی دیر تک نہ آئی۔ اس پر ہمارے دوستوں میں سے کسی نے تجویز دی کہ ہماری گاڑی حاضر ہے۔ اس پر متعلقہ پولیس افسر راضی ہو گئے اور ہم صدر انجمن احمدیہ کی نئی Hiace Toyota ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں بیٹھے اور دوستوں سے الوداع ہو کر آنکھ جھپکنے میں جیل کے سامنے پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی کچھ احبابِ جماعت پہنچے ہوئے ہیں جن کے پاس چند منٹ ٹھہر کر ہم حسبِ معمول جیل میں اپنے ٹھکانہ پر پہنچ گئے۔

## آپ کا کلمہ کیا ہے؟

ہماری پانچویں پیشی مورخہ 13 مارچ 1985ء کو تھی۔ ہم سب ساتھی حسبِ معمول تیار ہو کر صبح آٹھ بجے اپنے وارڈ سے باہر سڑک پر کھڑے تھے۔ زیرِ حراست ہونے کے بعد آج ہی میں نے پہلی مرتبہ اپنی ٹوپی اور بوٹ پہنے تھے کیونکہ اب تک میرے پاس ٹوپی تھی نہ ہی بوٹ، بس اُسی Softy جوتی میں پھرتے تھے جو بوقت گرفتاری پہنی ہوئی تھی۔ چنانچہ مجھے اِس لباس میں دیکھ کر بارک نمبر 10 کے سامنے کھڑے بعض حوالاتیوں نے بلایا جو عدالتوں میں جانے کے لئے تیار ہو کر گیٹ کے سامنے کھڑے گارد کا انتظار کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے پہلا سوال ہی یہ کیا کہ آپ کا کلمہ کیا ہے؟ میری زبان سے بے ساختہ کلمہ طیبہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

کے الفاظ سنے تو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک بولا میں نے کہا نہیں تھا کہ کلمہ تو وہی ہے، لوگوں نے ایسے ہی

ان کے خلاف پروپیگنڈہ کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد پوچھنے لگے آپ میں اور ہم میں فرق کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ دراصل صرف امام مہدی علیہ السلام کے قبول کر لینے کا فرق ہے۔ اس پر ان میں سے ایک صاحب جو باتوں سے شیعہ لگتے تھے کہنے لگے کہ ہر امام کو ایک علم دیا جاتا ہے۔ آپ کے مرزا صاحب کو جو علم دیا گیا ہے وہ کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ آپ کا علم آپ کی 85 کے قریب کتب میں بھرا پڑا ہے۔ اس کے بعد چند باتیں مزید ہوئیں پھر میں ان سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔ اس کے بعد ان سے آخر تک رابطہ رہا۔ وہ بڑے احترام اور خلوص سے پیش آتے اور کئی بار وہ اپنی بارک سے باہر نکلے ہوتے تو ہمیں ملنے کوارٹین میں بھی آ جاتے۔

ہم اُس روز عدالت میں پیش ہونے کے لئے 9 بجے کے قریب گارد کی حراست میں روانہ ہوئے۔ گاڑی ہمیں ائرپورٹ اور ملتان صدر کی سیر کراتی ہوئی یعنی مختلف جگہوں پر حوالاتیوں کو اُتارتی ہوئی کینال ریسٹ ہاؤس چھوڑ گئی۔ ہم معمول کے مطابق سوا نو بجے کینال ریسٹ ہاؤس کے گراسی پلاٹ میں آ بیٹھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے کی دیر تھی کہ اِدھر اُدھر سے ہمارے دوست احباب آنے شروع ہو گئے۔ ہمارے گارد انچارج ہمیشہ ہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے بڑے اچھے ہوتے اور ہمیں دوستوں سے ملاقات کا خوب موقع دیتے رہتے بلکہ بعض اوقات ہمیں خود اپنے ملاقاتیوں سے کہنا پڑتا کہ اب آپ جائیں تا کہ پولیس پر حرف نہ آئے۔ جب کبھی ہمیں کہنا یاد نہ رہتا تو اِستغاثہ والے انچارج گارد کو بلا کر کہہ دیتے لیکن شاذ ہی کوئی واقعہ ہوا ہوگا جبکہ گارد والوں نے اس معاملہ میں تنگ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہو، اللہ انہیں اس کا اجر دے، آمین۔

اُس روز ہمیں خاصا اِنتظار کرنا پڑا کیونکہ قریباً ساڑھے گیارہ بجے فوجی جیپ آئی جس کے سامنے والے Hood پر سرخ رنگ کا 'مارشل لاء ڈیوٹی' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ آدھ پون گھنٹے بعد نائب کورٹ نے ہمیں اندر آ جانے کا اِشارہ کیا جس پر ہم پیش ہو گئے۔

آج صرف ایک ہی گواہ کا بیان ہونا تھا جیسا کہ گذشتہ سماعت (7 مارچ) پر طے ہو گیا تھا۔ چنانچہ اِسی پروگرام کے مطابق آج خواجہ سرفراز صاحب نہیں آئے تھے اور مجیب الرحمٰن صاحب نے ہی سب کام چلایا۔ یہ اِستغاثہ کے عمومی گواہوں میں سے آخری گواہ تھا۔ اس کے بعد اہم اور نازک نوعیت کے گواہوں کی باری تھی۔ اِستغاثہ کے اس ساتویں گواہ کا نام نصر اللہ تھا جو دوسہرہ گراؤنڈ (عقب GTS اڈہ ساہیوال) کا ساکن اور گورنمنٹ پولی ٹیکنیک کالج ساہیوال میں انسٹرکٹر تھا۔ اس گواہ نے جو اُستاد کم اور ایک پیشہ ور سیاسی لیڈر زیادہ لگتا تھا، صرف یہی گواہی دی کہ اس نے اظہر رفیق کی نعش کو 26 اکتوبر کو دن کے گیارہ بجے پوسٹ مارٹم سے قبل ہسپتال میں شناخت کیا اور بتایا کہ متوفّی ہمارے کالج

کا طالب علم تھا۔ اس گواہ کا بیان کوئی زیادہ اہم تھا اور نہ ہی طویل مگر اس کی شخصیت اِس مقدمہ کے لئے بہت اہم تھی اور اس حد تک اہم کہ جائے وقوعہ پر بوقت وقوعہ اس شخص کے خود موجود اور روغن بردار مجاہدین میں شامل ہونے کے بھی قوی امکانات تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے اس پر سوالات کرنے شروع کئے کہ تمہارے گھر کا بیت الحمد (جائے وقوعہ) سے کتنا فاصلہ ہے، پولی ٹیکنیک کتنی دور ہے، وہاں سے جامعہ رشیدیہ کا کتنا فاصلہ ہے، نقشہ میں یہ شہر کے کس طرف واقعہ ہیں، وغیرہ۔ مطلب یہ تھا کہ تمہیں اتنی جلدی اس واقعہ کا کس طرح پتہ چل گیا اور تم فوراً ہی جائے وقوعہ پر پہنچ گئے، ہو نہ ہو تم خود ان رنگ و روغن بردار ''مجاہدین'' میں شامل تھے۔ چنانچہ ایسے سوالات پر استغاثہ کے وکلاء کو خطرہ محسوس ہؤا اور انہوں نے اعتراض کر دیا کہ یہ بے تعلق سوال ہیں۔ اس پر مجیب صاحب نے دندان شکن جواب دیا اور ان سوالات کی اہمیت بتائی کہ عین ممکن ہے کہ یہ گواہ اُن حملہ آوروں میں بھی شامل ہو جنہوں نے مسجد سے کلمہ مٹایا۔ اس سچی بات پر ایک طرف تو ممبران استغاثہ کو سانپ سونگھ گیا اور دوسری طرف کرنل صاحب کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ یہ سوالات متعلقہ ہی ہیں۔

## صدرِ عدالت کی کھلی جانبداری

فوجی عدالت کے صدر اور انصاف کا دعویٰ کرنے والے کرنل صاحب نے اس گواہ کو بھی دورانِ جرح Feed کرنا شروع کر دیا چنانچہ سب کے سامنے اپنی طاقت کا شرمناک حد تک استعمال کرتے ہوئے پہلے گواہ کی طرح اُسے بھی کہا:

''دیکھو جس سوال کا جواب مشکل ہو اس کے متعلق کہہ دو کہ پتہ نہیں اور زائد باتیں بھی نہ بتاؤ ورنہ مجیب صاحب تمہیں پھنسالیں گے۔''

جس عدالت کا صدر اس قسم کی باتیں کرے اور گواہ کی اس طرح راہنمائی کرے اس سے اِنصاف کی کیا توقع ہو سکتی ہے اور وہ انصاف کا خون نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ اس گواہ پر جرح کے دوران ایک موقع پر تو کرنل صاحب نے انتہا کر دی۔ انہوں نے گواہ کے منہ میں جواب ڈالا اور اسے ریکارڈ پر بھی لائے۔ سوال یہ تھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پولیس جب جائے واردات پر پہنچی تو اُس وقت نعشوں کی تصاویر اُتاری گئی تھیں۔ اس نے جواب دیا کہ اسے معلوم نہیں۔ کیوں معلوم نہیں؟ یہ سوال ابھی کیا ہی جا رہا تھا کہ کرنل صاحب نے ایک مرتبہ پھر بڑی ڈھٹائی سے اُسے لقمہ دیا:

'کہہ دو کہ چونکہ بہت زیادہ رش تھا اس لئے مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ تصاویر اُتاری گئی ہیں یا نہیں'

اندھے کو کیا چاہئے، دو آنکھیں! چنانچہ اس نے فوراً اس فقرہ کو اُچک کر دُہرا دیا اور سٹینو نے اسے یوں ریکارڈ پر محفوظ کر دیا:

I do not know whether the police took photographs of place of occurance as lot of people had gathered arround and it was not possible to see everything.

یہ الفاظ گواہ کے نہیں بلکہ انصاف کرنے کی قسمیں کھانے والے اور اپنی جان خدا کو دینے کا دعویٰ کرنے والے ملٹری کورٹ کے صدر لیفٹیننٹ کرنل منیر الرحمٰن کے ہیں۔ جب کسی کمزور سے کمزور شخص کو بھی ذرا حوصلہ دلایا جائے تو وہ شیر ہو جاتا ہے اور جب کسی مقدمہ میں صدرِ عدالت گواہ کی حوصلہ افزائی ہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر راہنمائی بھی کر رہا ہو تو گواہ خود ہی ایک کی بجائے دس دس جھوٹ بولے گا چنانچہ ہمارے مقدمہ میں ایسا ہی ہوا۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے یہ گواہ وقوعہ کے روز چھ بجے صبح بیت الحمد آیا، نہ ہی پولیس کے ساتھ وہاں رہا اور نہ ہی وہاں ہجوم تھا۔ صرف چند ایک احبابِ جماعت وہاں موجود تھے اور یہ تو میرے سامنے کی بات ہے جب اپنے حاجی حمید احمد صاحب (مرحوم) فوٹو گرافر نے مقتول اظہر رفیق کی زمین پر پڑی نعش کی تصاویر اُتاریں۔ اُس وقت تھانیدار قاضی ایاز نے مجھے کہا تھا کہ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ کہیں تمہاری ٹانگیں تصویر میں نہ آ جائیں۔

علاوہ ازیں اُس وقت تو رش کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ ڈر کے مارے کوئی شخص مسجد کے باہر والے دروازے کے بھی قریب نہ آ رہا تھا۔ مسجد کی شمالی دیوار کے ساتھ درختوں کے نیچے عام طور پر بیسیوں آدمی (مسجد کے بالمقابل واقع مشن ہسپتال میں داخل مریضوں کے لواحقین) ڈیرے ڈالے رہتے مگر اُس روز فجر کے وقت (یعنی وقوعہ کے فوراً بعد) سے ہی یہ ساری جگہ خالی پڑی تھی۔ لوگ سخت وحشت زدہ تھے اور کچھ تو اپنی چارپائیاں بھی اُٹھا کر لے گئے تھے۔ رش کس طرح ہو گیا اور وہ بھی مسجد کے اندر!

اِس گواہ نے جرح کے دوران اور بھی کئی بے جوڑ باتیں کہیں جنہیں ہمارے وکلاء ریکارڈ پر لاتے رہے کیونکہ اُن باتوں سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ گواہ صرف شناخت نعش کا گواہ نہیں ہے بلکہ موقع پر بھی موجود تھا اور اُس گروپ میں شامل تھا جو کلمہ طیبہ مٹانے آیا تھا۔ لیکن وائے افسوس! جہاں ایک منصوبہ کے مطابق سراسر جھوٹی FIR کاٹی گئی ہو اور یہ فیصلہ ہو چکا ہو کہ اسی کے مطابق تفتیش کی جائے گی اور تفتیش میں صرف اِسی جھوٹی FIR کو سچا ثابت کر کے تمام ملزمان کا چالان کیا جائے گا اور پھر صرف اُسی کو مدنظر رکھ کر مقدمہ چلایا جائے گا، وہاں ایسی باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

اِسی گواہ نے دورانِ جرح اپنے ایک ساتھی اعجاز محمود کا بھی ذکر کیا جو پولی ٹیکنیک کے ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ تھا کہ اُس نے سائیکل پر آ کر اسے واقعہ کی اطلاع دی تھی اور پھر اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر دونوں جائے وقوعہ پر آئے۔ عجیب بات ہے کہ مدعی ابھی کہیں گیا نہیں، وہ تھانہ کے قرب میں ہائی سٹریٹ پر واقع ایک مسجد میں بیٹھ کر درخواست لکھتا ہے اور سیدھا تھانہ جا کر مقدمہ رجسٹرڈ کراتا ہے، اُدھر اُس کے بقیہ ساتھی یعنی چشم دید گواہ موقع سے ہی نہیں ہلتے اور مقدمہ درج ہونے کے بعد مدعی اِنسپکٹر پولیس کو لے کر واپس جائے وقوعہ پر آ جاتا ہے۔ اِس دوران میں مسجد احمدیہ سے سات

آٹھ کلومیٹر دور پولی ٹیکنیک کی کالونی میں رہنے والے اعجاز محمود کو خدا معلوم کس طرح اس واقعہ کی اطلاع ہوگئی؟ پھر ابھی تک تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ کون کون مرا کون کون بچا! اعجاز محمود کو آخر کس طرح پتہ چل گیا کہ تمہارے کالج کا طالب علم مر گیا ہے کلمہ مٹاتے ہوئے اور پھر وہ فوراً ہی اپنے استاد نصر اللہ کے گھر بھی پہنچ جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں کہانی کے جھوٹا اور خود ساختہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ آج صبح عدالت لگنے سے قبل اس گواہ کا یہ ساتھی اعجاز محمود ادھر ہی موجود تھا مگر گواہی کے وقت جب اُسے طلب کیا گیا تو اس کو غائب کر دیا گیا تا کہ ایسی کسی صورت میں اُسے عدالت میں پیش ہی نہ کیا جا سکے جب کہ اُسے علم نہ ہو کہ اُس کے ساتھی گواہ نے کیا بیان دیا، اُس پر کس قسم کے سوالات ہوئے اور اُن کے اُس نے کیا جوابات دیئے۔ چنانچہ مجیب صاحب نے عدالت کے سامنے بڑے درد کے ساتھ یہ اظہار کیا کہ یہ مجھے پہلے بتاتے بھی نہیں کہ گواہ کا Couple کونسا ہے اور پھر طلب کرنے پر اُسے پیش بھی نہیں کرتے مگر صدرِ عدالت کرنل نے مجیب صاحب کی اِن باتوں کو بھی درخورِ اعتناء نہ سمجھا کیونکہ یہ اس کے مشن کے خلاف تھیں۔

## جامعہ رشیدیہ اور پولی ٹیکنیکل کی ملی بھگت

پولی ٹیکنیک کا مذکورہ بالا نصر اللہ نامی اُستاد بطور گواہ پیش ہوا تو اس نے اپنے بیان میں بعض اور بھی ایسی باتیں کہیں جن سے صاف ثابت ہوتا تھا کہ جامعہ رشیدیہ والوں نے پولی ٹیکنیک کالج کے طلبہ کو اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا۔ یہ اُن کے ساتھ مل کر احمدیوں کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف رہتا گویا صرف طلبہ ہی نہیں بلکہ اس 'سرکاری ادارہ' کا سٹاف بھی اس میں ملوث تھا کیونکہ اس کے ہی ایماء پر طلبہ ایسی سرگرمیوں میں شامل ہوتے اور اِس واقعہ میں بھی جامعہ رشیدیہ کے طلباء کے دوش بدوش پولی ٹیکنیکل کالج کے طلبہ نے بھرپور کردار ادا کیا۔

اِس امر کی تصدیق اُس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جس کا ذکر کتاب کے شروع میں ہے کہ 22 ستمبر 1984ء کی رات ہمیں اطلاع ملی تھی کہ جامعہ رشیدیہ والے مسجد سے کلمہ طیبہ مٹانے آ رہے تھے۔ اس پر امیر صاحب نے اِنتظامیہ سے رابطہ کیا تو SP صاحب کے حکم سے پولیس کی بھاری جمعیت مسجد میں پہنچ گئی تھی۔ اُس رات جامعہ رشیدیہ والوں نے مسجد پر حملہ کا پروگرام ترک کر دیا۔ دو تین روز بعد کسی کی جامعہ رشیدیہ کے ناظم مولوی حبیب اللہ سے اس موضوع پر بات ہوئی تو اس نے طنزیہ طور پر ہنس کر جواب دیا کہ یہ (احمدی) بھی ایسے ہی ہیں کل پرسوں کہیں پولی ٹیکنیکل کالج کے لڑکوں نے کہا کہ آج رات ہم کلمہ مٹانے جائیں گے تو ان کو مصیبت پڑ گئی اور پولیس بھاری تعداد میں آ گئی۔ اس اطلاع کو بھی اس سارے واقعہ کے ساتھ ملا لیا جائے تو بات سمجھنی مشکل نہیں رہتی کہ اس کالج کے طلباء کا کیا کردار تھا۔ انہوں نے جامعہ رشیدیہ کا برابر کا ساتھ دیا تو ان کو سزا بھی برابر کی مل گئی یعنی ایک جامعہ کا اور ایک کالج کا 'مجاہد' تقدیر الٰہی کا نشانہ بنا۔

اس گواہ کے بیان کے بعد اِستغاثہ والوں نے کوشش کی کہ ایک دو اور گواہ بھگت جائیں مگر مجیب صاحب نے انکار کیا اور پورے زور سے انکار کیا جس کے سامنے عدالت کو بھی جھکنا پڑا اور کورٹ کی کارروائی 16 مارچ تک کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ اب تک جتنے گواہ بھی ہوئے تھے، اُن میں سے پہلے گواہ کی حالت بوقت بیان قابل دید تھی یا پھر اس ساتویں گواہ کی۔ درمیان والے گواہوں کی گواہیاں اس نوعیت کی تھیں ہی نہیں کہ انہیں کوئی پریشانی ہوتی۔ گو بیان کی حد تک تو یہ گواہ بھی ان جیسا ہی تھا مگر مجیب صاحب کی جرح نے اسے اچھا خاصا پریشان کر دیا۔ یعنی گواہی تو صرف نعش کو شناخت کرنے کی دینے آیا تھا مگر مجیب صاحب نے اسے اس گروپ کا ممبر ثابت کرنا شروع کر دیا جس نے مسجد احمدیہ ساہیوال پر 26 اکتوبر کو شب خون مارا تھا۔ حقیقت تھی بھی یہی، اس لئے لازم تھا کہ ہم اس کی پریشانی دیکھتے۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا اور ہر کسی نے محسوس کیا کہ اسے مجیب صاحب کے سوالات کے جوابات دینے کتنے مشکل ہو گئے تھے۔ گواہ کی اس کیفیت کو بھی نوٹ کرنا عدالت کا فرض تھا مگر وہ تو اسے دِلاسا دیتی رہی۔

اُس دن ہم عدالت سے جلدی فارغ ہو گئے تھے چنانچہ باہر آ کر حسب معمول اپنے لئے بیقرار احباب سے ملاقات ہوئی۔ پھر پولیس کی گاڑی آ گئی اور ہم جیل واپس آ گئے۔ اب ہمارے مقدمہ کی کارروائی اہم اور بنیادی مرحلہ میں داخل ہونے والی تھی۔ اب تک پیش ہونے والے معمولی نوعیت کے گواہ تھے اور بنیادی اہمیت کے حامل گواہوں کی اب باری تھی۔

## اِستغاثہ اور عدالت کی شکایات

ایک روز سماعت کے آخر پر صدر عدالت نے وکلائے صفائی سے مخاطب ہو کر شکوہ کیا کہ اِستغاثہ کے ایک گواہ نے بتایا ہے کہ اُس پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ بیٹھ جائے، یہ بات ہرگز نہیں ہونی چاہئے۔ دوسرے یہ کہ اسے معلوم ہوا ہے کہ ملزمان کی ہتھکڑیوں کے ساتھ تصاویر لی جا رہی ہیں، یہ امر جیل قوانین کے خلاف ہے۔ یاد رکھئے کہ اگر یہ تصاویر شائع کی گئیں تو میں اِسے توہین عدالت قرار دے کر مقدمہ دائر کروں گا۔ تیسری بات اُس نے یہ کہی کہ آپ کے بعض احمدی فوجی افسران جو میرے ساتھی ہونے کے لحاظ میرے دوست بھی ہیں، میرے پاس آ آ کر مقدمہ کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں اور اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوگا اس لئے انہیں منع کر دیں۔

ہمارے وکلاء نے ان کی پہلی بات کو پورے زور کے ساتھ رد کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ ہمارا طریق ہے اور نہ ہی ہم نے ایسا کیا ہے۔ جہاں تک دوسری باتوں کا تعلق ہے تو ان کے بارہ میں پتہ کیا جائے گا اور اگر کسی موقع پر ایسا ہوا ہو تو

آئندہ پوری احتیاط کی جائے گی۔ ہمارے جونیئر وکلاء یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ مکرم خواجہ سرفراز صاحب بڑے جوش سے اُٹھے اور جیب سے جہازی سائز کا ایک اِشتہار نکال کر عدالت کے سامنے رکھتے ہوئے بڑے زوردار انداز میں عدالت کو جھنجوڑا کہ آپ کی یہ باتیں تو رہیں ایک طرف، ذرا یہ بتایئے کہ جب مقدمہ اِس معزز عدالت میں زیر سماعت ہے تو اِس قسم کے اِشتہار شائع کرنا توہین عدالت نہیں تو اور کیا ہے!؟ یہ اشتہار نام نہاد مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کی طرف سے تھا اور اس میں کھلے لفظوں میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس مقدمہ کے ملزمان کو فوری طور سرعام پھانسی دی جائے۔ اپنے دعویٰ کے جواب میں مکرم خواجہ صاحب کے اس ٹھوس ثبوت والے بھرپور جوابی حملہ سے کرنل تو گویا بوکھلا ہی گیا اور حیران ہو کر اس اشتہار کی تحریر پڑھنے لگ گیا۔ پڑھتے پڑھتے کھسیانہ سا ہو کر کہنے لگا 'لیکن اس میں ملزمان کا کہاں ذکر ہے؟' اس پر محترم خواجہ صاحب نے معیّن الفاظ پر اُنگلی رکھی تو کہنے لگا 'اچھا بلاؤ Complainent عبداللطیف کو'۔ جب وہ عدالت میں لایا گیا تو اُس کے ساتھ بڑی شفقت سے بولا کہ 'مجھے معلوم ہے یہ تمہارے اِختیار میں تو نہیں کہ اِس قسم کے اشتہار شائع ہونے سے روکو' اُس نے کہا بالکل سر! یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اس پر کرنل نے سرسری سی بات کر کے کہ آئندہ اس قسم کے اشتہار شائع نہیں ہونے چاہئیں، بات گول کر دی۔

اِس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ واقعہ 17 مارچ کی پیشی کے روز جرح کے دوران ہوا جب محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے مدعی عبداللطیف سے سوال کیا کہ کیا تمہیں پتہ ہے کہ عدالت نے اس مقدمہ کے سلسلہ میں ہر قسم کی اشتہار بازی سے منع کیا تھا؟ پھر اُس سے ملتان کے حضوری باغ، سلطان احمد روڈ، مدرسہ قاسم العلوم، مسجد کینٹ جانے سے متعلق پوچھا جس کا اُس نے اِنکار کیا۔ پھر اُسے اِن مقامات کی تصاویر دکھائیں جن میں اِس مقدمہ کے متعلق پوسٹر لگے ہوئے موجود تھے۔ کہنے لگا کہ میں نے ایسے پوسٹر کہیں لگے ہوئے نہیں دیکھے۔ اس کے بعد محترم مجیب صاحب اراکینِ عدالت کی طرف پلٹے اور اُنہیں یہ تصاویر دکھاتے ہوئے کہنے لگے کہ

'سر! آپ کی واضح ہدایت کے باوجود مبینہ ملزمان کے خلاف ایسے اِشتہارات کا سلسلہ

ابھی تک جاری ہے جن میں عوام کے جذبات کو بھڑکایا جا رہا ہے، یہ کیا مذاق ہے؟'

تصاویر دیکھ کر کرنل سے اور تو کچھ بن نہ پڑا سوائے یہ کہنے کے کہ 'اِس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اشتہار اُس دِن کے بعد لگائے گئے؟ محترم مجیب صاحب بڑے اِعتماد کے ساتھ بولے 'اس کا ثبوت بھی اسی میں موجود ہے'۔ آپ نے پوچھا، کیا ان تصاویر میں جنگ اَخبار نظر آ رہا ہے؟ ذرا اس کی تاریخ پر نظر ڈال لیں، آپ کو سوال کا جواب ہی نہیں، ناقابل تردید ثبوت بھی مل جائے گا۔ اس پر پہلے سے بوکھلائے ہوئے ممبرانِ عدالت و اِستغاثہ اور بھی بوکھلا گئے، کھسیانی بلی کھمبا

نوچے۔ اب ممبرانِ عدالت کو یہ اعتراض سوجھا کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اشتہار دفتر نام نہاد مجلس ختم نبوت کے دروازہ اور ملتان کی ہی دوسری جگہوں پر لگے ہوئے ہیں۔ مجیب صاحب نے فوراً جواب دیا ''جناب! گاڑی حاضر ہے، ابھی چلتے ہیں، ملتان شہر کے اندر اور آپ خود ان تصاویر والی جگہوں کو دیکھ لیں، اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے''۔ اس پر فوجی ممبران عدالت شرمندہ ہو کر ہنس دیئے اور کہنے لگے چھوڑو اِن باتوں کو۔ یہ تھی ان کی 'انصاف پسندی' کہ جب ہمارے خلاف کسی بات کا ذکر ہوتا تو کرنل صاحب پورے زور اور غصہ سے کارروائی کرتے مگر جب استغاثہ کی ایسی حرکات کا تذکرہ ہوتا تو آرام سے بات ٹال جاتے۔

## ڈاکٹر گلزار صاحب کی سچی گواہی

16 مارچ 1985ء کو عدالت لگی تو PW No. 8 کی حیثیت سے DHQ-Hospital ساہیوال کے ڈاکٹر گلزار احمد صاحب ڈوگر کو طلب کیا گیا۔ جنہوں نے کلمہ طیبہ مٹانے والے 'مجاہدین' میں سے ہلاک ہونے والوں کی نعشوں کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ انتہائی شریف اور سادہ لوح ڈاکٹر گلزار اپنی دھن میں مست رہنے والے ایسے لوگوں میں سے تھے جنہیں صرف اپنے Profession سے سروکار ہوتا ہے اور بس! جو اپنے فرض کی خاطر کسی بات کی پرواہ نہیں کیا کرتے اور اپنا نقصان کر کے بھی اپنا فرض ادا کیا کرتے ہیں۔ اپنی انہی خوبیوں کے باعث ڈاکٹر صاحب موصوف ہمارے لئے غیبی نصرت ثابت ہوئے کیونکہ انہوں نے وقوعہ کے روز کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس نازک اور خطرناک وقت میں نہ صرف صحیح طور پر پوسٹ مارٹم کیا بلکہ اس کی رپورٹ بھی حقائق کے مطابق تیار کی اور کسی کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ الحمدللہ، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ سنا تھا کہ پوسٹ مارٹم کے دوران کسی سرکاری افسر نے پوسٹ مارٹم روم میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کے اعلیٰ اور اہم عہدہ کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے اسے بے ساختہ حکم دیا Get out۔ اس طرح سے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ان ظالموں کی دست برد سے کلی طور پر محفوظ رہی، الحمدللہ۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے کسی نے کہہ رکھا ہے: ابھی کچھ لوگ ہیں باقی جہاں میں۔

جب ڈاکٹر صاحب گواہی کے لئے عدالت میں پیش ہوئے تو ہم نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا۔ موصوف اپنے لباس اور حرکات وسکنات سے مست قسم کے انسان دکھائی دیئے مگر اپنے پیشہ سے متعلق بات کرتے ہوئے آپ نے پوری قابلیت اور اہلیت کا ثبوت دے کر اس تاثر کو غلط ثابت کر دیا۔ گواہی شروع ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب نے اپنے تھیلے میں سے مختلف قسم کے کاغذات کا پلندہ نکالا اور ان میں سے پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑھنا شروع کر دی جو انہوں نے تھانہ بھجوائی تھی۔ جب یہ ساری رپورٹ عدالت کے ریکارڈ پر آچکی تو جرح کے لئے صفائی کے وکیلوں کو موقع دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر صاحب کے ذریعہ بالکل ٹھیک پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار کروادی ہوئی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ ان پر کوئی خاص جرح نہیں کی جاتی تھی۔ تاہم محترم مجیب صاحب نے اس امر کو ریکارڈ پر لانے کے لئے پوچھا کہ بعض حقائق آپ کو خاص طور پر مہیا کئے گئے تبھی تو آپ نے ان کو بالکل معین اور معمولی سے بھی فرق کے بغیر من وعن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں درج کیا، مثلاً موت زخم لگنے کے کتنی دیر بعد واقع ہوئی اور جب پوسٹ مارٹم ہوا تو اس وقت تک کتنا وقت گزر چکا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تسلیم کیا ہے کہ انہیں موت واقع ہونے کے وقت کے متعلق معلومات مہیا کی گئیں۔ ان سوالات کا مقصد یہ تھا کہ ریکارڈ پر یہ امر آجائے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹوں کی تیاری میں مدعی پارٹی نے دست درازی کی کوشش تو کی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی پیشہ وارانہ دیانتداری اور اس کے تقدس کو پامال نہ ہونے دیا۔

ایک امر بڑا دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ استغاثہ والوں کو اُمید تھی بلکہ ان کی کوشش تھی کہ صفائی کے وکلاء ڈاکٹر صاحب سے سوال کرتے کہ FIR اور گواہان کے بیانوں میں اظہر رفیق پر ریوالور کے فائر کا ذکر ہے جبکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق تو اس کے سر سے چھرّے نکلے۔ استغاثہ کا خیال تھا کہ جونہی وکلائے صفائی کی طرف سے اس بارہ میں سوال ہو گا، ڈاکٹر صاحب یہ جواب دے دیں گے کہ ممکن ہے ریوالور کی گولیاں جسم میں داخل ہو کر دوسری طرف سے نکل گئی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فراست سے ہمارے وکلاء نے استغاثہ کی اس سازش کو پہلے سے بھانپ لیا تھا چنانچہ انہوں نے یہ سوال کرنے کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور یہ سوال کرنے کا خیال عدالت کو بھی نہ آیا ورنہ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ عدالت نے جب دیکھا کہ جرح کے دوران گواہ اس قسم کے جواب نہیں دے سکا جو استغاثہ کے مفید مطلب ہوں تو عدالت نے آخر میں ایسے نکات کو اجاگر کرنے کے لئے سراسر جانبدارانہ سوالات کئے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ہمارے وکلاء کو بھی ایسی فہم و فراست عطا فرمائی تھی کہ وہ ہر ایسے موقع پر غیر معمولی دلیری کے ساتھ فوری اقدام کر کے ایسی مذموم کوششوں کو خاک میں ملاتے رہے۔ الحمدللہ۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کی ایک بات کو طبی نقطہ نگاہ سے محترم مجیب صاحب نے رد کیا اور وہ یہ تھی کہ دونوں اموات کے واقع ہونے کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہوا تھا کہ یہ دونوں At once یعنی فوری طور پر ہوئیں۔ یہ تو میرے بھی مشاہدہ میں ہے کہ اظہر رفیق کی موت تو واقعی فوری واقع ہوئی تھی مگر قاری بشیر کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے 10-15 منٹ کراہتے اور ٹانگیں سکیڑتے تو کبھی پھیلاتے دیکھا تھا۔ اُس کی موت کس طرح At once ہو سکتی تھی۔ چنانچہ مجیب صاحب نے نکتہ اٹھایا کہ آپ نے قاری بشیر کے دل کو خون سے خالی لکھا ہے اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے

کہ زخمی ہونے کے بعد دل Pump کرتا رہا ہو اور جب دل Pump کرتا رہا ہے تو موت فوری طور پر واقع نہیں ہو سکتی۔
یہ بات دراصل FIR اور گواہوں کے بیانات کو رد کرتی ہے جو کہتے ہیں کہ اسی وقت دونوں گرے اور مر گئے۔ اس نکتہ کو ریکارڈ پر لانے کے ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب کا بیان ختم ہوا۔ جتنی دیر ڈاکٹر صاحب کمرۂ عدالت میں موجود رہے، خوب رونق رہی کیونکہ ڈاکٹر صاحب ہر بات اپنے مخصوص انداز سے کرتے جو سب کے لئے محظوظ ہونے کے سامان کرتی۔ میرا خیال ہے سب سے زیادہ صحیح اور سچا بیان صرف اور صرف ڈاکٹر صاحب کا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

## جائے وقوعہ کا نقشہ

ڈاکٹر صاحب کے بعد دوسری گواہی ڈرافٹس مین فاروق احمد بھٹی کی تھی جس نے جائے وقوعہ کا نقشہ بنایا تھا۔ یہ نقشہ 1:32 (ایک انچ برابر 32 فٹ) کی سکیل پر 28/اکتوبر 1984ء کو بنایا گیا تھا تاہم اس کے نوٹس وقوعہ کے روز 26/اکتوبر کو ہی لے لئے گئے تھے۔ اس کے بیان پر محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے خواجہ سرفراز صاحب کے مشورہ سے صرف ایک ہی سوال کیا جس کے جواب میں گواہ نے کہا کہ اُس نے یہ نقشہ چشم دید گواہان کی موجودگی میں تیار کیا اور تمام اُمور کی گواہان مذکورہ نے ہی نشاندہی کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی گواہی ختم ہوئی۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے چائے کا وقفہ کر لیا جائے پھر دو چشم دید گواہوں کے آج صرف بیان ہو جائیں اور جرح ان پر کل ہو جائے گی۔ ہمارے وکلاء حضرات بھی دو دن کے پروگرام پر آئے ہوئے تھے چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق وقفہ ہو گیا اور ہم کمرۂ عدالت سے باہر آ کر کیکر کی چھاؤں میں اُسی جگہ آ بیٹھے جہاں روز بیٹھتے تھے۔ یہاں ہمارے لئے ٹھنڈے مشروبات اور چائے بسکٹ وغیرہ مہیا کئے گئے مگر ہمیں اِن مادی اشیاء سے کہیں زیادہ اپنے دوست احباب کے خلوص کا لطف آیا جو بڑے ہی اخلاص اور فدائیت کے ساتھ ہماری خدمت کر رہے تھے، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

# چشم دِید گواہوں کی باری

عمومی گواہوں کی گواہیاں ہو چکیں تو مقدمہ کے اصل یعنی چشم دِید گواہوں کی باری آئی۔ FIR کے مطابق ہمارے اِس مقدمہ کے چشم دِید گواہ چار تھے مگر عدالت میں صرف دو گواہوں کو پیش کیا گیا۔ اس کی وجہ کیا تھی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے مگر اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اُس مقدمہ کی اصلیت کیا ہو گی جس کے دو گواہ عدالت میں پیش ہی نہ کئے جا سکتے ہوں۔

بہر حال جو دو گواہ پیش کئے گئے ان کی انفرادی صورت حال کا ذکر تو اپنی اپنی جگہ پر آئے گا، یہاں اجمالاً دونوں کا مشترکہ تذکرہ کئے دیتا ہوں۔

ان گواہوں کے بیان کیا تھے، بس سرکاری وکیل واقعاتی ترتیب کے ساتھ سوالات کی صورت میں باتیں پوچھے جاتا اور وہ جواب دیئے جاتے تھے۔ مزہ تو جب تھا کہ گواہ بغیر کسی مداخلت کے آنکھوں دیکھا حال سناتے ہوئے زبانی اپنا بیان لکھواتے۔ سرکاری وکیل کے سوالات سے تو آدھی سے زیادہ Feeding ہوتی رہی۔ بہر حال یہ تو عدالت کا طریقہ کار ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کے باوجود بعض مواقع پر دونوں گواہوں سے سنگین نوعیت کی غلطیاں ہوتی رہیں۔ بعض اوقات تو سرکاری وکیل کی بروقت امداد سے درست ہو جاتیں لیکن ایک موقع ایسا بھی آیا کہ استغاثہ بلکہ خود عدالت کے لئے بھی صورت حال درد سر بن گئی، اُس کا ذکر اپنی جگہ آئے گا یعنی دوسرے گواہ کے بیان کے آخر پر۔ ان گواہوں کا حال بیان دینے کے دوران تو کسی قدر قابو میں رہا لیکن جرح کے دوران ان کی حالت قابل دید تھی، ان نظاروں کا ذکر بھی اپنی اپنی جگہ پر آئے گا۔

## مدعی عدالت میں

نعشوں کا پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر صاحب کے بیان کے بعد ہونے والا وقفہ ختم ہونے پر عدالت پھر سے لگ گئی اور مقدمہ کے 'قانونی مدعی' یعنی FIR درج کرانے والے جھوٹے گواہوں کے سرغنہ عبداللطیف چیمہ کو کمرۂ عدالت میں طلب کیا گیا۔ نام پتہ درج ہونے کے بعد اُس نے ہم سب کو خواہ مخواہ کھڑا ہونے کی تکلیف دی کہ اپنے حلف نامہ کے الفاظ دُھرا کر بس رسم پوری کر لے کیونکہ جو کچھ اُس نے بیان دیا اور جو کچھ اُس نے جرح کے دوران کہا، اسے پوری کوشش کے ساتھ سچائی کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ میں تو اس کا بیان سن کر حیران بلکہ پریشان ہو ہو جاتا رہا کہ دنیا میں اس قدر جھوٹ بولنے والے بھی ہیں! میرے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ کسی کو اتنی 'مقدار' میں اور پھر مقدس فریضہ کے نام پر جھوٹ بولتے ہوئے سنا ہو ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں　　　مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

پریشان اس لئے نہیں تھا کہ یہ لوگ ہمارے خلاف ایسا بیان دے رہے تھے جس سے ہمیں نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا، نہیں بلکہ ایک انسان ہونے کے ناطہ ان پر ترس آ رہا تھا اور اس کے نتیجہ میں ان پر آنیوالے عذاب الٰہی سے ڈر لگ رہا تھا۔

عبداللطیف کا بیان اُسی سرتاپا جھوٹی کہانی پر مشتمل تھا جو تھانہ میں درج ہونے والی FIR میں موجود تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ آج کے بیان میں مکرم لطف الرحمٰن صاحب اور مکرم چوہدری اسحاق صاحب کے اسلحہ کو ریوالور کی بجائے اب

’ریوالور یا پسٹل‘ کا نام دیا گیا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ انہیں اپنی FIR پر بھی اعتماد نہیں تھا اور اس میں بھی تبدیلیاں کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں قاری بشیر کے جسم سے چھرّے نکلنے کا ذکر تھا۔ عقل کے اندھوں کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ پسٹل میں بھی گولی ہی پڑتی ہے اس لئے ریوالور کے ساتھ پسٹل کا ذکر کرنے سے بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لئے انہیں مدد نہیں مل سکتی تھی۔

علاوہ ازیں اس گواہ سے عدالت میں دیئے جانے والے بیان میں یہ تبدیلی بھی کرائی گئی کہ ملزمان نعشوں کو ’اٹھا کر‘ بیت الحمد کے اندر لے گئے جبکہ FIR میں اس کا بیان لکھا تھا کہ ’گھسیٹ کر‘ اندر لے گئے۔ یہ محض الفاظ کی تبدیلی نہ تھی بلکہ جھوٹ کو چھپانے کی مذموم کوشش تھی کیونکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کسی قسم کی خراش یا گھسیٹنے سے نعشوں پر پڑنے والے کسی نشان کا ذکر نہ تھا نیز نقشہ موقع ملاحظہ میں بھی نعشوں کے گھسیٹے جانے کے آثار کی نشاندھی نہ تھی، اس لئے ان ہر دو دستاویزات سے مطابقت پیدا کرنے کی خاطر وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتے چلے جانے پر مجبور تھے۔

وکلاء نے گواہ سے یہ تبدیلی کیسے کروائی، اس کی تفصیل بھی دلچسپ ہے۔ انہوں نے گواہ کو رٹایا تو خوب ہوگا کہ اب عدالت میں ’نعشوں کو گھسیٹنے‘ کی بجائے ’اُٹھانے‘ کا ذکر کرنا تھا مگر دروغ گو را حافظہ نباشد۔ ہوا یوں کہ گواہی دیتے ہوئے پہلے تو اِس گواہ کے منہ سے وہی پرانی بات نکل گئی کہ ملزمان نعشوں کو گھسیٹ کر مسجد کے اندر لے گئے لیکن انگریزی ترجمہ کر کے سٹینو کو لکھوانے والے سرکاری وکیل نے جب گھسیٹنے کا ترجمہ Lifted کیا تو محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے فوراً پکڑا اور مطالبہ کیا کہ یہاں لفظ Dragged لکھیں۔ اِس پر سرکاری وکیل نے گواہ کو یاد کرانے کی خاطر بات اُلجھادی جسے سن کر گواہ کو بھی رٹائی ہوئی بات یاد آ گئی۔ جس پر ہمارے وکلاء کی طرف سے بھرپور صدائے احتجاج بلند ہوئی۔ اِس پر صدر عدالت کو مداخلت کرنی پڑی چنانچہ کرنل صاحب نے سب کو خاموش کرا کے اپنے مخصوص جانبدارانہ انداز میں گواہ سے پوچھا کہ ملزمان نعشوں کو کیسے اُٹھا کر لے گئے۔ اس پر گواہ جو اتنی دیر میں بات سمجھ چکا تھا، نے کہہ دیا کہ ’اٹھا کر لے گئے‘۔ اس پر ریکارڈ میں Lifted کا لفظ ہی لکھ دیا گیا۔ لیکن وائے افسوس! یہ تبدیلی بھی انہیں قانونی طور پر کوئی فائدہ نہ پہنچا سکتی تھی کہ خون کی لکیروں کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ نعشوں کو اُٹھا کر لے گئے یا گھسیٹ کر، تازہ زخموں سے خون تو ٹپکنا بلکہ بہنا چاہیے تھا کیونکہ مقتولین پوری طرح ’صحتمند‘ تھے۔ اس لئے خون کے بہہ ہونے کے وہاں واضح نشان ہونے چاہئیں تھے لیکن نقشہ موقع ملاحظہ میں خون کی صرف ایک ہی لکیر دکھائی گئی تھی۔

یوں تو اِس گواہ کے جھوٹا ہونے کے کوئی کم شواہد نہ تھے مگر یہ امر کس قدر وضاحت کے ساتھ انہیں جھوٹا ثابت کرتا ہے کہ اُس نے تھانہ سے یعنی روزِ اول سے ہی ہمارے حلیے اور نام یاد کرنے شروع کئے ہوئے تھے اور عدالت میں بیان

ہونے تک ہر روز ہمیں چوری چوری دیکھ کر ہماری پہچان یاد کرنے کا سلسلہ جاری رکھا مگر جب بیان کے دوران اس سے سرکاری وکیل نے ہمارے بارہ میں پوچھا کہ اِس وقت عدالت میں کتنے اور کون کون سے ملزمان موجود ہیں تو اُس نے جو نام لکھوائے وہ چھ ہوئے۔ اِس پر وکیل نے کہا دوبارہ بتاؤ مگر پھر بھی اس نے چھ ملزمان کے نام ہی بتائے اور مجھے یعنی Principal Accused کو دونوں مرتبہ چھوڑ گیا۔ اس پر سرکاری وکیل نے حتمی انداز میں اس کی مدد کرتے ہوئے کہا یہ تو چھ ہوئے ہیں۔ اس پر عبداللطیف نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور ہمیں دیکھ کر ہمارے نام زیرِلب دُہرائے اور غالباً ایک دو مرتبہ کی دُہرائی کے بعد کہیں جا کر اسے میرا نام یاد آیا۔ مگر افسوس عدالت نے اس بات کو بھی نوٹ نہ کیا۔ شاید اِس لئے کہ اس نے FIR کے مطابق ہی اس مقدمہ کو پرکھنا تھا اور اس FIR کو 'مقدس صحیفہ' یقین کرتے ہوئے اسی کے مطابق فیصلہ کرنا تھا۔

یہ گواہ جو شکایت کنندہ یا مدعی بھی تھا، یہ بات بیان کرنا بھی بھول گیا کہ اس نے یہ ساری کارروائی رات کے وقت دیکھی کیسے؟ اس پر سرکاری وکیل کو خیال آیا کہ یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ رات کے اندھیرے میں سب کچھ کیسے دیکھا اور پہچانا۔ اُن کے دل میں چور تھا کہ بجلی تو مسجد کی مرمت کی وجہ سے وہاں تھی ہی نہیں، اس لئے کہانی بنتی نہیں۔ چنانچہ اُس نے گواہ کو سمجھانے کے لئے ایسے انداز میں سوال کیا کہ وہ سمجھ جائے یا اسے یاد آ جائے کہ بجلی کا بھی لکھوانا ہے مگر اسے سمجھ نہ آئی کہ یہ کیا پوچھ رہا ہے۔ پھر ایک دو اور سوالات سرکاری وکیل کو کرنے پڑے تب کہیں تیسرے چوتھے سوال پر وہ سمجھا اور یکدم بولا کہ وہاں بجلی کے بلب روشن تھے اور کافی روشنی تھی اور اس طرح سے کہیں جا کر اس گواہ کی گواہی مکمل ہوئی۔

اس بیان کے بعد ہمارے وکلاء نے اِس گواہ کی وہ درخواست دکھانے کا فوری مطالبہ کیا جس کی بناء پر FIR درج کی گئی تھی جس پر وہ اصل درخواست دکھائی گئی۔ وہ درخواست ایک فل سکیپ ورق کے دونوں طرف نہایت صاف، خوشخط تحریر میں تھی گویا پورے اطمینان سے لکھی گئی تھی۔ اس کے متعلق بعض باتیں میرے ذہن میں ہیں گو ان کی کوئی قانونی حیثیت تو نہیں ہے مگر قارئین کے اضافہ معلومات کے لئے درج کرتا ہوں۔

۱۔ یہ درخواست نہایت صاف، خوشخط اور اطمینان سے لکھی گئی تھی جبکہ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ کہیں دو قتل ہو گئے ہوں تو ان قتل ہونے والوں کا کوئی بھی ساتھی اس واقعہ کے فوراً بعد اتنے عمدہ طور پر اور صاف لکھائی میں خوشخط درخواست نہیں لکھ سکتا۔ اس کا خط لازماً شکستہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ جلدی جلدی لکھنے اور وحشت طاری ہونے کے باعث اس قدر خوشخط تحریر بہر حال تیار نہیں کی جا سکتی تھی۔

۲۔ مدعی کہتا ہے کہ پانچ بجے کے قریب واقعہ ہوا، ظاہر ہے کہ واقعہ سے فراغت پانچ بجے یا پانچ بج کر کچھ منٹ پر

ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد وہ مسجد سے ایک کلومیٹر دور ہائی سٹریٹ پر واقع مسجد نور میں جاتا ہے۔ ظاہر ہے پانچ سات منٹ اس میں بھی لگے ہوں گے پھر وہاں جا کر وہ کسی لڑکے سے کاغذ اور قلم مانگتا ہے۔ لازماً دو تین منٹ اس میں بھی لگے ہوں گے اور کچھ ارد گرد ماجرا پوچھنے والوں نے بھی وقت لیا ہوگا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نصف گھنٹے سے بھی کم وقت میں دو صفحوں کی طویل درخواست لکھ لی گئی ہو جس میں باریک قانونی پہلوؤں کا خیال رکھنے کی بھی کوشش کی گئی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی صاف ستھری لکھائی والی درخواست تو مسمّٰی عبداللطیف ولد...... پرسکون حالت میں بھی اور سارے دن کی زور آزمائی کے باوجود بھی نہیں لکھ سکتا کجا یہ کہ اس خوفناک واقعہ کے فوراً بعد جبکہ متاثرہ شخص سخت گھبراہٹ کے عالم میں ہوتا ہے، صرف آدھے گھنٹہ میں اس نے اتنی طویل درخواست بغیر کسی لفظی غلطی یا قطع و برید کے لکھ لی ہو، ناممکن ہے اور قطعاً ناممکن ہے!

۳۔ گواہ کا بیان ہے کہ وہ مسجد نور اس لئے گیا کہ وہاں کسی طالب علم سے کاغذ اور قلم مل جائے گا مگر میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ جس اعلیٰ قسم کے کاغذ پر یہ درخواست لکھی ہوئی میں نے دیکھی، ویسا کاغذ مسجد نور کے طلبا تو ایک طرف رہے ان کے جامعہ رشیدیہ میں بھی نہ ہوگا۔

اِن سب باتوں پر غور کرنے سے جج صاحبان کو مقدمہ کی اصلیت اور اس کا پس منظر سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی تھی۔ کاش! عدالت متعصب نہ ہوتی۔ کاش! اس نے خاص اِشاروں پر ہی چلنے کا عزم نہ کیا ہوتا تو اسے اس بات کا خیال آتا کہ اس صورت حال میں اتنی طویل درخواست اتنی جلدی لکھی کیسے گئی کہ علی الصبح 05:30 بجے رجسٹر بھی ہو جاتی ہے۔ اِس بات پر غور کر کے عدالت بآسانی پتہ چلا سکتی تھی کہ یہ درخواست مسجد نور کے کسی کونے میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی تھی بلکہ وکلاء کے کسی چیمبر میں بیٹھ کر تیار کی گئی تھی اور یہ کہ صبح 05:30 بجے تیار ہو کر تھانہ نہیں پہنچی تھی بلکہ رات گیارہ بجے اس کو آخری شکل ملی اور تھانہ میں رجسٹر ہوئی۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ رات نو بجے کے قریب تو مکرم لطف الرحمٰن صاحب ہمیں بستر وغیرہ دینے کی غرض سے تھانہ آئے تھے اور وہ سارا دن موقع واردات پر اور شہر میں گھومتے پھرتے رہے، اُس دوران انہیں کیوں گرفتار نہیں کیا گیا جبکہ FIR میں تو اُن سے ریوالور بھی چلوایا گیا تھا۔

دوسرا چشم دِید گواہ

مدعی عبداللطیف کی گواہی مکمل ہونے پر استغاثہ کے گیارھویں اور دوسرے چشم دِید گواہ کی حیثیت سے عبدالرزاق نامی ایک نوجوان کو بلایا گیا جو اپنی ظاہری ہیئت اور گفتگو سے آوارہ نظر آتا تھا۔ اس گواہ کا بیان بھی وہی خودساختہ پرداختہ کہانی تھی جو پہلے دن سے بتاتے آ رہے تھے۔ پہلے گواہ کی طرح اس نے بھی ریوالور کے ساتھ پسٹل کا لفظ

بولا اور یہی کہا کہ نعشوں کو اٹھا کر اندر لے گئے۔ اس گواہ نے بھی جو کچھ اپنے بیان میں کہا وہ تھا تو سرتاپا جھوٹ ہی جھوٹ مگر ایسا جھوٹ جس کے صرف پاؤں ہی نہیں بلکہ سر بھی نہ تھا۔ اس لئے اس سے بھی ایک ایسی بھول ہوئی جو اپنے اثرات کے لحاظ سے اِستغاثہ کے لئے نہایت ہی سنگین بھول تھی۔ مقدمہ درج ہونے کے بعد اس نے پولیس کو اپنے دستخط کے ساتھ جو بیان دیا تھا، اُس میں لکھا تھا:

'اور جب ملزمان نعشوں کو بیت الحمد کے اندر لے گئے اور عبداللطیف رپورٹ درج کرانے تھانہ چلا گیا تو ملزمان نے بیت الحمد کا دروازہ پھر کھولا اور قاری بشیر احمد کی نعش کو ملزمان پھر اُٹھا کر باہر لائے اور سڑک کے کنارے رکھ کر چلے گئے'

لیکن عدالت میں بیان دیتے ہوئے یہ بات بھول گیا اور اس کا بیان ختم ہوگیا۔ اِس طرح اس کے بیان کے مطابق دونوں نعشیں بیت الحمد کے اندر ہی رہیں۔ یہ بات سرکاری وکیل جو اُس سے سوالات کی شکل میں بیان کہلوا رہا تھا، کے ذہن سے بھی خدائی تصرف کے تحت اُتر گئی۔ اِس اہم نکتہ کی کمی اِستغاثہ کے غیر سرکاری وکیل ملک فضل کریم کو فوری طور پر محسوس ہوئی جس پر اُس نے سرکاری وکیل کو آہستہ مگر اتنی اونچی کہ ان کی آواز کمرہ ٔعدالت میں ہر جگہ سنی جا سکتی تھی، باتیں کرنی شروع کر دیں لیکن اس کے باوجود سرکاری وکیل کو اس بات کی سمجھ نہ آئی کیونکہ ملک فضل کریم صاحب بہر حال اشاروں کنایوں میں ہی سمجھا رہے تھے۔ چنانچہ جب دونوں کی یہ باہم باتیں طول پکڑ گئیں تو سرکاری وکیل نے جھنجلا کر کہا: 'ٹھیک تو ہو گیا ہے!' اس پر ملک فضل کریم صاحب جھنجلا کر پنجابی میں بولے: 'کی ٹھیک ہویا اے' (کیا خاک ٹھیک ہوا ہے)۔

اس موقع پر کمرہ ٔعدالت کی عجیب کیفیت ہوئی۔ وہ یوں کہ اِدھر ہم خوش تھے کہ گواہ کے ساتھ ساتھ اِس مقدمہ کی بھی اصلیت ظاہر ہوگئی تو اُدھر ہمارے وکلاء بھی اِس نازک موقع پر پوری طرح چوکس تھے۔ چنانچہ وکیلِ اِستغاثہ کے ان فقرات کا کمرہ ٔعدالت میں سرگوشی کے رنگ میں گونجنا تھا کہ محترم خواجہ صاحب اور محترم مجیب الرحمٰن صاحب بیک وقت کھڑے ہو کر بیک زبان شیروں کی طرح حملہ آور ہو گئے اور عدالت کو اس امر کا سختی سے نوٹس لینے کو کہا کہ یہ کیا مذاق ہے کہ گواہ کو باقاعدہ طور پر Feed کیا جا رہا ہے! یہ کیوں ہو رہا ہے؟......!! غرضیکہ ایک ہی سانس میں بڑے سخت جارحانہ انداز میں دونوں حضرات پتہ نہیں کیا کیا کہہ گئے۔ اِس پر اِستغاثہ کی ٹیم کے ساتھ ساتھ عدالت بھی بوکھلا گئی۔ اِستغاثہ کے وکلاء نے کھسیانا ہو کر کہنا شروع کیا کہ ہم کیا فیڈ کر رہے تھے، ہم تو آہستہ آہستہ مشورہ کر رہے تھے۔ مجیب صاحب نے جواب دیا کہ ان کی باتیں مجھے 'یہاں' صاف سنائی دے رہی ہیں، پاس ہی بیٹھے ہوئے گواہ کو کیوں سنائی

نہ دے رہی ہوں گی۔ سرکاری وکیل نے کہا اچھا آپ بتادیں کہ ہم نے کیا کہا ہے۔ اس پر مجیب صاحب نے اصل بات تو نہ بتائی یعنی نعش باہر لانے والی بات تاکہ گواہ کو یاد نہ آجائے لیکن آخری بات کو ٹھیک تو ہو گیا ہے' اور' کی ٹھیک ہو یا اے' والا مکالمہ عدالت میں دُہرا دیا۔ اس پر استغاثہ کو سخت ہزیمت اُٹھانی پڑی تاہم شرم تم کو مگر نہیں آتی کے مصداق اُنہوں نے بات ٹالنے کی کوشش کی لیکن ہمارے وکلاء کی یہ کارروائی ایسی بروقت اور زوردار تھی کہ صدرِ عدالت جو ہر موقع پر استغاثہ کی ہر ممکن مدد کرنے پر تُلا رہتا، اس موقع پر اُس سے بھی بن نہ پڑی اور سرکاری وکیل کا یہ سوال کہ گواہ کا ایک اور فقرہ شامل کارروائی کرنے کی اجازت دی جائے، بڑے زور سے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے یہ کہتے ہوئے رد کرنا پڑا کہ

No, No, We do not allow - We do not allow

میرے خیال میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ صدرِ عدالت نے کھل کر حق بات کہی مگر افسوس کہ یہ بھی کوئی حقیقت پر مبنی اظہارِ حق نہ تھا بلکہ محض وقتی اشک شوئی تھی کیونکہ کرنل کی حق پرستی کا بھانڈا اگلے ہی روز عین چوراہے میں اُس وقت پھوٹ گیا جب اسی گواہ کی درخواست پر یہ ساری بات کارروائی کا حصہ بنا دینے کا فوجی حکم جاری ہو گیا۔

## ایک نئی موشگافی، ایک نیا جھوٹ!

اس گواہ نے ایک نئی موشگافی بھی کی، کہنے لگا کہ جب ملزمان نے دروازہ بند کر لیا اور مدعی عبداللطیف تھانہ روانہ ہو گیا اور ہم تینوں گواہ مسجد کے سامنے کھڑے تھے تو اُس وقت ہم نے ایک Fire Short کی آواز سنی جو بیت الحمد کے اندر سے آئی۔ یہ بات بھی اس نے اپنے پولیس بیان میں نہ کہی تھی لیکن پولیس کو بیان دینے کے بعد انہیں ہوش آیا کہ نقشہ موقع ملاحظہ میں انسپکٹر ایاز صاحب نے تو ایسے امور بھی بیان کئے ہیں جن کے مطابق اندر بھی کسی بڑی بندوق سے Fire ہونے کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ اس کمی کو دور کرنے کے لئے انہیں ایک اور جھوٹ گھڑنا پڑا۔

چونکہ یہ ساری کہانی گھڑی ہوئی تھی اس لئے اِس موقع پر بھی گواہ سے غلطی ہوئی اور اس نے پہلے یہی کہا کہ گواہان نے دروازہ بند کر لیا اور پھر Fire کی آواز سنائی دی۔ درمیان میں عبداللطیف کے پولیس اسٹیشن جانے کا ذکر بھول گیا تھا مگر سرکاری وکیل کی مداخلت سے اُسے یاد آ گیا اور عدالت کی کھلی کھلی طرف داری کے نتیجہ میں اُس کے بیان کو درست کر دیا گیا۔ اس گواہ کا تجربہ کم لگتا تھا کیونکہ عبداللطیف کی نسبت یہ زیادہ گھبرایا ہوا تھا حالانکہ آج تو گھبراہٹ کی کوئی بات ہی نہ تھی کیونکہ آج تو صرف بیان ہی ہونے تھے اصل معرکہ تو کل ہونے والا تھا جب ہمارے وکلاء نے ان پر جرح کر کے ان کی خبر لینی تھی۔ وقت کم ہونے کی وجہ سے طے ہو چکا تھا کہ آج دونوں گواہوں کے صرف بیان ہی لئے جائیں گے اور ان دونوں پر جرح اگلے دن ہو گی۔

شام چار بجے کے قریب عدالت کی کارروائی ختم ہوئی اور ہم باہر آ کر گاڑی کے انتظار میں بیٹھ گئے مگر جب دیر تک پولیس بس نہ آئی تو ربوہ سے آئی ہوئی ہماری انجمن والی گاڑی ہمیں جیل تک لے گئی۔ اس دوران محترم شفیق صاحب، محترم میاں عاشق صاحب، محترم چوہدری عبدالرحیم صاحب اور ملک نعیم الدین صاحب بھی گاڑی میں ہمارے ساتھ ہی سوار ہو گئے۔ موٹر سائیکلوں پر سوار ملتان کے بعض خدام بھی گاڑی کے ساتھ ساتھ جیل کے سامنے پہنچ گئے اور سب نے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ ہمیں جیل جانے کے لئے رخصت کیا۔ للّٰہی محبت میں ڈوب کر ان سب خدمت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے بہترین جزاء عطا فرمائے، آمین۔ ہم قریباً عصر کے وقت جیل میں واپس اپنے ٹھکانہ 'کورا ٹین' پہنچے۔ ظہر اور عصر کی نمازیں پڑھیں، کھانا کھایا تو اتنے میں بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا چنانچہ ہم اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں بند ہو گئے۔

## مقدمہ کا اصل معرکہ، گواہیوں کی چیر پھاڑ

اگلے روز 17 مارچ 1985ء کی صبح مقدمہ کی سماعت کے لئے ہمیں معمول کے مطابق کینال کالونی ملتان پہنچا دیا گیا۔ آج یہاں گذشتہ روز سے بھی زیادہ رونق تھی کیونکہ آج مقدمہ کا اصل معرکہ ہونے والا تھا یعنی چشم دید گواہوں پر جرح! اسی لئے آج عدالت بھی غیر معمولی طور پر جلدی یعنی گیارہ بجے سے بھی پہلے آ گئی تھی اور ہمیں بھی جلد ہی کمرۂ عدالت میں بلا لیا گیا۔

آج کی عدالتی کارروائی کی اہمیت کے پیش نظر کمرۂ عدالت پوری طرح بھرا ہوا تھا اور اس سے ملحقہ کوریڈور میں زائرین گنجائش سے بھی زیادہ تھے۔ صفائی اور استغاثہ کی ٹیموں میں کئی وکلاء کا اضافہ تھا بلکہ لمبی داڑھی والے ایک صاحب بھی موجود تھے جنہیں ممبرانِ استغاثہ والی لائن میں جگہ نہ مل سکنے کی وجہ سے ان کی کرسی مکرم رانا نعیم الدین صاحب اور میرے سامنے تھی۔ ان مولوی صاحب کی یہاں موجودگی پر شروع میں ہی محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے اعتراض کیا کہ اگر یہ محض سامع ہیں تو انہیں کوریڈور میں بیٹھنا چاہئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ انہیں عدالت سے مشورہ کے بعد بٹھایا گیا تھا کیونکہ عدالت نے محترم مجیب صاحب کے اعتراض کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور عملاً اسے رد کر دیا۔ تاہم ان کے منصوبہ کا بھانڈا اس وقت پھوٹ گیا جب پہلے گواہ پر جرح کے دوران بارہ یا ایک بجے کے قریب وقفہ ہوا تو اس کے بعد اگلے سیشن میں یہ مولوی صاحب دکھائی نہ دیئے۔ ظاہر ہے اس دوران انہوں نے دوسرے گواہ کو جرح کے سوالات بتانے ہوں گے اور وہ جوابات بھی جو پہلے گواہ نے دیئے تا کہ وہ اپنے آپ کو اس کے مطابق تیار کرے۔ اس امر کا علم ہونے کے باوجود ہمارے وکلاء نے چنداں پرواہ نہ کی کیونکہ ہمارا توکل تو خدا پر تھا اور ہے نیز ہمارے کیس کی نوعیت ہی

ایسی تھی کہ اس میں گواہ کتنے ہی سکھائے جاتے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ چنانچہ بعض اوقات خود عدالت کہتی رہی کہ گواہی سے فارغ ہونے والے گواہ کو کسی کمرے میں بند کردیتے ہیں تاکہ باہر جاکر وہ دوسرے گواہوں کو باتیں بتا نہ سکے لیکن ہمارے وکلاء کہتے رہے کوئی حرج نہیں، بے شک باہر جانے دیں، 'موج' کرنے دیں۔

پہلے گواہ پر جرح شروع ہوئی تو کرنل صاحب نے گواہ کو مخاطب کرکے یاد دلایا کہ کل آپ نے بیان سے قبل جو حلف اُٹھایا تھا کہ 'سچ بولوں گا' یاد ہے نا! اس نے کہا جی بالکل یاد ہے۔ اس طرح سے گویا کرنل صاحب نے اسے جھوٹ بولنے کی یاددہانی کرائی تھی! اس کے بعد صدرِ عدالت نے Defence counsel کو گواہ پر جرح کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پہلے خواجہ سرفراز صاحب نے جرح شروع کی۔ آپ نے قریباً ایک گھنٹہ تک واضح حقائق پر مشتمل سوالات کئے لیکن گواہ نے ہر حقیقت کا انکار کیا۔ آپ نے گواہ سے اُس کی ذاتی حیثیت سے متعلق سولات پوچھے تو اس کے بھی اس نے گول مول جواب دیئے اور بتایا کہ وہ سکول لائف سے ہی احمدیوں کے خلاف سرگرم عمل ہے اور قادیانی آرڈیننس کے اجراء کے بعد سے تو وہ خاص طور پر قادیانیوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے لگا تھا۔

محترم خواجہ صاحب نے بڑے سیدھے سادے اور To the point سوالات اس گواہ پر کئے، آپ کا انداز کمال درجہ کا ماہرانہ تھا۔ آپ ایک مسئلہ کو لیتے اور کچھ سوالات اس کے متعلق کرکے اسے درمیان میں ہی چھوڑ کر کسی دوسرے پہلو کو لے لیتے۔ اس کے متعلق بعض باتیں پوچھتے پھر اچانک پہلے والے مسئلہ کو چھیڑ لیتے۔ ان کا یہ انداز بڑا اچھا لگا کیونکہ اس طرح سے گواہ کے لئے حقیقت چھپانی ناممکن ہوجاتی ہے۔

چنانچہ جرح کے دوران بڑے واضح طور پر ظاہر ہوگیا کہ یہ گواہ تو سرے سے اس موقع پر موجود ہی نہ تھے جس کے باعث اصل واقعات تو ان کے ذہن میں ہی نہ تھے، ان کے ذہنوں میں تو ڈالی گئی فرضی اور من گھڑت کہانی ہی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ان کے سارے کے سارے بیانات اور جوابات تضاد اور نامعقولیت کا ملغوبہ تھے۔ محترم خواجہ صاحب نے اپنے خاص انداز سے جرح کرکے ممبران عدالت کے ذہنوں میں مندرجہ ذیل اُمور اچھی طرح سے واضح کردیئے:

۱۔ اصل واقعہ کیا ہوا۔

۲۔ کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات کو مٹانے کا مطالبہ یہ عرصہ سے کر رہے تھے اور یہی ان کا اِس دن مشن تھا۔

۳۔ اذان کی کبھی شکایت کی گئی اور نہ ہی کسی ہمسائے نے اپریل 1984ء کے بعد اذان سننے کی گواہی دی۔

## گواہوں کی اصلیت اور ایک سنہری لمحہ

محترم خواجہ سرفراز صاحب کے بعد محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے اسی گواہ پر جرح شروع کی۔ آپ نے ابتدائی نوعیت کے ایک دو سوالات کے بعد دیوبندیوں کے مشہور عالم رشید احمد گنگوہی صاحب کی اہمیت گواہ سے تسلیم کرانے کے لئے سوالات کرنے شروع کردیئے تا کہ سامعین (مع جج صاحبان) کے ذہنوں میں اُس واقعہ کا سارا پس منظر بیٹھ جائے جو چند لمحوں بعد ہونے جا رہا تھا۔ آپ نے مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کے حوالہ سے بات شروع کی۔ جب آپ بات کرتے ہوئے بریلوی اور دیوبندی مکتب کے تعارف تک پہنچے تو صدر عدالت نے بڑی سختی سے مجیب صاحب کو روکتے ہوئے کہا کہ میں نے پہلے دن آپ سب سے کہا تھا کہ اس مقدمہ کے دوران کسی قسم کی مذہبی گفتگو نہیں ہوگی، اس لئے آپ ایسے سوالات نہیں کرسکتے۔ اس پر مجیب صاحب ذرا پیچھے ہٹ کر قانون شہادت کی کسی شق کا حوالہ دیتے ہوئے بولے کہ جناب اس کے مطابق وکیل صفائی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے کسی خاص مقصد کو Develop یا Establish کرنے کے لئے Cross Examination کے دوران ہر قسم کے سوالات کرسکتا ہے پھر آپ اپنی عینک نیچے کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے یہ تو میں آپ کو ابھی بتاتا ہوں کہ میں کس مقصد کے لئے یہ سوالات کر رہا ہوں، آپ ذرا گواہ کو باہر بھیج دیجئے گا۔ پھر آپ جلال میں آ کر گواہ کے سامنے ہی کہنے لگے:

میں ان لوگوں کے نظریات کی حیثیت وحقیقت واضح کرنا چاہتا ہوں جو چاہتے ہیں کہ ان میں سے کسی کی ایک گواہی پر ان کو (ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے) پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔

مجیب صاحب کے اِس پرزور اور دلیرانہ موقف کا سارے کمرۂ عدالت پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ عدالت نے فوراً استغاثہ کی ٹیم کو کہا کہ آپ ذرا باہر چلے جائیں تا مجیب صاحب وضاحت کرسکیں۔ اس پر مجیب صاحب نے فرمایا کہ ان کو باہر بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے، صرف گواہ کو بھیج دیجئے گا۔ اس پر گواہ باہر چلا گیا تو مجیب صاحب نے اپنے بریف کیس سے ایک نئی نکور کتاب نکالی جس کا ٹائیٹل تھا ''فتاویٰ رشیدیہ'' پھر عدالت کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ اِس کتاب کے مصنف رشید احمد گنگوہی ان لوگوں کے بہت بڑے عالم تھے جو اس مقدمہ کے مدعی ہیں۔ ذرا دیکھئے اِس صفحہ پر کیا لکھا ہے۔ آپ نے اس میں سے اِس قسم کے مضمون پر مشتمل مولانا رشید گنگوہی کا فتویٰ پڑھ کر سنایا:

''اِحیائے حق کے لئے عدالتوں میں کذب بلکہ کذب صریح بولنا جائز ہی نہیں واجب ہے''

اور ساتھ ہی وہ صفحہ کھول کر صدر عدالت کے سامنے کتاب رکھ دی۔ اُس وقت عدالت کی جو حالت ہوئی وہ قابل دید تو تھی لیکن بیان کی جانی ممکن نہیں۔ اُدھر استغاثہ کے وکلاء میں جو کھلبلی مچی وہ اس کے علاوہ تھی۔ کرنل صاحب نے حوالہ

پڑھا، میجر اس کے اوپر گر کر اس سے بھی پہلے اس حوالہ کو پڑھنے میں کوشاں تھا۔ بظاہر متحمل مزاج مجسٹریٹ نے بھی بعد میں حوالہ پڑھا تو حیرانی و اِستعجاب کے جذبات اس کے چہرہ پر نمایاں ہو گئے۔ ممبرانِ عدالت اس ناگہانی اُلجھاؤ سے نکلنے کی کوشش میں تھے کہ مجیب صاحب کی آواز ایک مرتبہ پھر گونجی:

'آپ اِس قسم کے گواہوں کی گواہیوں پر ان میں سے کسی کو لٹکانا چاہتے ہیں!'

اس کتاب کو دیکھ کر سرکاری وکیل نے اِعتراض اُٹھایا کہ اس کے اصلی ہونے کی سند (یعنی اِس کے پبلشر کی طرف سے جاری شدہ ہونے کا ثبوت) بھی پیش کی جائے۔ مجیب صاحب بولے جناب یہ تو آج صبح ہی مکتبہ رشیدیہ سے خرید کر لایا ہوں دیکھئے (اندر والا ٹائٹل کھولتے ہوئے) یہ اس کی مہر لگی ہوئی باقی مزید تسلی کرنی ہو تو میرے ساتھ چلئے، کرایہ میں دیتا ہوں۔ اس پر کسی نے مذاقاً کہا کہ عدالت میں پیش کرنے کے لئے اس کے تین نسخے چاہئیں۔ مجیب صاحب کہنے لگے: نسخے جتنے کہیں گے لا دیں گے۔ اس پر ملک فضل کریم ہنستے ہوئے بولے ایک ایک ہمیں بھی لا دیں۔ بہر حال اس واقعہ سے کمرۂ عدالت کی فضا میں جو صبح سے گھٹی گھٹی سی تھی ایک جان سی پیدا ہو گئی اور سارے ہشاش بشاش بھی ہو گئے اور ایک فریق سارے ماحول پر چھا گیا جبکہ دوسرے فریق کی طرف سے مغلوبیت کا احساس ظاہر ہونے لگا۔ ممبران عدالت کا انداز اسی قسم کا ہو گیا جیسے وہ Defence counsel کا لوہا مان گئے ہوں، ایسا کیوں نہ ہوتا؟ مسیح محمدی کے فرقہ کا ایک عالم اپنے روشن دلائل کی رُو سے سب کے منہ بند کر چکا تھا۔

اِس موقع پر یہ دلچسپ بات بھی درج کرتا چلوں جس سے ان مسلمان کہلانے والوں کے مَبلغِ علم کا پتہ چلتا ہے کہ جب مجیب صاحب نے رشید گنگوہی کا حوالہ پڑھ کر سنایا تو اس وقت اِستغاثہ والوں میں سے کسی نے جھوٹ کی اپنے موافق کوئی تعریف کرنی چاہی۔ اس پر مجیب صاحب نے کہا جناب قرآن کریم میں تو ارشاد ہے اِجتَنِبُوا قَولَ الزُّورِ۔ اس پر سرکاری وکیل بولا تو گویا اِجتناب ہوا۔ (اس کا مفہوم کچھ ایسا تھا کہ گویا اس حکم کا مطلب یہ نہیں کہ تم جھوٹ کو بالکل ہی چھوڑ دو) اس پر مجیب صاحب کو عربی گرائمر (علم النحو والصرف) میں بھی اپنی لیاقت کا لوہا منوانا پڑا اور فرمانے لگے جناب اِجتنبوا باب افتعال سے ہے۔ اور سامنے بیٹھے تومند مولوی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: پوچھ لیجئے مولانا سے اس کے کیا معنے بنتے ہیں۔ پھر آپ نے اِجتنبوا کی مختصر تشریح کر کے بات ختم کر دی جس پر فریق مخالف کو خاموش ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، مولوی صاحب تو اِس قدر زچ ہوئے کہ مزید کچھ کہنے کی ان میں ہمت ہی نہ رہی۔ بہر حال اس معرکہ کے موقع پر کیا ممبرانِ عدالت اور کیا ممبرانِ اِستغاثہ سبھی کی حالت دیدنی تھی۔ اُنہیں بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ کے باعث کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کریں اور کیا کہیں۔ غرض یہ موقع مقدمے کے یادگار مواقع

میں سے ایک تھا اور ہلا کر رکھ دینے والا بھی تھا کہ جس قوم کے مذہبی رہنماؤں نے اس قسم کے فتوے جاری کر رکھے ہوں اس کے گواہوں سے لئے جانے والے حلف کی بھلا کیا حیثیت رہ جاتی ہے اور ایسی عدالتوں سے کسی کو کیسے انصاف مل سکتا ہے!؟

## مکرم مجیب الرحمٰن صاحب کی مہارت وذہانت

اِستغاثہ نے اپنی ساری کہانی کی بنیاد قاری بشیر کی باتوں پر رکھی تھی جو اگلے جہان پہنچ چکا تھا۔ اب اس سے تو تفتیش ہونے سے رہی۔ چنانچہ یہ گواہ بھی جرح کا جواب دیتے ہوئے بار بار بنیادی باتیں قاری بشیر کی طرف منسوب کرتا رہا۔ ایک موقع پر محترم مجیب الرحمٰن صاحب کو غصہ آیا تو آپ اپنے ہونٹوں کو دباتے ہوئے اپنے مخصوص انداز سے بولے:

'کوئی بات نہیں، فکر نہ کرو، ابھی قاری بشیر بھی بولے گا'

مجیب صاحب کی جرح کے دوران گواہ نے بار بار بات کو اُلجھایا اور سیدھی سادی بات کے متعلق بھی بڑے آرام سے کہہ دیتا کہ سمجھ نہیں آئی پھر سوال کریں اور مجیب صاحب اس کا مطالبہ پورا کر دیتے۔ مثلاً مجیب صاحب نے سوال کیا: ''کیا آپ جانتے ہیں کہ رشید گنگوہی کا مکتب فکر کیا تھا؟'' گواہ نے جواب دیا ''سمجھ نہیں آئی''۔ اس پر آپ نے سوال کو ذرا سلیس کر کے دُہرایا۔ اُس نے پھر وہی جواب دیا تو آپ نے سٹینو سے مخاطب ہو کر کہا کہ لکھیں Question۔ اس پر اس نے مذکورہ سوال لکھا اور گواہ کی طرف سے جواب میں آپ نے لکھوایا کہ 'سمجھ نہیں آئی'۔ مجیب صاحب کا یہ 'طریقہ واردات' دیکھ کر اُن کے کان کھڑے ہو گئے، رہی سہی کسر مجیب صاحب کے اس فقرہ نے نکال دی:

'بنے تو پھرتے ہیں گریجوایٹ اور مطلب مکتب فکر کا بھی نہیں آتا'

اس طرح سے آپ نے اس سے پہلے گواہ مدعی عبد اللطیف کی تعلیمی حالت کا بھی بھانڈا پھوڑ دیا جو دعویٰ کرتا تھا کہ ایم اے 'اسلامیات' کی تیاری کر رہا ہے اور اسی سلسلہ میں راہنمائی کے لئے جامعہ رشیدیہ جایا کرتا تھا۔ ایک اور موقع پر جب آپ کے ٹھہر ٹھہر کر سوال کرنے کے باوجود اس نے ایسا ہی جواب دیا تو آپ بڑے زور سے بولے:

''جناب اردو بول رہا ہوں Latin تو نہیں بول رہا، ہوں تو بنگال سے مگر کہتے ہیں تو پنجابی میں شروع ہو جاتا ہوں!''

ایسے مواقع پر مجیب صاحب فوراً سٹینو سے مخاطب ہو کر فرماتے: لکھیں QUESTION اور اِس طور سے سوال و جواب کرتے کہ اُس سے اپنے مطلب کی بات اُگلوا ہی لیتے۔ گو اِس طرح سے بات لمبی تو ہو جاتی مگر اپنا مقصد بھی حاصل ہو جاتا۔ بعض اوقات کرنل منیر الرحمٰن بھی آپ کے سوال پر گواہ کی تائید میں اعتراض کرتا کہ آپ یہ نہیں پوچھ سکتے۔ اس

پر آپ دوسرا انداز اختیار کرتے اور سوالات کرتے کرتے وہی بات جسے کرنل نے بھی قابل اعتراض قرار دیا ہوتا، گواہ سے کہلوا لیتے۔ پھر کیا ہوتا؟ کرنل اپنی ہتھیلیاں ملتا رہ جاتا!

## مقدمہ کی بنیاد - اذان

مقدمہ کی بنیاد اِس امر پر رکھی گئی تھی کہ گواہوں کو علم ہوا تھا احمدی اپنی مسجد میں اُذان دینے جیسے خطرناک جرم کا ارتکاب کررہے تھے۔ اسی جرم کی سرکوبی کے لئے یہ طائفہ مولویاں 26 اکتوبر 1984ء کی رات مسجد احمدیہ آیا تھا۔ اس سلسلہ میں محترم مجیب صاحب نے گواہ سے ایک سوال یہ کیا کہ جب آپ بیت الحمد کے سامنے پہنچے تو اذان کے کونسے الفاظ دُہرائے جارہے تھے۔ جواب ملا کہ جس لمحہ ہم پہنچے اُسی وقت اذان شروع ہوئی تھی۔ مجیب صاحب اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئے:

'ہاں ہاں وہ تمہارا ہی اِنتظار کررہے تھے کہ یہ آئیں اور اَذان شروع کریں'

ایک اور مسئلہ پر بھی گواہ نے بات گول کرنے کی بہت کوشش کی مگر مجیب صاحب نے بھی عزم کیا ہوا تھا کہ بات کی تہ تک پہنچ کر ہی رہیں گے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ فیصلہ کب اور کہاں ہوا کہ اگلے روز صبح بیت الحمد جانا ہے۔ اس نے کہا کہ رات کھانے کے وقت! آپ نے پوچھا کہ کیا کھانا کھا کر جلسہ گاہ میں واپس آ گئے تھے۔ یہاں چور پکڑا جاتا تھا کیونکہ اس قسم کے سوال کی نسبت غالباً اسے پڑھایا سکھایا نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر گواہ خاصا گھبرایا اور کہنے لگا ہم نے وہیں کھانا کھایا اور وہیں جلسہ میں شامل ہوگئے۔ مجیب صاحب نے کہا: وہیں کہاں؟ اپنے اس جھوٹ کو چھپانے کے لئے کہ یہ فیصلہ کھانے کے دستر خوان پر ہوا، اُسے بہت کوشش کرنی پڑی اور آخر میں اس نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ جلسہ گاہ میں ہی ایک طرف کھانے کا اِنتظام تھا جبکہ دوسرے گواہ کا کہنا تھا کہ ہم کھانا کھانے کے فوراً بعد جامعہ رشیدیہ کے استقبالیہ میں چلے گئے۔ قاری بشیر احمد تو اِدھر اُدھر آتے جاتے رہے البتہ باقی ہم پانچ اَفراد اُدھر ہی رہے۔

اسی طرح ریوالور اور پسٹل کے الفاظ سے متعلق بھی گواہ اپنا جھوٹ ثابت کرنے کے لئے دیر تک بے سود کوشش کرتا رہا۔ اس نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ وہ ریوالور اور پسٹل میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ جس پر مجیب صاحب نے سوال کیا کہ جب تم کوئی فرق نہیں سمجھتے تو پھر پولیس بیان کے خلاف عدالت میں دیئے جانے والے اپنے Examination in Chief میں ریوالور یا پسٹل کیوں کہا۔ اس پر وہ چکرا گیا اور جب کوئی جواب نہ بن پایا تو کہنے لگا کہ میں کوئی معین وجہ پسٹل کے لفظ کے استعمال کی نہیں بتا سکتا۔ بتاتا بھی کس طرح؟ بتاتا تو پھنستا بھی اور جامعہ رشیدیہ کی طرف سے ملنے والی خیرات کی رقم بھی نہ ملتی۔ کیا وہ سچ بات کہہ کر اپنا ذریعہ معاش بند کرا لیتا؟

محترم مجیب صاحب نے جرح کے دوران بڑی حکمت سے ایک نکتہ پہلے چشم دید گواہ عبداللطیف سے اُگلوا لیا تھا۔ لیکن وہ نکتہ وکلائے صفائی کی طرف سے ہونے والی جرح کے آخر تک بین السطور ہی رہا یعنی مجیب صاحب نے کسی کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ FIR کے مطابق جب ملزمان نعشیں سڑک سے اُٹھا کر مسجد کے اندر لے گئے تو شکایت کنندہ عبداللطیف رپورٹ درج کرانے تھانہ چلا گیا۔ دیگر گواہوں نے گواہی دی تھی کہ اندر لے جانے کے بعد ایک نعش کو ملزمان دوبارہ باہر لے آئے۔ نکتہ یہ تھا کہ جب نعش کو باہر لایا گیا اُس وقت عبداللطیف تو تھانہ جا چکا تھا۔ لہٰذا جب وہ کیس درج کرا کر تھانہ سے جائے وقوعہ پر واپس پہنچا تھا تو اس کو یکدم حیرانی ہونی چاہئے تھی کہ یہ نعش کہاں سے آ گئی! اُس موقع پر اسے بے ساختگی کے ساتھ اس بات کے متعلق اپنے ساتھیوں سے استفسار کرنا چاہئے تھا جو اس نے نہیں کیا اور اس سے اس کے جھوٹا ہونے کا واضح ثبوت ملتا تھا۔

چنانچہ اس نکتہ پر مجیب صاحب نے ایسے انداز میں سوالات کئے کہ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہونے پایا کہ یہ کس مقصد کے لئے سوالات کئے جا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ واپس پولیس کے ساتھ جب آپ آئے تو کیا آپ نے دونوں مقتولین کے مر کر گرنے کی جگہوں کی نشاندہی کی تھی یا نہیں؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ اسی طرح اس موقع سے متعلق اور بھی سوالات کئے مگر گواہ نے کسی موقع پر اپنی حیرانی کا اظہار نہ کیا کہ نعش باہر کس طرح آ گئی اور نہ ہی اُس وقت پولیس کو یہ بات بتائی تھی، تو یہ فرق ہوتا ہے سچے اور جھوٹے کا۔

17 مارچ کو مکرم مجیب الرحمٰن صاحب کی طویل جرح کے باعث سماعت بہت لمبی ہو گئی تھی۔ پہلے گواہ پر ابھی جرح جاری تھی کہ دو اڑھائی بج گئے۔ خواجہ صاحب اور آپ کی واپسی فلائٹس میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا مگر مجیب صاحب اس گواہ کو جو مدعی بھی تھا، چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے تاخیر ہو جانے کی صورت میں اپنی سیٹ کینسل کروا دینے کا بھی ارادہ کر لیا جبکہ خواجہ صاحب اُسی روز واپس جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی درخواست پر عدالت نے عبداللطیف کو باہر بھجوا دیا تا کہ مکرم خواجہ صاحب دوسرے گواہ پر جرح کر کے بروقت واپس روانہ ہو سکیں اور اس کے بعد مجیب صاحب دونوں بڑے گواہوں پر جرح مکمل کر لیں گے۔ خواجہ صاحب نے دوسرے گواہ پر اپنے مخصوص انداز میں مختصر سی جرح کر کے رخصت لی۔ آپ کے بعد مجیب صاحب پھر میدان میں آ گئے اور عبداللطیف پر جرح شروع کر دی۔ جرح کے دوران جب آپ کو یقین ہو گیا کہ اب آپ اپنی فلائٹ کے وقت تک فارغ نہیں ہو سکیں گے تو بریف کیس سے اپنا ٹکٹ نکال کر ایک دوست کو دیا تا کہ وہ اسے Cancel کروا آئے۔

## صدرِ عدالت کا بے ساختہ اعترافِ حقیقت

اُس روز ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہوا کہ جب دوسرے گواہ پر خواجہ صاحب جرح کر چکے تو چائے کا وقفہ ہوا۔ وقفہ کے دوران ہماری موجودگی میں محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے کرنل صاحب سے ہلکے پھلکے انداز میں مقدمہ کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ آپ نے گواہوں کے بیانات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کتنا جھوٹ بول رہے ہیں یہ لوگ! آپ کی اِن باتوں کا کرنل پر اثر ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور ہم نے دیکھا کہ وہ گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا پھر ہمارے کانوں سے اس کے یہ الفاظ ٹکرائے:

'ہاں! صاف ثابت ہو رہا ہے کہ واقعہ اندر ہوا ہے'

اس کے بعد مجیب صاحب کرنل صاحب کے ساتھ کمرۂ عدالت سے نکل کر برآمدہ میں کھڑے ہو گئے اور یہی باتیں ہونے لگیں اس دوران میجر صاحب بھی آ کر شریکِ گفتگو ہو گئے۔ میجر صاحب کی باتوں کی تان اس فقرہ پر ٹوٹی کہ:

''دیکھیں، وہ جس نے سب کچھ کیا اور کرنے کا اقبال کیا (یعنی رانا نعیم الدین صاحب)

اس کے ہاتھ میں تو یہ ڈنڈا بھی نہیں پکڑاتے''

### 'پتہ نہیں، یاد نہیں، غلط ہے'

چائے کے وقفہ کے بعد دوسرے گواہ عبدالرزاق پر جرح شروع ہوئی تو اسے غالباً صرف اسی بات پر پکا کیا گیا تھا کہ تم نے ہر سوال کے جواب میں 'پتہ نہیں، یاد نہیں، غلط ہے'، کے الفاظ ہی دُہراتے چلے جانا ہے۔ لیکن ہمارے مجیب صاحب اس کا بھی علاج کر لیتے۔ جہاں وہ کسی پولیس دستاویز کے متعلق یہ کہتا کہ 'پتہ نہیں، یاد نہیں' وہاں جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کے لئے فوراً اس کے سامنے متعلقہ دستاویز رکھ دیتے اور کہتے کہ اب پڑھ کر بتاؤ! اور اس طرح سے اپنی بات کی تسلی کروا کر رہتے اور پھر ریکارڈ پر اس کی اس حرکت کو بھی لاتے کہ گواہ نے پہلے انکار یا لاعلمی کا اظہار کیا اور اب ریکارڈ دیکھ کر اس کے متعلق یہ کہتا ہے۔

اچھی بھلی واضح باتوں کے متعلق بھی وہ اظہار لاعلمی ہی کرتا رہا۔ مثلاً جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تم نے پولیس بیان میں کہا تھا کہ ہم میں سے کوئی مسجد کے اندر داخل ہوا تو کہنے لگا یاد نہیں۔ پھر پوچھا کہ کیا تم نے پولیس بیان میں کہا تھا کہ لطف الرحمٰن اور اسحاق ریوالور سے مسلح ہو کر آئے لیکن اپنے عدالتی بیان میں کہا ہے کہ ریوالور یا پسٹل تو کہنے لگا: پتہ نہیں۔ پھر پوچھا کہ وقوعہ کے بعد جب عبداللطیف رپورٹ درج کرانے تھانہ چلا گیا تو تم نے اپنے بیان میں کسی فائر کی آواز سننے کا ذکر کیا تھا۔ کہنے لگا یاد نہیں۔ اسی طرح اُس نے اِن تمام سوالات کے جواب بھی اِنہی الفاظ میں دیئے:

کیا تم نے پولیس بیان میں کہا تھا کہ میں شاپ کیپر ہوں۔

کیا تم نے پولیس بیان میں الیاس منیر کے فائر کرنے کی جگہ کا ذکر کیا تھا۔

کیا تم نے تفتیشی افسر کو ان جگہوں کی نشاندہی کی تھی جہاں سے الیاس، اسحاق اور لطف الرحمٰن نے فائر کیا۔

## احمدیوں کے خلاف تعصب

اِس گواہ نے ہمارے ساتھ تعارف کی بنیاد نعمت علی تیلی کے مقدمہ قتل کو قرار دیا تھا (اس کا ذکر ابتداء میں گزر چکا ہے کہ اس کی موت ایک احمدی ملک نصیر احمد صاحب کے ہاتھوں ہوئی تھی جن پر یہ تیلی حملہ آور ہوا تھا اور ملک صاحب موصوف کو اپنا دفاع کرتے ہوئے اس پر فائر کرنا پڑا تھا اور محض اس وجہ سے کہ اس کے قتل کا اِلزام ایک احمدی پر تھا، یہ تیلی اپنے تمام تر 'کارناموں' کے باوجود شہید ختم نبوت قرار دے دیا گیا تھا) حالانکہ اِس مقدمہ کی پیروی کے لئے ہم میں سے سوائے ملک محمد دین صاحب کے کوئی ایک شخص بھی کچہری یا تھانہ نہیں گیا تھا۔ بہر حال اِس کے حوالہ سے وکیل صفائی خواجہ سرفراز صاحب نے گواہ سے پوچھا کہ نعمت علی کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا۔ کیا ہمدردی تھی جس کی وجہ سے تم اس مقدمہ کے لئے جاتے رہے۔ کہنے لگا کہ میری اُس کے ساتھ کوئی رشتہ داری یا سوشل تعلق نہ تھا، صرف اس لئے میں اس کے مقدمہ کے لئے جاتا رہا کہ وہ ایک مسلمان تھا۔ اس پر خواجہ صاحب نے بڑی برموقع پھبتی کسی ''تمہاری طرح کا'' اور گواہ نے اس کی تصدیق کی تو اس کا جواب ان الفاظ میں ریکارڈ کرایا کہ

Naimat Ali was not related to me in any manner except that he was a Muslim like me.

اس بیان میں Like me کے الفاظ نے بڑا لطف دیا اور جہاں مزاح کا رنگ چڑھایا وہاں ان دونوں یعنی گواہ اور نعمت علی کی مسلمانی کی حقیقت بھی آشکار کر دی۔ ہمارے اِس واقعہ سے قبل جامعہ رشیدیہ والوں نے نعمت علی کے حق میں اس کے گاؤں چک 9L /137 جا کر ایک جلسہ کیا تھا۔ اِس کے بارہ میں خواجہ صاحب نے گواہ سے سوال کیا کہ کیا تم اس جلسہ میں شامل ہوئے تھے؟ جواب دیا: ہاں۔ پھر سوال کیا کہ جب تمہارا اُس کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ تھا تو پھر اس کے گاؤں جا کر جلسہ میں شامل ہونے کی وجہ؟ کہنے لگا ایک مسلمان کی حیثیت سے اُس سے ہمدردی کی وجہ سے گیا تھا۔ اس پر خواجہ صاحب نے اسے گھر تک پہنچاتے ہوئے پوچھا:

یہ بتاؤ کہ ہر روز کتنے قتل ہوتے رہتے ہیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے کتنوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہو اور کتنوں کے گاؤں میں جا جا کر جلسے کرتے ہو؟

اس پر گواہ سے کوئی جواب بن نہ آیا۔ تو خواجہ صاحب نے کہا کہ پھر اس کا مطلب یہی ہوا نا کہ اس مقدمہ میں قتل کا الزام ایک احمدی پر تھا اور صرف اسی وجہ سے تم نے اس سے ہمدردی کا اظہار کیا نا! اس کے منہ سے بے اختیار نکلا: ہاں۔

اِن سوالات کا مقصد یہ تھا کہ ممبران عدالت پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ گواہ کے ذہن میں احمدیوں کے خلاف تعصب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور یہ پہلے بھی احمدیوں کی مخالفت میں کوشاں اور پیش پیش رہتا تھا، اس لئے اس کی گواہی کی اس پس منظر میں کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ چنانچہ اپنے اسی مؤقف کو مزید مضبوط بنانے کے لئے آپ نے اس سے احمدیوں کی مساجد کے متعلق پوچھا کہ کیا وہ تمہارے نزدیک پاک ہیں تو اس نے کہا نہیں میں انہیں ناپاک سمجھتا ہوں۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کے نزدیک ان کی مساجد پر کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات کا لکھا ہونا نامناسب ہے اور اُنہیں مٹا دینا چاہئے! یہ بات کہہ کر اس نے ناقابلِ تردید ثبوت مہیا کر دیا کہ 26 اکتوبر کی صبح یہ کلمہ مٹانے ہی مسجد احمدیہ گئے تھے لیکن جن کو بتانے کے لئے یہ باتیں ہو رہی تھیں، وہ تو صُمٌّ بُكْمٌ عُمْیٌ بنے بیٹھے تھے اور لا یرجعون کے مصداق وہ ناانصافی کرنے سے کسی طرح باز آنے والے نہیں تھے۔

اس کے بعد محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے گواہ عبدالرزاق پر جرح کے دوران بڑی مہارت کے ساتھ دو تین باتیں اور بھی اُگلوالیں۔ آپ نے سوال کیا کہ عبداللطیف کے تھانہ جانے کے بعد پولیس کے آنے تک کیا آپ مسجد کے دروازے کے سامنے کھڑے رہے؟ اس نے کہا ہاں ہم وہیں کھڑے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے کھڑے ہونے کا یہ مقصد تھا کہ ملزمان کی کسی اور کارروائی کا بھی نوٹس لیں لیکن اس نے نہ تو Examination in Chief میں نہ جرح میں اور نہ ہی پولیس بیان میں ملزمان کی کسی مزید کارروائی کا ذکر کیا۔ اس طرح سے گویا اس نے بین السطور ان امور کی گواہی دے دی کہ

الف۔ قاری بشیر احمد کی نعش مسجد کے اندر لے جانے کے بعد اُسے باہر کوئی نہیں لایا۔

ب۔ باہر کے دروازہ پر لکھا ہوا کلمہ طیبہ (احمدیوں میں سے) کسی ملزم نے نہیں مٹایا۔

ج۔ کوئی ملزم جائے وقوعہ سے فرار نہیں ہوا۔

پہلی بات یعنی قاری بشیر احمد کی نعش مسجد کے اندر سے باہر لانے کا تو گواہ نے اپنے عدالتی بیان میں ازالہ کر دیا جس کا کچھ ذکر اوپر گزر چکا ہے اور کچھ آئندہ سطور میں آ رہا ہے مگر دوسری باتیں اُسے اُس وقت محسوس ہوئیں جب استغاثہ کے Closing Address کا صفائی کے وکلاء منہ توڑ اور دندان شکن جواب دے رہے تھے۔

## بیان کا ضمیمہ، ناانصافی کا ایک اور مظاہرہ

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اس گواہ نے 16 مارچ کو جب اپنا بیان عدالت میں مکمل کر لیا تو اُس وقت ان کے وکلاء کو قاری بشیر احمد کی نعش باہر لانی یاد آئی اور انہوں نے اُسی وقت کوشش کی کہ ابھی اسے باہر لا کر رکھ دیں مگر صفائی کے وکلاء

کی بروقت مداخلت سے اُسے اُس وقت تو باہر نہ لایا جاسکا۔ تاہم صفائی کے وکلاء بھی کب تک یہ کوشش کر سکتے تھے اور کہاں تک زور لگا سکتے تھے! ظاہر ہے اُسی حد تک کہ عدالت حق وانصاف پر قائم رہتی اور جب عدالت ہی کہنے لگے کہ ''میں نہ مانوں'' تو پھر اس کے سامنے کسی کا کیا بس چل سکتا تھا۔ چنانچہ اگلے روز یعنی 17 مارچ کو جب گواہ مذکور پر جرح مکمل ہوگئی تو اس نے رخصت ہونے سے قبل عدالت سے عرض کیا کہ سر! کل مجھے بیان دیتے ہوئے ایک بات یاد نہیں رہی تھی۔ عدالت نے بڑی ہمدردی سے اور تجاہل عارفانہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ اس نے قاری بشیر کی نعش کو مسجد سے باہر لانے کے بارہ میں کچھ کہنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر عدالت نے اسے اجازت دے دی کہ ہاں تم نعش کو باہر نکال لاؤ۔ اس پر محترم مجیب صاحب نے جو پہلے ہی اس بات سے آگاہ تھے اور بڑے غور سے اس مکالمہ کو سن رہے تھے سٹینو کو مخاطب کر کے کہا لکھو کہ:

اس موقع پر جبکہ Counsel for defence گواہ پر اپنی جرح مکمل کر چکی ہے، گواہ اپنے عدالتی بیان میں کچھ ایزادی کرنا چاہتا ہے اور عدالت اسے اس بات کی اجازت دیتی ہے۔

میں نے ممبرانِ عدالت کے چہروں کو اُس لمحہ دیکھا تو یوں لگا جیسے محترم مجیب الرحمٰن صاحب کے اس آخری فقرہ نے انہیں کاٹ کر رکھ دیا ہو اور ان کے احساسات ایسے لگتے تھے جیسے ان کی کسی غیر قانونی حرکت کو ریکارڈ کر دیا گیا ہو لیکن انہیں یہ بات بہر حال کڑوی گولی کے طور پر نگلنا پڑی۔

گواہ کی اس ترمیم کے بعد وکیل صفائی کو پھر جرح کا موقع دیا گیا چنانچہ آپ نے سوال کیا کہ یہ بات تمہیں کب اور کس طرح یاد آئی۔ اس نے کہا کہ کل جب میں عدالت سے باہر گیا تو مجھے یہ بات یاد آئی۔ مگر حقیقت تو 'یاد آئی' کی بجائے 'یاد کرائی گئی' کے الفاظ میں تھی اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے دوسرے سوال کہ پھر تم نے اُسی وقت عدالت کو کیوں نہ بتایا؟ کے جواب میں کہا کہ میں نے خیال کیا کہ میں اپنے اوپر جرح مکمل ہونے دوں پھر کہوں گا۔ محترم مجیب صاحب نے اس موقع پر چند اور سوالات کر کے بہت ہی محفوظ پوزیشن بنالی۔ آپ نے اس سے یہ اقرار کروالیا کہ جب پولیس آئی تو اُس وقت اُس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ ملزمان قاری بشیر کی نعش کو یہاں واپس رکھ گئے ہیں۔ اس اقرار سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ جو عبداللطیف کے متعلق مجیب صاحب نے کہا تھا کہ اسے پولیس کے ساتھ واپس بیت الحمد آنے پر قاری بشیر کی نعش کو باہر دیکھ کر حیرانی کا اظہار کرنا چاہئے تھا، اُس نکتہ کو اس اقرار سے تقویت ملتی تھی۔ کیونکہ اگر کسی گواہ نے پولیس کے آتے ہی اس کو یہ بتادیا ہوتا تو پھر اس پر حیرانی کا اظہار کیا ہوسکتا تھا۔ اب یہ کیفیت ہے کہ کسی نے بتایا بھی نہیں اور مدعی بھی خاموش ہے، ظاہر ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

اس کے بعد آپ نے گواہ سے یہ پوچھا کہ واقعہ ہونے کے بعد ظاہر ہے کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے ہوں گے۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں ہاں اُس وقت بہت سے لوگ موجود تھے جنہوں نے ملزمان کی یہ سرگرمیاں (نعشوں کی نقل و حرکت اور کلمہ مٹانا وغیرہ) دیکھیں۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے کسی کو بھی حق بات کہنے کی جرأت نہ ہوئی اور اِستغاثہ کو گواہ ملے تو صرف یہی چار جنہوں نے اپنا ضمیر نہایت گھٹیا قیمت پر بیچ کر حق و انصاف کا خون کیا اور اُن میں سے بھی دو عدالت میں پیش نہ کئے گئے۔ گواہ کے مذکورہ بالا جواب کی بنیاد پر بھی محترم مجیب صاحب نے اپنے آخری ایڈریس میں اِستغاثہ کی خوب درگت بنائی۔ آخر پر مجیب صاحب نے گواہ سے بار بار کہلوا کر گواہ اور کورٹ کی تسلی کرائی کہ اب کوئی ایسی بات نہیں رہی جو یہاں کہنے کے لئے اس کے بعد اُسے یاد آ جائے گی۔

17 مارچ کی پیشی کے آخر پر سرکاری وکیل نے کہا کہ اب اگلی تاریخ پر مقدمہ کے تفتیشی افسران اِستغاثہ کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوں گے۔ ہم بقیہ چشم دید گواہوں کو چھوڑتے ہیں۔ اِس پر محترم مجیب صاحب کہنے لگے:

''اچھا! میں تو سمجھا تھا کہ بڑے بڑے علماء آئیں گے، ابھی تو مزہ ہی نہیں آیا تھا''

اس سے قبل ایک دو مواقع پر اِستغاثہ کے پرائیویٹ وکیل ملک فضل کریم باتوں باتوں میں کہہ چکے تھے کہ ممکن ہے ہم پورے گواہوں کو پیش ہی نہ کریں۔ ان کو پیش نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے پولیس بیان میں اقرار کیا ہوا تھا کہ:

ہم میں سے پانچ افراد مسجد احمدیہ کے 'اندر' چلے گئے تھے ........

اور یہ بات ان کے مقدمہ کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتی تھی کیونکہ ان کی تو کہانی کی بنیاد ہی اِس جھوٹ پر تھی کہ ہم مسجد سے باہر تھے۔ 'پُرامن اور شریفانہ' طور پر وہاں آئے تھے ہمیں 'بے گناہ' مارا گیا۔ ورنہ اِستغاثہ والے کبھی ایسا نہیں کیا کرتے کہ ان کے کل چشم دید گواہان صرف چار ہوں اور ان میں سے بھی دو کو چھوڑ دیں۔ ظاہر ہے یہ کیس کو بری طرح کمزور کر دینے والی بات ہے۔ اگر نیت صاف ہو تو اسی ایک بات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کیس کی کیا حیثیت ہے مگر فوجی عدالت نے بھی، جسے اپنے انصاف پر فخر ہوتا ہے، اس امر کا نوٹس لینے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کیونکہ یہ منصف بھی تو قیدی ہی تھے۔

## اِنسپکٹر قاضی ایاز احمد صاحب کا بیان

30 مارچ کو عدالت لگی تو کمرۂ عدالت حسب معمول پوری طرح بھرا ہوا تھا کیونکہ آج بھی بنیادی اہمیت کے حامل گواہوں کی گواہیاں تھیں۔ سب سے پہلے تھانہ اے ڈویژن کے تھانیدار قاضی ایاز احمد انسپکٹر پولیس بیان دینے کے

لئے بلائے گئے۔ ہمارے مقدمہ میں سب سے اہم کردار اُنہی کا تھا۔ اُنہوں نے دیانتداری اور جرأت کا مظاہرہ کر کے مقدمہ کی بنیادی دستاویزات کو حقائق کے مطابق تیار کر دیا ہوا تھا۔ عدالت میں بھی انہوں نے اپنے بیان میں بنیادی اُمور حقیقت کے مطابق بیان کئے۔ یہ بنیادی طور پر شریف النفس انسان تھے لیکن ان حالات میں واضح طور پر مکمل سچی گواہی دینا ان کے لئے ممکن نہ ہوسکا اور بعض اُمور سے انہوں نے بہر حال چشم پوشی کی اور جانتے بوجھتے ہوئے کئی سوالات کے جوابات میں حقیقت حال سے انکار کیا، مثال کے طور پر:

☆ اُنہوں نے حملہ آور یعنی اس مقدمہ کے اصل ملزمان کی اُن جوتیوں کا ذکر ہی نہ کیا جنہیں وہ بھاگتے وقت چھوڑ گئے تھے اور وہ ہماری مسجد کے اندر پڑی تھیں اور پولیس نے تفتیش کے دوران اپنے قبضہ میں بھی لیں تھیں۔ ظاہر ہے کہ تفتیش کرتے ہوئے معاملہ کی تہ تک پہنچنے کے لئے یہ جوتیاں کافی راہنمائی کرسکتی تھیں کہ حملہ آور مسجد کے اندر داخل ہوئے یا نہیں؟

☆ نیلے رنگ کے عمارتی روغن سے آلودہ اُس بُرش سے متعلق بھی یہ بات نہ بتائی کہ وہ مسجد کے صحن میں مردہ حالت میں چت پڑے ہوئے مقتول اظہر رفیق کے دائیں ہاتھ سے برآمد ہوا تھا جو اُس کے دائیں کولہے کے نیچے آیا ہوا تھا۔

☆ مسجد کے ہال میں بہت سارے چھرّے بھی پڑے تھے مگر معائنہ کے وقت یا تو وہ نظر نہیں آئے یا پھر کسی مصلحت کے تحت انہیں نظر انداز کیا گیا۔ بہرحال وہ چھرے اُسی روز ملک محمد دین صاحب نے آ کر جمع کر کے پولیس کو دیئے تھے لیکن بعد میں معلوم نہیں وہ کہاں گئے۔

☆ رانا نعیم الدین صاحب کو تو پولیس نے آتے ہی حراست میں لے لیا تھا اور باقی ہر کام بعد میں ہوا تھا۔ ہمیں (برادرم حاذق رفیق، عزیزم محمد نثار، عزیزم عبدالقدیر اور خاکسار کو) تو 12 بجے کے قریب محترم میاں عاشق صاحب کے گھر سے صرف گواہیاں لینے کے لئے تھانہ لے کر گئے تھے لیکن قاضی صاحب نے یہاں اپنے بیان میں کہا کہ ان سب کو اکٹھا گرفتار کیا گیا۔

قاضی صاحب اپنے اوپر جرح کے دوران بعض اوقات بعض سوالات کا خاص انداز میں ہنس کر انکار کرتے رہے کیونکہ یہ ایسی باتیں تھیں جو تھیں تو سچ اور ان کے سچا ماننے پر ان کا ضمیر بھی انہیں مجبور کرتا تھا مگر اپنی ملازمت بچانے کی خاطر ان سے انکار کرتے رہے، مثلاً:

☆ اُن سے پوچھا گیا کہ اِس واقعہ کے بارہ میں نعیم الدین کی درخواست آپ کو موصول ہوئی؟ کہنے لگے مجھ سے پہلے روز ہی تفتیش لے لی گئی تھی، بعد میں آئی ہو تو پولیس فائل میں لگی ہوگی۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ آپ ذرا پولیس فائل

دیکھ کر بتا دیں، کہنے لگے: عدالت اگر چاہے تو دیکھ سکتی ہے۔ اس پر خواجہ صاحب نے پھر صاف اور سیدھا سوال کیا کہ کہیں آپ اس لئے تو اس سے نہیں بچ رہے کہ آپ کا جرح کے دوران دیا ہوا ایک جواب غلط نہ ہو جائے؟ بات چونکہ سچی تھی اس لئے ہنس کر کہنے لگے 'نہیں نہیں یہ بات تو نہیں ہے'۔

☆ پھر مجیب صاحب نے آخر میں FIR سے متعلق ایک چبھتا ہوا سوال یہ کیا کہ کیا حقیقت میں ایسا تو نہیں کہ FIR دس بجے رات رجسٹر کی گئی ہو اور اس دوران آپ کا روزنامچہ بند پڑا رہا ہو۔ بات یہ بھی بالکل درست تھی لیکن مصلحتیں آڑے آئیں اور انہوں نے اس حقیقت سے بھی انکار کیا۔

☆ ایک بات جو غالباً ریکارڈ پر نہیں آئی یہ پوچھی گئی تھی کہ آپ سے تفتیش کیوں واپس لے لی گئی؟ کہنے لگے مجھے معلوم نہیں۔ پھر پوچھا کہیں امر واقعہ یہ تو نہیں کہ آپ صاف اور سچی تفتیش کرنا چاہتے تھے جو استغاثہ کے خلاف جاتی تھی اس لئے آپ کو اس تفتیش سے فوری طور پر علیحدہ کر دیا گیا تھا؟ اس پر بھی قاضی صاحب نے وہی انداز بنا کر معنی خیز اور گہری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا مگر نفی میں۔

☆ یہ بات بھی پوچھی گئی کہ آپ تو واقعہ کی تہ تک فوراً پہنچ گئے تھے اور اسی کے مطابق آپ کارروائی کرنا چاہتے تھے مگر دباؤ ڈال کر آپ کو مجبور کیا گیا کہ اس اس طرح FIR کاٹو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس پر بھی کمرۂ عدالت میں بالکل ویسی ہی مسکراہٹ بکھری مگر جواب پھر نفی میں آیا۔

اِن امور سے چشم پوشی کرنے کے باوجود دیگر بنیادی اور اہم باتیں قاضی صاحب نے بالکل ٹھیک بتائیں، اللہ انہیں اس کی جزاء دے، مثلاً:

☆ FIR کے مطابق دونوں حملہ آور مسجد کے باہر مارے گئے تھے مگر قاضی صاحب نے بتایا کہ انہیں مسجد کے باہر قاری بشیر کے مرنے کی جگہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ پر تلاش کرنے کے باوجود خون کا کوئی اور نشان نہ ملا یعنی دوسرے مقتول اظہر رفیق کا خون باہر تھا ہی نہیں۔

☆ انہیں گزشتہ تین چار ماہ کے دوران (جب سے موصوف ایس ایچ او تھانہ اے ڈویژن مقرر ہوئے تھے) کبھی کسی بھی شخص کی طرف سے قادیانی آرڈیننس کی خلاف ورزی کی شکایت موصول نہ ہوئی۔

☆ انہوں نے ایک اہم بات یہ بتائی کہ جب تک ان کے پاس تفتیش رہی، انہیں ملزمان کے اس وقوعہ میں ملوث ہونے کے بارہ میں کوئی شہادت نہ ملی۔

☆ اُنہوں نے سرکاری افسر کی حیثیت سے 'اسلام کے ان ٹھیکیداروں' کی طرف سے احمدیہ مساجد سے کلمہ طیبہ مٹانے

کے مطالبہ کا علم ہونے کا اظہار کرنے سے احتراز کیا۔ تاہم خواجہ صاحب کے ایک سوال کے جواب میں یہ ضرور اقرار کر لیا کہ ایک عام شہری ہونے کے لحاظ سے اُنہیں علم تھا کہ سارے پاکستان میں نام نہاد مجلس تحفظ ختم نبوت احمدیہ مساجد سے کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات مٹانے کے مطالبے کر رہی ہے۔

اس سب کچھ کے باوجود قاضی ایاز کا بیان بہت اچھا رہا کیونکہ اُنہوں نے مذکورہ بالا تین چار اہم باتیں بالکل درست بتا دیں تھیں۔ ایک بات مسجد سے باہر دوسرے مقتول کا خون نہ ملنے والی اور دوسری یہ کہ جب وہ مسجد پہنچے تو اُس وقت کلمہ طیبہ مٹا ہوا تھا۔ تیسرے یہ کہ ملزمان کے خلاف کوئی ایسی واقعاتی شہادت نہ مل سکی جس سے ان کا وقوعہ میں ملوث ہونا ثابت ہوتا۔ قاضی صاحب کو عدالت نے فارغ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کل بھی آئیں۔ آپ سے کورٹ کچھ سوالات کرے گی۔ اگلے روز بلانے میں کیا حکمت تھی؟ آج ہی سوالات کر لیتے، ظاہر ہے کسی سے جا کر مشورہ کرنا ہوگا!

## دوسرے تفتیشی افسر

اگلے روز 31 مارچ کو پھر عدالت لگی اور پابندئ وقت کی فوجی روایات کے سراسر خلاف مگر اپنے معمول کے مطابق ممبرانِ عدالت مقررہ وقت کی بجائے کافی تاخیر سے آئے جس کی وجہ سے بارہ بجے کے قریب کارروائی شروع ہوئی۔ آج ہمارے مقدمہ کے دوسرے تفتیشی افسر ملک تصدق حیات صاحب انسپکٹر پولیس پیش ہوئے جو دورانِ ریمانڈ متعدد مواقع پر بڑے وثوق، اعتماد اور یقین کے ساتھ ہمیں کہہ چکے تھے کہ بالکل بے فکر رہیں، اس مقدمہ میں بالکل انصاف کروں گا نیز اُن کا دعویٰ تھا کہ تفتیش کا نتیجہ خدشات کے بالکل اُلٹ نکلے گا۔ انہوں نے بھی دوسروں کی طرح حلف اٹھانے، خدا کی قسم کھانے اور اپنے ایمان کا اقرار کرنے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔

ان کا بیان محض چند سطروں پر مشتمل تھا کہ مجھے 27 اکتوبر کو اس مقدمہ کی تفتیش تفویض ہوئی جس پر میں نے ملزمان اسحاق اور محمد دین کو گرفتار کیا۔ پھر اسحق کا ریوالور برآمد کیا اور 22 دسمبر 84ء کو تفتیش مکمل ہونے پر تھانہ اے ڈویژن ساہیوال کے ایس ایچ او بشیر احمد انسپکٹر کو تمام ملزمان کا چالان Submit کرنے کی ہدایت کی اور بس!

گویا پونے دو مہینے تک جس تفتیشی کارروائی میں یہ گواہ مصروف رہا، وہ سب کچھ یہی تھی کہ سارے ملزمان کا چالان کر دو! یہ گواہ اپنی طرف سے بڑا چالاک بنتا رہا اور سمجھتا رہا کہ وہ بہت ماہر اور مشاق افسر ہے۔ ہمارے وکلاء سوالات پوچھتے تو وہ انہیں چنداں اہمیت نہ دیتا اور لاپرواہی کے ساتھ گول مول جوابات دے کر ٹرخانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کے مسلسل ایسے رویہ کی وجہ سے محترم مجیب صاحب کو بہت غصہ آیا اور ایک مرتبہ جو اس نے سوال کا سیدھی طرح جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے گول مول سی بات کر کے عدالت میں تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ یہ وکیل میرے

سامنے کیا چیز ہے تو محترم مجیب صاحب بھر پور جلال کے ساتھ گرجے:

'صحیح جواب دو، کس کو چار رہے ہو'

مجیب صاحب کی اس گرج سے انسپکٹر تصدق ایسا دبکا کہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ مجیب صاحب کی بات میں اس قدر وزن تھا کہ عدالت کے لئے بھی خاموش ہو کر رہ جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔ سرکاری وکیل جو اندر کی بات جانتا تھا وہ بھی منہ میں قلم دبا کر حیرت میں ڈوب گیا جبکہ ملک فضل کریم کے چہرہ پر دبی دبی مسکراہٹ کا احساس نمایاں تھا۔ چند لمحوں کے بعد جب بات پھر چلی تو Prosecuting Inspector شاہ حسین صاحب نے مجیب صاحب سے کہا کہ آپ نے یہ زیادتی کی ہے۔ اس پر مجیب صاحب مسکراتے ہوئے بولے I am sorry for that اور پھر باتوں باتوں میں اس معاملہ کو سمیٹ گئے۔

یہ زیادتی تھی یا نہیں بہر حال اس سے انسپکٹر کو ہوش ضرور آ گیا کہ کس سے واسطہ پڑا ہے اور اس کے بعد اس نے زیادہ گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس کے رویہ، انداز اور جوابات کو دیکھ اور سن کر حیرت ہوتی تھی کہ یہ معیار ہے ہمارے پولیس افسران کا! میں تو حیرانی سے یہی سوچتا رہا کہ اسے انسپکٹر کس نے بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر مجیب صاحب نے پوچھا کہ بھئی یہ تو بتاؤ کہ غروب آفتاب سے لے کر طلوع آفتاب تک Right of Private Defence کیا ہے اور کیا یہ دِن کے وقت حق خود حفاظتی سے مختلف نہیں؟ اس نے اس کا علم ہونے سے صاف اِنکار کر دیا۔ اب خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ جسے اِس قدر بنیادی بات کا بھی علم نہ ہو، وہ انسپکٹر کیسے ہو سکتا ہے! دراصل یہ حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد اسی نکتہ سے متعلق محترم مجیب صاحب نے بعض نظیریں ہائی کورٹس کے مختلف فیصلہ جات سے پیش کرنے کے لئے ایک ضخیم سی کتاب اٹھائی تو اس نے کتاب کھلنے سے پہلے ہی ہاتھ کے اشارے سے اپنی بے بسی اور بے بساطی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسے رہنے دیں مجھے ان کا نہیں پتہ۔ اس پر محترم مجیب صاحب نے معنی خیز مسکراہٹ اور مخصوص انداز کے ساتھ مذکورہ کتاب ایک طرف رکھ دی۔

محترم رانا نعیم الدین صاحب کی درخواست کے متعلق بھی اِس گواہ نے بہت ٹال مٹول اور ٹرخانے کی کوشش کی اور حتی الامکان اس کے متعلق کسی بھی سوال کے جواب دینے سے احتراز کیا۔ اس صورت میں محترم مجیب صاحب کو بار بار Question ریکارڈ کرانے پڑے اور گرمی سردی کا مظاہرہ کرنا پڑا اور یہ گواہ جو سمجھ رہا تھا کہ وہ ان کے قابو آنے سے رہا، اس کو خوب اچھی طرح سے پکڑا۔ بالآخر گواہ کو اپنی ضمنیاں دکھانی پڑیں اور یہ کہنا پڑا کہ باقی ریکارڈ دیکھنے کے لئے تھانہ کا رجسٹر روانگی ڈاک منگوا لیں۔ انسپکٹر تصدق نے تو خود ہوشیار چالاک اور دوسروں کو بیوقوف بنانے کی حد ہی کر دی، مثلاً

مجیب صاحب نے سوال کیا کہ کیا یہ واقعہ سورج طلوع ہونے سے پہلے ہوا؟ کہنے لگا معلوم نہیں۔ اِس پر مجیب صاحب نے سوال پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے بڑے زور سے کہا: براہ کرم اپنا ریکارڈ Consult کر کے مجھے جواب دیجئے کہ یہ واقعہ کب ہوا؟ اس پر اس نے پولیس فائل کھولی اور کہنے لگا۔ ہاں طلوع آفتاب سے پہلے ہوا۔

باقی تمام گواہوں کی طرح انسپکٹر تصدق نے بھی 'میں نے ضرورت محسوس نہیں کی' کے مخصوص الفاظ رٹے ہوئے تھے۔ وکیل صفائی جس بات کو حل کرنے کی کوشش کرتے یا کوئی ایسا سوال کرتے جس سے حقیقت سامنے آنے کا خطرہ ہوتا تو انہی الفاظ میں جواب ملتا۔ مثلاً سوال کیا گیا کہ آپ نے لطف الرحمٰن کی گن برآمد کی، قبضہ میں لی تو اُسے Expert کے پاس کیوں نہیں بھیجا؟ جواب ملا 'میں نے ضرورت محسوس نہیں کی'۔ سوال ہوا اسحاق کا ریوالور Expert کو کیوں نہیں بھیجا؟ اب کے بھی وہی جواب دیا کہ میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ پھر سوال ہوا کہ دو ماہ کے قریب آپ کے پاس تفتیش رہی، آپ نے ملزمان کے خلاف کیا کیا ثبوت جمع کئے۔ اب کے جو جواب ملا، وہ تاریخی جواب تھا:

'میرے پاس تفتیش آنے سے پہلے ہی کافی ثبوت جمع ہو چکے تھے'

پھر پوچھا گیا کہ آپ نے کیوں مزید ثبوت نہیں اکٹھے کئے؟ جواب پھر وہی تھا کہ میں نے ضروری نہیں سمجھا۔ اب دیکھئے کیسی عجیب بات ہے کہ پہلا تفتیشی افسر کہہ گیا ہے کہ ملزمان کے خلاف مجھے کوئی ایسی واقعاتی شہادت نہیں ملی جس سے ثابت ہو سکتا کہ ملزمان اس وقوعہ میں ملوث تھے اور یہ تفتیشی افسر کہہ رہا ہے کہ اُس نے مزید کوئی ثبوت اکٹھے ہی نہیں کئے کیونکہ اُس کے پاس تفتیش آنے سے پہلے ہی کافی ثبوت جمع ہو چکے تھے۔ سمجھ نہیں آتی کہ ایسی صورت حال میں چالان کس بناء پر کیا گیا؟ کیا صرف Complainant اور اس کے تین ساتھی چشم دید گواہوں کے بیانات کو ہی کافی ثبوت تصور کر لیا گیا تھا؟ اگر اِنہی گواہوں کے بیانات کو ہی کافی ثبوت قرار دیا گیا تھا تو اس کے متعلق بھی غور فرما لیجئے، اسی انسپکٹر تصدق کے نزدیک اِن بیانات کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔

سوال ہوا کہ کیا کسی نے آپ کے پاس آ کر کوئی ایسا بھی 'صفائی' کا بیان دیا جس میں بتایا گیا ہو کہ وقوعہ کے لئے مسجد احمدیہ آنیوالے افراد چھ سے زائد تھے۔ اس موقع پر بھی گواہ نے حتی المقدور تنگ کرنے کی کوشش کی۔ ان کے ذکر سے احتراز کیا اور کافی ردوکد کے بعد جواب دیا کہ مجھے دو گواہوں نے بتایا تھا۔ اس پر سوال ہوا کہ پھر آپ نے ان کی گواہی کو تفتیش میں کس طرح شامل کیا یعنی کیا نتیجہ نکالا۔ گواہ نے جواب دیا کہ جناب وہ دونوں گواہ Offensive Party سے تعلق رکھتے تھے یعنی احمدیوں کے طرفدار تھے اس لئے ان کی گواہی کو درخور اِعتناء نہ سمجھا گیا۔ اب ذرا انصاف کے ساتھ غور فرمائیے! ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ گواہ ملزمان کی پارٹی سے تھے حالانکہ وہ احمدی تھے نہ ہی کسی احمدی

کے رشتہ دار، نہ ہی کسی ملزم کے ہم ذات یا ہم قوم لیکن اس کے باوجود ان کو صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے ملزموں کے حق میں بات کی تھی، رد کر دیا گیا جبکہ دوسری طرف استغاثہ کے گواہوں پر اس قسم کا کوئی قانون یا اصول لاگو نہیں ہو رہا۔ کیا وہ مدعی کی پارٹی نہیں تھے، کیا وہ جامعہ رشیدیہ کے پروردہ نہیں تھے؟ اگر صفائی کے اِن گواہوں کی گواہی قابل قبول نہیں تھی تو اُن کی کس طرح ہوگئی جن کا سارا ماضی کیا حال بھی احمدیوں کی دشمنی سے بھرا پڑا ہے؟ تم پیو تو ٹھیک ہم پئیں تو پاپ۔

اِنہی گواہوں کے بیانات حاصل کرنے کے لئے صفائی کے وکلاء نے مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ یہ بیانات آپ کو نہیں دیئے جا سکتے، اس کے ساتھ ہی سرکاری وکیل بھی میدان میں کود پڑا اور حوالوں کے ترکش کھل گئے جس پر عدالت نے سماعت تھوڑی دیر کے لئے روک دی۔ کمرۂ عدالت خالی ہوگیا تا ممبران عدالت اس بارہ میں کسی فیصلہ پر پہنچ سکیں۔ کافی دیر بعد سماعت پھر شروع ہوئی اور سب سے پہلے عدالت کا فیصلہ سنایا گیا کہ وہ گواہان جن کے بیانات پولیس نے ملزمان کی درخواست پر قلمبند کئے تھے Prosecution والے ان کی نقول صفائی والوں کو مہیا کریں گے تب اُن بیانات کی نقول ہمیں ملیں۔ اس گواہی کے دوران وقفہ برائے چائے بھی ہوا۔ اِس کا اعلان کرتے ہوئے کرنل صاحب نے مجیب صاحب سے کہا آپ بھی چائے پی لیں اور انسپکٹر صاحب (گواہ) بھی۔ اُس وقت مجیب صاحب جرح کر رہے تھے اور گواہ کے سر پر کھڑے تھے۔ کرنل صاحب کی بات سن کر آپ اپنا سارا سامان سمیٹتے ہوئے فرمانے لگے کہ ہاں ہاں ضرور چائے پئیں بلکہ انسپکٹر صاحب اگر پسند فرمائیں تو ہمارے ساتھ چائے پئیں کیونکہ ویسے تو یہ ہمارے بھائی ہیں، عدالت میں تو اور بات ہوتی ہے نا! مجیب صاحب کی یہ بات سن کر انسپکٹر تصدق اپنی کرسی سے اُٹھ کر بزبان حال اس پیشکش کو رد کرتے ہوئے بیچ میں سے اس طرح نکل کر باہر چلا گیا جیسے کوئی مار کھا کھا کر تنگ آ چکا ہو اور اس نے شکر کیا ہو کہ جان چھوٹی سو لاکھوں پائے۔

ایک موقع پر جب خواجہ صاحب نے گواہ سے پوچھا کہ آپ کو ان ملزمان کے خلاف کیا کیا شہادتیں ملیں جن کی بناء پر آپ نے ان کا چالان کرنے کی ہدایت کی تو گواہ نے تمام ملزمان کا پیش نہ ہونا، لطف الرحمٰن صاحب کا وقوعہ سے ایک روز پہلے بینک سے رخصت پر ہونا، صفائی کی طرف سے ایک ماہ کی تاخیر سے شہادتوں کا آنا اور ملزمان کی طرف سے دو متضاد درخواستوں کا آنا اور وقوعہ میں ملوث نہ ہونے کے بارہ میں کسی ٹھوس ثبوت کا نہ ہونا بیان کیا اور اسی ضمن میں گواہ نے بتایا کہ ملزمان نے مسجد پر حملہ آور ہونیوالوں کی تعداد مختلف بتائی۔ کسی نے 20 سے 30، کسی نے 30 سے 40 اور کسی نے 40 سے 50 تک۔ اس موقع پر خواجہ صاحب نے بڑا ہی زبردست اور منہ توڑ جواب دیا، کہنے لگے کہ بھئی سب نے

چھ سے تو زیادہ ہی بتائی ہے نا! اُس نے کسی قدر پس و پیش کرتے ہوئے کہا: ہاں۔ خواجہ صاحب نے پھر کہا کہ

جناب اصل بات تو یہ ہے کہ سب نے چھ سے زیادہ تعداد بتائی ہے، باقی رہا ان کا اختلاف تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کو تجربہ ہوتا ہے اور وہ دیکھتے ہی کہہ دیتا ہے کہ مجمع 140 افراد کا ہے جبکہ دوسروں کو تجربہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اُن میں سے بعض اسے 125 بعض 150 کہہ دیتے ہیں۔ اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں۔

جب یہ بات گواہ نے کہی تھی تو مجھے بادی النظر میں کافی مضبوط معلوم ہوئی تھی لیکن جب اس کے چھکے چھوٹتے دیکھے تو حیران رہ گیا محترم خواجہ صاحب کی لیاقت پر کہ کس طرح بات کا پاسا ہی پلٹ کر رکھ دیا۔ رہیں اس کی دیگر باتیں تو قانون یاد رہے کہ کسی کے خلاف الزام کو ثابت کرنا مدعی کی ذمہ داری ہوتی ہے نہ کہ ملزم نے صفائی پیش کر کے اپنے پر لگائے جانے والے الزام کو دور کرنا ہوتا ہے۔

## استغاثہ کی درخواست مسترد

اس گواہ کا بیان ہو چکا تو کرنل صاحب نے یہ اعلان کیا کہ استغاثہ کی طرف سے دی گئی ایک درخواست کو DMLA نے مسترد کر دیا ہے۔ جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ملزمان پر دفعہ 298B کا بھی چارج لگایا جائے۔ محترم مجیب صاحب نے فرمایا پھر تو کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں کیونکہ اس واقعہ کی بنیاد ہی اذان پر ہے، جب وہی نہیں دی گئی تو اس کا مطلب ہوا کہ یہ سب واقعہ ہی جھوٹ ہے۔ اس پر کرنل صاحب نے جواب دیا کہ ممکن ہے انہوں نے کہا ہو کہ چونکہ 302 (جو کہ سب سے بڑی دفعہ ہے) لگی ہوئی ہے اس کے ساتھ اس کی ضرورت نہیں۔ بہر حال اس موقع پر بھی ہلکا سا شغل ضرور لگ گیا۔

## عدالت کی کھلم کھلا جانبداری

اس کے بعد کورٹ نے اپنے سوالات اس گواہ (یعنی تفتیشی افسر انسپکٹر تصدق) پر کرنے شروع کئے، بالکل اُسی لہجے میں جس کا میں اس سے قبل ذکر کر چکا ہوں یعنی کھلم کھلا طرفداری کرتے ہوئے۔ اس کے لئے کورٹ نے بڑے میٹھے اور معصوم انداز میں تمہید باندھی کہ اب ہم بعض ایسی باتیں آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں جو تجربہ کی ہیں یعنی آپ ماشاء اللہ ایک ذمہ دار پولیس افسر ہیں، آپ کا تجربہ بہت وسیع ہوگا۔ آپ ہمیں اپنے تجربہ کی روشنی میں بتائیں کہ کیا یہ عام طور پر نہیں ہوتا کہ جب ملزمان زیادہ ہوں تو ان میں سے کوئی ایک ملزم اپنے سر پر ارتکاب جرم کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ یہ سوال کورٹ نے کس مقصد کے لئے کیا اور کیا عدالت کو اس قسم کے سوال کا حق بھی تھا؟ یہ سوال دراصل اُس کمی کو دور کرنے کے لئے تھا جو ان کے خیال میں گواہ کے بیان میں رہ گئی تھی اور استغاثہ کے موقف کو سہارا دینے کے لئے تھا۔ گواہ نے لازماً کورٹ کا کہا ماننا تھا چنانچہ اس نے فوراً کورٹ کے ذہن کے مطابق اس کا اثبات جواب میں دے دیا:

بالکل درست ہے کہ ایک شخص باقیوں کو سزا سے بچانے کے لئے ایسا کر لیتا ہے

لیکن اس نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اس سوال اور اُس کے جواب پر کئی اَور سوال اُٹھتے ہیں چنانچہ کورٹ کے سوالات کے بعد جب خواجہ صاحب کو جرح کا موقع ملا تو انہوں نے گواہ سے پوچھا کہ کورٹ کے پہلے سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ قتل کا چارج ایک سے زائد ملزمان پر ہو تو اُن میں سے ایک قتل کی ذمہ داری لے لیتا ہے جبکہ یہاں تو صورت حال برعکس ہے۔ ایک ایسا شخص اس ذمہ داری کو قبول کر رہا ہے جس پر Charge of Killing ہے ہی نہیں۔ اس سوال پر عدالت میں بہت بحث ہوئی۔ خواجہ صاحب کا نکتہ یہ تھا کہ یہ Charge of Killing والا ملزم اَور حیثیت رکھتا ہے جبکہ باقی ملزمان اَور۔ عدالت، گواہ اور اِستغاثہ کی ٹیم اس بات پر مصر تھی کہ اس وقوعہ کے تمام ملزمان پر چونکہ 302 لگی ہوئی ہے اس لئے ان سب کی حیثیت ایک ہی ہے یعنی وہ اس بات کو تسلیم نہ کر رہے تھے کہ کسی ملزم پر بوجھ کم اور کسی پر زیادہ ہے حالانکہ ان کے ضمیر اِسی امر کی گواہی دے رہے تھے مگر چونکہ یہ بات ان کے خلاف جاتی تھی اِس لئے عدالت اور اِستغاثہ والے ماننے میں نہ آ رہے تھے۔ اس پر خواجہ صاحب اور مجیب صاحب نے حوالوں کے تیر چلانے شروع کئے جس پر یہ سب باری باری زخمی ہو کر گرنے لگے اور بالآخر میدان حضرت مسیح موعودؑ کے جرنیلوں کے ہاتھ رہا اور اُنہیں یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑی۔ مگر افسوس کہ ایسے ہر موقع پر یہ سب آئیں بائیں شائیں کر کے بات کو ختم کرنے کی کوشش کرنے لگتے مگر ہمارے وکلاء انہیں گھر تک پہنچا کر ہی دم لیتے۔ چنانچہ جب عدالت کی یہ کوشش خواجہ صاحب کے اس جوابی سوال سے بری طرح ناکام ہو گئی تو عدالت سٹپٹا اُٹھی اور اس نے دانت پیستے ہوئے باتوں باتوں میں گواہ کو Feed کرنے کے لئے ایک اور نکتہ اس کے ذہن میں ڈالنے کی کوشش کی مگر مقابلہ پر بھی خواجہ صاحب جیسے مشاق تیر انداز بیٹھے تھے۔ آپ نے وہی بات دوسرے رُخ سے سوال کر کے اُس سے اُگلوالی جو ریکارڈ بھی ہو گئی اور وہ یہ تھی کہ عدالت نے گواہ سے مزید پوچھا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ایک مقدمہ میں کسی اہم شخص پر Charge of Killing ہوتا ہے جسے بچانے کے لئے اسی مقدمہ میں ملوث ایک دوسرا ملزم جو غیر اہم ہوتا ہے ساری ذمہ داری خود اُٹھا لیتا ہے۔

کورٹ کے اس طرح سے گواہ کو Feed کرنے اور گواہ کی طرف سے اس بیان کے اظہار سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کورٹ کیلئے اپنے پہلے سوالوں سے اپنا مذموم مقصد حاصل کرنا ممکن نہ رہا تھا اور وہ اندر ہی اندر تلملا رہی تھی کہ سوچا تھا کچھ اور ہو گیا کچھ۔ اِس لئے گواہ سے اس طرح کے الفاظ کہلوا کر اور ریکارڈ کروا کر اپنے مقصد کے حصول کے لئے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ اِس موقع پر جب کہ عدالت اور اِستغاثہ کی ٹیم اس قسم کے الفاظ ریکارڈ پر لانے میں کامیاب ہونے کو اپنی فتح تصور کر رہی تھی، ہم نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اِس پیشگوئی کو اس موقع پر بھی بڑی شان سے

پورا ہوتا ہوا دیکھا:

میرے فرقے کے لوگ اس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ

اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رُو سے سب کا منہ بند کر دیں گے۔[1]

حضور کی پیشگوئی میں 'سب کا منہ بند کر دیں گے' کا مصداق یہ عدالت بھی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حضور اقدس کے ان الفاظ کے برخلاف آپ کے غلام اِس وقت مغلوب ہو جاتے۔ چنانچہ فوراً ہی محترم خواجہ صاحب نے گواہ سے ایک ایسا سوال کر ڈالا جس کے جواب میں گواہ کو یہ بات تسلیم کر کے ریکارڈ کرانی پڑی کہ:

جناب واقعی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقوعہ میں بہت سارے افراد ملوث کر دیئے جاتے ہیں اور ان میں سے زیادہ اہم شخص پر قتل کرنے کا Charge لگا دیا جاتا ہے حالانکہ واقعۃً قتل غیر اہم شخص نے ہی کیا ہوتا ہے۔

چنانچہ خواجہ صاحب کے اِس سوال نے کورٹ کے لئے اپنے مقصد کو قانونی طور پر حاصل کرنے کی تمام راہیں مسدود کر کے رکھ دیں اور وہ اندر ہی اندر تلملانے لگی۔ اتفاق یہ ہوا کہ کورٹ نے اس غرض سے جتنے بھی سوال کئے اور جس راہ سے بھی اپنے مقصد کے حصول کو قانونی شکل دینے کی کوشش کی یعنی اسے ریکارڈ پر لانا چاہا، وہ سب امکانی اور تصوراتی باتیں تھیں اور واقعات اور حقیقت کی دنیا میں ان کا وجود مکمل طور پر معدوم تھا لیکن اس کے مقابل پر ان باتوں کے ردّ میں جو نکات ہماری طرف سے پیش کئے گئے تھے وہ دنیائے حقیقت میں روزمرہ ظاہر ہونے والے امور تھے اور جب حقیقت کا مقابلہ محض تصور سے ہو تو فتح لازماً حقیقت کی ہوتی ہے۔ تصوراتی باتیں اور مفروضوں پر مشتمل امور تو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جانے والا دھواں ثابت ہوتے ہیں جن میں اپنی بقاء کے لئے بھی جدوجہد کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

### خالی ہاتھ

عدالت نے اس گواہ سے ایک سوال یہ بھی کیا کہ جب مدعی اور چشم دید گواہان جائے وقوعہ پر گئے تو ان کے پاس ہتھیار وغیرہ تھے یا نہیں۔ اس پر گواہ نے جواب دیا کہ اس کی تفتیش کے مطابق Complainant party was not armed یعنی مدعی پارٹی مسلح نہ تھی۔ اس قسم کا سوال کرنے سے عدالت کا یقیناً یہی مقصد ہوگا کہ اِس طرح سے استغاثہ کی مصنوعی معصومیت کو بھی ریکارڈ کرا دیا جائے۔ یہ سوال تو خیر ہو گیا مگر سرکاری وکیل نے اس سے اور بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور عدالت نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی اُسے نہ روکا اور وہ یہ کہ اس نے سٹینو کو جواب میں Empty Handed کے الفاظ لکھوا دیئے حالانکہ یہ الفاظ گواہ کے جواب کے سراسر خلاف تھے۔ اُس نے تو was not armed

---

[1] تجلیات الٰہیہ صفحہ 17 ر۔خ جلد 20

کے الفاظ کہے تھے۔ عدالت نے اس موقع پر بھی اسے بالکل نہیں ٹوکا لیکن ہمارے وکلاء نے اس کا سختی سے نوٹس لیا۔
سرکاری وکیل کا اِن الفاظ کے لکھوانے سے مقصد ہوگا کہ یہ امر ریکارڈ پر آ جائے کہ حملہ آور نیلا پینٹ اور برش بھی نہیں لائے تھے۔ غرضیکہ وہ تمام خیال اور محض تصوراتی باتیں جو کسی بھی لحاظ سے ملزمان کے خلاف ممکن ہو سکتی تھیں اور وہ گواہ کی طرف سے بیان میں زیرِ بحث نہ آ سکی تھیں، اُنہیں کورٹ اپنے سوالات کے ذریعہ ریکارڈ پر لانے میں کوشش کرتی رہی، مثلاً:

☆ واقعہ کے ' کتنی دیر بعد' ملزمان نے اپنے آپ کو پیش کیا؟

☆ کیا ملزمان مسلح تھے، کیا کسی جگہ کی حفاظت کرنے والوں کو مسلح نہیں ہونا چاہیے؟

اگر ایک بات بھی عدالت نے ایسی پوچھی ہوتی جس سے اِستغاثہ کی کہانی کا بھی پول کھلتا تو ہم سمجھتے کہ یہ غیر جانبدار عدالت ہے مگر اس نے تو ملزموں کو مجرموں میں بدلنا اپنا 'ہدف' بنا رکھا تھا۔

## ملزم اَن پڑھ

عدالت نے اپنے سوالات کے بعد سرکاری وکیل کو بھی سوال کا موقع دیا۔ چنانچہ اس نے گواہ سے پوچھا کہ کیا آپ کو تفتیش کے دوران یہ علم ہوا کہ ملزم نعیم الدین (جس کی طرف سے تحریری درخواست دینے کا بار بار ذکر آ تا رہا) اَن پڑھ ہے۔ اس کا جواب گواہ نے اِثبات میں دیا، مراد یہ تھی کہ وہ درخواست لکھ نہیں سکتا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مجیب صاحب نے بڑے عمدہ رنگ میں اس بارہ میں ان کی تسلی کرا دی اور وہ اس طرح کہ آپ نے کارروائی کے دوران میں کمال سادگی کے ساتھ عدالت سے پوچھا کہ جو سائلوں کی طرف سے وکالت نامہ تھا وہ میں آپ کو دے چکا ہوں یا نہیں، وہ میرے پاس نہیں ہے کہیں گم تو نہیں ہو گیا۔ اس پر عدالت نے اپنی فائل کھول کر دیکھی تو اس میں موجود تھا۔ مجیب صاحب کو بتایا کہ یہاں لگا ہوا ہے تو مجیب صاحب نے فائل اپنی طرف کر کے وکالت نامہ کو غور سے دیکھا اور پھر فاتحانہ شان سے بولے

میں تو دراصل نعیم الدین کے دستخط دیکھنا چاہتا تھا جسے اَن پڑھ قرار دیا جا رہا ہے

مجیب صاحب کے اس انداز سے بظاہر تو سارے ہی محظوظ ہوئے مگر اراکین عدالت و ممبران استغاثہ اندر ہی اندر جل بھن کر رہ گئے کیونکہ آپ نے اس طرح سے مکرم رانا صاحب کے اَن پڑھ ہونے کے حوالہ سے اِس سوال و جواب کی اہمیت کو بالکل ختم کر کے رکھ دیا تھا کیونکہ دستخط کی پختگی اس کے اَن پڑھ ہونے کی نفی کر رہی تھی۔

اس تیرھویں اور آخری گواہ اِنسپکٹر تصدق پر جرح مکمل ہوئی تو عدالت نے پہلے تفتیشی افسر قاضی ایاز انسپکٹر کو پھر طلب

کرلیا۔ یاد رہے کہ اس کا بیان تو گزشتہ روز ہو چکا تھا اور اس پر جرح بھی ہو چکی تھی مگر عدالت نے اُسے آج بھی حاضر ہونے کا حکم دیا ہوا تھا۔ گواہ حاضر ہوا تو کورٹ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج ہم آپ سے ایک دو باتیں پوچھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کورٹ نے لطف الرحمٰن کی بندوق کے بارہ میں استفسار کیا کہ کیا یہ اس کے والد نے رضا کارانہ طور پر پیش کی اور کیا یہ وقوعہ میں استعمال ہوئی؟ اس پر مجیب صاحب نے اس بات پر مزید پکا کرنے کے لئے کہ یہ بندوق واقعی رضا کارانہ طور پر ہی پیش کی گئی تھی، ایک سوال کر کے اس کا جواب واضح ترین الفاظ میں ریکارڈ کروایا۔

اس کے علاوہ کورٹ نے مذکورہ گواہ سے یہ بھی سوال کیا کہ مقتولین کے زخم کس قسم کے تھے؟ گواہ نے یہ کہہ کر حقیقت بیان کرنے سے احتراز ہی کیا کہ 'کوئی Expert ہی بتا سکتا ہے' لیکن کورٹ نے گواہ سے کہا کہ وہ اپنے تجربہ سے بتائے کہ اُسے کس قسم کے معلوم ہوئے تھے۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ Fire arm کے لگتے تھے۔ پھر پوچھا کہ Fire arm میں سے کس قسم کے زخم تھے۔ گواہ کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ 'چھروں کے تھے'۔ ان الفاظ کا سننا تھا کہ عدالت نے بات فوراً 'رولے' میں ڈال دی کہ یہ تو غلط پٹری پر چل نکلا ہے۔ بعد میں مقدمہ کا ریکارڈ دیکھنے پر عدالت کی یہ گفتگو کہیں ملی ہی نہیں۔ یقیناً اس لئے کہ یہ استغاثہ کے سراسر خلاف تھی، اس کو ریکارڈ پر لایا ہی نہیں گیا۔

31 مارچ 1985ء کو تفتیشی افسران کے بیانات اور ان پر جرح کے بعد استغاثہ کی طرف سے مقدمہ کی کارروائی کے بڑے حصہ کا اختتام ہوا۔ اُس وقت کرنل صاحب نے ہم (مبینہ ملزمان) سے مخاطب ہو کر دو باتیں پوچھیں۔ پہلی بات ذہن میں نہیں رہی تاہم اِتنا یاد ہے کہ اُس کا جواب ہماری طرف سے محترم مجیب صاحب نے نفی میں دیا۔ دوسرے یہ پوچھا کہ آپ کوئی بیان دینا چاہتے ہیں؟ اس پر بھی مجیب صاحب نے ہی ہماری طرف سے یہ کہتے ہوئے جواب دیا کہ

yes, every one will present written statement

اس کے بعد تحریری بیانات داخل کرنے کی تاریخ 11 اپریل ڈال دی گئی اور عدالت کی کارروائی ختم کر دی گئی اور ہم پولیس کی حراست میں پھر جیل بھیج دیے گئے۔

## گیارہ اپریل کی پیشی اور عدالت کا رویہ

گیارہ اپریل کو ہماری پھر پیشی تھی جس کے لئے ہمیں حسب معمول پولیس کی حراست میں ملتان کے کینال ریسٹ ہاؤس میں لایا گیا جہاں ہمارے بے چین اور مضطرب رشتہ دار اور دوست احباب آنے لگے اور ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ عدالت آج بھی تاخیر سے آئی۔ اس تاخیر کا ہمیں دو طرح فائدہ ہوتا، ایک تو جیل سے باہر رہنے کا زیادہ سے زیادہ موقع میسر آ جاتا اور دوسرے دوست احباب کے ساتھ کھلی ملاقاتوں کا خوب موقع ملتا، الحمدللہ۔

بارہ بجے کے قریب ہمیں کمرۂ عدالت میں طلب کیا گیا تو ہم نے دیکھا کہ محترم مجیب الرحمٰن صاحب موجود نہ تھے۔ ممبرانِ عدالت نے ضروری کارروائی کے بعد اپنا رُخ Defence Counsel کی طرف کیا تو محترم خواجہ سرفراز احمد صاحب ہاتھ میں کچھ کاغذات لئے کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے:

سر! مجیب صاحب تو آ نہیں سکے۔ پچھلی تاریخ سے فارغ ہوکر گئے تو انہیں لندن جانا پڑ گیا اور جاتے ہوئے مجھے فون پر اطلاع کر گئے تھے کہ 9/اپریل تک آ جاؤں گا لیکن اب پتہ چلا ہے کہ انہیں واپسی سیٹ نہیں مل سکی ہے اسلئے 16/اپریل تک لازماً آ جائیں گے اس لئے اگلی پیشی 18/اپریل کو رکھ لیں۔ اُس دِن سارے ملزمان کے بیانات پیش کر دیں گے۔

مکرم خواجہ صاحب کی بات ختم ہوتے ہی کرنل صاحب (صدرِ عدالت) نے غصے سے لال پیلے ہوکر کرسی پر اچھل کر اور اپنا چھوٹا سا رُول میز پر مار مار کر نہایت درشت لہجہ میں تقریر شروع کر دی کہ:

یہ کیا مذاق ہے، لندن جائیں یا کہیں اَور، یہاں عدالت میں ہر قیمت پر حاضر ہونا چاہئے تھا۔ میں نہیں مانتا کسی بات کو، میں بڑا ٹیڑھا آدمی ہوں، جب اپنی بات پر آ جاتا ہوں تو منوا کر رہتا ہوں۔ میں نے مقدمہ کی سماعت کے دوران پورا وقت دیا مگر آپ میرے ساتھ اس طرح کر رہے ہیں۔

کرنل کے اِس تلخ رویہ کا خواجہ صاحب نے بڑی مہارت سے مقابلہ اور تدارک کیا مگر کرنل چیخ چیخ کر مجیب صاحب کے لندن جانے پر یوں احتجاج کرتا رہا گویا وہ کہہ رہا ہو کہ مجیب صاحب اکیلے کیوں گئے! بہر حال پندرہ بیس منٹ تک یہ گرمی سردی جاری رہی۔ بالآخر عدالت کو اس بات پر راضی ہونا ہی پڑا کہ آج کی کارروائی ملتوی کر کے 18/اپریل کی نئی تاریخ مقرر کر لی جائے اور اس کے ساتھ ہی صدرِ عدالت نے اعلان کیا کہ 20/اپریل کو عدالت ساہیوال میں جائے وقوعہ پر جائے گی اور عدالتی گواہوں (Court witnesses) سے بیانات بھی اُسی روز وہاں لئے جائیں گے۔ اس طرح سے اُس روز کی کارروائی ختم ہوئی اور بری طرح سیخ پا کرنل اور میجر عدالت برخواست ہوتے ہی اپنا بوریا بستر لپیٹ کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم گاڑی کے انتظار میں دیر تک وہاں بیٹھے رہے اور اپنے دوستوں سے ملاقات کا لطف اُٹھاتے رہے۔

18/اپریل کو ہمیں سماعت کے لئے لایا گیا تو حسب معمول تاخیر سے ہی کمرۂ عدالت میں طلب کیا گیا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ممبران عدالت کے ساتھ ساتھ وکلاء کی کرسیاں بھی خالی تھیں، صرف ایک سٹینو اور سرکاری وکیل وہاں موجود تھے، چنانچہ ہمارے جونیئر وکلاء نے کمرۂ عدالت میں ہم سے ٹائپ شدہ بیانات پر دستخط

کرائے اور سرکاری وکیل کے سپرد کر دیئے۔ یہ دستخط ملتان کے ایک احمدی ایڈووکیٹ مکرم عبدالحفیظ صاحب نے اپنی بال پوائنٹ سے کروائے تھے۔ جب ہم سب دستخط کر چکے تو رقت کی کیفیت میں بڑی ہی محبت کے ساتھ کہنے لگے کہ:

میں یہ بال پوائنٹ حضور ایدہ اللہ کی خدمت میں بھجواؤں گا کہ اس سے اسیران نے دستخط کئے ہیں۔

میں ان کی یہ بات سن کر عرقِ انفعال سے تر ہو گیا۔ میں نے کہا، واللہ! ہم تو اس لائق ہرگز نہیں۔ حقیقت میں ہماری کوئی خاص قربانی بھی تو نہیں ہے اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو ہمارے مولیٰ کی عطا کردہ توفیق اور سعادت ہی ہے، اس میں ہمارا اپنا تو کوئی دخل نہیں ۔

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ہماری دعاؤں اور التجاؤں کا مرکزی نقطہ ہمیشہ یہی رہا کہ اے خدا! ہمیں ہمارے تمام تر نقائص اور عیوب کے باوجود اپنی رحمت سے قبول فرمالے، آمین۔

## ساہیوال میں عدالتی کارروائی اور موقع ملاحظہ

فوجی عدالتوں کے طریق کار کے مطابق ارکان عدالت جائے وقوعہ پر خود جا کر ملزمان، گواہان اور وکلاء کی موجودگی میں واقعات کا تفصیلی جائزہ بھی لیتے ہیں۔ چنانچہ اسی کے مطابق ایک روز کی کارروائی ساہیوال میں ہوئی اور اس کے لئے ہمیں ملتان سے اُس روز ساہیوال لایا گیا۔ یہاں اُسی یادگار سفر کی رُوداد بیان کی جاتی ہے۔

### ملتان سے ساہیوال تک کا سفر

20 اپریل کی پیشی کے لئے ہمیں ایک دِن پہلے جمعہ کی سہ پہر تیار ہو کر باہر آ جانے کو کہا گیا۔ ہم جیل کے اندر ڈیوڑھی کے سامنے ایک گراسی پلاٹ میں بیٹھ گئے مگر ہمیں لے کر جانے والی گارد کا نام ونشان نہ تھا۔ اسی حالت میں شام ہوگئی، مغرب کے وقت ہم نے نمازیں بھی وہیں پڑھ لیں پھر کہیں گارد آئی اور ہم روانہ ہوئے۔ گاڑی کھلی یعنی بغیر چھت کے تھی جسے دیکھ کر ہمیں حیرانی ہوئی۔ ایک سپاہی سے پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ گاڑی صرف پولیس لائن تک لے کر جائے گی اور وہاں سے کسی دوسری گاڑی میں ہمیں لے جایا جائے گا۔ تھوڑی دیر میں ہم پولیس لائن پہنچے تو وہاں احباب جماعت سے ملاقات ہوگئی جن کے ساتھ کھلے آسمان تلے چارپائیوں پر کچھ دیر بیٹھے رہے۔ اس طرح سے رات کے وقت کھلے آسمان تلے بیٹھنے کا ہمیں چھ ماہ بعد موقع ملا تھا اور یہ بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہمیں سپاہیوں کے بارک نما کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا گیا کہ ہمیں لے کر جانے والی خصوصی گارد ابھی آئی نہ تھی۔ اس دوران میں ہم بھی دوست احباب سے ملاقاتوں میں مصروف رہے اور اِس طرح یہاں رات کے گیارہ بج گئے تب کہیں گارد آئی اور ہمارا قافلہ عازمِ ساہیوال ہوا۔ روانگی سے تھوڑی دیر پہلے ملتان کے نہایت مخلص دوست مکرم ڈاکٹر شفیق سہگل صاحب (امیر جماعت) تشریف لائے۔ آپ لندن کے جلسہ سالانہ میں شرکت کے بعد اُسی وقت واپس پہنچے ہی تھے اور فوری طور پر ہمیں ملنے چلے آئے، آپ سے مل کر بے حد خوشی اور تسکین ملی کہ آپ پیارے آقا کی خوشبو جذب کئے ہوئے تھے، الحمدللہ۔

ہمارا سفر شروع ہوا تو پٹھان ڈرائیور نے پولیس بس اِس طرح دوڑانی شروع کی کہ آغاز میں ہی انجام کا احساس ہونے لگا۔ ابھی ملتان کی حدود میں ہی تھے کہ لکڑی کے پھٹوں کی سیٹیں اپنا کام دکھانے لگیں۔ میرے پاس ایک کمبل تھا، اُسے لمبا کر کے سیٹ پر ڈالا جس سے کسی قدر سکون ہوا مگر گاڑی کی رفتار اور سڑک کی حالت کے باعث اس سکون کو قرار نہ مل سکا۔ راستہ میں ایک جگہ وقفہ ہوا اور ہم گاڑی سے اُتر کر ایک ٹرک ہوٹل کی چارپائیوں پر بیٹھے تھے کہ ہمارا پٹھان ڈرائیور

گاڑی کے دروازے میں بیٹھے بیٹھے ہم سے یوں مخاطب ہوا کہ

وہ تم میں فوجی چوکیدار کون ہے؟

ہم نے بتایا تو اُس نے تحسین کی نگاہ سے رانا صاحب کو دیکھا۔ ہم نے پوچھنے کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگا:

اِسی نے فائرنگ کی تھی نا!!

ہمیں حیرانی ہوئی کہ ایک دور دراز کے رہنے والے ایک عام شخص کو بھی ہمارے واقعہ کی اصل حقیقت کا علم تھا مگر اسلام کے ٹھیکیدار کہلانے والے نہ صرف سفید جھوٹ بول رہے تھے بلکہ اپنے جھوٹ پر مصر تھے۔

اس وقفہ کے بعد روانہ ہوئے تو ساڑھے تین بجے صبح ساہیوال پہنچ کر ہی رُکے۔ گاڑی سے اُترے تو سامنے تھانہ صدر ساہیوال کا بورڈ تھا۔ گویا یہ تیسرا تھانہ تھا جسے رونق بخشنے کے لئے ہمیں یہاں لایا گیا تھا۔ یہ تھانہ بھی ملکہ ہانس کی طرح نو تعمیر شدہ تھا، اس لئے اس میں بھی بیت الخلاء وغیرہ کا معقول انتظام تھا۔ یہاں پہنچتے ہی ہم سب نیند کی آغوش میں چلے گئے مگر صرف گھنٹے ڈیڑھ کے لئے۔ پھر اُٹھ کر ہم نے نمازِ فجر ادا کی اور اس کے بعد ہمارے دوست احباب آنے لگے جن سے پولیس کی مہربانی سے ملاقات ممکن ہوگئی۔ اس موقع پر محترم ڈاکٹر عطاء الرحمان صاحب امیر جماعت ساہیوال بھی جولندن کے جلسہ میں شرکت کر کے آئے تھے ابا جان کے ہمراہ تشریف لائے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے جلسہ سالانہ کی بہت سی ایمان افروز باتیں سنائیں اور حضور کا سلام پہنچایا۔ اس دوران برادرم محترم ملک نعیم الدین صاحب ناشتہ لے آئے۔ ہم نے ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ ناشتہ کیا۔ اگرچہ گذشتہ ساری رات ایک تکلیف دہ سفر میں گزری تھی مگر صبح اپنے احباب سے مل کر جو ہمیں ملنے کی خواہش لئے دیوانہ وار تھانہ پہنچ رہے تھے، ساری کوفت اور تکان جاتی رہی۔ الحمد للہ وجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ساڑھے آٹھ بجے تک جاری رہا۔ پھر ہمیں حکم ملا کہ عدالت جانے کے لئے تیار ہو جائیں! چنانچہ فوری طور پر تیار ہو کر تھانہ کے صحن میں آ گئے جہاں ہمیں ہتھکڑیاں لگا کر پولیس بس میں سوار کر دیا گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی اور چند منٹوں میں ہائی وے ڈیپارٹمنٹ کے دفتر کے سامنے جارُکی جہاں آج عدالت لگنی تھی۔ یہاں احاطہ کے اندر اور باہر خوب رونق تھی۔ پولیس کی بھاری جمعیت تھی اور وکلاء بھی تھے۔ احاطہ سے باہر عام مجمع میں ہمارے لواحقین اور چھوٹی بڑی داڑھیوں والے ہمارے مخالف مولوی اور اُن کے شاگرد تھے۔ چونکہ عدالت آج بھی اپنے مقررہ وقت تک نہیں آئی تھی اس لئے ہمیں گیارہ بجے تک انتظار کرنا پڑا اور یہ انتظار اس لئے زیادہ تکلیف دہ تھا کہ ماحول اور صورت حال کے پیشِ نظر ہمیں پولیس گاڑی سے اُتارا نہیں گیا تھا اور موسم تبدیل ہو جانے کے باعث کھلی دھوپ میں کھڑی لوہے کی

گاڑی جس کی کھڑکیاں بھی واجبی سی تھیں، تنور بننے لگی تھی اور اُس میں ہم بیٹھنے پر مجبور تھے۔ ایک وقت تک ہمارے دوست احباب ٹھنڈا پانی وغیرہ لاتے رہے جسے پی کر سکون آتا۔

اسی دوران محترم چوہدری حمید نصر اللہ صاحب سفید رنگ کی کار ڈرائیو کرتے ہوئے احاطۂ عدالت میں داخل ہوئے۔ ان کی کار رُکی تو اس میں سے محترم مجیب الرحمٰن صاحب، محترم خواجہ سرفراز صاحب اور امیر صاحب ساہیوال باہر نکلے اور کچھ دیر ماحول کا جائزہ لینے کے بعد سب کے سب ہماری گاڑی کی طرف تشریف لے آئے اور دروازہ کی طرف کھڑے ہو کر ہمیں ملاقات کا موقع دیا اور پھر واپس تشریف لے گئے۔

## عدالتی کارروائی اور موقع ملاحظہ

صبح سے ہم گاڑی میں بند تھے، شدید گرمی تھی اور پانی تک بغیر اجازت عدالت پینے خیر سے بارہ بجے کے قریب عدالت کی 'تشریف آوری' ہوئی تو ہمیں طلب کیا گیا۔ پھر کرنل صاحب نے عدالت کی کارروائی کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ آج عدالت کو موقع ملاحظہ کرنا ہے، اِس لئے اب عدالت موقع پر چلتی ہے اور اُٹھنے کے لئے پر تولے ہی تھے کہ غالباً ایس ایچ او اے ڈویژن نے عدالت میں پیش ہو کر درخواست کی کہ ملزمان کو موقع پر نہ لے جایا جائے کیونکہ وہاں بہت زیادہ مجمع ہے اور ان کے لئے خطرہ ہے۔ اس پر کرنل صاحب نے کہا کہ ملزمان کے بغیر تو عدالت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس پر اس نے پھر کہا کہ کم از کم جامعہ رشیدیہ انہیں نہ لے جایا جائے۔ اس پر کرنل صاحب نے کہا ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ ہی عدالت موقع پر جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہم پھر پولیس بس میں لا کر بٹھا دیئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مشن چوک پہنچ گئے۔ یہاں اِس قدر ہجوم تھا کہ گاڑی کا گزرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ہجوم میں سے بمشکل راستہ بناتے ہوئے ہماری گاڑی مسجد احمدیہ ساہیوال کے سامنے عین اُس جگہ کھڑی کروائی گئی جہاں ہماری مسجد کے مہمان خانے کے دو کمرے ہیں۔ گاڑی فٹ پاتھ والی اُونچی جگہ پر کھڑی کروی گئی تھی جس کی وجہ سے ہمیں اردگرد کا سارا منظر بآسانی نظر آ رہا تھا۔ ہماری گاڑی کے باہر سخت پہرہ تھا اور کسی کو گاڑی کے قریب بھی آنے کی اجازت نہ تھی جس کی وجہ سے اِردگرد تا حدِ نظر ہمیں اپنے پیارے احباب جماعت سورج کی تیز شعاعوں کے باوجود کھڑے نظر آ رہے تھے جو ہمارے لئے بے تاب و مضطرب تھے اور اُن میں سے ہر کوئی ایڑھیاں اُٹھا اُٹھا کر گاڑی کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں میں سے ہمیں ایک نظر دیکھنے کی کوشش میں نظر آ رہا تھا۔ ان احباب میں اکثریت ساہیوال شہر کے دوستوں کی تھی اور بہت سے احباب ضلع بھر کی جماعتوں سے بھی آئے ہوئے تھے جن میں اوکاڑہ شہر کے کچھ خدام بھی نظر آئے۔ علاوہ ازیں اس مجمع میں بعض غیر از جماعت دوست بھی نظر آئے جو مولویوں سے ہٹ کر

احمدی دوستوں میں ہی گھل مل کر کھڑے تھے۔ اللہ کے فضل سے ہمارے اکثر دوست اپنی کاروں میں آئے تھے جن کے متعلق مخالفین، جو ایک طرف لگے کھڑے تھے، کا یہ تبصرہ سننے میں آیا کہ

'اوئے ویکھو ان کا ہر آدمی ائرکنڈیشنڈ کار میں آرہا ہے'

تھوڑے سے انتظار کے بعد عدالت بھی یہاں پہنچ گئی جبکہ ہمارے وکلاء اور دوسرے عہدیدار اس سے پہلے ہی اپنی اپنی کاروں میں پہنچ چکے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ عدالت ہمیں بھی باہر نکال کر موقع سے متعلق بعض باتیں پوچھے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ ایس ایچ او A ڈویژن نے جو درخواست کی تھی اس کی وجہ سے صدر عدالت نے ہمیں گاڑی میں ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

عدالت کی آمد پر ایک لوہار نے مسجد کے مین گیٹ کی دہلیز پر لگے ہوئے اُس تالے کو توڑا جسے پولیس نے گزشتہ کئی ماہ سے لگا کر مسجد کو سیل کیا ہوا تھا۔ اِس دوران عدالت نے مسجد سے باہر ماحول کا جائزہ لیا اور ہمارے وکلاء سے باتیں کرتے رہے۔ تالا ٹوٹنے کے ساتھ دروازہ کھلا تو مدت کے بعد ہمیں بھی مسجد کی ایک جھلک دیکھنی میسر آ گئی۔ پھر ممبرانِ عدالت اور ہمارے وکلاء مسجد کے اندر چلے گئے۔ ان کے ساتھ جب Complainant عبداللطیف اندر گیا تو اس کے پیچھے وہ "میو" جس کا نام غالباً قاری حنیف ہے (وہ پولیس کی ابتدائی کارروائی کے مطابق چشم دید گواہ بھی تھا) نے اندر داخل ہونے کے لئے اپنے جثہ کو آگے دھکیلا تو وہاں کھڑے سپاہی نے اسے روکا۔ جس پر اس نے کچھ کہا لیکن سپاہی نے اس کی بات رد کرتے ہوئے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ مسجد کے اندر عدالت اور دوسرے متعلقہ افراد کافی دیر تک جائزہ لینے کے بعد باہر آئے تو اُس وقت غالباً عبداللطیف Complainant سے کرنل صاحب نے وقوعہ سے متعلق پوچھا۔ جس پر ہم نے اُسے مسجد کے دروازہ کے سامنے باہر کی طرف Over Acting کرتے دیکھا۔ وہ اِدھر اُدھر جھک کر، کبھی بازو پھیلا کر اور کبھی آگے پیچھے ہو کر عدالت کو بتا تا رہا کہ اِس اِس طرح وقوعہ ہوا۔ ہمارے وکلاء سے بھی گفتگو ہوتی رہی۔ کچھ دیر اور موقع کا ملاحظہ کیا گیا پھر ہمیں واپس لیجانے کا حکم ہوا جس کے ساتھ ہی ہماری گاڑی واپس چلی اور احاطہ دفتر ہائی وے ریسٹ ہاؤس میں آ کر کھڑی ہو گئی جبکہ عدالت کے اراکین جامعہ رشیدیہ اور پولی ٹیکنیک کالج کے معائنہ کے لیے چلے گئے۔

ہمارے وکلاء کی ٹیم یہاں آئی تو مجیب الرحمٰن صاحب اس میں نہ تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جامعہ رشیدیہ جانے کے مسئلہ پر کرنل صاحب کا خیال تھا کہ احمدی وکلاء ساتھ نہ جائیں۔ نہ معلوم اندر سے کیا غرض ہوگی مگر بظاہر امن وامان کے نقطہ نظر سے انہوں نے کہا لیکن مجیب صاحب نے اصرار کیا کہ میں تو ضرور جاؤں گا لیکن کرنل صاحب پھر بھی نہ مانے۔

اس پر ایک روایت کے مطابق تیسرے رکن عدالت مجسٹریٹ صاحب نے کرنل صاحب کو کہا مجیب صاحب کو ساتھ لے کر جائیں ورنہ یہ قانونی چارہ جوئی کر کے آپ کے کیئے کرائے پر پانی پھیر دیں گے۔ اس پر کرنل راضی ہوا اور مجیب صاحب عدالت کے ساتھ جامعہ رشیدیہ گئے اور معائنہ و ملاحظہ کے وقت وہاں موجود رہے۔

ہمارے مسجد سے واپس آنے کے بہت بعد تک عدالت واپس نہ آئی، اس دوران ہم اپنے دوست احباب کی قربت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ مختلف دوست دو دو، چار چار ہو کر کبھی بوتلوں کے بہانے کبھی کسی اور چیز کے بہانے گاڑی میں آ جاتے اور تھوڑی دیر باتیں کر کے واپس چلے جاتے۔ گرمی شدید تھی جس کی وجہ سے برا حال ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے عدالت آئی اور تھوڑی دیر بعد ہمیں بھی طلب کر لیا گیا۔ ہم کمرۂ عدالت کی طرف جا رہے تھے اور برآمدہ پر چڑھنے لگے تو یہاں کھڑے اردلی نے ہمیں 'حکم' دیا کہ کمرے کے درمیانی یعنی صدر دروازے کے سامنے سے نہیں چڑھنا بلکہ اُدھر بغلی راستے سے ہو کر اوپر آئیں، ہم نے اس حکم کی 'دست بستہ' تعمیل کی۔ پھر کمرے میں داخل ہونے لگے تو اسی اردلی نے دوسرا مارشلائی آرڈر یہ جاری کیا کہ جوتیاں اُتار کر کمرے میں داخل ہونا ہے۔ ہم نے تعمیل حکم میں جوتیاں اُتارنی شروع کی ہی تھیں کہ سرکاری وکیل رانا فرزند علی صاحب کمرے سے باہر آئے اور کہنے لگے کہ کوئی فرق نہیں پڑتا اسی طرح آ جائیں۔ اس پر ہم جوتیوں سمیت ہی عدالت کے 'مقدس دربار' میں چلے گئے، یہ تو خدا کا شکر ہے کہ عدالت کی نظر نہیں پڑی ورنہ توہین عدالت کا مقدمہ بنا دیا جاتا۔

تھوڑی دیر بعد عدالت کی کارروائی پھر شروع ہوئی تو آغاز میں کرنل صاحب نے موقع ملاحظہ کا حاصل مشاہدہ یا حاصل ملاحظہ جسے انہوں نے باہمی مشورہ سے تیار کیا تھا، پڑھ کر سنایا۔ اس میں ایک بڑی ہی عجیب بات انہوں نے نامعلوم کس غرض کے لئے بیان کی اور وہ یہ کہ مسجد کا وہ اندرونی دروازہ جس کے سامنے اظہر رفیق کی نعش پڑی تھی اس کے نچلے حصہ میں جو گولیوں کے سوراخ تھے، ان کے متعلق کرنل صاحب نے لکھا کہ یہ 12 بور کے SG کارتوس کے نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کے چھرّے دروازے کے آر پار نہیں ہو سکتے حالانکہ مذکورہ دروازہ اتنی پتلی اور نرم لکڑی کا تھا کہ اس میں سے میرے خیال میں اچھی قسم کی Air gun کا چھرّہ بھی گزر سکتا ہے کجا S.G کارتوس کے چھرے جن کی قوت چلتے وقت کم از کم تین ٹن ہوتی ہے۔

## عدالتی گواہ

کسی قدر تفصیل سے تیار کی ہوئی موقع ملاحظہ کی رپورٹ سنانے کے بعد عدالت نے Court Witnesses یعنی عدالتی گواہوں کو طلب کیا۔ جہاں تک صفائی کا تعلق ہے ہم نے دو افراد کے متعلق بطور C.Ws (عدالتی گواہ) طلب

کرنے کی درخواست عدالت سے کی تھی اور ان میں ایک تو بہاول شیر کاٹھیا صاحب تھے جو مسجد احمدیہ سے تیسرے مکان میں بوقت وقوعہ موجود تھے اور دوسرے صاحب رینالہ خورد کے ایک وکیل محترم رضا صاحب ایڈووکیٹ تھے جو اُس وقت اپنی اہلیہ کی تیمارداری کی وجہ سے سامنے واقع مشن ہسپتال میں تھے جبکہ اِستغاثہ نے ایک خاتون کو بطور CW (عدالتی گواہ) بلانے کی درخواست کی ہوئی تھی۔ یہ خاتون مسجد احمدیہ کے مغربی جانب ملحقہ مکان میں اپنے خاوند، بچوں اور خسر کے ساتھ رہتی تھیں۔

اِن تینوں گواہوں کو مولویوں نے گواہی دینے سے روکنے کیلئے بہت ڈرایا دھمکایا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے اِن میں سے کسی ایک پر بھی کسی مولوی کے ڈراوے یا دھمکی کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ پہلے دونوں گواہوں کو ڈرانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ گواہی دینے کے لئے پیش ہی نہ ہوں اور آخر الذکر خاتون گواہ کو اس بات پر مجبور کرتے رہے کہ وہ مولویوں کے حق میں گواہی دے اور اِستغاثہ کی کہانی کے مطابق کچھ باتیں کہے۔ لیکن پہلے دونوں نے اِس مخالفت کی ذرہ بھر پرواہ نہ کی حتیٰ کہ اس سماعت والے دِن ان میں سے ایک گواہ نے ہمارے ایک احمدی وکیل کو یہاں تک کہا کہ:

'اگر میرا باپ بھی مجھے کہے کہ گواہی نہ دو تو میں نہیں رُکوں گا'

اور پھر انہوں نے عدالت میں آ کر باوجود عدالت کے دباؤ کے بھی پورے دھڑلے سے گواہی دی، الحمد للہ علیٰ ذٰلک وجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ مذکورہ خاتون نے بھی کسی دباؤ میں آ کر جھوٹی گواہی دینا قبول نہ کیا بلکہ سنا ہے کہ وہ بار بار کہتی رہیں کہ میں اگر گواہی دوں گی تو سچی دوں گی ورنہ رہنے ہی دوں گی۔ چنانچہ اس نے عدالت میں آ کر صرف یہی کہا کہ مجھے کچھ پتہ نہیں واقعہ کا اور یہ اِستغاثہ کی بہت بڑی شکست تھی کہ اُس کا بلایا ہوا گواہ کچھ کہہ ہی نہیں رہا۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس موقع پر محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے پھبتی کسی کہ پھر تو سر کچھ ہوا ہی نہیں (جب ان کے گواہ کی یہ شہادت ہے) اس پر کرنل صاحب کہنے لگے وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان نعشوں کا کیا کریں۔ مجیب صاحب خاص انداز سے گویا ہوئے:

'ذرا ٹھہریں میں ان کو بھی Dispose off کر لیتا ہوں، فکر نہ کریں'

ان عدالتی گواہوں کے بیانات کے دوران عدالت کا رویہ سخت حیران کن رہا۔ وہی عدالت جو اس سے پہلے اِستغاثہ کے گواہوں کو بڑے پیار سے Feed کرتی رہی، قدم قدم پر ان کی راہنمائی کرتی رہی تھی مگر آج ہر بات پر ان عدالتی گواہوں کو ٹوکنا شروع کر دیا تھا اور ان کے بیانات میں خوانخواہ ممکنہ مشکوک اور مشتبہ نکات نکال کر سامنے رکھنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ صدرِ عدالت اپنے میز پر پڑے چھوٹے سے 'رُول' کو لہرا لہرا کر بڑے تیز اور ترش لہجہ میں صفائی کے اِن گواہوں کو دھمکاتا رہا کہ دیکھو سچ سچ بات بتاؤ ورنہ تمہیں میں اندر کرا دوں گا ورنہ تم پر مقدمہ بنا دوں گا۔

گو یا گواہوں سے سچی گواہی لینے کے لئے آج ہی اُسے ہوش آئی تھی جب کہ گواہ پہلے ہی سچی گواہی دے رہے تھے اور اس سے قبل جو جھوٹی گواہی دے رہے تھے ان کی تمام وقت پیٹھ ٹھونکتا رہا۔ اس طرح سے اپنے نام نہاد انصاف کا بول بالا کرنے میں کوشاں رہا۔ لیکن آفرین ان گواہوں پر جنہوں نے بغیر کسی تعلق اور بغیر کسی اشتراک مقصد اور بغیر کسی مفاد کے پوری ہمت اور جرأت کے ساتھ گواہی دی۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے کہ انہوں نے سینکڑوں ہزاروں افراد میں سے دلیرانہ گواہی دینے کی ہمت کی اور خاص طور پر اس قسم کے ماحول میں! مگر افسوس عدالت پر جس نے سراسر جانبداری کا اظہار کر کے اپنا وقار مجروح کیا۔

غرضیکہ عدالت اور استغاثہ ہر دو نے ان دونوں گواہوں پر جرح کے دوران ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح ان کو گواہی دینے سے باز رکھا جائے، اس کے لیے اُن کے اخلاقی کردار تک کو زک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ استغاثہ نے تو بطور خاص اس مسئلہ کو اُٹھانا ہی تھا کہ بہاول شیر اُس گھر میں کیوں سویا جس کا سربراہ خانہ گھر پر نہیں تھا مگر عدالت نے بھی اس پر لایعنی قسم کی تنقید کی۔ تاہم اس نے بڑی جرأت کے ساتھ وضاحت کی کہ ہمارے ان کے ساتھ گھریلو تعلقات ہیں اور جب کبھی شام کو دیر ہو جائے اور گاؤں واپس نہ جاسکوں تو یہاں ہی سو جایا کرتا ہوں۔ دوسرے گواہ رضا صاحب پر یہ الزام لگانے کی کوشش کی کہ اس کی بیوی 304 کی مجرم ہے۔ اس پر انہوں نے جواب میں تفصیل بتائی۔ اِس پر عدالت نے کہا کیا آپ اِسے ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اگر ریکارڈ پر آئے تو اس تفصیل سے آئے کہ میری بیوی نرس ہے اور ایک زچگی کے دوران موت واقع ہوگئی جس پر اس کی بیوی کے خلاف 302/304 کے تحت مقدمہ رجسٹر ہوا جو کہ ابھی Under Trial ہے۔ انہوں نے مزید الزام لگایا کہ تمہاری بیوی اِس مقدمہ کے بعد ملک سے بھاگ گئی تھی اور بیلجیئم میں احمدیہ مشن کے پاس جا کر پناہ لی تھی اور اِسی وجہ سے تم اس کے حق میں گواہی دے رہے ہو۔ اس پر مجیب صاحب نے مسکرا کر کہا:

'احمدیوں کا تو گویا دنیا میں بیلجیئم کے سوا کہیں مشن ہی نہیں جو اس نے وہاں جا کر ہی پناہ لینی تھی'

پہلا گواہ دیہاتی طرز کا تھا اور اُسے قانونی موشگافیوں کا علم نہ تھا اس لئے بعض اوقات پریشان سا بھی دکھائی دیتا تاہم گواہی اُس نے بھی بڑے سنجیدہ اور ٹھوس انداز میں دی۔ ایک موقع پر سرکاری وکیل نے یہ اعتراض کیا کہ چونکہ تمہارا یہ گھر ایک عرصہ تک ملزم حفیظ الدین کے ماموں کے پاس رہا اور تم ان سے کرایہ بھی نہیں لیتے رہے، اس لئے ثابت ہوا کہ ان سے تمہارے پرانے تعلقات ہیں اور اِسی لئے گواہی دینے آئے ہو۔ اس پر اس نے اس امر کی بھرپور تردید کی کہ ان سے کرایہ نہیں لیتا تھا بلکہ پرزور انداز میں کہا کہ ان سے ہم باقاعدہ کرایہ وصول کرتے رہے ہیں۔ اب کرنل

صاحب کی انصاف پسندی کے ساتھ ساتھ عمومی 'سوجھ بوجھ' ملاحظہ ہو کہ جونہی گواہ نے کرایہ کی وصولی کا ذکر کیا، کرنل صاحب سرکاری وکیل کی جرح کے دوران ہی اپنا رول میز پر کھڑکاتے ہوئے مصنوعی قسم کے غصہ کا انداز بنا کر بولے:

'ہم تم سے کرایہ کی رسیدیں بھی طلب کر لیں گے۔ ذرا ہوش سے بات کرو'

گواہ بیچارہ سادہ مزاج تھا وہ بولا بالکل کر لیں۔ اس پر مجیب صاحب نے لقمہ دیا:

'سر! رسیدیں ان کے پاس تو نہیں، ان کے کرایہ داروں کے پاس ہوں گی'

اس پر کرنل صاحب کو ہوش آئی اور اندر ہی اندر شرمندہ ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ بات تو آئی گئی ہو گئی مگر اس سے کرنل صاحب کے رجحان اور ان کے قانون سے واقفیت اور عمومی معاملہ فہمی کی صلاحیت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ اُنہیں اتنا بھی علم نہیں تھا کہ کرایہ تو وصول کر کے رسید دیتے ہیں نہ کہ لیتے ہیں۔ مالک مکان سے رسیدوں کی طلبی تو ایک جاہلانہ بلکہ احمقانہ مطالبہ ہے۔ نہیں، نہیں بلکہ یہ نتیجہ تھا تعصب کی وجہ سے لاحق ہو جانے والے اندھے پن کا!

عدالت کی جانبداری کا ایک اور پہلو بھی ملاحظہ ہو۔ اِن دونوں گواہوں نے عدالت میں واضح طور پر یہ بیان بھی کیا کہ اُنہیں اس گواہی دینے سے باز رہنے کے لئے بہت دھمکایا اور ڈرایا گیا اور ہر طرح کے دباؤ سے کام لیا گیا۔ رضا صاحب ایڈووکیٹ نے بتایا کہ اسے تو یہاں تک کہتے رہے کہ اگر تم نے مرزائیوں کے حق میں گواہی دی تو ہم تمہارے خلاف تحریک چلائیں گے۔ لیکن ان باتوں کا کوئی اثر عدالت پر نہ ہوا بلکہ انہوں نے ان باتوں کو قطعاً درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا اور کوئی ایکشن لینا تو درکنار، ان باتوں کی طرف توجہ ہی نہ دی اور ایسا کرتی ہی کیوں؟ اس طرح تو ان کے مزعومہ 'انصاف' کو سخت دھچکا لگنے کا خطرہ تھا۔ ان کے نزدیک تو ملزمان کے خلاف کی اور کہی جانے والی ہر بات جائز تھی۔ انہیں اگر کسی کا اِحساس تھا تو صرف اِستغاثہ کے جھوٹے گواہوں کا تھا جن میں سے اگر کوئی اپنے سابقہ جھوٹوں میں ایک اور جھوٹ کا اضافہ کر کے یہ کہہ دیتا کہ مجھے مرزائی ڈرا رہے ہیں تو کرنل صاحب کو فوراً آگ لگ جاتی۔

تیسرے عدالتی گواہ کے طور پر مسجد احمدیہ ساہیوال کے بالکل ہمسایہ میں رہنے والی ایک خاتون پیش ہوئیں۔ اگرچہ انہیں استغاثہ نے پیش کرایا تھا مگر تصرف الٰہی سے انہوں نے آتے ہی کسی قسم کا بیان دینے سے انکار کر دیا تھا اور مذکورہ واقعہ سے مکمل طور پر لاعلمی کا اظہار کیا تھا مگر اس کے باوجود کرنل صاحب نے ذاتی طور پر ان سے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ یہ معلوم نہیں کہ ان کے جوابات ریکارڈ پر لائے گئے یا نہیں کیونکہ ان سے حلف بھی نہیں لیا گیا تھا۔ بہر حال کرنل صاحب نے کوشش تو بہت کی کہ وہ کچھ تو بولیں، آخر اِستغاثہ نے درخواست کی تھی! اس لئے کچھ تو بھرم رہ جائے لیکن سب کوششیں بے سود رہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خاص تصرف سے ہوا۔ الحمدللہ رب العالمین۔

ان گواہان کے بیانات کے بعد ہمارے وکلاء نے تھانہ Aڈویژن کا رجسٹر روانگی ڈاک دکھانے کا مطالبہ کیا۔ جس کے متعلق گواہ نمبر 13 ملک تصدق پر جرح کے دوران اچھی خاصی بحث ہو چکی تھی کہ مکرم رانا نعیم الدین صاحب کی درخواستیں واپس کہاں کہاں بھیجی گئیں۔ جب مذکورہ رجسٹر لایا گیا تو اس کے متعلق ہمارے دونوں سینئر وکلاء میز کے گرد کھڑے ہو کر عدالت کے ساتھ دیر تک بحث کرتے رہے۔ اس بحث کا کیا نتیجہ نکلا کچھ پتہ نہیں تاہم اس کے بعد اگلی تاریخ کا فیصلہ ہوا جب استغاثہ نے اپنا Closing Address پیش کرنا تھا۔ وکلائے استغاثہ نے کہا کہ وہ تین دن کے بعد پیش کر دیں گے جس کے مطابق 23/اپریل کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے وکلاء کی طرف سے جوابی ایڈریس کے لئے بھی 30/اپریل کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

## جرح کی نقول کا حصول

آخری بحث کی تیاری کے لئے Cross Examination یعنی جرح کی نقول ایک بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے وکلاء نے عدالت سے اس کا مطالبہ کیا تو حسب معمول وعادت عدالت نے انکار کیا اور استغاثہ نے اس کی حمایت کی۔ اس پر ایک طویل معرکہ آرائی ہوئی جس میں جیت ہمارے وکلاء کی ہوئی اور آخر عدالت کو ہمارا یہ حق تسلیم کرنا پڑا۔ چنانچہ آج اسی پیشی پر وہ نقول ہمیں مہیا کی گئیں مگر اس شرط پر کہ ان کا مطالعہ کوئی اور نہیں کرے گا۔ اس شرط کا بار بار تذکرہ کئے جانے پر خواجہ صاحب نے مسکت جواب دیتے ہوئے کہا:

'جناب! ہم بالکل معقول لوگ ہیں ہم اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کریں گے'

چونکہ پہلے بھی خواجہ صاحب الفاظ کے قدرے فرق سے اسی مفہوم اور مضمون کی باتیں کرتے آ رہے تھے مگر اب جو یہ الفاظ کہے کہ جناب! ہم بالکل معقول لوگ ہیں تو پنجابی کے محاورہ کے مطابق متین چوہدری کو سخت مرچیں لگیں اور مچل اٹھا اور چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق بغیر سوچے سمجھے بولا:

'تو کیا پھر ہم نامعقول آدمی ہیں'۔

قربان جاؤں خواجہ صاحب کی حاضر جوابی پر، بے ساختہ بولے:

'شکریہ! آپ نے خود ہی یہ الفاظ کہہ دیئے، میں نہیں کہنا چاہتا تھا'

اس سچی بات پر جو حال اُس کا ہوا، اُسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا تھا کہ بیان سے باہر ہے!

## ساہیوال سے ملتان واپسی

عدالت برخاست ہونے کے فوراً بعد ہمیں پولیس نے گاڑی میں بٹھایا اور ہم ابھی ٹھیک طرح بیٹھے بھی نہ تھے کہ گاڑی

ایک جھٹکے کے ساتھ چلی اور پھر فراٹے بھرتی ہوئی ہمارے اعزہ واقارب اور ساہیوال کی عمارتوں اور درختوں کو تیزی سے پیچھے چھوڑتی ہوئی ملتان کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ پٹھان ڈرائیور نے گاڑی اتنی تیز رفتاری سے دوڑائی کہ چیچہ وطنی ساہیوال کے علاوہ بھی کوئی سڑک ہوتی تو بھی ہماری ہڈیاں پسلیاں ایک ہو جاتیں۔ گاڑی کے پچھلے حصہ میں بیٹھے سپاہیوں کا تو برا حال تھا، اُن کے سر بار بار چھت کے ساتھ جا ٹکراتے۔ واپسی سفر کے اس طرح سے آغاز پر ہم حیران تھے کہ یہ کیا ہے؟ ہمیں کسی سے ملنے بھی نہیں دیا گیا پھر کھانا نہ پینا اور وہ بھی ایسی گرمی میں! بہر حال کچھ دیر حیران ہونے کے بعد یاد آیا کہ ایسی باتیں تو اب ہمارا معمول بن چکی ہیں۔ چنانچہ اس سوچ کے ساتھ جلد ہی سب کو صبر آ گیا۔

جب ہڑپا گزرا تو گاڑی ایک جگہ جھٹکے کے ساتھ اچانک رُک گئی۔ ہم نے باہر دیکھا تو جشن کا سا سماں تھا۔ یہاں ہمیں گاڑی سے اُترنے کو کہا گیا۔ ہم باہر آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے رشتہ دار اور دوست احباب جمع تھے اور یہ جگہ اڈہ چک نمبر 5/11L کے قریب تھی جہاں جماعت چک نمبر 6/11L نے ہمارے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ چنانچہ سڑک اور ریلوے لائن کے درمیان درختوں کے جھنڈ میں ہم نے اپنے پیاروں کے ساتھ بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا اور جنگل میں منگل کا نظارہ ہماری آنکھوں نے دیکھا اور ہمارے ذہنوں میں اِسے محفوظ کیا۔ یہاں مقامی جماعت 6/11L کے مرد احباب کے علاوہ بعض لجنہ ممبرات بھی موجود تھیں نیز ساہیوال سے مکرم میجر بشیر احمد صاحب، مکرم ملک محمود احمد صاحب، مکرم سید محمد احمد صاحب گیلانی اور بعض دوسرے احباب کے ساتھ گوجرانوالہ سے میرے ماموں مکرم عبدالمجید صاحب بھی پہنچے ہوئے تھے، فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔

کھانے کے بعد پانچ بجے شام یہاں سے روانہ ہوئے تو مسلسل سفر کرتے ہوئے رات آٹھ بجے ڈسٹرکٹ جیل ملتان کے سامنے گاڑی رُکی۔ گاڑی سے باہر آئے تو سامنے مکرم انیس الرحمن صاحب مربی سلسلہ کے ساتھ مکرم چوہدری عبدالرحیم صاحب اور مکرم انوار الحسن صاحب کو منتظر پایا۔ ان سے مل کر ہم جیل میں چلے گئے۔ اندر جا کر ہماری وہ ہتھکڑیاں کھولی گئیں جو صبح ساڑھے آٹھ بجے لگائی گئیں تھیں۔ گویا شدید گرمی کے ساڑھے گیارہ گھنٹے ہم ان ہتھکڑیوں میں جکڑے رہے جو ہماری اسیری کے دوران ہتھکڑیوں میں جکڑے رہنے کا طویل ترین عرصہ تھا۔ بہر حال اس طرح سے ملتان سے ملتان براستہ ساہیوال کا یہ تکلیف دہ اور کٹھن سفر اللہ تعالیٰ کے فضل سے مکمل ہوا اور ہمیں ایک مرتبہ پھر یقین ہوا کہ چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ انشاء اللہ العزیز۔

ہر قسم کی شہادتوں کے مکمل ہونے کے بعد 23 اپریل 85ء کی پیشی کے موقع پر استغاثہ کے وکلاء نے اپنے دلائل پر مشتمل Closing Address عدالت میں پیش کیا اور اُس کی نقول ہمارے وکلاء کو بھی دی گئیں۔ اُس روز بس اتنی ہی کارروائی ہوئی اور ہمیں 30 اپریل تک واپس جیل بھجوا دیا گیا، اُس روز یہ Closing Address پڑھا جانا اور اس کا جواب ہماری طرف سے دیا جانا تھا۔ خیال تھا کہ یہ ہمارے مقدمہ کی سماعت کا آخری دن ہوگا کیونکہ اس کے بعد سماعت کے قابل کوئی امر باقی نہیں رہا تھا تاہم اس کے بعد بھی دو مرتبہ عدالت لگی۔

## استغاثہ کے دلائل

30 اپریل کی کارروائی ناقابل فراموش ہے۔ وہ مصروف ترین دن تھا اور اُس روز ہمیں طویل ترین دورانیہ کے لئے عدالت میں بیٹھنا پڑا اور بیٹھنا بھی زمین پر کیونکہ ساتھ والے کمرے میں ایک اور فوجی عدالت کی بھی کارروائی ہو رہی تھی جس کی وجہ سے کرسیاں کم پڑ گئی تھیں تاہم کھڑے نہیں تھے کیونکہ کرنل صاحب نے ہمیں نیچے بیٹھ جانے کی اجازت دی ہوئی تھی اور ہم قالین پر بیٹھے رہے۔ اُس روز پہلے تو استغاثہ کی طرف سے رانا فرزند علی صاحب (سرکاری وکیل) نے اپنا اختتامیہ پڑھا جس میں استغاثہ کی وہی FIR والی کہانی دُہرائی۔ انہوں نے چند ایک ایسی باتیں ضرور پیش کیں جنہیں مدعی پارٹی ہمارے خلاف ثبوت تصور کرتی تھی اور اُسے امید تھی کہ ہماری طرف سے دورانِ جرح گواہوں سے پوچھی جائیں گی مگر ہمارے وکلاء نے کمال فراست اور حکمت سے اُن کا کارروئی میں اُس طرح ذکر ہی نہ آنے دیا تھا جس طرح استغاثہ کو توقع تھی اور وہ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اِن باتوں کے بارے میں پوچھے نہ جانے کی وجہ سے انہیں اِس قدر زک پہنچی تھی کہ وکیل استغاثہ نے اپنے Closing Address کے دوران بڑی تکلیف کے ساتھ اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ یہ باتیں پوچھی جانی چاہئیں تھیں مگر صفائی کے وکلاء نے نہیں پوچھیں! استغاثہ کے دلائل میں سے سب سے اہم دلیل یہ تھی کہ ملزمان اپنے خلاف عائد شدہ الزامات کی صفائی پیش نہیں کر سکے اور ان کی تردید بھی نہیں کی بلکہ چھ ملزمان کے متعلق اعتراف کیا گیا ہے کہ وہ وقوعہ کے وقت موجود تھے۔ لہٰذا ہماری Story سچی ہے اور انہوں نے Defence Version کو اپنے زعم میں یوں توڑا کہ جائے وقوعہ پر جائیداد کو کسی قسم کے نقصان پہنچنے یا انسانی جان کے خطرہ میں پڑنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جامعہ رشیدیہ سے جانے والے چھ افراد کا مشن پر امن تھا اور Private Defence کا کوئی جواز یا سوال ہی نہ تھا، اس لئے ملزمان نے فائرنگ کر کے

جارحیت کی ہے۔ یہ تھا ان کے Closing address کا خلاصہ، حالانکہ پولیس سمیت سبھی نے گواہی دی تھی کہ کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات وغیرہ مٹی ہوئی تھیں۔ یقیناً بصیرت کے ساتھ ان کی بصارت بھی جاتی رہی تھی۔

انہی بودے دلائل پر مشتمل ان کے اختتامیہ کا ان الفاظ پر اختتام ہوا کہ ہمارا دعویٰ سچا ثابت ہوتا ہے لہٰذا ہمارا مطالبہ ہے کہ ملزمان کو زیادہ سے زیادہ سزا دی جائے۔ یہ ایڈریس پڑھتے ہوئے رانا فرزند علی صاحب کی آواز بمشکل ہی کمرہ عدالت میں سنی جارہی تھی۔ یوں لگتا جیسے اُن کا ضمیر اُنہیں کوس رہا ہو، ضمیر اور نوکری کے درمیان ان کے سینہ میں جنگ ہو رہی ہو۔

## منہ توڑ جواب

استغاثہ کے بعد جب ہمارے وکلاء کی باری آئی تو ہر شخص دِل تھام کے بیٹھنے پر مجبور ہوگیا کیونکہ اب عدالت کا کمرا گویا میدانِ جنگ بن گیا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں گھمسان کا رَن پڑا ہو۔ اُس موقع پر زبردست معرکہ آرائی ہوئی اور ہم نے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا۔ اُس دن ہم نے سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی پیشگوئی کہ:

> 'میرے فرقے کے لوگ اِس قدر علم اور معرفت میں کمال حاصل کریں گے کہ اپنی سچائی کے نور اور اپنے دلائل اور نشانوں کے رُو سے سب کا منہ بند کر دیں گے'[1]

ایک دفعہ پھر پوری ہوتی دیکھی اور بڑی شان کے ساتھ، کمال کے ساتھ اور جلال کے ساتھ پوری ہوتی دیکھی، فالحمد للہ علی ذٰلک۔ اس دن کمرۂ عدالت کی فضا پر ہی نہیں بلکہ تمام ارکان پر حیرانی، پریشانی، سکوت اور جمود کی حالت طاری رہی اور ہمارے شیر مکرم خواجہ سرفراز احمد صاحب اور مکرم مجیب الرحمٰن صاحب پوری طرح چھائے رہے اور گرجتے رہے۔ آپ بہانگ دُہل اور ڈنکے کی چوٹ اِستغاثہ کی 'داستان کذبستان' کو چیلنج کرتے رہے۔ اِس دوران میں ہم نے دیکھا کہ اِستغاثہ کے تمام ارکان سوائے ملک فضل کریم صاحب کے بھیگی بلّی بنے رہے۔ ملک صاحب موصوف اس دوران معنی خیز انداز میں مسکراتے ہی رہے۔ جہاں تک ارکان عدالت کا تعلق ہے ان میں سے کرنل صاحب آگے ہو کر میز پر جھک کر اور مقرر کی طرف دیکھ کر اور پوری طرح چوکس رہے۔ میجر صاحب کرسی کی پُشت کے ساتھ ٹیک لگا کر مقالوں کی تحریر کا مقرر کے ساتھ ساتھ مطالعہ کرتے رہے جبکہ مجسٹریٹ صاحب سارا وقت مقالہ کی نقل کو اپنے سامنے میز پر بند کر کے اور پوری طرح Easy ہو کر کرسی پر نیم دراز حالت میں رہے اور اس دوران ان کی آنکھیں بھی اکثر وقت بند ہی

---

[1] (تجلیات الٰہیہ صفحہ 17 روحانی خزائن جلد 20)

رہیں۔ اُنہوں نے اپنی کہنیوں کو کرسی کے بازوؤں پر ٹکا کر دونوں ہتھیلیوں کو آسمان کے رخ جوڑا ہوا تھا۔ بالکل ایسے جیسے وہ پیشگی معافی مانگ رہے ہوں اور توبہ کر رہے ہوں اُس ظلم کی جو انہوں نے اس مقدمہ کا ظالمانہ فیصلہ کر کے کرنا تھا اور جس کا فیصلہ غالباً پہلے دن ہی ہو چکا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔ بہرحال باوجود اس کے کہ ایک مجسٹریٹ کے لئے اس قسم کی مجلس میں اس طرح بیٹھنا معیوب لگ رہا تھا مگر وہ شاید ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس طرح بیٹھے رہے۔

سرکاری ایڈریس کے بعد پہلے محترم خواجہ صاحب اُٹھے اور اِس اختتامیہ کے جواب کی تین چار خوبصورت مجلد نقول عدالت کو پیش کیں اور پھر اُسے پڑھنا شروع کیا۔ خواجہ صاحب نے نہایت بلند آواز اور دلیرانہ انداز میں ایڈریس کا جواب دیا۔ آپ نے ایسے ایسے نکات کو لیا جن کے متعلق کسی کو تصور تک نہ تھا اور ثابت کیا کہ اِستغاثہ کی کہانی کے اندر سے ہی ثابت ہو رہا ہے کہ یہ سرتاپا جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اگرچہ یہ ساری کارروائی انگریزی میں تھی تاہم بات سمجھانے کی خاطر آپ کہیں کہیں ٹھہر کر اپنی تحریر کو چھوڑ کر عدالت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اردو میں بھی بات کرتے رہے۔ آپ نے گھنٹہ بھر عدالت سے خطاب کیا جس سے اِستغاثہ کے چھکے پنجے بھولتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آپ کا یہ جواب سن کر عدالت کی بھی آنکھیں کھل گئیں لیکن یہ تو ابھی ابتداء تھی جس کے بعد ہمارے دوسرے وکیل محترم مجیب الرحمٰن صاحب کی طرف سے جواب بھی پیش کیا جانا تھا۔

محترم خواجہ سرفراز احمد صاحب کے جوابی اِختتامیہ کے بعد عدالت نے چائے کے وقفہ کا اعلان کیا اور تھوڑی دیر بعد پھر کارروائی شروع ہوئی۔ اب محترم مجیب الرحمٰن صاحب کی باری تھی۔ آپ کا تیار کردہ جواب کچھ لمبا بھی تھا اور موصوف نے اِسے پیش بھی اپنے مخصوص انداز میں کیا جس کی وجہ سے یہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ طویل بھی ہوتا گیا۔ آپ نے مقالہ کی ابتداء میں ہی عدالت کو بتلا دیا تھا کہ جناب میں ان کاغذوں یا ان الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتا، میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ اپنے مخاطب کو بات سمجھا دوں۔ اس لئے میں اپنا جواب پڑھنے کے ساتھ ساتھ آپ سے زبانی بھی باتیں کرتا جاؤں گا تاکہ مجھے یہ تسلی ہوتی جائے کہ میں نے آپ کو اپنی بات اچھی طرح سے سمجھا دی ہے۔ اس پر عدالت نے بڑی 'وسیع الظرفی' کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجازت دے دی اور کہا بالکل جیسے آپ چاہیں کریں (جو ہماری مرضی ہے ہم بھی وہی کریں گیا، اِنصاف کرنے سے متعلق آپ کی باتوں کا ہم پر کوئی اثر نہ ہوگا) اپنا مضمون شروع کرنے سے قبل آپ نے یہ بھی کہا کہ میں ٹائپ ہونے کے بعد نظرثانی نہیں کر سکا، اِس لئے ہم ساتھ ساتھ تصحیح بھی کریں گے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ ممبران عدالت دورانِ کارروائی جاگتے رہیں۔

اِس تمہید کے بعد آپ نے اپنا جواب پڑھنا شروع کیا۔ آپ پڑھتے کم تھے اور ٹھہر کر سمجھاتے زیادہ۔ اسی لئے آپ

دوبارہ پڑھنے لگتے تو کہتے کہ میں نے وقت زیادہ لے لیا ہے اس لئے میں اتنے حصہ کو چھوڑتا ہوں کیونکہ یہ میں اردو میں سمجھا ہی چکا ہوں۔ آپ بڑی روانی کے ساتھ انگریزی پڑھتے اور بولتے چلے جاتے۔ آپ کے لہجہ میں خالص انگریزی تاثر تھا، ماشاء اللہ۔ آپ انگریزی تو بڑے سکون اور تحمل سے پڑھتے لیکن جب اُردو میں بات سمجھانے لگتے تو کبھی چہرہ پر غیر معمولی جلال ہوتا اور کبھی معنی خیز مسکراہٹ۔ تاہم زیادہ تر آپ جلالی انداز میں عدالت سے مخاطب رہے اور بھرپور توجہ اور محنت کے ساتھ عدالت کو ایک ایک نکتہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ آپ کا یہ فقرہ ہمیشہ یاد رہے گا جو آپ نے بڑی بلند آواز کے ساتھ گرجتے ہوئے اور اپنا ہاتھ ہوا میں اِدھر سے اُدھر لہراتے ہوئے بڑے جوش سے کہا تھا کہ:

'کیا سارا ساہیوال مرزائی ہو گیا تھا کہ اُنہیں اِن چار آدمیوں کے سوا کوئی گواہ نہیں ملا؟ کیا وہاں پر ہسپتال کے مریضوں کے لواحقین موجود نہ تھے؟ کیا مسجد احمدیہ کے ہمسائے بھی مرزائی ہو گئے تھے؟ کیوں انہوں نے ان سے گواہیاں نہیں لیں؟'

آپ نے اس نکتہ کی بھی بڑی تفصیل سے وضاحت کی کہ انہوں نے دفعہ 149 کیوں لگائی؟ آپ نے بتایا کہ صرف اس لئے کہ اُنہیں تفتیش نہ کرنی پڑے۔ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ کردار اس واقعہ میں بنالیں گے تو بہت مشکل پڑے گی اور اس ضمن میں آپ نے ہائی کورٹس کے فیصلہ جات کے حوالے بھی پڑھ پڑھ کر سنائے جن میں چوٹی کے ججوں نے پولیس پر لعن طعن کی ہوئی تھی کہ یہ 149 لگا کر آسانی سے سارے ملزمان کو گناہ گار لکھ دیتے ہیں۔

آپ نے اپنے جواب کو بڑی محنت سے مرتب کیا ہوا تھا اور اس کے مختلف ابواب بنا کر انہیں چھوٹی چھوٹی فصلوں میں تقسیم کیا ہوا تھا جس سے اصل بات ترتیب کے ساتھ ذہن میں بیٹھتی چلی جاتی۔ آپ کے جواب نے استغاثہ کے پرخچے اُڑا دیئے۔ آج تو کرنل صاحب، مجیب صاحب کے بات شروع کرتے ہی کہہ دیتے ہاں ٹھیک ہے، سمجھ آ گئی۔ مگر مجیب صاحب کہتے! ذرا ٹھہریں تو سہی، مجھے اپنی تسلی کے لئے ہی بات کر لینے دیں چنانچہ آپ اپنی بات پوری کر کے رہتے۔ اِس دوران بعض حوالے زیر بحث بھی آ جاتے اور استغاثہ کی طرف سے اصل حوالہ دکھانے کا مطالبہ ہوتا تو مجیب صاحب فوراً متعلقہ کتاب لے کر اس میں سے حوالہ پڑھ دیتے۔ ایک موقع پر رات کے اوقات میں Private Defence کے حق کا ذکر آیا جس کی وضاحت محترم مجیب صاحب نے زبانی کی مگر سرکاری وکیل اور کرنل صاحب نہ مانے۔ اس پر مجیب صاحب نے متعلقہ کتاب غالباً P.P.C لے کر میز پر رکھی اور متعلقہ صفحہ نکالنے ہی لگے تھے کہ کرنل صاحب فوراً بولے: چلیں رہنے دیں۔ اس پر مجیب صاحب کہنے لگے: اب نہیں، اب آپ بھی سن لیں۔ آپ نے حوالہ

نکال کر ایک دو لائنیں پڑھ کر سنائیں اس پر سرکاری وکیل نے پھر مطالبہ کیا کہ آگے بھی ذرا پڑھیں۔ چنانچہ آپ نے پھر پڑھنا شروع کر دیا ایک دو سطریں پڑھی تھیں کہ استغاثہ کے خلاف مطلب مضمون شروع ہو گیا جس پر سرکاری وکیل نے بھی بس کرنے کی درخواست کی مگر مجیب صاحب یہ کہہ کر کہ اب تو میں آپ کو گھر تک پہنچا کر ہی رہوں گا، پڑھتے چلے گئے۔ اس پر استغاثہ کی ٹیم شرمندہ تو ہوئی تاہم 'شرم تم کو مگر نہیں آتی' کے مصداق اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہی۔

محترم مجیب صاحب نے یہ اصول بیان کر کے کہ شک کا فائدہ تو ہمیشہ ملزم کو دیا جاتا ہے، ہمارے کیس کے تمام مراحل باری باری گنوائے اور ثابت کیا کہ ان تمام مراحل میں دو دو موقف ہیں۔ ایک استغاثہ کا، ایک صفائی کا اور ہر مرحلہ میں شک کی کافی گنجائش موجود ہے اس لئے شک کا فائدہ مبینہ ملزمان کو ہونا چاہئے۔ محترم مجیب صاحب ہر قدم پر ٹھہر کر سچی بات ارکان عدالت سے تسلیم کرانے کے لئے رُکتے اور وہ 'ہوں ٹھیک ہے، ہوں ٹھیک ہے' کرتے جاتے۔ گویا کہہ رہے ہوں، جلدی ختم کرو اور پیچھا چھوڑو، ہم نے کرنا تو وہی ہے جو کرنے کا فیصلہ کر چکے ہوئے ہیں۔ غرضیکہ مجیب صاحب اپنے تمام سامعین کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے رہے۔ آپ نے کوئی بات بھی اَدھوری نہیں کی ہر دعویٰ کے ساتھ، ٹھوس، قابل فہم اور ناقابل تردید عقلی و نقلی دلائل بھی دیے۔

آپ نے Absence of Evidence یعنی عدمِ ثبوت کا موضوع بھی کافی تفصیل سے بیان فرمایا۔ آپ نے کلمہ مٹانے کا نکتہ پیش کیا کہ چلو فرض کیا کہ ان کی FIR کے مطابق خود احمدی احباب چوہدری حفیظ الدین صاحب اور شاہد نصیر باجوہ صاحب نے اپنے ساتھیوں سے تو یہ کہہ دیا کہ کلمہ مٹا دو لیکن مٹایا کس کس نے؟ آخر گواہ وہاں موجود رہے، اُنہوں نے کس کس کو کلمہ مٹاتے دیکھا؟۔ اس پر تو سرکاری وکیل خاموش رہا لیکن جب آپ نے یہ نکتہ اُٹھایا:

> عام طور پر FIR میں ہوتا ہے کہ وقوعہ کے بعد ملزمان اپنے ہتھیار لہراتے ہوئے جائے وقوعہ سے فرار ہو گئے۔ یہ پہلی FIR دیکھی ہے جس میں یہ ہے کہ 'پھر ملزمان نے دروازہ اندر سے بند کر لیا' اب سوال یہ ہے کہ ملزمان اندر موجود تھے تو پولیس نے انہیں آ کر گرفتار کیوں نہیں کیا؟

اس پر سرکاری وکیل نے کہا کہ وہ فرار ہو گئے ہوں گے پچھلے دروازے سے، مجیب صاحب جھٹ بولے:

'تو کہلوانا تھا نا! اپنے کسی گواہ سے، یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ گواہی غائب ہے'

اس پر اس نے پھر بات بنانے کی کوشش کی کہ وہ اندر ہی کہیں کسی کمرے میں چھپ گئے ہوں گے۔ مجیب صاحب وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:

'ہاں ہاں اندر چھپے ہوئے تھے'

آپ کے اِس انداز نے اسے خاموش ہی نہیں مطمئن بھی کر دیا۔ پھر محترم مجیب صاحب نے ان نکات کے بھی دندان شکن جوابات دیئے جو سرکاری وکیل نے اپنے Address میں اٹھائے تھے کہ اِن اِن امور کے بارہ میں صفائی کے وکلاء کو سوالات کرنے چاہئے تھے مگر انہوں نے نہیں کئے۔ چنانچہ آپ نے اُن تمام امور کے جواب گواہوں کے بیانات سے ہی نکال کر ان کے سامنے رکھ دیئے۔

قصہ کوتاہ ہمارے وکلاء صاحبان نے جو ہمارے لئے دیگر جماعتی خدمات کے حوالہ سے بھی قابل صد احترام ہیں، بہت محنت اور ذہانت کے ساتھ ہمارے مقدمہ کی تیاری اور پیروی کی، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔ انہوں نے ہر ضروری پہلو کو پوری طرح مدنظر رکھا اور بڑی اِحتیاط کے ساتھ کارروائی کو آگے بڑھایا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہہ رکھا تھا کہ دوران سماعت اور ویسے بھی یہ دعا کرتے رہا کریں۔

اَللّٰھُمَّ اَیِّدْ ھُمْ بِرُوْحِ الْقُدُسِ

چنانچہ ہم سب اپنے اِن محسنوں کے لئے انہی مسنون الفاظ میں زیرلب دعائیں کرتے رہتے اور ہمیشہ دعا گو رہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کرے انہیں ہمیشہ اس کی تائید ونصرت حاصل رہے، آمین۔ ان میں سے ایک بزرگ محترم خواجہ سرفراز احمد صاحب تو اِس وقت دُنیا میں نہیں ہیں، وہ اپنی کامیاب زندگی گزار کر اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو چکے ہیں، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَارْفَعْ دَرَجَاتِہٖ فِی الْجَنَّۃِ الْفِرْدَوْس۔

## 26 مئی کو پھر عدالت میں

رمضان المبارک شروع ہوئے ابھی دو تین روز ہی ہوئے تھے کہ جیل حکام نے بتایا کہ ہمیں 26 مئی کو عدالت میں طلب کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں عدالتی کارروائی مکمل ہو چکی تھی، اس لئے ہمیں حیرانی ہوئی کہ یہ کیوں! بعض افواہیں ایسی بھی تھیں کہ ہمیں فیصلہ سنانے کے لئے طلب کیا گیا ہے۔ بہرحال ہمیں عدالت میں لیجایا گیا لیکن عدالت نے فوراً ہمیں واپس بھیج دیا کیونکہ ہم میں سے محترم ملک محمد دین صاحب ہرنیا کا آپریشن ہونے کے بعد ہسپتال میں زیرعلاج ہونے کے باعث موجود نہ تھے۔ عدالت نے حکم دیا کہ جب تک ساتواں ملزم بھی حاضر نہیں ہوتا، عدالت نہیں لگے گی۔ ہمیں فارغ کرکے کرنل صاحب نے نشتر ہسپتال فون کر مارا کہ ملزم کو جلدی ڈسچارج کرو! چنانچہ ہسپتال کے عملہ نے فوجی آرڈر سنتے ہی ملک صاحب کو ڈسچارج سلپ پکڑا دی اور اِدھر ہم جیل پہنچے اُدھر ملک صاحب کے ہسپتال سے جیل آنے کی تیاری بھی مکمل ہو چکی تھی۔ اگرچہ اس کارروائی کو مکمل کرتے کرتے رات کے دس بج گئے تھے مگر پھر بھی ملک صاحب کو اُسی روز لاکر ہمارے ساتھ جیل میں بند کرکے ہی دم لیا گیا، آخر فوجی حکم کی تعمیل بھی ضروری تھی!

اُس روز چونکہ ہماری پیشی غیر معمولی طور پر جلد ختم ہوگئی تھی اور پولیس کی گاڑی نے تو اپنے وقت پر ہی آنا تھا، اس لئے کچھ انتظار کے بعد پولیس گارڈ نے ہمارے دوستوں کی پیش کش قبول کرلی اور ہمیں ان کی کاروں میں جیل لے جانے پر راضی ہوگئے۔ چنانچہ ہم محترم میجر بشیر احمد صاحب اور مکرم ملک محمود احمد صاحب کی کاروں میں بیٹھ کر جیل پہنچ گئے، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

## ایک خوشخبری

اُنہی ایام میں چوہدری اسحق صاحب کے بیٹے محترم چوہدری محمد الیاس صاحب جو چند روز پہلے امریکہ سے آئے تھے، سیدھے جیل میں آئے اور ہمارے ساتھ ملاقات کی۔ آپ چوہدری صاحب کے نام حضور رحمہ اللہ کا اپنے دست مبارک سے تحریر فرمودہ خط بھی لائے کہ آپ لندن سے ہو کر آرہے تھے۔ حضور رحمہ اللہ نے اس خط میں بڑے پرزور انداز میں اس مفہوم کے فقرات لکھے تھے:

'یہ جو پھندا ہمارے لئے تیار کر رہے ہیں وہ خود ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا'

حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کی یہ بات کس شان سے پوری ہوئی، یہ سارا مضمون ایک ایمان افروز داستان اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور جس کا گواہ آسمان بھی ہے اور زمین بھی۔ اس بات کے پورا ہونے کے نظارے ایک عالم نے دیکھے ؎

جس بات کو کہے کہ کروں گا میں یہ ضرور
ٹلتی نہیں وہ بات خدائی یہی تو ہے

26 مئی کی پیشی والے دِن محترم مجیب الرحمٰن صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ آپ عدالت سے فارغ ہونے کے بعد ہمارے پاس تشریف لائے اور ہمیں ہمارے مستقبل کے بارہ میں بڑی خوبصورتی سے بتا گئے کہ کیا ہونے والا ہے۔ آپ کہنے لگے یہ فوجی عدالتوں کا طریق کار ہے کہ مقدمہ کی سماعت مکمل ہونے کے بعد ملزمان سے متعلق کچھ اعداد و شمار اکٹھے کرتے ہیں تاہم انہوں جو فیصلہ کرنا تھا کر لیا ہوا ہے۔ اب اُسے JAG Branch کو بھجوانا ہے جہاں سے حتمی حکم جاری ہوگا۔ آپ نے ہمیں حوصلہ دلاتے ہوئے بھرپور اعتماد سے کہا:

گھبرانے کی ضرورت نہیں جو بھی فیصلہ ہوگا، اُس کے لئے تیار رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے گا، انشاء اللہ

چند منٹ کی اِس گفتگو کے بعد آپ تو واپس تشریف لے گئے مگر اپنی باتوں کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔

## عدالت میں آخری پیشی

محترم ملک محمد دین صاحب کے ہسپتال سے واپس آنے کے اگلے ہی روز ہمارے احاطہ کا دورہ تھا۔ اُس دوران

سپرنٹنڈنٹ جیل ملک صاحب کو دیکھ کر پوچھنے لگے کہ کیا آپ اب Fit for trail ہیں؟ پھر خود ہی ڈاکٹر صاحب کو کہہ دیا کہ ان کا طبی معائنہ کر کے رپورٹ دیں چنانچہ ایک ہی روز میں یہ سب کچھ مکمل ہو کر عدالت کو اطلاع ہو گئی۔ یہ سب کچھ اس طرح فوری طور پر ہوا کہ جیسے انہیں بھی فوجی حکم آیا ہو کہ جلدی کریں! یہی وجہ تھی کہ ایک دو روز میں ہمیں اطلاع بھی مل گئی کہ یکم جون کو عدالت نے ہمیں طلب کر لیا ہے۔

اُس روز ہم کینال ریسٹ ہاؤس یعنی مقامِ عدالت میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف لوگ ہی لوگ اور مولوی ہی مولوی تھے۔ غالباً یہ مشہور ہو گیا تھا کہ اُس روز مقدمہ کا فیصلہ سنایا جائے گا اس لئے یہ سب لوگ جمع ہو گئے تھے مگر انہیں حسرت کے ساتھ واپس جانا پڑا کہ تماشا نہ ہوا۔ ہمارے ملتان کے دوستوں کا خیال تھا کہ آج کی یہ پیشی یہاں آخری پیشی ہوگی اس لئے وہ بھی بڑی کثرت سے آئے ہوئے تھے اور اپنے کام کاج سے چھٹی کر کے آئے ہوئے تھے اور ہمارے لئے ایسی الفت و محبت کا اظہار کر رہے تھے کہ بیان سے باہر۔ ہر کسی کی خواہش تھی کہ کسی طرح ہمارے پاس بیٹھنے اور چند باتیں کرنے کا موقع مل جائے، ہمارا اس قدر خیال رکھتے کہ اگر کسی چیز کا کنایۃً بھی ذکر ہو جاتا تو جنوں کی طرح لپک کر وہ چیز لا حاضر کرتے۔ ان کے چہروں پر لکھا ہوا نظر آتا کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو ایک لمحہ کے لئے بھی ہمارے ہاتھوں کو ہتھکڑیاں لگنے نہ دیتے، فجز اہم اللہ احسن الجزاء۔

جب سے ہم جیل میں آئے تھے بچوں کے ساتھ کھلے ماحول میں ملاقات نہ ہو سکی تھی جس کا یوں تو سبھی کو احساس تھا مگر برادرم انوار الحسن صاحب آف ملتان کو کچھ زیادہ ہی تھا کیونکہ وہ قریباً دو ماہ ہمارے ساتھ اسی جیل میں اپنے کسی ذاتی مقدمہ میں رہ کر گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کوشش کر کے ہمارے بچوں کو بلوا لیا تھا کہ آج کی اس پیشی کے موقع پر ایسا موقع میسر آ جانے کا امکان تھا۔ اللہ کا کرنا ہوا کہ ان کی خواہش پوری ہو گئی اور ہم سب کے ہی بچے اور دیگر رشتہ دار اُس روز یہاں پہنچ گئے اور کھلی ملاقات کا موقع بھی مل گیا۔ ربوہ سے آنے والی گاڑی پہنچی تو برادرم افضل صادق صاحب عزیزم خالد کو اُٹھائے بطور ہراول دستہ اِدھر پہنچ گئے۔ میں نے بندھے ہاتھوں سے خالد کو لینا چاہا تو وہ اُڑ کر میری طرف بڑھا جس پر میں حیران ہو کر رہ گیا کہ میں تو اِسے دو تین ماہ کا چھوڑ کر آیا تھا اور اسے میری پہچان بھی نہ تھی بلکہ یہی میری اس کے ساتھ پہلی کھلی ملاقات تھی مگر اس نے مجھے فوراً پہچان لیا! بہر حال میں نے اُسے اٹھایا اور وہ میرے بندھے ہاتھوں میں ہی کھیلنے لگا۔ یہ دیکھ کر ایک سپاہی کا دل پسیجا اور اس نے بغیر کسی مطالبہ کے میرے ایک ہاتھ کی کڑی کھول دی، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ غرضیکہ اُس دِن یہاں بہت اچھے طور پر سب دوستوں اور رشتہ داروں سے ملاقات ہوئی اور عدالت کے آنے سے کچھ دیر پہلے تک جاری رہی۔

بارہ بجے کے قریب عدالت کا آنا ہُوا۔ ہمارے سینئر وکلاء تو آج نہ آئے تھے تاہم مقامی وکلاء موجود تھے۔ عدالت کے طلب کرنے پر ہمیں پیش کیا گیا تو حاضری لینے کے بعد ایک پولیس افسر کو بلایا گیا۔ جس پر تھانہ اے ڈویژن کے ASI اختر علی کچھ دستاویز اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئے اور سیلوٹ کر کے وہ دستاویزات کرنل صاحب کو پیش کر دیں۔ یہ دراصل وہی کارروائی تھی جس کے بارے میں محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے ہمیں 26 مئی کو بتایا تھا۔ بہرحال کرنل صاحب نے ان کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور اس پولیس افسر کے کوائف نوٹ کر کے ان سے حلفیہ بیان لیا کہ:

’ہم نے ملزمان سے متعلق پوری چھان بین کی ہے اور ہمیں ان کے خلاف اس سے پہلے کسی قسم کے مقدمہ کا اندراج نہیں ملا یعنی اس سے پہلے یہ ملزمان کسی مقدمہ میں ملوث نہیں رہے ہیں اور اس کے متعلق تحریری طور پر دستاویزات عدالت کو پیش کرتا ہوں‘

اُس لمحے میں نے کرنل صاحب کے جو تاثرات نوٹ کئے وہ کچھ اس طرح تھے کہ گویا انہیں بڑا گہرا دُکھ ہوا ہو کہ اِس سے قبل ملزمان کے خلاف کسی اَور مقدمہ میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ وہ گم سم سے ہو گئے اور پھر انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کاغذات کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے ایک دو مرتبہ زور دے کر مذکورہ گواہ سے پوچھا کہ کیا بالکل کوئی ثبوت نہیں ملا؟ اس کا جواب ظاہر ہے نفی میں ہی ہونا تھا کیونکہ اب تو اِن دستاویزات کو بدلنے سے رہے۔ اس سے پہلے اس صورت حال کا علم ہو جاتا تو شاید کچھ کوشش انہیں بدلنے کی کر بھی لیتے اور دو چار مقدمات ہم میں سے ہر ایک کے خلاف ڈال کر ہمیں عادی مجرم ثابت کروا لیتے۔

## رحم کی درخواست؟

اس گواہ سے فارغ ہونے کے بعد کرنل صاحب، ہم سے مخاطب ہوئے:

’اب مقدمہ کی کارروائی مکمل ہو چکی ہے تو آپ سب کو موقع دیتا ہوں کہ اگر کسی نے کچھ کہنا ہو تو کہہ سکتا ہے‘

اس پر ہم سب اکٹھے بولنے لگے تو انہوں نے ہمیں روک کر کہا ’نہیں، اکیلے اکیلے بولیں، میں نام بولتا جاؤں گا اور آپ جواب دیتے جائیں‘۔ سب سے پہلے میرا نام پکارا گیا اور نام لے کر انہوں نے اپنا سوال دُہرایا کہ مقدمہ کے بارہ میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔ جس پر ہم سب نے باری باری یہی کہا کہ جناب ہمارے تحریری بیان داخل عدالت ہو چکے ہیں اور ہمیں اس کے سوا کچھ نہیں کہنا ہے تو فرمانے لگے: وہ تو ہم نے پڑھ لیا ہے، اس کے علاوہ کچھ کہنا ہو تو! ہم نے پھر بھی نفی میں جواب دیا تو وہ اپنے اصل مدّعا کی طرف آ گئے اور کھڑے کھڑے ہم سے ایک عجیب و غریب سوال کر ڈالا جس کا جواب دینے کے لئے غیبی رہنمائی نہ ہوتی تو ہم ضرور ڈگمگا جاتے اور وہ یہ کہ:

’تو پھر کیا آپ رحم کی درخواست کرنا چاہتے ہیں؟‘

میں یہ فقرہ سن کر حیران رہ گیا کہ رحم کی درخواست؟ اس کا کیا مطلب؟ نہ ابھی مقدمہ کا فیصلہ ہوا، نہ سزا ہوئی، یہ رحم کی درخواست کیسی! اور پھر ’’تم‘‘ جیسے لوگوں کے سامنے رحم کی درخواست!! کیا ارحم الراحمین ربّ پر ہمارا ایمان نہیں رہا؟ خیر میں نے جلدی سے پھر وہی جواب دیا کہ سر! میں تو اپنا تحریری بیان داخل کر چکا ہوں۔ کہنے لگے وہ تو ہم نے پڑھ لیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کہنا ہو تو؟ میں نے کہا اس کے علاوہ تو اور کچھ نہیں! اس پر وہ مکرر کہنے لگے رحم کی درخواست؟ میں نے کہا ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے کرنل صاحب کی طرف دیکھا اور وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا اور وہ مجھے دیکھتے رہ گئے۔ ان کی اس وقت صورت ایسی تھی جیسے کسی مایوس جواری کی ہو۔ اپنی پنسل کو دانتوں میں دبائے میری طرف ایسے انداز سے دیکھ رہے تھے جیسے ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا ہو۔ اس جگہ میں پوری ایمانداری سے یہ وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ جب یہ گفتگو ہو رہی تھی مجھے کچھ شعور نہیں تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ میرے منہ سے ٹھیک ہی جوابی الفاظ ادا ہوئے تھے۔ شعوری طور پر میرے ذہن نے قطعاً کام نہیں کیا بلکہ یہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کے تصرف سے ہوا۔ غالباً عدالت چاہتی تھی کہ ہم رحم کی درخواست کر دیں گے تو ہماری طرف سے اقبالِ جرم متصور ہو جائے گا لیکن ہمارے مولیٰ نے اس موقع پر بھی اپنی سنت کے مطابق مدد فرمائی اور آزمائش کے اس مرحلہ سے بھی بخیر و خوبی گزار دیا، اِس پر اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے، الحمدللہ رب العالمین۔

مجھے یہ بات مولیٰ نے بتا دی فَسُبْحَانَ الَّذِی اَخْزَی الْاَعَادِی
خدا نے اپنی رہ مجھ کو بتا دی فَسُبْحَانَ الَّذِی اَخْزَی الْاَعَادِی
یہ سب تیرا کرم ہے میرے ہادی فَسُبْحَانَ الَّذِی اَخْزَی الْاَعَادِی

میرے بعد کرنل صاحب نے باری باری سب ساتھیوں سے پوچھنا شروع کیا تو سبھی نے یہی جواب دیا کہ ہم نے اپنے اپنے بیانات دے دیئے ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کہنا چاہتے اور ہر ایک نے رحم کی درخواست والے سوال کا جواب نفی میں دیا۔ جب آخر میں ملک صاحب سے پوچھا کہ آپ نے وقوعہ کے وقت للکارا مارا، اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ غلط ہے تو ملک محمد دین صاحب نے بڑی دلیری کے ساتھ جواب دیا کہ:

جناب عالی میں تو وہاں موجود ہی نہیں تھا، یہ بالکل غلط کہانی ہے، میرا نام تو متین چوہدری نے 137/9L والے مقدمہ کی پیروی کرنے کی وجہ سے لکھوا دیا تھا (تاکہ میں ایک ریٹائرڈ تجربہ کار پولیس افسر ہونے کے ناطہ اس مقدمہ میں اپنے احباب جماعت کی مدد نہ کر سکوں)۔

ہمارے اس طرح سے عدالت کو جواب دینے سے ہمیں اپنے پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی اُس خواہش کو پورا کرنے کی توفیق مل گئی جس کا اظہار آپ نے اپنے دست مبارک سے لکھے ہوئے ایک خط میں فرمایا تھا:

'بہت دعائیں کریں کہ میرا اور آپ کا خدا اِس پیاری جماعت کا سر ہر ابتلاء میں بلند رکھے اور کبھی غیر اللہ کے سامنے نہ جُھکے' (مکتوب 19.02.1986)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ علی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

## عدالت میں آخری لمحات

صدر عدالت کے ساتھ جملہ سوال و جواب ہو چکے تو انہوں نے اپنے سامنے پڑے کاغذات پر کچھ لکھتے ہوئے ہمیں عدالت سے فراغت کا مژدہ سنایا اور ساتھ ہی انہوں نے ہمارے وارنٹوں پر ساہیوال واپس بھیجنے کے احکام بھی لکھ دیئے۔ اِس کے بعد جب ہم کمرۂ عدالت سے باہر نکل رہے تھے تو صدر عدالت اپنی فائل سمیٹتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم بیس پچیس دِنوں میں مقدمہ کی کارروائی مکمل کر کے اوپر بھجوا دیں گے پھر جو بھی حکم ہوگا، سنادیں گے۔

ہم باہر آئے تو ساتھ ہی حکم ملا کہ تھوڑی دیر یہاں ٹھہریں۔ چند لحوں میں یہاں سرکاری وکیل رانا فرزند علی صاحب آگئے اور انہوں نے ہمارے جملہ تفصیلی کوائف اور خاندانی حالات لکھے جن میں بچوں، والدین اور بہن بھائیوں کی عمریں، پیشے اور تعداد تک شامل تھی۔ سنا تھا کہ فوجی عدالتیں سزا دینے سے پہلے ملزم کے جملہ حالات کا بھی خیال رکھتی تھیں مگر یہ امر شنید کی حد تک ہی تھا ورنہ فوجی راج کے دِنوں میں تو پاکستان کی جیلیں انتہائی دردناک داستانوں سے بھری پڑی تھیں جنہیں ایسے ہی فوجی قلموں نے رقم کیا ہؤا تھا۔

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

## ہمارے مزید دو ساتھیوں کی گرفتاری اور سماعت

ہمارے اِس مقدمہ میں ملوث کئے گئے کل گیارہ افراد میں سے ہم سات افراد کو تو پہلے روز ہی گرفتار کر لیا گیا جبکہ باقی چار افراد پولیس کے قابو نہ آسکے تھے۔ اس لئے ان کا مقدمہ علیحدہ کر کے پہلے مرحلہ پر ہم ساتوں کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ سماعت مکمل ہونے کے بعد ہم واپس ساہیوال پہنچے ہی تھے کہ خبر ملی کہ ہمارے بقیہ ساتھیوں میں سے دو ساتھی مکرم چوہدری حفیظ الدین صاحب اور مکرم نصیر احمد باجوہ صاحب بھی عدالت میں پیش ہو گئے ہیں۔ پھر اُن کے خلاف مقدمہ کی سماعت بھی جلد ہی شروع ہو کر چند دِنوں میں مکمل ہو گئی۔ اس کی پیروی بھی محترم مجیب الرحمٰن صاحب اور محترم

خواجہ سرفراز صاحب نے ہی کی۔ اس کی خبریں بڑی گرما گرم آتی رہیں کیونکہ اب مجیب صاحب نے پہلے سے بھی زیادہ جارحانہ انداز اختیار کرلیا تھا۔ چنانچہ سنا ہے کہ اس نکتہ پر بہت طویل بحث ہوتی رہی کہ جن ارکان عدالت نے اِس سے پہلے ہمارے مقدمہ کی سماعت کی تھی مارشل لاء کے ہی قانون کے مطابق اُن میں سے کوئی ممبر ہمارے مقدمہ کے اِس حصہ کی سماعت نہیں کرسکتا۔ کرنل منیر الرحمٰن اس بات پر مصر تھا کہ مجھے CMLA کا حکم ہے جبکہ مجیب صاحب کہتے کہ مجھے CMLA کا تحریری حکم چاہئے۔ جیسا کہ سب کو علم ہے کہ حکومت پھر حکومت ہی ہوتی ہے اور وہ بھی مارشل لاء کی! چنانچہ بات اُنہی کی مانی گئی اور اپنے ہی قانون کی خلاف ورزی کر کے CMLA نے آرڈر بھی تحریر کر دیا کہ مذکورہ کرنل ہی مقدمہ کی سماعت کرے گا۔ اُسی کرنل اور میجر کو باصرار اور اپنے ہی قانون کے برخلاف عدالت کے رُکن رکھنے میں یقیناً کوئی خاص مقصد ہی ہوگا!

بہرحال ہمارے اِن دونوں ساتھیوں کے خلاف بھی مقدمہ کی سماعت چند دِنوں میں مکمل کرلی گئی جس کے بعد اُنہیں دسمبر 85ء کے آخر تک ملتان جیل میں رہنا پڑا۔ 28 دسمبر کی رات ہمیں ایک سپاہی کی زبانی علم ہوا کہ اُن دونوں کو بری کردیا گیا ہے اور وہ اپنے گھروں میں آ گئے ہیں، الحمدللہ۔ غالباً ان دونوں کو اس بناء پر بری کرنا ان کی مجبوری ہوگی کہ یہ وکیل تھے اور ساہیوال کے وکلاء نے ان کے خلاف مقدمہ پر بہت احتجاج کیا تھا اور بار ایسوسی ایشن ساہیوال نے بھی بہت شور مچایا تھا۔

## مقدمہ کی سماعت ایک نظر میں

ہمارے مقدمہ کی سماعت اگرچہ ہر روز تو نہ ہوتی مگر اس کی کارروائی بہت تیزی سے مکمل کی گئی۔ چنانچہ ایک سماعت کے بعد اگلی پیشی کے لئے قریب کی ہی کوئی تاریخ مقرر ہوجاتی، اس طرح سے اس مقدمہ کی سماعت پورے دو ماہ میں مکمل ہوگئی۔ جس افراتفری کے عالم میں یہ سب کچھ ہوا اُس کا اندازہ مقدمہ کی تاریخوں کے مندرجہ ذیل خاکہ سے کیا جاسکتا ہے:

ساہیوال: 16 فروری 1985ء

ملتان: ماہِ مارچ 1985ء: 2، 13، 7، 4، 16، 17، 30 اور 31

ماہِ اپریل 1985ء: 11، 18، 23 اور 30

ساہیوال: 20 اپریل (بسلسلہ موقع ملاحظہ اور شہادت عدالتی گواہان CWs)

اس طرح پورے دو مہینوں میں ہمارے مقدمہ کی سماعت مکمل ہوگئی لیکن ''فوجی'' نوعیت کی مخصوص کارروائی کے لئے

اس کے بعد بھی دو دفعہ 26 مئی اور یکم جون 1985ء کو ہماری پیشی ہوئی جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ یکم جون کو باضابطہ طور پر ہمارے مقدمہ کے مکمل ہونے کا اعلان صدر عدالت نے کیا اور ہمیں واپس ساہیوال بھجوانے کے آرڈر ہمارے وارنٹوں پر لکھ دیئے۔

### وکلائے استغاثہ وصفائی

اس موقع پر یہ ریکارڈ پر لانا بہت ضروری ہے کہ سارے مقدمہ کے دوران ہماری طرف سے محترم مجیب الرحمٰن صاحب اور محترم خواجہ سرفراز صاحب (مرحوم) باقاعدہ طور پر پیروی کرتے رہے جبکہ ساہیوال سے مندرجہ ذیل وکلاء حضرات تشریف لے جا کر ان کی مدد کرتے رہے:

(۱) محترم میاں محمد عمر صاحب (مرحوم)
(۲) محترم ملک غلام احمد صاحب
(۳) محترم ناصر احمد سراء صاحب
(۴) محترم مرزا سمیع اللہ صاحب (مرحوم)

اسی طرح ملتان کے مکرم عبدالحفیظ جنجوعہ صاحب ایڈووکیٹ (مرحوم) بھی باقاعدہ تشریف لاتے رہے اور وکلاء کی ٹیم میں شامل رہے۔ ان کے علاوہ ملتان کے ایک اور ایڈووکیٹ مکرم بشیر احمد نون صاحب بھی گاہے گاہے آتے رہے، فجزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

اِستغاثہ کی طرف سے پبلک پراسیکیوٹر کی حیثیت سے ضلع ساہیوال کے قابل ترین سرکاری وکیل مکرم رانا فرزند علی خان صاحب پیش ہو کر پیروی کرتے رہے بلکہ مقدمہ پیش کرتے رہے۔ ان کے ساتھ Prosecuting Inspector شاہ حسین صاحب تھے جنہوں نے 14رفروری کو ساہیوال جیل میں آ کر ہمیں Charge Sheet دیتے ہوئے مقدمہ شروع ہونے کی اطلاع دی تھی۔ اس کے علاوہ اِستغاثہ والوں نے اپنے طور پر سرکاری وکیل کی مدد کے لئے فضل کریم صاحب ایڈووکیٹ ساہیوال کو کہا ہوا تھا جو ساہیوال کے وکلاء میں سے فوجداری مقدمات کے چوٹی کے وکیل شمار ہوتے تھے۔ تاہم ان میں سے عدالت میں بولنے کا حق صرف پبلک پراسیکیوٹر جناب رانا فرزند علی خان صاحب کو تھا۔ چنانچہ دورانِ کارروائی باقی سب خاموش رہتے تاہم بوقت ضرورت انہیں آہستہ آواز سے مشورہ دیتے اور راہنمائی کرتے۔ رانا صاحب موصوف اگرچہ ضلع بھر کے سرکاری وکلاء میں سے کامیاب ترین سمجھے جاتے تھے مگر ان کا انگریزی بولنے کا انداز اور لب ولہجہ دیسی قسم کا ہی تھا۔ بہر حال ہمارے حق میں یہ صاحب بہت اچھے رہے اور انہوں نے اس لحاظ سے عمدہ کردار ادا کیا کہ انہوں نے مقدمہ کی سماعت کے دوران کوئی اُلجھن پیدا نہیں کی۔ سچی بات ہے کہ صفائی کے وکلاء کو بالکل تنگ نہیں کیا۔ گو کبھی کبھی بظاہر غصہ سے Offensive پوزیشن میں آ کر بولتے مگر ان کے انداز سے اور پھر مجموعی طور

پر ان کے کردار سے صاف واضح ہوتا کہ یہ جان بوجھ کر کرتے رہے تا کہ مدعی پارٹی انہیں دوش نہ دے سکے۔ یہ سب کچھ انہوں نے کیوں کیا؟ اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ یہ مقدمہ سرتا پا جھوٹا ہے اور سب مبینہ ملزمان بے گناہ ہیں۔ بقول خود وہ صرف سرکاری وکیل ہونے کی وجہ سے مجبور تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کی ایک غیبی مدد تھی ورنہ خواہ مخواہ جھگڑالو قسم کا وکیل بھی تو آ سکتا تھا! الحمدللہ۔

ان کے ساتھ P.I یعنی پراسیکیوٹنگ انسپکٹر مکرم شاہ حسین صاحب پولیس کی وردی میں ملبوس اور کندھوں پر انسپکٹر کے تین تین پھول سجائے بڑی سنجیدگی کے ساتھ بیٹھے رہتے۔ یہ صاحب بھی طبعاً اور فطرتاً نہایت شریف اور ہمدرد قسم کے انسان تھے۔ اُنہوں نے کارروائی کے دوران سرکاری وکیل کی نہ ہونے کے برابر مدد کی اور بالکل خاموشی کے ساتھ کارروائی سماعت کرتے رہے۔ اُن کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ صاحب تو مجبوراً ہی یہاں آ کر بیٹھتے ہیں۔ اِس کا ثبوت ایک روز ان کی بات سے بھی مل گیا۔ ہوا یوں کہ محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے کسی بات پر کرنل صاحب سے کہا کہ یہ صاحب وردی میں کیوں آتے ہیں جبکہ تازہ ترین قواعد کے مطابق انہیں وردی میں نہیں آنا چاہئے۔ اس پر شاہ صاحب کو گمان گزرا کہ مجیب صاحب ان کی یہاں موجودگی پر اعتراض کر رہے ہیں۔ اس کی وضاحت میں فوراً بولے اور ایک ہی سانس میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو ان کے دل کی آواز تھی اور ان کے چہرہ سے عیاں تھی، کہنے لگے:

’سر! میں تو اس مقدمہ میں بالکل آنا ہی نہیں چاہتا۔ اگر آپ کو اعتراض ہو تو میں کل سے آؤں گا ہی نہیں۔

میرا تو دل قطعاً اس مقدمہ میں شامل ہونے کو نہیں چاہتا‘۔

اُن کے الفاظ پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان سے ان کا مدعا اور مقصد نیز اس جھوٹے مقدمہ سے متعلق ان کی ذہنی کیفیت آشکارا ہے۔ یاد رہے کہ یہ اِستغاثہ کی ٹیم میں سے تھے!

اِستغاثہ کے ایک پرائیویٹ وکیل ملک فضل کریم صاحب تھے۔ یہ صاحب پہلے تین چار دن تو آئے ہی نہیں، صرف چشم دید گواہان کی گواہی کے دنوں میں آئے یا پھر تفتیشی افسران کے بیانات والے دنوں میں آتے رہے۔ جب پہلے دن آئے تو انہوں نے مقدمہ کی کارروائی میں براہ راست حصہ لینے کی کوشش کرتے ہوئے عدالت سے کچھ کہا۔ اس پر ہمارے وکیل مجیب الرحمٰن صاحب فوراً کھڑے ہو گئے اور ان کی بات ختم ہوتے ہی بول پڑے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے فاضل دوست ملک فضل کریم صاحب کو عدالت میں بولنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ فقرہ تو اتنا سا ہی تھا مگر تھا ایسا جاندار کہ پھر ملک صاحب نے آخری دن تک کارروائی کے دوران ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کی جرأت نہ کی۔

اِستغاثہ کی ٹیم میں آخری کرسی پر فتنہ و فساد کی جڑ عبدالمتین نامی وکیل بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کی ’فطرت‘ اس سے پہلے بیان

ہو چکی ہے۔ یہاں عدالت میں اس کے کردار اور حشر کا ذکر مقصود ہے۔ کارروائی کے دوران یہ کاغذ قلم لئے صرف نوٹس لیتا رہتا۔ میری جگہ عین اس کے برابر تھی اس لئے اس کی بے ڈھنگی لکھائی میری نظر میں رہتی۔ عدالت میں اُسے بھی بولنے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ شروع میں ایک دو مرتبہ اس نے دخل دینے کی کوشش کی تو محترم مجیب الرحمٰن صاحب نے اس کی دُم پر ایسا پیر رکھا کہ یہ بُری طرح تڑپ کے رہ گیا۔ اس کے بعد اِسے آخر تک جرأت نہ ہوئی کہ ''چوں'' بھی کرتا۔ یہ دوسری یا تیسری پیشی کا ذکر ہے کہ اس کی کسی بات پر مجیب صاحب نے انتہائی جلال میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عدالت سے کہا کہ اِسے تو سرے یہاں ہونا ہی نہیں چاہئے کیونکہ یہ تو اُس روز (یعنی 26 اکتوبر کو وقوعہ کے وقت) موقع پر موجود تھا، اس لحاظ سے تو یہ Court witness ہے اور ہم اِسے عدالتی گواہ کے طور پر طلب کریں گے۔ محترم مجیب صاحب کا یہ کہنا تھا کہ ہم نے اِس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑتے اور چہرہ کا رنگ فق ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ واقعی اس وقوعہ میں شامل تھا۔ اِس کے بعد عدالت میں اس کا آخری فقرہ لڑکھڑاتی زبان سے یوں نکلا کہ سر! اگر یہ چاہتے ہیں کہ مجھے عدالتی گواہ کے طور پر طلب کریں تو یہ باقاعدہ درخواست دیں۔

## سماعت مقدمہ پر ایک نظر

مقدمہ کی سماعت کے دوران ہم نے جس قسم کے ایمان افروز اور ایمان سوز نظارے دیکھے، انہیں حتی الامکان محفوظ کر کے قارئین تک من وعن پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جن کے مطالعہ سے یہ انتہائی تکلیف دہ امر خوب اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کے یہ نام نہاد ٹھیکیدار کس کردار کے مالک ہیں اور محض احمدیت دشمنی میں کہاں تک چلے جاتے ہیں! کیا ایسے میں ہر کس و ناکس کو یقین نہیں آ جانا چاہئے کہ یہ وہی زمانہ ہے جس کے بارہ میں اصدق الصادقین صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ قرآن اور ایمان اُٹھ جائے گا، لوگ قرآن پڑھیں گے تو ضرور مگر ان حلق سے نیچے نہیں اترے گا اور اس پر عمل سے وہ کوسوں دور ہوں گے۔ یہ نظارے اس اعتبار سے اِنتہائی تکلیف دہ تھے کہ یہ لوگ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے والے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک نام پر سب کچھ کر رہے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ کے عظیم روحانی فرزند حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت پر مہر تصدیق بھی ثبت کرنے والے تھے کیونکہ ہر سچے کی مخالفت کے لئے ہمیشہ جھوٹ اور کذب بیانی کا ہی سہارا لیا جاتا رہا ہے جیسا کہ ہمارے اس مقدمہ کی سماعت کے دوران بھی دیکھنے میں آیا۔

## سارے کا سارا جھوٹ

آخری بحث والے دِن محترم خواجہ سرفراز صاحب کے ساتھ ایک دلچسپ اور بے ساختہ گفتگو ہوئی جسے قارئین کی دلچسپی کے لئے خاکسار درج کئے دیتا ہے۔ ہُوا یوں کہ اُس روز سماعت کے دوران وقفہ میں ہم باہر گراسی پلاٹ میں بیٹھے تھے کہ محترم خواجہ صاحب ہمارے پاس تشریف لائے اور دورانِ گفتگو کہنے لگے کہ میری 32 سالہ وکالت کے دوران یہ پہلا مقدمہ ہے جس میں کوئی ایک بات بھی سچی نہیں، سارے کا سارا جھوٹ ہے سوائے اِس کے کہ دو آدمی مرے ہیں۔ اِس پر خاکسار نے برجستہ عرض کیا کہ خواجہ صاحب! یہ بھی سچ نہیں۔ کہنے لگے کیسے!؟ میں نے کہا کہ دراصل بندے تین مرے تھے۔ تیسرا مرنے والا وہ تھا جسے زخمی حالت میں حملہ آور اُٹھا کر ساتھ لے گئے تھے اور بعد میں وہ چل بسا تھا۔ پھر اُسے قانونی وجوہات کی بناء پر پی گئے تھے کیونکہ اُسے FIR میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اِس پر خواجہ صاحب بے اختیار کہہ اُٹھے: لو، جسے میں سچ سمجھ رہا تھا وہ بھی جھوٹ ہی نکلا۔ پھر ہمیں کہنے لگے:

> دیکھنا اس مقدمہ کا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اس کی فائل JAG Branch میں پڑی رہے گی پھر مقدمہ سول عدالت کے سپرد ہوگا جہاں سے اس کی دوبارہ تفتیش کا حکم جاری ہوگا۔

محترم خواجہ صاحب کی اِس بات پر خاکسار کے دل میں جو خیالات ابھرے انہیں اُس وقت یوں تحریر میں لا کر اپنی روزانہ ڈائری میں محفوظ کیا تھا:

> اب دیکھئے کیا بنتا ہے لیکن یہ یقین کامل ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیں کسی صورت میں ضائع نہیں کرے گا۔ مارشل لاء عدالت ہو یا سول کورٹ، ہمارے روشن تر مستقبل کے سامان ہی ہوں گے، انشاءاللہ العزیز۔ ہم سول کورٹ کی آس لگا کر اسے بت نہیں بناتے۔ اگر خدا ہماری باعزت بریت چاہتا ہے تو مارشل لاء سے بھی بڑھ کر کوئی عدالت ہو، ہمیں ہرگز ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتی، ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کی مشیت اسلام کے اِحیائے نو کی خاطر ہم سے قربانی کا مطالبہ کرتی ہے تو ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ وہی ہمارا خدا ہمیں اس کی بھی توفیق عطا فرما دے گا، وہ قربانی رنگ لائے گی اور ہرگز رائیگاں نہیں جائے گی، انشاءاللہ تعالیٰ ۔

خوں شہیدانِ اُمت کا اے کم نظر! رائیگاں کب گیا تھا کہ اب جائے گا
ہر شہادت ترے دیکھتے دیکھتے، پھول پھل لائے گی، پھول پھل جائے گی
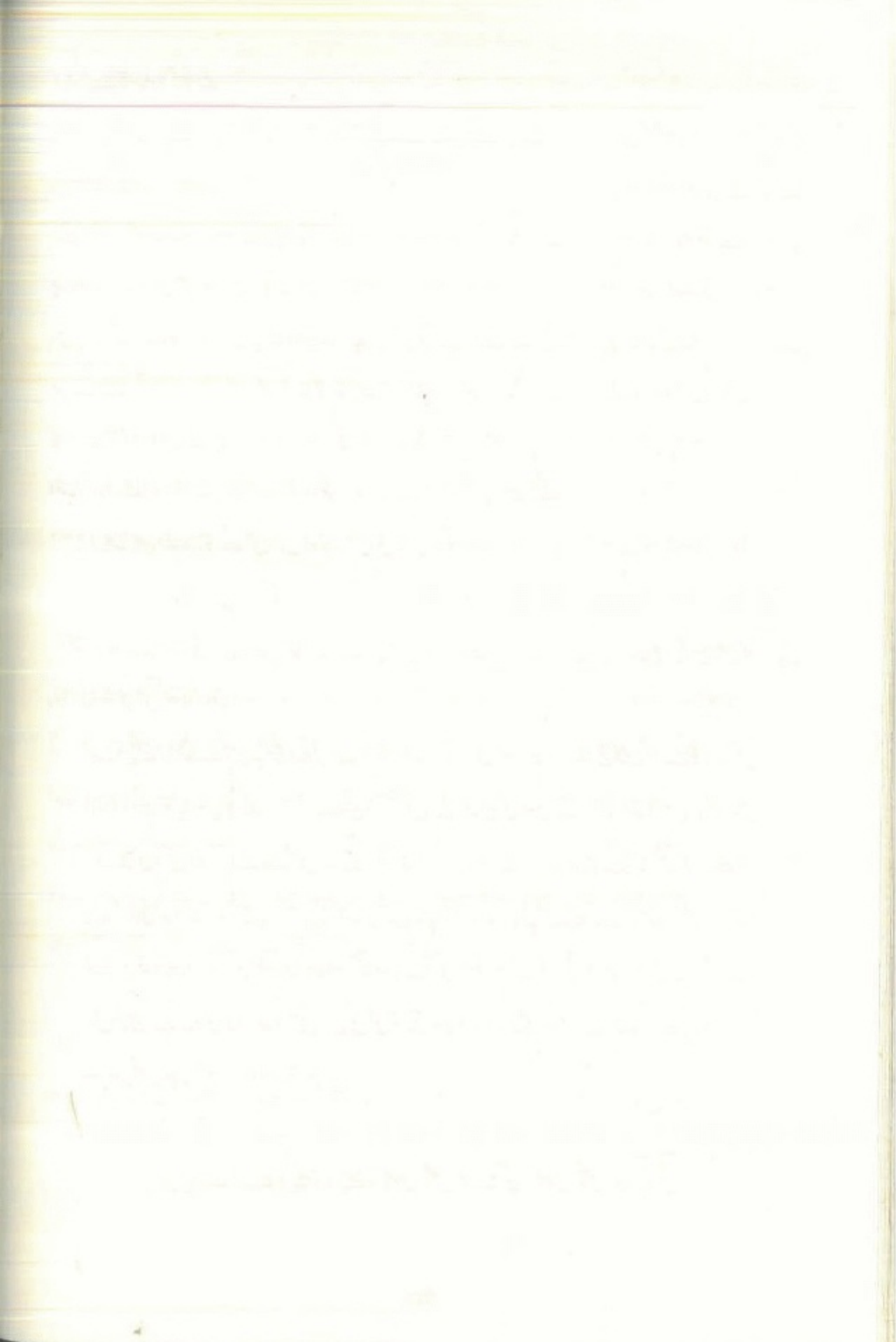
☆ چوتھا باب

# اسیری بطور قیدی سزائے موت

- ☆ فیصلہ مارشل لاء اُٹھنے کے بعد
- ☆ جب سزائے موت سنائی گئی
- ☆ سزائے موت کا عرصہ اور اس میں مصروفیات
- ☆ ساہیوال میں جب آخری حکم سنایا گیا
- ☆ سنٹرل جیل ملتان میں ایام اسیری
- ☆ سنٹرل جیل فیصل آباد میں ایام اسیری
- ☆ سزائے موت کا عمر قید میں تبدیل ہونا

کسی ابتلاء سے اُس کے فضل کے ساتھ مجھے خوف نہیں اگرچہ ایک ابتلاء نہیں کروڑ ابتلاء ہو،
ابتلاؤں کے میدان میں اور دُکھوں کے جنگل میں مجھے طاقت دی گئی ہے

من نہ آنستم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من
آں منم کاندرمیانِ خاک و خوں بینی سرے

میں وہ نہیں کہ جنگ کے دن تو میری پشت دیکھے
میں تو وہ ہوں کہ جس کا سر خاک وخون کے اندر ہی دیکھے گا

(انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۲۳)

# اسیری بطور قیدی

مقدمہ کی سماعت کے بعد قریباً آٹھ ماہ تک ہم ساہیوال جیل میں اپنے فیصلہ کے منتظر رہے۔ اُس دوران مارشل لاء بھی اُٹھا لیا گیا جس کے بعد ہر ایک کا خیال تھا کہ اب ہمارا مقدمہ سول عدالت میں منتقل کر دیا جائے گا اور وہیں سے فیصلہ ہوگا۔ مگر ایسا نہ ہوا بلکہ ایک روز اچانک جیل کے ہی دفتر میں بلا کر اُس 'فوجی عدالت' کا فیصلہ ہمیں سنا دیا گیا جس کا وجود ختم ہوئے بھی ڈیڑھ ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اس باب میں فیصلہ سنائے جانے سے پہلے اور بعد کی رُوداد سپردِ قلم کی جارہی ہے۔

## سزا کی خبریں اور حضورؒ کی نصیحت

جب ہم ساہیوال دوبارہ منتقل کئے گئے تو ہمارے لئے گویا عالم برزخ کا آغاز ہوگیا۔ اِس دوران مختلف قسم کی افواہوں کی گردش شروع ہوگئی کہ فلاں کو فلاں سزا اور فلاں کو فلاں سزا دی گئی ہے۔ کبھی خبر آتی کہ سزا کم کردی گئی ہے اور کبھی آتی کہ بحال رکھی گئی ہے اور کبھی کہتے کہ سزائیں بالکل ختم کردی ہیں صرف رانا صاحب کو دفعہ 304 کے تحت تھوڑی بہت سزا ہے۔ تاہم اس بارہ میں کوئی معین اور معتبر خبر نہ تھی اِسی وجہ سے ہم نے انہیں درخورِ اِعتناء نہ سمجھا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے فضل سے ان باتوں سے بالکل بے پرواہ رکھا اور ہم اپنی روزمرہ سرگرمیوں یعنی نمازوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی، تربیتی اور تبلیغی کاموں میں پورے اِنہماک سے مصروف رہے، الحمد للہ۔ جب کبھی خوف کے سائے بڑھتے ہوئے نظر آتے تو ذکر الٰہی میں مصروف ہوجاتے اور اُسی سے مدد چاہتے۔ اس کے نتیجہ میں اللہ کے فرشتے نازل ہوکر اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا کی تسلیاں دیتے۔

یوں تو حضرت امیر المؤمنین کی ہدایات اور نصائح ہر قدم پر ہمارے لئے مشعل راہ تھیں اور ابتداء سے ہی آپ نے اپنے خطوط اور پیغامات میں ایسا انداز اختیار فرمایا کہ غیر محسوس طریق سے ہمیں آنے والے حالات کے لئے تیار فرما دیا تھا مگر عین اُن ایام میں جب مقدمہ کی سماعت ہوچکی تھی اور ہمیں سزائیں سنائے جانے کی خبریں گردش میں تھیں، حضورؒ کی طرف سے ایک نصیحت اور ہدایت اِن الفاظ میں ملی کہ:

'تمام اسیران اور ان کے اعزہ واقارب

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف تذکرۃ الشہادتین کا بکثرت مطالعہ کریں'

حضورؒ کی یہ نصیحت بڑی اہم تھی اور اس میں حضور نے ہمیں اور ہمارے اعزہ واقارب کو جو پیغام دیا تھا وہ بھی بڑا واضح تھا۔ اس طرح سے حضورؒ نے دُور پردیس میں بیٹھے بڑے عمدہ رنگ میں ہماری تربیت فرمائی اور نہ صرف آنے والے حالات کی نشاندہی فرمادی تھی بلکہ ہمیں ان کے لئے تیار رہنے کے لئے نہایت مؤثر طریق بھی تجویز فرمادیا تھا۔ چنانچہ ہم سب اس کتاب کا مطالعہ کرتے رہے اور حضرت مسیح موعودؑ کی اِس تڑپ کو سامنے رکھ کر اپنے جسم و روح کو ہر قسم کی صورت حال کے لئے تیار کرتے رہے:

'اے عبداللطیف تیرے پر ہزاروں رحمتیں کہ تو نے میری زندگی میں ہی اپنے صدق کا نمونہ دکھایا، اور جو لوگ میری جماعت میں سے میرے بعد رہیں گے مَیں نہیں جانتا کہ وہ کیا کام کریں گے۔'[1]

خاکسار اُن ایام میں حضور رحمہ اللہ کے ایک اِرشاد کہ ہمارے حق میں خدا کی جو تقدیر بھی ظاہر ہوگی وہ خیر ہی ہوگی خواہ وہ شر کے پردہ میں ہو، کی مناسبت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا اپنے ساتھیوں سے بکثرت پڑھنے کے لئے کہتا رہتا کہ

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ

ہم سب اس دعا کا حسب توفیق ورد کرتے رہتے لیکن اُس وقت کا نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا جب کوئی منشی آکر پرچہ دیتا کہ آپ سب ڈیوڑھی روانہ ہوں۔ محترم ملک صاحب کہنے لگتے چلو جی! فیصلہ کے لئے تیار ہو کر جاؤ اور ساتھ ہی مجھے کہتے مربی صاحب! وہ دعا کیا تھی ذرا مجھے بتا دو۔ 15 فروری 86ء تک نہ جانے کتنی ہی بار ہم اس کیفیت کے ساتھ ڈیوڑھی گئے اور وہاں جا کر علم ہوتا کہ ابھی فیصلہ نہیں، ملاقات ہے!

## ضمیر مطمئن، قلب و ذہن پُرسکون!

خدا تعالیٰ کا ہمارے ساتھ یہ نرالا سلوک تھا کہ اس قسم کی غیر یقینی صورت میں بھی ہم پریشان ہونے کی بجائے خوشگوار موڈ میں رہتے۔ ہمیں کتنے ہی لوگ یہ کہہ کر ڈرایا کرتے تھے کہ تمہاری صورتِ حال (نوعیتِ مقدمہ کی وجہ نہیں بلکہ مارشل لاء کے باعث) بہت سنگین ہے، اس لئے کچھ کرلو اگر کرنا ہے! ہمیں خود بھی مارشل لاء والوں کے کارناموں اور اُن کی 'نیک نیتی' اور 'انصاف' کا پوری طرح علم تھا اور اُن سے کسی بھی خیر کی توقع نہیں تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی بے گناہی کا بھی تو کامل یقین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم مطمئن ضمیر اور صاف ذہن کے ساتھ ہر قسم کے خطرات سے بے فکر اور بے پرواہ ہو کر اسیری کا یہ سفر طے کرتے رہے۔ گرمیوں کے بعد ایک مرتبہ پھر سردیوں کی آمد شروع ہوگئی۔ عام

---

[1] تذکرۃ الشہادتین صفحہ 59 طبع اوّل

خیال تھا کہ شاید ہمیں سردیاں یہاں گزارنی نہ پڑیں لیکن آہستہ آہستہ کمبلوں کے بعد رضائیاں بھی منگوانی پڑیں۔ لیکن ملک صاحب بعض اشاروں کی وجہ سے گھر جانے کی تیاریوں میں تھے حتی کہ نومبر میں جب گھر والوں نے رضائی بھیج ہی دی تو اسے کئی روز تک کھولا ہی نہیں کہ آج نہیں تو کل گھر جا کر ہی کھولیں گے۔ میں ملک صاحب سے کہتا رہا کہ اتنی بھی کیا جلدی اور اتنا بھی کیا صرفہ اور ایسا بھی کیا حسن ظن اس حکومت پر!

میں نے کچھ عرصہ پہلے غالباً اگست کے مہینہ میں خواب دیکھا تھا کہ میں کسی سول افسر کے سامنے کھڑا ہوں۔ میز کرسی پر براجمان اُس افسر کی حیثیت مجسٹریٹ کی ہے۔ اس نے مجھے موت کی سزا سنائی ہے اور محترم ملک صاحب میرے ساتھ کھڑے اپنی ایک سالہ قید کی سزا پر اُسے کہہ رہے ہیں کہ یہ آپ نے ناجائز کیا ہے، زیادتی کی ہے وغیرہ۔ اس خواب کی بناء پر مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ فیصلہ فوجی نہیں سنائیں گے مگر اب صورتِ حال یہ تھی کہ سن 1985ء کا ماہ دسمبر شروع ہوا تو مارشل لاء اُٹھائے جانے کی خبریں گرم ہونے لگیں تو فوجیوں نے اپنے معاملات سمیٹنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ فوجی عدالتوں نے اپنی سرگرمیوں کو عروج تک پہنچا دیا اور اپنے سماعت کئے ہوئے مقدموں کے فیصلے تیزی سے سنانے شروع کر دیئے، یہاں تک کہ رات سو کر صبح اُٹھتے تو پتہ چلتا کہ فلاں نماند! ہر روز دِن کے وقت بھی اور رات کی سردی میں بھی فوجیوں کے بلاوے پر حوالاتیوں کو نکال کر لے جاتے اور سزا سنا کر حوالاتی سے مجرم قیدی بنا دیتے اور سزائے موت سنائے گئے قیدیوں کو نکال کر فوری طور پر پھانسی گھاٹ پر لے جاتے۔

### مارشل لاء کا خاتمہ

ہماری کیا سبھی مارشل لاء زدہ حوالاتیوں کی یہ کیفیت دسمبر 85ء کے آخر تک جاری رہی۔ ہم کہتے کہ فیصلہ جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے مگر رات کے وقت سردی میں تو ہمیں تنگ نہ کریں۔ چنانچہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے 29/30 دسمبر 1985ء کی رات بڑے درد کے ساتھ دُعا کی، ہم بھی رات کافی دیر تک اِسی اِنتظار میں جاگتے رہے کہ اب ہماری باری آئی کہ آئی! باہر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے۔ کسی راؤنڈ والے کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی تو ہم ہوشیار ہو کر تالے کھلنے کا انتظار کرنے لگتے۔ اُس رات کچھ دیر بعد مجھے تو نیند آ گئی تاہم باقی اکثر ساتھی نیم نیند کی حالت میں ہی رہے۔ صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ آج کی رات تو اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی ہے۔ اُسی روز 30 دسمبر کو دس گیارہ بجے صبح مارشل لاء اُٹھا لیا گیا اور فوجی عدالتوں میں زیرِ سماعت تمام مقدمات کو سول عدالتوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس پر ہمیں کافی حد تک یقین ہو گیا کہ اب ہمیں سول عدالت میں جانا ہو گا جہاں شاید پہلے ضمانتیں ہوں گی پھر نئے سرے سے مقدمہ چلے گا جیسا کہ محترم خواجہ سرفراز صاحب نے کہا تھا۔

اُسی روز کی بات ہے کہ دوپہر کے وقت محترم چوہدری اسحق صاحب ڈیوڑھی سے ہوکر آئے تو یہ خبر لائے کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کو ملتان سے فوجیوں کا فون آیا ہے کہ سات ملزمان کو آج صبح حکم سنانے کے لئے طلب کیا گیا تھا مگر وہ نہیں پہنچے، کیوں؟ فون کرنے والے نے گذشتہ روز تین بجے سہ پہر جیل میں کئے جانے والے فون کا ہی حوالہ دیا۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ جیل نے پوچھ گچھ کی مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ ہر کوئی حیران تھا کہ اس قسم کا اہم فون کس طرح لاپرواہی کا شکار ہوگیا۔ اُدھر یہ خبر ہمارے لواحقین کو اس طرح ملی کہ ہمیں ملتان لے جایا جاچکا ہے چنانچہ وہ ملتان کے لئے رخت سفر باندھ کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے مگر کسی کے کہنے پر جیل سے تصدیق کرنے کی خاطر برادرم حاذق صاحب کی ملاقات لکھوادی تو پتہ چلا کہ ملتان لے جائے جانے کی خبر درست نہ تھی۔ بہرحال اگر اس فون پر عمل درآمد ہوجاتا تو ہمیں بھی راتوں رات ملتان لے جا کر فیصلہ سنا دیا جاتا تھا مگر ہمارے خدا نے ہماری دعا سن لی تھی اور ہمیں اس کوفت سے اس نے بچایا، ہماری مدد فرمائی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس بات کا نظارہ کرادیا کہ

"تم سو رہے ہوگے اور وہ تمہارے لئے جاگے گا"

وقت اپنی پوری رفتار سے گزرتا چلا جارہا تھا اور ہم وقت کی سواری پر سوار 'عالم برزخ' (یعنی حوالات) کی منازل طے کرتے چلے جارہے تھے۔ ہمارے سفر کا یہ وہ حصہ تھا جسے طے کرنے والا ہر مسافر ہمہ وقت دھڑکتے دِل اور لرزتے جسم کے ساتھ طے کیا کرتا ہے۔ اس راہ پر وسوسے دِل کو پریشان رکھتے ہیں اور معمولی سی آہٹ پر بھی انسان چونک اُٹھتا ہے اور کسی بھی خبر کو دِل پر ہاتھ رکھ کر سنتا ہے۔ ذرا سی خبر سے نہال اور ذرا سی خبر پر نڈھال ہوجانا اس کا معمول بن جاتا ہے۔ غرضیکہ اس کا لحہ لحہ سخت بیتابی اور بے قراری میں گزرتا ہے۔ اس کی کیفیت اپنی نوعیت کے اعتبار سے قریباً قریباً ویسی ہی ہوتی ہے جیسی طالب علم کی امتحان کا نتیجہ نکلنے سے تھوڑی دیر پہلے ہوتی ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ طالب علم کے منفی نتیجہ کے اثرات تو محض سال دو سال تک محدود ہوتے ہیں جب کہ دفعہ 302 کے نتیجہ کا تعلق اس کی زندگی اور موت کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں نے مندرجہ بالا تجزیہ اپنے محسوسات کے ساتھ ساتھ دیگر قیدیوں کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد پیش کیا ہے۔ جہاں تک میری اپنی کیفیت کا تعلق ہے تو اس کے متعلق اوپر بھی عرض کرچکا ہوں کہ ایک انسان ہونے کے ناطہ اِن امور سے کلی طور پر تو پاک نہ تھا لیکن یہ بھی یقین سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے حوصلہ اور ضبط و تحمل کی بے پناہ دولت سے مالامال کئے رکھا، اسی وجہ سے میرے لئے یہ مرحلہ بہت حد تک پرسکون طور پر گزرا، الحمدللہ۔

### پہلا فیصلہ

جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ مقدمہ کی سماعت کے بعد سزاؤں کے بارہ میں مختلف قسم کی افواہیں گردش میں رہی تھیں

تو اس میں بہر حال حقیقت بھی تھی اور وہ یہ کہ فوجی عدالت نے سماعت کے فوراً بعد 16 جون 85ء کو ہی مقدمہ کا فیصلہ کر کے اعلیٰ حکام کو بھجوا دیا تھا۔ اس فیصلہ کے مطابق مکرم چوہدری محمد اسحاق صاحب بری کر دیئے گئے تھے جبکہ خاکسار اور مکرم رانا نعیم الدین صاحب کو موت کی سزا اور دیگر چار ساتھیوں کو سات سات سال قید با مشقت کی سزا دی گئی تھی۔ ان ظالموں کی عیاری و مکاری ملاحظہ ہو کہ جب فیصلہ سنائے جانے کے بعد ہمیں مقدمہ کی فائل دی گئی تو اس میں سے مندرجہ ذیل صفحات غائب کر دیے لیکن صفحات کے نمبر بدلنا بھول گئے جس سے پکڑے گئے۔

56

SENTENCE

| | |
|---|---|
| Death | The court sentence Muhammad Ilyas Munir Murrabi son of Muhammad Ismail to suffer death by being hangs by the neck until he be dead. |
| Death | The court sentence Naeem ud Din son of Feroze Kha to suffer death by being hanged by the neck until he be dead. |
| Imprisonment for seven years | The court sentence Abdul Qadir son of Abdul Rahim to suffer imprisonment for seven years. |
| Imprisonment for seven years | The court sentence Muhammad Nisar son of Gulzar Muhammad to suffer imprisonment for seven years. |
| Imprisonment for seven years | The court sentence Muhammad Haziq Rafique Tahir son of Mian Muhammad Ishaque to suffer imprisonment for seven years. |
| Imprisonment for seven years | The court sentence Muhammad Din (Retd) Sub Inspector Police son of Faqir Ali to suffer imprisonment for seven years. |
| Acquital | The court acquit accused Muhammad Ishaque son of Muhammad Ismail not being guilty of all the charges. |

Certified that the sentence have been passed with the concurrence of all the members of the board.

PAA Sec 105 complied with.

Signed at Multan this the 16th day of June 1985.

Maj
GSO-2 (Legal)
(Khadim Hussain)

Lieutenant Colonel
President Special Military Court Number 62
(Munir ur Rehman)

## جنرل غلام خان جیلانی گورنر پنجاب کا حکمنامہ

فوجی قانون کے مطابق یہ فیصلہ جب توثیق کے لئے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون اے جنرل غلام جیلانی خان صاحب (گورنر پنجاب) کے پاس گیا تو انہوں نے سزائے موت کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا اور اس پر ایک طویل حکمنامہ برائے نظر ثانی Revision Order لکھا اور فائل واپس عدالت کو بھجوا دی۔ اس حکمنامہ نے جہاں ہمارے مقدمہ

---

REVISION ORDER

I, Lt Gen Ghulam Jilani Khan, MLA Zone 'A' (Punjab) do hereby direct that the Special Mil Court No 62 which assembled at Multan from 2nd day of March 1985 to 16th day of June 1985, for the trial of accused persons Muhammad Ilyas Munir Murrabi S/O Muhammad Ismail and six others, will re-assemble at Multan on the date and time to be fixed by the President of the Court for the purpose of revising its findings and sentence in the light of the following observations:-

a. The complainant party appears to have taken law in its own hand and gone to the place of worship of Qadianis to remove Kalama-i-Tayyaba and Quaranic verses. The contention of the defence gets support from the facts that a tin of blue paint and a brush smeared with paint were found in the Bait Ul Hamd and Kalama-i-Tayyaba and Quaranic verses out-side as well as in-side were found erased with blue paint. The clothes of the deceased were also found stained with blue paint. If the accused had themselves erased the verses from out-side the Bait Ul Hamd, at-least, some PWs should have so stated. The prosecution assertion that the deceased had been injured out-side and later taken in-side and then brought out-side the Bait Ul Hamd, does not find support from evidence on record. Had this version been correct, there should have been more trail marks of blood leading to the place where the dead bodies were lying. As only one trail mark was found from in-side, from the Bait Ul Hamd leading upto the dead body of Qari Bashir Ahmed, it became clear that the deceased persons were injured when they were in-side the Bait Ul Hamd, which was the defence version and stood supported by CW-1 and CW-2.

b. The contention of the prosecution that Azhar Rafique (deceased) was injured through pistol/revolver fire, is belied by the medical evidence, as no bullet injury was found on his person. The Court is thus required to re-consider the conviction of Muhammad Ilyas Munir Murrabi (accused No 1), Naeem Ud Din (accused No 2), Abdul Qadir (accused No 3), Muhammad Nasir (accused No 4), Muhammad Haziq Rafique Tahir (accused No 5) and Muhammad Din (Retd) SI Police (accused No 7) on all the charges which is based on doubtful evidence and as such is not legally sustainable.

میں ایک بنیادی کردار ادا کیا وہاں جنرل صاحب کی نیکی اور انصاف پسندی پر بھی گواہ ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد اس مقدمہ کی اصلیت اور عدالت کے جانبدارانہ رویہ کا بھی بخوبی پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح اسے پڑھ کر دل سے بے اختیار آواز اٹھتی ہے کہ ابھی کچھ لوگ ہیں باقی جہاں میں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ خان صاحب موصوف کو جلتی اور شعلہ مارتی آگ کے باوجود اس جرأت کا مظاہرہ کرنے کا اجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔ قارئین بھی یقیناً غلام جیلانی خان صاحب کی جرأت رندانہ کی داد دیں گے اور ان کے لئے دعائے خیر بھی کریں گے۔

c. Naeem Ud Din accused No 2, has been found 'Guilty' U/S 302 PPC. From the evidence on record, it appears that the complainant party had gone to place of worship of the accused and erased Kalma-i-Tayyaba which created sufficient provocation to the accused who acted in self defence. However, since the group which entered Bait Ul Hamd was not armed nor it caused any injury to the accused persons, no damage to life or property of the inhabitants of the Bait Ul Hamd was caused except the erasing of the verses etc, which could create sufficient apprehension of death. Naeem Ud Din (accused No 2) had fired at Qari Bashir Ahmad and Azhar Rafique which resulted into their death. The action of accused No 2 was not compatable to the prevailing situation and thus he exceeded the right of self defence by causing fire arm injuries to the deceased. Therefore, this accused is 'Guilty' U/S 304 PPC and not U/S 302 PPC, as recorded by the Court. The Court is now required to re-consider the conviction of this accused U/S 304 PPC while recording special findings on charge 1 and 2 and pass a legally awardable sentence.

d. All the accused persons were charged for committing two murders U/S 302/149 PPC, therefore, the third charge framed U/S 148 PPC was not legally required to be laid. The accused were present at the place of their worship and Muhammad Ilyas Munir Murrabi (accused No 1), Naeem Ud Din (accused No 2) and Muhammad Din (Retd) S.I. Police (accused No 7) had their living accommodation in-side the Bait Ul Hamd. It was morning prayer time and they were present in the Bait Ul Hamd. Therefore, the conviction of all the accused on the third charge U/S 148 PPC is legally not sustainable.

e. While awarding the sentence to accused No 2, the court may also comply with the provisions of CMLO-84.

2. The Court is warned that while recording the revised sentence, they do not in any manner tamper with the original record of finding and sentence in the fourth column of Schedule to PAFF 956 but they will use a separate form for the purpose as per specimen at pages 491 - 492 MPML Vol-1.

3. The Court will re-assemble in close court i.e. no one except the members of the Court will be present and revision orders will be read out. The attention of the Court is drawn to PAA Section 126, PAA Rule 57 and notes there-under.

Station: Lahore
Dated : 3 Oct 85

Attested

Maj
GSO-2 (Legal)
(Khadim Hussain)

Lt Gen
MLA Zone 'A' (Punjab)
(Ghulam Jilani Khan)

## Revision Order

I, Lt. Gen Ghulam Jilani Khan, MLA Zone "A" (Punjab) do hereby direct that the Special Mil Court No: 62 which assembled at Multan from 2nd day of March 1985 to 16th day of June 1985 for the trail of accused persons Muhammad Ilyas Munir Murabi s/o Muhammad Ismail and six other, will reassemble at Multan on the date and time to be fixed by the President of the Court for the purpose of revising its findings and sentence in the light of the following observations:

a. The complainant party appears to have taken law in their own hands and go to the place of worship of Qadianis to remove Kalama-i-Tayyaba and Quranic verses. The contention of the defence gets support from the facts that a tin blue paint and a brush smeared with paint blue paint were found in the Bait-ul-Hamd and Kalama-i-Tayyaba and Quranic verses with blue paint. The clothes of the deceased were also found stained with blue paint. If the accused had themselves erased the verses from out-side the Bait-ul Hamd, at-least, some PW's should have so stated. The prosecution assertion that the deceased had been injured out-side and later taken in-side and then brought out-side the Bait-ul-Hamd, does not find support from evidence on record. Had this version been correct, there should have been more trail marks of blood leading to the place where the deadbodies were lying. As only one trail mark was found from in-side, from the Bait-ul-Hamd leading up to the dead body of Qari Bashir Ahmad, it became clear that the deceased persons were injured when they were in-side the Bait-ul-Hamd, which was the defence version and stood supported by CW-1 and CW-2.

b. The contention of the prosecution that Azhar Rafique (deceased) was injured through pistol/revolver fire, is belied by the medical evidence, as no bullet injury was found on his person. The Court is thus required to re-consider the conviction of Muhammad Ilyas Munri Murabbi (accused No:1), Naeem-ud-Din (accused No:2), Abdul Qadir (accused No:3), Muhammad Nisar (accused No:4), Muhammad haziq Rafique Tahir (accused No:5) and Muhammad Din (Retd) SI Police (accused No:7) on all the charges which is based on doubtful evidence and as such is not legally sustailable.

c. Naeem-ud-din accused No: 2, has been found Guilty U/S 302 PPC. From the evidence on record, it appears that the complainant party had gone to place of worship of the accused and erased Kalma-i-Tayyaba which created sufficient provocation to the accused who acted in self defence.

However, since the group which entered Bait-ul-Hamd was not armed nor it caused any injury to the accused persons, no damage to life or property of the inhabitants of the Bait-ul Hamd was caused except the erasing of the verses etc, which could create sufficient apprehension of death. Naeem-ud-Din (accused No:2), had fired at

Qari Bashir Ahmed and Azhar Rafique which resulted into their death. The action of accued No:2 was not compatible to the prevailing situation and thus he exceeded the right of selfdefence by causing fire arm injuries to the deceased. Therefore, this accused is Guilty U/S 304 PPC and not U/S 302 PPC, as recorded by the Court. The Court is now required to re-consider the conviction of this accused U/S 304 PPC while recording special findings on charge 1 and 2 and pass a legally awardable sentence.

d. All the accused persons were charged for commiting two murders U/S 302/149 PPC, therefore, the third charge framed U/S 148 PPC was not legally required to be laid. The accused were present at the place of their worship and Muhammad Ilyas Munir Murrabi (accused No:1), Naeem-Ud-Din (accused No:2) and Muhammad Din (Retd) S.I. Police (accused No:7), had their living accommodation inside the Bait-ul-Hamd. It was morning prayer time and they were present in the Bait-ul-Hamd. Therefore, the conviction of all the accused on the third charge U/S 148 PPC is legally not sustainable.

e. While awarding the sentence to accused No. 2 the court may also comply with the provisions of CMLO-84.

2. The court warned that while recording evidence, they do not in any manner tamper with the original record of findings and sentence in the fourth column of Schedule to PAFF 956 but they will use a separate form for the purpose as per specimen a pages 491-492 MPML Vol.-I.

3. The Court will re-assemble in close court i.e. no one except the members of the Court will present and revision order wil be read out. The attention of the Court is drawn to PAA Section 126, PAA Rule 57 and notes there-under.

(SIGNED)
Lt. Gen
MLA Zone"A" (Punjab)
(Ghulam Jilani Khan)

Station: Lahore
Dated: 8 Oct 85

attested
. Maj.
GSO-2 (Legal) (Khadim Hussain).

ترجمہ:

## حکم نظر ثانی

میں لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زون اے پنجاب ہدایت کرتا ہوں کہ سپیشل ملٹری کورٹ نمبر 62 جس نے ملتان میں 2 مارچ 1985ء تا 16 جون 1985ء ملزم محمد الیاس منیر مربی ولد محمد اسماعیل اور دیگر چھ افراد کے مقدمہ کی سماعت کی تھی کہ وہ دوبارہ ملتان میں صدر عدالت کی طرف سے دیئے گئے نظام الاوقات کے مطابق اپنا اجلاس منعقد کر کے ذیل میں بیان شدہ نکات کی روشنی میں اپنے فیصلہ اور (ملزمان کو دی گئی) سزاؤں پر نظر ثانی کرے۔

الف) مدعی فریق قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات کو مٹانے کے لئے قادیانی عبادت گاہ میں گیا۔ فریق صفائی کے اس موقف کی تائید ان حقائق سے ہوتی ہے کہ ایک نیلے روغن کا ڈبہ اور ایک برش جس پر نیلا رنگ بھی تھا، بیت الحمد سے ملا تھا۔ اور بیت الحمد کے باہر اور اندر کلمہ طیبہ اور قرآنی آیات بھی نیلے رنگ سے مٹی ہوئی تھیں، مزید برآں مقتول کے کپڑے بھی نیلے رنگ سے لتھڑے ہوئے تھے۔ اگر ملزمان نے خود بیت الحمد کے باہر سے آیات قرآنیہ کو خود مٹایا ہوتا تو گواہانِ استغاثہ میں سے کوئی ایک ضرور اس کا ذکر کرتا۔ استغاثہ کا اصرار کہ مقتول احاطہ کے باہر زخمی کئے گئے اور پھر انہیں بیت الحمد کے اندر لے جایا گیا جہاں سے بعد میں پھر باہر لایا گیا، کی ریکارڈ میں موجود شواہد سے قطعاً تائید نہیں ہوتی۔ اگر یہ موقف درست ہوتا تو مقتولین کی لاشوں کے اطراف خون کے مزید نشانات ہوتے جبکہ موقع پر خون کے صرف وہی نشانات تھے جو اندر سے یعنی بیت الحمد سے نکل کر قاری بشیر احمد کی لاش تک آرہے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مقتولین بیت الحمد کے اندر ہی زخمی ہوئے تھے اور یہی ملزمان کا موقف ہے جسے عدالتی گواہان نمبر 1 اور 2 کے بیان سے تائید ملتی ہے۔

ب) ڈاکٹری شواہد استغاثہ کے اس دعویٰ کو بھی جھٹلاتے ہیں کہ اظہر رفیق (مقتول) پستول یا ریوالور کی گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا کیونکہ اس کے جسم پر ایسی کسی گولی لگنے کا کوئی نشان نہیں ملا۔ پس متعلقہ عدالت کو چاہئے کہ وہ ملزمان محمد الیاس منیر مربی، نعیم الدین، عبدالقدیر، محمد نثار، محمد حاذق رفیق طاہر اور محمد دین (ریٹائرڈ) ایس آئی پولیس کی سزاؤں کا ازسرنو جائزہ لے جو مشتبہ شہادتوں پر مبنی الزامات کی بناء پر عائد کی گئی ہیں جو قانون کی نظر میں قائم نہیں رہ سکتیں۔

ج) نعیم الدین، ملزم نمبر 2، پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ 302 کے تحت جرم ثابت کیا گیا ہے جب کہ ریکارڈ میں موجود شواہد بتاتے ہیں کہ مدعی فریق نے ملزم کی عبادت گاہ میں جا کر وہاں سے کلمہ طیبہ مٹایا اور ملزم کے لئے اس حد تک اشتعال پیدا کیا کہ اپنے دفاع کے لیے کوئی قدم اٹھانا اسکے لئے ناگزیر ہو گیا تھا۔ تاہم وہ گروہ جو بیت الحمد میں داخل ہوا غیر مسلح تھا اور اس نے ملزمان میں سے کسی کو زخمی بھی نہیں کیا اور نہ ہی بیت الحمد کے مکینوں کے جان و مال کو سوائے قرآنی آیات وغیرہ مٹانے کے کوئی اور نقصان پہنچایا اور محض یہ امر اپنی ذات میں ایسا نہیں کہ اس کی بناء پر کسی کی جان لی جاتی۔ نعیم الدین ملزم نمبر 2 نے قاری بشیر احمد

اور اظہر رفیق پر گولی چلائی جس سے ان کی موت واقع ہوئی۔ ملزم نمبر 2 کا یہ قدم موقع کی مناسبت سے درست نہ تھا چنانچہ اس نے مقتولین پر گولی چلا کر اپنے حق خود حفاظتی سے تجاوز کیا۔ لہٰذا اس پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ 304 کے تحت فردِ جرم عائد کی جانی چاہئے نہ کہ دفعہ 302 کے تحت جیسا کہ عدالت نے قرار دیا ہے۔ اس لئے عدالت کو اب اس ملزم کی سزا پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ 304 کے تحت الزام نمبر 1 اور 2 پر خصوصی تجزیہ کرتے ہوئے نظرثانی کرنی چاہئے اور قانون کے مطابق سزا دینی چاہئے۔

و) تمام ملزمان پر تعزیرات زیر دفعہ 302 اور 149 دوہرے قتل کی فردِ جرم عائد کی گئی تھی۔ لہٰذا تیسری فردِ جرم جو زیر دفعہ 148 لگائی گئی ہے اس کی کوئی قانونی ضرورت نہیں رہتی۔ ملزمان اپنی عبادت گاہ میں تھے۔ محمد الیاس منیر مربی (ملزم نمبر 1) نعیم الدین (ملزم نمبر 2) اور محمد دین (ریٹائرڈ) ایس آئی پولیس (ملزم نمبر 7) کی تو رہائش ہی بیت الحمد کے احاطہ میں ہی تھی۔ اس وقت نماز فجر کا وقت تھا اور یہ لوگ اپنی عبادت گاہ میں تھے۔ اس لیے تمام ملزمان پر تیسرے الزام کی سزا دفعہ 148 کے تحت از روئے قانون لاگو ہی نہیں ہوتی۔

ز) ملزم نمبر 2 کی سزا کا تعین کرتے وقت عدالت CMLO-84 کے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھے۔

2. عدالت کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ نظرثانی شدہ فیصلہ لکھتے وقت پہلے سے لکھے گئے فیصلہ میں کسی قسم کا ردوبدل نہ کیا جائے جو جدول PAFF 956 کے چوتھے کالم میں درج ہے بلکہ اس مقصد کے لئے ایک علیحدہ فارم استعمال کیا جائے جیسا کہ vol-I,MPML کے صفحہ 491-492 پر بطور نمونہ فارم دیا گیا ہے۔

3. عدالت کی سماعت بند کمرے میں ہوگی۔ ارکانِ عدالت کے علاوہ کسی کو شرکت کی اجازت نہیں ہوگی۔ نظرثانی کا یہ حکم وہاں پڑھ کر سنایا جائے۔ عدالت کی توجہ PAA کے سیکشن 126، اس کے ضابطہ 57 اور اسکے متعلقہ حوالہ جات کی طرف بھی دلائی جاتی ہے۔

(دستخط) اسٹیشن لاہور

لیفٹیننٹ جنرل، ایم ایل اے زون اے (پنجاب) مصدقہ: بتاریخ 8 Oct 85

(غلام جیلانی خان) میجر جی ایس او 2 (لیگل) (خادم حسین)

ایم ایل اے پنجاب کی مذکورہ بالا ہدایات کی روشنی میں (فوجی) عدالت نے 12 اکتوبر 1985ء کو دوبارہ سماعت کی اور

بجائے اس کے کہ سزا میں کمی کی جاتی جیسا کہ ایم ایل اے نے کہا تھا، عدالت نے ہم دونوں کی سزائے موت نہ صرف برقرار رکھی بلکہ اس کے ساتھ دس دس ہزار روپیہ جرمانہ کا اضافہ کر دیا اور دیگر چاروں ساتھیوں کی سزا کو سات سال سے بڑھا کر عمر قید میں تبدیل کر دیا اور ساتھ پانچ پانچ ہزار روپے جرمانہ بھی منتھی کر دیا۔

58

REVISION (Better Copy)

At Multan on 21 day of October, 1985 at 1300 hours the Court reassembled by the order of Lt.General Ghulam Jilani Khan, MLA Zone A (Punjab) for the purpose of reconsidering their findings and sentence. Present the same President and members as on 16th June, 1985. The Revision order directing the re-assembly of the Court for the revision of findings and sentence in the light of observation of the confirming authority is read, marked Exhibit 'DDD', signed by the President and attached to the Proceedings.

The Court having attentively considered the observations of the confirming authority, and whole of Proceedings, do now revoke their findings and sentence and find and sentence the accused as under:

FINDING

The Court finds that following accuseds are guilty of first and second charge and not guilty of third charge:-

a) Muhammad Ilyas Munir Murrabi son of Muhammad Ismail
b) Naeem ud Din son of Feroze Khan
c) Abdul Qadir son of Abdul Rahim
d) Muhammad Nisar son of Gulzar Muhammad
e) Muhammad Haziq Rafique Tahir son of Mian Muhammad Ishaq
f) Muhammad Din son of Faqir Ali

2. The Court finds that Muhammad Ishaque son of Muhammad Ismail is not guilty of all charges and honourably acquitted of the same.

SENTENCE

The Court Sentence the accused as under:-

a) Muhammad Ilyas Munir Murrabi son of Muhammad Ismail
(1) To suffer death by being hanged by neck until he be dead.
(2) To pay a fine of Rs.10,000/-(Rupees Ten Thousand only) under the Provisions of CMLO 84.

b) Naeem ud Din son of Feroze Khan

Death

(1) To suffer death by being hanged by the neck until he be dead.

(2) To pay a fine of Rs.10,000/- (Rupees Ten Thousand only) under the Provisions of CMLO 84.

c) Abdul Qadir son of Abdul Rahim

Imprisonment for life

(1) To suffer imprisonment for life.

Fine

(2) To pay a fine of Rs. 5,000/- (Rupees Five thousand only) under the Provisions of CMLO 84.

d) Muhammad Nisar son of Gulzar Muhammad

Imprisonment for life

(1) To suffer imprisonment for life.

Fine

(2) To pay a fine of Rs.5,000/- (Rupees Five thousand only) under the Provisions of CMLO 84.

e) Muhammad Haziq Rafique Tahir son of Muhammad Ishaq

Imprisonment for life

(1) To suffer imprisonment for life.

Fine

(2) To pay a fine of Rs.5,000/-(Rupees Five thousand only) under the provisions of CMLO 84.

f) Muhammad Din(Retired) Sub Inspector Police son of Faqir Ali

Imprisonment for life

(1) To suffer imprisonment for life.

Fine

(2) To pay fine of Rs.5,000/-(Rupees Five thousand only) under the provisions of CMLO 84.

g. Direction of the Court. The court directs that the fire recovered from the accused be given to the heirs of the deceaseds as under:-

(1) A sum of Rs.10,000.00 (Rupees ten thousanc only) fine imposed on accused No 1 be paid to the heirs of Qari Bashir Ahmad (deceased) under CMLO 84.

(2) A sum of Rs. 5,000,00 (rupees five thousanc only) fine imposed on accused No 3 be paid up to the heirs of Qari Bashir Ahmad (deceased) under CMLO 84.

3

(Better Copy)

(3) A sum of Rs. 5,000.00 (Rupees five thousand only) fine imposed on accused No 4 be paid to the heirs of Qari Bashir Ahmad (deceased) under CMLO 84.

(4) A sum of Rs. 10,000.00 (Rupees ten thousand only) fine imposed on accused No 2 be paid to the heirs of Azhar Rafique (deceased) under CMLO 84.

(5) A sum of Rs. 5,000.00 (rupees five thousand only) fine imposed on accused on No 5 be paid to the heirs of Azhar Rafique (deceased) under CMLO 84.

(6) A sum of Rs. 5,000.00 (Rupees five thousand only) fine imposed on accused No 6 to be paid to the heirs of Azher Rafique (deceased) under CMLO 84.

The sentence of death for accused No 1 and accused No 2 has been passed with the concurrence of all the members of the court. PAA Sect 105 and PAA Rule 73 have been complied with.

Signed at Multan on 21 Day of October, 1985.

Sd/-
Lieutenant Colonel
President
Special Military Court No.62
(Munir ur Rehman)

اس کے بعد جب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون ''اے'' نے پھر نام نہاد نظرثانی شدہ فیصلے اور سزاؤں کی توثیق سے بھی انکار کیا تو کیس کو زیر التوا رکھا گیا اور مارشل لاء کے اُٹھنے کا اِنتظار کیا گیا اور آخرکار جب مارشل لاء کے اختتام کے بعد یہ درمیانی واسطہ ختم ہو گیا تو فیصلہ براہ راست صدر پاکستان کو بھیج دیا گیا جو پہلے ہی احمدیت دشمنی میں اپنے دانت پیس رہا تھا۔ اُس نے فوری طور اپنے دستخط کئے اور تنفیذ کے لئے جیل بھجوا دیا۔

## فیصلہ سنائے جانے کی کارروائی

16 فروری 1985ء کو ہمارے مقدمہ کی سماعت کا آغاز ہوا تھا اور ٹھیک ایک سال تک اَن گنت نشیب و فراز میں سے گزرتے ہوئے 15 فروری 1986ء کو آخر وہ گھڑی بھی آن پہنچی جب ہمارے مستقبل سے کھیلے جانے والے اِس کھیل کے فیصلہ کا اعلان ہوا۔ یہ فیصلہ ہماری زندگیوں کا ایک ایسا تاریخی سنگ میل تھا جس پر نہ تو اگلی منزل کا نام درج تھا نہ ہی اس کا فاصلہ! ہاں اس پر صرف ایک نہایت درجہ خوفناک اور ظالمانہ فیصلہ ضرور لکھا تھا۔ اُس روز دوپہر کو ہم معمول کے مطابق اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ میں بھی دھوپ میں کمبل بچھا کر تفسیر کبیر کے مطالعہ میں محو تھا کہ کسی بلانے والے کی آواز سن کر کتاب سے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک قیدی منشی کو کہتے سنا کہ:

'آپ ساتوں کے ساتوں ڈیوڑھی آجائیں، ڈپٹی صاحب نے بلایا ہے'

بلاتے تو پہلے بھی تھے، خطرہ بھی محسوس ہوتا تھا مگر ہلکا پھلکا مذاق کرتے ہوئے جاتے اور آگے واقعی ملاقات ہوتی لیکن آج سنجیدگی کا عنصر کچھ زیادہ ہی غالب تھا۔ ہم سنٹر چکر کے قریب سے گزرنے لگے تو ایک نمبردار اور ہیڈ وارڈر ہمارے پیچھے ہولیا۔ اِس پر میں نے کہا آج ضرور کوئی خاص بات ہے کیونکہ آج ہمیں غیر معمولی حالت میں لے جایا جارہا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باتیں کرتا جارہا تھا کہ میری زبان پر سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ شعر آ گیا ؎

بلا سے کچھ تو نپٹ جائے فیصلہ دل کا          اگر وہ جاں کو طلب کرتے ہیں تو جاں ہی سہی

ہم ڈیوڑھی کے قریب پہنچے تو ہمیں حکم ہوا کہ سکول میں بیٹھ جائیں جو ڈیوڑھی کے بالکل سامنے تھا۔ سکول کے احاطہ میں ہم سب گھومنے پھرنے لگے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق دعائیں کرنے لگے۔ اِس دوران بعض قیدی نمبردار اُدھر آتے رہے اور ہمیں اپنے چہروں کے پریشان اثرات سے کچھ کچھ اشارہ تو دیتے رہے تاہم تسلی دے کر چلے جاتے رہے۔ اِس دوران محترم ملک صاحب نے مجھے پوچھا کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا خیال کیا ہونا ہے، آپ بس دعا کریں۔ کہنے لگے کیا دعا کروں۔ میں نے کہا کہ دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں: بری ہوں گے یا پھر سزا ہوگی، دعا کریں کہ

'اے اللہ! اگر ہم بری ہو گئے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس سے پہلے جو تیرے دین کی خدمت میں کوتاہی ہوئی اس کی تلافی کریں گے اور اے اللہ! تو ہمیں اس کی توفیق دینا اور اگر ہمیں سزا کا حکم سنایا جاتا ہے تو اے اللہ! تو ہی ہمیں اس کو برداشت کرنے کی توفیق اور ہمت دینا، آمین'

اس پر ملک صاحب مطمئن ہو گئے پھر میں اُس دوران جو دعا کرتا رہا اس میں بھی غالب عنصر یہی تھا کہ اے اللہ! تو ہمیں استقامت کی توفیق دینا، سزا کی صورت میں ہمیں ثابت قدم رکھنا، ہمت اور طاقت دینا۔ بار بار یہی دعا زبان سے نکلتی

رہی اور پورے اعتماد کے ساتھ دعا کرتا رہا جس کے بعد مکمل اطمینان بھی نصیب ہوگیا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات بھی ہوئی تو خدا ضرور ہمت اور برداشت کی توفیق عطا فرمائے گا، انشاء اللہ العزیز۔

سماعت کے دوران عدالت اکثر طویل اِنتظار کراتی تھی شاید اُسی معمول کو اس آخری مرحلہ پر بھی برقرار رکھا گیا تھا اور آج بھی اِنتظار کی گھڑیاں طویل تر ہوتی گئیں حتیٰ کہ دھوپ زردی مائل ہونے لگی۔ چنانچہ ہم نے وضو کیا اور اپنی زندگیوں کے غیر معین اور غیر یقینی سفر کے آغاز سے پہلے آخری بار ساتوں ساتھیوں نے اسی سکول کے احاطہ میں نماز باجماعت ادا کی یعنی 16 فروری 85ء کی نمازِ عصر، اس کے بعد ہم ساتوں کو ایسی نماز نصیب نہ ہوئی۔ ابھی نماز ختم نہ کی تھی کہ ہمیں بلاوا آگیا۔ نماز کے بعد جلدی جلدی ڈیوڑھی کے اندر لے جائے گئے جہاں اُس وقت ہر قسم کی عام آمدورفت بند کر دی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی CHW یعنی چکر انچارج کو بھی طلب کر لیا گیا تھا اور قیدی نمبرداروں کی فوج بھی وہاں آ گئی تھی۔ ہماری کئی بار گنتی کی گئی کہ پورے سات ہی ہیں نا؟ ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چوہدری سیف اللہ صاحب بڑے پریشان چہرے کے ساتھ اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے، غالباً وہ اس روز Day Officer تھے۔ جب ہر کسی نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی تو خاص قسم کے رعب اور خوف کے ماحول میں سب سے پہلے چوہدری اسحاق صاحب کو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب کے کمرے میں لے گئے۔ اس کے بعد ہمیں حکم ہوا کہ ڈیوڑھی کی جنوبی گیلری میں چلے جائیں یعنی بڑے صاحب (سپرنٹنڈنٹ جیل) کے دفتر کے سامنے۔ وہاں ہم گئے تو جالیوں سے باہر دیکھا کہ ملک نعیم الدین صاحب (مرحوم) ہمارے لئے کھانا لے کر آئے ہوئے تھے اور چند لمحوں میں انہیں وہاں سے واپس جاتے دیکھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہیں اس لئے واپس کر دیا گیا تھا کہ اُس وقت حکم جاری ہو چکا تھا کہ آج سے ان کی گھر کی خوراک بند! اُس روز بزرگوارم میجر منظور احمد صاحب نے اپنے بیٹے مکرم آغاز احمد صاحب کی دعوت ولیمہ کا کھانا بھجوایا تھا۔

جب ہم اُدھر برآمدہ میں آ گئے تو ایک وقفہ کے بعد ہمیں گھل مل کر بات کرنے کا موقع بھی ملا۔ سب سے پہلی بات ملک صاحب نے یہ کہی کہ چوہدری اسحاق بری ہیں، اس لئے انہیں سب سے پہلے بلایا گیا ہے ورنہ Charge Sheet کے مطابق ملزمان کی فہرست میں ان کا چھٹا نمبر تھا۔ ایک دو منٹ کے بعد ہم نے چوہدری اسحاق صاحب کو ڈپٹی صاحب کے کمرے سے نکلتے دیکھا، اُنہیں ڈیوڑھی کے شمالی برآمدہ میں جانے کو کہا گیا پھر آواز آئی عبدالقدیر۔ جب برادرم عبدالقدیر اس کمرے سے نکلے تو انہیں دو نمبرداروں نے اِدھر اُدھر سے پکڑا ہوا تھا اور اسے ڈیوڑھی کے راستہ جیل کے اندر لے گئے اور سکول میں جا بٹھایا۔ پھر برادرم حاذق صاحب کو بلایا گیا۔ اُن کے جانے کے بعد ڈیوڑھی میں کچھ ہل چل ہونے لگی، سب اہلکار اپنے آپ کو ٹھیک ٹھاک کرنے لگے، پتہ لگا کہ بڑے صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ ہم

بھی برآمدہ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں صاحب بہادر گرم سوٹ پہنے وارد ہوئے اور ہمارے سامنے سے گزر کر اپنے دفتر میں چلے گئے۔ ان کے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی تھے جو اُنہیں دفتر میں چھوڑ کر واپس اپنے کمرے میں آ گئے جہاں ہمارے مستقبل کا فیصلہ سنایا جا رہا تھا۔ پھر نثار کی باری آئی اور اس کے بعد ملک صاحب کو بلایا گیا اور سب کو حکم سنا سنا کر دو دو نمبردار تھام کر جیل کے اندر لے جاتے رہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر سمجھ آیا کہ فیصلہ سنائے جانے سے پہلے اتنے نمبردار کیوں اکٹھے کئے گئے تھے۔ ملک صاحب نے باقی ساتھیوں کو ملتے ہی ہم دونوں کے حوالہ سے کہا:

'چلو بھئی، وہ دونوں تو اب ہمارے ساتھ مت آئے'

ملک صاحب کے بعد میرا نام پکارا گیا اور مجھے بھی اُسی بے اختیاری کے عالم میں اُس دفتر میں لے جایا گیا۔ وہاں صدر کرسی پر کوئی بھاری بھرکم صاحب براجمان تھے۔ پتہ نہیں کون تھے، کسی کا کہنا تھا کہ وہ علاقہ مجسٹریٹ تھے بہر حال جو بھی تھے، اُس وقت تو سب کچھ وہی تھے۔ اُن کے دائیں جانب ڈپٹی صاحب کرسی پر تشریف فرما تھے اور پریشان سے لگ رہے تھے۔ میری دائیں جانب کمرے کے ایک طرف ایک فوجی بھی بیٹھا ہوا سارے تماشہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ وہ کوئی افسر نہیں تھا بلکہ صرف نائیک یا حوالدار کے معیار کا لگتا تھا کیونکہ اس کے بازو پر صرف فیتے ہی لگے ہوئے تھے۔

## سزائے موت کا حکم

میں جب مذکورہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا تو میرے اردگرد بھی نمبردار کھڑے تھے۔ اس مجسٹریٹ نے میرا نام پتہ پوچھا اور تصدیق کی کہ واقعی میں وہی ہوں جو انہیں یہاں مطلوب ہے۔ اس کے بعد کہنے لگا کہ:

'تمہیں ملٹری کورٹ نے موت کی سزا سنائی ہے'

اُس نے ابھی فقرہ مکمل نہ کیا تھا کہ میں جو بے یقینی کے عالم میں تھا پوری طرح قائم ہو گیا۔ میں نے کہا 'بہت اچھا' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ

'تمہیں دس ہزار روپیہ جرمانہ بھی کیا گیا ہے جو تم مرنے والوں کے ورثاء کو ادا کرو گے'

اس کی بات جاری تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ تم اس فیصلہ پر رحم کی اپیل 30 دن کے اندر اندر صدرِ پاکستان کو کر سکتے ہو۔ دل میں میں نے کہا رحم کی اپیل تو میں کرنے سے رہا۔ اُس نے آخری بات یہ کہی کہ تم اِس فیصلہ کی نقلیں =/50 روپے جمع کروا کر حاصل کر سکتے ہو۔ اس کی بات ختم ہوئی تو میری زبان پر الحمدللہ کا وِرد جاری ہو گیا۔ یہ چند لمحات میرے لئے اِس قدر عجیب تھے کہ میں ان کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔ میرے جسم میں ایسی لہر دوڑ گئی کہ مکمل سکون ہو گیا اور میرے ذہن پر

یہ خیال چھا گیا کہ یہ میرے ساتھ گویا مذاق کر رہا ہے اور خدا کی قسم! مجھے یہ حکم نامہ ایک کھلونے کی طرح لگا۔ میرے جسم کا ذرہ ذرہ اور میرے ذہن کا خلیہ خلیہ جانتا تھا کہ یہ سزا سراسر غلط ہے، یہ فیصلہ سراسر ظلم ہے۔ اس وجہ سے مجھے اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ محسوس نہ ہوئی۔ بلکہ میری کیفیت کسی شاعر کے مطابق یہ تھی ؎

تجھ کو ظالم! مرے ناکردہ گناہوں کی قسم! اور بھی دے دے اگر اور سزا باقی ہے

اس کے بعد مجھے کہا گیا کہ اپنے دستخط کر دوں چنانچہ اس دوران میں نے میز پر ایک کاغذ دیکھا جس پر کچھ مانوس نام نظر آئے۔ وہ دیگر چار ساتھیوں کے نام تھے اور سب کے سامنے عمر قید اور 5/5 ہزار روپیہ جرمانہ کا حکم لکھا ہوا تھا۔ پھر میرے سامنے وہ کاغذ لایا گیا جس پر مجھے دستخط کرنے تھے تو دیکھا کہ اس پر میرے ساتھ رانا صاحب کا بھی نام ہے۔ چنانچہ میں نے دستخط کر دیئے اور غالباً انگوٹھا بھی لگایا۔ پھر میں نے انہیں کہا کہ ان دستاویزات کی ایک نقل مجھے بھی دے دیں۔ یعنی سزا کی تفصیل اور اپیل کے متعلق ہدایت اور مقدمہ کی فائل کے حصول کا ذریعہ وغیرہ اس پر انہوں نے کہا کہ حاذق کو یہ باتیں نوٹ کروادی ہیں۔ اس کے بعد مجھے حکم ہوا کہ پیچھے ہٹ جاؤں البتہ کمرے میں ہی رہوں یعنی ایک نکڑ میں ہو جاؤں۔ سو میں پیچھے مڑا اور وہاں پڑی ایک کرسی پر بیٹھنے لگا، اس پر کسی نے اشارہ سے زمین پر بیٹھنے کو کہا۔ اس پر ایک لمحہ میں میرا ذہن وہاں تک چلا گیا جہاں جانے کا کبھی وہم و گمان بھی نہ ہوا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ:

'اب تم عام انسان نہیں رہے ہو بلکہ سزا یافتہ قیدی ہو چکے ہو اور قیدی بھی 'سزائے موت' کے جسے جیل کی اِصطلاح میں Condemned Prisoner یعنی مذموم ترین قیدی کہا جاتا ہے، اِس لئے اب کرسی پر بیٹھنے کا خیال فی الحال چھوڑ دو'

چنانچہ اس پر بھی میں نے شکر کیا اور تسبیح کرتے اور درود پڑھتے ہوئے ایک طرف ہو کر زمین پر بیٹھ گیا اور رانا صاحب کا انتظار کرنے لگا۔ چند ثانیوں میں رانا صاحب کو بلا کر ان کے ساتھ بھی یہی کہانی دُھرائی گئی۔ پھر انہیں بھی میرے ساتھ ہی بیٹھنے کو کہا گیا۔ رانا صاحب میری طرف مڑے تو میں نے انہیں مبارک دی۔ رانا صاحب بھی شکر الحمدللہ پڑھتے ہوئے میرے ساتھ آ بیٹھے تو میں نے انہیں بتایا کہ باقی چاروں ساتھیوں کو 25/25 سال قید کا حکم سنایا ہے۔

ہماری اس پرسکون کیفیت کی گواہی متعلقہ مجسٹریٹ نے بھی دی۔ اس بارہ میں خاکسار کو ہمارے وکیل اور سابق نائب امیر جماعت ساہیوال محترم ملک غلام احمد صاحب حال کینیڈا نے بتایا کہ اُس مجسٹریٹ نے اُن کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ عجیب لوگ ہیں کہ انہیں سزائے موت کا حکم سنایا جا رہا تھا اور وہ بڑے ہی سکون اور اطمینان سے رہے اور کسی قسم کی گھبراہٹ کے آثار ان کے چہروں پر ظاہر نہ ہوئے۔

نمرو وقت کے دستخط سے جاری ہونے والا حکم نامہ سزائے موت

THE PRESIDENT

Confirmation Minute in respect of accused Muhammad Ilyas Munir Murrabi, Naeem-ud-Din, Abdul Qadir, Muhammad Haziq Rafique Tahir and Muhammad Din - Case FIR No. 226/84, PS 'A' Division Sahiwal

I hereby substitute valid findings for existing invalid findings on the first and second charges in respect of Abdul Qadir s/o Abdul Rahim (accused No.3), Muhammad Nasir s/o Gulzar Muhammad (accused No.4), Muhammad Haziq Rafique Tahir s/o Mian Muhammad Ishaq (accused No.5) and Muhammad Din (Retd) SI Police s/o Faqir Ali (accused No.7) and confirm the findings so substituted.

| 1st Charge | Original findings | Substituted findings |
|---|---|---|
| Under section 302/149 PPC. | Guilty of an offence under section 302/149 PPC. | Not guilty of an offence under section 302/149 PP but guilty of an offence under section 302/109 PPC (Abetment of murder) |
| **2nd Charge** | | |
| Under section 302/149 PPC. | Guilty of an offence under section 302/149 PPC. | Not guilty of an offence under section 302/149 PP but guilty of an offence under section 302/109 PP (Abetment of murder). |

2. I do hereby confirm the sentence of death passed by the court in respect of accused Muhammad Ilyas Munir Murrabi s/o Muhammad Ismail (accused No.1) and Naeem-ud-Din s/o Feroze Khan (accused No.2).

Islamabad

Affected
Maj
GSO 1 (Legal)
(Khadim Hussain)

M. Zia-ul-Haq
General
The President
(M. Zia-ul-Haq)

اب ہمارے متعلق یہ پروگرام تھا کہ 14 چکی میں لے جا کر بند کیا جائے۔ ہمیں یہیں سے ہتھکڑیاں لگا کر لے جانا تھا اور اسی لئے ہمیں یہاں بٹھا رکھا تھا۔ کچھ دیر گزر گئی تو ڈپٹی صاحب نے کسی کو ذرا خفگی کے انداز میں کہا کہ انہیں جلدی فارغ کرو چنانچہ کچھ دیر میں ہتھکڑیاں آ گئیں اور نمبرداروں نے ہمارے دونوں ہاتھوں کو جکڑ دیا۔ اس دوران نمبردار افسردہ تھے اور بڑے افسوس کا اظہار کرتے رہے لیکن ہمارا ردعمل الحمد للہ اور درود شریف ہی تھا۔ ہتھکڑیاں لگیں تو ڈیوڑھی سے ہمارا سفر شروع ہوا، وہ طویل اور تکلیف دہ سفر جس کا سنتے ہی ہر شخص کے ہاتھ کانوں پر آ جاتے ہیں۔ یہ سفر مشکلات اور تکالیف کا مرکب ہونے کے ساتھ ساتھ ذلت و رسوائی سے بھی عبارت ہوتا ہے مگر ہمارے لئے یہ سفر نہ تو تکلیف دہ اور مشکل تھا اور نہ ہی ہمیں کسی قسم کی ذلت کا احساس ہو رہا تھا بلکہ ہم بڑے فخر اور پورے اعتماد کے ساتھ اسے ایک عظیم سفر سمجھ کر شروع کر رہے تھے۔ ہمیں کسی قدم پر بھی تو ضمیر نے ملامت نہیں کیا بلکہ اندر کے انسان نے ہر قدم پر بلندی کا احساس دلایا۔ فخر کے ساتھ سر بلند کیا اور رکھا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ جس الزام میں ہمیں یہ ظالمانہ حکم سنایا گیا ہے اس کی حقیقت صرف ہم یا مدعی ہی نہیں بلکہ خود انصاف کے نام پر انصاف کا خون کرنے والے بھی جانتے ہیں اور وہ جانتے بوجھتے ہوئے اس ذلیل دنیا کی خاطر انصاف کی تاریخ میں بھیانک اور خوفناک باب رقم کر رہے ہیں۔ دورانِ سماعت صدر عدالت لیفٹیننٹ کرنل منیر الرحمٰن کی زبان سے نکلا اور اپنے کانوں سے سنا ہوا ایک فقرہ اچھی طرح یاد ہے۔ ایک بار محترم مجیب صاحب سے باتیں کرتے ہوئے بڑا معصوم چہرہ بنا کر اس نے کہا تھا کہ:

'ہاں! صاف ثابت ہو رہا ہے کہ واقعہ اندر ہوا ہے'

مگر اب یہ ثابت ہو چکا تھا کہ یہ چہرہ معصوم نہیں تھا بلکہ میسنا تھا اور یہ کھلی عیاری تھی، فریب تھا۔ یوں تو یہی وہ شخص تھا جس نے 16 فروری 85ء کو جب ساہیوال میں پہلی بار عدالت لگی تھی تو کہا تھا کہ

'آخر ہم نے بھی خدا کو جان دینی ہے، ہم انصاف کریں گے'

بہرحال ہم دونوں بندھے ہاتھوں کے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے سے نکلے۔ جب ہم فیصلہ سننے اس کمرے کے اندر گئے تو ملزم تو تھے مگر انسان ضرور سمجھے جاتے تھے مگر جب باہر نکلے تو جانوروں سے بھی بدتر سلوک شروع ہو چکا تھا جس کی تفصیل آئندہ کے حالات و واقعات سے سامنے آ جائے گی۔

ہمارے خلاف اس بہیمانہ فیصلہ کے چند دن بعد سکھر میں بھی دو معصوم احمدیوں کو فوجی عدالت کی طرف سے دی گئی سزائے موت سنائی گئی۔ ان ہر دو فیصلوں کے بعد دل و جان سے پیارے آقا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے دو خطبات جمعہ ارشاد فرمائے۔ ذیل میں یہ ایمان افروز خطبات درج کیے جاتے ہیں۔

# اسیرانِ راہ مولا ساہیوال کے عدالتی فیصلہ پر خطبہ جمعہ

فرمودہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ

مورخہ 21 فروری 1986ء بمقام مسجد فضل لندن

تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیات کریمہ کی تلاوت کی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ. وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ. وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ. الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔[1]

پھر فرمایا:

آج کے خطبہ میں میں احباب جماعت سے ساہیوال کیس کے متعلق کچھ باتیں کروں گا۔ ساہیوال کیس کے نام سے جو مقدمہ بعض احمدی مخلصین کے خلاف دائرہ کیا گیا تھا اس کا پس منظر پھر میں بیان کر دیتا ہوں کیونکہ ممکن ہے بعض نوجوانوں کو یا بعض بڑوں کو دوسروں کو بھی ان واقعات کا یا علم ہی نہ ہوا ہو پوری طرح یا ذہن سے اتر چکے ہیں۔

26 راکتوبر 1984ء کا یہ واقعہ ہے کہ ساہیوال کی مسجد میں صبح نماز کے بعد بعض مولویوں نے اور ان کے مدرسوں میں پڑھنے والے طلباء نے مل کر ہلہ بول دیا اور اپنے ساتھ وہ برش اور پینٹ وغیرہ لے کر آئے تھے تا کہ مسجد سے جہاں جہاں کلمہ شہادۃ لکھا ہوا ہے اُس کو مٹا دیں۔ چنانچہ باہر کی دیواروں پر اور باہر کے دروازے پر تو وہ مٹانے میں کامیاب ہو گئے لیکن جب اندر مسجد کے دروازے میں جو اندر کا دروازہ ہے اس پر سے کلمہ مٹانے لگے تو چند نوجوان جو وہاں اُس وقت موجود تھے انہوں نے مزاحمت کی اور یہ کہا کہ کسی قیمت پر بھی خواہ ہماری جان جائے ہم تمہیں اپنی مسجد سے کلمہ شہادہ نہیں مٹانے دیں گے۔ چونکہ اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی ایک نوجوان کو تو انہوں نے وہیں پکڑ لیا اور باقیوں کو قتل کی دھمکی دیتے ہوئے مسجد پر حملہ کر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔ اس وقت وہاں ایک احمدی نوجوان نے بندوق سے

---

[1] سورۃ البقرہ: 154 تا 158

دو فضائی فائر کئے تا کہ ڈر کے بھاگ جائیں اور ڈر کر کچھ عرصے کچھ دیر کے لئے وہ بھاگ کر باہر نکل گئے لیکن پھر انہی کے مولویوں نے ان کو کہا کہ یہ پٹاخے تھے تم کس بات سے ڈرے ہو۔ چنانچہ وہ دوبارہ حملہ بول کے اندر گئے اُس وقت اپنی جان کے خطرے کے پیش نظر یا اس اعلیٰ مقصد کے لئے کہ کسی قیمت پر بھی وہ مسجد احمدیہ سے کلمہ شہادۃ کو نہیں مٹنے دیں گے، اسی نوجوان نے دو فائر کئے اور اس کے نتیجے میں دو حملہ آور وہیں زخمی ہو کر گر گئے اور وہیں انہوں نے جان دے دی اور باقی بھاگ گئے۔ اور کچھ عرصے کے بعد جو وہاں واقعات گزرے اس کی تفصیل میں جانے کا تو ذکر نہیں مگر پولیس نے جو ملزم گرفتار کئے جن پہ الزام بتایا گیا وہ سات تھے لیکن مقدمہ گیارہ کے خلاف درج کیا گیا۔ ان سات میں سے چار نوجوان وہ ہیں جو یہاں موجود تھے۔ لیکن عملاً فائر کرنے والا صرف ایک نوجوان ہے اور باقی تین کی طرف سے حملہ آوروں کو کسی قسم کی کوئی گزند نہیں پہنچی باقی جتنے آدمی ہیں وہ موقعے پر موجود ہی نہیں تھے۔

ایک ہمارے مربی سلسلہ ہیں محمد الیاس منیر صاحب۔ وہ اوپر مسجد کے ملحقہ مکان میں اس وقت اپنے بیوی بچوں سے گفتگو کر رہے تھے یا تلاوت کر رہے تھے بہر حال گھر میں تھے اس وقت ان کو جب فائر کی آواز آئی بندوق کے چلنے کی تو وہ نیچے آئے اسوقت ان کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ کیا واقعہ ہوا ہے اور کچھ لوگ ایسے تھے جو ساہیوال میں موجود نہیں تھے۔ ان گیارہ میں سے۔ وہ آٹھ آٹھ دس دس میل دور دیہات میں رہنے والے تھے مگر ان علماء نے جانتے ہوئے دیکھتے ہوئے کہ سارا جھوٹ ہے نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کا نام پرچے میں درج کروایا جن کا کوئی دور سے بھی تعلق نہیں تھا بلکہ سارا سر الف سے ی تک پوری کی پوری جھوٹی کہانی بنائی۔

چونکہ دو احمدی جن کے خلاف الزام تھا کہ انہوں نے قتل میں حصہ لیا ہے وہ وکیل تھے اور بار کونسل کے ممبر اور ہر دلعزیز ممبر تھے۔ اس لئے ان مولویوں کے جھوٹ سے پردہ فاش کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی بن گیا کہ بار کونسل نے ایک بڑا شدید Resolution پاس کیا اور اس بات کی گواہی دی کہ یہ دو احمدی جو ممبر ہیں ہماری کونسل کے ان کے متعلق تو ہم قطعی طور پر جانتے ہیں کہ ان کا دور سے بھی اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے ہم اس کے خلاف احتجاج کرتے اور حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کا نام خارج کیا جائے۔

اتنا یہ جھوٹ مشہور ہوا اُس علاقے میں کہ بہت سے چوٹی کے شریف وکلاء جو Criminal Cases کے ماہرین تھے انہوں نے علماء کے مقدمہ کی پیروی سے کلیۃً انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اتنا جھوٹا مقدمہ، ایسا ظالمانہ الزام کہ معصوم لوگ جن کا کوئی دور سے بھی تعلق نہیں ان کو تم شامل کر رہے ہو اور پھر ساری کہانیاں الف سے ی تک جھوٹی ہے۔ کلمہ مٹانے جا رہے ہو اور بیان یہ دے رہے ہو کہ ہم یہ سننے گئے تھے کہ مسجد میں اذان تو نہیں ہو رہی اور یہ سننے کے لئے اس

وقت گئے تھے جبکہ نمازیں بھی ختم ہو چکی تھیں اور نمازی اپنے اپنے گھروں کو بھی جا چکے تھے اور ہم اندر گئے بھی نہیں، یہ بھی مولویوں کا بیان ہے۔ ہم تو صرف کھڑے سن رہے تھے، اس پر فلاں فلاں شخص نے اس طرح فائرنگ کی اور اس طرح حملہ کر کے ہمیں قتل کیا اور پھر گھسیٹ کر اندر لے گئے، یہ بتانے کے لئے گویا ہم اندر گئے تھے۔ چونکہ وکلاء جانتے تھے کہ یہ سارے کا سارا معاملہ جھوٹ ہے۔ ویسے تو جھوٹے مقدمات عدالتوں میں چلتے ہی ہیں اور پاکستان کی عدالتیں تو خوب اچھی طرح جھوٹے مقدمات سے آشنا ہیں۔ وہاں تو سچے مقدمے کی تلاش کرنی پڑتی ہے لیکن اس معاملے میں وکلاء کی کراہت اس بناء پر تھی کہ جھوٹ بولتے ہو یا گند کھاتے ہو تو دنیا کے نام پر جو چاہو کرو، اسلام کے نام پر جھوٹ بولتے ہوئے تم لوگوں کو حیا نہیں آتی اور ہمیں ملوث کرنا چاہتے ہو۔

تو ایک طرف علماء دین کی یہ جرأت اور بے باکی تھی کہ خدا اور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی قسمیں کھا کر اور قرآن اُٹھا اُٹھا کر اس کلیۃً بے بنیاد واقعات کی شہادت دے رہے تھے اور دوسری طرف وہ جن کو دنیا دار کہا جاتا ہے یعنی عام وکلاء اپنی روزی کمانے والے جن کا ظاہری طور پر دین سے تعلق نہیں ہے، وہ حیا محسوس کر رہے تھے کہ اس مقدمے میں فیس لے کر بھی کسی طرح ملوث ہو جائیں۔ چنانچہ اُن کو پھر ثانوی درجے کے بلکہ ثالثہ درجے کے وکیل ڈھونڈنے پڑے اور وہ بھی ایسے جو پہلے ہی انہی کی طرح تعصبات کے شکار تھے۔ وکیل تو بہر حال حکومت ہی مقرر کرتی ہے ایسے مقدمات میں لیکن اُس کی مدد اور اعانت کے لئے کہانی بنانے کے لئے کس طرح کا پرچہ درج ہونا چاہئے، کس طرح پیروی ہونی چاہئے، ان ساری باتوں میں بہر حال ان کو وکلاء کی ضرورت تھی۔

چار آدمی ان میں سے چونکہ جا چکے تھے اُس علاقے کو چھوڑ کر، پہلے ان کو علم ہو گیا تھا اس لئے ان پر تو پولیس قبضہ نہیں کر سکی لیکن جو سات تھے ان کو طرح طرح کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور بہت لمبی کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ یا اس سے زیادہ عرصہ ہو گیا تقریباً بہت شدید تکلیفیں پہنچائی گئیں لیکن اللہ کے فضل سے وہ لوگ ثابت قدم رہے اور جو دو وکلاء بعد میں پیش ہوئے ان کے متعلق جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے وہاں کے وکلاء کا اتنا زور تھا۔ اتنا دباؤ تھا حکومت پر وہ غیر احمدی تھے ان کا احمدیوں سے کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے جو ظلم کرنے ہیں دوسروں پر کرو مگر ہم اپنی برادری پر ہاتھ نہیں ڈالنے دیں گے۔ تو یہ برادری کی روح جو ہے یہ وہاں ان کے کام آئی اور اس کے نتیجے میں اُن کو بری کر دیا گیا مگر چند مہینے کی قید کے مصیبت کے بعد۔

اس مقدمے کا جو فیصلہ سنایا گیا ہے اُس کی رو سے دو احمدیوں کو جن میں ایک ہمارے مربی سلسلہ بھی ہیں موت کی سزا سنائی گئی ہے اور باقی کو عمر قید پچیس پچیس سال قید بامشقت۔ یہ مقدمہ تو شروع سے آخر تک جھوٹ ہی جھوٹ ہے لیکن

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس فیصلے کی توثیق صدر نے خود کی ہے اور فخر کے ساتھ اس بات کا اعلان کروایا ہے اخباروں میں کہ اس قتل کے ذمہ دار جو احمدیوں کو قتل کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں اس کے ذمہ دار صدر پاکستان ہیں اور انہی کی توثیق سے یہ سزا جاری کی جارہی ہے۔

یہ وہ پہلو ہے جو تعجب انگیز ہے اس لحاظ سے کہ دنیا بھر میں مقدمات ہوتے ہیں، قتل ہو جاتے ہیں۔ واقعۃً سچے مقدمات میں سزائیں ملتی ہیں مگر ملکوں کے صدر کبھی اپنے نام کو ان باتوں میں ملوث نہیں کیا کرتے۔ عدلیہ کارروائی کرتی ہے سچی ہو یا جھوٹی ہو لیکن ایک ملک کا صدر فخر سے یہ اعلان کرے کہ یہ جو قتل ہونے والے ہیں اس کا فیصلہ میں نے کیا ہے۔ یہ بات نہ صرف عموماً تعجب انگیز ہے بلکہ اس لئے بھی کہ یہ فیصلہ کرنے والے کی دہریت کی علامت بتاتی ہے، دہریت سے پردہ اٹھاتی ہے۔ دنیا کے نام پر مظالم کرنے والے بعض دفعہ خدا کے قائل بھی ہوتے ہیں تو غفلت کی حالت میں ظلم کر جایا کرتے ہیں مگر ایک شخص جو خدا کے نام پر ظلم کر رہا ہو اور معصوم انسان کے متعلق قتل کا فیصلہ کر رہا ہو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کو خدا پر ایمان ہو یا اس بات پر یقین ہو کہ وہ جوابدہ ہوگا قیامت کے دن۔ جوابدہی کے تصور سے تو دنیا لرزتی ہے۔ جتنے استبداد ہیں، دنیا میں جو قائم ہیں، ان سب کی طاقت کا راز جوابدہی میں ہے۔ جتنے ڈکٹیٹر دنیا پہ مسلط ہیں اور معصوموں کے خون بہا رہے ہیں یا انسانی حقوق چھین رہے ہیں ان کی طاقت کا راز اس بات میں ہے کہ اگر کوئی شخص اُن کے خلاف اُٹھنے کی کوشش کرے اس کو یہ پتہ ہے کہ خواہ وہ ظالم ہے خواہ اس کا حکومت کرنے کا حق نہیں بھی ہے تب بھی اس کے سامنے میں جوابدہ ہوں اور ایک صاحب استبداد کے سامنے، صاحب جبروت کے سامنے انسان جواب دہی سے ڈرتا ہے۔ اس لئے کیسے ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ پر کامل یقین رکھتا ہو کوئی شخص جانتا ہو کہ مرنے کے بعد اس کی گردن خدا کے ہاتھوں میں ہوگی اور وہ ذوالانتقام ہے اور اس کی پکڑ سے کوئی دنیا کی طاقت نہیں بچا سکتی، بڑے اور چھوٹے ہر ایک کی گردن اس کے ہاتھ میں ہے۔ جو شخص اس کی جواب دہی کا یقین رکھتا ہو وہ آنکھیں کھول کر اتنا ظالمانہ بیباکانہ فیصلہ اُس کے نام پر نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے بعد پھر اس کے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ دنیا کے ظلم بعض دفعہ معاف بھی ہو جاتے ہیں۔ انسان کے اندر جب پشیمانی ہو اور حیا پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے لیکن خدا کے نام پر ظلم کرنے والے کے لئے بخشش کی کوئی راہ میں نہیں دیکھتا۔ نہ مذہبی تاریخ میں اس قسم کی بخشش کا کوئی ذکر ملتا ہے اس لئے سوائے اس کے کہ کوئی شخص پوری طرح دلیر ہو چکا ہو خدا کے متعلق اور جانتا ہو یہ کہ کوئی خدا نہیں ہے۔ جواب دہی نہیں ہے اس سے اوپر کوئی ہستی نہیں ہے۔ اُس وقت تک جب تک یہ صورت حال نہ ہو کوئی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا ہے۔ اس لئے جہاں تک جماعت احمدیہ کا تعلق ہے یہ معاملہ تو جماعت احمدیہ خدا کے ہاتھ میں دیتی ہے۔ قرآن

سے یہ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایسے فیصلے ہوتے رہے ہیں۔ بعض ظالموں کو ظلم کا موقع بھی مل جاتا رہا ہے لیکن خدا کی پکڑ ضرور ظاہر ہوئی ہے اُن کے متعلق۔ آہستہ آئی ہو یا دیر سے آئی ہو خدا کی پکڑ نے ایسے صاحب جبروت لوگوں کو جو اپنے آپ کو صاحب جبروت سمجھتے تھے اور خدا تعالیٰ کو بے طاقت اور بے اختیار جانتے تھے یا اس کے وجود ہی کے قائل نہیں تھے اُن کے اس طرح نام ونشان دنیا سے مٹا دیئے کہ عزت کا ہر پہلو اُن کے ناموں سے مٹ گیا اور ذلت کے سارے پہلو اُن کے ناموں کے ساتھ لگے ہوئے ہمیشہ کے لئے زندہ رہ گئے، رہتی دنیا تک رحمتوں کی بجائے لعنتوں سے یاد کرنے کے لئے وہ نام باقی رکھے گئے۔

اس لئے ہم تو اِس خدا کو جانتے ہیں، اس صاحب جبروت کو جانتے ہیں کسی اور خدا کی خدائی کے قائل نہیں۔ اس لئے **احمدیوں کا سر ان ظالمانہ سزاؤں کے نتیجے میں جھکے گا نہیں بلکہ اَور بلند ہوگا، اَور بلند ہوگا یہاں تک کہ خدا کی غیرت یہ فیصلہ کرے گی کہ دنیا میں سب سے زیادہ سر بلندی احمدی کے سر کو نصیب ہوگی کیونکہ یہی وہ سر ہے جو خدا کے حضور سب سے زیادہ عاجزانہ طور پر جھکنے والا سر ہے۔**

یہ جو دوبارہ باسی کڑھی میں اُبال آرہا ہے اب میں اس کے پس منظر کے متعلق کچھ باتیں بیان کر کے احباب جماعت کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ عرصے سے حکومت کی طرف سے نہایت جابرانہ اور ظالمانہ مخالفت میں کچھ کمی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے ایک آدمی تھک چکا ہو ایک ذلیل حرکت کرتے کرتے اور بالآخر اس کو چھوڑ رہا ہو لیکن گزشتہ چند دنوں سے یہ ذلت اور یہ کمینگی پھر چمک اٹھی ہے۔ باسی کڑھی میں جیسے اُبال آتا ہے ویسے ہی ایک دوبارہ اِس احمدیت دشمنی میں ایک نیا ولولہ پیدا ہو رہا ہے۔ گورنرز بیان دے رہے ہیں، وزرائے اعلیٰ بیان دے رہے ہیں، جو کمی پیچھے رہ گئی تھی مارشل لاء کی طرف سے وہ اب ہم پوری کریں گے اور پہلے احمدیت نہیں مٹ سکی تھی تو اب ہم اِسے مٹا کر چھوڑیں گے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ آخر کیوں اچانک بیٹھے بیٹھے ان کو دوبارہ یہ جوش اُٹھا ہے؟ اس کی وجہ تو بڑی واضح ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک آمر جب بھی حکومت پر قبضہ کرتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ اس سے اب پیچھے ہٹنے کی کوئی راہ نہیں ہے، جانتا ہے کہ جب بھی وہ اُترے گا اس کی گردن ان مظلوموں کے ہاتھ میں ہوگی جو پہلے اُس کے ظلم کا نشانہ بن چکے ہیں۔ اس لئے عملاً وہ یہ فیصلہ کرنے کے بعد آمر بنتا ہے کہ اب میں نے کبھی اس طاقت کے مقام سے الگ نہیں ہونا اور کسی قیمت پر نہیں ہونا اور ایسے لوگ بسا اوقات اپنی ایک حقیر جان بچانے کے لئے لکھوکھہا انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں۔

سٹالن نے جتنے قتل کروائے ہیں اپنی جان بچانے کے لئے، یہ جانتے ہوئے کہ اگر میں نے ذرہ بھی کمزوری دکھائی تو

لازماً میں گولی کا نشانہ بنایا جاؤں گا اور جو میں ظلم کر چکا ہوں اس کے بدلے اتارے جائیں گے۔ اتنے قتل وخون کروائے ہیں کہ اب اگر جب ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو یقین نہیں آتا کہ یہ ہو سکتا ہے؟ ابتداء میں جب میں نے سنے وہ اعداد و شمار تو میں یہی سمجھتا تھا کہ مغربی پروپیگنڈہ ہے لیکن بعد ازاں جب روسی حکومتیں تبدیل ہوتی رہیں اور اس بات کی توثیق کرتی رہیں کہ سٹالن نے واقعۃً لکھوکھہا انسانوں کو محض اس خوف سے قتل کروایا کہ اسکے خلاف کوئی بغاوت نہ کھڑی کر دیں۔ تو اُس وقت مجھے سمجھ آئی کہ ایک ڈکٹیٹر (Dictator) کو اپنی جان کے بدلے میں دنیا کی کسی جان کی، کسی قدر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے اور یہی وہ دہریت ہے، یہی وہ نمرودیت ہے جس کا ذکر قرآن میں بارہا ملتا ہے۔ ڈکٹیٹر خواہ مذہب کی دنیا میں ڈکٹیٹر ظاہر ہو یا غیر مذہبی دنیا میں ظاہر ہو وہ سوائے اپنے کے کسی اور کو خدا نہیں جانتا، نہیں جان سکتا یہ اُس کی نفسیات کے خلاف ہے۔

یہ ڈکٹیٹر بننا ایک دہریت کے ساتھ ایسا گہرا تعلق رکھتا ہے کہ گویا دہریت اُس کی ماں ہے جس کی آغوش میں ڈکٹیٹر شپ پلتی ہے۔ ورنہ مذہبی دنیا میں جہاں جواب دہی کا تصور موجود ہے وہاں ڈکٹیٹر کا تصور قائم ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ یہی بنیادی فرق ہے ایک نبی کے صاحب حکم ہونے میں اور ایک دنیا دار کے صاحب حکم ہونے میں، ایک خلیفہ کے صاحب حکم ہونے میں اور ایک عام آمر کے صاحب حکم ہونے میں۔ نبی کی تو جان نکل رہی ہوتی ہے خدا کے خوف سے۔ وہ جوابدہ ہوتا ہے ایک بہت ہی بالا اور ذوالاقتدار ہستی کے سامنے اور اسی طرح اس سے بہت عاجز تر خلفاء کی بھی یہی دلی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ اپنے اختیارات کو کسی رنگ میں بھی آمرانہ طور پر استعمال کریں۔ ان کا تو وہی حال ہوتا ہے جو حضرت عمرؓ کا بستر مرگ پر تھا۔ بڑی بے قراری سے جان دی، بہت تڑپ رہے تھے اور بار بار اپنے رب کے حضور یہ عرض کرتے تھے۔ لَالِیَ وَ لَاعَلَیَّ، لَالِیَ وَ لَاعَلَیَّ اے خدا! میں تجھے جوابدہ ہوں، میرا آخری وقت آن پہنچا ہے، میں نہیں جانتا کہ مجھ سے کیا سلوک کیا جائے گا، اتنے میرے گناہ ہیں، اتنی میری کمزوریاں ہیں ایسی غفلتیں ہوئی ہوں گی مجھ سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کہ اُن کا خوف میری جان کو کھائے جا رہا ہے پس میں اپنی نیکیوں کا کوئی اجر تجھ سے طلب نہیں کرتا میرے آقا، میری غلطیوں سے پردہ پوشی فرمانا لَالِیَ وَ لَاعَلَیَّ مجھے بے شک کچھ نہ دے مگر میرے خلاف کچھ نہ رکھنا۔ اِس کیفیت کا آدمی جو اِس کیفیت کے ساتھ زندہ رہا ہو اور اِس کیفیت میں جان دے رہا ہو وہ کیسے آمر بن سکتا ہے۔

پس دنیا کی آمریت کا دہریت سے تعلق ہے اور مذہبی بظاہر آمریت کا گہرا خدا سے تعلق ہے اور دونوں میں تضاد اتنا زیادہ ہے کہ جیسے بعد المشرقین ہو۔ دونوں کے اظہار بالکل مختلف ہو جاتے ہیں، دونوں کا طرز عمل بالکل بدل جاتا ہے اور کوئی دور کی بھی مشابہت ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہتی۔

پس میں جب دنیا کی آمریت کی بات کرتا ہوں تو یہ قطعی اور لازمی حقیقت ہے کہ یہ دہریت کی گود میں پلتی ہے، دہریت کا دودھ پی کر جوان ہوتی ہے اور دہریت کی قبر میں جان دیتی ہے اور ایسے موقع پر ایک مومن کے لئے سوائے اس کے کوئی بھی راہ باقی نہیں رہتی کہ وہ کلیۃً ان معاملات کو اپنے رب کے سپرد کردے اور یہ کہے کہ اے خدا! ہم ہٹ رہے ہیں بیچ میں سے، اب تو جانے اور تیرے یہ سرکش بندے جانیں جن کو بندہ ہوتے ہوئے بھی بندگی کی توفیق نہیں ملی، جو مقدس نام لے لے کر نہایت بھیانک اور گھناؤنے کام کرتے رہے اور ایک لمحہ بھی ان کے دل میں خوف خدا نہ آیا۔ اب تو جانے، تو مالک ہے اور تو خالق ہے اور یہ تیرے بندے کہلانے والے لوگ جانیں۔

پس جماعت احمدیہ کا جہاں تک تعلق ہے وہ یہی ایک صورت ہے۔ لیکن ایسا شخص جو خدا کو نہیں مانتا وہ دنیا کو تو ضرور مانتا ہے، جو خدا کا خوف نہیں کھاتا وہ دنیا سے ضرور خوف کھاتا ہے اور جتنا زیادہ اپنی سفاکی اور ظلم میں بڑھتا چلا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ دنیا کا خوف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حالات میں دوبارہ اس باسی کڑھی کو اُبال آیا ہے۔

موجودہ آمریت خواہ کسی بھیس میں بھی پل رہی ہو۔ ایک سیاست دان کا جمہوری لبادہ لے کر آئے یا ایک مولوی کا لبادہ اوڑھ کر آئے، جس شکل میں بھی ہو بنیادی طور پر تو وہی آمریت ہے۔

ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس جو آئے

وہی کیفیت ہے، اس آمریت کی بنیادی طاقتوں کو اب یہ یقین ہو چکا ہے کہ زیادہ دیر تک یہ صورت حال باقی اب نہیں رہ سکتی۔ وہ غیور اور صاحب فہم سیاست دان جو حقیقۃً ملک میں جمہوری آزادی لانا چاہتے ہیں اور غیرت بھی رکھتے ہیں اور بصیرت بھی رکھتے ہیں وہ تو حکومت سے باہر بیٹھے ہوئے ہیں اور جتنا وقت گزر رہا ہے ان کی بے چینی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ساری قوم کو وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ رہے ہیں اور ان زنجیروں کے حلقوں کو زیادہ تنگ کیا جارہا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اب جو آمریت ٹھونسی جائے گی یہ اسلام کے نام پر ملاں کی آمریت ہوگی اور اس آمریت سے پھر چھٹکارا پانا بہت ہی مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے سارے پاکستان کے صاحب بصیرت سیاستدان بہت بے تاب ہو چکے ہیں اور بے چین ہو چکے ہیں۔

جماعت احمدیہ کے حق میں جو اُن کے بیانات آتے رہتے ہیں اس وجہ سے نہیں کہ جماعت احمدیہ سے ان کو محبت ہے۔ وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جماعت احمدیہ کے نام پر ساری قوم کو پاگل اور بیوقوف بنایا جارہا ہے اور جس ملاں کو اوپر لایا جارہا ہے ایک دفعہ اوپر آ گیا تو پھر اس کے پھندے سے نجات پانا قوم کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ ان کی تاریخ عالم پر نظر ہے چنانچہ اصغر خان صاحب نے جو کتاب لکھی موجودہ حالات پر اس میں اس بات کو کھول کر بیان کیا ہے کہ تاریخ

عالم سے ثابت ہے کہ مُلاں کی حکومت جب بھی قائم ہوئی ہے اس نے قوم کو برباد کیا ہے اور یہ اس طرح ختم نہیں ہوا کرتی کہ ملک کے کچھ اَور لوگ اُن سے عنان لے لیں، یہ اس طرح ختم ہوا کرتی ہے کہ غیر ملک آکر پھر ایسے ملکوں پر قبضہ کیا کرتے ہیں کیونکہ اُن کی حکومتیں ہمیشہ غداریوں پر منتج ہوتی ہیں اور اپنے وطن کو غیروں کے سپرد کرنے پر ان کی حکومتوں کا انجام ہوتا ہے۔

پس ان کی بے چینی بڑھ گئی ہے اور وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہر قیمت پر ہمیں ملائیت سے نجات حاصل کرنی ہوگی ورنہ یہ قوم کے لئے پیر تسمہ پا ثابت ہوگا۔ پیر تسمہ پا کا لفظ شاید انگلستان کے نوجوانوں کو سمجھ نہ آئے اس لئے میں اس کی مختصر سی تشریح کر دیتا ہوں۔ سند باد جہازی قصوں میں ایک یہ بھی قصہ ہے کہ ایک ایسے جزیرے پر اس کا جہاز ٹوٹا جہاں کہیں انسان کی تو کوئی خوبو نظر نہیں آتی تھی، کوئی اس کا وجود نہیں ملتا تھا، لیکن ویسے بہت زرخیز جزیرہ تھا، بہت پھل ہر قسم کے خدا تعالیٰ کی طرف سے طبعی نعمتیں مہیا تھیں۔ وہ جزیرے میں بس گیا پھل وِل ہر چیز اچھی ملتی تھی کھانے کو۔ اچھی زندگی گزر رہی تھی مگر تنہائی نے مصیبت ڈالی ہوئی تھی۔ ایک دفعہ گزرتے ہوئے اُس کو ایک انسانی آواز آئی اُس نے دیکھا تو ایک درخت نیچے ایک بہت ہی بوڑھا آدمی جس کی سفید ریش زمین کو چھو رہی تھی اور سر کے بال بھی لمبے اور سفید تھے، ہاتھ میں تسبیح پکڑی ہوئی اور ذکر الٰہی میں گویا بظاہر ذکر الٰہی میں مصروف تھا۔ اُس نے اس کو آواز دی اُس نے کہا میاں ذرا اِدھر آؤ۔ دیکھو ٹانگیں، ان ٹانگوں میں خود کھڑا ہونے کی طاقت نہیں ہے۔ اُس نے دیکھا تو واقعی جس طرح ربڑ کی کوئی چیز ہو اس طرح ٹانگیں لٹکی ہوئی تھیں ان میں واقعۃً کوئی طاقت نہیں تھی۔ اُس نے کہا! میں تو دوسرے کے سہارے کا محتاج ہوں اس لئے تم اتنا مجھ پہ احسان کرو کہ مجھے اپنے کندھے پر بٹھا لو تا کہ میں اپنے ہاتھ کے تازہ پھل توڑ کر کھاؤں اور یہ بھی مزہ لوں جو ٹانگوں والے مزے لیتے ہیں۔ اُس کو یہ کہانی سن کر بڑا رحم آیا اور اس نے کہا کہ اس میں تو کوئی بات نہیں میں آپ کو اپنے کندھے پر بیٹھا لیتا ہوں چنانچہ دونوں ٹانگیں اس نے ایک اس طرف اور ایک اُس طرف رکھ کے اس کو اپنے کندھے پر بٹھایا اور پھل کھلایا جب وہ پھل کھا چکا تو اس نے کہا کہ اچھا بابا میں آپ کو اُتارتا ہوں تو اس نے کہا اب تو میں نہیں اتروں گا۔ اب تو مجھے جو مزہ پڑ گیا ہے کسی کے کندھے پر سوار ہو کر پھل کھانے کا، میں اتنا ہی پاگل ہوں کہ اس مزے کو چھوڑ دوں اس سے محروم رہ جاؤں، اب تو ہر حالت میں یہ ٹانگیں تمہاری گردن کا ہار بنی رہیں گی۔ چنانچہ اس نے کس کر اُن ٹانگوں کا پھندہ بنا کر اس کی گردن میں ڈال دیا، جب وہ اس کو گرانے کا ارادہ کرتا تھا تو وہ پھندہ اور زیادہ سخت ہو جاتا تھا اور کہانی کے مطابق وہ ہمیشہ کے لئے بڈھا اس نوجوان پر سوار ہو گیا۔

مُلاں کی بھی کوئی ٹانگ نہیں ہے، حکومت کرنے کی کوئی ٹانگ نہیں ہے، کوئی جواز نہیں ہے کہ یہ حکومت پر آئے، اس کو

کوئی دنیا کے نظم وانصرام سے تعلق ہی نہیں ہے، اس کو فہم ہی نہیں ہے کہ سیاست ہوتی کیا ہے، اس کو تقویٰ کا بھی علم نہیں، اس کو عدل کا بھی علم نہیں، اس کو انصاف کا کوئی تصور نہیں، دنیا کے جغرافیہ تک سے ناواقف ہے۔ آج تک یہ بھی نہیں مانتا کہ چاند پر بھی کوئی انسان پہنچ چکا ہے۔ اس قسم کا مُلاں جو نہ دین کا علم رکھتا ہو نہ دنیا کا علم رکھتا ہوں۔ قرآن کریم کی وہ تفسیریں پڑھتا ہو جو گزشتہ زمانے میں بڑے بڑے بزرگوں نے لکھی مگر حالات سے ناواقفیت کے نتیجے میں بہت سی غلط باتیں قرآن کی طرف منسوب کر چکے ہیں۔ ان کی دنیا وہی وسطی ازمنہ کی دنیا ہے۔ اُس زمانے کے انسان کی سوچ ان کی سوچ ہے اور چونکہ دل تقویٰ سے خالی ہیں اس لئے علم بجائے نیکی پھیلانے کے ظلم اور سفا کی پھیلانے کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ اپنے برتے پر مُلاں کبھی دنیا میں حکومت نہیں کر سکتا ہے کوئی قوم کبھی کسی مُلا کی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتی ہے اگر اس کو اختیار ہو چننے کا۔ اس لئے واقعۃً یہ مثال ان پر صادق آتی ہے کہ ان کی اپنی ٹانگیں نہیں ہیں پھل کھانے کے لئے، ہمیشہ سے اس طرح زندگی گزاری کہ گرا ہوا پھل کھاتے ہیں۔ ہمارے دیہات میں، ہمارے شہروں میں ان کی حیثیت صدقہ خیرات زکوۃ کھانے والوں کی سی رہی ہے۔ بہت سے بعض شرفاء بھی ہیں، باغیرت بھی ہیں، اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا بھی جانتے ہیں لیکن انفرادی حیثیت سے۔ Institution کے لحاظ سے، ایک نظام کے اعتبار سے یہ ہمیشہ مرہون منت رہے ہیں دوسروں کی رحم دلی کا، اور جو رزق ان کی جھولی میں ڈالا گیا اسی پر غنیمت کی۔ ان کا بھی تو دل چاہتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں لیکن پاؤں ہیں نہیں کھڑے کس پر ہوں۔ اس لئے اسلامی تاریخ میں مُلاں نے جب بھی پھل پر براہ راست ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے وہ دوسروں پر سوار ہوا ہے۔ اسلامی سیاستدانوں پر سوار ہوا ہے، اسلامی بادشاہتوں پر سوار ہوا ہے اور ان کے کندھے پر چڑھ کر اس نے پھلوں پر ہاتھ ڈالے ہیں۔ اور وہ تو یہ سمجھتے رہے کہ عارضی قصہ ہے ہماری طرف سے اتنے احسان ہو رہے ہیں اس قوم پر تو کچھ اور سہی لیکن ہمیشہ مُلاں پیر تسمہ پا بنا ہے قوموں کے لئے اور کبھی بھی اس نے پھر اپنے پھندے سے ان گردنوں کو آزاد نہیں کیا۔

کہانی کے مطابق وہ سیاح جو پیر تسمہ پا کے پھندے میں جکڑا گیا تھا اسکی نجات کا تو بالآخر سامان ہو گیا لیکن بدقسمتی سے حقیقی دنیا میں ہم ان قوموں کی نجات کا کوئی سامان نہیں پاتے۔ جن لوگوں کی گردنیں ایک دفعہ مُلاں کے پھندے میں جکڑی گئیں ہیں پھر وہ کبھی آزاد نہیں ہوئیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہمارا سیاست دان جو باشعور ہے اور باغیرت ہے اور باحیاء ہے جس نے اس حکومت کے سامنے سر جھکانے سے ہر قیمت پر انکار کر دیا ہے۔ وہ کلیۃً گفت و شنید سے مایوس ہو چکا ہے اور جانتا ہے کہ ساری قوم کو لے کے اسے گلیوں میں نکلنا پڑے گا۔ ایک خونی سے اپنے ملک کو آزاد کروانے کے لئے خون کی قربانی دینی ہوگی اور اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔ ان حالات کو موجودہ وقت

کے حکمران بھی دیکھ رہے ہیں اور وہ سیاستدان بھی دیکھ رہے ہیں جنہوں نے اپنے اصول کو بیچا ہے، چند دن کی حکومت کے لئے اور آمر سے تعاون کیا ہے۔ اس لئے وہ مجبور ہیں اس توجہ کو ہٹانے کے لئے، اس کا رخ موڑنے کے لئے کچھ اور فساد کھڑے کئے جائیں گے اور جماعت احمدیہ سے بہتر ان کو اور کوئی سہارا نہیں مل رہا۔

ایک اور بھی ہے وہ ہے شیعہ ازم کا۔ اور پاکستان کی اخبارات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو رہا ہے کہ شیعہ ازم کو بھی اُبھارنے کے لئے پوری کوشش کی جارہی ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اب تک احمدیوں کے متعلق جو بھی کچھ کھیل کھیلے گئے ہیں عوام باخبر ہو چکے ہیں اور پوری طرح اُٹھ نہیں سکے جیسا کہ ان کو توقع تھی۔ لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ ایرانی حکومت کی شیعہ حکومت کی سنی حکومتوں سے لڑائی کے نتیجے میں بالعموم شیعہ اور سنی عالم بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، خوف کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ شیعہ سوال اگر اُٹھایا جائے تو ہوسکتا ہے ہماری جان چند دن اور کیفر کردار تک پہنچانے والوں کے ہاتھ سے بچ جائے۔ اس لئے بے اختیار اور مجبور ہوئے ہیں اس بات کے لئے کہ کوئی بہانہ ڈھونڈیں ملک میں، کوئی ایسے فساد برپا کریں جس کے نتیجے میں قوم کی توجہ بٹ جائے اور قوم سیاست دانوں کے ہاتھوں میں آنے کے بجائے ہمارے ہاتھوں میں اور ملاں کے ہاتھوں میں کھیلے۔

اس کا کیا انجام ہوگا وہ تو واضح ہے کیونکہ ہماری تو قرآن کریم کی تاریخ پر نظر ہے ہم اس انجام کو اُسی طرح دیکھ رہے ہیں جیسے ماضی کو دیکھا کرتے ہیں لیکن ان کو نظر نہیں آرہا اور یہی کوشش کر رہے ہیں کہ جس طرح بھی ہو ہم ان بظاہر مذہبی سوالات کو اُٹھائیں اور اس کے نتیجے میں عوام کے جذبات کو انگیخت کر کے توجہ دوسری طرف منتقل کر دیں۔

اس لئے جماعت احمدیہ پاکستان کو بالخصوص میں نصیحت کرتا ہوں کہ جس طرح انہوں نے گزشتہ سال اور اس سے پیوستہ سال نہایت ہی صبر اور استقامت کے ساتھ، دعاؤں کے ساتھ، عزم اور ہمت کے ساتھ، عشق و وفا کے ساتھ، خدا کی راہ میں تکلیفیں اٹھاتے ہوئے تسلیم و رضا کے ساتھ دن گزارے تھے اسی طرح ان روایات کو زندہ رکھیں اور ان سے چمٹے رہیں بلکہ آگے بڑھائیں اور کسی قسم کا ظلم بھی جس کی کوئی بھی انتہاء ہوسکتی ہے، وہ حکومت کی طرف سے توڑا جائے یا عوام کی طرف سے ظاہر ہو اس کو خدا کے نام پر خدا کی خاطر مردان مومن کی طرح برداشت کریں۔

ہم نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ ان کو یہ توفیق بخشے گا کہ نہیں کہ اپنے ظالمانہ فیصلے پر عمل پیرا ہوسکیں۔ خدا تعالیٰ نے انسان کے ہاتھ میں جو بھی تدبیریں رکھی ہیں ان تدبیروں سے بھی ہم کام لے رہے ہیں اور لیتے رہیں گے اور تقدیروں کے رخ بدلنے کے لئے جو دعا کے ہتھیار ہمیں عطا کئے ہیں ہم ان دعاؤں سے بھی کام لیتے رہیں گے کیونکہ دعاؤں کے ذریعہ تقدیریں بھی ٹل جایا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود خدا کی مرضی بہر حال غالب رہے گی اگر خدا نے کسی قوم کو

شہادت کی سعادت عطا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو ہم اس کی ہر رضا پر راضی رہیں گے لیکن میں جماعت احمدیہ پاکستان کو یاد دلاتا ہوں کہ اگر یہ شہادت ان کے مقدر میں لکھی جاچکی ہے تو پہلے سے زیادہ عزم اور حوصلے کے ساتھ اس بات کا عہد کریں کہ جس طرح اِن نوجوانوں نے اپنے عہد کو پورا کیا اور خدا کی خاطر اپنے پیارے بیوی اور بچوں سے منہ موڑا، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو دیکھا اور اُسے خدا کے نام پر قبول کرنے کے لئے تیار ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ کلمہ شہادت کی عزت اور ناموس پر حرف نہیں آنے دیں گے خواہ ان کی گردنیں تختہ دار پر لٹکا دیں جائیں اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیوی اور بچوں کی بیوگی اور یتیمی کو قبول کرلیں گے لیکن یہ نہیں قبول کریں گے کہ خدا کی عبادت گاہوں کو دنیا کے ذلیل انسان اپنے گندے پاؤں تلے روندیں اور ان کی عصمت کے ساتھ کھیلیں۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر حال میں ہر قیمت میں ہر قربانی دیتے ہوئے ہم کلمہ طیبہ کی حفاظت کریں گے اور اپنی مسجدوں کی ناموس کی حفاظت کریں گے۔ پس انہوں نے تو اپنی راہیں متعین کرلیں فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ (الاحزاب: ۲۴) کے فیصلے کو پورا کردیا۔ اے پیچھے رہنے والو! کیا تم ان راہوں سے پیچھے ہٹ جاؤ گے؟ اے پیچھے رہنے والو! کیا تم ان آگے بڑھنے والوں کو ہمیشہ کے لئے خالی چھوڑ دو گے؟ آج تم پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ان خدا کی خاطر مصیبتیں برداشت کرنیوالوں کے ساتھ وفا کا تقاضا ہے، محمد ﷺ اور قرآن اور خدا کے ساتھ وفا کا تقاضا ہے کہ ان راہوں سے نہیں پیچھے ہٹنا ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹنا آگے بڑھنا ہے۔ اگر چالیس لاکھ احمدی کی لاشیں پاکستان کی گلیوں میں کتے گھسیٹتے پھریں تب بھی میں تم کو تاکید کرتا ہوں کہ خدا کے نام کے کلمے اور محمد مصطفی ﷺ کے نام کے کلمے کو آنچ نہیں آنے دینی۔ پس آگے بڑھو اور یقین رکھو کہ آخر غلبہ تمہارا ہے آخر فتح تمہاری ہے کیونکہ خدا کے نام پر مرنے کے لئے تیار رہنے والوں کو کبھی موت مار نہیں سکی، کبھی کوئی دشمن ان پر فتح یاب نہیں ہوسکا۔ اپنی دعاؤں میں التزام اختیار کرو کیونکہ قرآن کریم کی ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام لکھتے ہیں۔

"جو مانگتا ہے اس کو ضرور دیا جاتا ہے اسی لئے میں کہتا ہوں کہ دعا جیسی کوئی چیز نہیں دنیا میں دیکھو کہ بعض خرگدا ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ہر روز شور ڈالتے رہتے ہیں ان کو آخر کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو قادر اور کریم ہے جب یہ اَڑ کر دعا کرتا ہے یعنی بندہ تو پالیتا ہے۔ کیا خدا انسان جیسا بھی نہیں۔"[1]

پھر آپؑ فرماتے ہیں:

"آج اس موقعہ کے اثنا میں جبکہ یہ عاجز بغرض تصحیح کاپی کو دیکھ رہا تھا بعالم کشف چند ورق ہاتھ میں دیئے

---

[1] الحکم جلد ۸ مارچ ۱۹۰۶ء

گئے اوران پر لکھا ہوا تھا کہ فتح کا نقارہ بجے، پھر ایک نے مسکرا کر ان ورقوں کی دوسری طرف ایک تصویر دکھلائی اور کہا کہ دیکھو کیا کہتی ہے تصویر تمہاری۔ جب اس عاجز نے دیکھا تو اس عاجز کی تصویر تھی اور سبز پوشاک تھی مگر نہایت رعب ناک جیسے سپہ سالار مسلح فتح یاب ہوتے ہیں اور تصویر کے یمین و یسار میں حجۃ اللہ القادر وسلطان احمد مختار لکھا تھا۔''[1]

پھر آپ فرماتے ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ نے بطور وحی کچھ اسماء عطا فرمائے، کچھ لقب دیئے ان میں سے ایک یہ تھا عبد القادر رضی اللہ عنہ۔ اری رضوانہ اللہ اکبر ۔اسکی تفسیر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں:

''خدا کچھ اپنی قدرتیں میرے واسطہ ظاہر کرنے والا ہے، اس واسطہ میرا نام عبدالقادر رکھا۔ رضوان کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ کوئی فعل دنیا میں خدا کی طرف سے ایسا ظاہر ہونے والا ہے جس سے ثابت ہو جائے اور دنیا پر روشن ہو جائے کہ خدا مجھ پر راضی ہے۔''

کوئی فعل دنیا میں خدا کی طرف سے ایسا ظاہر ہونے والا ہے جس سے ثابت ہو جائے اور دنیا پر روشن ہو جائے کہ خدا مجھ پر راضی ہے'' دنیا میں بھی جب بادشاہ کسی پر راضی ہوتا ہے تو فعلی رنگ میں بھی اس رضامندی کا اظہار ہوتا ہے۔''[2]

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کو جہاں فتوحات کی بڑی واضح اور قطعی اور عظیم الشان خوشخبریاں عطا فرمائی گئیں وہاں ان فتوحات کو حاصل کرنے کی چابی بھی عطا کر دی گئی اور الہام کے ذریعہ وہ راز سکھلایا گیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر نصرت آتی ہے اور خدا کے پاک بندوں کے لئے پھر عظیم الشان کام کر کے دکھاتی ہے اور وہ الہام یہ ہے کہ

''اٹھو نمازیں پڑھیں اور قیامت کے نمونے دیکھیں''[3]

**پس میں احمدیوں سے کہتا ہوں کہ اُٹھو اور نمازیں پڑھو یہی تمہارے ہتھیار ہیں تم ان روحانی ہتھیاروں کو استعمال کرو۔ پہلے سے بڑھ کر خدا کی عبادت میں شغف دکھاؤ۔ پہلے سے زیادہ بڑھ کر ان عبادتوں میں اپنے دلوں کو نرم کرو، اپنی روحوں کو گداز کرو اور خدا کے حضور گریہ کا شور مچا دو، خدا کے حضور اپنی عاجزی اور درد کی حالت اور بے کسی کی حالت**

---

[1] تذکرہ صفحہ: ۸۸

[2] تذکرہ صفحہ: ۳۶۵

[3] تذکرہ صفحہ 507

کو پیش کرو اور پھر دیکھو کہ خدا کی قسم! حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ الہام تمہارے حق میں بھی پورا کر کے دکھایا جائے گا ''اٹھو نمازیں پڑھیں اور قیامت کے نمونے دیکھیں'' اپنے ان پاک بندوں کے لئے جو خدا کی عبادت کا حق ادا کرتے ہیں اللہ ضرور دنیا کو قیامت کے نمونے دکھایا کرتا ہے اور یہ وہ قیامت کے نمونے ہوتے ہیں جن میں پھر آرا ء تبدیل کر دی جاتی ہیں اور بڑے بڑے عظیم الشان روحانی انقلاب برپا کئے جاتے جاتے ہیں۔ پس اُس دن کے منتظر رہو اور کامل یقین کے ساتھ اُس دن کے منتظر رہو، دعا پر پنجہ مارو اور خدا پر توکل سے ایک لمحہ بھی کبھی متزلزل نہ ہو۔ یقین رکھو کہ ربِ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم آج ہمارے ساتھ ہے، ہمارے ساتھ ہے اور ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔[1]

---

[1] خطبات طاہر جلد 5 صفحہ 157 تا 171

# اسیران ساہیوال اور سکھر کے بلند حوصلے کا ذکر اور سیدنا بلال ؓ فنڈ کا قیام

خطبہ جمعہ فرمودہ سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ

مورخہ 14رامان 1365 ہش بمطابق 14 مارچ 1986ء بمقام مسجد فضل لندن

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے فرمایا:

جب سے ساہیوال اور سکھر کے مقدمات کا جابرانہ فیصلہ سنایا گیا ہے اس وقت سے جماعت کی طرف سے جو خطوط مل رہے ہیں ان میں اکثر میں اس بارے میں بے چینی کا اظہار پایا جاتا ہے اور مختلف رنگ میں اپنے اپنے خیالات، اپنے اپنے انداز بیان کے مطابق اپنے درد کا بھی اظہار کرتے ہیں دعاؤں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور بعض خطوں میں یہ بھی تحریک ہوتی ہے کہ جو ممکن کوشش ہو وہ کرنی چاہئے۔لیکن اکثر خط ایسے ہیں جو اس بات میں بھی پوری طرح اطمینان کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمیں علم ہے کہ ہم سے بہتر نظام جماعت کو ان کا اور ان کے اہل خاندان کا فکر ہوگا اور ہمیں پورا اطمینان ہے کہ جو کوشش بھی انسانی حد تک ممکن ہے وہ ان کے لئے کی جارہی ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر ہیں، جن کو کامل اعتماد ہے نظام جماعت پر اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوۃ والسلام نے جو کام کرنے والے پیچھے چھوڑے ہیں ان کی صلاحیت پر لیکن کچھ لوگ اپنی بے چینی کے اظہار میں اس معیار پہ پورے نہیں اُترتے اور اشارۃً ایسی باتیں لکھتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو پورا اطمینان نہیں ہے کہ جماعت کیا کر رہی ہے۔بعض خطوں میں تو مطالبے آتے ہیں کہ ہمیں بتایا جائے کہ جماعت کیا کر رہی ہے۔ان لوگوں کے خطوں سے ایمان میں نقص کی بو آتی ہے اور جو ان کا مقام ہے اس سے بڑھ کر باتیں کرنے والے دکھائی دیتے ہیں۔سب سے زیادہ قریبی وہ لوگ ہیں جو مصیبت زدگان کے رشتہ دار ہیں۔ان کی بیوی، ان کے بچے، ان کے بھائی، ان کے خاوند، ان کی بہنیں، یہ وہ لوگ ہیں، خاوند تو جیلوں میں ہیں، میرا مطلب تھا کہ ان کی بیویاں اور ان کے بھائی وغیرہ۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے وہ پہلے گروہ سے بھی زیادہ ایمان اور تقویٰ کا عظیم الشان مظاہرہ کر رہے ہیں۔ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (التوبہ:۱۰۰) کن لوگوں کو کہتے ہیں۔

خود وہ جن پر خدا کی خاطر، خدا کے نام کی خاطر مصائب توڑے جارہے ہیں اور وہ جو اُن کے قریب ترین ہیں۔اُن کے نمونے صبر وثبات کے، تقویٰ کے، توکل کے اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے کے، ایسے عظیم الشان ہیں کہ وہ ہمیشہ تاریخ

احمدیت میں سنہری حروف سے لکھے جائیں گے۔ ہمیشہ آنے والی نسلیں ان کو دعائیں دیں گی اور رشک کریں گی اُن کے خلوص اور اُن کے تقویٰ پر۔

یہ حالات دیکھنے کے بعد یہ حکمت بھی سمجھ آگئی کہ کیوں خدا نے ان لوگوں کو خاص قربانی کے لئے چنا تھا۔قربانی کے لئے چنا جانا بھی ایک انعام ہے اور ایک بڑی عظیم سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو چنتا ہے تو اُس میں یا اُس کے خاندان میں ضرور کوئی بات دیکھتا ہے جس کے لئے وہ انتخاب کیا جاتا ہے۔جس طرح حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب شہید کا جو اِنتخاب کیا تھا، وہ سارے افغانستان میں دل کی حیثیت رکھتے تھے، روح کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ سارے مشرق میں ایک نمایاں امتیازی شان رکھتے تھے اور اِسی لئے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی شہادت کو غیر معمولی اظہار محبت کے لئے چنا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے انتخاب کی بھی سمجھ آجاتی ہے کہ کیوں بعض خاندانوں اور بعض افراد کو قربانی کے لئے چنتا ہے۔ اُن کے اندر تقویٰ کی کوئی ایسی روح نظر آتی ہے، کوئی ایسی قربانی کی تمنا دکھائی دیتی ہے کہ جس کی وجہ سے ان کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو قربانی نہیں دے رہے یعنی جن سے قربانی نہیں لی جارہی۔ دینے کے لئے تو جماعت کی بھاری اکثریت تیار بیٹھی ہے ان میں کوئی نقص ہے۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں، صرف یہ مطلب ہے کہ جب خدا کی نظر چنتی ہے کسی کو تو اس کی سعادت اُبھر کے سامنے آجاتی ہے، وہ تو چمک اٹھتی ہے۔ اور سعادت کے بغیر خدا کی نظر کسی کو نہیں چنتی۔ ورنہ ایسے بہت سے ہیں جن کا قرآن کریم خود ذکر فرماتا ہے فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ (الاحزاب: ۲۴) کہ جن کو ہم نے قربانی کے لئے چن لیا ہے صرف وہی نہیں ہیں جو میری نظر میں عزیز ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو انتظار میں بیٹھے ہیں اور وہ انتظار میں بیٹھے رہنے والے بھی میری محبت اور پیار کی نظر کے نیچے ہیں۔ یہ ہے دراصل اس اظہار کی روح۔

بہر حال آج کے خطبہ کے لئے میں نے بعض راہ مولیٰ میں دکھ اٹھانے والوں کے خطوط اور ان کے اعزاء و اقرباء کے خطوط کے چند اقتباسات چنے ہیں۔ جماعت کو یہ بتانے کے لئے کہ اس طرح خدا کی راہ میں عزم اور حوصلہ کے ساتھ قربانیاں دی جاتی ہیں اور ان کے نمونے نے آپ سے کیا تقاضے پیدا کئے ہیں۔ ان کے نیک اعمال نے آپ کے لئے کیا راہ متعین کی ہے اور اس لئے کہ تا آپ پہلے سے بڑھ کر ان کو دعاؤں میں یاد رکھیں۔

سکھر جیل میں ہمارے دو بھائی برادرم ناصر احمد قریشی اور رفیع احمد قریشی ہیں پروفیسر ناصر احمد قریشی بڑے ہیں۔ ان کا خط ملا ہے پھانسی گھاٹ سنٹرل جیل سکھر 04/03/86۔ بڑی محبت اور پیار سے مجھے مخاطب کرنے کے بعد، السلام علیکم لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

''حضور کے علم میں تو آ چکا ہوگا کہ کل مورخہ تین مارچ کو ہم دو بھائیوں راقم الحروف ناصر احمد اور رفیع احمد کو سزائے موت کا حکم جیل سپرنٹنڈنٹ سکھر نے غالباً ساڑھے گیارہ بجے دن سنایا اور پھر ہمیں بند وارڈ پھانسی گھاٹ میں کھدر کے کپڑے اور ٹوپی پہنا کر بند کر دیا گیا۔ حضور! ہماری جانیں، مال، عزت، اولاد، آبرو سب خدا کے حضور حاضر ہے۔ صرف وہ راضی ہو جائے۔ ظالم جتنا ظلم چاہیں کرلیں، تختہ دار پر بے گناہ لٹکا دیں۔ ہماری مسکراہٹ اللہ کی رضا کی خاطر قائم رہے گی۔ اور خدا اور قرآن کی جھوٹی قسمیں کھا کھا کر دروغ گوئی سے کام لینے والوں کو دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوں گے۔ کبھی تو ان کا ضمیر ان کو ملامت کرے گا۔ آخر سکھر کے لوگ ایک نہ ایک دن حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ ہم بے گناہ تھے۔ باقی پانچ اسیران بشمول میرا لڑکا عمر اٹھارہ سال کا معاملہ ابھی التواء میں ہے۔ (یہ فیصلہ بعد میں سنایا گیا تھا) خدا تعالیٰ ان کو محض اپنے خاص فضل سے مزید تکلیف میں نہ ڈالے۔ میری اہلیہ اور آٹھ بچوں جس میں دو جڑواں بہنیں عمر بارہ سال کے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں حوصلہ دے، ہمت دے اور وہ بھی خدا کی رضا پر راضی رہیں۔ یہ احمدیت کی پنیری ہے جس نے بڑھ کر بار آور درخت بننا ہے۔ ان کی دیکھ بھال اللہ کے فرشتے فرمائیں''۔

ان کے بیٹے کا خط بھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''آج مورخہ 5 مارچ 1986ء (یعنی ایک دن کے بعد کا لکھا ہوا خط ہے) کو جب بچے والد صاحب سے ملاقات کرنے جیل گئے تو ہم لوگوں کو وہاں لے جایا گیا جہاں پھانسی کے لوگوں کو رکھا جاتا ہے۔ وہاں والد صاحب اور چچا کو جس حالت میں دیکھا یعنی ان کے لباس کو تو یقین جانیں کہ دل خون کے آنسو رویا کہ ایسے دن بھی آسکتے ہیں۔ تمام لوگ رو رہے تھے لیکن آفرین ہے جماعت کے ان سپوتوں پر کہ کیا مجال کہ ان کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نکلا ہو''

پھر لکھتے ہیں کہ:

''میں نے جب یہ منظر دیکھا تو کیا بتاؤں بیان نہیں کر سکتا کہ خدا اپنے بندوں کے کیسے کیسے امتحان لیتا ہے۔ لوگ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان لوگوں کو تکلیف دے کر وہ ہمارا ایمان خرید لیں گے۔ خدا کی قسم یہ لوگ اگر ہم سب کو پھانسی دے دیں تو بھی ہم لوگ اُف نہیں کریں گے۔ پہلے ان ظالموں نے میرے دادا کو شہید کیا

اور اب ان کو بھی جھوٹے مقدمے میں ملوث کر دیا۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ جلد ان لوگوں کو باعزت بری فرمائے اور وہ لوگ ہنسی خوشی واپس گھر آئیں"

اس سے دعاؤں پر اور خدا کی قدرت پر جماعت کو جو کامل یقین ہے اس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بچے کو علم ہے کہ سو فیصدی ظالم اور سفاک لوگ ہیں اور کوئی خدا کا خوف نہیں ہے۔ اور بظاہر کوئی آثار نہیں ہیں کہ ان کے دل میں کوئی تبدیلی پیدا ہو اس کے باوجود آخری لمحے تک مومن کو جو خدا پر توکل ہے اس کا اظہار اس چھوٹی عمر کے بچے نے کیا ہے۔

محمد الیاس منیر کی ہمشیرہ لکھتی ہیں کہ:

"اس سے قبل میں نے آپ کو دو خط اپنے پیارے بھائی الیاس منیر واقف زندگی کی باعزت رہائی کے لئے لکھے تھے۔ جن میں بہت پریشانی کا اظہار کیا مگر اب ہمیں آپ کا 21 فروری کا خطبہ پہنچ گیا ہے جس کو میں ابھی دوبارہ پڑھ کر بیٹھی ہوں اور دل کو ڈھارس ہوئی ہے"۔

ان کے والد مکرم محمد اسماعیل منیر واقف زندگی لکھتے ہیں:

"ہمیں خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ہمارے خاندان کو بھی ایک اہم قربانی پیش کرنے کے لئے چن لیا ہے اور اللہ تعالیٰ مزید فضل فرمائے اور پوری بشاشت سے اس کو پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو ہمارے رب کے ہاں بھی مقبول ہو اور ہم سب کا انجام بخیر ہو۔ جب سے یہ خبر سنی ہے حضور ایدکم اللہ کی تکلیف کا تصور کر کے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ہم دعاؤں میں لگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے ہمارے امام کی ہر تکلیف کو دور فرمائے اور اسلام اور احمدیت کی شاندار فتوحات عطا فرمائے۔ اس غرض کے لئے ہم ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنے کے لئے ہر دم تیار ہیں۔ عزیزہ طاہرہ الیاس اور دونوں بچے طارق الیاس، خالد الیاس میری خوب مدد کر رہے ہیں اور ہم سب مل کر آنے والے احباب کی جسمانی اور روحانی خدمت کی توفیق پا رہے ہیں۔ اور اس اہم جماعتی دکھ کو دور کرنے کے لئے دن رات دعاؤں میں لگے ہوئے ہیں"۔

پھر ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"ہم اسیران راہ مولیٰ سے فیصلہ کے بعد 17 فروری کو ملے تھے۔ اس کے بعد بھی جو دوست مل کر آئے ہیں ان سب کی زبانی اسیران کے بلند حوصلوں کی خبریں ملی ہیں۔ اور وہ حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ (الصافات:۱۰۳) کے نعرے بلند کر

رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی خواہش کے مطابق حضرت عبداللطیفؓ صاحب شہید جیسی استقامت عطا فرمائے اور ان کی اس قربانی کو قبول فرمائے اور جماعت کو اس کے شیریں ثمرات سے نوازے‘‘۔

پھر لکھتے ہیں:

’’کل دونوں اسیران راہ مولیٰ ساہیوال سے ان کی پھانسی کی کوٹھڑیوں میں ہماری دوسری ملاقات ہوئی۔ الحمدللہ کہ ان کو ہشاش بشاش پایا اور گذشتہ ملاقات کی نسبت ان کی حالت ہر لحاظ سے بہتر تھی بلکہ انہوں نے ملاقات کرنے والے عزیزان خصوصاً عورتوں کے حوصلے بڑھائے مثلاً الیاس منیر کی بہن ناصرہ کے اور اُس کی نانی صاحبہ جو کل ملاقات کر کے آئی ہیں اُن کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے (یعنی اسیروں نے ان کے حوصلے بڑھائے) اور خوشی خوشی دوسروں کو اپنے خوش کن تاثرات سنا رہی تھیں۔ اُس کی بیوی طاہرہ نے تو بہت ہی حوصلے کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنے دونوں بچوں طارق اور خالد کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ملاقات کے لئے آنے والی سینکڑوں عورتوں کو ہر روز صبر و سکون کی تعلیم دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہمت دے اور اس کے والدین کو بھی‘‘۔

آخر پر میں اپنے نہایت پیارے عزیزم الیاس منیر کا خط پڑھ کر سناتا ہوں۔ یہ لکھتے ہیں:

’’15 فروری کو جب ہمیں سہ پہر کے وقت ڈیوڑھی طلب کیا گیا تو ہمیں پورا علم تو نہیں تھا کہ ہمارا فیصلہ کیا ہونے والا ہے۔ تاہم جس قسم کے انتظامات میں ہمیں لے جایا گیا اس سے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں آپس میں باتیں ہو رہی تھیں اور میری زبان پر سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ و السلام کا شعر جاری ہو رہا تھا:

اگر وہ جاں کو طلب کرتے ہیں تو جاں ہی سہی     بلا سے کچھ تو نپٹ جائے فیصلہ دل کا[1]

پھر ہمیں چار بجے کے قریب باری باری بلا کر فیصلہ سنایا جانے لگا۔ رانا صاحب سے پہلے مجھے بلا کر جب فیصلہ سنایا گیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تسکین میرے سارے جسم میں بھر دی گئی ہے۔ بے اختیار الحمدللہ کے کلمات منہ سے نکلے اور یوں لگا جیسے سارے بوجھ اتر گئے ہیں۔ ارد گرد سخت افسوس کا ماحول تھا اور ہم خوش ہو رہے تھے۔ دیکھنے والے ہمیں خوش ہوتا دیکھ کر حیران بھی ہوتے ہوں گے مگر ہم تو افسانہ بنی ہوئی تاریخ کو زندہ کر رہے تھے۔ پھر ہمیں بظاہر جیل کی سخت ترین جگہ لے جایا گیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور درود

---

[1] درثمین صفحہ: ۱۶۰

شریف پڑھتے ہوئے دو تین دن گزارے اور اب پھانسی کی کوٹھریوں میں الگ الگ وارڈ میں ہیں اور دو تین دن کی بے قرار جدوجہد کے بعد اب میں آپ کو خط لکھنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔

پیارے آقا! ہم جو خادم کے عہد میں جان قربان کرنے کا وعدہ کیا کرتے تھے آج وقت آیا ہے اس وعدہ کو نبھانے کا۔ بے شک ہم بہت کمزور ہیں بہت گنہگار ہیں لیکن آج جب ہمارے مولیٰ نے اسلام کے احیاء نو کے لئے ہمیں چنا ہے ہم اپنی پوری ہمت اور طاقت کے ساتھ لبیک لبیک کہتے ہوئے اپنے مولیٰ کے حضور حاضر رہیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ایک وجود کے بدلے میں ہزاروں، لاکھوں وجودوں کو زندگی ملے گی جو قیامت تک دشمنوں کے لئے جلن اور سخت سوزش کا موجب بنی رہے گی''۔

تو یہ ہیں ہمارے مصیبت زدگان بھائی، جن کو عام اصطلاح میں مصیبت زدہ ہی کہا جاتا ہے لیکن مذہبی اصطلاح میں یہ وہ خوش نصیب ہیں جنہیں خدا نے ابدی زندگی کے لئے چن لیا ہے۔ وہ خوش نصیب ہیں جو اربہا ارب انسانوں میں قسمت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور قسمت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔ ان کی پیدائش پر بھی اللہ کے پیار کی نظریں پڑتی ہیں، جن کی موت پر بھی اللہ کے پیار کی نظریں پڑتی ہیں، جو خود بھی مبارک بنائے جاتے ہیں اور جن کے وجود اپنے ماحول کو بھی مبارک کر دیتے ہیں۔ جن کے خاندانوں پر نسلاً بعد نسلٍ اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی رہتی ہیں اور خدا کی بے شمار برکتیں ان کے گھر بار پر برستی ہیں۔ یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو کامل طور پر رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (الفجر:۲۹) کی حیثیت سے جب بھی خدا اُن بلاتا ہے خدا کے حضور حاضر ہوتے ہیں۔ اس لئے جماعت احمدیہ کو ان کو ہمیشہ خاص دعاؤں میں یاد رکھنا چاہئے اور ان کی اولادوں کو بھی اور اولاد در اولاد کو بھی اور جہاں تک جماعت کو توفیق ہے لازماً وہ ان کے تمام پسماندگان کا بہترین خیال رکھے گی۔

اس موقع پر میں جماعت کو یہ بھی تسلی دلانا چاہتا ہوں کہ اللہ کے فضل سے جماعت احمدیہ میں کوئی خدا کی راہ میں مارے جانے والا ہرگز یہ وہم لے کر یہاں سے رخصت نہیں ہوتا کہ میرے بچوں کا، میری بیوی کا کیا بنے گا۔ جماعت احمدیہ میں ایسے لوگوں کے بچے یتیم نہیں ہوا کرتے۔ یہ ایک زندہ جماعت ہے اور ناممکن ہے یہ جماعت اپنے قربانی کرنے والوں کے اہل وعیال کو اور ان کے حقوق کو بھول جائے۔ اس ضمن میں پہلے بھی میں نے صدر انجمن کو اور تحریک جدید کو اور دیگر تعلق رکھنے والوں کو یہ ہدایت دی تھی کہ ان مشکلات میں مبتلا بھائیوں کے لئے یہ خاص طور پر خیال رکھیں کہ ان کے اہل وعیال کو ان کی عدم موجودگی کا دکھ یا تکلیف ان معنوں میں نہ ہو کہ وہ ہوتے تو ہماری یہ ضرورت پوری

ہوتی اور دہ ہوتے تو ہمارا یہ کام بنتا۔ اس کے لئے جماعت ذمہ دار ہے اور جہاں تک مجھے اطلاعات ملتی رہی ہیں اگرچہ بعض دفعہ نادانستہ کوتاہی ہوگئی ہے مگر بالعموم خدا تعالیٰ نے اپنے فضل کے ساتھ جماعت کو ہر طرح ان کی ضروریات کو پورا کرنے کی توفیق بخشی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے دور بیٹھے اس قسم کی تفصیلی نگرانی نہیں ہوسکتی جیسے قریب بیٹھ کر ہوسکتی ہے۔ اس لئے بعض شکایات بھی موصول ہوئیں اس پر میں نے فوری طور پر منتظمین کو سرزنش بھی کی اور بتایا کہ آپ نے قطعاً کوئی مالی لحاظ سے کسی پہلو سے کوئی فکر نہیں کرنا اور ہرگز ان لوگوں سے کوئی کنجوسی نہیں کرنی۔ خدا کا مال ہے، خدا کی امانت ہے ہمارے پاس اور یہ اول ترین استحقاق رکھنے والے لوگ ہیں۔

جماعتوں کی زندگی کی ضمانت اس بات میں ہے، الٰہی جماعتوں کی زندگی کی ضمانت کہ اُن کے قربانی کرنے والوں کو اپنے پسماندگان کے متعلق کوئی فکر نہ رہے اور اتنی واضح، اتنی کھلی کھلی یہ حقیقت ہر ایک کے پیش نظر رہے کہ ہم بطور جماعت کے زندہ ہیں اور بطور جماعت کے ہمارے سب دکھ اجتماعی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ یقین پیدا ہوجائے کسی جماعت میں تو اس کی قربانی کا معیار عام دنیا کی جماعتوں سے سینکڑوں گنا زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ باہر تو پوچھتا ہی کوئی نہیں۔ بڑے بڑے سیاسی لیڈر ہم نے دیکھے ہیں جو تحریکیں چلا کر ہزار ہا کو مروا دیتے ہیں اور اس کے بعد خود عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ کوئی پتہ نہیں کرتا کہ ان یتیموں کا کیا بنا، ان بیوگان کا کیا بنا، اُن کے بچوں کی اخلاقی نگرانی کرنے والا بھی کوئی تھا کہ نہیں، اُن کے سر پر چھت بھی تھی کہ نہیں، دو وقت کا کھانا بھی میسر تھا کہ نہیں اور عوام بے چارے اپنی سادگی میں پھر ہر دفعہ ایسی قربانیاں پیش کرتے ہیں لیکن جس جماعت میں قربانی کا معیار خدا کے فضل اور اس کے رحم کے نتیجے میں اس وجہ سے بلند ہو کہ وہ خدا کی خاطر قربانی کرتے ہیں اور ساتھ یہ بھی یقین کامل ہو کہ ہمارے بعد ہماری اولاد کی ساری جماعت نگران رہے گی بلکہ پہلے سے بڑھ کر اُن کی ضروریات کا خیال رکھا جائے گا تو ایسی جماعت کی قربانی کا معیار آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے۔

اس لئے اگرچہ جماعت خدا تعالیٰ کے فضل سے ان تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھتی ہے اور اپنی ذمہ داریاں نبھائے گی۔ لیکن بعض دوستوں کی طرف سے یہ اصرار ہوتا رہا ہے کہ شہدا کے لئے ایک مستقل فنڈ اکٹھا ہونا چاہئے۔ پہلے تو میری طبیعت میں یہ تردّد رہا اس خیال سے کہ یہ تو ان کے حقوق ہیں اور جماعت کی جو بھی آمد ہے اس میں یہ اوّلین حق ان لوگوں کا شامل ہے۔ اس لئے الگ تحریک کرنے سے کہیں یہ جذباتی تکلیف نہ ان کو پہنچے کہ ہمارا بوجھ جماعت اُٹھا نہیں سکتی اُس طرح ہمارے لئے جیسے صدقے کی تحریک کی جاتی ہے۔ اس طرح الگ تحریک کی جارہی ہے۔ اس لئے کافی دیر تردّد رہا اور دعا بھی کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ صحیح فیصلے کی توفیق عطا فرمائے۔ لیکن اب مجھے پوری طرح اس بات

پر شرح صدر ہو گیا ہے کہ چونکہ یہ ہرگز صدقے کی تحریک نہیں بلکہ جو شخص اس میں حصہ لے گا وہ اعزاز سمجھے گا اس بات کو کہ مجھے جتنی خدمت کرنی چاہئے تھی اتنی نہیں تو ایک بہت ہی معمولی خدمت کی توفیق مل رہی ہے اور اس لئے کہ بہت سے لوگوں کی طرف سے بے اختیار بار بار اظہار ہو رہا ہے کہ ہم بے چین ہیں ہمیں موقع دیا جائے ہم کسی رنگ میں خدمت کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ جماعت کی ایسی تربیت ہے کہ انفرادی طور پر ایسے لوگوں کو ایسے خاندانوں سے تعلق رکھ کر کچھ رقمیں دینے کو مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ اس میں کئی قسم کی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں اور ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ ذاتی طور پر یہ لوگ کسی کے احسان کے نیچے آئیں۔ اس لئے جن کی تمنا ہے جو اس بات کے لئے تڑپ رہے ہیں کہ ہمیں بھی موقع ملنا چاہئے اُن کے لئے پھر بھی رستہ باقی رہ جاتا ہے کہ نظام جماعت ان کو موقع دے اور وہ جماعت میں اپنی توفیق اور اپنی خواہش اپنی تمنا کے مطابق کچھ نہ کچھ پیش کریں۔

اِس لحاظ سے یہ سب باتیں سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج اِس تحریک کا اعلان کرتا ہوں۔ اس کے لئے میں اپنی طرف سے دو ہزار پونڈ سے اس کا آغاز کرنا چاہتا تھا مگر انگلستان کی جماعت کے ایک دوست مجھ سے پہل کر گئے باقی تو مشورے دے رہے تھے انہوں نے ایک ہزار پونڈ کا ساتھ چیک بھجوا دیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے توفیق ان کو دے دی کہ وہ سبقت لے گئے ہیں۔ مگر بہر حال دوسرے نمبر پر میرا نام آ جاتا ہے اور اب جس کو خدا تعالیٰ جتنی توفیق عطا فرمائے۔ پوری طرح شرح صدر اور محبت کے جذبے سے جو دینا چاہتا ہے وہ دے گا۔ ادنیٰ سا بھی تردّد یا بوجھ ہو تو ہرگز نہ دے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ نہ دے کیونکہ یہ ایسی تحریک نہیں ہے کہ جس طرح چندوں میں بعض دفعہ بوجھ اُٹھا کر بھی آپ دیتے ہیں۔ یہ ایک خاص نوعیت کی تحریک ہے اس میں بشاشت طبع ہی ضروری نہیں بلکہ طبیعت کا دباؤ ضروری ہے، دل سے بے قرار تمنا اُٹھ رہی ہو، ایک خواہش پیدا ہو رہی ہو کہ میں اس میں شامل ہوں۔ پھر خواہ کسی کو آنہ دینے کی بھی توفیق ہو وہ بھی بہت عظیم دولت ہے، وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک بہت بڑی سعادت ہوگی۔ تو اس تحریک کا میں اعلان کرتا ہوں اور اسی پر اس خطبہ کو ختم کرتا ہوں۔ لیکن ختم کرنے سے پہلے ایک دفعہ پھر آپ کو دعاؤں کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ دعائیں کرنا اور دعا میں گریہ وزاری کرنا یا ان پیاروں کی یاد میں دل کو نرم پانا یہ کوئی کمزوری نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ لیکن دشمن کے مقابل پر نظر نیچی کرنا اور اپنے مقاصد سے منہ موڑ لینا یا ان میں نرمی پیدا کر دینا یا اپنے عزائم میں کسی قسم کی کمی برداشت کر لینا، کسی قسم کی کمزوری برداشت کر لینا یہ مومن کو زیبا نہیں ہے۔ ہر ٹھوکر کے بعد پہلے سے زیادہ عزم ہونا چاہئے، پہلے سے بلند تر حوصلے ہونے چاہئیں، پہلے سے زیادہ سختی برداشت کرنے کے ارادے ہونے چاہئیں اور اس کے مطابق دعائیں بھی بڑھنی چاہئیں ساتھ ساتھ۔ پس جہاں تک ان لوگوں اور دشمنوں

کا تعلق ہے۔ اُن کے لئے یہ آنسو نہیں ہیں اُن کے لئے یہ دل کے درد نہیں ہیں۔ یہ ہمارا اپنے پیاروں کے ساتھ ایک تعلق ہے اور خدا کا اس کے ساتھ تعلق ہے۔

جہاں تک احمدیت کے دشمن کا تعلق ہے اُن کو ہمارا یہی پیغام ہے کہ جتنی ٹھوکریں تم ہمیں لگاؤ گے خدا کی قسم ہم پہلے سے بڑھ کر زیادہ طاقتور اور صاحب عزم ہوتے چلے جائیں گے۔ جتنا تم ہمیں دبانے کی کوشش کرو گے پہلے سے سینکڑوں گنا زیادہ قوت کے ساتھ ہم اُبھریں گے۔ تم اگر حسد کرتے ہو کہ ہمارا مقام ہمالہ کی چوٹیوں تک پہنچ گیا ہے تو ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ اِس مقام سے گرانے کی کوشش کرو گے تو ہم ثریا سے باتیں کرنے لگیں گے۔ وہاں سے گرانے کی کوشش کرو گے تو ہفت اقلیم تک خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ جماعت احمدیہ کی شہرت ضرور پہنچے گی اور بلند تر مرتبے اور بلند تر مقامات پر جماعت کا قدم اوپر سے اوپر بڑھتا چلا جائے گا۔ اس لئے ہم دشمن کے مقابل پر اس قسم کا عزم رکھنے والی جماعت ہیں۔ وہ ہماری عاجزی اور انکساری سے کہیں دھوکہ نہ کھا جائے۔

اور یہ بھی بڑی خوشی کی بات ہے، بڑے اطمینان کی بات ہے کہ جتنے خط جماعت کی طرف سے موصول ہو رہے ہیں ان میں بیشتر میں اس بات کا اظہار پایا جاتا ہے کہ ہم اپنے لئے نہیں کہہ رہے، ہم ماحول میں تبدیلیاں دیکھ رہے ہیں۔ ایسے ایسے کمزور احمدی جن کے متعلق وہم وگمان بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ کسی قربانی کا نام لے لیں گے ان کے چہروں کے ہم رنگ بدلے ہوئے دیکھ رہے ہیں، ان کی پیشانیوں پر ہم نئے عزم کے آثار دیکھ رہے ہیں۔ ایک عظیم انقلاب برپا ہو رہا ہے جماعت کے اندر۔ اس لئے بہت بہت مبارک ہو کہ ہر قربانی جو جب گزر جاتی ہے تو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عملاً جو خدا کے فضل نازل ہوئے اس کے مقابل پر کچھ بھی نہیں تھی۔ ہر قربانی جو جماعت پیش کر رہی ہے اُس کے مقابل پر جو سعادتیں نازل ہو رہی ہیں۔ اللہ کی طرف سے جو عظیم روحانی انقلاب برپا ہو رہا ہے اُس کی تو قیمت ہی کوئی نہیں ہے۔ کوئی شکوہ نہیں ہے اپنے رب سے۔ جس قسم کا تلخ گھونٹ اس کی رضا ہم سے بھرنے کا تقاضا کرے گی ہنستے ہوئے، مسکراتے ہوئے، سر کو جھکاتے ہوئے اُس کے حضور ہم اُس کی رضا کے لئے ہر تلخ گھونٹ کو بھریں گے۔ لیکن ایک ایک تلخ گھونٹ لامتناہی میٹھے چشمے جاری کر دے گا اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کے کیونکہ ہمیشہ اُس کی رضا کی خاطر تلخ گھونٹ بھرنے والوں سے اُس کا یہی سلوک ہوا کرتا ہے۔[1]

---

[1] خطبات طاہر جلد 5 صفحہ 213 تا 223

# جیل میں بطور قیدی

## جیل کی سخت ترین جگہ

فیصلہ سنائے جانے کے بعد جب ہم ڈیوڑھی سے نکلے تو ہمارے نگران ہیڈ وارڈر نے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سے ہمارے متعلق ہدایت لی تو اُس نے ہاتھ سیدھا کر کے اشارہ کیا جسے وہ فوراً سمجھ گیا کہ 7 بلاک لے جانا ہے چنانچہ ڈیوڑھی سے اُس طرف جانے والی سیدھی سڑک پر ہم چل دیئے۔ اس جلوس کے ہم آگے آگے اور ملازم و نمبردار پیچھے پیچھے تھے گویا عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہم آگے، کا منظر تھا۔ جب 7 بلاک کے احاطہ میں پہنچے تو اس کی وارڈ نمبر 2 کی طرف لے جانے کا حکم صادر ہوا۔ یہاں وارڈ نمبر 2 کی چکیوں کے سامنے پہنچ کر ہمارے ہاتھوں کو تو آہنی زیور (ہتھکڑیوں) سے آزاد کر دیا گیا مگر پیروں میں جھانجنیں یعنی بیڑیاں ڈال دی گئیں جو سب سے بڑے سائز کی تھیں (یہ بیڑیاں اگلے روز صبح لگی تھیں)۔ یاد رہے کہ 14 چکی یا 7 بلاک کی وارڈ نمبر 2 سزائے موت کے قصوری (یعنی انتہائی خطرناک) قیدیوں کے لئے مخصوص ہے اور یہ 7 بلاک اگرچہ ساری جیل میں سے سخت ترین جگہ ہے مگر اس میں سے بھی وارڈ نمبر 2 سب سے سخت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس وارڈ میں وارڈر یعنی نگرانی پر مامور سپاہی بھی دو ہوتے ہیں ایک تو صرف سزائے موت کے قیدیوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے اور دوسرا عام نگرانی کے لئے۔ اُدھر ہم لے جائے گئے تو اس وارڈ کی پہلی 11 چکیاں پہلے سے ہی سزائے موت کے قیدیوں سے پُر تھیں۔ چنانچہ ہمارے لئے 12 اور 13 چکی کو خالی کرایا گیا اور ان میں بند عام قیدیوں کو اگلی چکیوں میں ڈال دیا گیا۔

اب ہمیں علیحدہ علیحدہ چکیوں میں اس حال میں بند کیا جا چکا تھا کہ ہمارے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ بس وہی کپڑے تھے جو ہم نے پہنے ہوئے تھے کیونکہ بند ہونے سے پہلے ہماری خوب اچھی طرح سے تلاشی لی گئی۔ آتے ہوئے ایک واقف نمبردار سے میں نے کہا تھا کہ میری چکی سے گرم اونی ٹوپی لا دے۔ اس نے وعدہ کیا مگر یہاں تو یہ حال ہوا کہ میری ٹوپی جو باہر سے آئی تھی وہ تو ایک طرف رہی، محترم رانا صاحب نے جو ٹوپی پہن رکھی تھی اسے بھی اُتروا کر ضبط کر لیا گیا اور رومال تک ہم سے لے لئے گئے۔ ہمارے ذاتی کپڑے بھی اُتروا کر قیدی کپڑے پہننے کو دیئے گئے اور وہ بھی پھٹے پرانے۔ شلوار پہنتے ہوئے اپنی شلوار سے ازار بند نکال کر اس قیدی شلوار میں ڈالنے لگے تو ہم سے ازار بند بھی چھین لئے گئے۔ ہم نے پوچھا کہ یہ کیا؟ تو جواب ملا کہ یہاں اس کی اجازت نہیں، شلوار اس کے بغیر ہی پہننی یعنی باندھنی ہوگی! چنانچہ خاموشی سے شلوار پہن کر اسے دھوتی کی طرح کمر پر باندھ لیا۔ ایسی شلوار کیسی لگتی ہے اور ایسے میں کیسی

گزرہوتی ہے، اس کا اندازہ گھر میں بیٹھے اس عمل میں سے گزر کر بآسانی کیا جاسکتا ہے، لیکن شاید ایسا ممکن نہ ہوسکے کیونکہ یہاں ہمیں سب سے لمبے سائز کی سخت زنگ آلود بیڑیاں بھی لگائی گئی تھیں اور گھر میں یہ سہولت میسر نہ آسکے! یہ سب کچھ قیدی کو ڈرانے دھمکانے، اس کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے بلکہ بری طرح کچلنے اور اس پر جیل کا خوف طاری کرکے اس حد تک حواس باختہ رکھنے کے لئے ہوتا کہ قیدی کو اپنی ہوش ہی نہ رہے اور وہ ظاہری و باطنی، ذہنی ونفسیاتی زنجیروں میں ہی جکڑا رہے اور وہ کم از کم جیل اِنتظامیہ کے لئے تو مسائل پیدا کرنے کے قابل نہ رہے۔

ہمارے پاس جو سویٹر تھے انہیں قمیص کے نیچے پہننے کی اجازت دی گئی جس سے سردی سے بچاؤ کی کچھ صورت بن گئی کیونکہ ابھی فروری کا وسط ہی تھا اور رات کو اچھی خاصی سردی ہوجاتی تھی۔ لیکن اس حالت میں آنے کے بعد میں نے سردی وردی کا خیال چھوڑ دیا اور 'ہر چہ باداباد' سے جسم اور روح کو گرمانے لگا۔ شام ہونے سے پہلے پہلے ہمیں کمبل مل گئے جن کی تعداد پونے چار تھی۔ کمبل دیکھے تو وہ دن یاد آ گیا جب ہم پہلی مرتبہ جیل میں آئے تھے اور یہیں 14 چکی میں بند کئے گئے تھے اور اسی قسم کے کمبل ملے تھے۔ چنانچہ حافظہ کو تازہ کرکے بستر تیار کیا۔ ایک طرف قریباً تین چار انچ چوڑا تکیہ بھی بنایا۔ دو کمبل اوپر لینے کے لئے اس طرح ترتیب دیئے کہ ان کی چوڑائی بھی اتنی ہوگئی کہ جسم کے اردگرد آجائے اور تہیں بھی دروازے کی طرف چار ہوں جبکہ دیوار کی طرف صرف دو تہیں ہوسکیں۔

اسی دوران ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جناب چوہدری سیف اللہ صاحب مع گارڈ تشریف لے آئے اور جنگلہ یعنی کمرے کے دروازے کے بالکل ساتھ لگ کر پہلے میرا پھر کمرے کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ فرش سے لے کر 'عرش' تک ہر چیز کا جائزہ لیا، دائیں بائیں آگے پیچھے ہر طرح تسلی کر لینے کے بعد واپس 'تشریف' لے گئے۔ مغرب کے قریب ہمیں برتن بھی دیئے گئے اور جیل کا کھانا بھی! ذرا تصور کیجئے کہ تھوڑی ہی دیر پہلے ساہیوال جماعت کے معروف دوست محترم میجر منظور احمد صاحب (مرحوم) کے گھر سے ان کے بیٹے برادرم زاہد منظور صاحب کی دعوت ولیمہ کا کھانا ہمارے لئے آیا تھا جو حسب معمول برادرم ملک نعیم الدین صاحب ابن مکرم ملک محمد دین صاحب لئے عین اُس وقت باہر کھڑے تھے جب ہمیں فیصلہ سنایا جارہا تھا اور اب تھوڑے سے وقفہ کی دیوار حائل ہونے کے بعد ہمیں وہ دال روٹی دی گئی جس کی اُس کھانے سے کوئی نسبت ہی نہ تھی، یہ دیوار بڑی ظالم دیوار تھی اور بہت سخت! لیکن چونکہ یہ دیوار ہمارے کسی جرم اور گناہ کے بغیر حائل کردی گئی تھی اس لئے ہمیں یہ کھانا بھی اچھا لگ رہا تھا اور بھوک کے مطابق میں نے کھایا بھی۔ پانی حسب سابق کمرے سے باہر دروازے کے سامنے پڑا تھا۔ وضو کیا اور نمازِ مغرب کی تیاری پکڑی۔ نماز پڑھی اور رانا صاحب سے رابطہ قائم کیا اور حال احوال پوچھا۔ رانا صاحب بھی خدا کے فضل سے ٹھیک ٹھاک تھے

اور استقامت کا مظہر 'سنائی' دیئے، ('سنائی دیئے' اس لئے کہ انہیں صرف سنا جاسکتا تھا، دیکھا نہیں جاسکتا تھا) علاوہ ازیں ابھی اردگرد واقفیت نہ تھی اس لئے کسی اور سے کوئی بات نہ ہوئی۔

### اللہ نے حوصلہ دیا

عشاء تک کا وقت بالکل فارغ تھا چنانچہ میں بستر پر لیٹا اور تازہ ترین صورت حال پر سوچنے لگا۔ میں نے مسکرا کر اپنے آپ سے پوچھا کہ یہ ہوا کیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے؟ ایک طرف تو چند ہفتے قبل دو ملزموں (چوہدری حفیظ صاحب اور چوہدری شاہد نصیر صاحب) کو بری کر کے اور آج ایک اور ملزم (مکرم چوہدری اسحق صاحب) کو بری کر کے اِستغاثہ کی کہانی کو مسترد کر رہے ہیں اور دوسری طرف باقی چھ کو Offence کا مرتکب قرار دے کر سزا سنا رہے ہیں۔ پھر رانا صاحب کو یہ سزا دے کر رانا صاحب کے اقبالِ جرم کو قبول کر رہے ہیں اور ساتھ ہی مجھے بھی ان کے ساتھ نتھی کر رہے ہیں۔ اگر اِستغاثہ کے مطابق مجھے ہی مجرم بنانا تھا تو رانا صاحب کو تو جانے دیتے کہ اِستغاثہ تو ان کے ہاتھ میں ڈنڈا بھی نہیں پکڑاتا، یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اِس بارہ میں سوچنا ہی بیکار ہے، انہوں نے جو کچھ کیا، وہ کرنا ہی تھا اور وہ کر گزرے ہیں۔ اس لئے ان باتوں کو چھوڑو اور اپنے آپ کو، اپنے جسم کو، اپنی روح، اپنے دل اور دماغ کو ان کی اگلی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرو۔ یقین جانئے کہ میں نے اپنے آپ کو ان کے ناپاک منصوبوں کے نتیجہ میں کسی بھی ابتلاء کے لئے پوری طرح سے تیار پایا۔ ایک دعا ضرور کی کہ اے اللہ! اس 'حالتِ انتظار' میں رہنا سخت تکلیف دہ ہے اس لئے تو کسی طرح اس تکلیف دہ صورت حال سے جلد نجات دے دے، تو نے اپنی جو بھی تقدیر ظاہر کرنی ہے جلد ظاہر کر دے، آمین۔

### اپنے پیاروں کا خیال

جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا، اللہ نے بہت حوصلہ دیا اور ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ اس فیصلہ کی طرف سے دل بالکل مطمئن ہو گیا، کوئی پرواہ نہ رہی کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اس طرح سے میں اپنے حوالہ سے تو سرخرو ہو کر اس سوچ سے نکل آیا مگر ذرا آگے بڑھا تو تفکرات کے ایک اور بہت بڑے سمندر سے واسطہ پڑ گیا جس نے دماغ کو چکرا کر رکھ دیا تو جسم کو بری طرح ہلا کر۔ سوچوں کی ایک ایسی تیز و تند لہر ذہن سے ٹکرائی کہ اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اِرتعاش سے ساری رات تھرتھراہٹ رہی۔ اور یہ اِس اچانک خیال کا نتیجہ تھا کہ میں تو جیسے بھی ہوا، یہاں وقت گزارتا رہوں گا اور جب تک اس حال میں رہا، اللہ بہر حال توفیق دے گا ہی، مگر اُن ایک کروڑ دلوں کا کیا حال ہوگا جو ہمارے لئے تڑپ تڑپ کر بے حال ہو رہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر پیارے آقا رحمہ اللہ تعالیٰ کے خونِ جگر ہونے کا

نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ تصور میرے لیے ناقابل بیان حد تک دردناک تھا۔ پھر رشتہ دار، عزیز اور دوست احباب ملاقات پر آیا کریں گے تو کیا وہ اسی طرح تکلیف دہ عمل میں سے گزرا کریں گے جس طرح ہم ایک عرصہ سے سزائے موت کے قیدیوں سے ملاقات کے لئے آنیوالوں کو ڈیوڑھی کے سامنے دیکھا کرتے تھے۔ ایک آدمی کی تو خیر ہوتی ہے مگر اب ہمارے اعزہ و اقرباء کو اس اذیت ناک عمل سے گزرنا پڑے گا۔ عجیب الٹ معاملہ ہو گیا تھا۔ اب تک تو ملاقات سے واپسی پر ہماری تلاشی ہوا کرتی تھی اور سب ملاقاتی باہر آزاد ہوتے مگر اب ملاقات کے لئے آنے پر انہیں تلاشی کے اذیت دہ عمل میں سے گزرنا ہوگا کیونکہ اب ملاقاتیوں نے جیل کے اندر آ کر ہمارے ساتھ ملاقات کرنی ہوگی۔ اس حوالہ سے خاص طور پر مستورات کے خیال نے تو بہت ہی پریشان کر دیا۔ غرضیکہ میں اپنی ذات اور وجود کی طرف سے بالکل ہلکا پھلکا ہو کر تصورات کی دنیا میں اپنے پیاروں کے دکھوں اور بیقراریوں اور بیتابیوں کے عالم میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اُڑتا رہا۔ میں نے اس دوران اگر کوئی دعا کی تو یہ کی کہ اے اللہ! تو نے اب جو کچھ دکھانا ہے جلد دِکھا دے، اس تکلیف دہ صورت حال میں زیادہ دیر نہ رکھیو، آمین۔

میں نے اپنے اس حکم نما فیصلہ پر غور کیا اور پھر مارشل لاء کے گذشتہ 8 سالہ دور کے فیصلوں پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالی تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس ظالم اور فرعون صفت حاکم وقت نے اس قسم کے جتنے بھی ظالمانہ اور بہیمانہ فیصلے کئے ان پر عمل درآمد بھی کرایا اور بعید نہیں ہے کہ اب بھی ایسا ہی کرے۔ اس پہلو پر غور کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک بار پھر کسی بھی صورتِ حال کے لئے تیار پایا اور اس فیصلہ پر عدم عمل درآمد کی ایک ہی امکانی صورت نظر آئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص نشان اور معجزانہ آپریشن کے ذریعہ پاکستان کو اس ظالم اور جابر سے ہی نجات دِلا دے، اس کے علاوہ مجھے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ اس نے تو بھٹو جیسے بڑے لیڈر کو بھی نہ چھوڑا تھا حالانکہ اس کے لئے تو چین جیسے ملک نے بھی اپیل کی تھی۔ اس کے مقابل پر میں میری کیا حیثیت ہے! لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ بھٹو کے متعلق تو خاص تقدیر الٰہی کام کر رہی تھی۔ بہرحال میں نے اس ضمن میں منفی خیالات کو زیادہ جگہ نہ دی بلکہ کمینہ دشمن کی کمینگی کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی اور یہ یقین پیدا کیا کہ خدا کی جو بھی تقدیر ہمارے حق میں ہوگی وہ خیر ہی خیر اور برکت ہی برکت ہوگی، انشاء اللہ العزیز۔

جب نمازِ عشاء پڑھ چکا تو میں نے اپنے آپ کو پوری طرح relax کر کے سونے کی تیاری کی۔ میں لیٹا ہی تھا کہ ایک ملازم آ گیا اور ازراہِ ہمدردی میرا حال احوال اور نام پتہ پوچھنے لگا۔ اسے فارغ کر کے میں پھر لیٹ گیا اور مختصر سے کمبل کو درست کرنے کے تفصیلی عمل میں سے گزرے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ کسی نے آ کر پھر آوازیں دینی

شروع کر دیں۔ میں نے پہلے تو چاہا کہ چپ سادھ کے لیٹا رہوں مگر وہ جانے کو نہ تھا۔ جب آوازوں سے مجھے اُٹھا نہ سکا تو اُس نے اپنی چھڑی زور زور سے زمین پر اس طرح مارنی شروع کر دی کہ میں کمبل سے اپنا منہ نکال کر پوچھنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا بات ہے بھئی! کیوں تنگ کرتے ہو تو اُس نے سلام دعا کے بعد چوہدری اسحق صاحب کے بارے میں معلومات لینی شروع کر دیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں وغیرہ۔ اُس کی باتوں سے اندازہ ہؤا کہ وہ انہیں مل کر مبارک باد دینا اور کچھ 'لینا' چاہتا تھا اور مجھے مفت میں آ کے تنگ کر رہا تھا۔

اُسے رخصت کر کے پھر سے کمبل اوڑھ کر لیٹا تو بہت دیر تک نیند نہ آئی اور جب کہیں آنے لگی تو عین اُس وقت ایک بلّی نے ٹھیک میرے کان پر اپنا منہ رکھ کر پورے زور سے 'میاؤں' کیا، لاحول ولاقوۃ، اس بلی کو بھی سوجھی تو کیا سوجھی، خیر یہ پہلی رات تو اسی طرح گزری۔ میں نے ایک دو مرتبہ ڈیوٹی پر موجود ملازموں سے وقت پوچھنے کی کوشش کی مگر کسی نے مجھے وقت بتانا مناسب نہ سمجھا اور یونہی ٹرخا کر چلے جاتے رہے۔ غرضیکہ اسی طرح اُٹھتے بیٹھتے اور پہلو بدلتے صبح کے آثار ظاہر ہونے لگے تو پھر اُٹھ ہی بیٹھا۔ اگرچہ رات کے آخری پہر کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے آنکھ لگی تھی تاہم مجموعی کیفیت بے قراری کی رہی یعنی سو نہ سکنے کی وجہ سے سر بھاری تھا اور جسم تھکا تھکا سا تھا۔ خیر اُٹھ کر وضو کا ارادہ کیا، ایک سال پہلے والی تاریخ دہرائی جانی تھی یعنی باہر پڑے گھڑے سے ڈُلو کے ساتھ یخ بستہ پانی لینا تھا۔ چنانچہ وضو کیا اور نماز پڑھ کر پھر بستر میں دبک گیا کیونکہ سردی بہت تھی اور اپنے پاس صرف ایک چھوٹے سویئٹر کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ناشتہ والے آ گئے، انہوں نے چائے دی اور ایک پراٹھا، معاف کیجئے گا! پراٹھے کے لفظ سے مغالطہ نہ ہو جائے، یہاں پراٹھے سے مراد گھی سے مکمل طور پر بے نیاز وہ عام روٹی ہے جو چائے کی پیالی والی پرچ کے رقبہ کے برابر ہوتی ہے اور صبح کے وقت چائے کے ساتھ تقسیم ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ یہ پراٹھا تنور میں لگی ہوئی باقی روٹیوں کی طرح کھانے کے قابل بھی ہو۔ خیر میں نے چائے لے لی اور ساتھ 'پراٹھا' بھی۔ پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اب تو بہر حال یہی پراٹھے کھانے پڑیں گے کیونکہ یہاں گھر کا کھانا اب کس نے آنے دینا ہے۔ پوری کوشش کر کے میں نے ناشتہ شروع کیا۔ آخیر پر جب اعداد و شمار اکھٹے ہوئے تو نصف پراٹھا ہی کھا سکا تھا جبکہ چائے پوری پینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

## ماحول کا جائزہ

دن چڑھا تو یہاں کے ماحول کا جائزہ لینے پر احساس ہوا کہ اب تو ہر کسی کی آنکھیں پھر چکی ہیں۔ کسی ملازم کو بلاتے تو وہ نہ آتا، کسی مشقتی کو کچھ کہتے تو وہ کہتا اچھا میں ابھی کام کر کے آتا ہوں۔ نمبردار کو کوئی بات کہتے تو وہ بڑی صفائی سے ٹرخا

جاتا اور اتنی صفائی سے کہ ہم بالکل مطمئن ہوتے کہ یہ ہمارے ساتھ مخلص ہے۔ مثلاً گذشتہ شب جب ہمیں بند کیا گیا تو متعلقہ افسر نے کہا تھا کہ انہیں پانچ پانچ کمبل دیئے جائیں لیکن مشقتی مجھے چار کمبل دے کر گیا جن میں سے بھی ایک پرانا ٹاٹ تھا۔ میں نے اُسی وقت پانچویں کمبل کے لئے کہا تو کہنے لگا اچھا میں ابھی جا کر ایک اور لاتا ہوں۔ وہ یہ کہہ کر چلا گیا اور پھر اگلے روز ہی آیا اور جب میں نے اسی یاددہانی کرائی تو وہ کوئی اور ہی بہانہ کر کے ٹرخا گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید یہ سلوک خاص طور پر ہمارے ساتھ ہے پھر پتہ چلا کہ ان دنوں 7 بلاک میں ویسے بھی بہت سختی کی ہوئی ہے اور اس سختی کا اظہار سزائے موت کے قیدیوں پر خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ اب یہاں چکیوں کے سامنے اپنے ٹین (یعنی صندوق) رکھنے کی بھی اجازت نہ تھی، ہر چیز سٹور میں جمع کروانی ہوتی اور چکی کے اندر کمبلوں کے علاوہ قیدی کو صرف ایک قیدی چادر اور ایک جوڑا (شلوار قمیص) رکھنے کی اجازت تھی۔ زائد جوڑا نہیں بلکہ وہی جو اس نے پہنا ہوتا۔

میں نے دن چڑھنے پر رانا صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ سلام دعا کی، حال چال پوچھا۔ موصوف اللہ کے فضل سے پوری طرح مستعد اور ہشاش بشاش تھے۔ پھر ایک دو قیدیوں نے بھی اِردگرد سے رابطہ قائم کیا۔ اُنہوں نے ہمارے گزشتہ مرتبہ 7 بلاک میں قیام کے حوالے سے تعارف کرا کر واقفیت بتائی اور حسب توفیق ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ پھر ایک دو ملازموں سے بات کی کہ مجھے شلوار میں ڈالنے کے لئے الاسٹک ہی لا دیں کیونکہ ہمارے لئے سب سے زیادہ مسئلہ یہی تھا کہ ہم شلوار کو کیسے سنبھالیں۔ میں نے اپنے ہمسایہ میں ایک پرانے قیدی سے پوچھا کہ تم لوگ کیا کرتے ہو تو اس نے بتایا کہ اس نے تو شلوار کو اوپر سے پتلون کی طرح بنایا ہوا ہے اور ٹچ بٹن لگائے ہوئے ہیں۔ جس ملازم سے الاسٹک کی بات کی تھی، اُس نے ہیڈوارڈر کے ساتھ جا کر کیا کہ فلاں قیدی الاسٹک مانگ رہا ہے۔ اس پر ہیڈوارڈر میرے پاس آیا اور مسئلہ حل کرنے کی بجائے یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا کہ تم شلوار میں الاسٹک بات کرتے ہو، تمہیں تو ابھی بیڑیاں بھی لگنی ہیں! اس کے چند منٹ بعد چابیوں کی جھنکار سنائی دی جس کے ساتھ ہی پہلے ہمارے ہاتھوں کو ہتھکڑیوں سے جکڑا گیا پھر دروازہ کھلنے پر باہر نکل کر 7 بلاک کے بیرونی دروازے کی طرف چلنے کو کہا گیا۔ میں بندھے ہاتھوں کے ساتھ دھوتی نما شلوار کو سنبھالتے ہوئے چل پڑا۔ میرے پیچھے ایک ملازم اور ایک نمبردار تھا۔ منزل مقصود پر پہنچ کر لوہار کے سامنے پیش کیا گیا اور اُس نے جیل کی سب سے تکلیف دہ بیڑی میرے ٹخنوں پر فٹ کردی جو طویل ترین ہونے کے ساتھ سخت زنگ آلود بھی تھیں۔ یہی سلوک مکرم رانا صاحب کے ساتھ بھی کیا گیا۔ یاد رہے کہ جیل میں تین قسم کی بیڑیاں ہوتی ہیں:

☆ ایک تو بالکل ہلکی قسم کی بیڑی جس کی لمبائی ڈیڑھ فٹ ہوتی ہوگی۔ یہ عام طور پر لمبی مدت کے لئے لگائی جاتی ہے۔

☆ دوسری درمیانی قسم کی بیڑی، جس کی لمبائی قریباً اڑھائی فٹ ہوتی ہوگی ۔ یہ ایسے قیدیوں کو بطور سزا لگائی جاتی ہے جو جیل میں چھوٹی موٹی شرارت یا 'گستاخی' کے مرتکب ہوں۔

☆ تیسری قسم کی بیڑی اتنی لمبی ہوتی ہے کہ پورے قد کے جوان کی بھی ناف تک آجاتی ہے اور چونکہ یہ خاص الخاص قیدیوں کے لئے ہوتی ہے اور کم کم استعمال ہوتی ہے اِسی لئے عموماً یہ سخت زنگ آلود ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ رواں نہیں ہوتی اور غیر معمولی تکلیف کا باعث بنتی ہے۔

اس موقع پر ہمیں یہی تیسری قسم کی بیڑی لگائی گئی۔ مجھے بیڑی لگائی جارہی تھی تو اتفاق سے ایک پاؤں کی ریبٹ ذرا سی ڈھیلی رہ گئی جسے دیکھ کر نمبردار نے بے چارے غریب لوہار کو ایسی ایسی سلواتیں سنائیں کہ اس کے بڑے بھی توبہ کر اُٹھے ہوں گے۔ جب بیڑی لگ چکی تو 'حکام' کی طرف سے معائنہ اور تسلی کے بعد مجھے واپس اپنی چکی کی طرف چلنے کا حکم ہُوا تو ابتدائی چند قدم اور لمحات بطور خاص اہم تھے۔ ایک طرف ازار بند کے بغیر شلوار کو سنبھالنا اور دوسری طرف خوفناک قسم کی بیڑی اُٹھا کر چلنا! ستم بالائے ستم یہ کہ ہاتھ بھی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے لیکن خدا شاہد ہے کہ محض اُسی کے فضل سے شکوہ کا خیال تک دل میں نہ آیا بلکہ دین محمد مصطفیٰ ﷺ کی خاطر یہ زیور پہننے پر اللہ کی شان کا نظارہ کرتے ہوئے درود شریف ہی پڑھتا رہا اور اس صورت حال کا غالبؔ کے اس شعر کو پڑھتے ہوئے اِستقبال کیا۔

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ۔۔۔ جی خوش ہُوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اِس بڑے سائز کی بیڑی نے یوں تو پہلے ہی لمحہ اپنا آپ بتانا شروع کر دیا تھا مگر نماز کے دوران تو اس نے اپنی اہمیت خوب جتلائی۔ سجدہ کرتے ہوئے بیڑی کی پوزیشن درست کرنے کے لئے ٹخنوں کے گرد اس کے حلقوں کو گھمایا تو ٹھوڑی پر ایک طاقتور نا گہانی ٹھوکر سے دماغ بُری طرح چکرا کر رہ گیا کیونکہ بیڑی کا اوپر والا سرا چہرہ تک پہنچا ہوا تھا۔ اس پر فیصلہ کیا کہ پیروں کی خیر ہے چہرہ کو بچایا جائے۔ اس قسم کے واقعات تو پھر معمول بن گئے اور جن کا میں عادی ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ سُنائے جانے سے پہلے خاکسار اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس طرح سے تیار کرتا رہتا تھا کہ اگر سزائیں سنائی جاتی ہیں تو میرا ردِّعمل گھبرانے یا پریشان ہونے کی بجائے بشاشت کے ساتھ اطمینان اور سکون کے اظہار کرنے کے ساتھ ہوگا اور دُشمن کو اس نظارہ کا موقع نہیں ملے گا کہ وہ ہمیں پریشاں حال دیکھ کر خوش ہو سکے بلکہ اس اعتبار سے اُسے حسرت کے ساتھ مایوسی کا ہی سامنا کرنا پڑے گا، انشاء اللہ العزیز۔

### فیصلہ کے بعد پہلی ملاقات اور حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کا پیغام

اُس روز دوپہر کا کھانا کھا کر کے لیٹا ہوا تھا کہ چکی کے سامنے کچھ ہل چل محسوس ہوئی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے اپنے

چوہدری ناصر سراء صاحب پر نظر پڑی اور اس کے ساتھ ہی مکرم ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب امیر جماعت ساہیوال، مکرم ملک غلام احمد صاحب، مکرم مرزا عبدالسمیع صاحب (مرحوم) اور مکرم شاہد نصیر باجوہ صاحب میری چکی کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ یہ سب احباب غیر معمولی محبت کے ساتھ ملے اور اپنے اپنے انداز میں ہماری ہمت بندھائی اور حوصلہ دلایا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے ہمارے حوصلوں کے دل بڑھاتے ہوئے صاحبزادہ بشیر اول کی وفات کے حوالہ سے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صبر کا نمونہ یاد کرایا اور حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کے اُس خط کا ذکر کیا جو آپ نے افغانستان میں احباب جماعت کی شہادتوں کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی تحریک کہ 'احمدی نوجوان وہاں تبلیغ کی خاطر جانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کریں' پر لبیک کہتے ہوئے لکھا تھا۔ یوں تو سبھی احباب بڑی جذباتی حالت میں تھے مگر اِس تاریخی ملاقات میں ایک موقع ایسا بھی آیا جب سارے بند ٹوٹ گئے اور جذبات کا سیلاب طوفان بن کر کچھ اس طرح اُمڈ آیا کہ پھر کسی کو بھی اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ وہ لمحہ اُس وقت آیا جب میں نے حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں پوچھا تو کسی نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر مجھے تھماتے ہوئے بتایا کہ رات میاں عاشق صاحب کی حضور سے بات ہوئی تھی۔ حضور کو اس فون سے پہلے ہی فیصلہ کی اطلاع ہو چکی تھی چنانچہ حضور نے آپ سب کے لئے یہ پیغام لکھوایا ہے، اُس پیغام کے الفاظ کیا تھے، اِنتہائی طاقتور برقی رَواُن میں پنہاں تھی جنہیں پڑھتے ہی جذبات کے سب بندھن ٹوٹ گئے۔ یوں لگا کہ ان الفاظ کے لبادہ میں خود حضور رحمہ اللہ تشریف لے آئے ہیں۔ اِنتہائی غم کے وقت بھی اور اِنتہائی دکھ اور درد کے جذبات کی حالت میں بھی آپ پورے اعتماد اور جلال کے ساتھ کفر کی سازشوں سے قطعاً بے پرواہ ہو کر ہمیں فرما رہے ہیں:

'ہمت نہیں ہارنی، ساری دنیا میں دعا کے لئے اعلان کر دیا گیا ہے، قانونی لحاظ سے ہر ممکن تدبیر کی جائے گی'

یہاں تک تو بآسانی پڑھ لیا مگر آخری حصہ نے بہت بے چین کیا اور بہت تڑپایا جس میں لکھا تھا:

'انہیں میرا محبت بھرا اسلام کہیں، انہیں میرا محبت بھرا اسلام کہیں، انہیں میرا محبت بھرا اسلام کہیں'

حضور کا درد اور کرب سے تڑپتا ہوا وجود آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ان فقرات سے حضور کے آہ و فغاں کا شور کانوں میں گونج اُٹھا۔ پہلے دن سے اب تک کے عرصہ میں یہی وہ لمحہ تھا جب میرے اَعصاب نے کسی کی موجودگی میں جواب دے دیا چونکہ میں بھی ان جذبات کو کافی دیر سے دبائے ہوئے تھا، اب جو ایک دفعہ میرا ضبط ختم ہوا تو جو کیفیت ہوئی بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد احباب پر بھی جذباتی کیفیت غالب آ گئی۔ اس طرح سے وہاں کے در و دیوار نے ایک ایسا نظارہ دیکھا کہ اس سے پہلے اس ماحول میں ایسا نظارہ کبھی بھی دیکھنے میں نہ آیا ہو گا۔

☆دوسری درمیانی قسم کی بیڑی، جس کی لمبائی قریباً اڑھائی فٹ ہوتی ہوگی۔ یہ ایسے قیدیوں کو بطور سزا لگائی جاتی ہے جو جیل میں چھوٹی موٹی شرارت یا 'گستاخی' کے مرتکب ہوں۔

☆تیسری قسم کی بیڑی اتنی لمبی ہوتی ہے کہ پورے قد کے جوان کی بھی ناف تک آجاتی ہے اور چونکہ یہ خاص الخاص قیدیوں کے لئے ہوتی ہے اور کم کم استعمال ہوتی ہے اسی لئے عموماً یہ سخت زنگ آلود ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ رواں نہیں ہوتی اور غیر معمولی تکلیف کا باعث بنتی ہے۔

اس موقع پر ہمیں یہی تیسری قسم کی بیڑی لگائی گئی۔ مجھے بیڑی لگائی جارہی تھی تو اتفاق سے ایک پاؤں کی ربٹ ذرا سی ڈھیلی رہ گئی جسے دیکھ کر نمبردار نے بے چارے غریب لوہار کو ایسی ایسی سلواتیں سنائیں کہ اس کے بڑے بھی تو بہ کر اُٹھے ہوں گے۔ جب بیڑی لگ چکی تو 'حکام' کی طرف سے معائنہ اور تسلی کے بعد مجھے واپس اپنی چکی کی طرف چلنے کا حکم ہوا تو ابتدائی چند قدم اور لمحات بطور خاص اہم تھے۔ ایک طرف ازار بند کے بغیر شلوار کو سنبھالنا اور دوسری طرف خوفناک قسم کی بیڑی اُٹھا کر چلنا! ستم بالائے ستم یہ کہ ہاتھ بھی ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے لیکن خدا شاہد ہے کہ محض اُسی کے فضل سے شکوہ کا خیال تک دل میں نہ آیا بلکہ دین محمد مصطفی ﷺ کی خاطر یہ زیور پہننے پر اللہ کی شان کا نظارہ کرتے ہوئے درود شریف ہی پڑھتا رہا اور اس صورت حال کا غالبؔ کے اس شعر کو پڑھتے ہوئے اِستقبال کیا ؎

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں      جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اِس بڑے سائز کی بیڑی نے یوں تو پہلے ہی لحہ اپنا آپ بتانا شروع کر دیا تھا مگر نماز کے دوران تو اس نے اپنی اہمیت خوب جتلائی۔ سجدہ کرتے ہوئے بیڑی کی پوزیشن درست کرنے کے لئے ٹخنوں کے گرد اس کے حلقوں کو گھمایا تو ٹھوڑی پر ایک طاقتور ناگہانی ٹھوکر سے دماغ بُری طرح چکرا کر رہ گیا کیونکہ بیڑی کا اوپر والا سرا چہرہ تک پہنچا ہوا تھا۔ اس پر فیصلہ کیا کہ پیروں کی خیر ہے چہرہ کو بچایا جائے۔ اس قسم کے واقعات تو پھر معمول بن گئے اور جن کا میں عادی ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ سنائے جانے سے پہلے خاکسار اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس طرح سے تیار کرتا رہتا تھا کہ اگر سزائیں سنائی جاتی ہیں تو میرا ردعمل گھبرانے یا پریشان ہونے کی بجائے بشاشت کے ساتھ اطمینان اور سکون کے اظہار کرنے کے ساتھ ہوگا اور دُشمن کو اس نظارہ کا موقع نہیں ملے گا کہ وہ ہمیں پریشاں حال دیکھ کر خوش ہو سکے بلکہ اس اعتبار سے اُسے حسرت کے ساتھ مایوسی کا ہی سامنا کرنا پڑے گا، انشاء اللہ العزیز۔

### فیصلہ کے بعد پہلی ملاقات اور حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کا پیغام

اُس روز دوپہر کا کھانا کھا کر کے لیٹا ہوا تھا کہ چکی کے سامنے کچھ ہل چل محسوس ہوئی۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے اپنے

چوہدری ناصر سراء صاحب پر نظر پڑی اور اس کے ساتھ ہی مکرم ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب امیر جماعت ساہیوال، مکرم ملک غلام احمد صاحب، مکرم مرزا عبدالسمیع صاحب (مرحوم) اور مکرم شاہد نصیر باجوہ صاحب میری چکی کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ یہ سب احباب غیر معمولی محبت کے ساتھ ملے اور اپنے اپنے انداز میں ہماری ہمت بندھائی اور حوصلہ دلایا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے ہمارے حوصلوں کے دل بڑھاتے ہوئے صاحبزادہ بشیر اول کی وفات کے حوالہ سے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صبر کا نمونہ یاد کرایا اور حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کے اُس خط کا ذکر کیا جو آپ نے افغانستان میں احباب جماعت کی شہادتوں کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی تحریک کہ احمدی نوجوان وہاں تبلیغ کی خاطر جانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کریں' پر لبیک کہتے ہوئے لکھا تھا۔ یوں تو بھی احباب بڑی جذباتی حالت میں تھے مگر اِس تاریخی ملاقات میں ایک موقع ایسا بھی آیا جب سارے بند ٹوٹ گئے اور جذبات کا سیلاب طوفان بن کر کچھ اس طرح اُمڈ آیا کہ پھر کسی کو بھی اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ وہ لمحہ اُس وقت آیا جب میں نے حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں پوچھا تو کسی نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر مجھے تھماتے ہوئے بتایا کہ رات میاں عاشق صاحب کی حضور سے بات ہوئی تھی۔ حضور کو اس فون سے پہلے ہی فیصلہ کی اطلاع ہو چکی تھی چنانچہ حضور نے آپ سب کے لئے یہ پیغام لکھوایا ہے، اُس پیغام کے الفاظ کیا تھے، اِنتہائی طاقتور برقی رواُن میں پنہاں تھی جنہیں پڑھتے ہی جذبات کے سب بندھن ٹوٹ گئے۔ یوں لگا کہ ان الفاظ کے لبادہ میں خود حضور رحمہ اللہ تشریف لے آئے ہیں۔ انتہائی غم کے وقت بھی اور اِنتہائی دکھ اور درد کے جذبات کی حالت میں بھی آپ پورے اعتماد اور جلال کے ساتھ کفر کی سازشوں سے قطعاً بے پرواہ ہو کر ہمیں فرما رہے ہیں:

'ہمت نہیں ہارنی، ساری دنیا میں دعا کے لئے اعلان کر دیا گیا ہے، قانونی لحاظ سے ہر ممکن تدبیر کی جائے گی'

یہاں تک تو با آسانی پڑھ لیا مگر آخری حصہ نے بہت بے چین کیا اور بہت تڑپایا جس میں لکھا تھا:

'انہیں میرا محبت بھرا اسلام کہیں، انہیں میرا محبت بھرا اسلام کہیں، انہیں میرا محبت بھرا اسلام کہیں'

حضورؒ کا درد اور کرب سے تڑپتا ہوا وجود آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ ان فقرات سے حضور کے آہ و فغاں کا شور کانوں میں گونج اُٹھا۔ پہلے دن سے اب تک کے عرصہ میں یہی وہ لمحہ تھا جب میرے اَعصاب نے کسی کی موجودگی میں جواب دے دیا چونکہ میں بھی ان جذبات کو کافی دیر سے دبائے ہوئے تھا، اب جو ایک دفعہ میرا ضبط ختم ہوا تو جو کیفیت ہوئی بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد احباب پر بھی جذباتی کیفیت غالب آ گئی۔ اس طرح سے وہاں کے در و دیوار نے ایک ایسا نظارہ دیکھا کہ اس سے پہلے اس ماحول میں ایسا نظارہ کبھی بھی دیکھنے میں نہ آیا ہوگا۔

اسی ملاقات کے دوران محترم ملک غلام احمد صاحب نے مجھ سے ایک وکالت نامہ اور ایک ٹائپ شدہ درخواست پر انگوٹھے لگانے کو کہا۔ اس وقت تک مجھے یہی علم تھا کہ اب صرف رحم کی درخواست ہو سکتی ہے جس کے متعلق خاکسار پہلے ہی تہیہ کر چکا تھا کہ یہ کام کسی صورت میں بھی نہیں کرنا! چنانچہ جب ملک صاحب نے مجھے اس درخواست پر انگوٹھا لگانے کو کہا تو میں نے یہ خیال کر کے کہ رحم کی درخواست پر انگوٹھا لگوا رہے ہیں اُس پر انگوٹھا لگانے سے صاف انکار کر دیا۔ اِس پر محترم ملک صاحب نے بتایا کہ یہ رحم کی درخواست نہیں ہے بلکہ ہم نظر ثانی کے لئے پٹیشن دائر کر رہے ہیں کہ یہ فیصلہ قطعاً غلط ہوا ہے اس لئے اس پر از سرِ نو غور کر کے انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے۔ اِس وضاحت کے بعد خاکسار نے دونوں درخواستوں پر اپنے انگوٹھے کے نشان ثبت کر دیئے۔

میرے یہ ملاقاتی جو پہلے کبھی یہاں نہ آئے تھے چکی کے اندر جھانک جھانک کر غور سے دیکھتے رہے۔ کبھی میرے بستر کو اور کبھی میری بیڑی کو دیکھ دیکھ کر اظہار ہمدردی کرتے رہے۔ میں خود ان کے لئے مجسم عجوبہ بنا ہوا تھا کیونکہ منہ ہاتھ دھونے کا موقع ملا تھا نہ ہی جیل انتظامیہ کی طرف سے دیئے گئے قیدی کپڑے تبدیل درست کر سکا تھا اور سر کے بال تو مجھے پورا پورا 'اَشْعَثَ اَغْبَرَ' بنائے ہوئے تھے۔ بہر حال اِسی دوران اعلان ہوا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے جس پر محترم امیر صاحب نے اِجتماعی دعا کرائی اور سب احباب واپس تشریف لے گئے۔ ملاقات ختم ہوئی تو میں بستر پر آ کر لیٹ گیا اور حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو یاد کرنے لگا۔ اس اولوالعزم خلیفہ کی اولوالعزمی کو یاد کر کے اس پر قربان ہونے لگا کہ ایسے نازک موقع پر بھی کس ہمت اور حوصلہ والا پیغام اِرسال کیا ہے۔ ایک طرف تو اس پیغام سے ہماری حالت بہت جذباتی ہوئی تو دوسری طرف یہ ہمارے لئے حیاتِ تازہ کا پیغام تھا۔ ہاں موت کی خوفناک وادی میں پورے جوش کے ساتھ زندگی کی پھوٹتی ہوئی کرنیں تھیں اس پیغام میں، ہم مرے پڑے تھے لیکن اس زندگی بخش پیغام نے ہمیں اُٹھا کر کھڑا کر دیا اور ہمیں ایک نیا عزم، نیا جوش اور نیا ولولہ عطا کیا۔ یہی وہ عظیم الشان لمحہ تھا جس میں خلافت کی برکات، خلافت کی عظمت اور شان دِل و دماغ بلکہ سارے جسم میں سرایت کر گئی۔ یہ پیغام بجلی بن کر چمکا اور ہر قسم کی ممکنہ مایوسیوں کو بھی دور کر گیا، فالحمدللہ رب العالمین۔

**ایک دفعہ پھر ملاحظہ!**

دو دِن کے بعد ''ملاحظہ'' کے لئے حکم ہوا یعنی ہمیں سزا کا فیصلہ سنائے جانے کے بعد ایک قیدی کی حیثیت سے جیل کی زندگی کے آغاز پر سپرنٹنڈنٹ جیل کے سامنے پیش کیا جانا تھا جیسا کہ ذکر گزر چکا ہے کہ جیل میں نئے آنے والے ہر حوالاتی اور قیدی کو اس مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ صبح ہی صبح ہمیں تیار کر کے یعنی ہتھکڑیاں لگا کر چکی سے نکال لیا

گیا اور ہم دونوں (رانا نعیم الدین صاحب اور خاکسار) بندھے ہاتھوں اور جکڑے پیروں کے ساتھ شلواروں کو دھوتیوں کی طرح گرہیں لگائے خصوصی نگرانی میں ڈیوڑھی کی طرف جانے والی سیدھی سڑک پر روانہ ہوئے اور دیکھنے والوں کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہوئے ڈیوڑھی کے پہلو میں اُس جگہ پہنچے جہاں ملاحظہ ہوا کرتا تھا۔ راستہ میں ملنے والے واقف کار قیدی ہم سے اظہار افسوس و ہمدردی بھی کرتے رہے۔ منزل پر پہنچے تو دیکھا کہ ہسپتال کے عقبی دروازہ کے سامنے والے پلاٹ میں نیا ملاحظہ تیاری پکڑ رہا تھا یعنی ایسے قیدی و حوالاتی تیار ہو رہے تھے جنہیں ملاحظہ کے لئے پیش کیا جانا تھا۔ اُدھر گئے تو ہمارے دیگر چاروں ساتھی اسیرانِ راہ مولا بھی اپنی چوکڑی بنائے کھڑے تھے۔ وہ ہمارے ہی منتظر تھے اور ہم پر نظر پڑتے ہی بے اختیار ہماری طرف لپکے مگر پہلی نظر میں انہیں پہچاننا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ وہ قیدی لباس میں پہلی دفعہ نظر آئے تھے اور یہ لباس بھی بڑا 'شاہی' قسم کا تھا، ایسا 'شاہی' کہ جس میں انسان کا حدودِ اربعہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس موقع پر ہم آپس میں خوب اچھی طرح ملے، قریباً سب کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ہم وہاں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے اور اپنی اپنی آپ بیتی سنانے لگے کہ کیسے یہ دوراتیں گزریں۔ سزا سنائے جانے کے بعد اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی جو بمقام و موقع 'ملاحظہ شریف' ہوئی۔

## ساتھیوں کے تأثرات!

اس پہلی باہمی ملاقات کے موقع پر بھی نے اس بہیمانہ حکم نما فیصلہ پر اپنے تأثرات مسکراتے ہوئے ایسے طور پر بیان کئے جیسے ہر ایک کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو کہ یہ ہماری زندگیوں سے کھیلا جانے والا کھیل نہیں بلکہ کھلونا ہو۔ ملک صاحب بتانے لگے کہ جب مجھے 25 سال قید کا حکم سنایا تو میرا دل بے اختیار مسکرایا اور اس نے کہا کہ اتنی تو میری عمر بھی نہیں ہے جتنی یہ سزا سنا رہے ہیں۔ (یاد رہے کہ محترم ملک صاحب کی عمر اُس وقت قریباً 75 سال تھی اور ان کی یہ بات واقعۃً درست ہی نکلی کیونکہ دورانِ اسیری ہی محترم ملک صاحب کی وفات ہوگئی اور آپ شہید احمدیت کا اعزاز پا گئے) برادرم حاذق صاحب کہتے ہیں کہ ان کی زبان سے بھی بے اختیار 'الحمد للہ' نکلا۔ اور سنائی جانے والی سزا کے ہر فقرہ کے بعد وہ یہی کہتے رہے کہ اچھا اور...... اچھا اور! غرضیکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے سب ساتھی پوری طرح حوصلہ میں تھے۔ کسی حد تک پریشانی ایک فطری عمل ہے مگر مجموعی طور پر سب کا مورال بلند تھا۔ مایوسی کی کیفیت ذرہ برابر بھی نہ تھی بلکہ دین اسلام کی خاطر اس قربانی کو قبول کرنے کے لئے ہر ایک کا دل اُچھلتا ہوا محسوس ہوا، کسی کی زبان پر گلہ یا شکوہ کا نام تک نہ تھا۔ ثابت قدمی اور استقامت میں سب اعلیٰ معیار پر تھے اور ہر کوئی اِس سزا کو دین کی راہ میں قربانی کے جذبہ کے ساتھ قبول کر کے برداشت کرنے کے لئے تیار تھا۔ حکومت وقت کی اس سراسر ظالمانہ کارروائی اور انصاف کا خون

کرنے پر سب اپنے اپنے انداز میں دل کا غبار تو نکال رہے تھے مگر ساتھ ہی راہِ مولیٰ میں اسیری کی اس عظیم سعادت پر ہر ایک کا سر فخر سے بلند تھا، کسی کو دیگر قیدیوں کی طرح شرمندگی یا ندامت نہ تھی بلکہ ہر ایک کا ضمیر مطمئن تھا اور یہی ہمارا زادِ راہ تھا جس نے کبھی ہمیں کمزور نہ ہونے دیا، الحمد للہ۔ اس فیصلہ نے جماعت احمدیہ کی صداقت کو بھی ایک مرتبہ پھر کھول کر رکھ دیا تھا اور یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ ہمارے مخالفوں کے پاس دلائل کی قوت اور برہان کی طاقت نہیں، تبھی تو اس قسم کے ظالمانہ فیصلوں اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آئے ہیں۔

## 7 بلاک اور بیڑیوں سے نجات!

ملاحظہ کے لئے موقع ملاحظہ پر پہنچ تو ہم صبح ہی گئے تھے مگر یہاں اِنتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی گئیں اور اس طوالت کا فائدہ ہم باہمی ملاقات کی صورت میں اُٹھاتے رہے۔ بالآخر ہمیں ہمارے قیدی ٹکٹ (جیل سروس بک) دیئے گئے۔ ان پر لکھا تھا کہ آج بعد ملاحظہ ہماری گنتی سزائے موت کے عام وارڈ میں ڈال دی جائے گی۔ ٹکٹ کے مطابق میری گنتی وارڈ نمبر 1 میں اور رانا صاحب کی وارڈ نمبر 3 میں ڈالی گئی تھی۔ صاحب بہادر کے آنے کا وقت ہوا تو ہمیں بھی ملاحظہ کے کٹہرے میں کھڑا ہونے کا حکم ملا اور جس کے آداب کے مطابق زائد کپڑوں (چادر وغیرہ) کے ساتھ ہمارے جوتے بھی اُتروالئے گئے اور سخت سردی میں نہتہ کر کے اُس قطار میں کھڑے کر دیئے گئے جس میں ہمارے چاروں ساتھی پہلے سے کھڑے تھے۔ دس بجے کے قریب اِنتظار کی گھڑیوں کے ختم ہونے کا اعلان ڈیوڑھی کے دروازے کھلنے سے ہوا جس کے ساتھ ہی پریڈ، گارڈ اور ملاحظہ ہوشیار ہو گیا۔ ہوشیار کیا ہوا حاضرین ملاحظہ کو رعب اور خوف کے شکنجوں میں بُری طرح کس دیا گیا، ہر ایک کا سانس رُکا ہوا تھا اور رنگ اُڑا ہوا! جب میری باری آئی تو صاحب بہادر کو میں نے دیکھا کہ وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ہمارے کوائف دیکھنے کے بعد انہوں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ ان کی بیڑیاں اُتار دیں۔ وہ کہنے لگے: سر! ابھی کل ہی تو لگی ہیں۔ اس پر صاحب کو میں نے ذرا سختی سے کہتے ہوئے سنا کہ 'نہیں ابھی اُتار دیں'۔ چنانچہ اُسی روز ہماری بیڑیاں اُتار دی گئیں اور ہمیں 7 بلاک سے سزائے موت کے عام وارڈ میں بھی منتقل کر دیا گیا، الحمد للہ۔

## سزائے موت کا عام وارڈ

ملاحظہ کے بعد پہلے تو ہمیں 7 بلاک ہی لے جایا گیا اور دفتری کارروائی مکمل ہونے کے بعد 'آزادی کا پروانہ' آنے پر ہمیں یہاں سے سزائے موت کے عام وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ وارڈ جیل کے سنٹر سیکشن میں واقع تھی جہاں عام قیدی بڑی بڑی بارکوں میں اور سزائے موت یا بعض مخصوص نوعیت کے قیدی وسیع پیمانہ پر بنی ہوئی چکیوں (چھوٹے چھوٹے

کمروں) پر مشتمل وارڈز میں رکھے جاتے تھے۔ ہم یہاں لائے گئے تو دیکھا کہ اس جگہ باقی جیل کی نسبت غیر معمولی خوف کا ماحول تھا اور ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ انسان تو ایک طرف کسی پرندے کی بھی مجال نہ تھی کہ وہ نظر آتا۔ ساری وارڈ بند پڑی تھی، صرف اِکا دُکا قیدی (مشقتی) کام کرتے دکھائی دیئے جس کی وجہ سے ظاہری طور پر مکمل صفائی تھی۔ یہ پُراسرار ماحول دیکھ کر پہلے تو حیرانی ہوئی کیونکہ اس کے متعلق مجھے 7 بلاک کے ایک قیدی نے بتایا تھا کہ وہ جگہ تو 7 بلاک کی نسبت لاہور ہے لاہور! یہ تاثر پہلے تو زائل ہو گیا مگر جلد ہی اُس وقت دوبارہ قائم ہو گیا جب یہ علم ہوا کہ اس جگہ شلوار میں ازار بند ڈالنے کی اجازت ہو گی۔ یہ سن کر میرا دِل بلیوں اچھل پڑا کیونکہ میرے لئے اب تک یہ بہت بڑا مسئلہ بنا ہوا تھا۔

یہاں لا کر ابتداءً رانا صاحب کو وارڈ نمبر 3 جبکہ خاکسار کو وارڈ نمبر 1 میں رکھا گیا اور مجھے ڈیوٹی پر موجود ہیڈ وارڈر نے میرے کہنے پر میرے ایک واقف جسے یہاں 'تایا غلام نبی' کہتے تھے، کے ساتھ چکی نمبر 23 میں بند کر دیا جہاں اُس کے ساتھ دو اُور بھی قیدی بند تھے۔ تایا غلام نبی ایک غریب موچی تھا جسے میں کسی کے کہنے پر دورانِ حوالات بھی ملنے یہاں آیا کرتا تھا اور ایک دفعہ اُسے ملنے آیا تو میں نے اُسے یہ کہا بھی تھا کہ

'جس طرح میرا سفر جاری ہے، لگتا ہے میں بھی یہاں آنے والا ہوں'

میں نے چکی میں داخل ہوتے ہی اسے یہ بات یاد دلائی اور اس سے 'ازار کش' مانگا۔ اس نے جھٹ سے ایک پُراسرار قسم کی تھیلی کا منہ کھولا اور ایک چھوٹی سی ازار کش نکال کر دے دیا۔ میں نے فوراً چادر باندھی اور شلوار میں ازار بند ڈال کر شلوار پہنی تو یوں لگا جیسے دُنیا میں واپس آ گیا ہوں! اس کے بعد میں اِن قیدیوں کے درمیان بیٹھ گیا اور سبھی میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرنے لگے۔ اِسی دوران تایا غلام نبی نے بات کاٹتے ہوئے بڑے جوش سے پنجابی میں یہ یادگار الفاظ کہے:

اوئے میں تینوں اِک گل دس دیاں جے تیری وَدھی ہوئی اے تے باہر جاویں ایں جاویں، جے نہیں تے فیر کوئی طاقت نہیں بچاندی! (یعنی میں تجھے ایک بات بتا دوں کہ اگر تیری عمر ہے تو ہر قیمت پر رہا ہو گے اور اگر نہیں تو پھر کوئی طاقت تمہیں بچا نہ سکے گی)

انہوں نے یہ بات بڑے اعتماد، جرأت اور سچائی سے کہی، عام طور پر ایسے نازک وقت میں ایسی باتیں بھی مصلحت اور احتیاط کے ساتھ کی جاتی ہیں مگر تایا غلام نبی کسی قسم کی جھوٹی اُمید دلانا نہیں چاہتے تھے۔ اِنہی باتوں کے دوران ساتھیوں نے مجھ سے میرے مقدمہ کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا جس پر میں نے کہا کہ جناب سب سے پہلے تو

واضح کردوں کہ میں اللہ کے فضل سے احمدی ہوں۔ اس پر ایک ساتھی تو فوراً ہی منہ بسور کر ایک طرف ہو گئے اور وضو کر کے نماز شروع کر دی۔ اس پر میں نے تو نماز میں خلل کے خیال سے خاموشی اختیار کی مگر دوسرے قیدیوں کو ایسا کوئی شعور نہ تھا اور وہ آپس میں مسلسل باتیں کرتے رہے۔

## رشتہ داروں سے پہلی ملاقات

مجھے یہاں پہنچے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور میں اِن ساتھی قیدیوں سے ابھی متعارف ہی ہو رہا تھا کہ کسی نے دروازے کے سامنے آ کر آواز دی:

'الیاس کون ہے؟ تیار ہو جائے، اُس کی ملاقات آئی ہے'

میں نے فوری طور پر اپنی حالت تھوڑی بہت درست کرنے کی کوشش کی اور دروازہ کھلنے پر باہر نکلا تو دیکھا کہ چند اَور قیدی بھی نکالے گئے ہیں پتہ چلا کہ ان کی بھی ملاقات آئی تھی۔ پھر ان قیدیوں کے ساتھ مجھے بھی ہتھکڑی لگائی گئی اور 'کنڈم وارڈ' کی طرف چلنے کو کہا گیا۔ (یاد رہے کہ کنڈم وارڈ دراصل وارڈ نمبر 2 تھی جو نمبر 1 اور 3 کے درمیان میں تھی اور پرانی اور خستہ ہو جانے کی وجہ سے متروک تھی اور کنڈم وارڈ کہلاتی تھی اور قیدیوں کے رکھے جانے کے لئے استعمال نہ ہوتی تھی تاہم ملاقات جیسے عارضی کام اس سے لئے جاتے تھے۔ جن قیدیوں کی ملاقات ہوتی انہیں لا کر یہاں بند کر دیا جاتا اور ان کے ملاقاتی چکیوں کے سامنے آ کر بیٹھ جاتے) بہر حال ملاقات کے لئے ہمیں اِس متروک وارڈ کے ایک ایک کمرے میں بند کر دیا گیا یعنی اِس کمرے کا آہنی سلاخوں والا قریباً ایک میٹر چوڑا دروازہ ہمارے اور ملاقاتیوں کے درمیان حائل ہوگا۔ اسی دوران دوسرے وارڈ سے مکرم رانا صاحب کو بھی لا کر میرے ساتھ ایک ہی کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہم سب اپنے اپنے ملاقاتیوں کا انتظار کرنے لگے۔ اِس نئے ماحول میں ملاقات کا عجیب نظارہ تھا۔ خیر کافی دیر کے بعد لوگوں کے آنے کی آوازیں سنائی دیں جس کے ساتھ ہی کمروں کے سامنے والے برآمدے میں لوگوں کو فکر مندی کے بوجھ تلے دبے ہوئے گزرتے دیکھا۔ ہر کوئی جلدی میں تھا اور دروازے سے جھانک کر اندر دیکھتا کہ ہمارا آدمی یہاں تو نہیں ہے۔ ہر کسی نے کچھ نہ کچھ اُٹھایا ہوا تھا، کسی کے ہاتھ میں تھیلا تھا تو کسی کے سر پہ گٹھڑی! بے بسی کے عالم میں عورتیں بھی گزر رہی تھیں اور معصوم بچے بھی۔ بعض بوڑھے سوٹے کا سہارا لئے اپنی روزنِ زنداں آنکھوں سے اپنے جواں سال بیٹوں کو تلاش کر رہے تھے۔ بس اسی دوران ہماری چکی کے دروازے کے سامنے بھی رونق لگ گئی۔ ایک دو تین چار پتہ نہیں کتنے ہی دوست احباب اعزہ و اقرباء یک دم جمع ہو گئے جن میں بچے بوڑھے سبھی شامل تھے اور ہر ایک کی کیفیت نا قابل بیان تھی۔ ہم اپنے جذبات پر بہت قابو رکھے

ہوئے تھے مگر پھر بھی جب ملاقاتیوں کی طرف دیکھتے تو کیفیت کسی قدر بدل جاتی تاہم مجموعی طور پر صورت حال قابو میں رہی۔ اس ملاقات میں بڑی امی جان (یعنی نانی جان) بھی گوجرانوالہ سے آئی ہوئی تھیں۔ ان کی حالت بہت ہی خراب ہوئی جارہی تھی۔ عمر کا تقاضا پھر اس بڑھاپے میں بیماری اور اوپر سے یہ دل دہلا دینے والی خبر! اس ملاقات میں پنجاب میں موجود رشتہ داروں کے قریباً تمام نمائندے تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس موقع پر کوئی ہمیں تسلی دے رہا تھا، کوئی ہمارا حال پوچھ رہا تھا تو کوئی ہماری حالت یعنی کپڑے اور بالوں وغیرہ کو دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا جبکہ جواب میں ہم ہر ایک کو تسلی دیتے رہے۔ امی جان نے بتایا کہ دو تین دن پہلے تمہیں خواب میں ایسے ہی پھٹے ہوئے کپڑوں میں دیکھا تھا اور ان کا رنگ بھی انہی کپڑوں جیسا تھا۔

نہایت درجہ درد اور کرب اور سوز و گداز کے ماحول میں قریباً آدھ گھنٹہ کی ہماری یہ پہلی ملاقات ہوئی۔ آخر پر ہم سب نے اجتماعی دعا کی۔ وداع کا یہ نظارہ بھی بڑا پُر درد تھا، کسی ملاقاتی کا واپس جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ہر کوئی واپس مُڑ مُڑ کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر سلام کر رہا تھا لیکن آخر کب تک! چند لمحوں میں سارے ملاقاتیوں کو جیل کے عملہ نے باہر بھیج دیا اور یہاں چکیوں میں بند صرف ہم قیدی ہی رہ گئے! آج چونکہ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں بند ہوئے تھے۔ اس لئے ہم دونوں کے رشتہ دار اور ملاقاتی سب ایک ہی برآمدے میں تھے اور ایک ہی دروازے سے ملاقات کر رہے تھے۔ اس وجہ سے ہمیں بات کرنے میں ویسی ہی دقت ہوتی رہی جیسی ایک ہی وقت میں کئی ریڈیو سٹیشن لگے ہوں تو بات سننے اور سمجھنے میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ الگ الگ مگر ساتھ ساتھ کی چکیوں میں بند ہوا کریں گے تا کہ کسی کو بھی بات کرنے سننے میں دقت نہ ہو۔

### سزائے موت وارڈ میں پہلا دِن

ملاقات سے واپس آ کر چکی میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک قیدی منشی رجسٹر اُٹھائے 'اُڑدی' سنانے آ گیا۔ دیگر قیدیوں کے ساتھ مجھے بھی ایک چکی کا نمبر بتایا جو 10 تھا یعنی میں نے آج 10 نمبر کمرے میں رات گزارنی تھی۔ اُڑدی سنائے جانے کے تھوڑی دیر بعد باہر سے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا شور قیامت ہے تو معلوم ہوا کہ اُڑدی لگانے کے لئے قیدیوں کو کھولا جانے لگا ہے۔ چند لمحوں میں ہمارا دروازہ بھی کھول دیا گیا جس پر میرے ساتھ والے بھی اپنا سامان اُٹھا اپنے نئے کمروں کی طرف دوڑے۔ باہر نکل کر دیکھا تو ہر کوئی اپنا اپنا سامان اُٹھائے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا۔ چند لمحے تو یوں لگا جیسے حشر کا سماں ہو، میں نے بھی اپنا سامان سنبھالا اور بتائے گئے نمبر والی چکی کی طرف چل پڑا۔ وہاں سامان رکھا تو میرے علاوہ اور کوئی نہ آیا جس سے اندازہ ہوا کہ مجھے اکیلا ہی رکھا جائے گا۔ اس

سے مجھے بہت سکون ہوا کہ چھوٹے سے کمرے میں دیگر لوگوں کے ساتھ وقت گزارنا بہت مشکل لگتا تھا اور لوگ بھی ایسے کہ ان جیسوں سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو۔

سامان رکھنے کے بعد میں نے ہیڈوارڈر داؤد شاہ کے ذریعہ اپنے دوسرے اسیر ساتھیوں سے اپنے ٹینے (یعنی صندوق) منگوائے جو سزائے موت وارڈ کے بالکل قریب 5 چکی میں تھے جہاں پر کہ سزا سنائے جانے تک ہم رہتے تھے۔ اپنے کمرے میں سامان سیٹ کرنے کے بعد وارڈ کے صحن میں آیا تو دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے قیدی جمع تھے اور جھک کر کچھ اُٹھا رہے تھے۔ قریب گیا تو پتہ چلا کہ یہاں مٹی کا ایک ڈھیر ہے جس سے ہر قیدی اپنے اپنے تھیلہ میں مٹی ڈال کر لے جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا؟ تو بتایا گیا کہ چونکہ کمرے میں فلش سسٹم نہیں ہے اس لئے ایک کونہ میں قضائے حاجت کر کے اس پر مٹی ڈال دی جاتی ہے اور پھر ٹہلائی کے دوران خاکروب آ کر صفائی کر جاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی ایک لفافہ میں مٹی ڈال کر اپنی چکی میں لے گیا۔ اسی اثناء میں لوہے کی موٹی چادر سے بنے ہوئے ہماری وارڈ کے بڑے دروازہ پر کسی نے زور زور سے ڈنڈا مارا جس کی آواز سن کر قیدی 'چلو بھئی ڈنکا ہو گیا' کہتے ہوئے اپنے اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔ پتہ چلا کہ جب ٹہلائی کا وقت ختم ہو جائے تو اس کا اسی طرح اعلان کیا جاتا ہے اور اسے 'ڈنکا ہونا' کہا جاتا تھا۔

میں نے اپنی چکی میں بند ہونے سے پہلے اپنا سامان ٹینوں میں سیٹ کیا اور انہیں حسب دستور باہر سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔ چند لمحوں میں مجھے بند کر دیا گیا تو میرے پاس کمرے کے اندر پانی کے گھڑے یا مٹی کے لفافہ کے سوا کوئی چیز نہ تھی اور یہ میرے اس سفر کا باقاعدہ آغاز تھا۔ اس موقع پر مجھے پھر حضرت مولوی برہان الدین صاحب جہلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ تاریخی فقرہ پھر یاد آ گیا:

'او برہانا! ایہہ نعمتاں کتھوں'

تھوڑی دیر بعد تالے چیک کرتے ہوئے ہیڈوارڈر سامنے سے گزرا تو میں نے اس سے بستر کے بارہ میں پوچھا تو اس کے کہنے پر مجھے کمبل مہیا کئے گئے۔ یہ کمبل کیا تھے، بس چیتھڑے سے تھے مگر ان پر ہی قناعت کرنا پڑی کہ اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ دو نسبتاً صاف کمبل اوڑھنے کے لئے رکھ کر باقی بچھا لئے اور ان کے اوپر پروفٹ چوڑی دری بچھا کر اپنا بستر مکمل کر لیا۔ اسی دوران پانی بھی سپلائی کیا گیا جس کا طریق کار کچھ یوں تھا کہ وارڈ کے اطراف میں بنے ہوئے حوضوں سے مشقتی پانی بھر بھر کر ہر چکی کے سامنے لاتے اور دروازے کی سلاخوں میں سے ٹین کی بنی ہوئی ایک ایسی پیک کو گزارتے جس کے شروع میں چوڑی سی جگہ بنی ہوتی۔ جب چکی کے اندر موجود قیدی اس پیک کا منہ تھام کر اپنے

گھڑے کے منہ پر رکھ دیتا تو باہر کھڑا مشقتی پانی کا ڈول اس میں انڈیل دیتا۔ اس طرح سے گھڑا پانی سے بھر جاتا۔
ان کاموں سے فارغ ہو کر صورتِ حال پر غور کرتے ہوئے کمرے میں ہی اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ اتنے میں عصر کی اذان سنائی دی تو نماز کی تیاری شروع کر دی۔ آج نمازِ ظہر بھی نہ ادا کر سکا تھا، اسلئے جمع کر کے دونوں نمازیں پڑھیں۔
پھر کسی مشقتی نے آ کر ایلومینیم کے تین برتن (پلیٹ، ڈُلو اور قَولا) دیئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد کھانا تقسیم کرنے والا قیدی آیا تو اس سے صرف روٹی لے لی کہ آج سالن گھر سے آیا ہوا تھا۔
میں کھانا کھانے لگا تو باہر چکیوں کے سامنے رونق کا احساس ہوا۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس وقت باہر تڑکے لگ رہے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ لنگر سے آنے والا دال پر مشتمل سالن تو سالن کی صفات سے بالکل عاری ہوتا ہے، اس لئے جیل حکام کی طرف سے قیدیوں کو سہولت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق اسے تڑکا لگا لیں۔ اس کے لئے انتظامیہ کی طرف سے لمبی لمبی انگیٹھیاں بنا کر دی جاتی ہیں جنھیں کھانے کے دونوں وقت سزائے موت وارڈ کے مشقتی لنگر سے دہکتے ہوئے کوئلے لا کر دہکاتے اور قیدی اپنے اپنے برتنوں میں اپنا اپنا گھی، پیاز اور نمک مرچ وغیرہ دیتے اور مشقتی انہیں تڑکا لگا دیتے ہیں۔ جس سے لنگر کا کھانا کھانا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ مجھے اول تو کئی روز تک تڑکے کی ضرورت ہی نہ پڑی لیکن جب کبھی لنگر کا کھانا کھانے کی نوبت آتی تو سادہ دال ہی کھا لیتا، تڑکا لگانے کو جی نہ چاہتا اور اسے بھی اُدْعُوا فِی سَبِیلِی کا ہی ایک حصہ سمجھتا۔
جب کھانے سے فارغ ہوا تو شام ہو رہی تھی۔ اُس وقت میرے پاس ایک قیدی آیا اور اس نے بتایا کہ وہ راؤ بھوپل ہے اور گزشتہ دس سال سے جیل میں ہے۔ اس نے میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا اور مجھے پیش کش کی کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتاؤں۔ میں نے شکریہ کے ساتھ اس کی پیش کش کا جواب دیا۔ اُس کی یہاں B class تھی جس کی وجہ سے اس کے پاس اخبار آتا تھا سو میں نے صرف اخبار پڑھوانے کو کہا۔ (یہ وہی تھے جو جیل میں پہلے روز ہمیں 14 چکی میں مکرم میاں نصیر صاحب کے ہمراہ ملنے آئے تھے۔ اُس وقت حوالاتی تھے لیکن اب سزا ہو چکے تھے)
جب مغرب کی اذان ہوئی تو وارڈ پر مکمل طور ہُو کا عالم طاری ہو گیا، کوئی مشقتی رہا اور نہ کوئی وارڈر۔ مشقتی تو بند ہو چکے تھے جبکہ وارڈر اُس وقت اپنی اپنی دوستیاں نبھانے میں مصروف تھے۔ نماز پڑھ کر بیٹھا تو چائے پینے کو دِل چاہا مگر ایسی سہولت یہاں میسر نہ تھی۔ کجا یہ کہ اس موسم میں ہم روزانہ تین چار مرتبہ چائے پیتے تھے اور کجا یہ کہ آج تیسرا دن تھا کہ چائے دیکھنے کو بھی نہ ملی تھی۔ اگرچہ انتظامیہ کی طرف سے روزانہ صبح چائے تو آتی تھی مگر جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ اسے چائے کون کہتا، وہ تو برتنوں کا دھوون ہوتا! چائے کی اس طلب پر اللہ تعالیٰ نے صبر وقناعت کو غالب رکھا اور کسی بھی

موقع پر ایسی طلب کو ناگزیر بننے نہیں دیا، الحمدللہ۔ نمازِ عشاء کا وقت بھی جلدی ہو گیا۔ اس سے فارغ ہو کر اخبار منگوایا اور اسے بڑی احتیاط سے اور چھپا کر پڑھا۔ جب سونے کی نوبت آئی تو کمبلوں کو اپنے گرد ایسی ترکیب و ترتیب سے لپیٹا کہ سردی کا زیادہ سے زیادہ دفاع ہو سکے۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ کب نیند آ گئی، یہ بہر حال یاد ہے کہ نیند آنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی بلکہ مکمل سکون رہا، الحمدللہ۔

### سزائے موت وارڈ میں دوسرا دِن

سزائے موت وارڈ میں یہ میری پہلی صبح تھی۔ علی الصبح آنکھ کھلی تو سوچا کہ اندھیرے میں ہی بیت الخلاء والا کونہ استعمال کر لیا جائے۔ چنانچہ اس سے فارغ ہو کر گھڑے کے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور نماز میں مصروف ہو گیا۔ نمازِ فجر کے بعد سردی کے باعث پھر بستر میں گھس گیا۔ اتنے میں ناشتہ تقسیم ہونے لگا۔ میں نے بھی چائے اور روٹی لے لی۔ سات بجے کے قریب ہماری چکیاں کھول دی گئیں، پتہ چلا کہ ٹہلائی شروع ہو گئی ہے اور اسی دوران میں خاکروب صفائی بھی کرے گا۔ یہ میرے لئے اچنبھے کا باعث تھا کیونکہ اب تک تو اتنی صبح اس قسم کی سہولت کا تصور تک نہ تھا۔ بہر حال میں ڈرتے ڈرتے باہر نکلا تو پہلے میرے ہاتھوں کو ہتھکڑی لگی پھر دیکھا کہ دوسرے قیدی بھی اسی طرح ہتھکڑیاں لگوائے باہر کھلے میدان میں چل پھر رہے تھے۔ اُس وقت مشقتیوں کو دیکھا کہ وہ چکیوں میں پڑے گھڑوں میں پانی بھر رہے تھے۔ میں نے یونہی ایک بوڑھے سے مشقتی سے کہا کہ نہانا چاہتا ہوں تو اس نے تازہ پانی کے دو ڈول مجھے لا دیئے جن سے بھاپ بھی نکل رہی تھی۔ چنانچہ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہتھکڑی عارضی طور پر اُتروائی اور فوراً کچھا پہن کر اپنے کمرے کے گھرے میں نہانے لگا۔ نہا چکا تو طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی۔ پھر ہتھکڑی لگوائے بغیر ہی دھوپ تلاش کر کے اس میں ٹہلنے لگا۔ جسم کو گرمائش میسر آنے ہی لگی تھی کہ ٹہلائی ختم ہونے کا ڈنکا بج گیا اور سارے قیدی خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی چکیوں کی طرف چل پڑے اور چند منٹوں میں ہر کوئی اپنی جگہ سیٹ ہو کر تلاوت قرآن کریم میں مصروف ہو گیا تھا کہ اکثر کمروں سے تلاوت کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ پھر وہی معمولات تھے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

### سزائے موت وارڈ کا عمومی ماحول

سزائے موت کے ہر وارڈ میں 35 کمرے تھے جو دراصل ایک ایک قیدی کے لئے بنائے گئے تھے مگر یہاں اس قدر ہجومِ قیدیاں تھا کہ 4x3 میٹر کے کمرے میں بعض اوقات پانچ پانچ قیدی بند کرنے پڑتے تھے، تین یا چار تو عام بات تھی۔ اس طرح سے ایک ہی کمرہ میں اکٹھے گنتی پڑنے کو جیل کی اصطلاح میں 'بچ پڑنا' کہا جاتا تھا۔ ہم دونوں کو

شروع میں تو اکیلے اکیلے رکھا گیا تاہم چند دنوں بعد ہمیں بھی پنجوں میں ڈال دیا گیا اور کچھ دنوں بعد رانا صاحب بھی میرے والی وارڈ میں آ گئے تو ہم دونوں کو اکھٹے ایک پنج میں رکھا جاتا اور ہمارے ساتھ ہر روز کوئی نہ کوئی ایک یا دو دوسرے قیدی ہوتے۔ ساہیوال کی یہ سنٹرل جیل پاکستان کی پرانی ترین جیلوں میں سے ہے اس لئے اس میں جدید سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سزائے موت وارڈ کی سب سے تکلیف دہ بات یہاں بیت الخلاء کا انتظام نہ ہونا تھا۔ تاہم یہاں 7 بلاک کی نسبت بہت سی سہولتیں بھی تھیں جن کی وجہ سے ہی اسے 'لہور' (لاہور) کہا جاتا تھا۔ مثلاً یہاں صبح شام آدھ آدھ گھنٹہ کے لئے کھولا جاتا تھا جس دوران قیدی اپنی چکیوں سے نکل کر اپنی وارڈ کے صحن میں چل پھر سکتے تھے، اسے یہاں کی زبان میں 'ٹہلائی' کہتے تھے۔ اسی طرح یہاں لنگر سے آنے والی دال کو قیدی تڑکا لگا کر کچھ بہتر حالت میں کھانا کھا سکتے تھے۔ تڑکا لگانے کے لئے سرکاری طور پر انتظام کیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں چوری چھپے چائے کا سامان بھی قیدی رکھ لیتے اور موقع ملنے پر رات یا دن کے کسی حصہ میں چائے بنا کر 'عیاشی' بھی کر لیتے۔ یہاں مشقتی پانی لاتے جنہیں قیدی اپنے اپنے بڑے بڑے مٹکوں اور گھڑوں میں بھروا کر کمروں کے اندر رکھ لیتے اور پینے، برتن اور کپڑے دھونے کے علاوہ نہانے کے کام بھی آتا مگر عموماً یہ سب کچھ چکی کے اندر بنے ہوئے چھوٹے سے 'گھرے' میں ہی کرنا پڑتا۔ تاہم کبھی کسی کو موقع ملتا تو وہ ٹہلائی کے وقت باہر وارڈ کے دونوں طرف بنے ہوئے پانی کے حوضوں پر بھی جا کر یہ تمام کام کر لیتا۔ یہاں قیدی کے سامان والے 'ٹینے' (صندوق) کمرے کے اندر رکھنے کی اجازت نہ تھی بلکہ انہیں ہر قیدی اپنے کمرے کے سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھتا اور کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو کسی مشقتی یا وارڈر سے کہنا پڑتا کہ اس کا 'ٹینا' دروازہ کے قریب کر دے۔ یہ سامان سردی گرمی اور بارش وغیرہ ہر حالت میں یہیں باہر پڑا رہتا جس سے ٹینے بنا کر بیچنے والے کی روزی کا سامان بھی ہوتا رہتا۔

یہاں کے معمولات کچھ اس طرح تھے کہ صبح سویرے ناشتہ والے آتے، پھر دن چڑھنے پر 'سب اچھا' والے آ کر معائنہ کرتے۔ اس کے بعد سورج نکلنے پر ٹہلائی کے لئے آدھی آدھی وارڈ کو باری باری کھولتے۔ اس کے بعد قیدی اپنی اپنی چکیوں میں بند ہوتے اور نہا دھو کر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ کوئی تلاوت کرتا تو کوئی کتاب کے مطالعہ میں لگ جاتا اور کئی لوگ لمبی تان کر سو جاتے۔ بڑے صاحب کے ہفتہ وار دورہ کا وقت ختم ہوتا تو دوپہر کے کھانے والے آ جاتے اور کھانا تقسیم ہونے کے ساتھ ہی تڑکے والے مشقتیوں کی رونق لگ جاتی۔ ابھی کھانا کھا رہے ہوتے تو ملاقات کا شور پڑ جاتا اور جس کی ملاقات آتی اُس کی گویا عید ہوتی۔ بعد ازاں اُڑدی سنائی جاتی اور اس کے ساتھ ہی اُڑدی لگانے کے لئے سب کو کھول دیا جاتا۔ اُس وقت منظر دیکھنے والا ہوتا کہ ہر کوئی اپنے نئے کمرے کی

طرف اپنا سامان اُٹھائے اس کوشش میں بھاگ رہا ہوتا کہ اس کمرے میں اچھی جگہ اس کا 'کھڈا' لگے۔ اس عمل میں کوئی گھنٹہ بھر لگتا پھر سب قیدی بند کر دیئے جاتے اور شام کے کھانے کا انتظار شروع ہو جاتا جو کچھ ہی دیر بعد تقسیم ہو رہا ہوتا اور اس کے ساتھ ہی تڑکا لگانے والے مشقتی اپنی بڑی بڑی انگیٹھیوں کے ساتھ چکیوں کے سامنے اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ کر رہے ہوتے۔ مغرب سے بہت پہلے یہ ساری سرگرمیاں ختم ہو جاتیں تو قیدی نماز کے بعد اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ لگانے، کھیلنے یا ایک دوسرے کو دعائیں دینے میں مصروف ہو جاتے۔ اس طرح سے یہاں کا ایک دن مکمل ہوتا جو موسم سرما میں تو بڑی آسانی سے گزر جاتا مگر موسم گرما میں اپنا آپ بتا کر ہی رخصت ہوتا۔

## جیل افسر اور ہم

سزائے موت وارڈ میں آئے ایک روز ہوا تھا کہ ایک عجیب واقعہ ہوا جس نے نہ صرف مجھے حیران کر کے رکھ دیا بلکہ میری آنکھیں بھی کھول دیں۔ ہوا یوں کہ جب میں ٹہلائی کے وقت دھوپ میں کھڑا تھا تو میرا ایک واقف سپاہی وارڈر میرے پاس آیا اور باتیں کرنے لگا۔ جب ٹہلائی بند ہونے پر میں اپنی چکی کی طرف جانے لگا تو اس نے مجھے یہ کہتے ہوئے روک لیا کہ یہیں کھڑے چند منٹ اور دھوپ سینک لو، ابھی دوسری ٹہلائی (یعنی باقی آدھی وارڈ) بھی کھلنی ہے، فکر نہ کرو کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ میں وہاں کھڑا اُس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ وارڈ کے جنوبی دروازہ سے سزائے موت وارڈ کا اِنچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رضوی شاہ اچانک وہاں آ گیا۔ اُسے دیکھ کر میں اس خیال سے سلام کرنے کو آگے بڑھا کہ یہ شخص کل تک ہمارے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا اور کھاتا پیتا رہا تھا اور اس اعتبار سے میں نے اسے اپنا ہمدرد سمجھا اور بڑے مان کے ساتھ اس کی طرف سلام کرنے کو ہاتھ بڑھایا مگر میری حیرت کی انتہاء نہ رہی جب اس نے انتہائی گھٹیا پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ اس سپاہی سے بڑے متکبرانہ لہجہ میں پوچھنے لگا کہ یہ کون ہے؟ سپاہی نے کہا، سر! یہ وہی احمدی ہے جسے ابھی سزا سنائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تجاہل عارفانہ کرنے والے اس طوطا چشم کی آنکھیں ماتھے پر آ گئیں اور اپنے ساتھ آنے والے ہیڈ وارڈر سے کہنے لگا کہ ٹہلائی بند ہو گئی ہے اور یہ ابھی تک کھلا ہے؟ اور اسے ہتھکڑی بھی نہیں لگی ہوئی؟ پھر بڑے غصہ سے حکم جاری کیا کہ اِسے ہتھکڑی ضرور لگایا کرو! اس پر میں نے فوراً اپنی چکی کی راہ لی اور دِل کو سمجھایا کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔

بعد میں وہ سپاہی میرے پاس آیا اور اپنی صفائی پیش کر کے میری دلجوئی کرنے لگا مگر مجھے تو سبق مل چکا تھا جس سے میں نے پھر سارے عرصۂ اسیری کے دوران خوب فائدہ اُٹھایا۔ میں اب بھی اُس افسر کے رویہ کو یاد کر کے سوچتا ہوں کہ کیا انسان اتنی جلدی بدل جاتے ہیں۔ کیا قیدی کپڑے پہننے کے بعد انسان، انسان نہیں رہتا!!!؟؟

عشق کے امتحان کا یہ ابتدائی اور بنیادی سبق لینے کے بعد میں اپنی چکی میں بند ہوا، تلاوت قرآن کریم کی پھر کھانے کا وقت ہوگیا تو کھانا کھا کر لیٹ گیا کہ کچھ بھی پاس نہ تھا، کچھ کرنے کو نہ ہی پڑھنے کو۔ اسی دوران ملاقات کا پرچہ آ گیا اور جس جس قیدی کی ملاقات آئی تھی اُسے تیار ہونے کو کہا گیا بعد ازاں اُسے نکال کر کنڈم وارڈ میں لے جا کر بند کیا جانے لگا۔ اس پرچہ میں تو میری ملاقات نہ تھی تاہم تھوڑی دیر بعد ایک نمبردار آیا اور مجھے بھی نکال کر لے گیا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ بری ہوجانے والے ہمارے ساتھی مکرم چوہدری محمد اسحق صاحب (مرحوم) ہماری ملاقات کے لئے آئے تھے۔ چوہدری صاحب سے یہ ملاقات کافی دلچسپ رہی مگر افسوس کہ یہ آخری ملاقات ثابت ہوئی کیونکہ اس کے جلد بعد موصوف اپنے بیٹوں کے پاس امریکہ چلے گئے جہاں کچھ عرصہ بعد بیمار ہوگئے اور اسی بیماری میں آپ کی وفات ہوگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حق مغفرت کرے عجب مخلص اور قربانی کرنے والے دوست تھے!

آج میں نے ٹہلائی کے دوران اپنے چاروں ساتھیوں کو ایک بار پھر قیدی لباس میں دیکھا جب وہ چوہدری صاحب موصوف سے ملاقات کے بعد واپس آ رہے تھے تو میں بھی اتفاق سے اپنی وارڈ کے بیرونی دروازہ پر کھڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر اپنے پاس بلالیا اور کچھ دیر ہم باتیں کرتے رہے۔ اس نئے لباس میں وہ پہچانے ہی نہیں جا رہے تھے۔

ٹہلائی کے بعد میں چکی میں بند ہوا تو کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔ میں نے ایک مشقتی سے پوچھا کہ اس کی صفائی کیسے ہوگی تو اس نے بتایا کہ مجھے اپنا جھاڑو منگوا کر ساتھ رکھنا ہوگا اور جب بھی نئی چکی میں جاؤں، وہاں خود ہی صفائی کرنا ہوگی۔ چنانچہ میں نے اُسی وقت برادرم حاذق صاحب کو جھاڑو کے لئے پیغام بھجوایا تو انہوں نے فوری طور پر ایک جھاڑو بھیج دیا۔ اِس سے میں نے ایک اور فائدہ بھی اُٹھایا اور وہ یہ کہ اس کے اندر اپنی بال پنسل چھپا کر رکھنے کی جگہ بنالی۔ یہاں لکھنے کی کوئی چیز رکھنے کی اجازت نہ تھی اور جونہی نوٹس میں آتی، ضبط کر لی جاتی۔ غرضیکہ آہستہ آہستہ یہاں کے اسرار و رموز اور طور طریقے سمجھ آنے لگے تو چند دِنوں میں میرے روزمرہ کے معمولات بھی مرتب ہوگئے اور میں اپنی کٹھن منزل کی طرف سفر پر رواں دواں ہوگیا، اگرچہ منزلِ عشق کٹھن تھی اور راہ میں راہزن بھی تھے مگر یہ نصیحت بہت کام آئی۔

پیچھے نہ مڑ کے دیکھ تُو آگے قدم بڑھائے جا

(حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کا یہ شعر اپنے سکول کے کلاس فیلو برادرم ڈاکٹر شمس الحق طیب مرحوم سے بچپن سے سنا ہوا ہے، مرحوم یہ نظم گہرے درد کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ مرحوم کو جنوری 2000ء میں اغوا کر کے نہایت بہیمانہ طور پر اُس وقت شہید کر دیا گیا تھا جب وہ فیصل آباد میں ایک نہایت کامیاب اور ماہر آرتھوپیڈک سرجن کے طور پر نوع

انسانی خدمت بجالا رہے تھے۔ وائے افسوس ظالموں نے اس قابل انسان کا خون کرتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ خون کے دھبے دھلتے دھلتے نہ جانے کتنی برساتیں گزریں گی ہی مگر ایسا ذہن اور دماغ پیدا ہوتے نہ جانے کتنی نسلیں گزر جائیں)۔

## ہمارے ساتھیوں کے شب وروز

ہم دونوں ساتھی تو 'کوٹھی' لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ہماری کوئی مشقت نہ تھی جبکہ ہمارے دیگر چاروں ساتھیوں سے جنہیں عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی، مشقت لی جانے لگی جس کے لئے اُنہیں علی الصبح جیل کی فیکٹری میں جانا ہوتا جہاں سے سہ پہر کے تین بجے واپسی ہوتی۔ اُن کی مشقت ٹاٹ بننے والی کھڈیوں پر لگائی گئی جو ایک سخت مشقت شمار ہوتی ہے۔ یہاں انہیں ہر روز قریباً پانچ چھ ٹاٹ بنانے ہوتے جو اچھا خاصا مشکل کام ہوتا البتہ محترم ملک محمد دین صاحب کی مشقت ہلکی سی تھی کیونکہ آپ اپنی عمر اور صحت کے اعتبار سے اتنی سخت مشقت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہیں دھاگہ کے گولے بنانے کی مشقت دی گئی تھی لیکن یہ بھی ملک صاحب کے لئے اس قدر سخت کام ہو جاتا تھا کہ جب واپس آتے تو دیگر ساتھیوں کی طرح آپ بھی بری طرح تھکے ہوتے۔ آپ کا بھی سر، چہرہ اور کپڑے پٹ سن کے ریشوں سے اَٹے ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ سب کچھ راہِ مولیٰ میں وہ بڑے صبر، ہمت اور استقامت سے برداشت کرتے رہے۔ درود شریف پڑھتے ہوئے فیکٹری جاتے اور اللہ کی حمد وثناء گاتے ہوئے واپس آتے۔ شروع کے کچھ دن میں چھٹی کے وقت روزانہ ہی اپنے وارڈ کے بیرونی دروازہ پر ٹہلائی کے دوران آ کر کھڑا ہو جاتا اور انہیں فیکٹری سے واپس آتے ہوئے مل لیتا۔

## ایک افسر کی بدسلوکی اور اللہ کا اِنتقام

اوپر رضوی شاہ نامی ایک جیل افسر کا ذکر گزر چکا ہے۔ یہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سزائے موت وارڈ کے علاوہ اُس وارڈ کا بھی انچارج تھا جہاں ہمارے دیگر چار ساتھی تھے۔ اس نے خیال کیا کہ یہ بُدھو سے لوگ ہیں، ڈرا دھمکا کر ان سے جو کچھ ہو سکے لوٹ لیا جائے۔ اس کے لئے اس نے انہیں بھی تنگ کرنا شروع کر دیا اور روز ہی وہاں جا کر نت نئے قانون اور احکام جاری کرتا اور انہیں گالیاں تک دینے لگا۔ اس بری طرح دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا کہ ان کا جینا دوبھر ہو جائے۔ ایک روز برادرم حاذق نے بتایا کہ اب تو اس نے حد ہی کر دی ہے اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آیا ہے یہاں تک کہ گزشتہ روز ایک نمبردار سے مجھے پٹوایا بھی ہے۔ اس پر حاذق صاحب کو تو تسلی دی مگر خود بہت پریشان ہوا پھر اپنی چکی میں آ کر نماز پڑھنے لگا جس میں اِنَّمَآ اَشْکُوْ بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کے مطابق اپنے مولا کے حضور ملتجی ہوا۔

اللہ تعالیٰ بڑا بے نیاز ہے۔ وہ ڈھیل تو دیتا ہے مگر اپنے مظلوم بندوں کا ایسے لوگوں سے انتقام بھی لیتا ہے۔ چنانچہ ہم نے کیا پوری جیل نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی لاٹھی نے اچانک ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی اور وہ ادھ موا سا ہو کر رہ گیا۔ ہوا یوں کہ عین اُنہی دنوں میں کسی نے اُس کے خلاف ہوم ڈیپارٹمنٹ پنجاب میں کارروائی کی۔ ہمیں صرف اِتنا علم ہوا کہ اُسے صوبائی حکام کی طرف سے Dismiss from service کا حکم نامہ ملا ہے۔ اِس پر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور ہاتھوں کے طوطوں کے ساتھ ہی اُس کا دَمکتا رنگ بھی اُڑ گیا۔ یقین جانئے اس کی شکل اُن دنوں دیکھنے کے قابل تھی، کاٹو تو بدن میں لہو نہیں اور نیم مردہ کیفیت میں وہ وہاں پھرتا ہوا دکھائی دیتا۔ پہلے تو اس نے بحالی کی بہت کوشش کی مگر جب اس کا کہیں سے کام نہ بن پایا تو کسی نے اس کے کان میں ڈالا کہ احمدیوں کے بڑے تعلقات ہیں، ان سے سفارش کراؤ۔ جس پر خدا کی قدرت کہ اُسے ہمارے پاس آنا پڑا۔ چنانچہ وہ کمال بے شرمی سے ہماری طرف دوڑا، کبھی اپنے کئے کی معذرت کرتا اور کبھی اس کے لئے عذر لنگ تلاش کرتا۔ بہر حال ہم نے بھی اپنی جماعتی روایات کو برقرار رکھا اور مصیبت کے وقت میں اُس کی پوری مدد کی یہاں تک کہ چند روز کی 'کوششوں' کے بعد اُسے پھر نوکری میں لے لیا گیا مگر افسوس کہ اُس احسان فراموش نے اس کی قدر نہ کی اور اپنی عادت کے مطابق اس کے بعد بھی ہمیشہ موقع کی تاڑ میں ہی رہتا اور ہمیں تنگ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تا آنکہ جملہ افسران کی ڈیوٹیاں بدل گئیں اور بعد میں اس کی ٹرانسفر مظفر گڑھ ہوگئی۔ جہاں سے سننے میں آیا کہ اسے اپنے کرتوتوں کے باعث پھر خاصی ذلت اٹھانی پڑی۔ یہ وہ افسر تھا جو قیدی کو ذلیل و رسوا کر کے پیسہ کھاتا تھا اور پیسہ کی لالچ میں ہر کمینی اور رذیل حرکت کر گزرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے بچائے اور انہیں ہدایت بھی دے تا کہ غریب اور مجبور و بیکس قیدیوں پر مظالم نہ توڑیں، آمین۔

## اچھے ملازم بھی تھے!

جیل عملہ میں بڑے بڑے اچھے ملازم بھی تھے۔ ایک ہیڈ وارڈر حسن بادشاہ کے نام سے مشہور تھے۔ جب مجھے سزائے موت وارڈ میں لایا گیا تو وہ یہاں انچارج تھے۔ موصوف پختہ عمر کے تجربہ کار، نیک شریف اور دیانتدار ملازم تھے۔ قول کے سچے اور کام کے کھرے، قیدیوں کو بالکل تنگ نہ کرتے، شور مچا کر ڈراتے تو تھے مگر کارروائی بالکل نہ کرتے تھے۔ دوسروں کی بھلائی کے لئے کوشاں رہتے۔ ٹہلائی کے دوران قیدیوں کو اکٹھا کر کے سبق آموز واقعات سناتے اور انہیں توبہ کرنے اور عبادت میں مصروف رہنے کی نصیحت کرتے رہتے۔ میرے یہاں آنے کے دس بارہ دن کے بعد ان کی ڈیوٹی کہیں اور لگ گئی۔ جتنے دن بھی موصوف یہاں رہے، میں نے نہیں دیکھا کہ انہوں نے کسی کو پیسے

لینے کی خاطر تنگ کیا ہو یا پھر ان کے نرم رویہ کی وجہ سے کوئی انتظامی گڑبڑ ہی ہوئی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ قیدی انہیں اپنے بزرگ کے طور پر سمجھتے تھے اور ان کے اسی مخلصانہ و ہمدردانہ کردار کے باعث دیگر عملہ کے ساتھ ان کی بالکل بھی نہیں بنتی تھی۔ ان کی نیک دلی کا اُس وقت یقین ہو گیا جب جیل کے ایک نسبتاً بڑے اہلکار نے ان کے خلاف غلط رپورٹ کر کے معطل کرا دیا تو چند ہی روز بعد وہ اہلکار ایک چھاپہ میں دھر لیا گیا اور اس کی جرابوں کی تلاشی لی گئی تو تھوڑے نہ بہت، پورے 22000 روپے برآمد ہوئے جس پر اسے فوری طور پر ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ حسن بادشاہ تو چند دنوں میں بحال ہو گئے مگر وہ شخص نوکری پر واپس نہ آ سکا۔ اِس واقعہ سے قیدیوں میں عام طور پر یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ حسن بادشاہ کی بددعا سے بچنا چاہیے۔

اِن ملے جلے حالات اور جیل ملازموں کے درمیان رہنا اور اپنے جسم و جان اور دل و دماغ کو مجتمع رکھنا میرے جیسے ناتجربہ کار کے لئے کس قدر کٹھن کام تھا، اس کا اندازہ لگانا کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ ایک طرف ان جیل ملازمین کی تلخیاں، زیادتیاں اور بات بات پر ظلم و جور پر اُتر آنے کے واقعات تھے تو دوسری طرف اپنے وطن کی عدالتوں کے فیصلوں پر نظر پڑتی تو انصاف کا خون ہوتے دیکھ کر سخت بے چینی ہوتی۔ کجا یہ کہ اسلامی تعلیم کی بنیاد ہی معاشرتی انصاف پر ہے اور کجا یہ کہ اسلام کے ہی نام پر بے گناہ اور معصوم انسانوں کے کشتوں کے پشتے لگائے جا رہے ہوں حالانکہ اسلام انصاف کے ساتھ ساتھ نرمی کی تعلیم بھی دیتا ہے لیکن یہاں یہ ہو رہا ہے کہ ذرا سے شک پر کسی بھی شخص کو جیل میں دھکیل دیا جاتا ہے پھر ان قیدیوں کو برسوں جیل کی اذیت ناک چکی میں پستے چلے جانا ہوتا ہے۔ جہاں کسی کو پیچیدہ قسم کی بیماریاں لگ جاتی ہیں تو کوئی خوراک کی کمی، غم و فکر اور پریشانیوں کی کثرت نیز جیل انتظامیہ کے خوف و ہراس کے باعث قریباً نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ قیدی آنیوالی خوشیوں کی آس میں زندہ تو رہتے ہیں مگر ان کے جسم گھل گھل کر کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ بظاہر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خاں صاحبؓ مرحوم کی یاد آئی، جنہوں نے اپنے وزارتِ قانون کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی تصنیف تحدیثِ نعمت میں لکھا ہے کہ میرے پاس جب وائسرائے کی طرف سے سزائے موت کے قیدیوں کی رحم کی اپیلیں قانونی مشورہ کے لئے آتیں تو میں یہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا کہ اتنے اتنے سال انہیں کال کوٹھڑیوں میں ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں ہر ایسے قیدی کی سزائے موت کو ختم کرنے کا مشورہ دیتا۔ ایک ایسے ہی قیدی کی سزائے موت کو چھ ماہ قید میں تبدیل کر دیا تو ہائی کورٹ والے چلا اُٹھے کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں، میں نے کہا کہ تم بھی دیر نہ لگایا کرو۔ اِس طویل مدت کے دوران قیدی موت کے تصور سے اس قدر ذہنی اذیت برداشت کر چکا ہوتا ہے کہ وہ اس کی

سزا کے لئے کافی ہوجاتا ہے۔ چوہدری صاحب ؒ مرحوم عشق رسول ﷺ میں ڈوب کر مزید لکھتے ہیں کہ:

''میری طبیعت کا میلان تو اسی طرف تھا کہ جہاں بھی نرمی کی گنجائش نظر آئے نرمی کی جائے۔ برسوں بعد میں نے رسول کریم ﷺ کی حدیث پڑھی کہ جہاں تک ہوسکے لوگوں پر حد وارد ہونے سے انہیں بچاؤ اور جہاں گنجائش ہو، اُن کے لئے مخلصی کا رستہ تلاش کرو کیونکہ یہ بہتر ہے کہ ایک قصوروار سزا سے بچ جائے بجائے اس کے کہ ایک بے قصور پر عقوبت وارد ہو (اِدْرَءُ وا الحُدُودَ عنِ النَّاسِ بِالشُّبُهَاتِ۔ ناقل) اس کو پڑھ کر مجھے اطمینان بھی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے ایسا موقع عطا فرمایا کہ میں اس فرمان کے مطابق سعی کرسکا اور ساتھ ہی حسرت بھی ہوئی کہ کاش پہلے اس فرمان کا علم ہوجاتا تو اس تعلق میں مزید مواقع نرمی کے تلاش کرتا''۔[1]

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ''۔

## کال کوٹھڑی میں عجیب وغریب انگیٹھی

چند روز میں میرے شب وروز کے معمولات میں ترتیب آنے لگی اور میں اس نئے ماحول سے مانوس ہونے لگا تو یہاں کا خوف اور ڈر دور ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں وقت گزارنے کے رموز واسرار سے بھی پردہ اُٹھنے لگا۔ قیدی کو اپنے کمرے کے اندر کچھ بھی کھانے پکانے کی اجازت نہیں ہوتی اس لئے ظاہر ہے کہ چائے بھی نہیں بن سکتی تھی مگر یہ تھی ایسی ضرورت کہ اس سے کسی کو بھی انکار نہ تھا۔ لنگر سے مہیا کی جانے والی چائے ایک تو صرف صبح ملتی تھی اور دوسرے وہ اتنی ناقص ہوتی کہ اسے چائے کہنا ہی چائے کی توہین تھی۔ چنانچہ اس مسئلہ کا حل مختلف قیدیوں نے اپنے اپنے طور نکال رکھا تھا۔ میں نے شروع میں تو مشقتیوں کے انچارج اسحاق لالی نامی قیدی جو لالیاں کا رہنے والا تھا، کے ساتھ طے کیا کہ وہ مجھے چائے بنا کر دے دیا کرے اور اس نے ایسا شروع بھی کر دیا لیکن مجھے خود اپنی پسند کی چائے بنانے کی ہی جستجو رہی۔ (اس مشقتی نے دیگر اُمور مثلاً اپنے ساتھی اسیران کے ساتھ پیغام رسانی اور اشیاء کی نقل وحمل میں بھی میرا یہاں بہت ساتھ دیا، فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔) پھر مجھے آخر کار ایک روز علم ہو ہی گیا تھا کہ قیدی اپنی چکیوں میں کس طرح چائے بناتے ہیں۔ ہوا یوں کہ ایک روز جب اُڑدی لگی اور میں اپنا سامان اٹھائے نئی چکی میں داخل ہوا تو چکی کا ماحول ایسی گرمائش والا لگا کہ سکون آ گیا۔ وہاں موجود قیدی سے جو اپنا سامان باندھ کر نکلنے ہی والا تھا، پوچھا کہ چکی بڑی گرم ہے، کیا بات ہے؟ اُس نے ایک کونہ کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ انگیٹھی جو جل رہی ہے۔ اس پر میں نے اُس کونہ کی

---

[1] تحدیث نعمت ص 425 طبع ثانی 1981ء۔

طرف نظر دوڑائی مگر مجھے تو کوئی چیز نظر نہ آئی۔ مجھے سراپا سوال پا کر اس نے اُس سرکاری توے کو اٹھایا جس میں چائے پک رہی تھی اور جس کے نیچے انگیٹھی جل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر معمہ تو حل ہوا سو ہوا مگر میری حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ قیدیوں نے چائے بنانے کا کیا خوب حل نکال رکھا تھا۔ اس انگیٹھی کا ایک حصہ ڈالڈا گھی والے ڈبہ کے پیندے کو ایک انچ کی اونچائی سے کاٹنے کے بعد اس میں چھید ڈال کر بنایا گیا تھا جبکہ دوسرا حصہ مٹی کو گوندھ کر ایک انچ موٹی اور اونچی دیوار کا تھا جسے اسی ڈبہ کی گولائی کے مطابق ڈھالا گیا تھا اور اس کے ایک طرف چھوٹا سا دروازہ تھا تا کہ کوئلوں کو نیچے سے ہوا مل سکے۔

اب ہوتا کیا کہ چائے بنانے کے بعد مٹی والا حصہ تو اُڑدی لگنے کے وقت پھینک دیا جاتا کہ اگلی چکی میں جا کر نئے سرے سے مٹی گوندھ کر بنالیں گے البتہ ٹین والا حصہ اس وقت تک زیر استعمال ہی رہتا جب تک کہ تلاشی وغیرہ میں ضبط نہ کرلیا جاتا اور اگر ضبط ہو جاتا تو یہ کوئی ایسی قیمتی چیز نہ ہوتی کہ دُکھ ہوتا بلکہ اُسی وقت ایک اور ڈبہ کاٹ کر نئی انگیٹھی بنالی جاتی۔ تاہم قیدیوں نے انگیٹھی کو تلاشی سے بچانے کے بھی کئی طریق نکال رکھے تھے۔ چنانچہ کبھی اسے پانی والے مٹکے میں ڈال کر اور کبھی مٹی والے تھیلہ میں چھپا کر 'اُن' کے شر سے بچا لیتے۔

اس انگیٹھی کے علاوہ ایک اور قسم کا چولہا بھی بعد میں قیدیوں کے پاس دیکھا جسے 'بُوڑا' کہتے تھے۔ اسے کپڑے کی قریباً دو انچ چوڑی ٹاکی کے اندر گھی یا تیل لگا کر گولائی میں پراٹھے کے پیڑے کی طرح لپیٹ کر تیار کیا جاتا۔ اچھی طرح سے لپیٹنے کے بعد اِسے ٹین کی چھوٹی سی ڈبیا میں رکھ کر جلایا جاتا اور اس کے شعلہ کے اوپر برتن رکھ کر چائے بنالی جاتی۔ اس سے چائے تو بڑی آسانی سے بن جاتی مگر اس کے بعد برتن کے باہر چکنی قسم کی کالک کی تہ جم جاتی جسے پہلی مرتبہ دیکھ کر مجھے فکر ہوئی کہ اِسے کیونکر اُتارا جائے گا۔ مگر پھر اسے اُترتا دیکھ کر اور بھی حیرانی ہوئی کہ قیدیوں نے کیسے کیسے طریقے ایجاد کر لئے ہوئے تھے۔ اس کے لئے وہ برتن کو آگ پر چڑھانے سے پہلے ہی مٹی کا ہلکا سا لیپ کر لیتے اور استعمال کے بعد مٹی کی ہلکی سی تہ پر جمی ہوئی کالک کو اتارنے کے لیے بانس جھاڑو کے تنکے کے ساتھ اس طرح اُس پوچے کی تہ اتارتے جس طرح نائی شیو کرتے ہوئے استرے کے ساتھ چہرے پر لگائی ہوئی کریم کو صاف کرتا ہے۔ اس طرح سے برتن دھونے کا کام بھی بچ جاتا ہے اور ہاتھ بھی کالے نہ ہوتے۔

نمازِ جمعہ کی ادائیگی

سزا سنائے جانے سے چھٹے روز پہلی مرتبہ جمعہ کا دن آیا۔ اگرچہ جیل میں پہلے بھی ایسے کئی جمعے گزر چکے تھے جب ہم اکیلے اکیلے ہوتے تھے مگر اس جمعہ کچھ اور قسم کا ہی احساسِ تشنگی تھا۔ بار بار خیال آتا رہا کہ اب ہم بھی اکٹھے ہو کر جمعہ

نہیں پڑھ سکیں گے! اس قسم کے احساسات میں اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ پھر ڈھارس بندھائی اور میری رہنمائی فرمائی جس کی روشنی میں خاکسار نے جمعہ کی ادائیگی کا جو طریق اختیار کیا اس سے سارا احساسِ محرومی جاتا رہا۔ میں نے جب ہمت کر کے دل میں آنے والے وساوس کو دُور کیا تو مجھے خیال آیا کیوں نہ اس وقت کو اُسی طرح گزارا جائے جس طرح آزاد ماحول میں گزارا کرتا تھا۔ چنانچہ غسل کر کے صاف کپڑے پہنے، پھر نمازِ ظہر کے فرضوں کی پہلی دو رکعات میں جمعہ کی طرح سورۃ اعلیٰ اور غاشیہ کی تلاوت کی۔ اس سے پہلے خطبہ ثانیہ کی تلاوت کر کے گویا خطبہ میں بھی شمولیت کر لی۔ اس کے بعد میں نے ہر جمعہ یہی طریق رکھا اور کئی سال تک اِسی طرح نمازِ جمعہ ادا کر کے قلبی سکون حاصل کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ نے پھر کبھی عدم اُدائیگی جمعہ کا احساسِ محرومی نہ ہونے دیا، ہوا میں تیرے فضلوں کا منادی، فسبحان الذی اخزی الأعادی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہمارے ساتھ جمعہ ادا کرتے ہوں گے اور ہماری نمازِ جمعہ اُس کے حضور باجماعت ہی شمار ہوتی رہی ہوگی۔

## کال کوٹھڑی میں حجامت کی سہولت

سزائے موت وارڈ میں ایک اہم اور بڑا مسئلہ حجامت بنوانے کا ہوتا ہے۔ چند دن تو یونہی گزر گئے مگر جب داڑھی اور سر کے بال بے قابو ہونے لگے تو نائی کا پتہ کیا۔ کسی نے بتایا کہ ہر منگل کو نائی یہاں آتے ہیں اور سب کی حجامتیں 'کر' جاتے ہیں۔ ان کے اِنتظار میں تین منگل گزر گئے مگر کسی نائی کا یہاں سے گزر تک نہ ہوا۔ پوچھنے پر علم ہوا کہ جیل کے تمام نائی جو قیدی ہی ہوتے ہیں، 7 بلاک میں بند ہیں۔ ان کے متعلق کسی نے بڑے صاحب کو رپورٹ کر دی تھی کہ قیدیوں سے پیسے لیتے ہیں تو صاحب نے اِن کا پیسہ ہی نہیں حقہ پانی بھی بند کر دیا۔ مہینہ بھر تک ہمارے بالوں کی یہی صورت حال رہی اور جب نائیوں کی 7 بلاک سی خلاصی ہوئی تو اگلے منگل کو ہماری وارڈ میں بھی آئے۔ میں یہ خبر سن کر بڑے شوق سے باہر کھلے صحن میں گیا مگر ان کے ہاتھوں قیدیوں کا حشر ہوتے دیکھ کر بھونچکا کر رہ گیا۔ ان نائیوں کے پاس قینچی، کنگھی اور موٹی مشین پر مشتمل کل تین ہتھیار تھے جو باعتبارِ صلاحیت اپنی مثال آپ تھے۔ کنگھی ایسی کہ دیکھنے کو جی نہ چاہے، قینچی ایسی کہ کاٹو تو بالوں کو کھینچتی چلی جائے اور مشین غالباً بھیڑیں مونڈھنے والی تھی مگر ہم سب کو انہی ہتھیاروں سے اپنی اپنی حجامتیں بنوانی بلکہ 'کروانی' تھیں۔ ہر چند کہ مجھے پلاسٹک سیفٹی میسر آ گئی تھی مگر اس سے تو محض خط ہی بن سکتا تھا، بال تو کاٹنے سے رہا۔ چنانچہ اس کے لئے نائیوں کا ہی انتظار کرنا پڑتا اور انہی کے سامنے سر جھکانا پڑتا جو فی الواقع بھیڑوں کی طرح قیدیوں کے سر مونڈھ رہے ہوتے کیونکہ انہیں قریباً ایک گھنٹہ میں اندازاً ایک سو قیدیوں کو بھگتانا ہوتا تھا۔

مجھی اپنی چکی میں اکیلا دیکھ کر ڈیوٹی پر تعینات بعض ملازم میرے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے اور ایسا اکثر رات کے اوقات میں ہوتا۔ اُن میں سے بعض واقف ہوتے اور بعض ویسے ہی یہاں نئے ہونے کی وجہ سے از راہ ہمدردی یا وقت گزاری کے لیے میرے ساتھ آ کر باتیں کرنے لگ جاتے۔ گو میں فارغ تو نہ ہوتا مگر پھر بھی اُن سے باتیں کرنے لگ جاتا کہ کہیں نہ کہیں تو دعوت الی اللہ کا موقع مل ہی جائے گا۔ ایک ملازم جو کئی روز سے مجھے نماز پڑھتے دیکھ رہا تھا اور ہر روز سلام کرتا تھا آخر ایک رات میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ 6 سے 10 بجے والی شفٹ کی بات ہے جب اگرچہ وارڈ میں خاموشی چھا چکی ہوتی تاہم قیدی ابھی جاگ رہے ہوتے۔ وہ تعجب سے اِستفسار کرنے لگا کہ تمہیں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں کہ نماز بھی وہی پڑھتے ہو اور قرآن بھی وہی ہے پھر تمہیں مرزائی کیوں کہتے ہیں اور تمہیں مسلمان اپنے سے الگ کیوں کرتے ہیں۔ اللہ دے اور بندہ لے، مجھے اور کیا چاہئے تھا۔ میں نے اسے پہلے تو ایسے انداز میں مختصر جواب دیا کہ اس کی تشنگی اور بھی بڑھی اور جب اُس نے دلچسپی سے سوال کرنے شروع کئے تو پھر میں نے اسے جماعت کا تعارف کرایا اور درجہ بدرجہ جماعت کے عقائد سے آگاہ کیا۔ غرض وہ سوالات پوچھتا گیا اور میں اُسے جوابات دیتا گیا۔ رات کا وقت تھا اور مکمل خاموشی تھی اس وجہ سے ساتھ والی چکیوں میں آہستہ گفتگو بھی بآسانی سنی جاسکتی تھی۔ چنانچہ ہماری یہ باتیں اردگرد کی چکیوں والے قیدیوں نے بھی سنیں۔ صبح ہوئی تو مجھے ایک ملازم نے آ کر کہا بھئی تم یہاں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہو، باز آ جاؤ۔ میں نے کہا کہ میں نے کس کو تبلیغ کی ہے اور کس کو اعتراض ہے؟ اُس نے کہا کہ ساری وارڈ والے کہہ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کسی کا نام بھی بتاؤ گے؟ کہنے لگا مولوی منشاء کہہ رہا ہے کہ اسے منع کرو کیونکہ وہ ملازموں کو روک کر اپنے مذہب کی باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ اگر وہ اس طرح باز نہ آیا تو ہم دوسری طرح باز کرلیں گے۔ (مولوی منشاء چھاج کی طرح پھیلی ہوئی سرخ داڑھی والا سزائے موت کا ایک قیدی تھا اور غالباً محض اپنی اِسی داڑھی کی وجہ سے ہی یہاں 'عالم' سمجھا جاتا تھا)۔

ملاں زدہ اِس ملازم کی دھمکی آمیز بات سن کر میں نے نرمی کے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اسے اپنی عقل کو حاضر کر کے سوچنے کو کہا کہ اگر مجھ سے آ کر کوئی سوال پوچھے یا کوئی بات کرے تو کیا میں اس کو جواب نہ دوں؟ کہنے لگا بالکل دینا چاہئے۔ میں نے کہا: پھر اس میں میرا کیا قصور؟ ایک ملازم خود ہی آیا اور اس نے آ کر مجھ سے کچھ سوالات کئے اور میں نے اس کے جواب دیئے۔ کہنے لگا بالکل درست ہے۔ میں نے کہا کہ پھر ملازموں کو منع کرنا چاہئے کہ وہ میرے پاس نہ آئیں اور میرے ساتھ گفتگو نہ کریں۔ کہنے لگا بالکل درست ہے۔ پھر میں نے دوسرا پہلو اختیار کیا کہ اگر کوئی کسی کو

اپنے مذہب کی بات بتا بھی دے تو اس میں حرج کیا ہے؟ ہر کسی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی کی بات کو قبول کرے یا نہ کرے، کسی مذہب میں شامل ہو یا نہ ہو۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ بالکل صحیح ہے، کسی دوسرے مذہب سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ باتیں اُس سے تسلیم کروا کر اُسے پابند کیا کہ وہ واپس جا کر اس ''مولوی'' منشاء پر واضح کردے کہ وہ غلطی پر ہے۔ اگر اُسے کوئی مسئلہ ہے تو وہ میری باتیں سنتا ہی کیوں ہے! چنانچہ اس ملازم نے نہ صرف اس مولوی کو جا کر سمجھایا بلکہ میرے ساتھ بھی بہت زیادہ مانوس ہو گیا اور اس کے بعد جتنے دن بھی اس کی ڈیوٹی یہاں ہمارے وارڈ میں لگتی رہی وہ میرے پاس ضرور آ کر ملتا اور کچھ دیر گفتگو کرتا، فالحمدللہ۔

## سازش کی تیاری

یہ بات اُس روز تو آئی گئی ہو گئی مگر اس کے بعد اندر ہی اندر میرے خلاف یہاں محاذ بننے لگا۔ اِدھر میرے دِل میں جوش اِس قدر تھا کہ دوستوں کے سمجھانے کے باوجود میں اپنے واقعہ کا تذکرہ کرنے سے منع نہ ہوتا۔ مجھ سے جو بھی پوچھتا میں بے دھڑک اپنا اصل واقعہ بیان کر دیتا اور یہ بات ان لوگوں کو بُری لگتی کہ کلمہ مٹانے والے اللہ کے غضب کا نشانہ بنے۔ گو اکثر قیدی ہمدردی کا اظہار کرتے اور ایسے شر پسند لوگ چند ایک ہی تھے مگر فتنہ کے لئے تو ایک ہی کافی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے پہل میرے متعلق یہ کارروائی شروع ہوئی کہ ٹہلائی کے وقت جو قیدی میرے ساتھ ٹہلائی کرتا، اسے منع کیا جاتا کہ اس کے ساتھ ٹہلائی کیوں کرتے ہو۔ قوم کا ظرف ملاحظہ ہو۔ چنانچہ بعض لوگ تو اسی بات سے ڈر جاتے اور میرے ساتھ تعلق رکھنے سے کنارہ کش ہو جاتے۔ تاہم چند دوست ایسے بھی تھے جو کسی صورت بھی اِس بات پر آمادہ نہ ہوئے کہ میرے ساتھ تعلق نہ رکھیں۔ ایسے ساتھیوں میں سے دو خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں سگے بھائی بھوپالوالہ ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور چند ہفتے قبل انہیں اِنتظامی مسائل کی وجہ سے بہت سے دیگر قیدیوں کے ساتھ سیالکوٹ جیل سے یہاں منتقل کیا گیا تھا۔ یہ سمبڑیال والے چوہدری محمد اعظم صاحب سابق MPA کے پرانے واقف کار تھے اور چیمہ برادری سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے ہر موقع پر علی الاعلان میری حمایت کی، فجزاہما اللہ تعالیٰ۔ تاہم بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہیں کوئی ذرا سا دھمکاتا تو فوراً پیچھے ہٹ جاتے اگرچہ چھپ کر پھر بھی مل لیتے۔ بہرحال اس کے بعد مخالفت میں اضافہ ہونے لگا اور ہر روز نئے سے نئے شگوفے چھوڑے جانے لگے۔

## آنا ہمارا نچوں میں

سزائے موت وارڈ میں تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک ایک کمرے میں چار چار بلکہ بعض اوقات پانچ پانچ کے نچوں میں قیدیوں کو بند کیا جاتا تھا جو سخت تکلیف دہ صورت حال ہوتی جبکہ ہم دونوں ساتھیوں کو شروع میں اکیلے اکیلے

رکھا گیا تھا جو اس صورت حال میں ایسی سہولت تھی جسے دیکھ کر ہمارے مخالف قیدی تکلیف محسوس کرتے۔ چنانچہ اُنہوں نے ہمارے خلاف سازشیں اور شکایتیں کرنی شروع کر دیں کہ یہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں اس لئے انہیں بھی بچوں میں بند کریں تاکہ علیحدہ بند ہونے کا فائدہ اٹھا کر تبلیغ نہ کر سکیں۔ جب اُن کا شور زیادہ ہی بڑھ گیا تو ایک روز ہمیں بھی بچوں میں ڈال دیا گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اب میں اکیلا بند نہیں ہوا کروں گا بلکہ میرے ساتھ بھی دو یا تین مزید قیدی ہوا کریں گے۔ پہلے تو مجھے یقین نہ آیا مگر منشی سے مکرر پوچھا اور اس نے رجسٹر دیکھ کر تسلی کرائی تو یہ کڑوی گولی نگلنے کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ رانا نعیم الدین صاحب کے ساتھ وارڈ نمبر 2 میں رابطہ ہوا تو پتہ چلا کہ انہیں بھی آج سے بچوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ یہ کارروائی یہاں آنے کے پندرہ روز بعد ہوئی۔

## بچوں کا ماحول

بچوں میں آنے کے بعد پہلے روز تین قیدیوں کے ساتھ 10x10 فٹ کے کمرے میں بند ہوا تو ایک نئے ماحول سے تعارف کا سلسلہ شروع ہوا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ بند ہوتے ہی سب اپنے بستروں سے جھاڑو نکال کر فرش صاف کرنے لگے۔ صفائی ہو چکی تو بستر بچھانے کی باری آئی اور یہ عمل دائیں طرف سے شروع کیا گیا اور دیوار کے ساتھ جگہ ملنے والے قیدی نے سب سے پہلے بستر بچھایا پھر اُس کے ساتھ والے نے پھر اُس کے ساتھ والے نے اور آخر میں میری باری آئی۔ جتنی جگہ بچی اُس کے اوپر بستر بچھا کر یوں براجمان ہو گیا جیسے کوئی بادشاہ اپنی جاگیر کا تصور لئے تخت پر بیٹھتا ہے۔ بچکی کی صورت حال یہ تھی کہ زیادہ تر جگہ پر ہمارے بستر تھے۔ دروازے کے ایک طرف یعنی دائیں کونے میں بیت الخلاء کا انتظام تھا اور اس کے ساتھ میرے پاؤں کی طرف مختلف تھیلیوں اور لفافوں میں مٹی کا سٹاک تھا۔ دوسری طرف کونے میں گھڑے، مٹکے اور ایک دو بالٹیاں تھیں نیز چھوٹے سے گھڑے میں چار لوٹے پڑے تھے جن کی ٹونٹیاں ایک دوسرے کی طرف اُٹھی ہوئی عجیب نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ باقی جو جگہ بچی تھی اس پر ہماری جوتیاں پڑی تھیں۔ ایسے ماحول میں صرف بستر بچھاتے اور دیگر سامان درست کرتے ہوئے ہی سخت گرمی محسوس ہونے لگی تھی! ابھی پوری طرح بستر بھی لگا نہ پائے تھے کہ تلاشی والے آ گئے اور آناً فاناً لگے لگائے، سجے سجائے بستروں کو اوپر تلے کر گئے اور ہم ان کا منہ دیکھتے اور اپنے دانت پیستے رہ گئے۔ ان کے جانے کے بعد بستر پھر سے درست کئے۔ قریباً ڈیڑھ فٹ چوڑی جگہ میں بستر کو سیٹ کرنا کبھی اِدھر ہو کر اس کے بل نکالنا اور کبھی اُدھر ہو کر، بڑا دلچسپ عمل اور تجربہ تھا۔ میں نے تو اپنے سامان کا تھیلا بھی اپنے بستر پر ہی رکھا ہوا تھا کہ اس کے علاوہ جگہ ہی نہ تھی۔ تھوڑی دیر بعد نماز عصر کا وقت ہو گیا جس کے لئے وضو کرنے کا سلسلہ بھی ایک ترتیب چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے لئے سب سے پہلے جنوبی طرف والے

صاحب کو دعوت دی گئی، ان کے بعد دوسرے صاحب آئے اور وضو کر گئے پھر تیسرے اور آخر میں میری باری آئی۔ جوں جوں کوئی وضو کرتا گیا اپنی جگہ پر جا کر نماز شروع کرتا گیا۔ نماز کے بعد دعا اور تسبیحات کا لمبا سلسلہ چلا، اِس دوران کمرے میں مکمل سکون رہا۔

بچ میں میرا یہ پہلا دن تھا جس کا آغاز ہی بہت مشکل اور گھٹن والے ماحول میں ہوا۔ یقین جانئے تھوڑی دیر میں میرا دم گھٹنے لگا اور مجھے تیز چکر آنے لگے اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں کمرے میں نہیں کسی گاڑی کے ڈبہ میں بیٹھا ہوں جو تیزی سے بھاگے جا رہی ہے۔ میں بہت گھبرایا مگر دعا کے ذریعہ کمر ہمت کسی۔ اگلی صبح تک ڈیڑھ فٹ کے اِس بستر کے علاوہ کسی اور جگہ قدم تک رکھنا ممکن نہ تھا۔ خیر نماز عصر کے بعد کچھ دیر قرآن کریم پڑھا۔ اس طرح سے ذہن مصروف رہا پھر کھانے کا پروگرام شروع ہو گیا۔ میرے پاس تو سالن موجود تھا جسے میں نے صرف گرم کروانا تھا۔ سو تھوڑی دیر میں باہر دھونکی گئی انگیٹھیوں سے سالن گرم ہو کر آ گیا۔ کھانا ہم چاروں نے ایک ہی وقت میں شروع کیا اور ایک ہی دستر خوان پر کھایا مگر میں نے محسوس کیا کہ ایک دو ساتھیوں نے مجھ سے پوری پوری احتیاط کی ہے مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ نماز مغرب کے بعد میں نے چائے کا پروگرام کرنا چاہا۔ میں نے باقی تینوں ساتھیوں سے پوچھا تو کسی نے بھی چائے کی خواہش ظاہر نہ کی۔ چنانچہ میں نے صرف اپنے ہی لئے چائے کا پانی لیا اور انگیٹھی بنا کر اس کے اوپر رکھ دیا۔ انگیٹھی جلائی مگر وہ جلنے کا نام نہ لے، کچھ کوئلے گیلے تھے تو کچھ انگیٹھی کی سیٹنگ صحیح نہ تھی اس لئے خاصی پریشانی ہوئی تاہم ایک طویل اور صبر آزما کوشش کے بعد چائے تیار ہو ہی گئی اور میں نے اکیلے ہی پی۔ پیتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی رہی لیکن مجبوری تھی! اب تو اسی طرح سلسلہ چلنا تھا، اپنا اپنا کھانا، اپنا اپنا پینا ہونا تھا کیونکہ مجھ پر احمدی ہونے کی فردِ جرم بھی تھی۔ عشاء کی نماز پڑھ کر ایک ساتھی نے ایک کپڑا نکال کر درمیان والے بستر پر بچھایا۔ اس کپڑے پر ''اڈہ کھڈہ'' نامی ایک کھیل بنی ہوئی تھی۔ پھر دانے اور گھوٹیاں نکال کر میرے علاوہ تینوں کھیلنے لگے کہ مجھے اس کھیل سے بالکل واقفیت نہ تھی اس لئے میں صرف نظارہ ہی کرتا رہا۔ کھیل سے فارغ ہو کر انہوں نے آپس میں کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ لمبی لمبی مگر دلچسپ کہانیوں کا سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا مگر میں تو کمبل لپیٹ کر جلد ہی سو گیا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ بچ میں دل لگا رہنے کے باعث وقت تو آسانی سے گزر جاتا ہے مگر اُس ماحول میں نماز پڑھنے کا صحیح موقع اور لطف نہ تھا۔ علاوہ ازیں مطالعہ اور دیگر خط و کتابت کا بھی کوئی مناسب موقع ملنے کا امکان نہیں تھا۔

### انتہائی تکلیف دہ وقت

بچوں کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ وقت اگلی صبح نماز سے پہلے شروع ہوا جب چکی کے اندر بیت الخلاء کے مقاصد

کے لئے مخصوص کونہ کا استعمال شروع ہوا۔ اِس کا آغاز یوں ہوا کہ علی الصبح ہم میں سے ایک قیدی اُٹھا اور وہاں پہنچ کر ایک مخصوص انداز میں ہمیں ہوشیار کرتے ہوئے کہنے لگا "ٹھیک ہو جاؤ" جو میرے لئے بالکل نئی بات تھی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ ٹھیک کیسے ہوں۔ پھر دیکھا کہ باقی ساتھی دوسری طرف منہ کر کے اوپر چادر لے کر بیٹھ گئے ہیں تو خود ہی سمجھ آ گئی۔ چنانچہ میں بھی انہی کی طرح بیٹھ کر اُس وقت کے گزر جانے کا انتظار تو کرنے لگا مگر کمرے میں پھیلنے والی بدبو کے باعث میرے لئے یہ وقت اس قدر تکلیف دہ تھا کہ ناقابل بیان! لیکن اب اسے ہر صورت میں برداشت کرنا تھا۔ جب مذکورہ ساتھی فارغ ہو چکا تو اُس نے دوبارہ آواز دی کہ 'ٹھیک ہو جاؤ' یعنی معمول کی حالت میں آ جاؤ۔ جب چاروں ساتھی باری باری اِس عمل سے گزر چکے تو سب نے اپنی اپنی نماز فجر شروع کر دی، نماز کیا پڑھنی تھی سانس لینا دشوار بلکہ ناممکن ہو رہا تھا۔ ذرا تصور کیجئے کہ 10x10 فٹ کے اُس کمرے میں چار جوان پڑے ہوں جس کا ایک کونہ گندگی کے ڈھیر سے اَٹا پڑا ہو، وہاں فضا اور ہوا کی کیا کیفیت ہوگی۔ نہلے پہ دہلا یہ ہوا کہ اُس روز میری چکی نمبر 24 تھی یعنی دوسری ٹہلائی میں ہم نے کھلنا تھا۔ گویا پہلے دن ہی مجھے اِس حالت میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ زیادہ رہنا پڑا۔ نماز فجر کے بعد ناشتہ والا آیا سب نے چائے لی مگر ایسے میں چائے کیا پینی تھی؟ مگر وہ لوگ تو ایسے ماحول اور ایسی فضا کے عادی ہو چکے تھے، اس لئے وہ تو سب مزے سے ناشتہ کرنے لگے۔ خیر پہلی ٹہلائی اللہ اللہ کر کے ختم ہوئی تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہماری ٹہلائی کھل گئی اور ہمیں تکلیف دہ اور اذیت ناک حالت سے نجات مل گئی۔ دروازہ کھلنا تھا کہ میں جلدی سے باہر نکلنے کو دوڑا اور دوسروں کی طرح میں بھی دھوپ تلاش کرتے ہوئے ایک کونہ میں پہنچ گیا جہاں تھوڑی سی دھوپ آ رہی تھی۔ اس جگہ پہنچ کر چہل قدمی المعروف بہ 'ٹہلائی' کرنے لگا۔ ادھر وارڈ میں بھنگی آ چکا تھا اور باری باری ہر چکی کی صفائی کرتا جا رہا تھا۔ قریباً نصف گھنٹہ بعد ڈنکا بجا اور ہم اپنی اپنی چکیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں چکی میں داخل ہوا تو اندر زبردست طوفان بدبو برپا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے جھاڑو کیساتھ تھوڑی سے مٹی بیت الخلاء والی جگہ پر بکھیر دی اس طرح سے بدبو کا سرچشمہ کسی حد تک دب گیا اور بدبو میں کمی ہو گئی یا پھر ہماری ناکیں مانوس ہو گئیں۔ پہلے دن والا یہ عمل ہر روز اسی طرح ہر صبح دُہرایا جاتا اور ہم سب اسی تکلیف دہ کیفیت ولمحات میں سے ہر روز گزرتے۔

## مخالفت میں شدت

بنچوں میں آنے کے بعد میری مخالفت دن بدن زیادہ ہی ہونے لگی چنانچہ بعض افراد نے تو اپنی ٹہلائی ہی اس کام کے لئے وقف کر دی تھی۔ چنانچہ یہ لوگ اُردی سنائے جانے کے بعد اِس ٹوہ میں لگ جاتی کہ آج کس کس کی گنتی میرے ساتھ ہے پھر میرے ساتھ بند ہونے والوں کو سمجھاتے اور ضروری ہدایات دیتے۔ اُنہیں ایسا کرتے ہوئے کئی دفعہ میں

نے بھی دیکھا اور سنا۔ پھر ٹہلائی کے دوران میرے ساتھ چلنے والوں کو بھی سمجھاتے کہ اس کے ساتھ کیوں چلتے اور بات چیت کرتے ہو۔ اب ظاہر ہے سو افراد میں سے کسی نے تو میرے ساتھ چلنا ہی تھا اور یہی بات ان کے لئے موجب تکلیف ہوتی۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر بعض جاہل اور ناواقف لوگ تو واقعی پرہیز کرنے لگ جاتے اور جو ایسا نہ کرتا اس کی یہ مخالف ہو جاتے۔ بیچ میں بھی وہ پوری احتیاط کرتے، اکٹھے کھانا تو درکنار پانی بالٹی گھڑے اور لوٹے حتی کہ جوتی تک کے استعمال میں پوری پوری احتیاط برتتے۔ میں سوچتا کہ میں کہاں ہوں؟ جہاں سو سے زائد آدمی سب کے سب میرے خلاف ہیں، مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور میرے ساتھ دشمنی اور بغض رکھتے ہیں اور مجھے ان کے درمیان ہی رہنا ہے اور ان کے درمیان ہی ٹہلائی کرنی ہے۔ یہ جنونی قسم کے لوگ کسی بھی وقت مجھ پر پل پڑ سکتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں ایسے حالات کے لئے مخصوص نسخہ استعمال کرتا اور بکثرت حضرت خاتم النبیین ﷺ کی سکھائی ہوئی دعا

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ

کا ورد کرتا بلکہ ٹہلائی کا وقت ہوتے ہی اس دعا کا ورد میں نے معمول بنالیا اور ٹہلائی کے دوران جتنا بھی موقع ملتا اسی کا ورد کرتا رہتا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نفرت انگیز پُرخطر اور پُرہول ماحول کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مجھے پورے اعتماد کے ساتھ یہ وقت گزارنے کی توفیق عطا فرمائی اور جب بھی میرے سامنے کوئی آتا، میرے ساتھ ملتا یا بات کرتا تو میں اُسے مرعوب ہی پاتا، فالحمدللہ علی ذٰلک۔

## مخالفت کے باوجود تبلیغ!

مخالفت کے ساتھ ساتھ بچوں میں آنے کے بعد ایک مثبت تبدیلی بھی آئی کہ اس سے پہلے جنونی قسم کے افراد نے میرے متعلق جو پروپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ یہ قرآن کو نہیں مانتے، نماز نہیں پڑھتے وغیرہ وغیرہ کا ازالہ ہونے لگا۔ جب میں وضو کرتا تو یہ لوگ مجھے دیکھتے، میں نماز پڑھتا تو بھی دیکھتے اور قرآن پڑھتا تو حیران رہ جاتے اور اسی شش و پنج میں مبتلا ہو کر مجھ سے پوچھے بغیر نہ رہتے کہ بھئی! یہ بات کیا ہے، تمہاری نماز بھی وہی ہے، قرآن پاک لے کر دیکھتے، غور کرتے اور اسے بھی ویسا ہی پا کر پوچھتے تمہارے قرآن میں کیا فرق ہے؟ ظاہر ہے کہ جب یہ پوچھتے تو مجھے بتانا پڑتا کہ نماز بھی وہی ہے اور قرآن بھی وہی ہے صرف فرق یہ ہے کہ وہ امام مہدی علیہ السلام جن کی آمد کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی تھی، ہم کہتے ہیں کہ وہ آچکے ہیں اور تم لوگ ابھی تک اس کی انتظار میں ہو ۔

یارو جو مرد آنے کو تھا وہ تو آچکا    یہ راز تم کو شمس و قمر بھی بتا چکا

اس پر وہ تفصیل پوچھتے تو تھوڑی بہت باتیں بتانی پڑتیں۔ گو کہ میرے دل میں تو یہی خواہش ہوتی کہ میں زیادہ سے

زیادہ بتاؤں مگر میں ذرا تامل کرتا کہ تشنگی بڑھے اور زیادہ جستجو کے ساتھ پوچھے گا تو اس کی ذمہ داری بھی اس کے سر ہو گی۔ چنانچہ اس طرز پر تبلیغ کا ایک نیا سلسلہ چل پڑا اور بے شمار غلط فہمیاں دور ہونے لگیں۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے خلاف برسرِ پیکار ''مُلاں'' اور بھی سیخ پا ہو گئے کہ یہ کیا اُلٹ چکر چل پڑا ہے! چنانچہ وہ اور بھی برانگیختہ ہو کر میرے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ رُو برو تو کچھ کرنے یا کہنے کی جرأت و ہمت نہ تھی اس لئے اپنی سرگرمیوں کو زیرِ زمین ہی رکھتے رہے۔ پہلے تو انتظامیہ سے کہا کہ اس کی ملاقاتیں اتنی زیادہ کیوں آتی ہیں اور اتنے زیادہ افراد کو کیوں یہاں لایا جاتا ہے مگر اس معاملہ میں ان کی دال نہ گل سکی۔ پھر انہوں نے بعض بااثر قیدیان سزائے موت سے مشورہ کیا کہ باہر مولویوں کو خط لکھ کر اندر کی صورت حال سے آگاہ کیا جائے کہ احمدیوں کو ناجائز سہولتیں دی جارہی ہیں گو کہ اس میں کوئی صداقت تو نہ تھی مگر شوشہ چھوڑنا، فتنہ ڈالنا اور ہمیں تنگ کرنا ان کے مقاصد میں شامل تھا۔ بہر حال ہم اِن سب حالات سی بے پرواہ اور بے فکر ہو کر یارِ نہاں میں نہاں سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔

## رانا صاحب کی میرے والی وارڈ میں منتقلی

اب یہاں ایسی فضاء پیدا کر دی گئی کہ بہت سے لوگ مجھ سے بے زاری کا اظہار کرنے پر مجبور ہو گئے جس کی وجہ سے یوں لگتا کہ میرا قافیہ تنگ کیا جارہا ہو لیکن اِن باتوں کو میں اُوذُوا فِی سَبِیلِی کا حصہ سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا اور پینج میں ہونے کی وجہ سے بھی پہنچنے والی ہر اذیت کو بھی خواہ وہ جسمانی تھی یا ذہنی، ہر قیمت پر برداشت کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ 8x8 فٹ رقبہ کے ایسے ماحول میں 24 گھنٹے گزارنا بہت ہی مشکل تھا جس میں تین ذہن ایک طرف ہوں اور وہ مل کر چوتھے سے مکمل طور پر امتیاز برت رہے ہوں اور طرّہ اس پر یہ کہ ہر ذہن موت کے تصور سے شدید قسم کے ایسے ذہنی دباؤ Depression کا شکار ہو کہ وہ سوچتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو۔ ایسے میں اگر کوئی بات مجھے پریشان کئے ہوئے تھی تو یہی کہ یہ لوگ محض اپنی جہالت اور کمی علم کے باعث میرے ساتھ ایسا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔

ان میں سے بعض جسمانی طور پر تو گندے ہوتے ہی تھے لیکن اس سے بھی بڑھ کر بعض اِنتہائی غلیظ قسم کی اخلاقی بیماریوں میں بھی مبتلاء ہوتے اور انہیں اس آخری مقامِ حیات پر بھی خوفِ خدا نہ ہوتا۔ اس صورت حال کا علم ہونے پر خاکسار نے محترم امیر صاحب ساہیوال کی خدمت میں خط لکھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے مجھے ہنچوں سے نکلوانے کی کوشش کریں۔ اس پر چند دِنوں بعد ایک دِن مکرم رانا صاحب اپنا سامان اُٹھائے میرے والی وارڈ میں چلے آئے اور ہماری گنتی مستقل طور پر ایک ساتھ ڈال دی گئی یعنی ہماری اُڑدی ہر روز اکھٹے ہی لگتی۔ اگرچہ ہمارے ساتھ کوئی نہ کوئی تیسرا قیدی بھی ہوتا مگر ہم اپنا ماحول بنا ہی لیتے۔

ایک دو روز گزرے تو ایک غریب قیدی جس کی ملاقات پر آنے والا کوئی نہ تھا، کی درخواست پر ہم نے اس کی اُڑدی اپنے ساتھ پکی کروالی مگر دوسرے تیسرے دِن ہی لوگوں نے اُسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ایک روز جب وہ ہمارے ساتھ آکر بند ہوا تو زاروقطار رو رہا تھا کہ اُسے مجبور کیا جا رہا ہے کہ مرزائیوں کا ساتھ چھوڑ دو۔ ہم نے اسے کہا کہ اگر تمہیں مشکل ہے تو ہماری طرف سے تو کوئی ایسی پابندی نہیں۔ اُس روز اُسے ایک مولوی نما قیدی کی طرف سے سالن بھی آیا اور اسے تاکید کی گئی تھی کہ ''اِن'' سے سالن لے کر نہیں کھانا۔ رات ہوئی تو اسے چائے بھی آئی۔ گو اِس سے پہلے ان لوگوں نے اس غریب کا کبھی حال تک بھی نہ پوچھا ہو مگر احمدیت دشمنی میں اس کی ہر طرح سے خدمت کرنے کو تیار ہو گئے۔ اگلے روز اسکی اُڑدی ہمارے ساتھ نہ لگی۔

## مخالفت کی انتہاء

جیل انتظامیہ کی طرف سے ہماری اُڑدی اکھٹے کر دینے کے نتیجہ میں حاسد مخالفوں کے بغض میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور انہوں نے ہمیں سبق سکھانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک روز بند چکی میں مجھے سخت زدو کوب کیا گیا۔ اس کے لئے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت پہلے تو یہ شکایت کی گئی کہ یہ دو ہوتے ہیں اور مل کر تیسرے قیدی کو تبلیغ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد سے ہمارے ساتھ ایک چوتھا قیدی بھی بند کیا جانے لگا تا کہ توازن قائم رہے۔ یہ اپریل 86ء کی 10 یا 12 تاریخ کی بات ہے کہ اُڑدی لگی تو ہمارے بیچ میں دو ایسے قیدی بھی تھے جو ہمارے کٹر مخالف اور سخت معاند تھے اور جن کے دلوں میں ہمارے لئے سخت بغض تھا جس کا اظہار وہ گاہے گاہے کرتے رہتے۔ ان میں سے ایک تو یہاں کے خود ساختہ مولوی منشاء کا شاگردِ خاص تھا اور اِسی گھمنڈ میں اپنے آپ کو مجاہد اور خادم دین گمان کرتا بلکہ مذہبی ٹھیکیداری کرنے کی بھی کوشش کرتا، سابق فوجی ہونے کی وجہ سے جسمانی طاقت کا نشہ بھی اُسے تھا۔

اُس روز ہم ٹہلائی کے بعد جو بند ہوئے تو ان دونوں نے پہلے تو اپنے بستر ایک طرف کھینچ لئے اور پوری احتیاط کے ساتھ ہم سے پوری طرح بچتے بچاتے بستر بچھائے اور ہمیں ذرا ہٹ کر بستر بچھانے کو کہا۔ پھر پانی کے برتن بھی ایک طرف کھینچ لئے۔ گویا ابتداء سے ہی انہوں نے شرارت کا بیج بو دیا تھا۔ بہرحال ہم بھی اسی طرح محتاط ہو کر وقت گزارنے لگے۔ بظاہر تو خاموشی رہی مگر وہ دونوں اِشاروں کنایوں میں باتیں کرتے رہے اور عجیب و غریب قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کرتے اور منہ بناتے رہے۔ رات تو خیر سے گزر گئی اور صبح ہوئی تو ہم حسبِ معمول پروگرام کے مطابق مصروف رہے مگر اِس دوران اُن کے رویہ میں کچھ زیادہ ہی کھچاؤ آ گیا۔ تاہم اِدھر ہم اپنے آپ میں ہی کھوئے رہے کیونکہ ہمیں تو کسی بات کا علم تھا نہ ہی اندازہ کہ ان کے ذہنوں میں کیا کیا منصوبے جنم لے رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے

کہ صبح تک اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانہ سکنے پر ٹہلائی کے دوران انہیں کچھ نئی ہدایات ملی تھیں کہ اُلٹا سیدھا جیسا بھی بہانہ ملے ڈھونڈو اور انہیں سبق سکھلاؤ کہ کیسے اپنے عقائد کی تبلیغ کی جاتی ہے نیز نام نہاد 'اسلامی معاشرہ' میں ایسے شخص کے لئے جو حکومت کے قانون کے مطابق مسلمان نہیں، کیا آدابِ زندگی ہیں۔ خیر دوپہر ہوگئی، اڑدی بھی سنادی گئی اور ہم بستر وغیرہ سمیٹ رہے تھے کہ ان میں سے ''شاگردِ خاص'' نے ایک انتہائی گھٹیا اور جھوٹی بات کو بنیاد بنا کر میرے ساتھ بحث شروع کردی کہ صبح 'پیشاب' کر کے مٹی نہیں ڈالی تھی۔ میں نے کہا کہ میں نے تو ڈالی تھی اگر کم تھی تو مجھے بتادیتے تو تھوڑی اور ڈال دیتا۔ پھر اُس نے کہا کہ میں رات تمہاری تلاوت کی وجہ سے نماز نہیں پڑھ سکا اور صبح میں نے پیشاب کرنا تھا تم نے قرآن کریم 'نشان' نہیں کیا (یعنی ایسے مواقع پر احتراماً قرآن کریم بند کر کے رکھ دینا)۔ میں نے کہا کہ دوسری طرف منہ ہونے اور تلاوت میں مشغول ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کہ مجھے تمہاری بات سنائی ہی نہ دی ہو۔ اگر میں سن لیتا تو مجھے ایک منٹ کے لئے قرآن کریم کو نشان کر دینے میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ مگر یہ میری بھول تھی کہ وہ میری بات تسلیم کرلے گا۔ میں تو اُسے اپنے ذہن کی سطح پر ہی سمجھ رہا تھا مگر یہاں تو زمین و آسمان کا فرق تھا۔ میں اپنی طرف سے پوری سچائی، خلوص اور صاف دلی کے ساتھ جواب دے ہی رہا تھا کہ وہ اچانک اپنے کھڈے (بستر) سے اُٹھ کر آ گیا اور میرے سر پر کھڑا ہو گیا اور ساتھ ہی بغیر کسی سیاق و سباق کے اچانک مجھ پر مکے برسانے شروع کر دیئے۔ میں آرام سے اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور خیال تک نہ تھا کہ ایسی صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے، اس لئے مجھے کئی وجوہ سے دفاعی پوزیشن پر مجبور ہونا پڑا۔ بند چکی کے اندر یہ تجربہ اچھا خاصا خطرناک اور خوفناک تھا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے پورے شرحِ صدر کے ساتھ یہ مار کھالینے کے لئے اپنے آپ کو تیار پایا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ میری ان باتوں کی وجہ سے نہیں ہے جن کو بہانہ بنایا گیا ہے۔ اُس وقت پھر حضرت مولوی برھان الدین صاحب جہلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت یاد آئے۔

اس صورت حال میں رانا صاحب نے چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ تو سوچی سمجھی سکیم پر عمل کر رہا تھا۔ جب رانا صاحب نے زیادہ دخل دیا تو مجھے چھوڑ کر رانا صاحب کو پکڑ لیا اور انہیں مارنے کے لئے ایک کونہ میں دھکیلا ہی تھا کہ اس چوتھے نے دخل دے کر انہیں چھڑا دیا مگر منافقت کیساتھ ہی چھڑایا۔ انہیں چھوڑ کر وہ پھر میرے پیچھے پڑ گیا اور جب خوب سیر ہو لیا تو آرام سے بیٹھ گیا۔ اس ہنگامہ کا شور سن کر اردگرد کی چکیوں والے بھی ہوشیار ہوئے اور مشقتیوں کے ذریعہ خبر معلوم کرلی مگر قریب کوئی نہ آیا حالانکہ وارڈ میں ہر وقت وارڈرز اور ان کا نگران ہیڈ وارڈر موجود رہتے تھے۔ علاوہ ازیں پانچ چھ مشقتی بھی ہوتے مگر معلوم ہوا کہ یہ سب ایک منصوبہ کے تحت ہوا تھا اور عین اُس وقت سب کے سب

اِدھر اُدھر ہو گئے تھے تاکہ علم نہ ہو سکنے کا بہانہ کیا جا سکے۔ بعد میں اس واقعہ پر دوسرے قیدیوں کے تبصرے سن کر بڑی حیرانی ہوئی مگر ان کے یہ تبصرے اتنے غیر متوقع بھی نہ تھے۔ حیرت صرف اس امر پر تھی کہ وہ قیدی جو ہمارے ساتھ بظاہر اچھی طرح ملتے اور حتی المقدور استفادہ بھی کر لیتے انہوں نے بھی کہا تو یہ کہا کہ "جاؤ اور فوجی کو اور بھی مارنے کو کہو۔" اس سے مارِ آستین کی تمیز ضرور ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد اُڑدی اور ٹہلائی کے لئے ہمیں کھول دیا گیا۔ اس پر رانا صاحب نے مجھے ہیڈ وارڈر کے پاس رپورٹ کرنے کو کہا۔ میں اس کے پاس گیا اور واقعہ بیان کیا۔ اس پر اس نے مجھے کہا طفل تسلی دیتے ہوئے کہا کہ جاؤ میں اسے بلا کر اس کی خبر لے لیتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے اسے بلایا تو ضرور مگر اسے کچھ کہہ نہ سکا کیونکہ اس کے پشت پناہ پوری طرح اس کی مدد کر رہے تھے۔ آخر انہوں نے اگر سکیم بنائی تھی تو اس کے عواقب سے بچنے کا بھی انتظام کیا ہوگا۔

شام کو ہمارا انچارج اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رضوی شاہ آیا اور پہلے اس فوجی کے پاس گیا اور اس سے واقعہ پوچھا اور معمولی ڈانٹ ڈپٹ کی۔ پھر میرے پاس آ گیا اور مجھ سے واقعہ کی تفصیلات پوچھنے کے بعد اُلٹی مجھ پر ہی چڑھائی کر دی اور ایسے عیارانہ طور پر چڑھائی کی اور مجھے ہی قصوروار قرار دیتے ہوئے اُس نے اس بری طرح ڈانٹا کہ کسی کے وہم گمان میں بھی نہیں آ سکتا جس پر میں حیرت سے اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایسے میں میں نے اس موقع پر خاموشی ہی بہتر سمجھی کیونکہ ایسا تجربہ مجھے پہلی بار ہو رہا تھا اور ان لوگوں کے طریقۂ واردات سے بالکل بھی واقفیت نہ تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ اچھا ہے کہ مار بھی کھاؤ اور جھڑکیاں بھی بلکہ بہت ہی ذلت آمیز ڈانٹ ڈپٹ بھی سنو! لیکن سردست تو کچھ بھی کر نہیں سکتے تھے کیونکہ اندر کی کسی بھی کارروائی کا نتیجہ ہمارے لئے مفید نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ان کا تو منصوبہ ہی یہ تھا کہ انہیں تنگ کر کے مشتعل کرنے کے بہانے ڈھونڈو! اس قسم کی صورت حال کی تکلیف اور پریشانی ہماری نسبت ہمارے لواحقین کو زیادہ ہوتی تھی چنانچہ ہماری خاموشی کا نتیجہ ہمارے حق میں اچھا ہی نکلا اور بعد میں اس واقعہ کا خمیازہ تقریباً ساری وارڈ کو بھگتنا پڑا۔ چنانچہ ایک تو اس کے بعد وارڈ میں یکے بعد دیگرے کئی واقعات ہوئے جن سے وارڈ کا امن ختم ہو گیا اور کئی قیدیوں کو بری طرح مارا پیٹا گیا، خصوصی تلاشی کی کارروائیاں ہوئیں جن میں ہمارے مخالف قیدی جو اس واقعہ میں ملوث تھے بہت ذلیل ہوئے اور ہم نے اِنِّیْ مُهِيْنٌ مَنْ اَرَادَ اِهَانَتَكَ کا نظارہ دیکھا۔

## بی B کلاس

جیل میں عمومی طور پر قیدی جس حالت میں رکھے جاتے ہیں وہ نہایت ناگفتہ بہ ہوتی ہے مگر مجبوری کا نام شکریہ کے مصداق کبھی گزارا کرتے چلے جاتے ہیں تاہم یہاں نسبتاً باوقار طور پر وقت گزارنے کے لئے ایک سہولت بھی ہوتی ہے

جسے بی(B) کلاس کہتے ہیں۔ اس میں قیدی کو عام قیدیوں سے علیحدہ کمرے یا احاطہ میں رکھا جاتا ہے اور اُسے چارپائی کی سہولت کے ساتھ کھانا بھی خود تیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے بلکہ اسے ملتا ہی کچا راشن ہے۔ کھانا پکانے اور دیگر کام کاج کرنے کے لئے اسے قیدی بھی ملتا ہے جسے 'مشقتی' کہتے ہیں۔ اصولی اور قانونی طور پر تو یہ سہولت ہر اُس قیدی کو ملنی چاہئے جو گریڈ 17 کا سرکاری ملازم ہو یا جس کی تعلیم کم از کم بی۔ اے ہو یا پھر ایسا زمیندار یا کاروباری ہو جو ایک 'معقول' ٹیکس حکومت کو ادا کرتا ہو۔ علاوہ ازیں کوئی قیدی اپنے معاشرتی یا خاندانی Status کی وجہ سے بھی اس کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان تمام معیاروں سے قطع نظر پاکستان میں ایک معیار 'سفارش' کا ہے اور اِسے ہی سب سے زیادہ مؤثر وسیلہ ظفر سمجھا جاتا ہے۔

جب مجھے سزائے موت وارڈ میں مختلف نشیب وفراز سے گزرنا پڑا تو ہر بار یہی خیال ہوتا کہ اب معاملہ درست ہو جائے گا مگر اگلی دفعہ کسی اور بہانہ سے تنگ کیا جاتا تو اس کا مستقل حل یہ ذہن میں آیا کہ بی کلاس لگوالی جائے تو علیحدہ چکی مل جانے سے بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ کچھ عرصہ ایک طبعی جھجک مانع رہی کہ ان مشکلات سے پریشان ہو گیا ہوں مگر جب دیکھا کہ سزائے موت کے اس آخری مرحلہ پر بھی قیدی اخلاقی گندگی میں مبتلا ہیں تو اس جھجک کے باوجود میں نے ابا جان سے درخواست کی کہ میری بی کلاس لگوانے کی کوشش کریں کیونکہ قسم قسم کے نت نئے مسائل کے مستقل حل کی اب ایک یہی صورت نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ ابا جان نے فوری طور پر اس مقصد کے لئے کوشش شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے چند ہی دنوں میں 7 رمئی کو میری B کلاس لگ گئی۔ اس طرح سے مجھے علیحدہ چکی مل گئی اور میں بہت سی غلاظتوں اور کثافتوں سے محفوظ ہو گیا، الحمدللہ۔ اس کے لئے مکرم منیرالدین مسعود صاحب آف لاہور کا خصوصی تعاون ابا جان کو حاصل رہا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ بی کلاس لگنے سے تیسرے دن رانا صاحب کو بھی میرے پاس بھجوا دیا گیا اور اس طرح ایک ہی چکی میں ہم دونوں مستقل طور پر رہنے لگ گئے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا کیونکہ اگلے افسر نے آ کر کہا کہ یہ تو جیل کے بنیادی اصول کے ہی خلاف ہے کہ دو قیدی ایک چکی میں ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد رانا صاحب کی گنتی معمول کے مطابق مختلف چکیوں اور بنچوں میں پڑتی رہتی تاہم ان کا سامان اور کھانا پینا میرے ساتھ ہی ہوتا اور انہیں صرف اپنا بستر اُڑدی کے وقت دوسرے کمرے میں لے جانا پڑتا، اس کے لئے بھی میں نے اپنے مشقتی کی ڈیوٹی لگا دی ہوئی تھی۔

بی کلاس کے نتیجہ میں مجھے مستقل طور پر علیحدہ چکی مل گئی جس میں میز، کرسی، ایک چھوٹی سی الماری (ڈولی) اور بستر کے لئے فوم کا ایک گدا بھی شامل تھا۔ علاوہ ازیں کھانا پکانے اور سامان رکھنے کے لئے ایک زائد کمرہ بھی مل گیا۔ اس سب

کچھ کے ساتھ ایک قیدی کی ڈیوٹی بطور مشقتی بھی میرے ساتھ لگا دی گئی۔ تاہم ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اب ملاقات میری اپنی چکی میں ہی ہونے لگی اور میرے ساتھ مکرم رانا صاحب کو بھی کنڈم وارڈ کی طرف نہ لے جایا جاتا۔ چنانچہ ہمارے سارے ملاقاتی ہماری چکی میں آ کر سما جاتے اور جتنا بھی ہمیں وقت ملتا، باوقار طور پر مل بیٹھ کر حال واحوال دریافت کر لیتے۔ اس موقع پر ہم اپنے ملاقاتیوں کی حسب موسم ٹھنڈے یا گرم سے تواضع بھی کرتے جس پر ملاقات پر تشریف لانے والے نئے احباب حیران بھی ہوتے۔

جیل میں آنے کے بعد سزا سنائے جانے تک ہمارا وقت اللہ تعالیٰ کے فضل سے عمومی طور پر صاف ستھرے ماحول میں ہی گزرا، الحمدللہ، کیونکہ الگ رکھے جانے کی وجہ سے ہم اپنے مخصوص ماحول میں ہی رہے تھے۔ اب جب کوٹھی لگے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ رکھا گیا تو ان لوگوں کے طور اطوار، اخلاق کردار اور گفتار دیکھ کر بڑی حیرانی ہوتی کہ دنیا میں اس قسم کے لوگ بھی ہیں۔ ہر بات میں جھوٹ بولنے کی عادت اور دھوکہ دینے کی عادت ان لوگوں کی فطرت ثانیہ بلکہ اُولیٰ بن چکی تھی اور ایسے شوریدہ ماحول میں رہتے رہتے ان کی حس غیرت بھی مر چکی تھی۔ چنانچہ اس کا مشاہدہ اس وقت ہوا جب دو قیدی آپس میں مذاق کرتے ہوئے جھگڑنے لگے اور ایک دوسرے کو گندی گالیاں دینے لگے۔ ایک انتہائی غلیظ اور ننگی گالی دیتا تو دوسرا سن کر ہنس دیتا، اور دوسرے کی باری پر پہلا ہنس دیتا۔ میں ان کے اس جھگڑے کو سن کر شرمسار بھی ہو رہا تھا اور سوچنے لگا کہ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی فطرت مسخ ہو چکی ہے۔ میں سوچتے سوچتے اس نتیجہ پر پہنچا کہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آپ نے اپنی جماعت کو کردار اور گفتار کے اُنہی اعلیٰ معیاروں سے روشناس کرایا جو ہمارے آقا و مولیٰ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے سکھائے تھے اور اس طرح سے آپ نے ہمیں حقیقی اسلام سے بہرہ ور کیا ہے۔ آپ یقیناً سچے ہیں اور وہی امام مہدی ہیں جن کی بعثت کی خبر سیدنا حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے دی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ ایسے ہی لوگوں کو دین کی اقدار سے آراستہ کرنے کا عظیم الشان مشن جماعت احمدیہ کے سپرد ہے جو اگرچہ ان لوگوں کی حالت دیکھ کر بہت مشکل دکھائی دیتا ہے مگر ہمارے امام ہمام علیہ السلام کا عزم بھی تو بہت بلند تھا۔ آپ کا ہی تو ارشاد ہے کہ میری سرشت میں ناکامی کا خمیر نہیں۔ اس صورت میں کم از کم میں تو استغفار کرتے ہوئے اپنے مولیٰ سے ملتجی ہوں کہ وہ اپنے فضل سے ہماری یہ جسمانی قربانی جو گزشتہ دو سال سے اس کے حضور پیش کئے ہوئے ہیں، قبول فرمالے اور اس کے بدلہ میں خود بخود ایسے سامان کر دے کہ مسخ شدہ فطرت والے اِس قسم کے لوگوں کی بھی اصلاح ہونے لگے۔ شاید ہمارا وجود اسی طرح دین کے کچھ کام آ جائے اے کاش ایسا ہو جائے۔ آمین۔

## سزائے موت میں رمضان المبارک

ماہ مئی 1986ء کے وسط میں جو رمضان المبارک آیا تو زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مکمل روزے رکھنے کی توفیق ملی، الحمدللہ۔ اِس سے پہلے جتنے بھی رمضان آئے، اُن میں کسی نہ کسی مجبوری کے باعث ایک نہ ایک روزہ چھوٹ ہی جاتا رہا جسے بعد میں رکھ کر رمضان کی گنتی پوری کرتا اور اِس سال حالت ابتلاء کی بدولت ماہِ رمضان میں پہلی مرتبہ مکمل روزے رکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہاں دن کا زیادہ حصہ بند رہنے کی وجہ سے قرآن کریم کی تلاوت کا کہیں زیادہ موقع تھا جس سے مستفیض ہونے کی بھرپور کوشش کی اور شاید سب سے زیادہ مرتبہ قرآن کریم کے دَور یہاں ہی کرنے کی توفیق ملی، الحمدللہ۔

سزائے موت وارڈ میں رمضان بقیہ جیل کی طرح ہی تھا۔ بند چکی میں علی الصبح روزہ رکھنا اور بند چکی میں ہی سرِ شام روزہ کھولنا۔ سحری و افطاری کے وقت اپنے ساتھیوں تک کھانے کی کوئی چیز بھجوانی اسی طرح دشوار بلکہ بعض اوقات ناممکن تھی جس طرح عام وارڈ میں۔ ایک روز سحری کے وقت میں نے چائے تیار کر کے ملازم کو بلایا کہ مکرم رانا صاحب کو پکڑا دے تو وہ قانون بتانے لگ گیا کہ رانا صاحب دوسرے پہرے میں ہیں اور وہ وہاں نہیں جاسکتا۔ میں نے کہا بھئی! اپنے پہرے کے کنارے پر کھڑے ہو کر دوسرے پہرے والے ملازم کو آواز دے کر بلالو کہ آگے وہ پکڑا دے تاکہ ایک مجبور بوڑھے شخص کو گرم چائے کے دو گھونٹ تو میسر آجائیں مگر تعصب کا مارا ہوا وہ ملازم نہ مانا اور اَکڑ کر کہنے لگا کہ میں ایسا بھی نہیں کروں گا۔ مجھے اس کے رویہ پر سخت افسوس ہوا کیونکہ اس طرح کا رویہ عام طور پر دیکھنے میں نہ آتا تھا۔ بہرحال میں نے اپنی چائے بھی ایک طرف رکھ دی۔ اُس روز اگر میرے ساتھی کو چائے نہ پہنچ سکی تھی تو میں نے بھی سوچا کہ یہ کونسی ایسی چیز ہے کہ اس بغیر روزہ ہی نہ رکھا جاسکے۔ بعد میں پتہ چلا کہ بعض لوگ ہمارے ساتھ ایسا رویہ دراصل ''خدمتِ دین'' کے جذبہ کے تحت رَوا رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک قیدی نے بتایا کہ ایک ہیڈ وارڈر تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرنے لگا تھا تو میں نے کہا کہ کیوں خوامخواہ اُسے تنگ کرتے ہو، تو اس ہیڈ وارڈر نے جھنجلا کر جواب دیا کہ یار! میں جب بھی کوئی خدمتِ دین کرنے لگتا ہوں تم درمیان میں آجاتے ہو، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

### عید الفطر

جون 86ء میں رمضان المبارک کے اختتام پر اس حال میں پہلی مرتبہ عید الفطر کا بابرکت موقع آیا کہ ہم جیل کے اندر جیل میں تھے۔ اُس روز اِنتہائی خوشی اور مسرت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اِس ماہ رمضان میں پورے روزے رکھنے کی توفیق و سعادت سے نوازا ہے جو سزائے موت کی کوٹھڑی میں آیا۔ اُس روز صبح ہی صبح ہمارے دیگر سب ساتھی بھی ہمارے پاس

آ گئے تھی بلکہ ان کے علاوہ تین اور احمدی احباب بھی جو اُس وقت ساہیوال جیل میں تھے، ہمارے پاس آ گئے تھے جس کی وجہ سے خوب رونق ہوگئی تھی۔ چنانچہ ہم نے افسر مجاز سے خصوصی اجازت لے کر کنڈم وارڈ کی ایک چکی میں نمازِ عید ادا کی۔ اِدھر میں تو کھلا ہی تھا، رانا صاحب کو بھی ساتھ لے لیا اور اِس طرح سے ایک عرصہ بعد ہمیں نماز باجماعت ادا کرنے کا موقع میسر آیا۔ یہ موقع اپنوں سے دُوری کے غم خصوصاً حضور انورؒ کے تصور کے باعث رقت کی کیفیت بھی لئے ہوئے تھا اور اس کیفیت کے ساتھ حمد وشکر اور خوشی وانبساط کے اِمتزاج کی وجہ سے ناقابل بیان کیفیت تھی۔ موسم بہت سخت گرم تھا اور اس بند کمرے میں پنکھا بھی نہ تھا جس وجہ سے پسینہ سے شرابور ہورہے تھے اس لئے نماز ادا کی اور مختصر سا خطبہ دیا۔ پھر ہم سب اُدھر سے واپس اپنی چکی میں آ گئے۔ میں نے اُس روز چکی میں بیٹھنے کے لئے خصوصی انتظام کر رکھا تھا اور سارے کمرے میں چادریں بچھا کر کافی کھلی جگہ بنائی ہوئی تھی چنانچہ سب دوست آسانی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ یہاں ہم نے عید ملن دعوت کی اور شام تک آنے جانے والوں سے ملنے جلنے اور ان کی تواضع کرنے میں وقت گزارا۔

عید کے اِس موقع پر سارا دن ایک یاد آتی رہی اور دُعا بن کر عرش کی طرف محوِ پرواز رہی۔ وہ یاد اپنے عزیز واقارب کی یاد تھی، وہ یاد اُن کروڑوں دلوں کی تھی جو ہماری خاطر تڑپ رہے تھے، اُن کروڑوں آنکھوں کی یاد تھی جو ہماری یاد میں آنسو بہا رہی تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر ان کروڑوں دلوں کے دل اور آنکھوں کے نور کی یاد ستاتی رہی۔ میری مراد اپنے شفیق امام حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہے۔ ہمیں یہ یاد اس لئے نہیں تڑپاتی تھی کہ کاش ہم بھی ان کے درمیان ہوتے بلکہ اس کا اول وآخر یہ تھا کہ ہم تو ٹھیک ہیں مگر ہمارے یہ پیارے کس طرح ہماری خاطر بلبلا رہے ہوں گے۔ ان کے سینے ہماری خاطر بریاں ہو رہے ہوں گے۔ ان کی روحیں گداز ہو رہی ہوں گی تو ان کے قلب وجگر خون ہوئے جا رہے ہوں گے۔ اپنے ان کروڑوں پیاروں کے دَرد وکرب سے تڑپنے کا تصور ہمارے لئے ناقابل برداشت تھا ؎

میرے زخموں پر لگا مرہم کہ میں رنجور ہوں ‏ ‏ ‏ میری فریادوں کو سن میں ہو گیا زار و نزار

تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری یہ مشکلات اور تکلیف دہ حالات، آسان نظر آنے لگے کہ قانون فطرت ہے:

’رنج سے خوگر ہوا اِنساں تو مٹ جاتا ہے رنج ‏ ‏ ‏ مشکلیں مجھ پر پڑیں اِتنی کہ آساں ہوگئیں‘

چنانچہ دن تیزی سے گزرنے لگے اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ سرما کے بعد موسم بہار نے زخم تازہ کئے پھر گرمیاں آئیں اور پھر برسات نے اپنی برکھا رُت دکھائی۔ عید الفطر کے بعد عید الاضحیٰ بھی گزر گئی اور ہم اس ماحول سے گویا مانوس

ہو گئے۔ ہر موسم اور ہر تہوار کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے چلے گئے۔ یہی وجہ تھی کہ اب ہمیں اسیری کی مشکلات کی اُس طرح پرواہ نہ ہوتی جیسا کہ ایک آزاد شخص جیل کی زندگی کو دیکھتا ہے۔

## ریڈیو کی سہولت

بی کلاس لگنے کے ساتھ ہی ابا جان نے مجھے جیل میں ریڈیو رکھنے کی منظوری بھی ہوم ڈیپارٹمنٹ سے دلوادی تھی جس سے حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کا ذریعہ میسر آ گیا تھا۔ اسی طرح دیگر بہت سے تفریحی، علمی اور معلوماتی پروگرام سننے کا موقع بھی مل جاتا چنانچہ بی بی سی سے نشر ہونے والے متعدد سلسلہ وار پروگرام باقاعدگی سے یہاں ہی سنے جن کی یاد ابھی تک ذہن پر تازہ ہے۔ صبح ہوتے ہی مکرم رانا صاحب میرے پاس پہنچ جاتے اور بی بی سی کی خبریں لگا کر محفل جما لیتے۔ اس طرح سے وقت بھی سہولت سے گزر جاتا اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا رہتا۔

## سازشیں

جیل میں طرح طرح کی سازشیں ہمارے خلاف ہوتی ہی رہتیں۔ جب اس بارہ میں کوئی خبر ملتی تو ایک مرتبہ تو دل ودماغ پریشان ہو جاتا لیکن جیل بھگتنا، تو دراصل اسی قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا تھا ورنہ جیل کوئی مافوق الفطرت جگہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہر ایسی صورت میں خدا تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرتے کہ وہی اپنے فضل سے ہمیں شامت اعمال سے بچائے اور ہر شر سے محفوظ رکھے، آمین۔ حق تو یہ ہے کہ جیل میں ہمیں جس قسم کے حالات کا سامنا ہوتا اُن میں صرف خدا کی ہی ایک ذات بدخواہوں سے بچا سکتی تھی ورنہ ہمارے پاس کوئی مادی طاقت تھی نہ ہی ہمیں چالاکیاں آتیں کہ ہم شریروں کی شرارتوں سے بچ سکتے۔ ایسے میں صرف اور صرف یہی دعا ہمارا سہارا ہوتی:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ

اے اللہ! ہمیں کانٹوں کے اس جنگل میں سے اپنا پہلو ہر دم بچاتے ہوئے چلتے چلے جانے کی توفیق بخشنا، آمین۔

## چکی کی اچانک تلاشی

ہمیں تنگ کرنے کے لئے کیسے کیسے حربے اختیار کئے جاتے اور حسد کی آگ میں جل کر کس قسم کی خوفناک سازشیں کی جاتیں، ان کا اندازہ اس واقعہ سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ایک روز صبح کے وقت عام ٹہلائی بند ہونے کے بعد میں اپنے بی کلاس ساتھیوں کے ساتھ بیرونی دروازہ کے پاس وارڈ کے اندر بنے ہوئے چھوٹے سے باغیچہ میں کھڑا دھوپ کا مزا لینے کے ساتھ ساتھ چائے پی رہا تھا۔ بڑے خوشگوار ماحول میں ہلکی پھلکی باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک دروازہ کھلا اور چیف ہیڈ وارڈر پریڈ کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے پیچھے بڑے افسران آ رہے ہیں۔ ہم ابھی

سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنے بھرپور افسرانہ طمطراق کے ساتھ داخل ہوئے اوران کے بعد چھوٹے افسران اور اہلکاروں کے ساتھ نمبرداروں کی فوج! عام طور پر ایسے مواقع پر ہم بی کلاس والوں کو بھی چکیوں میں بند کر دیا جاتا تھا مگر آج تو کسی کو کوئی موقع ہی نہ ملا تھا۔ ہم دم بخود وہاں کھڑے رہ گئے اور وہ سب وارڈ کے اندر چلے گئے۔ ہم بھی ان کے پیچھے جانے کے لئے آگے بڑھے تو آواز آئی کہ الیاس منیر کہاں ہے؟ میں تیزی سے آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کچن والی چکی کے سامنے سارا لشکر کھڑا تھا۔ جونہی میں وہاں پہنچا تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے حکم جاری کیا کہ سارے ٹینے کھول دوں تو میں نے سب تالے کھول دیئے۔ اس پر نمبردار اور وارڈر میرے سامان پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے ہر چیز اُلٹا کر رکھ دی حتی کہ کوئلوں والا تھیلا بھی زمین پر بکھیر دیا۔ میں وہاں کھڑا حیران ہوئے جارہا تھا کہ انہیں ہوا کیا ہے؟ لیکن ڈپٹی صاحب نے خود اپنے سامنے میرے تمام سامان کی پوری طرح چھان بین کرائی اور ہر طرح سے تسلی کرنے اور سب کچھ بڑی بے دردی کے ساتھ بکھیرنے کے بعد خاموشی سے واپس چلے گئے۔

یہ خبر ساری وارڈ میں ایک لمحہ میں پھیل گئی اور ہر کوئی پوچھنے لگا کہ کیا ہوا؟ مگر میری کیفیت تو یہ تھی کہ مجھے کوئی بتلائے کہ بتلاؤں کیا! بہرحال اس میں سب سے اہم امر یہ تھا کہ اس کے نتیجہ میں کوئی ناخوشگوار بات نہ ہوئی۔ بعد میں بتانے والوں نے بتایا کہ میرے متعلق کسی نے سازش کی تھی کہ اس کے سامان میں کوئی ناجائز چیز پھینک دی جائے اور پھر اس پر چھاپہ مروایا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی سازش اِس طور پر کامیاب نہ ہوسکی کیونکہ غالباً چھاپہ پہلے پڑ گیا یا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا، ہم نے اللہ تعالیٰ کی حفاظت کا ایک اور مرتبہ نظارہ کیا، فالحمدللہ۔

## میرے خلاف زیر زمین سرگرمیوں کی خواب میں اطلاع

مؤرخہ 24 فروری 1987ء کی صبح نماز اور تلاوت سے فارغ ہوکر جو لیٹا تو ایک عجیب نظارہ دیکھا جس کی اُس وقت تو بالکل ہی سمجھ نہ آئی مگر بعد میں لفظاً لفظاً پورا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ میں اپنی چکی میں بیٹھا ہوں کہ میرے پرائمری اور مڈل کے اُستاد محترم شیخ مبارک احمد صاحب (موجودہ ناظر بیت المال آمد، صدر انجمن احمدیہ پاکستان) تشریف لاتے ہیں۔ اُس وقت میرے پاس یہاں کے ہی ایک قیدی راؤ بھوپل بھی بیٹھے ہیں۔ میں اپنے مشقتی کو بلا کر چائے بنانے کو کہتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے دروازے کے سامنے سے 'پوچا' کھینچتے ہوئے گزرتا ہے۔ میں اُسے دیکھ کر حیران ہوکر کہتا ہوں کہ تم یہ کیا کر رہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے شریف ہیڈ وارڈر نے زبردستی اس کام پر لگا دیا ہے۔ اس پر میں اس سے فوراً پوچا چھڑوا دیتا ہوں اور اس ہیڈ وارڈر کو سخت سست کہنے لگتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی منظر بدلتا ہے اور

میں اپنی چکی میں داخل ہوتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ اندر مشتاق نامی ایک قیدی سزائے موت میری ردی والی ٹوکری کے پاس مشکوک انداز میں بیٹھا ہے اور اس میں ہاتھ ڈالے کچھ کر رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں تو وہاں کپڑے یا کمبلوں کے ریشوں کا ایک چھوٹا سا گولہ نظر آتا ہے جس پر مجھے اس کی حرکتوں اور رویہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس نے کوئی شرارت کی ہے اور کوئی ناجائز چیز چھپائی ہے۔ چنانچہ میں سختی سے اسے ڈانٹتا ہوں اور اپنی ڈولی کے ساتھ پڑے میز کے نیچے دیکھتا ہوں تو وہاں گول شکل کی چھوٹی سی ایک ٹکیہ (جس میں سوراخ ہے) ملتی ہے۔ میں اُسے افیون کی ٹکیہ سمجھتا ہوں اور اُسے اٹھاتا ہوں تو وہ قیدی میرے پیچھے پڑ جاتا ہے اور چھیننے کی کوشش کرتا ہے گویا یہ ٹکیہ اُسی نے یہاں رکھی تھی۔ چھینا جھپٹی کی کشمکش میں ہم دونوں اُلجھتے ہوئے چکی کے باہر پہنچ جاتے ہیں۔ جب وہ زیادہ زور کے ساتھ میرا ہاتھ کھول کر چھیننے کی کوشش کرتا ہے تو میں اونچی آواز میں کہتا ہوں کہ میں 'مُدّا' پکڑوا دوں گا یعنی رپورٹ کر دوں گا۔ اس پر وہ میری منتیں کرتے ہوئے مجھے چھوڑ کر اپنی چکی کی طرف چلا جاتا ہے۔

ان ہر دو نظاروں کی وجہ سے میرے ذہن پر اثر تھا اور اس گھبراہٹ کے ازالہ کیلئے میں نے کچھ صدقہ دینے کی نیت کی اور استغفر اللہ ربی من کل ذنبٍ واتوب الیہ کا ورد کرتا رہا۔ ان ہر دو نظاروں سے میرا ذہن اس طرف گیا کہ مجھے جیل انتظامیہ اور قیدیوں کی طرف سے سازشوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔ چنانچہ یہاں میں چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا دعائیں کرتے ہوئے اپنے سفر پر رواں دواں رہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی کسی بھی صورت حال سے محفوظ و مامون رکھے:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجْعَلُکَ فِیْ نُحُوْرِھِمْ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شُرُوْرِھِمْ

وہ قادر اور عالم الغیب اور خیر الماکرین مولیٰ میری راہنمائی فرمائے، میری مدد اور نصرت فرمائے اور میرے خلاف منصوبے بنانیوالوں، مجھے خوامخواہ تنگ کرنے والوں کو ناکام کرے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ کے علاوہ اُس شام ایک واقعہ ہو بھی چکا تھا جس سے اندازہ ہو گیا کہ زیر زمین سرگرمیاں جاری تھیں۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اور اس حالت مجبوری سے ہی نجات بخش دے، آمین ثم آمین۔

26 فروری 87ء کو دو واقعات ہوئے جن سے اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا نظارے دکھا کر مخالفانہ سازشوں سے بروقت باخبر کر دیا ہے۔ چنانچہ سزائے موت کا ہی ایک قیدی جس کے بعض افسران کے ساتھ تعلقات تھے، میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ فلاں افسر پیسے مانگ رہا تھا جس پر میں نے تمہاری طرف سے بڑی بھرپور وکالت کر دی ہے کہ وہ تو اس پوزیشن میں نہیں ہے۔ اُس کی بات میرے لئے کوئی نئی یا ناقابل فہم نہ تھی۔ اس لئے اُس کی تقریر کے

آخر تک پہنچنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا جواب سکھا دیا کہ وہ لاجواب ہو کر چلا گیا۔ پھر ایک روز یہی صاحب مجھے کہنے لگے کہ تمہارے متعلق وارڈ میں یہ بات پھیل گئی ہے کہ تم سارا دن بیٹھے قرآن کریم کے الفاظ مٹاتے رہتے ہو اور بعد میں اپنی مرضی کے مطابق لکھتے رہتے ہو۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم۔ اس قسم کی باتیں بنانے سے ان کا مقصد صرف اور صرف یہی تھا کہ اسے پریشان رکھو اور جہاں جو بات چل جائے چلا دو اور اس کے خلاف محاذ کھول دو مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کی ہر سازش کو ناکام ہی بنایا اور زنداں میں اسیر کے ساتھ رہا۔ تاہم اِن باتوں سے یہاں کے ماحول اور مسائل و مشکلات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمیں کس قسم کی ذہنی اذیت سے ہر وقت دوچار رہنا پڑتا تھا۔

## اللہ کی مدد کیسے کیسے آتی رہی!

معمولی باتوں سے لے کر بڑے بڑے امور تک اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے حل فرماتا رہا اور اس کے ایک دو نہیں اَن گنت واقعات ہماری اِس دس سالہ سرگزشت میں موجود ہیں۔ ہم ہر ایسے موقع پر ''نہ ڈر، قریب ہوں میں'' کی سرگوشیاں سنتے اور اللہ کی رحمت و مدد کے نظارے کرتے۔ ایک ایسا واقعہ 14 جون 1987ء کو بھی ہوا جب ہفتہ وار دورہ کے بعد ہیڈ وارڈر نے آ کر بتایا کہ صاحب بہادر نے تمہارا کچن خالی کروا کر اس میں کسی قیدی کی گنتی ڈالنے کو کہا ہے اور ہمیں بی کلاس کے دوسرے قیدیوں والا کچن ہی مشترکہ طور پر اِستعمال کرنا ہوگا۔ اگرچہ یہ کوئی ایسی بات تو نہ تھی مگر اِس اِعتبار سے کہ دوسرے جب چاہتے ہمیں احمدی ہونے کا طعنہ دے کر کھانے کے برتن علیحدہ کر دیتے۔ اسی وجہ سے، ہم ہمیشہ یہی کوشش کرتے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہی نہ ہو اور ہم پہلے سے ہی علیحدہ رہیں۔ علاوہ ازیں محترم رانا صاحب کی ملاقات کے بارہ میں بھی اُنہی دنوں حکام نے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا جس کی تفصیل اس طرح سے ہے کہ جب سے میری بی کلاس لگی تھی، میری تو ملاقات میرے سیل میں ہی ہونے لگی تھی اور اسی بہانہ مکرم رانا صاحب کی بھی ان کے سیل میں ہی ہونے لگی تھی مگر 14 اکتوبر 87ء کو ہماری ملاقات آنے پر اچانک کسی وجہ کے بغیر رانا صاحب کو کنڈم وارڈ میں لے جا کر بند کر دیا۔ عین آخری وقت یہ کارروائی کی گئی کہ اس وقت کچھ کیا بھی نہ جاسکتا تھا۔ اس پر میں پریشان ہوگیا کہ ان کے بچے آئیں گے تو کیا سوچیں گے۔ اسی کیفیت میں جس قدر بھاگ دوڑ ہوسکی کی مگر بات نہ بنی۔ ہر چند کہ جیل کے ماحول کے اعتبار سے بات کوئی اتنی بڑی نہ تھی مگر وقت کی نزاکت ایسی تھی کہ اس نے بری طرح پریشان کر کے رکھ دیا اور یہ سب کچھ دراصل ہمیں تنگ کرنے کے لئے کیا جاتا۔

چنانچہ اب جب ہمیں تنگ کرنے کے لئے ہمارے کچن کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو میں اولین فرصت میں رانا

صاحب کے پاس گیا اور اس نئی صورت حال سے آگاہ کر کے اُن سے مشورہ چاہا۔ مگر انہوں نے خاموشی اختیار کی اور کہا کہ اب کیا ہو سکتا ہے کہ یہ جیل ہے! یہاں یونہی گزارہ کرنا پڑے گا۔ اس پر میں نے اپنا خیال ان کے سامنے رکھا کہ امیر صاحب ساہیوال کو خط لکھا جائے اور اُن سے درخواست کی جائے کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب سے مل کر صحیح صورت حال اور اس مسئلہ کی نزاکت واضح کریں۔ چنانچہ رانا صاحب نے اس سے اتفاق کیا جس پر میں واپس اپنے سیل میں آ گیا اور کاغذ قلم پکڑ کر خط لکھنا شروع کر دیا۔ خط لکھتے ہوئے جب اس بات پر پہنچا کہ ''آپ چوہدری حفیظ الدین صاحب کو بھی ساتھ لائیں'' تو میرے دل نے مجھے جھنجھوڑا کہ تم عاجز انسانوں کی طرف تو فوراً بھاگنے لگے ہو، خدا سے مدد نہیں مانگ رہے۔ چنانچہ میں نے اپنے خیالات کا دھارا خدا تعالیٰ کی طرف موڑ دیا تاہم بطور ''ہمت مرداں'' خط مکمل کیا۔ بس خدا تعالیٰ کو میرے خیالات کا مڑا ہوا یہی دھارا بھا گیا اور ابھی قاصد کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ مجھے اپنے دروازے پر لٹکے ہوئے پردہ کے پیچھے سے پیار بھری آواز آئی ''اچھے ہوئے گا میرا شہزادہ''، میں آواز پہچان گیا۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا تو سامنے ملک اعجاز صاحب (انچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ) نظر آئے۔ ان کے ہمراہ محبت کرنے والے ہمارے ایک بزرگ پیار اور شفقت بھرے جذبات کے جلو میں میرے لئے بیتاب کھڑے تھے۔ آج اُن کے ساتھ محترم سید شکیل احمد صاحب علوی بھی تھے۔ میں ان سے بغلگیر ہوا۔ یہ دونوں بزرگ بے پناہ محنت کے ساتھ مجھ سے ملے۔ اُن کی یہ محبت عقیدت کی حدوں کو پھلانگ رہی تھی جس سے مجھے ندامت محسوس ہو رہی تھی اور واقعۃً میں عرقِ اِنفعال سے تربتر ہوئے جا رہا تھا۔ ہم اندر آ کر بیٹھے، تھوڑی دیر میں غیر متوقع طور پر رانا صاحب بھی یہاں آ گئے۔ مشقتی نے پانی بنایا۔ پانی پیتے پیتے رانا صاحب کی ملاقات والا مسئلہ اور آج صبح پیدا ہونے والی تازہ ترین صورت حال کی تفصیل بتائی اور پھر اچھی طرح سے فنی بنیادوں پر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے دلائل اور ضروری نکات سمجھائے۔ جس پر ہمارے ملاقاتی دوست نے یقین دلایا کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرانے کی پوری کوشش کریں گے اور یہ کہ صاحب بہادر سے بات کرنے کے بعد جو بھی نتیجہ ہوا اس کی اطلاع دے کر جائیں گے۔ اِس کے لئے انہوں نے ہمارے عمر قید اسیر ساتھیوں کو بھی ملاقات کے لئے ڈیوڑھی بلانے کا سوچ لیا۔

ملاقات مختصر ہی رہی کیونکہ محترم شکیل صاحب جلدی میں تھے۔ تاہم نصف گھنٹہ سے زائد ہم اکٹھے بیٹھے رہے۔ انہیں رخصت کیا تو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور فضلوں اور اس کی مدد کے انوکھے اور نرالے اور فوری نوعیت کے اِس اَنداز پر قربان ہو جانے کو جی چاہا۔ میں جس طرح سوچ رہا تھا اس کے مطابق تو اس مسئلے کے حل میں کئی دن تک لگ سکتے تھے مگر اب اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت سے فوری حل کا سامان ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کیا تا اس کے وعدے لازیدنکم سے بھی

استفادہ کرسکوں۔ چنانچہ گھنٹہ بھر کے بعد مشقتی نے آکر حاذق صاحب کا پیغام دیا کہ آپ کے دونوں کام ہو گئے ہیں۔ میں نے پھر الحمدللہ کا وِرد شروع کیا اب کے یہ وِرد خاصا جذباتی تھا، الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ ہمارے اتنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے بھی خدا تعالیٰ کس شان سے ہماری مدد کرتا ہے! واقعی ؎

تیرے سوا ہے کون؟ تیری ذات ہی تو ہے — مشکل کشا مجیب دعا، ربِ کار ساز

تیرے ہی پاس ہے میرے ہر کرب کا علاج — چارہ گری کا کوئی کرشمہ! اے چارہ ساز

بے پایاں تیری نعمتیں، رحمت ہے بے کراں — انساں کی پستیوں کو بھی بخشا گیا فراز

مالک ہے تُو، کریم ہے تُو، بے نیاز ہے — نَے حاجت عمل تجھے، نَے حاجتِ جواز

یہ ملاقاتیں ایک طرف ہمارے لئے غیر معمولی حوصلہ افزائی اور دلداری کا باعث بنتیں تو دوسری طرف ہمارے لئے بعض اوقات مسائل بھی پیدا کر دیتیں۔ وہ لالچی قسم کے اہلکار جو یہ سمجھتے کہ یہ لوگ 'اوپر' سے ہو کر آجاتے ہیں اور انہیں کچھ بھی نہیں ملتا، ہمیں تنگ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے۔ اسی طرح بعض اہلکار اور قیدی حسد کی آگ میں بھی جلتے۔ مثلاً ایک روز جو برادرم عبدالودود صاحب (شہید لاہور) آئے تو ان کے ساتھ کسی اہلکار نے ڈیوڑھی میں بدتمیزی کی جس پر صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ نے اسے سرزنش کی۔ اب نزلہ برعضوِ ضعیف کے مصداق شامت ہماری آگئی کہ وہ ہماری ملاقات پر آئے تھے۔ وارڈ میں ایسا لگنے لگا جیسے ہمارے خلاف مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہو جس پر ہمارا رجوع ہمیشہ کی طرح اپنے رب کی طرف ہی ہوا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے خوف کی اِس حالت کا علاج ایک اور نہایت زبردست ملاقات کے ذریعہ کیا اور محترم ملک حمید احمد صاحب (داماد محترم ملک محمد دین صاحب) کے ساتھ ہمارے بعض احباب اچانک خصوصی ملاقات پر آگئے۔ یہ بات اِن دنیاداروں کے لئے باعث خوف ہوا کرتی تھی کہ اِن احمدیوں کے تعلقات بڑے بڑے افسران کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ بڑے اچھے طور پر ملاقات کرائی گئی حتی کہ ہمارے ساتھی اسیر محترم ملک محمد دین صاحب کو بھی میرے ہی کمرے میں بلا لیا گیا اور ہم سب نے بڑے خوشگوار ماحول میں ملاقات کی، الحمدللہ۔

ملاقات تو خیر جو ہوئی، سو ہوئی مگر ہمارے حالات کو بہتر کرنے کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ بھی ثابت ہوئی۔ ایسے خطرناک اور نازک اور مشکل وقت میں آسمانی مائدہ یقین کر کے اِسے خوب سمیٹا۔ یقیناً یہ انہی دعاؤں کا ثمر تھا جو اُس روز صبح سے ہمارے ہونٹوں پر تھیں۔ ہمارے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ رب کل شیٍٔ خادمك رب فاحفظنا وانصرنا وارحمنا کی صوتی لہروں میں تبدیل ہوئے جارہی تھی۔ چنانچہ اُس روز مکمل طور پر خیریت رہی جس کی ہمیں

اِس ملاقات سے پہلے توقع نہ تھی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہماری مدد و نصرت فرما کر ہماری توجہ اس طرف پھیرے رکھتا کہ اپنے مولیٰ پر کامل توکل اور بھروسہ رکھو، چنانچہ ہر شام ہمیں یقین رہتا کہ کل اُس کے فضلوں کی بارش پہلے سے بھی زیادہ شدت اور تیزی اور وسعت کے ساتھ ہوگی کیونکہ کسی بھی دِن تو ہم نے نہیں دیکھا کہ اُس نے ہمیں چھوڑا ہو۔ اگر اُس نے کسی مشکل اور پریشانی کے ذریعہ امتحان لیا تو اُسے بشاشت کے ساتھ برداشت کرنے کی ہمت اور توفیق بھی عطا فرمائی اور خود ہی سو فیصد کے معیار پر کامیاب بھی کروایا، الحمدللہ۔ ہمارے عبیداللہ علیم صاحب نے کیا خوب کہا ؎

اُس نے تنہا کبھی نہیں چھوڑا ــــــ وہ بھی زنداں میں ہے اسیر کے ساتھ

## سزائے موت کی کوٹھڑی میں مشاغل اور مصروفیات

جہاں تک مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا تعلق تھا تو ان کے کسی بھی تکلیف دہ پہلو سے کلیۃً بے فکر ہو کر شروع سے ہی ہم نے اپنا سفر جاری رکھنے کا تہیہ کر لیا تھا اور بفضل اللہ تعالیٰ اس کے مطابق اپنا رویہ بنانے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ جہاں تک سزائے موت کی کوٹھڑی کا تعلق تھا تو یہاں کی مصروفیات محض لکھنے لکھانے اور پڑھنے پڑھانے کی حد تک ہی ہو سکتی تھیں چنانچہ اس کے مطابق میں نے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو کر اپنی ساری توجہ مطالعہ قرآنِ کریم اور دیگر کتب پر لگا دی تھی۔ اسی طرح خطوط کے ساتھ ساتھ اپنی ڈائری لکھنے کا شغل بھی پہلے سے بڑھ کر جاری رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے میز کرسی اور آزاد کمرے کی سہولت جو دی تھی اُس سے پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا۔ اپنے ان مشاغل کے حوالہ سے اپنی ڈائری میں سے چند ایک اقتباسات پیش ہیں جن سے ہماری اُس وقت کی کیفیات اور خیالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

### جلسہ سالانہ کا منظر

آج دسمبر 86ء کی 28ویں تاریخ تھی۔ آج کا دن غم اور دُکھ اور درد کا یہ پہلو لئے ہوئے تھا کہ یہی وہ تاریخ ہے جس روز ہمارے مقدس جلسہ سالانہ کا اختتام ہوا کرتا ہے۔ آج تیسرے سال بھی یہ تاریخ یونہی گزر گئی اور اس دفعہ بھی ظالموں نے ہمارا جلسہ نہ ہونے دیا۔ 83ء کی وہ شام یاد ہے جب مغرب کا وقت ہو رہا تھا اور حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے نظام عدل کے مضمون کے ایک حصہ کو تفصیل سے بیان فرماتے ہوئے اپنے اختتامی خطاب کو سمیٹا تھا۔ پھر آپ نے بڑے دردآمیز انداز میں اپنے پیارے احباب جماعت سے الوداعی باتیں کیں جن سے ماں سے بھی بڑھ کر محبت کی کرنیں پھوٹتی ہوئی

دکھائی دیتی ہیں۔ حضور نے اس موقع پر غالب کا یہ مشہور شعر بھی پڑھا تھا کہ ۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد  ہزار بار برو ، صد ہزار بار بیا

حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے سینہ میں ہمارے لئے کتنی محبت، کتنا پیار اور کتنا عشق ہے! اس کا تو اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ گو ہمارا یہ مقدس، روح پرور اور ایمان افروز جلسہ نہ ہو سکا اور گو ہم ان دنوں میں بھی گذشتہ دو سالوں کی طرح اندر ہی بند پڑے ہیں مگر ہمارے پیارے رب نے اس مجبور و بے بس حالت میں بھی ہماری روحانی سیری کے انتظام کر دیئے۔ ہمیں تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی جلسہ کا چھوٹا سا منظر مہیا فرما دیا۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم، اللھم صل علی محمد و آل محمد۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آج ملاقاتوں کا پرچہ آیا تو اُس میں تو میرا نام نہ تھا مگر جب میں یونہی اپنی وارڈ میں گھوم پھر کر دھوپ سینک رہا تھا کہ ایک قیدی نے اچانک مجھے کہا کہ آپ کی ملاقات آئی ہے۔ میں نے ملاقات کے پرچے کے حوالہ سے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بتایا کہ بعد میں جو دوسرا پرچہ آیا ہے اُس میں نام ہے۔ چنانچہ میں تصدیق ہونے پر فوراً اپنی چکی میں آیا اور ملاقات کے لئے اسے تیار کرنے لگا۔ اِتنے میں ملاقات کرنے والے قیدیوں کے لواحقین پہنچ گئے۔ میں ان کو اپنی چکی کے سامنے کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ جب سب ملاقاتی اندر آ چکے اور بیرونی دروازہ بند ہو گیا تو میں نے اپنے پاس سے گزرتے ہوئے آخری ملاقاتیوں سے پوچھا کہ سارے ملاقاتی آ گئے ہیں یا کچھ پیچھے بھی ہیں؟ ان میں سے ایک نے جواب دیا کہ سارے آ گئے ہیں۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ کسی نے سپیشل ملاقات لکھوائی، پھر آیا بھی نہیں۔

میں نے ایک طرف کھڑے اپنے انچارج ہیڈ وارڈر سے پوچھا تو اس نے دور جاتے ہوئے ملاقاتیوں کی طرف رخ کر کے آواز دی: مبشر! مبشر! اس پر ان میں سے ایک صاحب پلٹے اور اپنی درویشانہ صورت اور چال ڈھال کے ساتھ واپس آنے لگے۔ ان کا چہرہ احمدی ہونے کے ناطہ تو میرے لئے مانوس تھا مگر ان سے ذاتی واقفیت بالکل نہ تھی۔ قریب آئے تو میں نے بڑھ کر اُن سے سلام کر کے معانقہ جو کیا تو ان کی حالت زار اور بھی زار ہونے لگی، اُن کے درد بھرے جذبات آنکھوں کے راستے بہنے لگے۔ بڑی مشکل سے انہیں حوصلہ دے کر چکی میں لایا۔ رانا صاحب میرے ساتھ والے سیل میں تھے اُن سے ملوایا پھر ہیڈ وارڈر سے کہہ کر رانا صاحب کو بھی کھلوایا اور آرام سے اپنی چکی میں بیٹھ کر ان سے تعارف کیا۔ یہ دوست ڈیرہ غازی خاں سے تعلق رکھتے تھے، نام ان کا مبشر احمد صاحب تھا اور صدر بازار میں آئرن مرچنٹ تھے۔ ان کا خط بڑی باقاعدگی سے ہر دوسرے ہفتہ آتا تھا۔ میں بھی جواباً خط لکھتا مگر جب کبھی میرا جواب

دیر سے جاتا تو گھبرا کر ایک اور خط لکھ دیتے ہیں۔ موصوف نے بتایا کہ جلسہ سالانہ منعقد نہ ہوسکنے کی وجہ سے اُداس تھا چنانچہ ڈیرہ غازی خاں سے یہاں ملاقات کرنے چلا آیا ہوں کہ اسی طرح ہی جلسہ کی تشنگی کچھ نہ کچھ دور ہو جائے گی۔ موصوف نے علیک سلیک کے فوراً بعد اپنی جیب سے کئی خطوط نکالے۔ میں سمجھا کہ باہر سے احباب کے بھیجے ہوئے خطوط مجھے پہنچانے لگے ہیں مگر دیکھا تو میرے اپنے لکھے ہوئے خطوط تھے جنہیں موصوف اپنے تعارف کے لئے ساتھ لے آئے تھے کیونکہ میری اُن کے ساتھ پہلی ملاقات تھی اور اِس سے پہلے ان کے ساتھ جان پہچان تک نہ تھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کس محبت سے اُنہوں نے ان خطوط کو سنبھال رکھا تھا۔ پہلے تو ان کے ساتھ خط کے ذریعہ آدھی ملاقات ہوتی تھی اب 'پوری' ملاقات کے لئے بھی چلے آئے تھے اور ان کی دعاؤں، خواہش کے زور اور دیوانہ وار شوق نے انہیں ہمارے ساتھ ملوا دیا۔ باتیں کرتے ہوئے بار بار بے قابو ہو جاتے اور جذبات کا دھارا بہہ نکلتا۔ ان کے ایک ایک لفظ سے سچائی اور خلوص کی خوشبو آرہی تھی۔ انہوں نے ہمارے دِلوں کو اس طرح گرمایا کہ ہمیں جو جلسہ کی کمی کا احساس اُداس کئے جا رہا تھا، کلیۃً دور ہو گیا اور ان کی قوت ایمانی کے بدولت ہمیں ایسا لگا جیسے ہم جلسہ میں ہی بیٹھے ہوں۔ ان صاحب کی اس جذباتی ملاقات سے حضور انور رحمہ اللہ کے یہ الفاظ دل و دماغ میں گونجنے لگے کہ:

'کیا تمہیں علم نہیں کہ کروڑوں احمدیوں کے دلوں کا چین تم چند مظلوم احمدیوں کے دِلوں سے وابستہ کر دیا گیا ہے'

اور یہ کہ

'آج ایک کروڑ احمدیوں کے دھڑکتے ہوئے دل تمہیں دُعائیں دے رہے ہیں
اور دو کروڑ غمناک آنکھیں تم پر محبت اور رشک کے موتی نچھاور کر رہی ہیں'

## سال 1986ء کا اِختتام

سال 86ء کے آخری چند ایام جلسہ سالانہ کی یاد میں گزرے۔ اگرچہ اُن دِنوں آئی جی جیل خانہ جات کے دورہ کی تیاری کی وجہ سے جیل میں ہر طرف گہما گہمی تھی مگر اپنا دھیان تو جلسہ گاہ کی طرف ہی تھا۔ بہر حال اِنہی احساسات کے ساتھ سال کو الوداع کہتے ہوئے لمحہ لمحہ وقت گزر رہا تھا کہ 30 دسمبر 1986ء کی صبح چار بجے بیدار ہوا تو حافظہ پر ایک خواب کا کچھ اس قسم کا منظر تھا کہ میں اپنے بعض رشتہ داروں کے ساتھ کسی مکان کی تیسری یا چوتھی جو اس مکان آخری منزل ہے پر بیٹھا ہوں۔ رشتہ دار یہی ابا جان اور ماموں جان وغیرہ ہیں اور مکان وہ لگتا ہے جو گوجرانوالہ کے بازار دیگاں والا میں ہوا کرتا تھا۔ گو اس کی تعمیر اس قسم کی نہیں مگر ذہن پر تاثر یہی ہے کہ یہ مکان وہی ہے۔ اس کی منڈیر کافی اونچی ہے اور کھلا صحن ہے، دیواریں اور فرش وغیرہ بہت خوبصورت ہے۔ یہاں بیٹھے ہیں کہ اچانک محسوس ہونے لگا جیسے

زلزلہ آ گیا ہے۔ پھر چند ثانیوں میں یہ زلزلہ اتنا تیز ہو گیا کہ مکان لرزنے لگا حتی کہ اوپر والی منزل ایک لچکدار شاخ کی طرح جھولنے لگی۔ ہر چند کہ یہ بڑا خوفناک منظر تھا مگر ہم سب اطمینان سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے۔ ہلکی سی تشویش تو چہروں پر نظر آئی مگر خوفزدہ ہونے کی حد تک کسی بھی مرحلہ پر کسی کی حالت نہ ہوئی اور یہی اثر لئے بیدار ہو گیا۔ (اس وقت تو اس کی تعبیر سمجھ نہ آئی مگر بعد کے حالات نے اس کی عملی تفسیر کر دی۔)

سال کے انہی اختتامی لحات میں مجھے یہ سوچ بھی آتی رہی کہ اس میں کیا شک ہے کہ سال 86ء نے چار معصوم احمدیوں (دو ساہیوال میں اور دو سکھر میں) کو موت کی سزا سنائے جانے کے حوالہ سے جو زخم لگایا تھا دنیوی نقطۂ نگاہ سے بہت گہرا زخم تھا اور ایسا زخم نہ صرف شکست کی علامت ہوا کرتا ہے بلکہ ہمتوں کو بھی پست کر کے رکھ دینے والا ہوتا ہے۔ میرے دل نے پکارا کہ اس لحاظ سے اے 1986ء! تو ہرگز اس قابل نہیں کہ تجھے یاد بھی رکھا جائے، مگر ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم تجھے نہ صرف یاد رکھیں گے بلکہ تجھے زندہ و تابندہ رکھیں گے۔ تیری یاد سے ہماری ہمتیں اور ہمارے حوصلے ہمیشہ بڑھتے رہیں گے کیونکہ یہ زخم ہمارے لئے قطعاً مایوسی یا شکست یا ہمت کو پست کرنے کا موجب نہیں بنا۔ ہم اس زخم کو اپنے لئے بابرکت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ ہماری دعا ہی نہیں بلکہ ہمارے ایمان و یقین کا بھی جزو لاینفک ہے کہ

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ہمارے رب کی کوئی بھی تقدیر ہمارے مفاد کے خلاف ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے دُور رَس اور نہ ختم ہونے والے فوائد اور بے شمار مصالح کو ہم وقتی طور پر سمجھ نہ سکیں، پس میں تجھے درود شریف پڑھتے ہوئے ماضی کے سپرد کرتا ہوں:

اللھم صل علی محمد و علیٰ ال محمد و بارك وسلم انك حمید مجید

نئے سال کی آمد

ہر چند کہ جیل میں سالوں کے بدلنے کا کہاں پتہ چلتا ہے مگر وقت تو بہر حال وقت ہے جو گزرتا ہی چلا جاتا ہے اور ہر صبح چڑھنے والا نیا سورج عمر رفتہ کی نشاندہی کر کے شام کے وقت غروب ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے قیدیوں کے ذہنوں میں کیلنڈر بنتا چلا جاتا ہے اور جونہی سال ختم ہوتا ہے تو ذہنوں میں بنتا چلا جانے والا کیلنڈر نئے سال کی نشاندہی کر دیتا ہے۔ چنانچہ قیدی اپنے انداز سے نئے سال کا استقبال کرتے ہیں اور میں نے یکم جنوری کی صبح نئے سال 1987ء کا آغاز

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا

کی دعا کے ساتھ کیا اور مزید دعا کی کہ گذشتہ سال ہمیں جو معنوی فتوحات نصیب ہوئیں ان سے کئی گنا زیادہ ترقیات ملیں

اور معنوی کے ساتھ ساتھ ظاہری فتوحات بھی اس سال میں نصیب ہوں، آمین۔ علاوہ ازیں نئے سال کا اِستقبال نفلی روزہ رکھنے کے ساتھ کیا اور اِس طرح سے اس سال کا پہلا دن گزارا۔ گو آج کا دن بھی اپنی ظاہری صورت کے لحاظ سے کل سے کوئی مختلف نہ تھا، اُسی طرح سورج طلوع ہوا اور آسمان پر اپنا چکر مکمل کر کے زوال پذیر ہوا پھر وہیں جا چھپا جہاں ہر روز چھپ جایا کرتا ہے مگر ذہنی اِعتبار سے چونکہ اس دن میں اور گذشتہ روز میں پورے ایک سال کا فرق تھا، اس لئے ذہن میں اُنجان سی خوشی لہریں لیتی رہی۔

## دِنوں کی پہچان

جیل میں اور خصوصاً سزائے موت وارڈ میں پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کونسا دِن ہے اور کونسی رات! کیونکہ یہاں کام پر جانے کا تصور تھا نہ ہی جمعہ یا اتوار کی چھٹی کا تصور اور نہ ہی کسی کے پاس کیلنڈر رہتا۔ اس کی وجہ سے کچھ احساس نہ ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے اور ہفتہ کے ساتوں دِن ایک سے لگتے۔ ہاں البتہ دِنوں کی پہچان کا ایک ہی طریق تھا کہ جمعرات اور جمعہ کو قیدیوں کی ملاقاتیں نہ ہوتیں جس سے اندازہ ہو جاتا کہ آج جمعرات ہے یا جمعہ! علاوہ ازیں ایک اور بات سے بھی دِنوں کا تشخص قائم تھا اور وہ تھا مقررہ دِنوں میں رات کے کھانے میں پٹرول نما شوربہ کا ملنا۔ گوشت ایسا کہ بڑے سائز کی ہڈیوں کے ساتھ گوشت کے تار اُلجھے ہوتے جو پتلے اور گہرے رنگ کے شوربہ میں تیر رہے ہوتے تھے جسے دیکھتے ہی گھن آنے لگتی تاہم اس کا فائدہ بھی تھا کہ اسے دیکھتے ہی اتوار یا جمعرات کا علم ہو جاتا کیونکہ اِنہی دو دِنوں میں رات کے کھانے میں 'گوشت' پکتا تھا۔

## سردی سے بچاؤ کا اِنتظام

آج نئے سال (۱۹۸۷ء) کے ساتھ ساتھ مہینہ کا بھی پہلا دِن تھا اس لئے ہماری ماہوار اُرڈی بھی لگی اور میں 17 نمبر سیل سے 14 نمبر سیل میں آ گیا اور آج جو سب سے اہم اور بڑا کام ہوا وہ سردی سے بچاؤ کے لئے آہنی سلاخ دار دروازوں پر پلاسٹک کی چادریں لٹکانے کا تھا۔ جیل اور سزائے موت وارڈ میں خصوصاً اس سے قبل اس قسم کی سہولت نہیں ہوتی تھی۔ اس سال ہم نے اس کے لئے تحریک چلائی تو اللہ کے فضل سے کامیابی ہوگئی۔ اگرچہ اس کی منظوری لینے کی کوششوں کا آغاز تو موسم سرما کے ساتھ ہی کر دیا گیا تھا مگر سرخ فیتہ میں سے گزرتے گزرتے دسمبر کا اخیر آ گیا تاہم یہ بھی ہمارے لئے غنیمت تھا۔ اس منظوری کے ملنے کے بعد میں نے اپنے اور رانا صاحب کے لئے ایک اچھی قسم کا پولی تھین منگوایا جو غیر معمولی طور پر شفاف اور مضبوط تھا۔ پھر اُسے دروازہ کے مطابق کاٹ کرایا پردہ تیار کیا جسے آسانی کے ساتھ تہ بھی کیا جا سکے اور شام ہونے سے پہلے پہلے دو پردے تیار کر کے اپنے اور رانا صاحب دروازے پر لٹکا لئے،

الحمدللہ۔ سرکار کی طرف سے جو اجازت ملی تھی وہ اسی قسم کے شفاف پردے لٹکانے کی تھی تا کہ چوکیدار ملازموں کو اندر کا سارا ماحول نظر آتا رہے۔ بہر حال اس سے ہمیں بہت فائدہ ہوا کیونکہ اسے لٹکانے سے کھلے دروازے سے آنے والی سردی کا بہت حد تک سدباب ہو جاتا اور اندر کا ماحول خوب گرم اور پرسکون ہو جاتا، فالحمدللہ۔ وارڈ کی دیگر تمام چکیوں کے لئے کسی مخیر دوست نے وسیع پیمانہ پر پولی تھن مہیا کر دیا تھا جس سے پردے بنا کر ہر چکی کے دروازہ پر لٹکا دیئے گئے، الحمدللہ۔ جیل حکام کا بھی بہت شکریہ کہ انہوں نے اِس سہولت کی اجازت دے دی وگرنہ یہ اجازت نہ ملے تو ایک قیدی اور وہ بھی سزائے موت کا قیدی کیا کر سکتا ہے!!!

## درویشان قادیان کا ذکر

یکم اپریل 87ء کی ملاقات میں بچے بھی تھے بڑے بھی، رشتہ دار بھی تھے اور عام دوست بھی! مگر ایک ایسی شخصیت بھی شامل تھی جن کے لئے احترام ہی نہیں، رشک کے جذبات بھی دل میں موجزن رہے۔ یہ بزرگ قادیان دارالامان سے تشریف لائے تھے وہاں اُس وقت غالباً ناظر بیت المال آمد کے عہدہ پر خدمات سلسلہ بجالا رہے تھے اور نام ان کا محترم چوہدری سعید احمد صاحب تھا۔ ان سے مل کر قادیان کی یاد لازمی امر ہے۔ یہ اُن بزرگوں میں سے ہیں جنہیں تاریخ ہمیشہ یاد بھی رکھے گی اور جھک کر سلام بھی کرتی رہے گی۔ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اپنے جذبات کی، اپنے اموال کی، اپنے جسم و جان کی قربانیاں پیش کیں اور حفاظت مرکز کی عظیم ذمہ داری کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ چنانچہ انہوں نے آج تک انتہائی خلوص اور کامل سچائی کے ساتھ اپنے خون اور اپنے گوشت پوست اور اپنے ولولوں اور جذبوں کے ایندھن کے ساتھ یہ ذمہ داری بڑے احسن طور پر سرانجام دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کی اولادوں کو جزائے خیر سے نوازے، اس دنیا کی حسنات بھی عطا ہوں اور اگلی دنیا کی حسنات بھی نصیب ہوں، آمین۔

میں جب بھی کسی درویش یا ان کے کسی بیٹے کو دیکھتا ہوں تو ناقابل بیان جذباتی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہوں، ان میں سے ہر کسی کے چہرہ پر عزم اور اعتماد اور قناعت کا نور دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ انہی میں میرے پیارے تایا جان محترم ماسٹر محمد ابراہیم صاحب بھی شامل ہیں جو تقسیم ملک کے وقت اپنے امام کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے تین ماہ کے لئے کراچی سے قادیان گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے خاندان کو بھی درویشی کی یہ عظیم سعادت نصیب ہوئی، الحمدللہ۔

## مطالعہ کتب اور خط و کتابت

جیل میں مصروف رہنے کا سب سے زیادہ مفید اور مؤثر ذریعہ مطالعہ کتب ہے۔ چنانچہ خاکسار نے یوں تو جیل میں آنے

کے فوراً بعد ہی اس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور ابتدائی دنوں میں ہی مؤطا امام مالک، تحدیث نعمت جیسی ضخیم اور بڑی بڑی کتب پڑھ ڈالی تھیں مگر ایک روز حضور انور رحمہ اللہ تعالیٰ کے خطبہ جمعہ کا خلاصہ پڑھا جس میں حضور نے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہام أنت الشيخ المسيح الذي لا يضاع وقته کے حوالہ سے اپنے اوقات کو صحیح مصرف میں لانے کی تلقین اور وقت سے بھرپور استفادہ کرنے کی نصیحت فرمائی ہے تو خاکسار نے حفظ قرآن وقصائد، مطالعہ کتب اور انگریزی زبان سیکھنے کا پروگرام بھی ترتیب دے دیا تا اس حالت میں اپنے مطالعہ میں وسعت پیدا کر کے ہی خدمت دین بجا لاسکوں۔ چنانچہ اس کے بعد اور خصوصاً سزائے موت وارڈ میں بی کلاس کی سہولت ملنے کے بعد تو اپنا کام ہی لکھنا اور پڑھنا ہوتا تھا جس کے نتیجہ میں اس دوران میں نے چھوٹی بڑی کتب ورسائل کے علاوہ تفسیر کبیر کا بھی ایک دور مکمل کیا۔ یادوں کی بارات اور شہاب نامہ جیسی متعدد موٹی موٹی کتابیں بھی دنوں میں پڑھ ڈالیں۔ اخبار کا تفصیلی مطالعہ روزانہ کا معمول بن گیا تھا اور شہ سرخیوں پر مشتمل سیاسی خبروں سے لے کر غیرت میں آ کر قتل کر ڈالنے کی خبریں تک پڑھتا۔ اداراتی صفحہ کے سیاسی وادبی آرٹیکل تو اپنی خاص خوراک تھے۔ علاوہ ازیں ہر ملاقات پر آنے والے جماعتی رسائل ترجیحی بنیادوں پر نہ صرف خود پڑھتا بلکہ مکرم رانا صاحب کو سناتا بھی۔

## دو اہم مضامین

14 ستمبر 1987ء: دو تین مضامین کا ذہن پر گہرا اثر ہے۔ سیاسی لحاظ سے کل کے اخبار جنگ میں شائع ہونے والا جنرل اعظم خاں کا مضمون بعنوان ''عوام اور فوج میں یک جہتی ناگزیر ہے''۔ موصوف نے اپنے اس مضمون میں بالکل کھرا انداز اختیار کیا ہے۔ ملکی حالات کا نہایت گہرا اور تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور اس کی روشنی میں موجودہ فوجی حکمرانوں کو 'مت' دینے کی کوشش کی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ مضمون بھی فاروق حسن بار ایٹ لاء کے نہایت تیز مضامین کی طرح صدا بصحرا ہی ثابت ہوگا۔

اس کے علاوہ دو آرٹیکل ایسے بھی ہیں جنہوں نے میرے ذہن پر ہی نہیں، میرے دل پر بھی، میری روح پر بھی اور میرے انداز فکر اور میری سوچ پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ گو میں نے ان مضامین کو علیحدہ علیحدہ ہی پڑھا مگر پڑھنے کے بعد غور وفکر کے تانے بانے نے انہیں ملا دیا۔ ان میں سے ایک تو حضور رحمہ اللہ کا خطبہ جمعہ ہے اور دوسرا ہفت روزہ لاہور میں شائع ہونے والا چوہدری عزیز احمد صاحب سینئر ایڈووکیٹ لاہور کا مضمون بعنوان ''انسانیت کے خلاف جرم'' ہے۔

حضور رحمہ اللہ نے اپنے اس خطبہ میں جماعت احمدیہ پر پاکستان میں ہونیوالے مظالم کا نقشہ کھینچا ہے اور جنوری فروری 87ء میں سہاوہ کے مقام پر شہید ہونے والے ایک نوجوان کے واقعات شہادت بیان کر کے ثابت کیا ہے کہ

جماعت کے خلاف عوامی سطح پر نہیں بلکہ حکومتی ایوانوں سے مظالم ہو رہے ہیں۔ اس لحاظ سے حضور نے پاکستان کو اس قابل قرار دیا ہے کہ اس کے لئے پورے جوش اور صدق دل سے دعائے خیر کی جائے۔ اس کے بعد لاہور رسالہ میں شائع شدہ مضمون پڑھا جس میں قدیم زمانہ سے لے کر اس زمانہ تک عقائد اور نظریات کے المناک واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں سقراط، منصور، سرمد، صاحبزادہ عبداللطیف صاحب شہید اور بالکل حال کا واقعہ جس کا فیصلہ 4 رجولائی 1987ء کو ہوا یعنی فرانس کے کلاؤز باربی (1913-1991) کی مثالیں دی گئیں ہیں۔ ان سب کے علیحدہ علیحدہ واقعات بیان کر کے ان شہادتوں کے فوراً یا کچھ عرصہ بعد ان کی اقوام یا ان کے ممالک پر آنیوالے ہولناک عذابوں اور تباہیوں اور بربادیوں کی خوفناک داستانیں لکھی ہیں اور مضمون نگار نے موجودہ حکومت کو بین السطور خبردار کیا ہے کہ اپنے ظالمانہ افعال سے باز آ جائے۔ گو اس سے پہلے بھی مظالم کے نتیجہ میں ان اقوام ان پر آنیوالے عذابوں اور ایک ایک معصوم جان کے بدلہ میں ان اقوام کے ہزاروں افراد کے ہلاک کر دیے جانے کے واقعات پڑھے تھے مگر آج یہ مضمون پڑھ کر دل کی کیفیت کچھ اور ہی ہوئی اور یوں لگا جیسے اس زمانہ میں بھی یہ واقعات دہرائے گئے تو وہ ہماری وجہ سے ہی دہرائے جائیں گے۔ اس پر اپنی قوم کے لئے بے حد رحم کا جذبہ دل میں پیدا ہوا۔ اس بھیانک انجام کے تصور سے کانپ گیا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اگر اس حکومت نے ظلم کی راہ سے آج ہماری جانیں لیں تو خدا خاموش نہیں رہے گا بلکہ اپنی سنت کے مطابق بدلہ ضرور لے گا۔ چنانچہ اس پس منظر کے باعث آج شاید پہلی مرتبہ میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس ظلم سے بچا لیا جاؤں تا میری قوم کو اس کی سزا بھگتنی نہ پڑے، ورنہ مجھے کبھی اپنی جان کی پرواہ نہیں ہوئی، کبھی اس نام نہاد سزا سے خوف نہیں آیا۔

حضور رحمہ اللہ کے مذکورہ بالا خطبہ کے ساتھ اس مضمون کو ملایا تو اور بھی لطف آیا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ آج ہی دونوں مضامین کا مطالعہ ہوا۔ اللہ کرے کہ قوم کے سر پر مسلط حکمرانوں اور آمروں کو اس ظلم پر عمل کرنے کی توفیق ہی نہ ملے تا قوم خطرناک انجام سے محفوظ ہو جائے جس میں چیخ و پکار ہی نہیں آہیں اور سسکیاں بھی ہونگی۔

## بچہ کی معصوم سوچ

19/اکتوبر 87ء کو ملاقات کے موقع پر ہم نے دوپہر کا کھانا اپنے ملاقاتیوں کے ہمراہ کھایا۔ اس موقع پر میری بیگم نے بتایا کہ یہاں آنے کی تیاریوں کے دوران میرے بڑے بیٹے عزیزم طارق نے پوچھا کہ شامی کباب کس کے لئے بن رہے ہیں؟ اسے جب بتایا گیا کہ 'تمہارے ابو کے لئے' تو بڑی فکرمندی کے ساتھ کہنے لگا کہ ابو پندرہ دن بھوکے ہی رہتے ہیں؟ اس فقرہ میں کس قدر درد تھا اور اس معصوم ذہن میں تفکرات کا کتنا گہرا سمندر تھا! کاہے بتلائیں تجھے!

28 اکتوبر 87ء

آج دوران مطالعہ حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد سامنے آیا جو کسی بھی قوم کی زندگی کے لئے نسخہ کیمیا ہے۔ حضور نے فرمایا ہے:

"اس امر کو سمجھا جائے کہ جو شخص قوم کے لئے فنا ہوتا ہے وہ فنا نہیں ہوتا اور یہ کہ جب تک قوم زندہ ہے اس وقت تک ہی حقیقی زندگی باقی ہے۔ پس قومی زندگی کے مقابلہ میں انفرادی قربانی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔"

اس حقیقت کا اِدراک مجھے پہلی مرتبہ حقیقی انداز میں اُس وقت ہوا جب مجھے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ میرے دل میں بڑی پختگی سے یہ ایمان پیدا ہوا کہ اگر یہ لوگ ہمارا گلا دبا دیتے ہیں تو اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ انہیں فائدہ تو خیر کیا ہونا ہے اُلٹا نقصان ہی ہوگا کیونکہ ہماری اس سزا کے باعث پوری جماعت میں غیر معمولی بیداری پیدا ہوگئی ہے جس کی اہمیت ہماری کئی زندگیوں سے زیادہ ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں چاہئے کہ اس نکتہ کو ہمیشہ سامنے رکھیں اور ہر قربانی کے لئے تیار رہیں اور اس یقین کے ساتھ تیار رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے کئی گنا اَجر سے نوازے گا۔ انشاءاللہ۔

سزائے موت کے اِن ایام میں مجھے اپنی زندگی کا تیز ترین مطالعہ کرنے کی بھی توفیق ملی۔ اس کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ محترم میجر منظور احمد صاحب نے کسی سے "شہاب نامہ" عاریۃً لے کر مجھے پڑھنے کے لئے بھجوایا۔ میں نے موقع سے بھرپور اِستفادہ کے لئے باقی تمام کام موقوف کر دیئے اور دن رات کے آسان اوقات یعنی جن میں کھانسی کی شدت کے باوجود زیادہ سے زیادہ مطالعہ ہو سکے، اس کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ آج جب تھوڑی دیر پہلے کتاب بند کی تو اس کے 1200 صفحات میں سے صرف 50 صفحات باقی تھے جنہیں کل صبح پہلی ہی نشست میں ختم کر لوں گا۔ انشاءاللہ۔

یہ کتاب پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ باوجود اس کے کہ یہ کتاب پاکستان کے ایک معروف اور بلند پایہ دانشور، کامیاب بیوروکریٹ، بظاہر روشن خیال، صاحب طرزِ ادیب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مصنف جناب قدرت اللہ شہاب نے لکھی ہے مگر یہ کوئی مستند اور مفید علمی یا تاریخی دستاویز ہرگز ہرگز نہیں۔ البتہ اچھی دلچسپ معلوماتی کتاب ضرور ہے جو سیاسی، سماجی، معاشرتی اور دفتری چٹکلوں اور لطیفوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک بات اس کی جو مجھے اچھی نہیں لگی وہ یہ ہے کہ اس میں دوسروں کی برائیوں اور کمزوریوں اور عیبوں کی خوب خوب تشہیر کی گئی ہے اور یہ بات اِس کثرت سے ہے کہ گویا کتاب کا مقصد ثانی بنتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی بالواسطہ و بلاواسطہ اور مختلف انداز اور مختلف پیرایوں میں بے پناہ تعریف اس کے اصل ذائقہ کو تبدیل کئے ہوئے ہے۔

شہاب صاحب نے تاریخی اعتبار سے بعض بڑی بھیانک اور فاش غلطیاں بھی کی ہیں اور بعض تاریخی حقائق کو ازراہ تعصب بالکل گول کر دیا ہے تو بعض حقائق کو برے طور پر مسخ! لیکن اس سب کچھ کے باوجود مجھے ان کی ذاتی اور گھریلو زندگی کے اعتبار سے بہت ترس آیا۔ میری رائے میں تو ان کی گھریلو بالخصوص ازدواجی زندگی بڑی ہی دردناک کہانی ہے۔ ایسی المناک کہ صرف دس بارہ برس میں اُن کے جوان وجود سے منحنی اور مضمحل وجود تک کا انتہائی تیز رفتار سفر سمجھ آتا ہے، اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے، آمین۔

## افسرانِ بالا کے دورے

جیل میں مقامی افسران یعنی سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کے ہفتہ وار دورے تو ہوتے ہی رہتے تھے جو قیدیوں کو ہراساں رکھنے کے لئے بہت کافی ہوتے مگر جب بھی افسران بالا یعنی آئی جی یا ڈی آئی جی جیل خانہ جات یا پھر کسی وزیر وغیرہ کا دورہ ہوتا تو قیدی تو ایک طرف رہے سارے عملے کے اوسان خطا ہوئے ہوتے اور ایسا سال میں دو تین مرتبہ ہو ہی جاتا۔ چنانچہ اس کے لئے بڑے وسیع پیمانہ پر تیاریاں کی جاتیں جن میں ٹوٹی پھوٹی دیواروں کی مرمت سے لے کر پھلواڑیوں تک کی درستی اور سجاوٹ کی جاتی۔ ہر طرف سفیدیاں ہوتیں، رنگ وروغن کئے جاتے اور دورے کے دِن ساری جیل کو خوب سجایا جاتا۔ اِس مقصد کے لئے قیدیوں ہی سے رقوم اکٹھی کی جاتیں جو ظاہر ہے کہ مقامی افسران کی جیبوں میں جاتیں کیونکہ اس مقصد کے لئے بہرحال جیلوں میں باقاعدہ منظور شدہ بجٹ بھی ہوتا ہے تاہم مقامی افسران کا کہنا ہوتا کہ انہوں نے 'اوپر' بھی تو دینا ہوتا ہے۔

یہاں سزائے موت وارڈ میں اِس قسم کا پہلا دورہ 1987ء کے آغاز میں ہوا جب قریباً دو ہفتے سارے قیدی مشقتوں اپنی اپنی وارڈوں کی مرمتوں میں لگے رہے اور سزائے موت وارڈ میں بھی جن قیدیوں نے اچھی ادائگیاں کی تھیں، کام کرنے کے بہانے موجیں کرتے رہے یعنی سارا سارا دِن کھلے رہتے جبکہ کام کرنے کے لئے غریب حوالاتیوں کو لایا جاتا۔ کئی روز کی محنت کے بعد تیاری مکمل ہوئی تو عین اُس رات شدید قسم کی طوفانی بارش ہوگئی جس کی صبح آئی جی صاحب کا دورہ ہونا تھا۔ 1879ء کی تعمیر شدہ ساہیوال جیل چونکہ کچی ہے اس لئے بارش نے ساری سفیدیاں اور رنگ وروغن مٹی میں ملا کر رکھ دیئے۔ جس پر کیا قیدی اور کیا اہلکار سبھی سر پیٹ کر رہ گئے مگر قدرت کے سامنے کس کی مجال تھی۔ چنانچہ فوری طور جو کچھ بن پڑا صبح ٹھیک ٹھاک کر کے وارڈ کو پھر سے سجایا گیا۔

اس قسم کے دوروں میں سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی کہ یہ علم ہی نہ ہو پاتا کہ "کس وقت افسر مجاز دورہ فرمائیں گے"۔ چنانچہ قیدیوں کو صبح ہی پریڈ لگوا کر بٹھا دیا جاتا اور پریڈ کا مطلب یہ ہوتا کہ اب کوئی قیدی کچھ بھی نہیں کر سکے گا

اور بس اپنے 'کھڈے' پر بیٹھا ہی رہے گا۔ اُس کا ہر قسم کا سامان اُس کے سامنے مگر اُس کی پہنچ سے باہر ہوتا۔ اس حالت میں بعض اوقات گھنٹوں بٹھائے رکھا جاتا۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی اور بعض مواقع پر تو شام ہو جاتی رہی۔ ایسی صورت میں لنگر کا کھانا تقسیم ہو جاتا جسے فوری طور پر کھا لینے کا حکم ہوتا اور قیدی بس خوف و ہراس کی حالت میں زہر مار کر لیتے۔ ایسے دنوں میں قیدی دعا کرتے کہ ان کی ملاقات نہ ہی آئے کیونکہ ایک تو ملاقاتیوں کی شامت آئی ہوتی اور دوسرے یہاں ملاقات کا وقت بھی کم ملتا اور ایسی ہنگامی حالت میں واپس آ کر سامان کو سنبھالنا ایک الگ مسئلہ ہوتا۔

ایسے دوروں کے موقع پر ستم بالائے ستم یوں بھی ہوتا کہ قیدی سارا دِن انتظار میں اپنے کھڈوں پر بیٹھے بیٹھے اُکتا جاتے اور ہر ایک کی نظریں آنے والے راستہ پر اور کان جیل میں دورہ کے لئے بجائی جانے والی گھنٹی پر لگے ہوتے تو شام کے وقت اعلان ہو جاتا کہ دورہ نہیں ہوگا، اپنے آپ کو معمول کی حالت میں لے آؤ۔ ایک آزاد شخص کے لئے بھی اس صورت حال کو برداشت کرنا یقیناً مشکل ہوگا مگر وہاں تو قیدیوں کو یہی کہہ دینا کافی سمجھا جاتا تھا: Take it easy baby!

جیل میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ اچانک شور پڑ جاتا کہ آئی جی جیل خانہ جات آ گیا ہے۔ صوبائی سطح کے اس اعلیٰ ترین محکماتی افسر کا آنا کوئی معمولی بات نہ ہوتی۔ کیا اہلکار اور کیا قیدی سبھی کو مصیبت پڑ جاتی۔ صفائیاں کی جانے لگتیں، زائد سامان غائب کر دیا جاتا اور ہر کسی کو ہوشیار کر کے گویا ٹکٹکی پر چڑھا دیا جاتا اور بہت دفعہ شیر شیر آیا کے مصداق ایسا ہوتا کہ سارا سارا دِن تیاریاں اور پھر انتظار کرتے گزر جاتا مگر کوئی نہ آتا۔ اس قسم کے دَوروں کا ایک سبب دراصل ہمارے ہاں کا وہ نظام ہے جس میں ہر شخص دوسرے کا 'کانا' ہو چکا ہے اور ہر بڑا افسر اپنے ماتحت سے بھاری رقوم رشوت کے طور پر وصول کرتا ہے۔ چنانچہ جیل میں یہ بات عام تھی کہ آئی جی اپنی لاہور والی رہائش گاہ میں کروٹ لیتے لیتے کہتا ہے کہ ہائے ابھی ساہیوال جیل سے Monthly نہیں آئی تو یہاں بھگدڑ مچ جاتی ہے اور بے چارے قیدیوں کا جینا حرام کر دیا جاتا ہے۔ اس تناظر میں میں دیر تک سوچتا رہا کہ ہمارے یہ افسران اپنے سے بالا افسران سے جس طرح ڈرتے ہیں، کاش کہ اس کا عشرِ عشیر اپنے خالق و مالک رب سے بھی ڈرتے تو کیا ہی اچھا ہوتا!

## جنوری 1987ء کے آخری چند ایام

مؤرخہ 24 جنوری کو بڑے بھائی جان کا خط امریکہ سے کئی خوشیاں لایا جس سے ذہن کے کئی بوجھ اُترتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ پھر فوجی عدالتوں کے سزا یافتگان کو سول عدالتوں میں اپیل کا حق دینے کے سلسلہ میں کئی ایک خبریں، تبصرے اور اداریئے حوصلہ افزائی کا باعث بنے۔ گو جہاں تک ہمارا معاملہ ہے، ہمیں اس ظالم اور آمر حکومت (جنرل ضیاء کی فوجی حکومت) سے قطعاً کسی خیر کی اُمید تھی اور نہ ہی ہمارا اس پر تکیہ ہے۔ ہم ہمیشہ احکم الحاکمین کی طرف سے

نازل ہونے والی خیر کا ہی سوچتے اور اِس سوچ کو دعا کی لہروں میں ڈھال کر عرشِ عظیم کی جانب روانہ کرتے ۔

رب کریم! شان کریمی کا واسطہ   پہلی سی ڈال پھر وہی نگہ نیم باز

اور ہمیں کم از کم اپنے مقدمہ کے مراحل سے گزرنے کے بعد ستم کی اِس سیاہ رات کی سیاہی کا کافی حد تک اندازہ ہو چکا تھا، اس لئے مجروح سلطان پوری کی طرح ہم یہ نعرہ لگاتے ہوئے اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے تھے کہ ۔

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ   جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

آخر کبھی تو یہ سیاہی ختم ہوگی۔ اگر ہمارے سروں کے چراغ مکمل طور پر اسے ختم نہ کر سکے تو کسی حد تک کم تو ضرور ہی کردیں گے، انشاء اللہ العزیز۔ اس لئے جب مذکورہ بالا قسم کی کوئی خبر پڑھنے میں آتی تو ہمارا دِل اُچھل پڑتا کہ اس خوشی سے ایک کروڑ دِلوں کی خوشی وابستہ تھی۔ یہ خبر دو کروڑ آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کو خوشی کے آنسوؤں میں بدلنے کا موجب ہوگی اور سب سے بڑھ کر اِن دِلوں کے دِل اور ان سب آنکھوں کے مرکز خلیفة اللہ فی الأرض کے لئے قرار اور سکون اور خوشی و مسرّت کا موجب ہوگی۔ مگر اس ساری کیفیت کے دوش بدوش یہ حقیقت بھی بہر حال مسلّم ہے کہ: دِل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت۔

اُس روز یعنی مؤرخہ 24 جنوری کو خوشی کے مزید مواقع اُس وقت پیدا ہوئے جب گھر سے بھی خطوط آئے اور ان کے ساتھ ہمارے دِل وجان سے پیارے آقا کی طرف سے آپ کے جذبات، آپ کی بے پایاں محبت تحفہ میں متمثّل ہو کر ہم تک پہنچی۔ حضور نے ہمیں رومال اور جرابیں بھجوائی تھیں جنہیں پیارے آقا کی محبت میں ڈوب کر آنکھوں سے لگایا، سینہ سے چمٹایا اور آقا کا تصور آنسوؤں میں بسایا۔ میرے اللہ! میرے آقا کو قرار اور سکون اور چین عطا فرما، ہمیں آپ کا دیدار جلد عطا فرما۔

لمحے جدائیوں کے بہت ہوگئے طویل   فرقت کی لَے میں ڈوبی ہوئی ہے نوائے ساز

خدام کے فراق میں محمود بے قرار   شہر وفا میں مضطرب محمود کے ایاز

لیکن اگر اے اللہ! تجھے ہمارا امتحان اور بھی منظور ہے تو ہم اس کے لئے بھی حاضر ہیں، حاضر ہیں، حاضر ہیں ۔

یہ ابتلاء کا دور بھی ہم کو قبول ہے   آقا میرے بخیر رہیں، عمر ہو دراز

## سکھر میں ہمارے شریک سفر ساتھی

ایک اور بات کل سے میری روح کو گداز کئے ہوئے ہے اور میں اپنے اُن ہم سفروں کی فکر میں ہوں اور اُن کی تکالیف اور مشکلات کا تصور کئے ہوئے ہوں۔ میرے وہ بھائی اور شریک سفر گو مجھ سے تین چار سو میل کے فاصلہ پر

رہتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں مگر ہمارا یہ سفر بھی عجیب ہے کہ زمان ومکان کا پابند نہیں ہے۔ ہم تو اس سفر کو اختیار کر کے راہ مولا کے اُن مسافروں کے بھی ہمسفر بن گئے ہیں جنھوں نے آج سے چودہ سو سال پہلے ایسے سفروں کی منزلیں طے کی تھیں۔ غرض یہ سفر ایسا سفر ہے کہ اس نے تمام مکانی وزمانی نسبتوں کو ختم کر کے اور تمام فاصلوں کو سمٹا کر اُن کو بھی شریک سفر کر دیا ہے جو پشاور میں اِس راہ پر گامزن ہیں اور اُن کو بھی جو سکھر، حیدر آباد اور تھر پار کر یا پنجاب کی کسی بھی جیل کی زینت بنے ہوئے راہِ مولا کی منزلیں طے کرنے میں کوشاں ہیں، الحمدللہ۔

قصہ کوتاہ گزشتہ روز سکھر سے ہمارے اسیر راہ مولا محترم پروفیسر قریشی ناصر احمد صاحب کا گرامی نامہ شرفِ صدور لایا جسے پڑھ کر خوشی بھی ہوئی، حوصلہ بھی ملا، نیا ولولہ اور عزم بھی نصیب ہوا لیکن ساتھ ہی یہ معلوم کر کے سخت تکلیف ہوئی کہ اُنہیں وہاں کوئی بھی سہولت میسر نہیں حتی کہ کاغذ وقلم بھی خاص احتیاط سے رکھتے ہیں۔ اللہ ان کی حالت پر رحم فرمائے، اُن کے اہل وعیال کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ اُن کی جملہ پریشانیاں اور تکالیف اور مسائل حل فرمائے اور سکون اور مسرت وشادمانی کے دِن جلد نصیب ہوں، آمین ثم آمین۔ قریشی صاحب موصوف نے دوران اسیری اپنی درج ذیل نظم بھی ہمیں ارسال فرمائی جو موصوف کے سچے اخلاص اور محبت کی منہ بولتی تصویر ہے:

اے اسیرانِ رہِ مولیٰ زمین ساہیوال
آپ نے بخشا ہے دین حق کی شمع کو جمال

ایک عرصہ سے پس زنداں ہو تم بیٹھے ہوئے
آفریں صد آفریں تم پہ فدا صدق بلالؓ

اے نعیم الدین تم پہ رحمتیں ہوں بے شمار
اے مرے الیاس نکلا تو تو مرد باکمال

اے محمدؐ دین تم نے دین کی رکھی ہے لاج
اے میرے حاذق ملے گی تم کو شہرت لازوال

یہ خدا کی ہے عنایت تم پہ اے عبدالقدیر
باپ تو ہے ہی مجاہد بن گیا تو بھی مثال

ہو مبارک تم کو تم بھی بن گئے دیں کے نثار
تم کو یہ دنیا مٹا دے ہے کہاں اس کی مجال

میرے پیارے سرفروشو چند دن کی بات ہے
دور بدلے گا کہ آخر ہر کمالے را زوال

اس کی غیرت جوش میں ہے اس کے تیور تند ہیں
کیا نہیں دکھلا رہا وہ اپنی ہیبت اور جلال؟

رات دن اس کو پکاریں وا کریں زخمی جگر
حوصلے مضبوط ہوں دل نہ ہونے دیں نڈھال

سارا عالم احمدیت کا ہے نازاں آپ پر
آپ کا ہر دم امام وقت کو رہتا خیال

جب کبھی راتوں میں ہوں اس یار سے راز و نیاز
"مشکلیں ناصر کی بھی آساں ہوں" کرنا یہ سوال

پروفیسر ناصر احمد قریشی، اسیر راہ مولا (پھانسی کا سزا یافتہ) سنٹرل جیل سکھر (سندھ پاکستان)

## 26اپریل 1987ء

آج کا دن جماعت احمدیہ کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسا سنگ میل جو ابتلاؤں کی ایک بھٹی کی شکل میں طویل ابتلاء اور ایک صبر آزما دور کے آغاز کی علامت بن کر جماعت کے سامنے آیا۔ آج سے ٹھیک تین سال قبل حکومت پاکستان کے مطلق العنان آمر اور نمرود و فرعون وقت جنرل ضیاء الحق نے جماعت کو تباہ کرنے، جماعت کو ہر لحاظ سے کچلنے، اسے ذہنی، معاشی اور دینی لحاظ سے بالکل مفلوج کر دینے کے لئے ایک خطرناک، بھیانک اور ظالمانہ منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک صدارتی آرڈیننس جاری کیا تھا۔ جس کے تحت جماعت پر ہر لحاظ سے قانونی پابندیاں لگا کر ان کی خلاف ورزی کو قابل تعزیر، ناقابل ضمانت اور قابل دست اندازی پولیس قرار دیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے قطعاً یہ نہ سوچا تھا کہ آیا اس کا یہ فعل قرآن وسنت کے خلاف ہے اور کس طرح وہ اپنی اور اپنی قوم کی عاقبت کو واصلِ جہنم کر رہا ہے۔

### ہر ماہ کی 26 تاریخ، انوکھی سالگرہ

26 / اکتوبر 87ء کو اپنی نوعیت کی انوکھی اور منفرد تیسری سالگرہ ہمت، استقامت اور بشاشت کی دعائیں مانگتے ہوئے گزاری۔ پہلے تو اُس دن (26 / اکتوبر 84ء) کے مختلف مراحل کے مختلف لمحات، ہاں سنسنی خیز لمحات یاد آتے رہے۔ خوفناک منظر بھی آنکھوں کے سامنے آیا۔ جی ہاں روغن سے مٹائے گئے کلمہ طیبہ کا وہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وحشت برس رہی ہو اور ایسی وحشت جسے میرے حواس پوری طرح محسوس کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اس قوم پر، آمین۔

آج کی تاریخ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ مسجد ساہیوال میں ہونے والے حادثہ یا واقعہ کی عمر میں ایک اَور مہینہ کی تکمیل ہوئی۔ اس دوران ہم نے جابر انسانوں کی طرف سے بہت زیادتیاں دیکھیں۔ قدم قدم پر زیادتیاں، ناانصافیاں اور مظالم ہمارا استقبال کرتے رہے مگر اُن لوگوں کا یہ سلوک اور ظالمانہ رویہ ہمیں اس جادۂ مستقیم سے برگشتہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ گو مقصد تو یہی تھا مگر انہیں کامیابی نصیب نہ ہوئی کیونکہ خدا کا فضل ہمارے شامل حال رہا اور اس کے نتیجہ میں ہم نے ہر لمحہ اور ہر قدم پر اپنے آپ کو ایمان کی خوشبو میں پہلے سے زیادہ معطر اور اس کی عمیق گہرائیوں میں پہلے سے زیادہ ڈوبا ہوا پایا۔ ہم ہر مشکل مرحلہ اور ہر پیچیدہ راہ گزر سے یہ کہتے ہوئے گزرتے گئے کہ

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں     جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

ہماری ہمیشہ یہی دعا رہی کہ اللہ ہمیں پہلے سے زیادہ استقامت اور مضبوط قدم عطا فرمائے، پہلے سے زیادہ بشاشت کے

ساتھ سب کچھ برداشت کرنے کی توفیق بخشے اور پہلے سے زیادہ مؤثر اور بولتی ہوئی داستان تاریخ کے سپرد کرتے چلے جانے کی سعادت سے نوازے، آمین۔

بے پایاں تیری نعمتیں، رحمت ہے بے کراں　　انساں کی پستیوں کو بھی بخشا گیا فراز

## قرآنی بیان اور ضیاء کا آرڈیننس

ایک روز تلاوت کر رہا تھا کہ میری نظریں ایک آیت پر رک گئیں اور میں سیاق وسباق پر غور کرنے لگا۔ مجھے تو یوں لگا کہ ان آیات میں بالکل اسی زمانہ کا ذکر ہے جس میں اسلام کا دعویٰ کرنے والوں کو اور اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والوں کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات کریمہ!

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝[1]

ترجمہ: یقیناً متقیوں کے لئے ان کے ربّ کے حضور نعمتوں والی جنتیں ہیں۔ پس کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح بنالیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے فیصلے کرتے ہو؟ کیا تمہارے لئے کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو؟ یقیناً اس میں تمہارے لئے وہ (کچھ) ہوگا جسے تم زیادہ پسند کرتے ہو۔

مجھے تو یوں لگا جیسے اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ میں موجودہ حکومت مخاطب ہے۔ واضح طور پر مسلمان کا لفظ لا کر اس کے مقابل میں بالکل وہی لفظ رکھا ہے جو آج کی حکومت نے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والے احمدیوں کے لئے مقرر کیا ہے کہ وہ مجرم ہوں گے اور ان کے جرم کی سزا تین سال قید بامشقت ہوگی۔ کاش زعماء حکومت غور کریں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کس کتاب سے یہ کالے قوانین کا استدلال کرتے ہیں اور کیا انہیں اس قسم کے استدلال کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے؟

اس میں ہمارے لئے تسلی کے بہت کافی سامان بھی ہیں اور وہ یہ کہ یہ دنیاوی حکومتیں بے شک جو مرضی فیصلہ کرلیں، قانون بنالیں، جس کو مرضی مجرم قرار دے لیں مگر خدا کے ہاں ایسی اندھیر نگری نہ ہوگی۔ وہ مجرم بنا دیئے جانے والے مسلمانوں کو قیامت کے روز جنت میں جگہ عطا فرما کر ان کافروں سے فاتحانہ انداز میں فرمائے گا کہ کیا میں مسلمانوں کو مجرم قرار دوں؟

جوں جوں اس آیت پر غور کرتا ہوں مجھے موجودہ زمانہ پر یہ آیت پوری طرح منطبق ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

---

[1] سورۃ القلم 35 تا 39

مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کا کیا مطلب؟ کب مجرم قرار دیا گیا؟ مسلمانوں کو جاہل، جادوگر کے پیروکار، بیوقوف، فسادی اور اس قبیل کے مختلف القاب سے تو نوازا جاتا رہا مگر اسلام کا دعویٰ کرنے والے کو مجرم تو کبھی نہیں قرار دیا گیا۔ ہاں اپریل 1984ء کی 26 تاریخ کو فوجی آمر اور نمرودِ وقت ضیاء الحق نے ضرور ایک آرڈیننس جاری کر کے اپنے آپ کو اس آیت کے عتاب کا مورد بنالیا اور اس آیت میں مخفی ایک پیشگوئی کو پورا کرنے کے سامان کئے۔ اگر تو میرا یہ استدلال درست ہے تو اللہ تعالیٰ قرآن مکنون کے اس مضمون پر غور کرنے کی سب کو توفیق دے کہ اس میں ایک طرف جماعت کے لئے تازگی ایمان کا سامان ہے تو دوسری طرف اہل حکومت کے لئے لمحہ فکر یہ ہے۔

## یادِ ماضی میں سے کچھ نظارے

31 جنوری 87ء کی شام ہم کچھ قیدیان سزائے موت کھڑے تھے کہ ایک مشقتی سے سرِ راہ علیک سلیک ہوئی جو کچھ دِن ہوئے فوج سے کورٹ مارشل ہو کر چھ ماہ قید کی سزا لے کر آیا تھا۔ اس کی دُکھ بھری بپتا سنی تو بہت تکلیف ہوئی۔ اس سے اس کے علاقہ کے بارہ میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کاغان کا رہنے والا ہے۔ بس اس کا یہ بتانا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے وادئ کاغان کے مقامات کنڈ، ڈاڈر، شہید پانی، شنراں، ندی، پارس، شوگراں، کاغان، ناران اور جھیل سیف الملوک کے خوبصورت نظارے ایک دم سے گھوم گئے۔ میں جس جگہ کا بھی نام لیتا، وہ اس کی تفصیلات بیان کرنے لگ جاتا۔ اس کی باتوں کے ساتھ اپنے حافظہ کے سہارے 1979ء میں کی ہوئی مختصر سی ہائیکنگ کو یاد کر کے اس خوبصورت وادی کی سیر کرنے لگا۔ ایک ایک نظارہ مجھے یاد آ کر بے پناہ لطف دینے لگا۔ مختصر سی یہ ملاقات طبیعت کو باغ د بہار کر گئی۔ اے کاش! اس دلکش وادی کے شاہکار دریائے کنہار سے ایک دفعہ پھر آنکھ مچولی کرنے کا موقع ملے۔

اس کے ساتھ ہی میں سوچنے لگا کے وہ چند دِن جو لمحات سے زیادہ محسوس نہیں ہوتے، کتنے حسین اور دلفریب تھے۔ جب اُن دِنوں اور نظاروں کا اپنے موجودہ حال سے موازنہ کیا تو یک دم ٹھٹک کر رہ گیا۔ ظاہری لحاظ سے موازنہ کرنے والا تو واقعی بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے کہ ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا مگر درحقیقت یہ بھی ایک انوکھی جنت اور روحانی سرود کی ایک رنگا رنگ محفل تھی۔ ایسی محفل جس میں حقیقی اور ابدی زندگی کا ساز بڑے جوش و خروش سے بجایا جا رہا ہو اور جسم و روح میں سرایت کر جانے والا نور برسایا جا رہا ہو، جس میں ایمان کے درخت اپنی بہار دکھلا رہے ہوں اور ان درختوں میں سے گزر کر چلنے والی بادِ نسیم تسکین کی لوریاں دیتے ہوئے چل رہی ہو اور ایسے میں ؎

تشنہ لبانِ مشرق و مغرب کو ہو نوید بٹتی ہے آج پھر مئے خم خانۂ حجاز

کا معاملہ سونے پہ سہاگہ کا سا ہے، الحمد للہ۔

میں اپنے اعزہ واقرباء اور دوست احباب کو ابتداء سے ہی خطوط لکھتا چلا آرہا تھا، جیسے بھی حالات ہوئے میں نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا۔ تاہم بعد میں تو یہ سلسلہ خط وکتابت ایک مستقل اور باقاعدہ شکل اختیار کر گیا۔ اس میں سب سے زیادہ اہم میری روزانہ کی ڈائری تھی جسے میں نے جیل میں جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد شروع کردیا تھا مگر 1988ء کے بعد میں نے اسے لکھنا ترک کر دیا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ لکھنا اس لئے ترک کیا کہ میری یہ ڈائری باہر جاتی تو کسی نہ کسی ذریعہ سے عام لوگوں تک پہنچ جاتی اور جب یہ باتیں مجھ تک پہنچتیں تو میں عرقِ انفعال میں تر ہو جاتا۔ لیکن اب جبکہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد میں اپنی لکھی ہوئی ڈائری دیکھتا ہوں تو بے شمار بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں بلکہ ایک فلم بن کر گزشتہ واقعات آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگتے ہیں اور جن دنوں کی ڈائری میں نے نہیں لکھی، ظاہر ہے کہ ان دنوں کے واقعات پوری طرح تو اب سپردِ قلم ہونے سے رہے۔ اس امر سے باقاعدہ ڈائری لکھنے کی اہمیت واضح ہے۔

مثال کے طور پر خاکسار نے مؤرخہ 10 جنوری 1987ء کی شب جو ڈائری لکھی اور اس میں جن جذبات کا اظہار کیا، اُن کا احساس اُس وقت تو ہوسکتا تھا مگر اب نہیں۔ علاوہ ازیں اب مجھے وہ تحریر پڑھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اُس نازک وقت میں بھی کس قسم کے الفاظ میرے قلم سے نکلوائے تھے، یہ محض خدائی تصرف تھا، خلیفۃ المسیح کی دعائیں تھیں اور ساری جماعت کا اضطراب تھا جو ان الفاظ کی تخلیق کا باعث تھا ورنہ من آنم کہ من دانم، ملاحظہ ہو میری ڈائری کا ایک ورق:

آج کا دِن طلوع ہوا تو معمول کے مطابق جذبات واحساسات کی سسکتی لہریں تیر رہی تھیں اور غروب ہوا تو یہاں کم ازکم وارڈ میں خوشی پھوٹ پھوٹ پڑ رہی تھی اور فضا میں جشن کا سا سماں تھا کیونکہ دن کے عین درمیان یہاں کے ایک پرانے قیدی سزائے موت کی بریت کی خبر آ گئی جس کی اپیل سپریم کورٹ میں تھی اور آج تاریخ پیشی تھی اور خوشی پر خوشی یہ تھی کہ ان کا سارا کیس ہی بری ہو گیا تھا۔ (بعد میں علم ہوا کہ ابھی ان کی بریت نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کی اپیل سپریم کورٹ میں سماعت کے لئے منظور ہوئی تھی اور یہ مرحلہ طے ہونا بھی دراصل بریت کی طرف ایک قدم ہوتا ہے، اسی لئے ایسی خبر کو بھی قریباً رہائی کی خبر کے مترادف سمجھا جاتا ہے) چونکہ ہمارا بھی ان سب مقدمہ واروں کے ساتھ خاصا تعلق تھا، اِس لئے مجھے بھی بے حد خوشی ہوئی اور یوں لگ رہا تھا کہ خوشی کے فوارے پھوٹ رہے ہیں۔ یہ مقدمہ گیارہ سال پرانا تھا اور سزا ہوئے لگ بھگ چھ سات سال ہو چکے تھے۔ اس لحاظ سے یہ بہت ہی خوشی اور مسرت وشادمانی کا موقع

تھا۔ پھر اس خوشی کو سامنے رکھ کر اُس خوشی کا مقابلہ و موازنہ بھی کیا جو ہماری بریت کے روز ہوگی اور یہاں ہی نہیں ربوہ اور ساہیوال یا گوجرانوالہ میں ہی منائی نہیں جائے گی بلکہ پاکستان کی بستی بستی میں خوشیوں کے شادیانے بجیں گے اور پاکستان ہی کیا ساری دنیا میں ایک منٹ میں خوشی کی یہ خبر خوشی کی لہروں پر تیرتی ہوئی ایک کروڑ غمگین اور بے قرار دلوں میں پہنچ کر خوشیوں کے قمقمے روشن کردے گی تو حمد و شکر کے نغموں سے دِلوں کے ایوان گونجنے لگیں گے اور جہاں جہاں کوئی احمدی جبین ہوگی وہ اپنے رب کے حضور جھک جائے گی اور احمدی تو کیا دوسرے اہلِ فہم احباب بھی اس خبر پر اپنی بے ساختہ و بے اختیار خوشی کا اظہار کریں گے، انشاء اللہ العزیز۔ خدا کرے وہ دن جلد آئے جب ایسی خوشخبری ہمارے پیارے آقا کو ملے اور آپ کا سخت بے قرار اور مضطر و مضطرب دل سکون اور قرار سے بھر جائے اور آپ کے ہنڈیا کی طرح اُبلتے سینہ میں ٹھہراؤ آجائے، آمین۔

ہم اپنے رب کی رحمت سے قطعاً مایوس نہیں ہیں۔ وہ ضرور اس بابرکت منظر سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے گا مگر ہمارا معاملہ تو عجیب تر ہے کہ اگر ہمارے مولیٰ کی رضا شر کے پردہ میں ظاہر ہو تب بھی کسی لمحہ بھی ہمارے ماتھے پر نہ تو کوئی شکن دکھائی دے گی اور نہ ہی ہمارے لبوں پر کوئی شکوہ آئے گا، انشاء اللہ۔ اللہ ہمیں کسی بھی صورت حال کے پیش آنے پر اس کے شایان شان نمونہ پیش کرنے کی توفیق، ہمت اور سعادت بخشے آمین۔

اِس کے ساتھ ساتھ ہمارا ایمان وایقان ہے کہ ''حقیقتوں کو کبھی موت آنہیں سکتی''۔ اِس لئے جب تک شب ظلم جاری ہے ہم ستون دار پر اپنے سروں کے چراغ رکھ کر اس کی سیاہی کو کم کرتے چلے جائیں گے اور دعا گو ہیں ؎

جو زخم کھانے دیارِ وفا میں نکلے ہیں ۔۔۔ خدا کرے نہ بجھیں اُن مسافروں کے چراغ

اسی طرح چند مزید صفحات اپنی ڈائری میں سے ہدیۂ قارئین ہیں جو خالصۃً انہی پر آشوب ایام اور غیر یقینی صورت حال میں سپردِ قلم کئے گئے تھے۔

## ایک مخالف سے گفتگو

یوں تو ابتداء سے ہی کسی نہ کسی رنگ میں تبلیغ کا موقع ملتا رہا بلکہ ہمارا تو وجود اور تعارف ہی مجسم تبلیغ تھا تاہم بعض مواقع پر تو خاص طور پر اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے دیتا۔ یہاں تک کہ سزائے موت وارڈ میں بھی

موقع کی تاک میں رہتا چنانچہ ایک غیراز جماعت قیدی سزائے موت میرے ساتھ سلسلہ کے بارے میں گفتگو کرتا اور کسی کتاب کا تقاضا کرتا رہتا۔ میں نے کچھ دنوں تک تو ازراہِ احتیاط اسے کوئی کتاب نہ دی تاہم 28/اپریل 1987ء کی سہ پہر اس کے پاس کھڑا تھا کہ مجھے کہنے لگا کہ تم مجھے اپنی کتابیں دو یا نہ دو میں نے تو انہیں پڑھ ہی لیا ہے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو اس کے جواب سے اندازہ ہوا کہ اس کے پاس مخالف سلسلہ مولویوں کی کچھ کتابیں پہنچی ہیں جن میں انہوں نے کتب حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں سے حسب عادت حوالوں کی کتر و بیونت کر کے اپنے انداز میں شائع کئے ہوئے ہیں۔ اس پر مجھے جوش آیا کہ اس کے ذہن میں یہ منفی رجحان کیوں پیدا ہو؟ چنانچہ میں نے محترم ملک صاحب کے پاس پڑی ''کشتی نوح'' منگوائی اور ہرچہ باداباد کہتے ہوئے اسے دی کہ یہ ہے خالص دودھ، اسے پی کر دیکھو! مگر اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کس چکر میں تھا کیونکہ اس کے بعد اچانک اس نے اپنا پینترا بدلا اور مخالفانہ باتیں شروع کر دیں پھر چند ہفتوں بعد اس کی تمام اپیلیں مسترد ہو گئیں اور ایک روز پھانسی گھاٹ کے رستے راہی ملک عدم ہو گیا۔

## آخر فرق کیا ہے؟

ساہیوال جیل میں سزائے موت وارڈ کی بات ہے کہ ایک قیدی کی سپیشل ملاقات آ گئی۔ ملاقات کے ساتھ ہمارے انچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ شیخ محمد عقیل صاحب بھی تھے۔ جنہیں جب کوئی اور جگہ نہ ملی تو میرے سیل میں آ کر بیٹھ گئے۔ اسی دوران ایک موقع پر بڑے معذرت خواہانہ انداز میں بولے:

'میں ایک بات پوچھنی چاہتا ہوں۔ اس کے لئے میں پہلے معذرت کرتا ہوں، گستاخی معاف'

ان الفاظ اور انداز سے موصوف ہماری جماعت کے متعلق پوچھنے لگے۔ چنانچہ بھوکے کو کیا چاہئے والا معاملہ تھا۔ جیل میں پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھے ایک افسر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مخاطب کی جو کیفیت ہو سکتی تھی وہ میری ہوئی۔ خیر اس کے بعد وہ بڑے حساس انداز میں کہنے لگے کہ یہ بتاؤ کہ ہمارے اور آپ کے درمیان فرق کیا ہے۔ کیا آپ کا بھی کلمہ یہی نہیں یا کوئی اور ہے؟ میں نے فوری طور پر کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھا اور کہا ہمارا تو کلمہ یہی ہے جہاں تک اس کے ثبوت کی ضرورت ہے تو یہ پڑی ہے ہمارے حضرت مرزا صاحب کی کتاب! میرے پاس سید میر داؤد احمد صاحب مرحوم کی مرتب

کردہ ضخیم کتاب ''مرزا غلام احمد قادیانی اپنی تحریروں کی رو سے'' موجود تھی۔ میں نے اس کتاب کا ان سے تعارف کرایا، حضورؑ کی شبیہ مبارک بھی دکھلائی اور بعض اَوراق دکھاتے ہوئے حضورؑ کی ایک تحریر کا خیال آ گیا جسے میں نے کچھ ہی روز پہلے پڑھا تھا اور اسے علیحدہ کاغذ پر نوٹ بھی کر لیا تھا۔ وہ تحریر پڑھنے کو انہیں دی اور خود آرام سے بیٹھ کر ان کا چہرہ پڑھنے لگا۔ اس صفحہ پر سیدنا حضرت مسیح موعودؑ کے دو اقتباس تھے اور دونوں میں آپؑ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی وابستگی کا نہایت والہانہ انداز میں اظہار فرمایا تھا۔ اسے پڑھ کر کہنے لگے ''تو پھر باقی کیا رہ گیا، یہ کیا چکر ہے، اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے؟'' اسی دوران اُس وقت کے ہمارے انچارج S.G.Warder بھی وہاں آ کر شریک گفتگو ہو چکے تھے۔ شیخ صاحب نے مذکورہ اقتباس انہیں بھی بآواز بلند سنایا اور حیرانی ظاہر کی کہ ایسا عقیدہ رکھنے والوں کو بھی اس اس طرح کہا جا رہا ہے حالانکہ اس میں تو کوئی بات ہی نہیں۔ وہ باریش S.G.Warder صاحب نے بات کا نچوڑ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''شیخ صاحب! جہاں تک ہمارے یعنی اہلحدیثوں اور ان کے درمیان فرق ہے وہ صرف یہی ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ امام مہدی آ گئے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ ابھی آنا ہے، اس کے علاوہ کوئی فرق نہیں''۔

اس S.G صاحب نے چند روز پیشتر، امیر ضلع خوشاب جناب جہانگیر جوئیہ کی ضمانت کے سلسلہ میں ہائیکورٹ میں وکیل اِستغاثہ کے شائع ہونے والے دلائل کے بارہ میں مجھ سے بات کی تھی۔ اِس کی مناسبت سے میں نے کہا کہ قرآن میں آیا ہے لا تقربوا الصلوٰۃ تو کیا صرف اسی حصہ کو درست سمجھ کر عمل کرنا جائز ہوگا نہیں۔ اس لئے اگر کوئی ایسی بات ہو تو اس کو اس کے سیاق وسباق میں دیکھنا ہوگا۔ اس پر وہ صاحب خاموش ہو گئے اور ساتھ ہی انہوں نے بات ختم کر دی۔ میں نے بھی ''اتنا'' ہی کافی سمجھتے ہوئے بات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔

### قرآن مجید سے استفادہ

13/اکتوبر 1988ء ایک روز سوچ رہا تھا کہ ہم قرآن کریم تو ہر روز پڑھتے ہیں مگر اس کا فائدہ؟ سوائے اس کے کہ اعتقادی لحاظ سے ہمیں ثواب مل رہا ہو اور تو کوئی بھی فائدہ نہیں ہے جبکہ قرآن کریم کا صرف یہ مقصد تو نہیں ہے اور نہ ہی ایسے کسی ثواب کو قرآن کا اصل مقصد قرار دیا جا سکتا ہے، چنانچہ فیصلہ کیا کہ تلاوت کے دوران اس بات کا خیال رکھا کروں کہ کوئی ایک حکم چن لیا کروں اور سارا دن اس پر غور کروں، اس پر عمل

کروں، اس طرح سے مہینہ میں 30 اور سال بھر میں 365 حکموں پر عمل کرنے کا موقع مل جائے گا اور اگر ان میں سے چند ایک بھی زندگی اور معمولات زندگی کا حصہ بن جائیں تو میرے ایسے گناہ گار کے لئے بہت کافی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اکتوبر کے اس مہینہ میں قرآن کریم کا نیا ماہوار دور شروع کیا تو اس کا اہتمام بھی کیا۔ چنانچہ اب روزانہ کم از کم ایک حکم کو منتخب کر لیتا ہوں اور اس پر دن کے مختلف اوقات میں جب بھی خیال آئے غور کرتا ہوں اور عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آج کا حکم یہ تھا کہ اے لوگو! تم اپنی قسموں کو آپس میں دھوکہ دہی کا ذریعہ نہ بنایا کرو۔ ہم خواہ مخواہ قسمیں کھاتے رہتے ہیں، اس طرح سے اللہ کے نام اور اس کو گواہ ٹھہرا کر اپنے آپ کو دھوکا دیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

## ایک اقتباس

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مذکورہ بالا اقتباس حضور اور جماعت کے عقائد کی وضاحت اور صراحت کے لئے انتہائی زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں حضور نے بے حد تڑپ اور درد کے ساتھ اپنے دل کی بات کہی ہے جسے پڑھ کر کسی کافر کا دل بھی اسے تسلیم کئے بغیر نہیں رہتا۔ سچ ہے جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے میں اپنے اور قارئین کے اِزدیادِ ایمان کی غرض سے یہاں بھی درج کئے دیتا ہوں۔ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مجھے اللہ جلّ شانہ کی قسم ہے کہ میں کافر نہیں، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میرا عقیدہ ہے۔ اور لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت میرا ایمان ہے۔ میں اپنے اس بیان کی صحت پر اس قدر قسمیں کھاتا ہوں جس قدر خدا تعالیٰ کے پاک نام ہیں اور جس قدر قرآن کریم کے حرف ہیں اور جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا تعالیٰ کے نزدیک کمالات ہیں، کوئی عقیدہ میرا اللہ اور رسول کے فرمودہ کے برخلاف نہیں۔ اور جو کوئی ایسا خیال کرتا ہے خود اُسکی غلط فہمی ہے اور جو شخص مجھے اب بھی کافر سمجھتا ہے اور تکفیر سے باز نہیں آتا وہ یقیناً یاد رکھے کہ مرنے کے بعد اُس سے پوچھا جائیگا میں اللہ جلّ شانہٗ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا خدا اور رسول پر وہ یقین ہے کہ اگر اس زمانہ کے تمام ایمانوں کو ترازو کے ایک پلہ میں رکھا جائے اور میرا ایمان دوسرے پلہ میں تو بفضلہ تعالیٰ یہی پلہ بھاری ہوگا۔"[1]

اس اقتباس کو پڑھ کر یہی دعا نکلتی ہے دل سے کہ

**اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ، اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ، اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ!**

---

[1] (کرامات الصادقین صفحہ 25، روحانی خزائن جلد 7 صفحہ 67)

13 جنوری 1987ء کا اخبار دیکھا تو بے حد دُکھ ہوا کیونکہ سارا اخبار کراچی اور حیدر آباد میں ہونے والے قتل و غارت کی خبروں سے بھرا ہوا تھا اور یہ کہ صوبہ سندھ کا اکثر حصہ بدامنی اور فسادات کے شعلوں کی شدید لپیٹ میں آ گیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں انسانی وجود گاجر مولی کی طرح کاٹے جانے لگے تھے۔ پہلے بھی اور اب بھی ان فسادات اور خون ریز حالات کی خبریں سن کر اور پڑھ کر آنکھوں میں برسات کا سماں ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور ان حالات کی بہتری کے لئے دعا کرتا ہوں تو اُس وقت مجھے مختلف آوازیں آنے لگتی ہیں۔ کسی آواز کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ سارے پاکستان میں اللہ اور رسولؐ کے نام کے ساتھ جو کچھ یہ قوم کر رہی ہے، اُس سارے کا نچوڑ کراچی کے یہ حالات ہیں۔ کبھی مجھے آگ اور خون کی اِس ہولی میں سے لاڑکانہ کے معصوم احمدی عبدالحکیم صاحب ابڑو شہید کی آواز سنائی دیتی ہے کہ 'مجھے مارتے ہو!؟' تو کبھی حیدر آباد کے ہر دلعزیز اور نافع الناس سپوت ماہرِ امراضِ چشم ڈاکٹر عقیل بن عبدالقادر صاحب شہید کی معصومیت کا نعرہ بلند ہوتا ہوا سنائی دیتا ہے، ہاں ہاں قریشی عبدالرحمٰن شہید کا مقدس خون جس بدقسمت زمین پر گرا تھا وہ بھی تو اُسی صوبے کی ہی تو ایک پسلی تھی یعنی ضلع سکھر جس کا دارالحکومت عروس البلاد کہلاتا ہے۔ پھر انعام الرحمٰن صاحب کو بھی اسی سرزمین پر سراسر ظلم کی راہ سے مارا گیا۔ پنجاب و سندھ کی سرحد پر واقع بنوں عاقل بھی تو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ نواب شاہ کے امیر جماعت محترم ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب کا خون بھی تو صوبہ سندھ کے چہرہ پر رنگ لانے والا باقی تھا۔ مجھے اپنے ذہن میں یہ صدائیں گونجتی ہوئی سنائی دینے لگیں کہ کراچی اور حیدر آباد میں ہونے والے یہ واقعات ان چودہ دردناک واقعات شہادت کا منطقی انجام ہیں جن کی ایف آئی آر بھی آسانی سے تھانوں میں درج نہ ہو سکی تھی۔ ہاں انہی کربناک واقعات کا منطقی نتیجہ ہیں جن کے پرچوں میں نامزد ملزمان میں سے آج تک کسی ایک کی گرفتاری بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ ہائے ان مظلوموں کی آہیں ابھی نہ جانے کس کس بھیانک شکل میں ہمارے اس بدقسمت ملک میں ظاہر ہونے والی ہیں۔ ان کے مظلوم بیوی بچوں کی آہیں اور جذبات آسمان سے ہو کر کیا خبر کیسی کیسی خبریں لائیں اور کس کس شکل میں نازل ہوں ۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر ، لہو پکارے گا آستیں کا

مجھے یقین ہے کہ دمِ واپسیں ان شہدائے احمدیت میں سے کسی ایک کے بھی لبوں پر یا ان کے تصور میں بھی اپنے وطن اور اہل وطن کے لئے قطعاً کسی قسم کے انتقامی جذبات یا خیالات نہ ہونگے اور نہ ہی آج اِن کے بچوں یا اعزہ و اقارب کے ذہنوں میں ایسی کوئی بات ہوگی مگر خدا تعالیٰ تو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ غفور اور رحیم ہونے کے ساتھ ساتھ ذوالانتقام بھی تو ہے۔ اُس کی لاٹھی بڑی بے آواز ہے اور اس کے سبق سکھانے کے انداز بڑے نرالے ہیں چنانچہ فرماتا ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ أَوْ مِن تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ ۗ انظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۝[1]

یعنی کہہ دے کہ وہ قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے یا تمہیں شکوک میں مبتلا کر کے گروہوں میں بانٹ دے اور تم میں سے بعض کو بعض دوسروں کی طرف سے عذاب کا مزہ چکھائے۔ دیکھ کس طرح ہم نشانات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تا کہ وہ کسی طرح سمجھ جائیں۔

اللہ کا یہ عذاب بہت سخت اور خوفناک ہے جسے ہماری قوم نے آج محب وطن اور معصوم احمدیوں کے بے گناہ خون اور جانوں کے عوض مول لے لیا ہے۔ یہ تجزیہ صرف میرا ہی نہیں ہے بلکہ قوم کے ہر طبقہ خیال کے لوگ اسی طرح سوچ رہے ہیں اور آوازِ خلق کی صورت میں نقارۂ خدا بج رہا ہے۔ اور تو اور کل کے اخبار میں یہ خبر تھی:

”گجرات (نمائندہ جنگ) فلم سٹار محمد علی نے کہا ہے کہ جب کسی ملک پر حملہ ہو یا آسمانی آفتیں نازل ہوں تو یہ اُس ملک کے باسیوں پر قہر خداوندی کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک پر بھی اس وقت عذاب الٰہی نازل ہے جس نے ملک کے عوام کے دلوں سے بھائی چارے، محبت اور اخوت کا رشتہ ختم کر دیا ہے اور بھائی بھائی کا گلہ کاٹ رہا ہے......“[2]

پھر ان تبصروں پر ہمارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں مہر تصدیق ثبت فرما دی:

یہ سورۃ الانعام کی وہ آیات ہیں جن کا آج کل ہمارے ملک پر بعینہٖ اِطلاق ہو رہا ہے اور اس قوم نے جو

---

[1] سورہ الانعام: 66

[2] روزنامہ جنگ لاہور 31 رجنوری 1987ء ص 2

اپنے وقت کے امام کو جھٹلایا ہے جو حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کا سچا نمائندہ تھا تو عملاً انہوں نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی پیشگوئیوں کا انکار کر کے آپؐ ہی کی تکذیب کی ہے خواہ یہ منہ سے مانیں یا نہ مانیں، اس حقیقت سے کوئی انکار ممکن نہیں۔[1]

کاش ہماری قوم اس بیان کے ساتھ قرآن کو بھی پڑھے جہاں لکھا ہے ویذیق بعضکم بأس بعض اور فاعتبروا یا اولی الابصار پر عمل کرے، آمین۔

11 ستمبر 87ء

آج مکمل چھٹی تھی بلکہ دوہری چھٹی تھی یعنی جمعہ کی بھی اور قائداعظم کے یومِ وفات کی بھی۔ قائداعظم کے یومِ وفات کے سلسلہ میں ریڈیو پر پروگرام تو آ رہے تھے مگر یہ پروگرام عام لوگوں کے دلوں میں اپنے قائد کے لئے محبت پیدا کرنے سے قاصر تھے کیونکہ کسی کو بالکل ہی اس دن کا خیال نہ تھا۔ غالباً اس لئے کہ یہ پروگرام اپنی اصل روح سے عاری تھے، خالی تھے بالکل پھوکے تھے۔ ان کو پیش کروانے والے صرف اپنی کرسیوں کی حفاظت کے لئے انہیں پیش کروا رہے تھے۔ انہیں مجبوری تھی کیونکہ ابھی تک قوم میں یہ شعور ضرور باقی ہے کہ ہمارا ملک قائداعظم کی کوششوں سے بنا تھا ورنہ یہ لوگ حضرت قائداعظم کو بھی بھلا دیتے۔ کراچی کے مشہور شاعر جناب رئیس امروہی نے انہی تاثرات کو نظما کر آج کے جنگ اخبار میں بڑے مؤثر انداز میں شائع کرایا ہے۔ انہوں نے قائدِاعظم کے ارشادات آپ کی ہدایات اور آپ کی قوم اور ملک کے مستقبل سے متعلق متعین کردہ لائنوں کا خلاصہ لکھنے کے بعد پاکستان کی موجودہ حالت کے ساتھ یوں موازنہ کیا ہے۔

سی رہے ہیں خود کفن دوز اپنی میت کا کفن — حکم یہ ہے اپنی قبریں آپ کھودیں گورکن
ایک گورستان عبرت ہے بہ چشم آگہی — ہم سمجھتے ہیں جسے زندہ دلوں کی انجمن
زلزلے رقصاں ہیں تیری جنبش انگشت میں — تیرا فن خلد آشنائی، تیرا خامہ خود شکن

---

[1] خطبہ جمعہ فرمودہ 12 دسمبر 1997ء

# مخالفین کا انجام

## ساہیوال میں جماعت کے خلاف فساد کی آماجگاہ 'جامعہ رشیدیہ' کی حالت زار

جیسا کہ ابتداء میں ذکر ہو چکا ہے کہ ساہیوال میں جماعت کے خلاف ہر قسم کے فتنہ وفساد کی آماجگاہ شہر سے باہر بڑے لاری اڈہ کے قریب واقع احراریوں کا قائم کردہ جامعہ رشیدیہ تھا۔ مسجد احمدیہ پر اس مدرسہ کی سرپرستی میں ہونے والے حملہ کے جلد بعد اس مدرسہ کے جو حالات ہوئے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے خاکسار نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

یہ بجا کہ ہم اِس وقت مشکل میں ہیں اور ہمارے لواحقین ہم سے بھی زیادہ پریشانی اور تکلیف کا شکار ہیں مگر ہمیں کامل یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑے گا، اِنشاء اللہ العزیز۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ابتلاء کا یہ دَور طویل ہو جائے مگر انجام کار خدا ہمارے اور مخالفوں کے درمیان خوب کھول کھول کر فیصلہ کر دے گا۔ اُس کی لاٹھی بڑی بے آواز ہے اور سچ پوچھئے تو اس کے برسنے کا اِحساس ہماری قوم کو نہیں ہو رہا ورنہ وہ پوری شدت لیکن کامل خاموشی کے ساتھ برس تو رہی ہے۔ سارے ملک کے حالات اِس امر کے گواہ ہیں۔ اس کا ایک پہلو جو براہِ راست ہمارے ساتھ تعلق رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ساہیوال کا مدرسہ 'جامعہ رشیدیہ' جو ساہیوال میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف سازشوں کا مرکز اور فتنہ وفساد کا براہِ راست ذمہ دار ہے، ہمارے اِس واقعہ کے فوراً بعد سخت انتشار اور بدامنی کا شکار ہو گیا۔ پہلے ان کے اربابِ حل و عقد کے درمیان ہلکے ہلکے اختلافات رونما ہونے کی اطلاعات آتی رہیں۔ پھر اس کے ناظم اعلیٰ مولانا حبیب اللہ کی موت سے ایک نشان ظاہر ہوا اور اس کے بعد تو پھر اس مدرسہ کو چین نصیب ہی نہیں ہوا۔

اس کی تفصیل کسی قدر یہ ہے کہ پہلے تو فتنہ وفساد اور مخالفت احمدیت کی اِس آماجگاہ کے کرتا دھرتا دو گروہوں میں بٹ گئے اور تنازعہ بڑھتے بڑھتے سرکاری اِنتظامیہ تک جا پہنچا۔ چنانچہ D.C صاحب نے معاملات کی جانچ پڑتال کے لئے کمیٹی بنائی مگر کچھ فرق نہ پڑا۔ پھر دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو نام نہاد مجلس تحفظ ختم نبوت نامی تنظیم سے گندے اور بددیانتی کے الزامات لگا کر خارج کرنے کا اعلان کیا۔ جن میں ایک الزام ہمارے اسی مقدمہ کے نام پر جمع کئے جانے والے لاکھوں روپوں کے خورد برد کا بھی تھا۔ اس سلسلہ میں اخراج نامہ تقسیم کرتے ہوئے قاری بشیر احمد مقتول کے بیٹے کی ساہیوال ''وکلاء بار'' میں جوتیوں سے پٹائی بھی کی گئی۔ آہستہ آہستہ گروہ بندی کی نوبت بہ ایں جا رسید کہ فریقین مسلح محاذ آرائی پر اُتر آئے۔ چنانچہ دسمبر 87ء میں اس مدرسہ پر قبضہ کرنے کے لئے وہاں شدید فائرنگ ہوئی جس

کے بعد انتظامیہ نے اس مدرسہ کو مقامی لوگوں کی درخواست پر سیل کر دیا۔ ہائیکورٹ میں رٹ کے نتیجہ میں جو دوبارہ کھلا تو چند دنوں بعد پھر فائرنگ کی خبر آئی۔ اس فائرنگ کے بعد' داڑھی بردار کئی مجاہدین' یہاں جیل کی سیر بھی کر کے جا چکے ہیں۔ جامعہ رشیدیہ کی زبوں حالی اور فتنہ پرداز منتظمین کی ذلت وخواری بزبان حال پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

آج 2 فروری 87ء کو پھر اس مدرسہ میں گڑبڑ ہونے کی اطلاع ملی۔ بات جو چل نکلی ہے دیکھئے کہاں ٹھہرتی ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ خورد برد کہاں نہیں ہو رہی۔ زکوٰۃ کے نام پر لاکھوں روپیہ کس مدرسہ میں نہیں کھایا جا رہا مگر یہ تنازعہ، یہ فساد صرف اس مدرسہ میں کیوں؟ اس سوال کا جواب کم از کم ہمارے لئے واضح اور صاف ہے۔ قرآن اُٹھا اُٹھا کر، خدا کو حاضر و ناظر جان کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر سراسر اور سرتاپا جھوٹی شہادتیں دینے والوں کا یہ انجام نہ ہو تو اور کیا ہو! خدا کا نام، اس کے مقدس اور برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مٹانے والوں کا یہ حشر نہ ہو تو اور کیا ہو؟

پھر 10 فروری 1987ء کے اخبار میں جامعہ رشیدیہ سے متعلق یہ خبر پڑھی کہ اسے دوبارہ سیل کر دیا گیا ہے۔ یوں تو کوئی بھی ایسی خبر جس میں کسی کے لئے شرّ کا پہلو ہو، اچھی نہیں ہوتی مگر بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو خدائی نشان کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی باتیں پوری ہونے پر خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مدرسہ کے ذریعہ پیارے مہدی کی جماعت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی اور اُن کی مسجد کو سیل کیا گیا تو خدائے غیور نے اس مدرسہ کو ایک چھوڑ دو بار سیل کر دیا اور اس طرح سے اِنِّیْ مُھِیْنٌ مَنْ اَرَادَ اِھَانَتَکَ کی خدائی بات پوری ہوئی۔ ابھی تو آگے آگے دیکھئے کیا کچھ ظاہر ہوتا ہے اور ہمیں کامل یقین ہے کہ یہ سب باتیں لازماً پوری ہوں گی اور بڑی شان اور شوکت کے ساتھ پوری ہوں گی، انشاء اللہ۔

جس بات کو کہے کہ کروں گا میں یہ ضرور ٹلتی نہیں وہ بات خدائی یہی تو ہے

## دشمنوں میں پھوٹ

30 جولائی 1987ء کے اخبار جنگ میں جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے دو گروپوں کے درمیان ایک مرتبہ پھر شدید فائرنگ کی خبر پڑھی۔ پچھلے ایک سال کے دوران وہاں کئی مرتبہ شدید نوعیت کی لڑائیاں ہو چکی ہیں جس سے کئی افراد تشویشناک حالت میں داخل ہسپتال ہیں۔ اس خبر میں خوشی کا کوئی پہلو نہیں ہے تاہم اس پہلو سے یہ کافی اہم واقعات ہیں کہ انہوں نے خدا اور خدا کے رسول کا نام مٹایا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں وَیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے، فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ! ہے ازل سے یہ تقدیر نمرودیت، آپ ہی آگ میں اپنی جل جائے گی۔

## تاریخ احمدیت

تاریخ احمدیت کے مطالعہ سے بے پناہ لطف آتا ہے ایمان غیر معمولی طور پر تازہ ہوتا ہے اور ربنا اللہ کہہ کر استقامت کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی حیات طیبہ کے ایسے ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں کہ آپ کی صداقت پر مہر ثبت کرتے ہیں۔ ایسے ایسے حالات آپ کی زندگی میں پیش آئے جو عام آدمی کے وہم وگمان بھی نہیں آسکتے۔ کہیں حضور پر گالیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے تو کہیں پتھروں کی! مگر آپ کمال ثبات قدمی سے مردِ میدان رہے۔ خاص طور پر پادری مارٹن کلارک کی طرف سے حضور پر دائر کردہ مقدمہ اقدامِ قتل کے واقعات ایمان کو تازہ کر دیتے ہیں۔ مقدمہ کے حالات اور اس کا انداز اِتنا خطرناک تھا کہ آج بھی اس کو پڑھتے ہوئے شدید خوف محسوس ہوتا ہے۔ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام جیسے پاکیزہ وجود پر ایسے بھیانک انداز میں کئے گئے مقدمہ کی شروعات ہی کپکپی طاری کر دیتی ہیں مگر یہ اسی پاک ہستی کا جگرا تھا کہ سب کچھ نہ صرف پورے حوصلہ سے سنا بلکہ پوری بشاشت اور شجاعت کے ساتھ مقدمہ کی پیروی کی غرض سے عدالت میں پیش ہوئے اور اِنتہائی مخالفانہ حالات کے باوجود سرخرو ہوئے اور ہمارے لئے اپنی صداقت کے بے شمار نشانات تاریخ کے صفحات پر نقش کر گئے۔ اِس واقعہ میں ہمارے لئے حوصلہ، ہمت، برداشت، کامل توکل، اِستقامت اور اپنے رب کی رضا پر راضی رہنے کا عظیم درس ہے۔ یہ واقعہ بلاشبہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ حیرت ہے کہ احباب جماعت کے خلاف جتنے بھی فوجداری مقدمات میں سے قتل یا اِقدام قتل کے مقدمات تاریخ احمدیت میں محفوظ ہیں، وہ سب کے سب جھوٹے اور سراسر بے بنیاد ہیں۔ گویا ہمارے خلاف قائم کیا جانے والا یہ جھوٹا مقدمہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمارے مخالفوں کا شروع سے یہی وطیرہ رہا ہے۔

جماعتی تاریخ کے حوالہ سے آج کا دن (13 مارچ) ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کیونکہ آج سے 73 برس قبل قدرت ثانیہ کا ایک چاند غروب ہوا تھا تو اللہ کے فضل سے ایک دوسرا چاند طلوع ہو گیا تھا۔ اس چاند نے طلوع ہو کر چار دانگ عالم کو اپنی چاندنی میں نہلا دیا اور پورے باون برس تک اس کی چاندنی ارضِ قلوب پر پڑتی رہی۔ میری مراد حضرت خلیفۃ المسیح الاول رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کے منصبِ خلافت پر فائز ہو کر ایک طویل عرصہ پر محیط آپ کی غیر معمولی اور عظیم الشان خدمت دین کی تفصیلات سے ہے۔ کیا خوب کسی نے کہا ہے کہ ؎

إِذَا سَيِّدٌ مِنَّا خَلَا ، قَامَ سَيِّدٌ قَئُوْلٌ لِمَا قَالَ الْكِرَامُ فَعُوْلُ

یعنی جب ہمارا کوئی سردار گزر جاتا ہے تو فوراً ہی اس کی جگہ لینے والا ایک اور کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ ہمارے معزز لوگوں کی باتوں کو بہت اچھی طرح کہنے والا اور عمل کرنے والا ہوتا ہے۔

## جنرل ضیاء الحق کو مہلت کیوں؟

اس عنوان کے تحت خاکسار کی ڈائری کا ورق حسب ذیل ہے:

آج 18 مارچ 87ء کی بات ہے کہ صبح چہل قدمی کے دوران میں اپنے کسی ساتھی کی اس بات پر غور کر رہا تھا کہ ضیاء الحق کو اس قدر مہلت کیوں مل رہی ہے حالانکہ اس کی حرکتیں پہلوں سے کہیں زیادہ بھیانک اور خوفناک ہیں۔ اس پر میرا ذہن اس طرف گیا کہ جماعت کا ایک بڑا دشمن ذوالفقار علی بھٹو مرا اور ایسے حالات میں مرا اور ایسے ایسے واقعات ہوئے کہ انسان ذرا سا بھی تدبر کرے تو اس پر حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ اس پر خدائی پیشگوئیوں کے مطابق اللہ کی خاص تقدیر جاری ہوئی اور اس کی ہلاکت جماعت احمدیہ کی صداقت وحقانیت پر مہر تصدیق کر گئی ہے لیکن قوم نے اس پہلو کی طرف بالکل توجہ نہ دی اور اسے معمول کا ایک واقعہ قرار دے دیا۔ اب میرے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ اس ضیاء کو کچھ اس طرح سے سزا دینے والا ہے کہ قوم کے لئے کسی قسم کے بہانے کی گنجائش نہ رہے اور حقیقت پوری شان اور جلال وشوکت کے ساتھ ظاہر ہو یا پھر ساری قوم ہی اس سزا کی لپیٹ میں آنے والی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ بہرصورت اللہ تعالیٰ رحم ہی فرمائے، آمین۔

16 ستمبر 87ء

اللہ کے فضل سے دن بخیریت گزر گیا۔ جب میں یہ فقرہ لکھتا ہوں تو میرے ذہن میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اس خیریت کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ایک خیریت تو جیل عملہ کی طرف سے ہوتی ہے اور ایک یہاں کے قیدیوں کی طرف سے۔ علاوہ ازیں ایک تیسرا پہلو اپنے کیس کی نوعیت کے حوالہ سے بھی ہوتی ہے۔ ہمیں مقدمہ کے سلسلہ میں مختلف مراحل سے اس طرح غیر متوقع اور اچانک طور پر گزارا گیا کہ اب کسی بھی لحہ کا اعتبار نہیں رہا۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آج رات ہم خیریت سے سوئے ہیں تو اگلی صبح کس حال میں ہوں گے۔ اسی طرح صبح خیریت سے ہوئی ہے تو شام کا اعتبار نہیں ہوتا کہ کہاں ہوں گے۔ ہر وقت پا بہ رکاب ہوتے ہیں تا کہ کسی بھی آڑے وقت پر ہمارے جذبات یا تصورات یا توقعات آڑے نہ آئیں۔ اللہ ہمیں ہر قسم کی صورت حال کا کمال بشاشت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی توفیق بخشے، آمین۔

## جامعہ احمدیہ

میری مادرِ علمی جامعہ احمدیہ ربوہ کے تعلیمی موسم کے لحاظ سے یہ وہ دن تھے جب غیر نصابی سرگرمیاں عروج پر ہوتی تھیں۔ مارچ کے ان آخری ایام میں ہمارے سالانہ تقریری مقابلے ہوا کرتے تھے۔ اس دوران اور بھی کئی علمی مقابلے ہوا کرتے تھے کیونکہ ان سالانہ مقابلوں کے آخری روز سالانہ تقریب تقسیم انعامات بھی منعقد ہوتی تھی جس کے بعد سالانہ ڈنر ہوا کرتا تھا جس کے آخر پر تفریحی خاکے وغیرہ بھی پیش کئے جاتے۔ اس تقریب میں اللہ کے فضل سے میں ہر سال کوئی نہ کوئی انعام ضرور حاصل کرتا رہا۔ الحمدللہ۔

میں آج اسیری کی حالت میں وقت کے اس کنارہ پر کھڑا بڑی چاہت کے ساتھ اُن گزرے ہوئے لمحات کو یاد کر رہا ہوں۔ یہ سب یادیں ہیں جو میرے دل کو گدگدا رہی ہیں۔ کیسی شاندار وہ شامیں تھیں، اور کتنی رنگین وہ صبحیں تھیں۔ ان شاموں اور ان صبحوں نے مجھے واقعی بہت کچھ دیا۔ لیکن افسوس کہ میں نے اس کو پوری طرح سمیٹا نہیں ہاں ایک بات مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ میں ہر سال اپنے صداقت گروپ کی طرف سے عربی تقریری مقابلہ میں حصہ لیا کرتا تھا اور اس سلسلہ میں ایک نکتہ اپنی تقریر کے آخر میں ضرور بیان کیا کرتا تھا۔ مضمون خواہ کوئی بھی ہوتا، عنوان کیسا بھی ہوتا میں مضمون کو گھما پھرا کر اس نکتہ پر لے آیا کرتا تھا۔ وہ عظیم نکتہ ہمارے جامعہ کے محبوب پرنسپل حضرت سید داؤد احمد صاحب مرحوم کے اُس پیغام پر مشتمل تھا جو آپ نے اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں طلبہ جامعہ کو دیا تھا اور آپ کی سیرت پر شائع ہونے والی کتاب کے سرورق پر ان الفاظ میں شائع ہوا تھا:

اسلام کی فتح اور کامیابی کے لئے تمہارے خون کی ضرورت ہے۔

مجھے امید ہے کہ تم اس کے لئے ہمیشہ تیار اور آمادہ رہو گے۔

اس ولولہ انگیز پیغام کا نہایت شاندار اور فصیح و بلیغ عربی ترجمہ استاذی المکرم حضرت ملک مبارک احمد صاحب مرحوم نے کیا تھا اور اس کے الفاظ کچھ یوں میرے حافظہ میں محفوظ ہیں:

أيها الطلاب! إن غلبة الإسلام بأمس الحاجة إلى دمائكم. فإنني آمل أنكم

لاتزالون ولن تزالوا على أهبة الاستعداد لهذا الفداء العظيم!

خدا کرے کہ یہ عظیم پیغام کئی سال گزر جانے کے باوجود بھی جس طرح میرے ذہن پر رقم ہے، میرے کردار پر بھی اسی طرح ہمیشہ نقش رہے۔ میرے اعمال کے خاکوں میں اس پیغام کے خوبصورت رنگ بھر جائیں اور اس کے موتیوں جیسے الفاظ سے میری زندگی میں جڑاؤ ہو جائے اور میری زندگی کے لمحہ لمحہ سے یہ آواز بزبان حال بلند ہونے لگے کہ میرا

خون، میرا گوشت پوست، میری صلاحیتیں اور ساری استعدادیں اور طاقتیں اور قوتیں اور میری ساری ہمت غلبۂ اسلام کے لئے وقف ہو چکی ہے، اس کیلئے قربان ہو چکی ہے اور میں اس عظیم قربانی کے لئے تیار اور آمادہ ہی نہیں بلکہ میرے وجود کا ذرہ ذرہ لبیک لبیک کی صدا لگاتے ہوئے اَسْلَمْتُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِین کا نظارہ پیش کر رہا ہو، آمین ثم آمین۔

## یکم اکتوبر 87ء مرکزی اجتماعات کی یاد

اکتوبر کا مہینہ شروع ہوتے ہی جہاں موسم سرما کا احساس خود بخود ہونے لگتا تھا وہاں اجتماعات اور پھر جلسہ سالانہ کی آمد ہمارے جسموں اور ذہنوں میں ایک شوق اور لگن پیدا کر دیا کرتی تھی۔ ربوہ کی گلیاں اور سڑکیں، دفاتر اور مساجد، میدان اور رہائش گاہیں آباد ہونے لگتی تھیں۔ دفاتر میں مصروفیات بڑھ جاتیں تو مساجد میں حاضری، میدانوں میں کسی طرف شامیانے اور چھولداریاں لگ رہی ہوتیں تو کسی طرف طہارت اور وضو کے انتظامات ہو رہے ہوتے۔ سڑکوں پر پرالی سے لدے ہوئے اونٹ اور ریڑھے نظر آنے لگتے، لنگر خانوں میں مشینوں کی صفائی اور مرمت کی وجہ سے ٹھک ٹھک ہو رہی ہوتی۔ پریس والے اپنی جگہ مصروف ہوتے، رسائل و جرائد اور کتابوں کے ایڈیٹر، مصنف و پبلشر نیز مینیجر حضرات خوب بھاگ دوڑ کر رہے ہوتے۔ ضرورت کے ایسے وقت کاتب حضرات رسائل کے ایڈیٹروں کو داؤ دے کر دریائے چناب کے کنارے ماہی گیری کے شغل سے مستفید ہو رہے ہوتے۔ مگر سمجھ نہیں آتی کہ یہ سب کچھ اہل وطن کو کس زاویئے، کس پہلو سے اسلام کے لئے خطرہ کا باعث نظر آ رہا ہے۔ جس کا سہارا لے کر انہوں نے بیک جنبش قلم زندگی کے اِن تاروں کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ زندگی حقیقی زندگی کے ان ہنگاموں کا شور، ان کی مصروفیت، ان کی تھکاوٹ حافظہ کا بڑا ہی پر لطف سرمایہ ہے۔ اللہ کرے کہ یہ گھڑیاں، یہ مقدس اور بابرکت مواقع پھر سے ہمیں میسر آ جائیں، آمین۔

## قیدی کی حالت

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کا فرمودہ خطبہ عید الفطر 87ء پڑھا۔ حضور نے اس میں صبر کے مضمون پر بڑی عمدگی سے اور نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں حضور نے جیلوں میں مقید صعوبتیں برداشت کرنے والے معصوم احمدیوں کی تکالیف کا تذکرہ فرمایا ہے اور اس ضمن میں ایک قیدی کی کیفیت اور اس کے گزر اوقات کی تصویر کشی کے لئے فیض کے اشعار بھی پڑھے۔ یوں تو فیض کے سارے اشعار ہی اچھے لگتے ہیں مگر اپنی مناسبت سے یہ اشعار دل کو بہت ہی بھلے لگے کیونکہ ان اشعار میں خود اپنی آپ بیتی اور روزمرہ کا معمول بھی سجا ہوا نظر آیا۔ فیض نے جیل کے ماحول اور معمولات کی کیا خوب منظر کشی کی ہے۔

بُجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی

چمک اُٹھے ہیں جو سلاسل تو ہم نے جانا ہے کہ اَب سحر تیرے رُخ پر بکھر گئی ہو گی

غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں گرفتِ سایہ دیوار و در میں جیتے ہیں

جیل میں عام قیدیوں کی جو حالت ان اشعار میں بیان کی گئی ہے وہ تو ہے ہی مگر ان اشعار کا اصل اور مکمل مصداق سزائے موت کے قیدی یا 7 بلاک میں قصوری بند ہیں۔ جن کی زندگی کے یہ مشکل اور تلخ لمحات واقعی شام و سحر کے تصور میں گزرتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے تو صفائی والے کا اِنتظار دِن چڑھا دیتا ہے۔ اِس کے بعد کھانے کے اِنتظار میں گھنٹہ دو گھنٹے گزر جاتے ہیں۔ اس کے بعد اُردی سنائی جاتی ہے تو نئے سیل میں جاتے ہوئے چند لمحوں کے لئے سیل سے باہر کھلے آسمان تلے جانے کا تصور کچھ ایسی خوشی کا باعث بنتا ہے کہ پھر گھنٹہ دو گھنٹے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ دوسرے سیل میں جا کر صفائی کرتے اور اپنا بستر لگانے میں گزرنے لگتا ہے پھر اسی میں رات ہو جاتی ہے اور آسمان کی مانگ ستاروں سے بھر اور سج جاتی ہے۔ گو اب جیلوں میں بجلی کے انتظامات کافی ہیں مگر اس کے باوجود قطع نظر محاورہ کے حقیقت میں بھی شام و سحر کے اوقات کا علم سلاسل اور روزن سے آنے والی روشنی سے ہی ہوتا ہے۔ کسی کے پاس گھڑی ہوتی ہے نہ ہی کوئی اور چیز۔ آسمان نظر آتا ہے نہ ہی زمین کیونکہ اس روزن اور جنگلے کے سامنے اونچی اونچی دیواریں ہوتی ہیں جو ہماری نگاہوں کو بھی ہمارے ساتھ ان کال کوٹھریوں میں بند رکھتی ہیں۔

## جیل کیا ہے؟

مجھے 3 دسمبر 87ء کو ہی بذریعہ خط یہ علم ہوا کہ بھابھی ثمر صاحبہ اہلیہ مکرم ڈاکٹر محمد ادریس صاحب منیر امریکہ سے پاکستان آ رہی ہیں اور اپنی بیٹی عزیزہ منصورہ خلت کو لیکر 5 دسمبر کو ملاقات پر آئیں گی۔ یہ خبر میرے لئے خوشی کا بھی موجب تھی اور حمد و شکر کا بھی موقع تھا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ اپنے بہن بھائیوں میں سے کسی کے بچے سے ملاقات ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس کے لئے مجھے خواہش ہوئی کہ پیاری عزیزہ منصورہ خلت کو کوئی تحفہ پیش کروں۔ جیل میں بیٹھ کر یہ سوچنا تو بہت آسان ہے مگر عملاً بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے، بطورِ خاص ایسی صورت میں کہ جب اُس شہر میں اپنا گھر بھی نہ ہو۔

خیر میں نے اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اپنے ایک دوست کے ذریعہ ایک دوسرے دوست کو پیغام بھجوایا جس میں ساری صورت حال واضح کر کے کسی اچھے سے تحفہ کی فرمائش کی اور قیمت کے بارہ میں بھی انہیں کھلی چھوٹ دی۔ انہیں پیغام بھی پہنچ گیا، انہوں نے وعدہ بھی کر لیا کہ شام کو لے آوں گا لیکن ایسا اس سے اگلے روز بھی ممکن نہ ہو سکا۔ ملاقات آ گئی، سب سے ہی بڑی اچھی ملاقات ہو گئی۔ میں یہ سوچتا رہا کہ عزیزہ منصورہ کو کیا دوں مگر اپنے آپ کو مجبور

خیال کر کے اس احساس کمتری کے بوجھ تلے سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب ملاقاتی واپس چلے گئے تو سامان دیکھا تو میز پر ایک لفافہ پڑا تھا جس پر فوری کا لیبل لگا ہوا تھا، اسے کھولا تو اس میں منصورہ کے لئے ایک فراک تھا۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جیل ہے۔ یہ جیل کی مجبوریاں ہیں۔

اس ملاقات پر ایف اے کے امتحان کے لئے داخلہ فارم آئے۔ چنانچہ رات اللہ کا نام لے کر اسے پر کرنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ فارم پُر کرنا بھی کتنا محنت طلب کام ہے۔ ایک تو پیچیدہ قسم کے کوائف اور پھر سر کے اوپر لٹکتی ہوئی تلوار کہ اگر کٹنگ ہوگئی تو فارم قابل قبول نہ ہوگا۔

## ایک تقریب رخصتی میں شرکت

آج 25 جنوری 1987ء کو صبح سے مجھے یاد تھا کہ میں نے محترم ماموں منیر الدین احمد صاحب مبلغ سلسلہ (خاکسار کی نانی جان کے بھائی جنہیں ہم بھی ماموں جان ہی کہتے ہیں) سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ ان کی بیٹی کی تقریب رُخصتانہ میں دعاؤں کے ذریعہ شریک ہوں گا۔ سو پہلے پہر بھی ان کی اس تقریب میں شامل ہوا اور پچھلے پہر بھی جبکہ رخصتی کا وقت تھا۔ نماز مغرب کے بعد اس سلسلہ میں دو نفل پڑھے اور یہ دعا کرتے ہوئے اس تقریب میں شریک رہا کہ اے اللہ! یہ تعلق ہر لحاظ سے مبارک ہو ؎

اہل وقار ہوویں، فخر دیار ہوویں  مولیٰ کے یار ہوویں، حق پر نثار ہوویں

## موسمی حالات کا خوف

جیل کے اس ماحول میں بعض اوقات یوں بھی ہوتا جیسا 13 مئی 1987ء کی رات ہوا جب کسی پہر میری آنکھ زوردار گڑگڑاہٹ اور شدید قسم کی کڑک سے کھلی۔ طوفانی آندھی کی گھوں گھوں ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہی تھی۔ بجلی کا نظام اس طوفان کی نذر ہو کر درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے مکمل اندھیرا تھا۔ تاہم آسمانی بجلی اس زور سے چمک رہی تھی کہ ہر دوسرے لمحہ ماحول پوری طرح روشن بھی ہو جاتا۔ گرج چمک اس نوعیت کی تھی کہ یوں لگتا جیسے خطرناک دھماکے ہو رہے ہوں اس پر مستزاد یہ کہ شدت کی بارش بھی ہو رہی تھی غرضیکہ ماحول جس قدر خوفناک ہو سکتا تھا، وہ تھا۔ اور یہ سب کچھ مجھے نیند سے یک دم بیدار ہونے کی وجہ سے اور بھی خوفناک لگا اور چند لمحوں تک تو میں حیران و پریشان ہو کر یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر مجھے کبھی کسانوں کا خیال آیا تو کبھی کچے گھروندوں کا۔ اللہ رحم فرمائے، آمین۔

آج سحری سے فارغ ہو کر نماز فجر ادا کی اور تلاوت قرآن مجید کرنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ آسمان کو پھر برس پڑنے کا حکم ہوا اور پورے جلال کے ساتھ برسنے لگا۔ پہلے جو بارش ہوئی تھی وہ تو اندھیرے میں ہوئی تھی اور دیکھی

نہ تھی، اب کے سب کچھ روشنی میں ہو رہا تھا۔ یہ بارش پہلے کی نسبت کئی گنا تیز ہوا کی لہروں پر ناچتی اور بھرپوری شدت کے ساتھ زمین پر پڑتی ہوئی سامنے نظر آ رہی تھی۔ پہلے پہل تو میں اس سے بے نیاز تلاوت کرتا رہا مگر بعد میں جب بارش کے زبردست چھینٹوں نے میرے سیل میں ہر چیز کو نہلا دیا تو قرآن کریم بند کر کے نشان کر دیا اور اس نشان نما طوفان کا نظارہ کرنے لگا۔ اب کے میرے دل میں بڑا شدید درد پیدا ہوا۔ حضور اکرم ﷺ کی یاد آئی جو بادل کو دیکھتے ہی استغفار کرنے لگتے تھے کہ یہ کہیں اقوامِ سابقہ پر آنے والے عذاب کی شکل نہ اختیار کر جائے۔ چنانچہ جوں جوں بارش میں شدت آتی میری زبان سے اسی نسبت سے جوش کے ساتھ استغفار جاری ہوتا گیا۔ کبھی میں زمینداروں کا تصور کر کے گھبرا جاتا اور قوم کی ہدایت کے لئے دعا کرتا اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون کیونکہ باقی لوگ سمجھیں نہ سمجھیں میں اس یقین اور ایمان پر قائم ہوں کہ یہ سب کچھ مامور من اللہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تکذیب کا نتیجہ ہے، بموجب ارشاد باری تعالیٰ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولاً۔ اسی صبح جب اخبار آیا تو اس میں پاکستان کے مشہور مصنف وڈرامہ نگار اشفاق احمد کا ایک انٹرویو پڑھنے کو ملا جس میں اس نے ملکی حالات کے حوالہ سے کہا تھا:

> میرا خیال ہے ہمارے ملک میں بھی یہ ہونے والا ہے۔ ہمارے ملک میں ایک آدمی پیدا ہوگا جو کہ اس پروسیس کا نتیجہ نہیں ہوگا۔ میری رائے یہ ہے کہ برصغیر کے اس مقام پر ایک آدمی آیا کرتا ہے...... چاہے وہ لاہور کا مقام ہو یا پاک پتن کا مقام۔ ایک شخص ضرور آتا ہے اور لوگ اسے ماننا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا آدمی ہی وحدت فکر پیدا کر سکتا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے کام ہوئے ہیں وہ ایک ہی آدمی نے کئے ہیں [1]

### ایک اہم نکتہ

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کا مطالعہ نہایت درجہ خوشگوار علمی اور روحانی تجربہ ہے۔ ان دنوں مختلف قسم کے موضوعات پر مشتمل حضورؑ کے اقتباسات کا مجموعہ ''مرزا غلام احمد قادیانی اپنی تحریرات کی رو سے'' زیر مطالعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت سید داؤد احمد صاحب پرنسپل جامعہ احمدیہ ربوہ کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے نجانے کتنی طویل محنت اور کتنے گہرے مطالعہ کے بعد یہ مجموعہ مرتب کیا۔ ایک موضوع پر حضور کے فرمودات اور بیش قیمت علمی نکات کا ایک جگہ پر میسر آ جانا بہت مفید ہے۔ حضور کی کتب کے چنیدہ اقتباسات کے سلسلہ میں محترم مرزا عبدالحق صاحب امیر جماعت ہائے احمدیہ ضلع سرگودھا نے بھی ایک کتاب مرتب کی ہے، گذشتہ دنوں اسے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اسے مرزا صاحب موصوف نے اپنے مخصوص نقطہ نظر اور علمی ذوق کے تحت مرتب کیا ہے۔

---

[1] روزنامہ جنگ لاہور 13 مئی 1987ء

میں اس مجموعہ تحریرات کے مطالعہ کے دوران جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات ووفات کے موضوع پر پہنچا تو حضور کے یکجا ارشادات کو پڑھ کر حضورؑ کے جذبات کا بہت باریکی سے احساس ہوا۔ اس ضمن میں ایک نکتہ نے میری دعاؤں کے دھارے کو نیا رُخ دیا۔ حضور نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ صلیب کے ضمن میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے صلیب دیئے جانے سے پہلی رات رو رو کر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ! مجھ سے موت کا یہ پیالہ ٹال دے۔ میں بھی اِس تجربہ سے گزر رہا ہوں لیکن دیانتداری سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ مجھے اپنی جان کے لئے دعا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ سلسلہ کی کامیابی اور اسلام کے غلبہ اور فتح کے لئے دعا کرنی چاہئے لیکن جب میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق یہ بات پڑھی اور اس پر غور کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مجھے بھی اپنی نجات یعنی اس صلیبی موت سے نجات کے لئے دعا کرنی چاہئے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو خدا تعالیٰ کے ایک برگزیدہ بندے اور اس کے سچے نبی تھے، اُن کا یہ عمل آخر خدا تعالیٰ کی منشاء کے مطابق ہی ہوگا۔ وہ غلط تو کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ جب خدا کے ایک نبی نے اسے مناسب سمجھا تو میری کیا حیثیت کہ اس طرف سے اظہار استغناء کروں۔ چنانچہ اب میں اس روشنی میں بھی دعا کیا کروں گا۔ بقول غالب التجاء کروں گا ؎

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

مگر اس خواہش اور آرزو کے ساتھ کہ میرے عظیم الشان مشن کی راہ میں میری ذات حائل نہ ہو۔ اگر کسی بڑے امتحان کا وقت آجائے تو یہ دعا جس کے نتیجہ میں کسی قدر خواہش کی صورت میں اثرات دل میں ضرور پیدا ہوجائیں گے۔ میرے اس مشن کی راہ کو گرد آلود نہ کردے، اسے دُھندلا نہ دے بلکہ امتحان میں بیٹھنے اور اس پر پورا اُترنے کے لئے تمام تر بشاشت، ہمت اور استقامت اپنی پوری شان اور پوری چمک اور دمک کے ساتھ میرے وجود، میرے کردار اور میری گفتار میں موجود ہو۔ آمین۔

### جماعت احمدیہ اور پاکستان

24 راگست 87ء کو وقت کی گاڑی پر سوار سفر کرتے کرتے رات کے جنگل میں داخل ہوا اور بی بی سی کی اردو نشریات سن رہا تھا کہ کرسی پہ بیٹھے بیٹھے نیند کا غلبہ ہوگیا۔ جس پر ڈیوٹی پر موجود کسی ملازم نے ازراہ ہمدردی آواز دی کہ سونا ہی ہے تو بستر پر جاکر لیٹو۔ اس پر جو میری آنکھ کھلی تو بی بی سی کی آواز کان پڑی کہ ''احمدی جنہیں پاکستان میں دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جاچکا ہے، ان کی تحریک پاکستان میں شرکت اور جماعت اسلامی کے کردار کے بارہ میں سردار شوکت حیات کے تاثرات سنئے۔'' یہ مسلم لیگی راہنما، قائداعظم کے دستِ راست اور پاکستان کی بزرگ مقتدر سیاسی شخصیت

بی بی سی کے خصوصی پروگرام ''آزادی کے چالیس سال'' میں انٹرویو دے رہے تھے۔ اُنہوں نے خود اپنی آواز میں تحریک قیام پاکستان کے بعض سچے واقعات بیان کئے اور یہ حقیقت جو آج ایک مخصوص طبقہ کے لئے تلخ بنی ہوئی ہے بیان کی کہ جماعت احمدیہ نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا تھا جبکہ جماعت اسلامی اس کے قریب سے بھی نہ گزری تھی۔ اُنہوں نے 1946ء کے اِنتخابات کے سلسلہ میں بتایا کہ قائداعظم نے مجھے احمدیوں کے خلیفہ اور جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا مودودی کے پاس یہ پیغام دے کر بھجوایا کہ پاکستان کے لئے دعا بھی کریں اور دوا بھی! چنانچہ جب میں نے قادیان پہنچ کر مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کو اطلاع بھجوائی کہ قائداعظم کا پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں تو وہ آدھی رات کے وقت فوراً نیچے آگئے اور کہنے لگے ''حکم'' اس پر میں نے پیغام دیا تو فرمایا کہ ''دُعا تو ہم ہر وقت کر رہے ہیں اور جہاں تک دوا کا تعلق ہے تو کوئی احمدی مسلم لیگ کے سوا دوسرے کو ووٹ نہیں دے گا'' چنانچہ ممتاز دولتانہ کی کامیابی ایک احمدی امیدوار محترم نواب محمد دین صاحب کے مقابلہ میں ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں مولانا مودودی کے پاس گیا تو پہلے انہوں نے ملنے میں ہی کافی لیت و لعل کی اور جب ملے اور میں نے قائداعظم کا پیغام دیا تو کہنے لگے ''لاحول ولا قوۃ الا باللہ، میں پاکستان کے لئے کس طرح دعا کر سکتا ہوں۔'' گو کہ تحریکِ پاکستان میں جماعت کے کردار اور قربانیوں کے بارہ میں مجھے ذاتی طور پر کچھ بھی شبہ نہیں ہے، دیکھا نہیں مگر پڑھا اور سنا تو ضرور تھا۔ تاہم یہ بیان سن کر بے حد خوشی ہوئی اور دِل پکار اُٹھا کہ: ابھی کچھ لوگ ہیں باقی جہاں میں۔

آج جماعت احمدیہ کو سکرین سے ہٹانے کے لئے تاریخ کو جس طرح مسخ کیا گیا اور کیا جا رہا ہے وہ بے انتہاء تکلیف دہ ہے۔ دل پر چرکے لگائے جا رہے ہیں۔ ایسے ماحول اور حالات میں اس قسم کا حقیقت پسندانہ بیان دے کر سردار صاحب نے جہاں بے انتہاء جرأت کا اِظہار کیا ہے وہاں میں سمجھتا ہوں کہ موصوف شیر کی کچھار میں بھی جا بیٹھے ہیں۔ ساتھ ہی حضرت مسیح موعودؑ سے الٰہی وعدہ اِنِّی مُعِینٌ مَنْ اَرَادَ اِعَانَتَکَ کی روشنی میں مجھے ان کی حفاظت اور ان کی خیر و برکت کا بھی پورا یقین ہے، انشاء اللہ العزیز۔ اللہ تعالیٰ قوم کو سمجھ دے، حقائق کا سامنا کرنے اور انہیں تسلیم کرنے کی توفیق بخشے تا وہ ان تمام تلخیوں اور مصائب اور دکھوں سے بچ جائے جو حقائق سے منہ موڑنے کے نتیجہ میں قوم کو شکار کر لیا کرتے ہیں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، آمین۔

## درود شریف

آج محرم الحرام کی دوسری تاریخ تھی۔ مجھے سیدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کا کئی سال پرانا اِرشاد یاد آیا کہ ان ایام میں کثرت کے ساتھ درود شریف پڑھ کر اہل بیت کے ساتھ اپنی عقیدت محبت اور دلی لگاؤ کے

جذبات اللہ کے حضور پیش کئے جائیں۔ چنانچہ میں نے اس ارشاد کی تعمیل میں درود شریف پڑھنے کے پروگرام پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اللہ کرے کہ اس پر عمل کی توفیق ملتی رہے اور یہ کہ قبول ہو جائے۔ آمین۔

اللھم صل علی محمد و علی ال محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی ال ابراھیم انک حمیدٌ مجیدٌ

اللھم بارك علی محمد و علی ال محمد کما بارکت علی ابراھیم و علی ال ابراھیم انک حمیدٌ مجیدٌ

يَا رَبِّ صَلِّ عَلٰى نَبِيِّكَ دَائِماً فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا وَ بَعْثٍ ثَانٍ

شیعہ بھی عجیب ہیں جن کا مذہبی تہوار خوشی یا عبادت کی بجائے ماتم اور عزاداری پر مشتمل ہے۔ میں نے گداز دل کے ساتھ کثرت سے درود شریف پڑھنا شروع کیا اور دعا کی کہ اے اللہ مجھے اس واقعہ محرم کے مختلف پہلوؤں سے متعلق علم لدنی عطا فرما، میرے ذہن کو صاف کر۔ میں مخالفین اور معترضین کو جواب دینے کے قابل ہو سکوں اور میرے دل اور سینہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت اور بچوں کی محبت سے بھر دے اور میری یہ حالت ہو جائے کہ ؎

جان و دِلم فدائے جمالِ محمد است خاکم نثار کوچۂ آلِ محمد است

اللھم صل علی محمد و علی ال محمد و بارك وسلم انک حمید مجید

## جماعتی ترقیات

جلسہ سالانہ پر حضور کی بیان فرمودہ جماعتی ترقیات کی خبریں سن کر اپنے رب کی حمد سے دل بھر بھر گیا، الحمدللہ۔ ساتھ ہی حیرانگی بھی ہوتی رہی کہ ہمارے محدود وسائل کے باوجود اتنی غیر معمولی کامیابیاں اور اتنی وسعت والی ترقیات اور کام کیسے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ دل نے ہر دفعہ یہی جواب دیا یہ سب اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے کام ہیں۔

## ایک قسم کی طاعون

ترقیات کی یہ دلچسپ داستان تو خیر اپنی جگہ مگر اس جگہ جو نکتہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ بہت ہی زیادہ حیران کن، ایمان افروز اور روح پرور ہے۔ کل میں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے دورہ ہالینڈ 1987ء کے دوران مجلس عرفان کی روداد پڑھی۔ جس میں حضورؒ نے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک عظیم الشان پیشگوئی کے پورا ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ حضور علیہ السلام نے 13 مارچ 1907ء کو اللہ تعالیٰ سے الہاماً خبر پا کر پیشگوئی فرمائی تھی کہ

"یورپ اور دوسرے عیسائی ملکوں میں ایک قسم کی طاعون پھیلے گی جو بہت ہی سخت ہوگی۔"[1]

حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پیشگوئی کو یورپ اور امریکہ میں تیزی سے پھیلنے والی ایک موذی اور مہلک اور نہایت

---

[1] تذکرہ طبع ثانی صفحہ 701

خطرناک مرض 'ایڈز' پر منطبق کیا ہے کہ یہ مرض پیشگوئی کے الفاظ ''ایک قسم کی طاعون'' کے عین مطابق ہے اور اس کی ابتداء بھی عیسائی ممالک سے ہوئی ہے اور پھیل بھی انہی ملکوں میں رہی ہے۔ میں نے یہ ساری تفصیل پڑھی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منجانب اللہ ہونے کا ایک اور نشان میرے دل پر ثبت ہو گیا۔ آج 24 اکتوبر 1987ء کو عجیب اتفاق ہوا جب جنگ اخبار آیا تو حسب معمول سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزرتا جا رہا تھا کہ میری نظر اچانک ایک کالمی سرخی پر جا ٹھہری، تفصیل اس خبر کی یوں تھی:

نیویارک (جنگ فارن ڈیسک) ڈیپریشن اعصابی تناؤ، جذباتی کیفیات تھکن اور مصروفیات کی وجہ سے امریکی عوام ایک نئی بیماری کا شکار ہو رہے ہیں جو ان کا گھریلو سکون تباہ کر رہی ہے۔ یہ مرض ازدواجی بے کیفی اور بے رغبتی سے متعلق ہے جسے آئی ایس ڈی Inhibited sexual desires کا نام دیا گیا ہے اور ایک سروے کے مطابق 20 سے 50 فیصد تک امریکی شادی شدہ مرد اور عورتیں اس میں مبتلا ہیں۔ ماہرین صحت نے اسے 80ء کی دہائی کا ''طاعون'' قرار دیا ہے......

جب میں نے یہ آخری فقرہ پڑھا تو حیران رہ گیا کہ اس خبر نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مذکورہ بالا پیشگوئی کی حرف بحرف صداقت کے سامان مہیا کر دیئے ہیں۔ ایڈز کو حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے تو استعارۃً طاعون کہا ہے جبکہ ماہرین نے آئی ایس ڈی کو واضح طور پر طاعون قرار دیا ہے، فَتَبَارَکَ اللّٰہُ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ۔

25 اکتوبر 1987ء

آج شام کو ہمیں اس واقعہ قتل میں ملوث کئے جانے پر پورے تین سال کا عرصہ مکمل ہو گیا۔ اس عرصہ کے دوران اللہ کا بے انتہاء فضل و کرم ہمارے شامل حال رہا۔ اسی نے ہمیں ہمت اور طاقت دی جس کے طفیل جس طرح بھی بن پڑی، ہم اس رہ پر چلتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنا خاص سہارا عطا کئے رکھے گا اور اس کے لئے میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو غیر معمولی استقامت کے ساتھ بشاشت کے ساتھ ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی توفیق بخشتا رہے۔ ہمارے حوصلوں کے دل بڑھائے اور ہم پوری جماعت کے لئے نمونہ بن سکیں اور غیر ہمیں دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جائیں، آمین۔

اسیری کے دوران لکھی ہوئی ڈائری کے چند اوراق بطور نمونہ ہدیہ قارئین کئے جا رہے ہیں جن سے اسیری کے دوران ہمارے شب و روز، ہماری مصروفیات، خیالات اور کیفیات کا کسی قدر اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

# موت کی دہلیز پر

14 فروری 1987ء کی ڈائری ایک روز کی تاخیر سے لکھی گئی۔ یہ تو خیر گزری کہ صرف ایک روز کی ہی تاخیر ہوئی وگرنہ جس وقت میں 14 فروری کا بالخصوص وہ وقت گزار رہا تھا جبکہ عام طور پر ڈائری لکھا کرتا ہوں تو مجھے کچھ بھی اندازہ نہ تھا کہ ان تھرکتے ہوئے لمحات کو کب محفوظ کر سکوں گا یا یہ کہ ان لمحات کی الفاظ میں کبھی تصویر بنا بھی سکوں گا یا نہیں!!؟

تفصیل اِس اجمال کی اپنی جگہ آئے گی لیکن پہلے بلحاظ ترتیب 14 فروری کے واقعات پیش کرتا ہوں۔ وہ ہفتہ کا دن تھا اور اندازہ تھا کہ گوجرانوالہ سے چھوٹی خالہ جان ملاقات کے لئے آئیں گی کیونکہ ان کے بارہ میں اطلاع تھی کہ وہ امریکہ سے 8 فروری کو یہاں پہنچ چکی تھیں اور ہفتہ کی مناسبت سے اُس دِن ان کے آنے کی امید تھی لیکن جب ملاقات کا پرچہ آیا تو میرا نام نہ تھا! خیر خاموشی کے ساتھ اپنی چکی میں بند ہو گیا اور مطالعہ میں مصروف ہونے ہی لگا تھا کہ دوسرا پرچہ آیا جس میں میرا نام تھا اور چونکہ میرے اکیلے کی ملاقات آئی تھی اس لئے یقین ہو گیا کہ گوجرانوالہ سے ہی ملاقات آئی ہے۔ تھوڑی سی زیادہ دیر انتظار کے بعد ملاقات آئی تو میرا اندازہ درست نکلا اور یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ نانی جان بھی ساتھ ہیں اور گجرات سے باجی بھی! ملاقات ہوئی بہت مزا آیا، خوب باتیں ہوئیں۔ خالہ جان اور خالو جان سے پورے تین سال کے بعد ملاقات ہوئی تھی، الحمدللہ۔

ملاقات ختم ہوئی تو سب کو الوداع کہا اور نمازِ ظہر کی تیاری پکڑی۔ اس سے قبل یہاں آنیوالے نئے (CHW) چیف ہیڈ وارڈر سے بھی ایک سرسری ملاقات ہوئی۔ ٹہلائی کھل چکی تھی اور اِسی دوران برادرم حاذق صاحب بھی مجھے ملنے آئے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ ذرا بیٹھیں تو میں نماز پڑھ لوں۔ میں نے ابھی نماز ختم نہ کی تھی کہ ایک نمبردار نے آ کر میرے پاس بیٹھے ہوئے برادرم حاذق صاحب کو میرے لئے پیغام دیا کہ نماز کے بعد باہر گیٹ پر پہنچ جاؤں۔ وہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ محترم رانا نعیم الدین صاحب لوہار کے سامنے بیڑی لگوانے کی پوزیشن میں کھڑے ہیں، پاس ہی ایک بیڑی اور پڑی تھی جو یقیناً میرا ہی اِنتظار کر رہی تھی۔ میں یہ منظر دیکھ کر ایک مرتبہ تو چونکا اور پھر میں نے بھی خاموشی سے بیڑی لگوالی۔ اس دوران محترم رانا صاحب کہتے جا رہے تھے کہ چلو اگر لگ گئی ہے تو کل پرسوں اُتر بھی جائے گی۔
بیڑی لگوا کر ہم واپس وارڈ میں آئے تو ہماری بیڑیوں کو دیکھ کر ٹہلائی کرنے والے قیدیوں کے سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ ہر کوئی پریشان حالی سے پوچھنے لگا کہ یہ کیا؟ اس کا کیا مقصد اور کیا مطلب؟ یہ کیوں؟ غرضیکہ جس نے بھی دیکھا اس نے

اپنے فوری ممکنہ جذبات کا اظہار کیا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزا۔ یوں تو بظاہر میں مطمئن ہی تھا مگر دل میں کھٹکا سا لگا رہا۔ ہیڈ وارڈر سے پوچھا جواب ندارد، منشی سے پوچھا بڑی خوبصورتی سے ٹرخا گیا۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تشویش بڑھتی گئی مگر ہمت وحوصلہ بھی بڑھتا گیا۔ دیر تک میں باہر بیٹھا رہا مگر حاذق صاحب نہ آئے۔ پھر قدیر آیا مگر کوئی خبر نہ لایا۔ رانا صاحب سے ملا تو انہوں نے اس امکان کا اظہار کیا کہ ہمارے 'کاغذات' (سزائے موت پر عمل درآمد کے احکام) آ گئے ہوں گے۔ اِس اِمکان کو یکسر رد تو نہیں کیا جاسکتا تھا تاہم بوجوہ یقین نہ آیا! اس کے بعد میں نمازِ عصر پڑھنے لگا تو دورانِ نماز ہی ہیڈ وارڈر آیا اور پاس ہی کھڑے نمبردار کو کہہ کر میرا دروازہ بند کرا دیا۔ اب مجھے رانا صاحب کی بات پر یقین آ گیا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ نماز کے دوران اس صورت حال کا احساس ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنا یہ عہد دُہرایا ۔

ہو فضل تیرا یا ربّ! یا کوئی ابتلاء ہو　　　راضی ہیں ہم اُسی میں جس میں تیری رضا ہو

ساتھ ساتھ استقامت کے لئے دعا کی اور پیش آمدہ صورت حال کا مردانہ وار اور بشاشت کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے ہمت اور طاقت چاہی۔ نماز ختم کر کے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے پرائیویٹ کپڑے اُتارے اور قیدی جوڑا پہن کر قیدی روپ میں آ گیا۔ 'بیڑی کے ساتھ' کپڑے تبدیل کرنے کا یہ مرحلہ (شروع میں ذکر گزر چکا ہے کہ بیڑی کے ساتھ شلوار تبدیل کرنا کیسا پیچیدہ معاملہ ہوتا ہے) طے ہو ہی رہا تھا کہ میرا دروازہ دوبارہ کھول دیا گیا اور ساتھ ہی مجھے باہر شیخ جاوید صاحب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جو انچارج آفیسر سزائے موت وارڈ تھے، کے روبرو پیش ہونے کو کہا گیا۔ اب کے دروازے کے سامنے ہیڈ وارڈر خود کھڑا تھا تا کہ اپنی خصوصی نگرانی میں مجھے لے کر جائے۔ میرے تیار ہونے تک برادرم حاذق صاحب بھی آن پہنچے اور میری سوالیہ مگر مطمئن نگاہوں کے جواب میں انہوں نے بڑے تحمل اور حوصلہ دلاتے ہوئے کہا کہ

'کوئی نہیں، وہ پٹیشن ضیاء الحق نے خارج کی ہے'

یہ نہ صرف میرے اندازہ کے مطابق بلکہ ہماری توقعات کے عین مطابق خبر تھی کیونکہ مثل مشہور ہے شوم سے خیر کی توقع کہاں؟ یہ عصر کے بعد کا وقت تھا جب سب قیدی بند ہو چکے تھے اور باہر کھلے صحن میں میرے ہی کمرے سے میز لے جا کر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے لئے دفتر لگایا گیا اور ہمیں وہاں لے جایا گیا۔ میں وہاں پہنچا تو متعلقہ افسر بڑے مہذبانہ انداز میں پیش آیا پھر ایک سرکاری دستاویز دکھا کر یہ خبر سنائی کہ ہماری پٹیشن جنرل ضیاء الحق نے مسترد کر دی ہے۔ میں نے چٹھی کا مضمون پڑھا اور انگوٹھا ثبت کر دیا۔ جس کا مضمون کچھ یوں تھا کہ میں اِن ناکارہ قیدیوں کی رحم کی درخواست

مسترد کرتا ہوں حالانکہ ہماری رحم کی درخواست تھی ہی نہیں۔ اس کے بعد ایک اور چٹھی کی پشت پر بھی انہوں نے انگوٹھا نشان کرنے کو کہا تو میں نے تعمیل کر دی اور ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ یہ چٹھی تو پڑھوا دیں۔ اس پر انہوں نے بڑی خوشی سے مجھے دے دی۔ میں نے اسے پڑھا تو اس میں کہا گیا تھا کہ ہم آرٹیکل نمبر 45 کے تحت رحم کی اپیل کر سکتے ہیں۔ عجیب و غریب احکامات تھے، ایک طرف لکھا تھا کہ ان کی رحم کی اپیل مسترد کی جاتی ہے اور دوسری طرف رحم کی اپیل کرنے کا اختیار دیا جا رہا تھا۔

اس موقع پر محترم ملک محمد دین صاحب بھی موجود تھے جو اس خوفناک خبر کی وجہ سے گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں تھے۔ محترم ملک صاحب کی ہماری خاطر گھبراہٹ اور پریشانی کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہماری تو رحم کی درخواست تھی ہی نہیں، یہ آرڈر غلط ہے۔ لیکن ملک صاحب سے ایک فقرہ بھی ادا نہ ہو پا رہا تھا۔ دراصل یہ ان کی گھبراہٹ نہ تھی بلکہ ہمارے ساتھ ان کا پُرخلوص اور سچا تعلق اور محبت تھی! بہر حال میں نے مختصر سی بات اس موقع پر افسر مجاز سے کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو آرڈر کے ٹائپ شدہ الفاظ کی پورے طور پر پیروی کرنے کے پابند تھے اور اسی پر مصر تھے۔ اس صورت حال میں اُن سے بحث بے سود ہی نہیں لایعنی بھی تھی۔ یہ کارروائی پوری ہوئی تو انہوں نے ہمارے متعلق حکم جاری کیا کہ انہیں 7 بلاک لے جایا جائے جہاں پر ایسے قیدیوں کو آخری وقت پر رکھا جاتا ہے اور میری نسبت کہا کہ اسے صرف گدیلا وغیرہ دے دیا جائے کیونکہ اس کی B کلاس ہے باقی سامان دینے کی ضرورت نہیں۔ اس پر ہیڈ وارڈر نے کہا کہ وہاں کوئی بھی چیز دینے کی اجازت نہ ہو گی۔ اس پر انہوں نے کہا ٹھیک ہے اور ہمیں کہا کہ کھانا اگر یہاں سے پک کر جا سکے تو ٹھیک ہے اور دوسرے یہ کہ اس وقت اپنے ساتھیوں سے بات کر لیں کیونکہ اس کے بعد کسی سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ ہم دونوں ملک صاحب اور حاذق صاحب کے ساتھ علیحدہ ہو گئے اور بس یہی بات ہوئی کہ اس کارروائی کی باہر اطلاع پہنچ جانی چاہئے کہ اُس وقت سب سے بڑی ضرورت اور سب سے اہم مشورہ بھی تو یہی تھا جس کے بارے میں حاذق صاحب نے بتایا کہ پہنچ بھی چکی ہے۔ اس کے بعد ہم واپس اپنی چکی میں آئے تو برادرم حاذق صاحب جلدی سے کچھ کھانا لے آئے جس میں سے ہم نے وقت کی مناسبت اور نزاکت کے مطابق تھوڑا بہت کھایا اور اپنا سامان سمیٹ کر حاذق صاحب کے سپرد کیا۔ اس سلسلہ میں میرے ساتھی قیدی سزائے موت محترم راؤ بھوپل صاحب نے بھی بہت مدد کی۔ فجزاھم اللہ خیرالجزاء۔

## ایک مرتبہ پھر 7 بلاک کی طرف

ہم اپنی معمول کی سزائے موت وارڈ سے سر بکفن باہر نکلے تو ہمیں ایک اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چوہدری سیف اللہ

کے سپرد کر دیا گیا۔ یہ صاحب اُس وقت 7 بلاک کے انچارج تھے لہٰذا ہمارا مختصر سا قافلہ موصوف کی نگرانی میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں جو قیدی ہمیں دیکھتا، پریشان ہو جاتا۔ کسی کو ہمارے ساتھ ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہ تھی، بس دُور سے ہاتھ ہلا کر سلام کرتے رہے۔ تاہم راستہ میں چوہدری سیف اللہ صاحب کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی حتیٰ کہ اُن ادبی کتابوں کے بارے میں تبصرے ہوتے رہے جو وہ مجھ سے پڑھنے کے لئے لے جاتے رہے تھے۔ غرض اسی طرح چلتے چلتے ہم 7 بلاک پہنچ گئے جہاں اس آخری مرحلہ پر پہنچے ہوئے سزائے موت کے قیدیوں کے لئے مخصوص قصوری وارڈ نمبر 2 کے سامنے اس جگہ کا عملہ پہلے سے کھڑا ہمارا منتظر تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ہماری تفصیلی تلاشی لی گئی۔ پھر ہمیں پہلی اور دوسری چکی میں جو ہمارے لئے ہی خالی کروائی گئی تھیں، بند کر دیا گیا۔

یہاں متعین ہیڈ وارڈر نسبتاً اچھے کردار کا لگا۔ اُس نے ہمارے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا اور اچھی طرح پیش آیا۔ میں نے چکی میں بند ہو کر اس سے بات کی کہ شلوار میں ازار بند رہنے دوں یا نکالنا ہے کیونکہ تلاشی کے وقت انہیں خیال نہ آیا تھا اور میں نے اس خیال سے کہ کہیں کوئی بڑا افسر آ کر تلاشی لے تو کہیں اس کی اِس فروگزاشت کی وجہ سے بے عزتی نہ کرے۔ چنانچہ میرے یاد کرانے پر اُس نے کہا کہ نہیں ازار بند تو بہر حال نکالنا ہوگا۔ میں نے کہا پھر الاسٹک ڈال لیں (میں اپنے ساتھ الاسٹک احتیاطاً لے گیا تھا) اس نے الاسٹک کی اجازت بھی نہ دی۔ بس پھر کیا تھا کہ شلوار دھوتی میں بدل گئی بلکہ دھوتی سے بھی کئی گنا مشکل کیونکہ ساتھ میں بیڑی بھی لگی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں کمرے کے اندر سوائے بستر اور لوٹے اور پیشاب والے برتن کے اور کچھ بھی رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ حتیٰ کہ قرآن کریم نشان کرنے (لٹکانے) کے لئے معمولی سی لکڑی بھی کسی سوراخ میں لگانے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ قرآن کریم کو دروازے کی سلاخوں سے باندھ کر اوپر لٹکا یا گیا۔ جو صابن ہم ساتھ لائے تھے وہ بھی اندر نہیں رکھ سکتے تھے بلکہ باہر ہی رکھا گیا تھا اور اس کے متعلق حکم تھا کہ جب ہاتھ دھونے ہوں، ملازم سے کہہ کر پکڑ لیا جائے اور بعد از استعمال واپس باہر رکھ دیا جائے۔

میں جب اندر بند ہوا اور بستر بچھا کر بیٹھا تو میری نظر پیروں پر پڑی تو مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ میں نے ''ایسے وقت'' میں حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جرابیں ہی پہنی ہوئی تھیں۔ اور جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہی رومال تھا جو اِن جرابوں کے ساتھ حضور نے کچھ ہی روز پہلے بھجوایا تھا، الحمد للہ۔ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قمیص مبارک کے بٹن والی انگوٹھی تو میں آتے ہوئے حاذق صاحب کے سپرد کر آیا تھا مبادا اُسے پہننے کی اجازت نہ دیں اور ضائع ہو جائے۔ چنانچہ جراب اور رومال دیکھ کر قدرے تسلی ہوئی کہ چلو کچھ نہ کچھ تو متبرک سامان اِس وقت میرے پاس موجود ہے۔

جب ہم بند ہو چکے تو متعلقہ افسر چوہدری سیف اللہ نے آ کر چکی اور ہمارا بڑی باریک نظر سے جائزہ لیا کہ کہیں کوئی

ایسی صورت نہ رہ جائے کہ ہم یہاں سے فرار ہو جائیں۔ جائزہ لیتے ہوئے افسر موصوف کا انداز اور رویہ ایسا روکھا تھا جیسے ہمیں جانتا ہی نہ ہو۔ شاید یہ اُس کی اِنتظامی مجبوری ہو گی لیکن ہمیں اس سے بہت حیرت ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی مغرب کی اذان ہوگئی چنانچہ وضو کر کے نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر دروازہ سے باہر نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک بڑا سا گیس لیمپ پورے جوبن پر روشنی دیتا ہوا پڑا ہے اور اس کے ساتھ تین چار لالٹینیں بھی رکھی ہوئی ہیں گویا ماحول کو ہر حال میں روشن رکھنے کے لئے پورے انتظامات کئے گئے تھے۔ علاوہ ازیں چھ بجے ڈیوٹیاں تبدیل ہوئیں تو ہمارے اس پہرہ میں دو ملازم معمول سے زیادہ تھے جن کی ڈیوٹی بس ہم دونوں پر تھی اور اس کے بعد کی شفٹوں میں بھی ایسا ہی ہوتا رہا۔ ان تفصیلات کے بیان کرنے سے یہ امر واضح کرنا مقصود ہے کہ جیل اِنتظامیہ کے نزدیک اب ہمارا واقعی آخری وقت تھا اور اسی وجہ سے یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا۔

میں نے یہاں آ کر سوچا کہ میرے پاس دوسری کوئی چیز ہے ہی نہیں سوائے سرکاری بستر کے۔ پہلے تو کبھی اخبار کا مطالعہ کر لیتا، کبھی کوئی کتاب پڑھ لی، کسی سے کوئی گپ شپ لگا لی اور بہت سا وقت خط و کتابت میں گذر جاتا۔ اب یہ تمام سہولتیں مفقود تھیں۔ ویسے بھی ایسے وقت میں دو ہی قسم کی مصروفیت باقی رہ جاتی ہیں یا تو انسان اپنے آپ کو سوچوں اور فکروں کی لہروں اور تھپیڑوں کے سپرد کر دے یا پھر دعا میں لگا رہے۔ میں جو ہر قسم کے عواقب سے ویسے ہی بے پرواہ تھا، یہ سوچنے لگا کہ دعا کس قسم کی کی جائے۔ چنانچہ مجھے حضور رحمہ اللہ کے دو پیارے پیارے خطوط یاد آئے۔ ایک خط تو 19 فروری 1986ء کا ہے جس میں حضور نے ہمیں نصیحت فرمائی تھی کہ اسلام کے غلبہ اور احمدیت کی فتح کی دعائیں کرتے ہوئے اِس دُنیا سے رخصت ہونا۔ چنانچہ میں نے جتنا ہو سکا یہ دعا کرنے کی کوشش کی اور دوسرے حضور رحمہ اللہ نے اپنے مکتوب محررہ یکم مئی 1986ء میں مجھے بطور خاص ارشاد فرمایا تھا کہ رَبِّ کُلُّ شَيْءٍ خَادِمُکَ رَبِّ فَاحْفَظْنِي وَانْصُرْنِي وَارْحَمْنِي کا بکثرت ورد کروں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے الٰہی اِشارہ کے مطابق اسے اس زمانہ کے لئے اسم اعظم قرار دے رکھا ہے اور اسی وجہ سے پیارے آقا نے بھی لکھا تھا کہ یہ دعا خوب کرو تا تمہاری بلائیں ٹلیں اور تمہاری بلائیں ٹلیں تو میری بلائیں بھی ٹلیں۔

اب جو واقف ملازم بھی یہاں ڈیوٹی پر آتا ہمیں یہاں اور اِس حال میں دیکھ کر حیران پریشان رہ جاتا۔ ایک ایسے ہی ملازم کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ اچانک بجلی چمکنے کا احساس ہوا۔ بجلی کا کوندا اِتنا واضح نہ تھا کہ مجھے کمرے کے اندر بیٹھے نظر آ جاتا تاہم باہر بیٹھے ملازم نے اس کی تصدیق کی۔ پھر چند لمحوں میں سارا ماحول گرج چمک سے بھر گیا۔ پھر کیا تھا آسمان پر بجلی تیزی سے چمکنے لگی اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ گھن گرج میں تبدیل ہونے لگی۔ آسمانی بجلی کی ایسی گرج چمک

بالکل اچانک اور غیر متوقع تھی کیونکہ ابھی شام تک تو دور دور تک اس قسم کے کوئی آثار نہ تھے اور مطلع پوری طرح صاف تھا۔ اس پر میری زبان پر سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا شعر آ گیا۔

کون روتا ہے کہ جس سے آسماں بھی رو پڑا     مہر و مہ کی آنکھ غم سے ہوگئی تاریک و تار

یقیناً اس لمحہ دنیا بھر میں، کرہ ارض کے ہر طرف پیارے آقا کی اقتداء میں لاکھوں احباب جماعت کی آنکھوں اور قلب وجگر سے دعاؤں، آہوں اور اِلتجاؤں کے ان گنت بخارات اُٹھ رہے ہوں گے جنہوں نے لاجرم بالیقین عرش کے کنگروں کو ہلا کر رکھ دیا ہوگا۔

## سولی پر نیند

نمازِ عشاء کے بعد کسی اور مصروفیت کی بجائے یہی مناسب جانا کہ بستر میں لیٹ کر میں بھی دعاؤں میں لگ جاؤں۔ چنانچہ سرکاری کمبلوں کو سیٹ کر کے اور انہیں اپنے اردگرد لپیٹ کر دنیا و مافیہا سے کٹ کر میں اپنی ہی دنیا میں پہنچ گیا پھر نہ جانے کب اور کس طرح نیند آ گئی۔ مجھے اِتنا یاد ہے کہ نیند آنے میں کوئی دقت نہ ہوئی تھی حالانکہ ایسی حالت میں کسے نیند آتی ہے مگر ہمارا تو معاملہ ہی اَور تھا۔ ہمارا ضمیر صاف تھا اور یقین تھا کہ ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی راہوں پر سے گزارا جا رہا تھا چنانچہ آنکھ لگ گئی اور بڑی آسانی سے نیند آ گئی۔

## موت کی وادی میں دوسرا روز

رات اللہ کے فضل سے بخیریت اور پرسکون گزر گئی سوائے اس کے کہ خصوصی چیکنگ کے لئے آنے والوں کی وجہ سے دو تین مرتبہ آنکھ کھلی۔ اِن 'آخری دِنوں' میں جملہ اہلکاروں کو بس یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ قیدی کہیں بھاگ نہ جائے یا پھر اسے کچھ ہو نہ جائے، اس لئے رات کو سوتے میں بھی جگا کر تسلی کرتے رہتے ہیں خواہ سوئے ہوئے کو کتنی ہی مشکلوں سے نیند آئی ہو۔

میں صبح سویرے ہی اُٹھ پڑا تھا اور وضو کے لئے دروازہ سے باہر دھرے گھڑے میں سے چلو چلو پانی سلاخوں کے اندر لا رہا تھا تو سامنے خصوصی حفاظت کے لئے کھڑا سپاہی جس کا نام آصف تھا اور میرا کسی قدر واقف بھی تھا، مجھ سے اظہارِ افسوس کرنے لگا۔ گویا زندگی میں ہی تعزیت کی جا رہی تھی۔ اس پر میں نے اُسے بڑے جوش اور ولولہ سے مخاطب کر کے کہا تھا کہ یاد رکھنا اس وقت اذان ہو رہی ہے، اللہ کے فضل سے مجھے کچھ نہ ہوگا۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ ابھی تک مجھے یاد ہے جو کہہ رہی تھی کہ اِس کا دماغ چل گیا ہے کیونکہ مولوی اس کے خلاف، حکومت کا سربراہِ اعلیٰ اس کی جان کے درپے اور وہ خود زندگی کے اِس آخری مرحلہ پر اور پھر بھی کہہ رہا ہے کہ مجھے کچھ نہ ہوگا۔ یقیناً مجھے خود بھی شعور نہ

تھا کہ کس برتے پر ایسا کہہ رہا ہوں مگر کوئی طاقت تھی جو مجھ سے یہ کہلوا رہی تھی اور وہ طاقت تھی ہمارے قادر اور حی و قیوم خدا کی! اور اسی خدا نے پھر اس ملازم سے بھی اسی قسم کی بات کہلوا دی۔ ہوا یوں کہ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک راؤنڈ کرنے والا نسبتاً بڑے رینک کا مولوی ٹائپ ملازم آ کر میرے ساتھ سلام دعا کرنے کے بعد اس ملازم کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ اُن دونوں کی باہم باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک کسی اَنجانی طاقت نے آصف سپاہی کی زبان سے یہ الفاظ نکلوائے:

'مولوی! اس وقت اذان ہو رہی ہے، میری بات یاد رکھنا کہ یہ یہاں نہیں رہیں گے'

میرے لئے یہ بات حیران کن تھی اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اُس نے ایسا کیوں کہا مگر عجیب تصرف ہے کہ اُس کی یہ بات چند گھنٹوں میں لفظ لفظ پوری ہو گئی، جس کی تفصیل تو آئندہ سطور میں آئے گی تاہم اس موقع پر آنحضور ﷺ کی یہ حدیث مجھے یاد آ رہی ہے کہ

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهُ اللّٰهُ

(ترجمہ: کتنے ہی بظاہر پراگندہ حال، گرد و غبار میں اَٹے ہوئے اللہ کے بندے ہیں جو اگر خدا کا نام لے کر کوئی بات کہہ دیں تو خدا اُسے پورا کر کے رہتا ہے)

نماز کے بعد پھر بستر پر لیٹ گیا کہ اس کے علاوہ اور کرنا بھی کیا تھا۔ تھوڑی دیر میں 'سب اچھا' کرنے والے ہیڈ وارڈر آئے پھر ناشتہ والے آ گئے، پہلے چھوٹی سی روٹی جسے یہاں 'پراٹھا' کہتے ہیں ایک قیدی دے گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا قیدی آیا اور ڈَلو میں چائے ڈال کر دے گیا تو میں یہ نام نہاد قسم کا ناشتہ الحمدللہ کے وِرد کے ساتھ کرنے لگا۔

اِس کے بعد اب مجھے اِنتظار تھا کہ خاکروب آ کر صفائی کر جائے اور میں اُٹھ کر منہ ہاتھ دھوؤں اور قرآن کریم کی تلاوت کروں۔ چنانچہ وہ بھی سورج نکلنے کے بعد آیا اور جب صفائی کر گیا تو پھر میں اُٹھا اور باہر پڑے گھڑوں میں سے تازہ پانی لے کر منہ ہاتھ دھویا، وضو کیا اور اپنے بستر کو درست کیا، کمبل اکٹھے کر کے ایک طرف تہ لگا کر رکھے، چادر کو جھاڑا اور پوری طرح تر و تازہ ہو کر بیٹھ گیا۔ عین اُس وقت ہمارے ہیڈ وارڈر صاحب مشقتی کو لئے آ موجود ہوئے۔ مشقتی کے ہاتھ میں چائے کا تھرماس اور کپ تھا جسے میرے طرف بڑھا کر چائے سے بھر دیا اور ساتھ ہی ہیڈ وارڈر نے مجھے بسکٹ کا ایک ڈبہ تھمایا۔ میں نے اسے کھول کر چند بسکٹ لئے اور بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ یہ سب سامان برادرم حاذق صاحب نے بھجوایا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر منہ سے بے ساختہ الحمدللہ نکلا اور اس کے ساتھ ہی سوچوں میں گم ہو گیا کہ ہم کہاں پہنچے ہوئے ہیں اور ہمارا اللہ اس حالت میں بھی پوری طرح خیال رکھے ہوئے ہے، الحمدللہ۔

چائے پی کر میں تلاوت میں مشغول ہو گیا پھر بستر پر بیٹھے بیٹھے دعاؤں میں محو تھا کہ ہیڈ وارڈر صاحب ایک ملازم کے ہمراہ تشریف لائے اور مجھے دروازہ کے قریب طلب کیا۔ یہ ملازم ساہیوال جیل کا مشہور فخری وارنٹی تھا جس نے کچھ کاغذات پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ بھئی تمہارے وارث باہر آئے ہوئے ہیں اور یہ کاغذ انہوں نے بھیجے ہیں، ان پر انگوٹھے لگوانے ہیں۔ ان کاغذات میں سے دو میرے اور دو مکرم رانا صاحب کے تھے اور ان میں سے ایک تو وکالت نامہ تھا اور دوسرا کاغذ ایک دستاویز بعنوان صالح اقرار نامہ پر مشتمل تھا جس میں لکھا تھا:

'مجھے ایک مقدمہ قتل نمبر فلاں میں ناجائز طور پر ملوث کیا گیا پھر ملٹری کورٹ نمبر 62 میں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا جس نے مجھے فلاں تاریخ کو موت کی سزا سنائی۔ جس کے بعد میں نے ایک پٹیشن دائر کی جسے صدر پاکستان نے خارج کر دیا ہے۔ اب آج سے میری ملاقات بند ہے صرف آخری ملاقات ہوگی اور یہ کہ مجھے اندر سات یوم کے تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے گا'

غرضیکہ ہمارے مقدمہ کے جملہ مراحل کو نمبروار درج کر کے بات آخر تک پہنچائی گئی تھی۔ میں نے وارانٹی کے کہنے کے مطابق اُس تحریر پر بھی اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کا نشان ثبت کر دیا۔ یہ ساری کارروائی ایسے ماحول میں ہوئی کہ اچھے بھلے جوان کا بھی پتہ پانی ہو جائے کیونکہ وہ ملازم بھی بے حد افسردہ اور سہمی ہوئی صورت لئے میرے پاس آیا تھا اور ڈیوٹی پر موجود باقی ملازم وغیرہ تو تھے ہی ایسی کیفیت میں۔

اِس کارروائی کے بعد میرے خیالات دو راہوں پر تیزی سے دوڑنے لگے۔ ایک راستہ عارضی زندگی کی طرف جاتا تھا اور دوسرے راستہ پر ابدی زندگی کا بورڈ آویزاں تھا۔ پہلے راستہ کے بارہ میں بھی مجھے یقین کامل تھا کہ خدا تعالیٰ اِن ظالموں کے پنجہ سے ضرور بضرور نجات بخشے گا اور دوسرے پر چلنے کے نتیجہ میں یہ خوشگوار حقیقت سامنے تھی کہ حضرت سید عبداللطیف صاحب ؓ اور دوسرے بے شمار شہیدانِ امت سے ملاقات ہوگی اور اِن تمام مظلوموں کا تصور تھا جن پر ظالم حکومتوں نے مظالم کی راہ سے عرصہ حیات تنگ ہی نہیں بالکل مسدود کر کے رکھ دیا تھا۔ دِل کو تسلی تھی، اطمینان بھی تھا بلکہ تسلی ہی تسلی اور اطمینان ہی اطمینان تھا کیونکہ ان دونوں راستوں کی منزل ایک ہی تھی۔ تب میں نے سوچا کہ زندگی میں میرے بہت سے محسن ہیں، بہت سے پیارے اور گہرے دوست ہیں جنہوں نے میری کئی لحاظ سے بے پناہ خدمت کی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی سوچوں کے تانے بانوں میں ان بزرگوں، دوستوں، ہمجولیوں اور رشتہ داروں کے تصور سجا لئے اور ان سب کی ایک محفل برپا کر لی اور ان سب کے لئے دعا کرنے لگا۔

اسی دوران اللہ کی اس تقدیر پر لبیک کہنے کے لئے میں نئے جذبوں کے ساتھ تیاری کرنے لگا۔ عین اُس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جب میں نے اپنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے موت کا تصور کیا اور اپنے جسم کو مضبوط قدموں پر اُستوار کر کے موت کے اِس تصوراتی ہیولہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو خدائے ذوالجلال کی قسم کھا کر لکھتا ہوں کہ میں نے اُس وقت موت کو اپنے سامنے سے سرپٹ بھاگتے ہوئے دیکھا۔ بہت عجیب اور کیف آور تھے وہ لمحے جن کے بعد اچانک دل ٹھہر گیا اور پوری طرح سکون ہو گیا۔

اسی دوران ساڑھے دس بج گئے تھے اور ملازموں کی نوکریاں بدلنے لگیں اور آہستہ آہستہ ہمارے کمروں پر تعینات نئے ملازم بھی آ گئے۔ میرے پاس جو ملازم آیا اس سے واقفیت تو کافی عرصہ سے تھی مگر اس کے ساتھ بے تکلفی نہ تھی اور کچھ صورت حال کی نزاکت کا تقاضا بھی تھا۔ چنانچہ تالا چیک کرنے اور مجھے چیک کرنے کے بعد اس نے پوری احتیاط برتی اور میرے ساتھ کوئی خاص بات نہ کی۔ اس سے ذرا پہلے میں سوچ رہا تھا کہ کسی طرح کاغذ کا ٹکڑا اور قلم میسر آ جائے تو اس پر ان آخری لمحات میں اپنے پیاروں کے نام کچھ لکھوں اور اس کے لئے اپنے ایک خاص دوست اکبر شاہ وارڈر کا نام بھی ذہن میں آیا کہ اگر وہ آ جائے تو اسے کہا جا سکتا ہے مگر جس طرح اُس کا نام ذہن میں آیا اُسی طرح نکل بھی گیا کیونکہ اُس وقت خیالات کی رفتار بہت تیز تھی لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہی اکبر شاہ میرے سامنے آ موجود ہوا۔ میں اُٹھ کر اس سے بڑے تپاک سے ملا اور وہ بھی بڑی چاہت اور خلوص سے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس حادثہ کا سنتے ہی اس نے اپنی نوکری 7 بلاک میں لگوالی تھی اور رات بھی آیا تھا مگر مجھے سویا ہوا پا کر مل نہ سکا۔ ابھی یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ مجھے اس کی آواز بھرائی ہوئی لگی۔ میں نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں برسات کا سماں تھا جس کی وجہ سے اب وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا اور اُس سے کچھ بھی بولا نہ جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اُسے کہا اکبر! جذباتی نہیں ہونا مگر وہ تو میرے اِس فقرہ کی ادائیگی سے پہلے ہی بہت آگے جا چکا تھا اور اگلے ہی لحہ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو برسنے لگے اور وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں نے اسے ہاتھ باہر نکال کر پکڑا، جھنجوڑا، سمجھایا مگر کچھ نہ بنا۔ اتنے میں اُسے احساس ہوا کہ اس کے پیچھے میرے خاص پہرہ والا ملازم بھی کھڑا ہے۔ چنانچہ بڑا جبر کر کے اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور رانا صاحب سے ملنے کو کہہ کر میرے پاس سے چلا گیا۔ پھر وہاں جا کر بھی بقول رانا صاحب اُس کی یہی کیفیت تھی۔ میں یہ نظارہ دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ اور یہ سوچ کر کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ایک غیر شخص کے دل میں بھی ہماری ہمدردی اور محبت ڈال دی ہے، اس کی بے انتہاء حمد و ثناء کرنے لگا۔ یہ ملازم نہ تو جیل میں آنے سے پہلے میرا واقف تھا اور نہ ہی احمدی تھا۔

اس موقع پر مجھے خیال آیا کہ اکبر شاہ کو کاغذ قلم لانے کے لئے کہوں۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد جب رانا صاحب سے مل کر وہ باہر نکلا تو اسے اکیلے میں بلایا۔ جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنی فرمائش بتادی۔ جس پر وہ تیار تو ہو گیا مگر کہنے لگا کہ یہ جو خاص پہرہ والا ملازم ہے، اُس سے کس طرح بچا جاسکے گا؟ اسی موقع پر ہم بات کر رہے تھے کہ اچانک ان کا ایک دوست محمد حفیظ وارڈر بھی آ گیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر بطور خاص مجھے ملنے آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ کل رات سے بے حد پریشان ہے۔ اُسے آئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ باہر والے دروازے سے اچانک ہیڈ وارڈر ریاض شاہ وارد ہوئے۔ یہ صاحب اُن دنوں چیف ہیڈ وارڈر کے عہدہ پر کام کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کو دیکھ کر یہ دونوں گھبرا کر فوراً پیچھے ہٹے اور باہر صحن میں نکل گئے۔ پکڑے جانے کے خوف سے بے حد پریشان نظر آئے کیونکہ یہ دونوں یہاں چوری چوری آئے ہوئے تھے اور یہاں اِس حال میں ان کا ہمیں ملنا اُن کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا کہ ہمارا معاملہ انتہائی نازک مرحلہ میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے بھی دھڑکا سا لگ گیا کہ اب اِن بے چاروں کی شامت آئی کہ آئی مگر اگلے چند لمحے اس چیف ہیڈ وارڈر کی عجیب و غریب اداکاری کی نذر ہو گئے۔ وہ خاموشی سے میرے سیل کے سامنے کھڑے رہے۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر پتہ نہیں کیا کچھ سوچ کر ان کے ہونٹ ہلتے ہوئے نظر آئے تو تشویش نیا رخ اختیار کر گئی۔ ان کا پہلا فقرہ تھا کہ لاؤ چابیاں اور ان کو کھولو۔ میرے خیالات کا گھوڑا اِدھر سے اُدھر بے تحاشا دوڑنے لگا۔ میں نے کہا کس غرض سے کھولنا ہے؟ کیا ملاحظہ کے لئے کھولنا ہے؟ پھر خیال آیا کہ اب کونسا ملاحظہ! کیا کسی دوسری جیل میں چالان تو نہیں بھیجنے لگے۔ بے شمار خیالات آنے جانے لگے۔ یہ تو اُس لمحہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ اُسی لمحے، اُسی حالت میں ہمیں آزاد کریں گے۔ میں نے ان سے پوچھنا چاہا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر چابیاں آئیں تو میں نے ملازم سے پوچھا تو اُس نے آہستہ سے بتایا کہ وہ کہتا ہے کہ Stay Order آ گیا ہے۔ میں نے کہا اتنی جلدی Stay کیسے آ سکتا ہے۔ خیر میں نے باہر آ کر ریاض شاہ سے خود پوچھا کہ کیا Stay آ گیا ہے؟ اس نے جواب دیا 'پتہ نہیں'۔ میں نے کہا پھر یہ کیا ہے اور کس لئے ہے؟ مگر اُس نے خاموشی ہی مناسب سمجھی۔ پھر جب میں نے سامان لینے کو کہا تو وہ کہنے لگا کہ وہاں جا کر اپنے مشقتی کو بھجوا دینا۔ اُس کے اِس فقرہ سے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ ہمیں معمول کی سزائے موت وارڈ میں واپس لے جایا جا رہا تھا۔

چنانچہ ہم نے اس خوشی میں اپنے مختصر سے سامان کو اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں میں ہی سمیٹ لیا اور بیڑیوں کی جھنکار میں حمد و ثناء کے ترانے گاتے اور خوشی و مسرت کے شادیانے بجاتے ہوئے اُسی راہ پر واپسی سفر شروع کیا جو راہ کل شام ہمارے لئے اجنبی ہو گئی تھی۔ جو راہ کل شام ہمیں 'قاتل قاتل' کے طعنے دے رہی تھی آج ہمارے لئے بچھی جا

رہی تھی۔ قریباً پانچ سات منٹ کے سفر کے بعد ہم اپنی منزل یعنی سزائے موت وارڈ میں پہنچے تو یہاں ہمارے ساتھیوں نے حیرانی کے ساتھ مگر بڑھ بڑھ کر خوشی وشادمانی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور ہمیں دعائیں دیں، فالحمدللہ۔ معین طور پروقت تو نوٹ نہیں کیا تاہم یہ خوفناک ڈرامہ سترہ سے اٹھارہ گھنٹوں پر پھیلا ہوا تھا۔ شام پانچ بجے کے قریب ہم یہاں سے گئے تھے اور اگلے روز صبح گیارہ بجے کے قریب واپس آئے تھے۔ میں نے یہ وقت کیسے گزارا؟ اس کی کچھ تفصیل تو گزر چکی ہے تاہم مندرجہ ذیل اشعار بھی اس دوران میرا زادِ سفر بنے رہے ۔

اگر وہ جاں کو طلب کرتے ہیں تو جاں ہی سہی   بلا سے کچھ تو نبٹ جائے فیصلہ دل کا

اور غالب کا یہ شعر ۔

عجب نشاط سے جلاّد کے چلے ہیں ہم آگے   کہ اپنے سائے سے، سر پاؤں سے ہے دوقدم آگے

اسی طرح کسی شاعر کا یہ کہنا ۔

اب راہِ صداقت میں ہم نے یہی ٹھانی ہے   ایماں کا بھرم رکھ لیں، یہ جان تو جانی ہے

اور فیض احمد فیض کا یہ لافانی شعر ۔

جس دَھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی تو کوئی بات نہیں

اب یہ ایک معمہ ہے کہ یہ سب کچھ کیا تھا یعنی جیل حکام کو غلطی لگی تھی یا اوپر سے ایسے احکام آئے تھے کہ کسی کو پتہ لگنے سے پہلے پہلے ان کا حساب چکا دیا جائے۔ جو بھی صورت تھی مگر یہ ایک حقیقی اور باقاعدہ کارروائی تھی جس میں سے ہم گزرے اور ایسے طور پر گزرے کہ اس میں مصنوعیت کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ اپنے کیا اور غیر کیا سبھی نے یہی سمجھ لیا تھا کہ اب یہ واپس نہیں آئیں گے خصوصاً اتنی جلد واپسی کا تو کسی کو وہم وگمان تک نہ تھا۔ بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم چند گھنٹوں میں ہی واپس آگئے اگرچہ یہ چند گھنٹے ساری جماعت عالمگیر کے لئے اعصاب شکن تھے۔ دنیا نے اس واقعہ کی نہ معلوم کیا کیا توجیہات کی ہوں گی مگر میرا تو ایمان ہے کہ یہ میرے پیارے آقا کی دل گداز دعاؤں اور حضورؒ کی اقتداء میں احباب جماعت کی درد بھری آہوں کا اعجاز تھا اور یقیناً حضور رحمہ اللہ کا یہ شعر اس موقع پر اپنی عظمتِ شان کے ساتھ پورا ہوا ۔

عصرِ بیمار کا ہے مرض لادوا، کوئی چارہ نہیں اب دُعا کے سوا
اے غلامِ مسیح الزماں! ہاتھ اُٹھا، موت آ بھی گئی ہو تو ٹل جائے گی

اس عظیم الشان شعر کے حوالہ سے ایک امر بڑا ہی ایمان افروز اور روح پرور واقعہ ہے جس کی یاد آتے ہی 1983ء کے جلسہ سالانہ کا وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا جب سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہی منظوم کلام 'دو گھڑی صبر سے کام لو ساتھیو!......' پہلی مرتبہ پڑھا گیا تھا اور میں اُس وقت جلسہ کے سٹیج پر حضورؒ کے بالکل قریب بیٹھا سوچ رہا تھا کہ حضورؒ یہ کیسی باتیں کہہ رہے ہیں حالانکہ حالات تو بالکل ٹھیک ہیں اور اُس وقت حالات بظاہر تھے بھی پُرسکون، پھر اس نظم کا مذکورہ بالا یہ مقطع بالخصوص حیران کن تھا۔ تاہم اُس جلسہ میں موجود ہر احمدی کی طرح میرے دل میں بھی یہی جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا کہ اگر ایسا وقت آ گیا تو ہم کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے اور پیچھے نہیں رہیں گے۔

پھر کچھ دنوں کے بعد اس نظم میں چھپے ہوئے معنی حقیقت بننے لگے اور اس میں بڑی احتیاط سے سجائی گئی پیشگوئیاں پوری ہونے لگیں تو مجھے خلافت کی عظمت کا ایک نیا احساس ہوا، خلافت ایسی بے بہا نعمت مجھ پر نئے انداز میں آشکار ہوئی۔ پھر اس ہفتہ ہمارے ساتھ ہونے والے 'ڈرامہ' کے اختتام پر محترم رانا نعیم الدین صاحب نے مجھے یہ شعر یاد دلایا تو میں وارفتگی کے عالم میں اس شعر پر نثار ہونے لگا۔ کیسی خوبصورتی اور کیسی عظمت شان اور کیسی سچائی کے ساتھ جماعت کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو پیارے آقا نے اس نظم میں پرو دیا تھا۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ شعر ہم پر بھی پورا ہوا اور ایسی شان سے پورا ہوا کہ کم از کم ساہیوال کے دَر و دیوار، ساہیوال جیل کے ایک ایک قیدی حوالاتی اور ملازم نے اسے پورا ہوتا ہوا دیکھا اور ہر کوئی انگشت بدندان پوچھتا رہا کہ یہ سب کیسے ہوا اور کیا ہوا مگر انہیں نہیں معلوم کہ اس سارے حادثہ کا خلاصہ اِسی ایک مصرعہ میں ہے:

اے غلام مسیح الزماں! ہاتھ اُٹھا، موت آ بھی گئی ہو تو ٹل جائے گی

قصہ کوتاہ، اللہ نے اس اِنتہائی نازک، خطرناک اور خوفناک وقت کو اپنے بے شمار فضلوں، بے پایاں انعامات اور بے کراں رحمتوں سے معمور رکھا۔ اُس کی سب سے بڑی رحمت، سب سے بڑا فضل اور سب سے عظیم انعام تو ہمت، حوصلہ، صبر اور استقامت کی وہ توفیق تھی جو ہمیں ابتلاء کے اس حصہ میں بھی نصیب ہوئی اور جس کے نتیجہ میں ہمیں اپنے اعصاب پر ایسا قابو رہا کہ کسی بھی پہلو سے ہمارے کردار یا رویہ میں دشمن شگاف ڈالنے میں ناکام رہا، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔ آئندہ بھی ہماری یہی دعا ہے، یہی تمنا ہے یہی خواہش ہے کہ اللہ ہمیں اپنے فضل سے اپنی راہ میں ثابت قدم رکھے۔ اِستقامت جیسی نعمت بے بہا سے نوازے اور ہم اس کے ہو رہیں اور وہ ہمارا ہو جائے، آمین ؎

| | |
|---|---|
| جو ہمارا تھا وہ اب دلبر کا سارا ہو گیا | آج ہم دلبر کے اور دلبر ہمارا ہو گیا |
| شکر للہ مل گیا ہم کو وہ لعلِ بے بدل | کیا ہؤا گر قوم کا دِل سنگِ خارا ہو گیا |

## 'آخری ملاقات' سے پہلے ملاقاتوں کی قطار

جیل حکام نے تو ہمیں تحریری طور پر یہ بتا دیا تھا کہ اب ہماری کوئی ملاقات نہ ہوگی سوائے آخری ملاقات کے اور اُس تحریر پر ہم سے دستخط بھی کروا لئے تھے مگر کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ ڈاڈھا (طاقتور) ہوتا ہے۔ جس قسم کے حالات کا جماعت احمدیہ کو پاکستان میں سامنا تھا، ان کے پیش نظر اس قسم کی تحریر کے بعد تو ظاہری لحاظ سے زندگی کی موہوم سی اُمید بھی نہ رکھی جا سکتی تھی مگر ہمارے زندہ خدا نے اپنی قدرت نمائی کی اور وہی جو ہماری ملاقات تک کا پتہ کاٹ چکے تھے اگلے ہی روز سے قطار اندر قطار ملاقاتیں کروانے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ مؤرخہ 16 فروری 1987ء کی صبح قریباً ساڑھے دس گیارہ بجے کے قریب میں اپنی وارڈ کے بیرونی دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اچانک باہر سڑک پر جو نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے چکر کے قریب سے ابا جان اور میرے سسر صاحب کچھ دوستوں کے ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتے دوڑے چلے آرہے ہیں اور اُن کے آگے رانا ذکاء الرب صاحب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک اور دوست بھی چلے آرہے تھے جنہیں میں پہچانتا نہ تھا۔ اِس پر میں نے ایک دفعہ تو سوچا کہ اندر چلا جاؤں مبادا رانا ذکاء الرب صاحب ناراض ہو جائیں مگر دوسرے ہی لمحہ اپنے بزرگوں کا یہیں رہ کر استقبال کرنے کو جی چاہا۔ اِسی کشمکش میں وہ سب احباب وہاں آن پہنچے تو میں دروازہ کے ایک طرف ہو گیا۔ رانا صاحب تیزی سے وارڈ کے اندر جانے لگے تو اچانک مجھ پر نظر پڑی اور اپنے ساتھی سے کہنے لگے دیکھیں، ایک تو آپ کے دوست یہ ہیں الیاس منیر' اور اس کے ساتھ ہی وہ ناواقف دوست میری طرف بڑھے اور میں ان کی طرف۔ ابھی سلام ہی ہوا تھا کہ رانا صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر اپنے ساتھ آنے والے ایک احمدی دوست کا تعارف کرایا۔ اِس کے ساتھ ہی وہ مصافحہ ایک پر جوش معانقہ میں ڈھل گیا اور اتنا مزا آیا کہ بیان سے باہر۔ قریشی صاحب نے بے انتہا خلوص اور اپنائیت اور جذباتیت کے ساتھ معانقہ کیا۔ ان کے بعد ابا جان، سسر صاحب اور لاہور سے بھائی رفیق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کے علاوہ ایک مہربان دوست کے خسر محترم قریشی منیر احمد صاحب بھی ساتھ تھے۔

پھر قریشی صاحب کہنے لگے کہ یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ چنانچہ اُدھر ہی کرسیاں اکٹھی کروالی گئیں۔ رانا نعیم الدین صاحب بھی وہاں آگئے۔ پھر قریشی صاحب نے ایک ملازم سے کہا کہ ہمارے آدمی جہاں جہاں ہیں، بلا لاؤ۔ چنانچہ چند منٹ میں ہم سب یہاں اکٹھے ہو گئے۔ اِتنے میں مشقتی وسیع پیمانہ پر چائے بھی تیار کر لایا اور اس کھلی فضاء میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی جشن کا سماں ہو، الحمدللہ۔

سب مہمانوں نے ہم سے گزشتہ دو دنوں کے حالات تفصیل سے سنے اور قریباً گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد عام ملاقات کا

پرچہ آیا اور باہر سے ملاقاتی آنے لگے تو یہ تمام دوست واپس تشریف لے گئے۔ پھر معمول کی ملاقات شروع ہوئی تو اُس میں بھی ہمارا نام تھا اور تھوڑے سے انتظار کے بعد محترم میجر بشیر احمد صاحب، محترم عاشق صاحب کے علاوہ ملتان سے چوہدری عبدالرحیم صاحب اور مربی سلسلہ انیس الرحمٰن صاحب (مرحوم) ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ان سے دیر تک ملاقات ہوتی رہی اور ان سے بھی کئی امور سے متعلق تفصیلی گفتگو کا موقع ملا۔ الحمدللہ۔

اِس موقع پر یوں تو بھی احباب کے اضطراب کی کیفیت بیان سے باہر تھی مگر محترم میجر بشیر احمد صاحب صاحب کا معصوم اور مضطرب چہرہ ابھی تک آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ میری بیڑی کو پکڑ کر اس کے متعلق دیر تک باتیں پوچھتے رہے۔اُن کی باتوں سے عیاں تھا کہ میرے پیروں میں لگی ہوئی بیڑی کو دیکھنا ان کے لئے نا قابل برداشت ہوا جا رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر دے، ان کے جذبات قبول فرمائے اور ان کی التجاؤں اور دعاؤں کو سنے، آمین۔

## رحم کی اپیل کرنے کے لئے اِنتظامیہ کا دباؤ بلکہ اصرار

سزا پر عمل درآمد کے اس مرحلہ پر ہمیں کہا جانے لگا کہ ہم صدر پاکستان کے پاس رحم کی اپیل کریں کیونکہ قانون کے مطابق اب سزا پر عملدرآمد تک کے سفر میں صرف ایک یہی صورت رہ گئی تھی۔ اگر ہم ایسا کرتے تو اس کا مطلب ہوتا کہ ہم نے اِس جرم کا اِرتکاب کیا ہے جس کی سزا میں ہمیں تختۂ دار پر لٹکانے کے احکام جاری کئے گئے ہیں اور دوسرے یہ کہ اپنے آپ کو قادرِ مطلق سمجھنے والوں کو جھوٹی تسکین ہوتی کہ احمدیوں نے ان کے سامنے اپنی زندگیوں کے لئے بھیک مانگی ہے۔ چنانچہ یہ بھی خدا تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ ہمیں حضور اقدس کی وہ دِلی خواہش پوری کرنے کی توفیق ملی جسے حضورؒ نے اپنے مکتوب مؤرخہ 19.02.86 میں یوں الفاظ کا جامہ پہنایا تھا کہ

'بہت دعائیں کریں کہ میرا اور آپ کا خدا اِس پیاری جماعت کا سر ہر ابتلاء میں بلند رکھے
اور کبھی غیر اللہ کے سامنے نہ جھکے'

خاکسار نے جب رحم کی اپیل کرنے سے انکار کیا تو دو اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ صاحبان میرے پاس آئے اور مجھے کہا کہ رحم کی اپیل دائر کرو۔ میں نے کہا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میں تو ہرگز ایسا نہیں کروں گا تو وہ دونوں حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگ گئے۔اُن میں سے ایک کہنے لگا کہ اگر رحم کی اپیل نہیں کرو گے تو پھر کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے رحم مانگوں گا نہ کہ کسی انسان سے! اس پر وہ خاموش ہو کر چلے گئے۔

## سزا پر عمل درآمد روکنے کا عدالتی حکم نامہ

جب صدر پاکستان نے نظر ثانی کی ہماری پٹیشن مسترد کر دی تو جیل حکام کی طرف سے مندرجہ بالا کارروائی کی گئی اور

ہمیں سزا پر عمل درآمد کی غرض سے زندگی کے آخری موڑ پر پہنچا دیا گیا تھا۔ جہاں سے ’حیلے سب جاتے رہے بس اک حضرتِ تواب ہے‘ والا مضمون شروع ہو گیا۔ اس صورت حال میں اللہ تعالیٰ نے تضرعات کو سنا اور ایک تو فوری طور پر غیب سے ایسے حالات پیدا فرمائے کہ ہمیں اُس حالت سے نجات مل گئی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور دوسرے ہمارے وکلاء نے فوری طور پر لاہور ہائی کورٹ میں مارشل لاء کی خصوصی عدالت کے اِس فیصلہ کو چیلنج کر دیا جسے ہائیکورٹ کے ایک ڈویژن بنچ نے سماعت کے لئے منظور کر لیا جس کے دو تین روز بعد ہمیں باقاعدہ Stay مل گیا کہ جب تک عدالت عالیہ اس معاملہ کا فیصلہ نہیں کرتی، سزا پر عمل درآمد نہیں ہو گا۔

ہر چند کہ حالات سخت ناموافق تھے مگر عدالتِ عالیہ کو ہماری یہ رِٹ پٹیشن سماعت کے لئے منظور کرنا پڑی اور اُسے ہماری سزاؤں پر عمل درآمد روکنے کا عدالتی حکم نامہ جاری کرنا ہی پڑا۔ 17 فروری کی صبح ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ ہائی کورٹ میں گذشتہ روز تک رِٹ دائر نہیں ہو سکی تھی اور آج امید ہے کہ ہو جائے گی۔ دوپہر کے وقت برادرم حاذق صاحب نے ملاقات کے بعد آ کر بتایا کہ آج صبح 9 بجے رِٹ دائر ہو گئی ہے۔ کل اس لئے نہ ہو سکی تھی کہ ہمارے وکیل جناب عابد منٹو صاحب کراچی میں تھے، وہ کل ہی آئے ہیں اور آج انہوں نے رِٹ دائر کر دی ہے۔ کل صبح اس پر ضروری بحث ہو گی جس کے بعد باقاعدہ طور پر سماعت کے لئے منظور ہو جائے گی پھر Stay Order جاری ہو گا۔

اگرچہ قانونی طور پر ہماری صورت حال آخری مرحلہ پر پہنچے ہوئے قیدیوں سے بالکل مختلف تھی مگر جیل انتظامیہ ہمیں کس نظر سے دیکھ رہی تھی، اس کا اندازہ اِس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہلے دِن کی ملاقاتوں کے بعد سپرنٹنڈنٹ جیل نے حکم جاری کر دیا تھا کہ جب تک ہائی کورٹ سے Stay نہیں آ جاتا اس وقت تک ملاقات بند رہے گی۔ چنانچہ چند روز تک ہماری تمام ملاقاتیں بند رہیں حتیٰ کہ ہماری معمول کی فیملی ملاقات بھی 18 فروری کو نہ ہو سکی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے اِس حکم پر حیرانی ہوئی کیونکہ ہماری ملاقات اس مرحلہ پر بند ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ہم اگر ہائی کورٹ سے Stay نہ لیتے تو بھی ایسا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ صدر کے پاس رحم کی اپیل کا مرحلہ ابھی باقی تھا اور یہ تو کبھی نہیں ہوا کہ رحم کی اپیل والوں کی ملاقات بند ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک انسان سے رحم مانگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

## عدالت عالیہ کا حکم نامہ اور اُترنا ہماری بیڑیوں کا

18 فروری 1987ء کی صبح ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ میں کتاب لئے باہر والے گیٹ کے پاس پڑی کرسی کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں وہی ملازم ملا جو دو روز پہلے ساڑھے دس بجے 7 بلاک میں میرے خاص پہرہ کی ڈیوٹی پر آیا تھا۔ میں نے اسے سلام کیا اور کہا کہ تم ہمارے لئے نیک شگون ہو۔ اس کے بعد وہ اندر وارڈ میں چلا گیا اور مَیں دُھوپ میں

کرسی پر بیٹھ کر مصروفِ مطالعہ ہوگیا۔ ابھی دو تین صفحے ہی پڑھے تھے کہ دروازہ سے قیدی لوہار اچانک برآمد ہوا جس نے کندھے پر ایک بڑا سا ہتھوڑا اُٹھایا ہوا تھا اور ہاتھوں میں دیگر ضروری سامان پکڑا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ ہماری بیڑیاں اُترنے لگی ہیں۔ اُس کے پاس ایک پرچی تھی جس پر ہم دونوں کے نام لکھے تھے کہ بحکم سپرنٹنڈنٹ صاحب جیل ان کی بیڑیاں اُتار دی جائیں۔ چنانچہ چند منٹ بعد ہماری بیڑیاں اُتار دی گئیں اور یہ امر اس بات کا غماز تھا کہ عدالت عالیہ کی طرف سے باقاعدہ طور پر Stay Order جاری ہو گیا ہے کیونکہ اس کے بغیر جیل انتظامیہ اس قسم کا کوئی قدم اُٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوسکتی تھی کہ اُسے بخوبی علم تھا کہ ہمارے معاملہ کو 'اوپر' سے monitor کیا جارہا تھا۔

اگر چہ اب کے بیڑیاں تین چار روز کے لئے ہی لگی تھیں مگر اُترنے پر غیر معمولی سکون محسوس ہوا، یوں لگا جیسے مدتوں ہمیں بیڑیاں لگی رہی تھیں۔ شاید اس لئے کہ یہ چند روز اپنی کیفیت کے لحاظ سے بہت بھاری تھے اور بیڑیوں کے اُترنے کے بعد بھی بہت دیر تک یونہی محسوس ہوتا رہا کہ پاؤں بندھے ہوئے ہیں بالکل اُس پرندہ کی طرح جسے دیر تک پنجرہ میں رکھا جائے اور وہ اُڑنا ہی بھول جائے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے اس احسان پر دِل سے بے اختیار یہ دعا نکلی:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّی الاذیٰ وَعَافَانِی

عدالت عالیہ کے اس حکم نامہ کے جاری ہونے کی تصدیق اُسی روز ملاقات کے لئے تشریف لانے والے مکرم میاں خالد مسعود صاحب اور برادرم مکرم عبدالودود صاحب نے کی جو سپرنٹنڈنٹ صاحب سے مل کر آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جب Stay Order جاری ہونے کی اطلاع آئی تھی تو وہ صاحب بہادر کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اس Stay Order کی خبر جنگ اخبار میں کئی دِنوں کے بعد 8 مارچ 87ء کو آئی۔ اُس روز ہمیں اِنتظار ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ خوشی کی کوئی خبر عطا فرمائے گا کیونکہ 7 مارچ کو ہائی کورٹ میں مارشل مقدمات کی سماعت کے سلسلہ میں پہلے مرحلہ پر دلائل کو سمیٹا جانا تھا چنانچہ یہی ہوا۔ میں 9 بجے کے قریب اپنے ایک قیدی ساتھی کے ساتھ اپنی وارڈ میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ محترم ملک محمد دین صاحب اچانک تشریف لائے اور مبارک باد دی۔ انہوں نے عبدالقدیر صاحب کے حوالہ سے بتایا کہ ہائی کورٹ میں رِٹ سماعت ہونے کی اِجازت ہوگئی ہے۔ ہم نے فوراً اخبار منگوانا چاہا اور ابھی مشقتی کو بلانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ باہر والے دروازہ سے میرا مشقتی داخل ہوا اور اس نے اخبار مجھے تھمایا۔ جلدی سے میں نے اَخبار کھولا تو پہلے صفحہ پر شہ سرخی کے ساتھ ہی دو کالمی موٹی سی سرخی تھی "ساہیوال قادیانی کیس کے مجرموں کی درخواست سماعت کے لئے منظور"، تفصیل پڑھی تو وہ اُس خبر پر مشتمل تھی جو آج سے 15 روز پہلے آنی چاہئے تھی کہ ہائی کورٹ نے ہماری رِٹ پٹیشن سماعت کے لئے رکھ لی ہے۔ تاہم ساتھ ہی میری نظر اس صفحہ کے نچلے حصہ پر پڑی تو وہاں وہ خبر بھی تھی جس کا

ہمیں انتظار تھا۔ اس خبر کے مطابق ہائی کورٹ کے فل بنچ نے معروف ایڈووکیٹ اعتزاز احسن کی درخواست پر مارشل لاء عدالتوں کی سزاؤں کے خلاف اپیل کا حق دے دیا تھا، الحمدللہ۔

## غیروں نے ہمیں کیسے دیکھا

خاکسار نے 20 فروری 1987ء کو جو ڈائری سپرد قلم کی تھی، معمولی لفظی اصلاح کے ساتھ پیش ہے:

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے آمرِ وقت، صدر پاکستان کے ہماری نظر ثانی کی اپیلوں پر سزائے موت کو بحال رکھنے کا فیصلہ سن کر اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ہمت اور حوصلہ دیا اور پوری بشاشت کے ساتھ صورت حال کا مقابلہ کرنے کی توفیق ملی، الحمدللہ۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے جسم میں ہمارے دل اور دماغ میں طاقت کا بہت بڑا چشمہ ہے یا کوئی ری ایکٹر لگا ہوا ہے جہاں سے ہمیں بے پناہ توانائی اور طاقت مل رہی ہے مگر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل کی عملی شکل تھی۔ وہ دعائیں تھیں جو ساری دنیا میں بسے ہوئے پیارے احباب جماعت کے دلوں سے اُٹھ اُٹھ کر ہم پر اللہ کے افضال و برکات کی صورت میں برس رہی تھیں۔ وہ بے قرار جذبات تھے جو ہر احمدی کے جسم و روح اور قلب و ذہن میں مچل رہے تھے۔ ایک کروڑ مسکینوں کے سینوں سے اُبلتی ہوئی ہنڈیا ایسی گڑگڑاہٹ ہمارے لئے تسکین کا پیغام بنے ہوئے تھی۔ اگر ہم کسی وجہ سے بے قرار تھے تو وہ صرف اور صرف انہی تمام احباب جماعت کی بے قراری کا تصور تھا۔

یہ باتیں لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اسے صرف ہم نے ہی محسوس نہیں کیا۔ بلکہ غیروں نے بھی اِس امر کو نوٹ کیا اور بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اس صورت میں یہ کیفیت سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت اور احمدیت کی حقانیت کا ثبوت بن جاتی ہے۔ صحیح مسلم میں جہاں مسیح موعود کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی اللہ کے لقب سے ملقب کر کے اس کے اور اس کی جماعت کے ساتھ پیش آنے والے چار واقعات کا ذکر فرمایا ہے، ہمارا یہ واقعہ بھی اُن میں سے اُن الفاظ کا مصداق تھا جن میں بتایا گیا ہے کہ مسیح موعود اپنی جماعت کو طور پہاڑ پر لے جائے گا یعنی سکینت اُن کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے گی۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آج 20 فروری 87ء کی صبح ناشتہ پر ہم بیٹھے تو رانا نعیم الدین صاحب مجھے بڑے رازدارانہ لہجہ میں بتانے لگے کہ ابھی ایک وارڈر شان نامی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ بزرگو! دیکھو جی یہ مرزائی بھی عجیب ہیں، ان کی Date (تاریخ سزائے موت) بھی لگ گئی تھی یعنی اپنے انجام کی آخری

منزل پر پہنچ گئے مگر ان کے چہروں پر کوئی اثر نہیں ہوا کوئی فرق نہیں آیا، ذرا بھی کملائے نہیں۔ اس مضمون کی لمبی چوڑی باتیں کرتا رہا۔ رانا صاحب کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ اسے میرا پتہ نہیں کہ کون ہوں۔ چنانچہ جب اُس نے اپنی بات مکمل کر لی تو اُس سے پوچھا 'میرے چہرے پر کوئی اثر ہے؟ میرا چہرہ کملایا ہوا ہے؟' اُس نے جواب دیا کہ جی نہیں۔ اس پر رانا صاحب کے اس اِنکشاف نے اُسے ہلا کر رکھ دیا کہ 'میں بھی انہی میں سے ایک ہوں'۔

## جوان عزم

یہ پانچ مئی سن ستاسی کی بات ہے تازہ اخبار آیا تو اس میں وفاقی وزیر قانون کا بیان پڑھا کہ مارشل لاء عدالتوں کی سزاؤں پر نظر ثانی کرنے کے لئے مقرر کی گئی کمیٹی کی رپورٹ جلد آنے کی توقع ہے۔ تاہم قتل، مجرمانہ حملوں اور کرپشن کے مجرموں کو رعایت دیئے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ مجھے خیال آیا کہ مارشل لاء گزیدہ تو زیادہ تر قتل کے مقدمات میں ملوث کئے گئے ہی لوگ ہیں، اس لئے اگر اس کمیٹی کا کوئی مثبت فیصلہ آ بھی جاتا ہے تو اکثریت کو تو کوئی فائدہ نہ ہوگا حالانکہ ان کے مقدمات کا مارشل لاء سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ دراصل بات تو یہ ہے کہ اس وقت کے آمر کسی صورت میں بھی اپنے کئے پر نادم ہونے کے لئے تیار نہ تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے اقدامات پر کسی طرف سے بھی انگلی اُٹھے۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود ایک طرف تو ہم ہر قسم کی آزمائش کے لئے اپنی کمر ہمت کسے اور اپنے ظرف کے مطابق عزم کئے ہوئے تھے اور دوسری طرف کامل توکل اور کامل یقین سے بھی معمور تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے انہی حالات میں سے خوشیوں کے سامان کرے گا اور جس طرح بھنور میں ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچالیا کرتا ہے بالکل اُسی طرح وہ اپنی عظیم قدرت کاملہ اور اعجازی طاقت کا خارقِ عادت نمونہ دکھائے گا، انشاء اللہ العزیز۔

## حضرت نواب امۃ الحفیظ بیگم صاحبہؓ کی وفات

یہ 7 مئی 1987ء کی بات ہے کہ صبح سے چکیوں کی مرمت کے سلسلہ میں مصروف تھا اور سارا سامان لپیٹ کر چکی کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ اِسی دوران اخبار جنگ کا تازہ شمارہ آیا۔ اُسے ایک نظر دیکھ رہا تھا کہ پچھلے صفحہ پر ایک چھوٹی سی خبر پر نظر پڑی 'مرزا غلام احمد کی بیٹی انتقال کر گئیں'۔ جس پر تشویش ہوئی کہ یہ کن کے بارہ میں ہے؟ تفصیل پڑھی تو پتہ چلا کہ یہ حضرت نواب امۃ الحفیظ بیگم صاحبہ کی وفات حسرت آیات کی خبر تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ اُس مبشر اولاد میں سے آخری نشانی تھیں جن کی خبر حضرت رسول کریم ﷺ نے یَتَزَوَّجُ وَیُولَدُ لَہٗ کے الفاظ میں دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے ماضی کی یادیں فلم بن کر گزرنے لگیں۔ مجھے یاد ہے کہ امی جان مرحومہ مجھے کئی بار

بچپن میں حضرت بیگم صاحبہ مرحومہ کے پاس لے گئی تھیں اور میرے لئے دعا کرائی تھی مجھے یاد پڑتا ہے ایک دو مرتبہ مجھے آپ سے تبرک بھی ملا۔ پھر مجھے آپ سے اُن دنوں کئی بار فون پر بات کرنے کی سعادت بھی ملی جب میں 1982ء میں اخبار الفضل ربوہ میں بطور قائمقام اسسٹنٹ ایڈیٹر متعین رہا۔ ان دنوں آپ کی صحت کی اطلاع اخبار میں درج کرنے کے لئے ہر روز اخبار کی تیاری کے آخری مرحلہ پر فون کیا جاتا تھا۔ فون کے پاس اگر کوئی نوکر یا کوئی اور فرد خانہ ہوتا تو وہ پوچھ کر بتا دیتا۔ وگرنہ بہت دفعہ ایسا ہوا کہ آپ خود فون اُٹھاتیں اور مضمحل آواز میں حال بتاتیں۔ اس دوران بسا اوقات میری توجہ نفس مضمون کی بجائے اس طرف ہوتی کہ ایک مقدس ہستی کی بیٹی کی متبرک آواز ہے۔ آپ کی آواز میں بزرگی، نیکی، تقویٰ اور سادگی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا خاص انداز بھی ہوتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل سے اس مبارک وجود کو اپنی رحمت میں لپیٹے رکھے۔ ان کے درجات بلند فرمائے اور اس بابرکت وجود کے اُٹھ جانے سے دعاؤں میں جو کمی آ گئی ہے اسے اپنے فضل سے پورا کر دے، آمین۔ آہ! اب سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اولاد میں سے کوئی بھی ہمارے درمیان نہیں رہا، یہ وجود تو مجسم خیر و برکت تھے، برکتیں ان کے وجودوں سے پھوٹ پھوٹ کر ہمارے ماحول کو بابرکت کر رہی تھیں۔

میں نے یہ خبر پڑھی اور فوراً ملک صاحب کو بلوا کر باہم تعزیت کی اور نماز جنازہ غائب کا پروگرام بنایا مگر ڈیوٹی پر موجود اہلکار نے ہمیں اس کی اجازت نہ دی کہ ایسا کرنے سے اس کے نزدیک خوامخواہ جھگڑا ہو جانے کا امکان تھا حالانکہ ہم نے تو ساتھ والی ویران کنڈم وارڈ میں یہ نماز ادا کرنا تھی جہاں کوئی دوسرا قیدی ہوتا ہی نہیں۔

## ہمارے ساتھی محترم ملک صاحب کی اہلیہ کی وفات کا اندوہناک واقعہ

اگلے روز 8/اپریل 1987ء کی بات ہے کہ میں حسب معمول ملاقاتوں کے بعد اپنے کمرے میں بند نماز ظہر ادا کر رہا تھا کہ یوں لگا جیسے کوئی صاحب مجھے ملنے آئے ہیں کیونکہ ایک دو مرتبہ کسی نے میرے دروازہ پر لٹکا پردہ ہٹا کر دیکھا بھی۔ میں نے سلام پھیرنے کے بعد آئینہ لگا کر باہر دائیں بائیں دیکھا تو دورا پنے ملک محمد دین صاحب کھڑے نظر آئے۔ میں نے اُنہیں قریب بلوایا تو بتانے لگے کہ ابھی جیل کے ایک دفتری سپاہی نے آ کر بتایا ہے کہ مجھے دو دن کے لئے پیرول پر گھر لے جایا جا رہا ہے کیونکہ میری بیوی زیادہ بیمار ہے۔ پھر ساتھ ہی ملک صاحب نہایت جذباتی کیفیت میں ڈوب کر کہنے لگے کہ گزر گئی ہوگی، مجھے بتا نہیں رہے۔ اس پر میں نے ملک صاحب کو حوصلہ دلانے کی کوشش تو کی مگر ملک صاحب کے ساتھ ساتھ میری بھی چھٹی حس معاملہ کی تہ کو چھو چکی تھی اس لئے یہ ساری کوشش طفل تسلی سے بڑھ کر نہ تھی۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ کہاں اور کس حال میں ہو رہا تھا اور ہم اس

صورت حال سے سزائے موت کی کوٹھڑی میں سلاخوں کے آر پار سے جنگ کر رہے تھے۔ میں نے ملک صاحب سے کہا کہ آپ اپنے کمرے میں چل کر بیٹھیں ہم کسی سپاہی کو گھر بھجوا کر پتہ کرواتے ہیں۔ اس کے بعد نماز مکمل کر کے ابھی بیٹھا ہی تھا کہ کسی سپاہی نے آ کر یہ اندوہناک خبر سنادی کہ ملک صاحب کی اہلیہ فوت ہو گئی ہیں، اِنّا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون۔

اس پر فوری طور پر میں نے رانا صاحب کو بتایا اور برادرم حاذق صاحب سے بھی رابطہ کیا۔ انہوں نے آ کر بتایا کہ ملک صاحب کو ابھی گھر لے جا رہے ہیں اور پہلے جو پیغام آیا تھا وہ دراصل اس غم کے برداشت کرنے کے لئے انہیں تیار کرنے کے لئے تھا وگرنہ یہ واقعہ تو پہلے کا ہو چکا تھا۔ بہر حال چند منٹ میں ملک صاحب گھر پہنچ گئے کیونکہ جیل کے قریباً سامنے ہی تو گھر تھا۔ اِدھر پس دیوارِ زنداں میں سوچ رہا تھا کہ آپ گھر تو گئے مگر ایسے وقت میں جب کہ نہ صرف غم اور ماتم کا ماحول ہوگا بلکہ حسرت کی پرچھائیاں بھی ہر طرف ہوں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے پورا ایمان اور یقین ہے کہ اپنی پوری شدت کے باوجود یہ غم، یہ دکھ، یہ رنج اور حسرت آمیز ماحول راہِ مولیٰ میں قربانی کے جذبہ کے باعث کامل سکون اور اطمینان سے معمور ہوگا اور راہِ مولیٰ میں جدائی کے اِس عالم میں یہ وفات اللہ تعالیٰ کے حضور شہادت کا بلند مرتبہ لئے ہوئے ہوگی۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ۔

اس کے بعد ہمارا باہر اور اندر مسلسل رابطہ رہا اور ہم جنازہ اور تدفین کی خبروں سے باخبر رہے اور جب ملک صاحب اُسی شام واپس آئے تب بھی ہمیں پتہ تو چل گیا تھا لیکن اُس وقت اُن کے پاس جانا ممکن نہ تھا اس لئے اگلے روز 9 /اپریل کو صبح سویرے خصوصی اجازت اور انتظام کے ساتھ رانا صاحب کو لے کر محترم ملک صاحب کے پاس ان کے وارڈ میں تعزیت کے لئے گیا جہاں تھوڑی دیر ہم بیٹھے رہے اور باہمی دکھ سکھ کی باتیں ہوئیں۔ پھر ہماری نگرانی پر مامور وارڈر نے پندرہ منٹ بعد واپس چلنے کے لئے کہنا شروع کر دیا تو ہم واپس آ گئے۔ اس کے بعد سارا دن ملک صاحب کے ساتھ ہونیوالے اس حادثہ کی وجہ سے ذہن منتشر رہا، بے چینی اور بے قراری رہی۔ اگلے روز ملک صاحب ہمارے پاس آ گئے کیونکہ ہمارے لئے تو ان کے ہاں بار بار جانا ممکن نہ تھا۔ موصوف دیر تک ہمارے پاس بیٹھے اپنی اہلیہ کی یاد میں باتیں کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے رہے۔ آخر 45 سال تک اکٹھے زندگی گزاری تھی اور ہر قسم کے حالات میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا مگر وقتِ رخصت آپ پاس نہ تھے۔ اس اعتبار سے یہ بہت بڑی جذباتی قربانی تھی اور کڑے امتحان کا وقت تھا جسے محترم ملک صاحب نے کمال صبر سے گزارا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مرحومہ کو اپنی رضا کی جنتوں میں جگہ عطا فرمائے اور جملہ لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق دے، آمین۔

اس موقع پر میں یہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ زمانہ کیسا خودغرض اور لالچی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ میں اُس روز بس انہی سوچوں میں گم تھا اور یہ ایک طبعی امر تھا۔ گو میری ملک صاحب سے کوئی جسمانی رشتہ داری نہیں جو میں ان کی اہلیہ محترمہ کی وفات پر غمگین ہوتا مگر کسی نے کہا ہے کہ رشتہ سے زیادہ رویہ کی اہمیت ہوتی ہے چنانچہ دواڑھائی سال سے بالکل ایک ہو کر رہنے کی وجہ سے ایک غیر معمولی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے میں بہرحال پریشان تھا اور یہ پریشانی قدرتی اور طبعی تھی جبکہ اس کے برعکس جیلرز کو ان جذباتی کیفیات سے کوئی سروکار نہ تھا اور عین اس عالم میں بھی انہیں اپنی ہی پڑی ہوتی۔ چنانچہ جب میں غم کی اس کیفیت میں بیٹھا سوچوں میں گم تھا تو ایک جیلر میرے پاس آیا۔ اسے میں نے بتایا بھی کہ ہمارے ہاں یہ سانحہ ہو گیا ہے مگر اس کے باوجود چند لمحوں بعد مجھے اپنے مخصوص للچائے ہوئے انداز میں پوچھنے لگا کہ گوجرانوالہ سے ملاقات کب آئی تھی؟ (یاد رہے کہ اس قسم کے سوالات سے ان کی مراد ملاقات پر آنے والی اشیاء یا پیسوں سے ہوتی ہے) اس پر میں نے اسے شرم دلانے کی کوشش تو کی مگر کہاں!

## محترم عزیز الرحمٰن صاحب منگلا کی وفات

18 جولائی 1987ء کو خاکسار کے میدان عمل کے اولین استاد بزرگ مربی سلسلہ محترم عزیز الرحمٰن صاحب منگلا کی وفات کی خبر ملی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ موصوف خدا رسیدہ اور مجذوب لوگوں میں سے تھے۔ بچوں سے انتہائی شفقت کرنے والے، ہر قسم کی محفل کو کشتِ زعفران بنا کر رکھ دینے والے بزرگ تھے۔ علمی لحاظ سے بھی اِنتہائی بلند پایہ شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے تھیلے میں ہر وقت کوئی نہ کوئی کھانے پینے کی چیز رکھی ہوتی۔ کبھی مٹھائی، کبھی پھل اور کبھی انڈے۔ بہت پہلے کی بات ہے جلسہ سالانہ پر ہماری ڈیوٹی لنگر پرہیزی پر ہوتی اور موصوف بھی وہیں سامنے کوارٹرز تحریک جدید میں ٹھہرے ہوتے، آپ صبح سویرے تشریف لاتے اور چاول تقسیم کرنے والی کھڑکی کے سامنے آ کر تقسیم کرنے والے کو کبھی دہی سے بھرا ہوا برتن پکڑاتے اور کہتے کہ اسے خالی کر کے چاول ڈال دو۔ کبھی پراٹھے پر فرائی انڈہ دھرا ہوتا تو کبھی کچھ اور چیز اور یہ سب کچھ ہم سے ازراہ تفنن کرتے۔

یہ تو تھیں ان کے لطیف مزاج کی چند جھلکیاں۔ میں ان کے جذب وسلوک کا اس وقت زبردست قائل ہوا جب تخت ہزارہ ضلع سرگودہا میں بطور مربی متعین تھا اور موصوف حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب صدر مجلس انصاراللہ مرکزیہ کی وہاں آمد کے سلسلہ میں بحیثیت مربی ضلع سرگودھا پہلے سے تشریف لا چکے تھے۔ اِس موقع پر مخالفین کی طرف سے شدید شورش برپا کی گئی۔ نوبت بائیکاٹ سے ہو کر پولیس حکام تک جا پہنچی۔ جنہوں نے وہاں آ کر نصیر پور خورد کی مسجد کی سنگِ بنیاد رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ ایسے حالات کی وجہ سے میں شدید پریشان ہوا کیونکہ میدان عمل میں کسی بھی شورش کا

یہ میرے لئے پہلا واقعہ تھا۔ اِس سلسلہ میں انتظامات کرنے کے بعد میں اپنے کمرے متصل مسجد احمد یہ تخت ہزارہ میں منگلا صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ مجھے پریشان دیکھ کر آپ چارپائی پر دراز ہو گئے اور اپنی چادر مکمل طور پر اُوڑھ لی۔ چند منٹ بعد کسی قدر پسینہ آلود چہرہ کے ساتھ یکدم اُٹھے اور مجھے نہایت بااعتماد لہجہ اور زوردار آواز و انداز میں تسلی دی اور میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے فرمانے لگے 'اوالیاس! فکر نہ کر، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔' منگلا صاحب کا یہ انداز کچھ اس قدر مؤثر تھا کہ میرے دل اور دماغ اور سارے جسم میں اعتماد کی لہر دوڑ گئی۔ میں تھوڑی دیر بعد یہاں سے نصیر پور چلا گیا جہاں حضرت میاں صاحبؒ کی آمد اور جلسہ کا پروگرام پہلے تھا۔ چنانچہ اُس روز کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ منگلا صاحب واقعی پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ سارے پروگرام غیر معمولی کامیابی کے ساتھ منعقد ہوئے اور افراد جماعت کے لئے ہی ایمان افروزی کا موجب نہیں بنے بلکہ علاقہ بھر میں جماعت اور حضرت میاں صاحبؒ کے خطاب کی ڈھوم مچ گئی، الحمدللہ۔ مجھے وہ نظارہ کبھی نہیں بھول سکتا جب حضرت میاں صاحب کی گاڑی نصیر پور پہنچی تو ہم سو ڈیڑھ سو افراد جماعت دو رویہ کھڑے استقبال کر رہے تھے۔ اُس وقت منگلا صاحب سڑک کے درمیان ٹہلتے ہوئے یہ اَشعار تمام احباب سے کہلوا رہے تھے کہ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ    وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعَا لِلّٰہِ دَاعِی

آپ نے اِن اشعار کی مشق گزشتہ رات یہاں پہنچنے کے بعد ہی شروع کروا دی تھی۔ آپ کی اقتداء میں پڑھے جانے والے اِن پیار بھرے اَشعار سے فضا گونج اٹھی تھی اور اِس قدر رُوح پرور سماں بندھ گیا تھا کہ بیان سے باہر میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

### عید الاضحیہ اور خطبہ الہامیہ

آج 6 اگست 1987ء کو عید الاضحیٰ کا مبارک دن تھا جس کی اِبتداء نماز تہجد سے کی۔ نماز فجر کے بعد گنتی کھلنے پر ہمہ تن مصروف ہو گیا کیونکہ آج بہت سے کام بیک وقت اور تیزی سے کرنے تھے۔ ناشتہ کی تیاری، اپنے سیل کی صفائی اور سیٹنگ اور اپنی تیاری۔ آج ناشتہ بھی کچھ زیادہ تیار کرنا تھا چنانچہ سویاں پکائیں، ساتھ ہی دوسری انگیٹھی پر چائے تیار ہو رہی تھی اور اِدھر میرے سیل میں صفائی ہو رہی تھی، میں کچن سے فارغ ہو کر آیا تو فرش سوکھ چکا تھا۔ پھر مہمانوں کے لئے فرش لگایا، اس کے بعد غسل کر کے کچھ قیدیوں کو بلایا اور ایک ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ فارغ ہو کر باہر نکلا تو نماز عید کے لئے ہمارے دیگر ساتھی آ چکے تھے۔ چنانچہ کنڈم وارڈ کی پہلی چکی میں صفائی کروا کر نماز عید ادا کی۔ یہاں پنکھا لگا ہوا تھا اس لئے بڑے سکون کے ساتھ نماز عید ہوئی۔ اس دفعہ میں نے خطبہ عید میں 'خطبہ الہامیہ' کا تفصیل سے تذکرہ کیا اور اس

کے متعلق ضروری معلومات اور کوائف اپنے ساتھیوں کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد خطبہ الہامیہ کے نفس مضمون سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس عید کی اصل روح اور غرض اپنی خواہشات اور دُنیوی آلائشوں کے گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بھی دراصل یہی قربانی عنداللہ مقصود تھی گویا ؎

عمر میں اک بار مرنا یہ تو کچھ مشکل نہیں   دن میں سو سو بار مرنا کام ہے ابرار کا

نمازِ عید کے بعد ہم اپنے سیل میں آ گئے جہاں کچھ دیر محفل جمی رہی پھر باقی دوست چلے گئے تو ہم دونوں یہاں رہ گئے چنانچہ ہم آنے جانے والے عام قیدیوں و ملازموں سے میل ملاقات میں مصروف رہے اور یہی کچھ ہمارے بس میں تھا!

## ایک منذر خواب

14 اگست 87ء کی صبح آنکھ کھلی تو ذہن خوفناک صورت حال سے دوچار تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ نانی جان کی وفات ہوگئی ہے اور ماموں صاحبان سے تعزیتی ملاقات کر رہا ہوں اور آہستہ آہستہ ایک نسبتاً اونچی جگہ رکھی گئی چارپائی کی طرف بڑھتا ہوا وہاں پہنچتا ہوں تو نانی جان معمول کے کپڑے پہنے ہوئے لیٹی ہیں اور میرے وہاں پہنچتے ہی کچھ باتیں کرتی ہیں اور کچھ اشارے، تاہم ماحول سوگوار ہے اور سبھی رو رہے ہیں۔

اس نظارے نے بہت تشویش اور فکر میں ڈال دیا۔ اس سے پہلی رات بھی ایک خواب دیکھا جس میں ماموں عبدالباسط صاحب میرے پاس شام کے وقت جیل میں آتے ہیں اور آ کر ٹوکری سے قربانی کا گوشت نکال کر دیتے ہیں۔ ایک بڑے ٹکڑے پر زبان ایسے وندانے دار تہ ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر پوچھتا ہوں کہ کیا اس دفعہ بڑی قربانی کی تھی تو جواب دیتے ہیں نہیں بکرے کا ہی گوشت ہے۔ بس اس کے بعد یہ نظارہ ختم ہو جاتا ہے۔ صبح اُٹھ کر صدقہ دینے کا پروگرام بنایا، باہر پیسے بھجوا کر سری دینے کا ارادہ کیا مگر ایسا نہ ہو سکا جس پر یہیں کسی غریب کو پیسے دے دیئے۔ اللہ تعالیٰ ان منذر خوابوں کے بُرے اثرات سے محفوظ رکھے۔ سب بزرگوں اور عزیزوں کو صحت اور عافیت والی لمبی عمریں عطا فرمائے۔ آمین۔

# سنٹرل جیل ملتان میں ایام اسیری

فرعونِ وقت کی طرف سے ہماری زندگیوں سے کھیلنے کی کوشش اوراس پر عدالت عالیہ کے حکم اِمتناعی کے بعد ہمارے معمولات پھر سے ایک رَو میں بہنے لگے تھے اور ہماری فائلیں سرد خانہ میں ڈال دیئے جانے کے اشارے ملنے سے یہ سفر طویل سے طویل تر نظر آنے لگا تھا۔ چنانچہ اس دوران مصروف رکھنے کی خاطر ابا جان نے مجھے ایف اے کے امتحان کے لئے تیاری کروانی شروع کردی تھی۔ میرا داخلہ جانے کے بعد مجھے امتحان دینے کے لئے سنٹرل جیل ملتان جانا تھا کہ ساہیوال کا علاقہ ملتان کے تعلیمی بورڈ میں آتا تھا اور اُن دنوں کسی بھی بورڈ کے علاقہ کی جیلوں کا امتحانی مرکز اُس بورڈ کے شہر میں واقع جیل میں ہی بنایا جاتا تھا۔

ہر چند کہ میں نے امتحان کی تیاری تو کئی مہینوں سے شروع کر رکھی تھی مگر اس میں یکسوئی میسر نہ تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہاں کے مخالفانہ حالات تھے جو خوامخواہ پریشان کرنے کے لئے پیدا کئے جاتے اور دوسرے یہ کہ ملتان جانے کی غیر یقینی صورت حال! چنانچہ سال 1988ء کا آغاز ہوا تو میں نے سوچا کہ اب کوشش کر کے ملتان چلے جانا چاہیے تا کہ وہاں پوری توجہ سے امتحان کی تیاری ہو سکے۔ اس کے لئے محترم میاں خالد مسعود صاحب نے کوشش کی جس کے نتیجہ میں ماہِ فروری کی ایک شام مجھے ساہیوال سے ملتان کی سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس سے قبل دورانِ حوالات ہم سب اسیر ساتھی ملتان کی ڈسٹرکٹ جیل میں تین ماہ گزار چکے تھے، اِس اعتبار سے یہاں کے موسم کا کسی حد تک اندازہ تھا۔

## سنٹرل جیل ملتان کی سزائے موت وارڈ

سنٹرل جیل ساہیوال سے روانہ ہونے کے بعد ہمارا قافلہ رات دس بجے کے قریب سنٹرل جیل ملتان پہنچا۔ ڈیوڑھی میں سپرداری اور تلاشی کے مراحل سے گزرنے کے بعد مجھے سزائے موت وارڈ پہنچا دیا گیا۔ یہاں کسی قیدی کے آنے کی خبر سن کر چکیوں میں بند قیدی باہر جھانکنے لگے کہ کون لایا گیا ہے! اِسی دوران ایک چکی میں سے مانوس قسم کی آواز آئی کہ اسے ہمارے ساتھ بند کر دیں۔ یہ قیدی ساہیوال سے میرا واقف نکل آیا گویا ہمارے تعلقات کا دائرہ ایک جیل سے دوسری جیل تک وسیع ہو چکا تھا۔ میں نے بھی اُسے پہچان کر اس کی چکی میں بند ہو جانے پر رضامندی ظاہر کردی۔ میں اندر گیا تو اس پرانے ساتھی سے ملا، حال واحوال دریافت کئے اور اپنی شانِ نزول بتائی۔ ان سے اُس وقت جو تواضع ہو سکی انہوں نے کی اور اس کے بعد ہم سونے کے لئے لیٹ گئے۔ میرا سارا سامان ابھی ڈیوڑھی میں ہی تھا تا ہم گزارے کے لئے بستر میسر آ ہی گیا۔

چند گھنٹے سونے کے بعد ہم اُٹھے اور نماز فجر سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ایک قیدی منشی تیزی سے اُڑدی سناتے ہوئے گزر گیا۔ میں ابھی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں ہی تھا کہ تالے اور دروازے کھلنے کی آوازیں آنے لگیں اور اس کے ساتھ منہ اندھیرے نفسانفسی کے عالم میں قیدیوں کے بھاگنے دوڑنے کے منظر نے مجھے حیران کر دیا کہ انہیں اس وقت اور اتنی جلدی کیا ہوا ہے؟ میرے ساتھیوں نے بتایا کہ گھبراؤ نہیں، یہاں اُڑدی اسی وقت اور اسی طرح لگتی ہے۔ اس پر میں نے بھی اپنا تھیلا اُٹھایا اور باہر نکل آیا۔ چونکہ میرا نام ابھی یہاں درج نہ ہوا تھا اس لئے مجھے اُڑدی نہ سنائی گئی۔ میں باہر کھڑا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا کہ چھوٹے قد کے ایک باوردی صاحب آئے اور انہوں نے مجھے پوچھا کہ آپ آئے ہیں گزشتہ رات؟ میں نے بتایا تو انہوں نے کہا کہ سردست آپ کسی بھی چکی میں بند ہو جائیں، آج کسی وقت آپ کی پکی گنتی ڈال دی جائے گی۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ میرے یہاں کھڑے کھڑے چند منٹوں میں سب قیدی اپنی اپنی چکی میں جا چکے ہیں اور سب چکیوں کو تالے لگنے لگے ہیں تو میں نے پوچھا کہ ٹہلائی کیا ہوئی؟ اس پر مجھے بتایا گیا کہ یہاں ٹہلائی نام کی کوئی سہولت نہیں ہے۔ مجھے بہت حیرانی ہوئی مگر جلد ہی سمجھ گیا کہ:

ہر جیلے 'را رسم و راہے دِگر است!

## مختلف نوعیت کی چکیاں

دن چڑھا تو یہاں کے ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہاں کی سزائے موت وارڈ کی چکیاں ساہیوال کی نسبت مختلف اور بہت باسہولت تھیں۔ ہر چکی سامنے سے قریباً تین میٹر چوڑی تو پیچھے کی طرف آٹھ میٹر تک لمبی تھی جسے ایک دیوار بنا کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور اُس دیوار میں قریباً ایک میٹر کا در کھلا رکھا گیا تھا۔ سامنے والے حصہ میں قیدی اپنا وقت گزارتے تو پچھلے حصہ میں ان کا سامان اور پانی وغیرہ ہوتا۔ یہیں ایک کونے میں بیت الخلاء بھی تھا جو فلش سسٹم پر مشتمل تھا اور یہ سہولت سب سہولتوں سے بڑھ کر تھی! یہیں ایک کُھرا تھا جسے غسل خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ اس جگہ کو باقی کمرے سے علیحدہ کرنے کے لئے آدھا میٹر اونچا اور اتنا ہی چوڑا مگر لمبائی میں تین میٹر ایک تھڑا سا بنایا گیا جس کے اوپر قیدی پانی کے گھڑے رکھ لیتے۔ اس لحاظ سے یہ جگہ ساہیوال کی نسبت بہت اچھی لگی کہ یہاں بہت حد تک باپردہ بیت الخلاء تھا اور وہ بھی فلش سسٹم والا! چونکہ یہ چکیاں اچھی خاصی بڑی تھیں اسی لئے یہاں ساہیوال والی ٹہلائی کی سہولت نہ تھی لیکن باہر کی ہوا اور فضا تو باہر کی ہی ہوتی ہے!!

سورج نصف النہار کی طرف رواں دواں تھا کہ مجھے اسی وارڈ کے آخر پر ایک چکی خالی کروا کر اس میں بھیج دیا گیا۔ وارڈ کی آخری چکیاں بی کلاس اور غیر معمولی نوعیت کے قیدیوں کے لئے تھیں جہاں دو اُور بھی بی کلاس یافتہ قیدی تھے۔

مجھے یہاں بند ہونے کے بعد نسبتاً آرام کا احساس ہوا کیونکہ ایک تو یہ صاف ستھری اور پختہ تھی، دوسرے اتنی بڑی تھی کہ ٹہلائی کی سہولت نہ ہونے کے باوجود اس کے اندر ہی بآسانی ٹہلائی کی جاسکتی تھی اور تیسرے یہاں فلش سسٹم تھا اور چوتھے اپنا سارا سامان بھی اندر ہی تھا اور کھانا پکانے کا انتظام بھی! میز کرسی کے علاوہ یہاں چارپائی بھی دے دی گئی تھی جو سزائے موت کے حوالہ سے ایک حیران کن بات تھی۔ ان تمام امور کے باعث یہاں وقت نسبتاً پرسکون گزرتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ملتان کی گرمی کا خوف تھا مگر وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جاتا رہا کیونکہ ایک تو یہاں کی چھتیں اونچی تھیں اور دوسرے ان چکیوں کا طرزِ تعمیر ایسے طور پر تھا کہ دھوپ اندر آنے نہ پاتی۔

## اردگرد کے ساتھی

اپنی چکی میں سنبھلنے کے بعد میں نے اردگرد کا جائزہ لیا تو علم ہوا کہ میرے علاوہ جو دو بی کلاس قیدی ہیں ان میں سے ایک تو ملتان شہر کے ہی نوجوان ہیں اور ایم اے کے طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسیات کے میدان کے بھی دعویدار ہیں جبکہ دوسرے صاحب کبیر والا کے کسی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے والے نسبتاً بڑی عمر کے ہیں۔ ان کے ساتھ علیک سلیک اور تعارف ہوا اور پھر آئندہ چار پانچ ماہ تک ان سے قریبی تعلق رہا۔ ان کے علاوہ ان آخری چکیوں میں بعض ایسے قیدی بھی تھے جنہیں مختلف وجوہات کی بناء پر اکیلے اکیلے رکھا گیا تھا۔ ان میں بعض بھارتی شہریت رکھنے والے سزائے موت یافتہ قیدی بھی تھے جو لمبے عرصہ سے جاسوسی کے الزام میں قید تھے۔ ان میں سے ایک قیدی مسلمان ہوجانے کا بھی دعویدار تھا اور اس نے اپنا نام ابراہیم رکھا ہوا تھا۔ وہ نماز و قرآن پڑھتا اور جب بھی میرے ساتھ اس کی چکی ہوتی تو اپنا دکھ سکھ کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے بڑے درد سے کہنے لگا کہ میں دل سے مسلمان ہو چکا ہوں مگر یہ لوگ مجھے مسلمان نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ سزا سے بچنے کے لئے مسلمان ہوا ہوں۔ تاہم بعض لوگ اس کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتے تھے لیکن ابھی 2009ء کے آغاز کی بات ہے کہ ایک روز ٹی وی پر خبر دیکھی کہ ایک بھارتی قیدی کشمیرا سنگھ کو بڑے اہتمام کے ساتھ ہندوستان کے سپرد کیا گیا ہے۔ میں نے اس سپردِ ہند کئے جانے والے کی شکل دیکھی تو چہرہ شناسا لگا۔ میں نے غور سے دیکھا اور اس کے ساتھ آنے والی تفصیل پڑھی تو یہ شخص وہی ابراہیم تھا جو میرے ساتھ ملتان جیل میں رہا تھا اور مجھے قسمیں کھا کھا کر کہا کرتا تھا کہ میں دل سے مسلمان ہو گیا ہوں مگر اب اُس نے اپنے وطن واپس پہنچتے ہی بلکہ سرحد پار کرتے ہی اعلان کر دیا کہ اس نے قطعاً کوئی مذہب تبدیل نہ کیا تھا۔

## افسرانِ جیل

سنٹرل جیل ملتان میں اُس وقت سپرنٹنڈنٹ جناب محمد حسین چیمہ صاحب تھے۔ سیالکوٹ کے رہنے والے یہ صاحب

ایک بہت اچھے انسان تھے۔ ان کا رویہ اور انداز عام جیلرز کے برخلاف ملائمت والا تھا۔ قیدیوں کے ساتھ تمیز سے مخاطب ہوتے اور بے جا سختی نہ کرتے جبکہ ان کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ان کے برعکس مزاج کے حامل تھے اور سزائے موت سیکشن کے انچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تو گویا ہلاکو خان ہی تھے۔ ان کا نام ہی سنتے کیا قیدی اور کیا ملازم سبھی کانپنے لگتے۔ یہ صاحب لمبے عرصہ سے اس سیکشن کے انچارج چلے آرہے تھے اور انہوں نے یہاں خوب رعب داب کے ساتھ انتظام سنبھالا ہوا تھا جس کی وجہ سے اعلیٰ انتظامیہ انہیں یہاں سے تبدیل بھی نہ کرتی۔

اِنتظامیہ میں سے میرے لئے سب سے اہم اور محترم شخصیت ایک احمدی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل کی تھی جو دو سال قبل جب ہم ڈسٹرکٹ جیل میں رہے تھے تب موصوف اسی سنٹرل جیل میں ہیڈ کلرک تھے اور اب ترقی ہو جانے کے بعد اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے۔ موصوف نہایت شریف النفس اور بے ضرر انسان تھے۔ ان کی شرافت کا اس امر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی ترقی ہونے پر انہیں یہاں سے تبدیل نہیں کیا گیا اور بعد میں بھی جب کبھی ان کے تبادلہ کے احکام جاری ہوئے، سپرنٹنڈنٹ نے خود کوشش کر کے ان کا تبادلہ رُکوا لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں اِسی جیل سے ملحق خواتین کی بھی جیل تھی جس کی انچارج اگرچہ ایک خاتون ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہوتی مگر جب کبھی اُسے رخصت پر جانا ہوتا تو اس کی جگہ مردانہ جیل کے کسی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو عارضی انچارج بنایا جاتا۔ اِس مقصد کے لئے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو اِن احمدی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سے بہتر اور قابل اعتماد کوئی اور نظر نہ آتا چنانچہ ایسی صورت میں ہمیشہ آپ کو ہی یہ ڈیوٹی دی جاتی اور اسی ضرورت کے پیش نظر آپ کا یہاں سے تبادلہ بھی نہ ہونے دیا جاتا۔ یہ تھی ایک احمدی کی شان اور یہ تھا وہ انقلاب جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو قبول کرنے کے نتیجہ میں برپا ہوا۔

آپ کی شرافت اور دیانتداری کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ آپ نے اپنی ڈیوٹی مستقل طور پر بطور نائٹ آفیسر مقرر کروا رکھی تھی۔ اس طرح سے آپ جیل میں ہونے والی ہر قسم کی بدعنوانیوں سے بچے رہتے جو کہ اکثر دن کے وقت ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ آپ رات کو گشت شروع کرتے تو میرے پاس آجاتے اور دیر تک کھڑے رہتے۔ حال واحوال پوچھتے، ضروریات کا جائزہ لیتے اور اس طرح سے دیگر عملہ کو بھی ایک پیغام مل جاتا کہ اس قیدی کو پوچھنے والا کوئی ہے! میری یہاں اسیری کے دوران آپ ہی نہیں بلکہ آپ کی اہلیہ اور بچوں نے بھی میرا بے حد خیال رکھا۔ مجھے ہر روز آپ کے گھر سے کھانے کے ساتھ تازہ اور خالص دودھ آتا۔ موسم گرما کے پیش نظر لسّی اور برف بھی باقاعدگی کے ساتھ آتی۔ یہ سب کچھ آپ کے اردلی کے ذریعہ مجھے بآسانی پہنچ جاتا۔ 1988ء کا رمضان مجھے یہیں گزارنے کا موقع ملا اور ان سہولتوں کی وجہ سے بڑے مزے سے گزارا۔ رمضان کے بعد عید الفطر آئی تو اگرچہ اب کی بار میں اکیلا تھا مگر مکرم چوہدری صاحب

نے کسی قسم کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ صبح عید کا کھانا بھجوایا پھر عید پڑھ کر سیدھے میرے پاس آئے اور سارا دن کچھ نہ کچھ بھجواتے رہے۔ آپ کے علاوہ امیر جماعت ملتان مکرم ڈاکٹر شفیق احمد صاحب نے بھی ہر طرح سے خیال رکھا۔ اسی طرح چوہدری عبدالرحیم احمد صاحب تو ہر جگہ پہنچتے تھے اور یہاں بھی کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ محترم پروفیسر مبارک مجوکہ صاحب کا ذکر خیر الگ باب میں ہے جنہوں نے امتحان کی تیاری کروانے میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ اپنا کردار ادا کیا۔ لاہور سے مکرم میاں خالد مسعود صاحب بھی باقاعدگی سے ہر ماہ تشریف لاتے رہے اور ریل گاڑی کی سب سے نچلی کلاس میں سفر کر کے آتے کہ ہم اسیران کی تکلیف کا انہیں احساس ہو۔ اللہ تعالیٰ ان سب مہربان اور شفیق بزرگان کو نہایت اعلیٰ جزاء عطا فرمائے اور نیکی وتقویٰ کی نہریں ان کی نسلوں میں دور تک جاری فرمائے، آمین۔

## ایک تلخ واقعہ کی یاد

یوں تو چھوٹے چھوٹے واقعات جیل کی زندگی کا لازمہ اور معمول تھے مگر بعض اوقات یہی واقعات بڑی خوفناک شکل اختیار کر جاتے۔ ایسا ہی ایک واقعہ یہاں بھی ہوا۔ بڑے صاحب کے ہفتہ وار دورہ والے دن جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان ہو چکا ہے، ہر طرف خوب صفائیاں اور تیاریاں ہوتی تھیں۔ اسی کے مطابق ایک روز جب ہماری وارڈ کا دورہ تھا، میں بھی اپنی چکی میں تیاری میں مصروف تھا اور اِس قدر مصروف رہا کہ مجھے وقت کا اندازہ ہی نہ رہا۔ اُس روز ایک تو وقت کا اندازہ نہ رہا اور دوسرے دورہ بھی عین وقت پر شروع ہو گیا جبکہ عام طور پر دیر سے ہی شروع ہوا کرتا تھا۔ اُس وقت مشقتی بھی باہر کاموں میں مصروف تھے اس لئے بھی تسلی تھی کہ ابھی وقت ہے مگر اچانک گھنٹی گھر کے گھنٹہ کی ٹن ٹن فضا میں پھیلی تو ہر طرف سکوت طاری ہو گیا کہ دورہ کے جیل میں داخل ہونے کا یہ اعلان تھا۔ میں نے سوچا کہ جلدی سے نہالوں چنانچہ میں نے چکی کے پچھلے حصہ میں بنے ہوئے غسل خانہ میں جا کر جلدی سے تاری لگائی اور کپڑے پہن کر قمیص کے بٹن بند کرتے ہوئے باہر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھنے لگا تھا کہ دورہ کا جلوس انتہائی تیزی سے چلتا ہوا میری چکی کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ مجھے پریڈ کی حالت میں بیٹھے نہ پا کر صاحب بہادر نے صرف دو لفظ کہے کہ: یہ کیا؟ اور اس کے بعد آخری چکی سے گھوم کر واپس چلا گیا۔

بظاہر عام دنیوی نقطہ نظر سے یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی مگر جیل میں اسے بہت سخت قابل گرفت سمجھا جاتا تھا اور وہ بھی سپرنٹنڈنٹ کے دورہ کے وقت! چنانچہ دورہ کے واپس جاتے ہی میرے ساتھ وہ عمل شروع ہو گیا جو ایسے مواقع پر ہوا کرتا ہے۔ پہلے چھوٹے اہلکاروں نے آ کر پوچھ گچھ شروع کی پھر نسبتاً بڑے افسران آئے اور شام کے وقت مجھے نکال کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے 'حضور' پیش کیا گیا۔ جس نے نہایت سخت تحکمانہ لہجہ میں شراروں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں

نے ہر ایک کو یقین دلانے کی بہتیری کوشش کی کہ محض اور محض غلط فہمی کی بناء پر ایسا ہوا ہے ورنہ میری نیت کسی قسم کی شرارت کی نہ تھی مگر ہر کوئی اسی بات کے پیچھے تھا کہ آج جو شکار قابو آیا ہے، جانے نہ پائے! بہر حال ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے خوب آگ اگل کر جس میں بیڑی لگا کر قصوری چکی میں بند کر دینے تک کی دھمکی بھی شامل تھی، مجھے واپس اپنی چکی میں بھیج دیا اور اس طرح سے اس ڈرامہ کی تکمیل ہوئی۔

اس سارے معاملہ کی خبر ہمارے بزرگ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو ہوئی تو وہ نائٹ آفیسر کی ڈیوٹی شروع کرتے ہی میرے پاس آ گئے اور مجھ سے بڑے جذباتی ہو کر پوچھنے لگے کہ تمہارے ساتھ ان لوگوں نے کوئی بدتمیزی کی ہے؟ میں نے صورت حال کے پیش نظر مثبت رنگ میں ہی تفصیل بتائی تا کہ انہیں ٹھنڈا رکھا جاسکے کیونکہ اگلے ہی لمحہ ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ آج میں عہد کر کے آیا ہوں کہ اگر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہوگی تو میں اپنی نوکری بھی داؤ پر لگا دوں گا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مگر انہوں نے پھر پوچھا کہ کوئی گالی گلوچ تو نہیں کیا؟ میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا کچھ کہتے رہے میں تو اسے جیل کی زندگی کا ایک لازمہ سمجھ کر سنی ان سنی کرتا گیا یوں بھی ہمیں تو تعلیم ہی یہی ہے کہ گالیاں سن کر دعا دو، پا کے دکھ آرام دو! اس پر چوہدری صاحب کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ ورنہ کوئی بعید نہ تھا کہ جماعت کی غیرت میں وہ آج کچھ کر ہی گزرتے!

## جمعدار کی فطرت

ہر کہ در کان نمک رفت، نمک شد کے مصداق جیل میں کام کرنے والے ہر ایک کی فطرت جیل کے رنگ میں رنگی جا چکی ہوتی ہی یعنی ہر کوئی پیسے بنانے کی خاطر کس کس طرح قیدی کو تنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے حتی کہ جمعدار تک بھی! اس کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ ایک روز ہمارے ہیڈوارڈر نے احسان کیا اور جمعدار کو بلایا کہ وہ ہم بی کلاس والوں کی ٹائیلٹ صاف کر دے۔ جب میری چکی سے فارغ ہو کر باہر جانے لگا تو میں نے اسے پانچ روپے کا نوٹ تھما دیا۔ چند لمحوں بعد اس نے میری چکی کا دروازہ دوبارہ کھلوایا اور کہنے لگا کچھ کام رہ گیا تھا چنانچہ وہ اندر گیا اور باہر آ گیا۔ میں نے اس پر غور ہی نہ کیا کہ یہ دوبارہ کیوں آیا ہے اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ کچھ دیر بعد میرے ساتھ والی چکی میں بند حاجی صاحب نے مجھے آواز دی کہ ان کی تو ٹائیلٹ ہی بند ہو گئی ہے، جمعدار صفائی اچھی کر کے گیا ہے کہ پانی کا اخراج ہی بند ہو گیا ہے۔ اس پر میرے ذہن میں وہ سارا نقشہ گھوم گیا جو اس نے میری چکی دوبارہ کھلوائی تھی۔ میں نے حاجی صاحب سے پوچھا کہ اسے آپ نے کچھ دیا بھی تھا؟ کہنے لگے دینا کیا تھا وہ تو اپنی ڈیوٹی پر آیا تھا! میں نے کہا کہ بس یہی وجہ ہے۔ پھر میں نے اپنی چکی کو دوبارہ کھلوانے والی بات بتائی تو ساری بات کھل گئی۔ چنانچہ انہوں نے ہیڈوارڈر

کو بلوایا اور شکایت کی۔ جس پر جمعدار کو دوبارہ لایا گیا جس نے ان کی ٹائیلٹ کو کھولا۔ جب تک موصوف کتنی تکلیف میں رہے ہوں گے، اس کا اندازہ ایسی صورت پیدا کر کے ہی کیا جا سکتا ہے!

## ملکی سیاسی صورت حال

1988ء کے آغاز میں جونیجو صاحب کی حکومت کے بارہ میں خبروں میں تیزی آ گئی تھی کہ اب خطرہ میں ہے۔ اسی دوران اپریل میں اوجڑی کیمپ کا انتہائی خوفناک حادثہ ہوا جو جونیجو حکومت کے لئے آخری دھچکا ثابت ہوا۔ وسیع علاقہ تک پھیلے ہوئے اثرات والے اس حادثہ نے عام لوگوں کے ذہنوں میں ایک عجیب قسم کا انتشار پیدا کر دیا تھا جس کے سدّ باب کے لئے جونیجو صاحب نے ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ میرے ساتھ والی چکی میں بند قیدی مجھے کہنے لگے کہ اب تو اس حادثہ کی وجوہات سامنے آ کر رہیں گی کیونکہ وزیر اعظم نے قوم کے ساتھ بڑے واضح طور پر وعدہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کبھی بھی نہیں ہوگا۔ وہ شرط لگانے پر اُتر آیا۔ میں نے کہا کہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، میں بھی یہاں ہوں، تم بھی یہاں ہو، چند دنوں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا! ہم ابھی اسی بحث میں تھے کہ ایک روز اچانک خبر آ گئی کہ جونیجو صاحب کو انہی کے آقائے ولی نعمت نے گھر بھیج دیا ہے اور بس اِسی میں اوجڑی کیمپ سے لے کر پتہ نہیں کیا کیا لپیٹ دیا گیا اور نئی کہانی شروع ہو گئی جس کا اختتام 17 راگست 1988ء کی سہ پہر ہوا جب اللہ نے گزشتہ گیارہ سالہ دَورِ ظلمت کی صف لپیٹ ڈالی۔

## ایف اے کا امتحان

سنٹرل جیل ملتان میں آمد کا مقصد ایف اے کے امتحان میں بیٹھنا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے قریباً چار ماہ کے قیام کے دوران یہ مقصد بہت اچھے طور پر پورا ہوا۔ اس کے لئے یہاں تیاری کرنے کا جو بہت عمدہ موقع اور سہولت میسر آئی، اُس کی تفصیل علیحدہ باب میں درج کر دی گئی ہے۔ اس طرح سے خاکسار نے ایک اَور جیل کی سیر کر لی جو میرے مشاہدات و تجربات میں اضافہ کا باعث بنی۔

## سنٹرل جیل فیصل آباد میں ایام اسیری

ملتان میں ایف اے کا امتحان دینے کے بعد مجھے واپس ساہیوال بھجوایا جانا تھا۔ اس موقع پر مجھے خیال آیا کہ جب یہاں سے جانا ہی ہے تو کیوں نہ فیصل آباد ڈیرہ ڈالا جائے کہ ربوہ سے ملاقات کے لئے آنے والوں کو تو سہولت ہو۔ چنانچہ میں نے ابا جان سے اس خیال کا اظہار کیا تو انہوں نے بھی اس سے اتفاق کیا اور نظام جماعت کی منظوری سے میری فیصل آباد منتقلی کے انتظامات مکمل ہو گئے تو جولائی 1988ء کے شروع میں مجھے فیصل آباد کی سنٹرل جیل میں پہنچا دیا گیا جو شہر سے باہر جڑانوالا روڈ پر واقع ہے۔ میری بقیہ اسیری کا تمام عرصہ اسی جیل میں گزرا، صرف تین ماہ بی اے کا امتحان دینے کے لئے کیمپ جیل لاہور میں رہا۔ فیصل آباد آتے ہی احساس ہو گیا کہ یہاں آنے کا فیصلہ بالکل درست تھا اور اسی وجہ سے مکرم رانا نعیم الدین صاحب کو بھی یہیں آ جانے کو کہا مگر وہ بہت تاخیر سے آئے۔

### نئی جیل، نیا ماحول، نئے قوانین

فیصل آباد کی یہ جیل پاکستان بننے کے بہت بعد تعمیر ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ اڈیالہ جیل کی طرح جدید ترین تو نہیں تاہم اس کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ نئی جیل تھی کیونکہ اس سے قبل جن جیلوں میں رہ چکا تھا، ان کی نسبت بہت بہتر تھی۔ یہاں لایا گیا تو وہی کہانی نئے سرے سے شروع ہو گئی جو کسی بھی جیل میں جانے کے بعد ہوتی رہی تھی۔ چنانچہ یہاں کی بھی ہر بات عجیب سی لگی۔ جب بات کرو تو جواب ملتا کہ یہ سنٹرل جیل فیصل آباد ہے بابا! بہرحال اس نئے ماحول سے مانوس ہونے میں چند دن لگے پھر جلد ہی گاڑی اپنی سابقہ رفتار میں آ گئی اور سفر سہولت کے ساتھ طے ہونے لگا۔

اس جیل کی سزائے موت وارڈ کا نقشہ بالکل ہی مختلف تھا، اس میں مختلف پہرے تھے۔ ہر پہرے میں آمنے سامنے دو وارڈ اور ہر وارڈ کے دو، دو حصے تھے۔ ہر حصے میں چار سیل یعنی چکیاں تھیں۔ گویا ہر پہرے میں کل سولہ چکیاں تھیں۔ ان چکیوں کے سامنے صحن تھے جنہیں سامنے اور اوپر سے مضبوط آہنی سلاخوں سے پوری طرح ڈھکا ہوا تھا۔ گویا چڑیا گھر کا منظر تھا جہاں جانوروں کے لئے ایک کمرا ہوتا ہے اور اس کے سامنے کھلی اور تازہ ہوا اور روشنی میں چلنے پھرنے کے لئے تھوڑی سی جگہ کو سلاخوں کے ذریعہ پنجرہ میں تبدیل کیا گیا ہوتا ہے۔ جانوروں کو تو آزادی ہوتی ہے کہ وہ چاہیں تو کمرے کے اندر رہیں اور چاہیں تو باہر آ کر دھوپ کا مزہ لے لیں مگر یہاں ایسا نہ تھا بلکہ صبح اور دوپہر کے وقت قیدیوں کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے کھولا جاتا اور باقی تمام وقت انہیں اپنے کمروں کے اندر ہی رہنا ہوتا۔ تاہم یہ جیل اور خصوصاً

یہ وارڈ تو بالکل ہی نئی تھی اور مکمل طور پر پختہ تھی نیز اس میں فلش سسٹم کے ساتھ پانی کی سپلائی کا بہت اچھا انتظام تھا جس کی وجہ سے بہت سی تکالیف اور مسائل کا احساس نہ ہوتا۔

یہاں جو چار چار چکیوں کے علیحدہ علیحدہ پہرے بنائے گئے تھے، یہ دراصل ایک لمبے تجربے کے بعد قیدیوں کی طاقت کم کرنے کے لئے ڈیزائن کئے گئے تھے۔ لڑائی جھگڑے، دنگا وفساد، بغاوت اور ہنگامے بھی جیل میں ایک معمول ہیں۔ ایسی صورت میں جیل انتظامیہ کو بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کوشش کی جاتی ہے کہ قیدیوں کو اس طرح رکھا جائے کہ ایسی صورت کم سے کم پیدا ہو۔ لیکن ہر قسم کی احتیاطی تدابیر کے باوجود اس کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے جس کی بنیادی وجہ جیل انتظامیہ کی بدعنوانی اور بددیانتی کے باعث ہونے والی بے انصافی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی جیل میں جہاں اس قدر انتظامات تھے میرے ہوتے ہوئے ایک بار ایسی خوفناک بغاوت ہوئی کہ سرِ شام شروع ہونے والے واقعات پر رات کے تیسرے پہر کہیں قابو پایا جا سکا وہ بھی باہر سے طلب کی جانے والے کمانڈوز کی مدد کے ساتھ۔ اس دوران قیدیوں نے سزائے موت وارڈ کی تمام چکیوں کے تالے اُکھاڑ دیئے، فیکٹری کو آگ لگا دی اور گھنٹی گھر کا سارا ریکارڈ جلا کر بیرکوں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور جب تک وسیع پیمانہ پر باغی قیدیوں کو پکڑ کر اور بری طرح مار مار کر اُدھ موا کر کے قصوری پہروں میں ڈال نہ دیا گیا اور ساری جیل سے کراہنے اور روتے پیٹنے کی آوازیں نہ آنے لگیں، یہ بغاوت فرو نہ ہوئی۔

بات سے بات نکلتی گئی اور میں بہت دور چلا گیا۔ قصہ چل رہا تھا میرے یہاں منتقل ہونے کا! میں یہاں فیصل آباد آیا تو ماحول عجیب سا لگا۔ سارا دن ایک مختصر سی چکی میں پڑے رہنا کیونکہ یہاں ابھی کسی سے واقفیت بھی نہ تھی۔ اوپر سے ایک ظالم قسم کی بیڑی بھی لگی ہوئی تھی جس نے ٹخنوں کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ برسات کے موسم کی وجہ سے یہ زخم کچھ زیادہ ہی تنگ کرنے لگے تھے۔ یہاں سب کچھ پختہ ہونے باوجود باریک قسم کی بھورے رنگ کی کیڑیاں بھی بڑی کثرت سے تھیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں چٹائی پر لیٹا، ذرا سی آنکھ لگی تو ایک دم چیخ مار کر اُٹھ گیا اور مقامِ درد یعنی ٹخنوں پر بیڑی کی وجہ سے ہو جانے والے زخموں کی طرف دیکھا تو ہر ہر زخم سے ان کیڑیوں کی پوری بٹالین چمٹی ہوئی نظر آئی جنہیں ان زخموں سے بآسانی علیحدہ کرنا بھی ممکن نہ ہوتا۔ میں سوچتا کہ قبر میں جب کیڑے ہماری خبر لینے آئیں گے تو کیا صورت ہوگی! بہرحال یہ بھی ایک قبر ہی تھی گو عارضی نوعیت کی ہی سہی! جہاں جیتے جی کیڑے چمٹ رہے تھے۔

## میرے ساتھی اور اژدھی

یہاں مجھ سے پہلے ایک اور قیدی کو بھی بی کلاس ملی ہوئی تھی۔ یہ صاحب جھنگ کے نواب خاندان سے تعلق رکھنے

والے تھے، مذہباً شیعہ تھے مگر عملاً بالکل ہی مست ملنگ، اسی وجہ سے انہیں سب لوگ ''باوا، باوا'' کہتے تھے جبکہ نام ان کا صفدر عباس تھا۔ انہیں جب بھی دیکھا عالم مدہوشی میں دیکھا۔ رات ہوتی تو ان کی چکی سے چرس کی ناک میں دم کر دینے والی بدبو باقاعدگی سے اُٹھتی اور جس روز ہم دونوں کی چکیاں ساتھ ساتھ ہوتیں، اس بدبو کی وجہ سے خاصی تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ موصوف بات بس مشکل سے ہی کرتے، بعد میں پتہ چلا کہ احمدی ہونے کی وجہ سے میرے ساتھ ویسے ہی بات کرنی انہیں پسند نہ تھی۔ ان کے دو اَور بھی بھائی اسی جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے تھے جو ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ اُن میں سے ایک نہایت معقول شخص تھا جس کے ساتھ بعد میں اچھا تعلق رہا، نام اس کا منظر سیال ساری جیل میں معروف تھا۔ یہاں کے دستور کے مطابق بی کلاس قیدیوں کی بھی روزانہ اُڑدی لگتی صرف اس سہولت کے ساتھ کہ انہی چار چکیوں میں انہیں رکھا جاتا جبکہ باقی قیدیوں کی اُڑدی پہرے کے چاروں حصوں میں لگتی۔ میرے آنے کے بعد ہم دونوں کی اُڑدی ایک دوسرے کی چکی میں لگنے لگی۔ اس طرح سے کچھ نہ کچھ سہولت رہتی۔

چند دن بعد پتہ چلا کہ ہمارے اسی پہرے میں دو احمدی بھی ہیں جنہیں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ ان کا تعلق فیصل آباد شہر کے قریبی گاؤں گوکھووال سے تھا۔ محمد صفدر تو سکول کے زمانہ میں اپنا کلاس فیلو بھی رہا تھا اور مکرم چوہدری محمد اسحاق صاحب نمبردار مرحوم کا بیٹا تھا اور ربوہ میں اپنے محلہ دارالصدر جنوبی کے مکرم حوالدار چوہدری بشیر احمد صاحب کا بھتیجا! جبکہ اس کا ساتھی عزیزم محمود احمد گوکھووال کے نہایت شریف اور مخلص دوست مکرم ماسٹر رفیق احمد صاحب کا نوجوان بیٹا تھا! ان کا ایک تیسرا ساتھی چوہدری ناصر احمد بھی تھا جسے عمر قید ہوئی تھی اور وہ اُس وقت ضمانت پر باہر تھا۔ ان تینوں نے مل کر اپنے ایک مخالف کو کچہری بازار فیصل آباد میں قتل کیا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ یہاں تو محض علیک سلیک ہی ہو سکی مگر چند ماہ بعد جب ہماری سزائیں عمر قید میں تبدیل ہو گئیں تو ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے۔

## ملاقاتوں کا سلسلہ

اس جیل میں سزائے موت قیدیوں کی ملاقاتوں کے لئے اسی وارڈ کے ابتدائی پہرے مخصوص تھے جہاں اُن دنوں سزائے موت کے قیدیوں کو نہ رکھا جاتا کیونکہ اب ان کے لئے بالکل جدید قسم کے پہرے تعمیر ہو گئے تھے۔ ان پرانے پہروں کی چکیوں میں اُن قیدیوں کو لا کر بند کر دیا جاتا جن کی ملاقاتیں آئی ہوتیں۔ شروع میں میری ملاقاتیں بھی اسی طریق کے مطابق ہوتی رہیں تاہم جوں جوں واقفیت بڑھتی گئی اور انتظامیہ کو ہمارے حالات کا اندازہ ہوتا گیا سہولتیں میسر آتی گئیں، یہاں تک کہ بعد میں میرے ملاقاتی میری چکی میں ہی آ کر ملاقات کرنے لگے، فالحمدللہ۔

ابھی ملتان جیل میں ہی تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ مؤرخہ 10 جون 1988ء کو لیڈران قوم کے ظلم سے تنگ آ کر مسجد فضل لندن میں اپنے خطبہ جمعہ کے ذریعہ شور محشر مچا چکے تھے یعنی دعاؤں سے معمور مباہلہ کا چیلنج دے چکے تھے۔ اس کی تفصیلات یہاں آنے کے بعد ہی مجھے ملیں اور جب ملیں تو میرے دل میں بھی انتہائی جوش اور ولولہ کی کیفیت پیدا ہوگئی اور میرے دل ودماغ اور جسم وروح میں یہ کیفیت ایسی سرعت کے ساتھ سرایت کر گئی کہ ضیاء الحق کی ہلاکت میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ اس بات کا اس حد تک یقین ہوگیا تھا کہ میں جب بھی ریڈیو لگاتا تو میرے کان اس خبر کے منتظر ہوتے کہ ''نہایت افسوس سے یہ خبر دی جاتی ہے کہ............'' اُن ایام میں جن جن احباب کو خطوط لکھے، انہوں نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور میرے ساتھ اِظہار بھی کیا کہ اتنے جارحانہ خطوط کیوں لکھ رہے ہو؟ میرا جواب یہی ہوتا کہ حضور نے جو مباہلہ کا چیلنج دیا ہے تو اس کا بہت جلد نتیجہ نکلنے والا ہے، اب ہمیں کسی کی پروا نہیں کرنی چاہئے اور کسی سے دَب کر رہنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ مباہلہ کے مضمون پر مشتمل جماعت کی طرف سے تقسیم کئے جانے والے کتابچہ پر پورے پاکستان میں شور مچ گیا۔ اسے تقسیم کرنے کے الزام میں سینکڑوں خدام وانصار کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی اور ان پر مقدمات قائم ہونے اور ان کی گرفتاریاں عمل میں آنے کی خبریں آنے لگیں گویا دشمن دین اپنے ظلم وتعدی اور تکذیب سے باز آنے کی بجائے اپنی شرارتوں میں اور بھی بڑھ گیا تھا اور یہ سب کچھ صدر پاکستان کی ہی اشیر باد سے ہو رہا تھا جسے مباہلہ کے اس چیلنج میں پہلے مخاطب کے طور پر رکھا گیا تھا۔ اِن خبروں سے فرعون وقت کی ہلاکت اور بھی یقینی نظر آنے لگی اور اس کی یہ ظالمانہ کارروائیاں Swan song (آخری کارنامہ) کے طور پر سنائی دینے لگیں اور ایسی ہر خبر آنے پر اللہ کے حضور ہی فریاد بلند ہوتی کہ وہ اپنے فضل سے ہمارے اور ہمارے دشمن کے درمیان فیصلہ فرمادے ؎

عدو جب بڑھ گیا شور وفغاں میں    نہاں ہم ہو گئے یارِ نہاں میں

مباہلہ پر اِس قدر یقین تھا کہ عین 17 راگست 1988ء کو بعد دوپہر میرے بڑے بھائی جان مکرم محمد داؤد منیر صاحب فیصل آباد کے ایک دوست مکرم ڈاکٹر منیر احمد صاحب ابن مکرم ڈاکٹر بشیر احمد صاحب مرحوم آف گگو منڈی کے ہمراہ مجھے ملنے آئے تھے۔ کئی سال بعد جب مجھے لندن آنے کا موقع ملا تو اِسی ملاقات کے حوالہ سے مکرم ڈاکٹر منیر احمد صاحب حال مقیم لندن نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو کس طرح پتہ چل گیا تھا کہ آج ضیاء الحق کی ہلاکت کا دن ہے؟ میں نے تفصیل پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ اُس ملاقات کے دوران انہوں نے مجھ سوال کیا تھا کہ کب تلک؟ جس پر میں نے

بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ بس اب کوئی واقعہ ہونے ہی والا ہے۔ پھر اس ملاقات کے بعد ہم جیل سے جا ہی رہے تھے کہ ضیاء الحق کی ہلاکت کی خبر آ گئی۔

میں نے کہا کہ میرے کہنے کی بنیاد صرف اور صرف حضور رحمہ اللہ کے مباہلہ کا چیلنج ہی تھا، اسی پر یقین کامل تھا کہ حضور نے جو اتنے درد کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں دعائیں کرتے ہوئے یہ چیلنج دیا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ پورا نہ ہو۔ اب اسے اتفاق کہہ لیں یا تقدیر الٰہی کہ میرے منہ سے بھی فیصلہ کن قسم کا فقرہ عین اُس وقت ادا ہوا جب اُس نمرود کے انجام کی سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، فالحمدللہ۔

## جب مباہلہ کا نشان ظاہر ہوا!

اللہ کی شان دیکھئے، مباہلہ کا نشان پورا ہونے کی خبر مجھے عین اُسی طرح ملی جیسے میرا دل چاہا کرتا تھا۔ 17 راگست 1988ء کی شام بھی عام دنوں کی طرح ہوئی۔ معمول کے مطابق کھانا کھایا اور نماز مغرب ادا کی۔ اس کے بعد تسبیحات مکمل کرتے ہوئے کسی خبر سننے کے منتظر کانوں کے لئے ریڈیو لگایا تو اظہر لودھی کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی:

نہایت افسوس اور دکھ کے ساتھ خبر دی جاتی ہے کہ جنرل ضیاء الحق آج سہ پہر بہاولپور سے واپس آتے ہوئے طیارہ کے ایک حادثہ میں اپنے ساتھیوں سمیت جاں بحق ہو گئے..........

پہلے تو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور ایک مرتبہ تو سکتہ طاری ہو گیا پھر اپنے آپ کو سنبھالا دیا کہ مباہلہ کا نشان خدا نے پورا کر دکھایا ہے۔ میں نے اپنے ساتھ والی چکی میں بند قیدی کو یہ خبر دی، اسے بھی یقین نہ آیا مگر چند منٹ میں یہ خبر پورے وارڈ کیا، سارے جیل میں جنگل کی آگ سے بھی زیادہ تیزی سے پھیل گئی اور حیرت کی بات ہے کہ ہر طرف سے خوشی کے ہی نعرے بلند ہو رہے تھے، کسی ایک طرف سے بھی افسوس یا غم کا اظہار نہ تھا۔ یہ بھی مباہلہ کے نشان کا ایک پہلو ہے۔ اس کے بعد رات گئے تک ریڈیو کے ذریعہ خبریں تو سنتے رہے مگر اس عبرت ناک ہلاکت کے واقعہ کی تفصیلات کا علم اگلے روز کے اخبارات سے ہوا جنہیں پڑھنے کے بعد حضور رحمہ اللہ کی نظم ''دو گھڑی صبر سے کام لو ساتھیو!......'' کا یہ شعر آنکھوں کے سامنے گھوم گیا ؎

تم دعائیں کرو یہ دعا ہی تو تھی جس نے توڑا تھا سر کبر نمرود کا
ہے ازل سے یہ تقدیر نمرودیت، آپ ہی آگ میں اپنی جل جائے گی

علاوہ ازیں ان تفصیلی خبروں سے یہ بھی علم ہوا کہ اس ظالم کی ہلاکت لفظاً لفظاً حضور رحمہ اللہ کے اُس پر جلال و پر شوکت پیشگوئی کے مطابق ہوئی جو آپ نے 14 دسمبر 1984ء کو ہالینڈ کی احمدیہ مسجد مبارک میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہوئے کی

تھی۔ اس میں آپؒ نے اس کی جماعت احمدیہ کے خلاف ظالمانہ سرگرمیوں پر کھلے لفظوں میں تنبیہ فرمائی تھی:

"جماعت احمدیہ تو خدا تعالیٰ کے فضل سے ایک والی رکھتی ہے، ایک ولی رکھتی ہے۔ جماعت احمدیہ کا ایک مولا ہے اور زمین و آسمان کا خدا ہمارا مولا ہے لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارا کوئی مولا نہیں ہے خدا کی قسم جب ہمارا مولا ہماری مدد کو آئے گا تو کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ خدا کی تقدیر جب تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کرے گی تو تمہارے نام و نشان مٹا دیئے جائیں گے اور ہمیشہ دنیا تمہیں ذلت اور رسوائی کے ساتھ یاد کرے گی اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام عاشق محمد مصطفیٰ ﷺ کا نام ہمیشہ روز بروز زیادہ سے زیادہ عزت اور محبت اور عشق کے ساتھ یاد کیا جایا کرے گا۔"[1]

## حضور رحمہ اللہ کے خطبات

حضور رحمہ اللہ کے خطبات کی ترسیل خاکسار کو برابر جاری تھی۔ مؤرخہ 31 جولائی اور 12 راگست 1988ء کے خطبات پہنچے تو انہیں پڑھ کر اپنا ایمان اور بھی تازہ ہوا۔ مباہلہ کا چیلنج دینے اور اسے پاکستان میں وسیع پیمانہ پر پھیلانے کے بعد حضور رحمہ اللہ نے 31 جولائی کے خطبہ میں جنرل ضیاء الحق کو مخاطب کرتے ہوئے اس مباہلہ کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے حوالہ سے کچھ وقت دیا تھا کہ عین ممکن ہے کہ دیگر مصروفیات کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ ہو سکی ہو۔ اس کے ساتھ حضورؒ نے فرمایا تھا کہ اگر یہ اپنی ظالمانہ کارروائیوں سے رُک جائے تو بھی ہم اسے توبہ شمار کریں گے مگر 12 اگست کے خطبہ جمعہ میں دوٹوک انداز میں فرما دیا تھا چونکہ ضیاء الحق نے جماعت کے خلاف اپنی کارروائیاں بند کرنے کی بجائے ان میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اس نے ایک لحاظ سے مباہلہ کے اِس چیلنج کو قبول کر لیا ہے۔ اس لئے اب اللہ کی تقدیر اسے ضرور پکڑے گی اور اس کی قہری تجلی لازماً ظاہر ہو کر رہے گی۔ پھر ایک عالَم نے دیکھا کہ مردِ خدا کی اس بات پر اگلا جمعہ نہ آیا کہ اللہ نے فرعون وقت کو دریائے ستلج کے کنارے اِس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہلاک کر دیا کہ اس کا نام و نشان تک نہ رہا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!! 17 راگست 1988ء کو اِس خدائی فیصلہ یعنی جنرل ضیاء الحق اور اس کے تیس ساتھیوں کی ہوائی جہاز میں جلنے کی خبر دنیا بھر کی اخباروں میں شائع ہوئی اور احمدیت کی سچائی کا ریکارڈ دنیا کی اخباروں میں ان الفاظ میں محفوظ ہو گیا۔

Zia Killed In Plane Crash

Islamabad, Aug. 17: President General Mohammad Ziaul Haq died in an air crash

---

[1] خطبات طاہر جلد ۳ صفحہ ۳۳۷

near Bahawalpur Wednesday. According to an official announcement, the plane carrying President Zia and members of his party exploded in mid-air soon after taking off from Bahawalpur airport. The President has gone to Bahawalpur Wednesday morning to inspect some army units in the area. He was accompanied by the Chairman, Joint Chief of Staff Committee, Gen. Akhtar Abdur Rehman, some senior army officers and the United States Ambassador in Pakistan, Arnold Raphel. According to information so far available, there were no survivors. An APP correspondent who visited the site reported that the wreckage of the C-130 plane lay scattered over a large area. (The Daily Muslim Islamabad, 18th August 1988)

اسی طرح خاکسار کے پاس اس واقعہ سے ٹھیک ایک ماہ قبل کا ایک خط محررہ 18.07.1988 موجود ہے جس پر حضور رحمہ اللہ کے مبارک دستخط ثبت ہیں، اس میں حضور نے تحریر فرمایا ہے کہ:

''اسلم قریشی کے ظاہر ہونے کی خبر سے جس رنگ میں آپ نے خوشی کا اظہار کیا اور قہقہہ لگایا، اس کا سن کر بہت لطف آیا ہے، اللہ تعالیٰ سچائی کو جلد ظاہر فرمائے۔ یہ تو ایک نشان ہے، یہ قوم خدا کی قہری تجلی کے بغیر سمجھنے والی نہیں لگتی۔ بہرحال سعید فطرت لوگوں کے لئے یہی نشان کافی ہے۔ احمدیت کے چہرے سے یہ دھبہ اتر گیا ہے، دھبہ لگانے والے خود داغدار ہوئے ہیں اور اپنے زخم چاٹ رہے ہیں''

## مباہلہ کا نشان ظاہر ہونے کے بعد

مباہلہ کے نتیجہ میں جنرل ضیاء الحق کی عبرت ناک ہلاکت کے بعد صدر پاکستان کا عہدہ حسب قواعد سینٹ کے چیئرمین جناب غلام اسحٰق خان نے سنبھالا جبکہ فوج کے سربراہ جناب جنرل اسلم بیگ ہو گئے جو جنرل ضیاء کے نائب تھے۔ انہوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ انتخابات مقررہ وقت پر ہوں گے اور انہیں ہر ممکن طور پر شفاف بنایا جائے گا۔ چنانچہ ستمبر اور اکتوبر کے مہینے باہر کی طرح جیل میں بھی انتخابات کی گہما گہمی میں گزر گئے کیونکہ جیل میں بھی ہر قیدی ایک عظیم سیاسی دانشور بن گیا ہوتا ہے اور اخبارات کے علاوہ ریڈیو بھی بہت سے قیدیوں کے پاس تھے جن سے بحث و مباحثہ کے لئے کافی مواد مہیا ہو جاتا۔ جیل میں ہماری دیگر مصروفیات معمول کے مطابق رہیں اور کسی غیر معمولی دباؤ یا مشکل کے بغیر وقت گزرتا چلا گیا کہ کیا جیل اہلکار اور کیا قیدی سب کی نظریں بس انتخابات پر لگی تھیں۔

## عام انتخابات اور اس کے نتائج

عام انتخابات پروگرام کے عین مطابق اکتوبر 88ء میں ہو گئے جس کے نتیجہ میں قومی سطح پر پاکستان پیپلز پارٹی اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے سامنے آئی۔ جس پر قیدیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ انہیں اسی پارٹی سے توقع تھی کہ ان کے

لئے کچھ کرے گی۔ انتخابات کے بعد چند ہفتے تو حکومت سازی کی تیاریوں یعنی جوڑ توڑ میں گزر گئے کیونکہ قومی اسمبلی کے نتائج کے بعد صوبائی سطح پر ہونے والے انتخابات کے نتائج ذرا مختلف رہے تھے جس کی وجہ سے پیپلز پارٹی کے لئے حکومت سازی میں مشکلات پیدا ہوگئی تھیں۔ بہر حال نومبر کے آخر تک صورت حال واضح ہوگئی تو اسے غلام اسحق خان کو ہی صدر پاکستان قبول کرنے کی شرط پر حکومت سازی کی دعوت مل گئی۔ جس کے بعد پارٹی کی شریک چیئر پرسن بے نظیر بھٹو نے وزیر اعظم پاکستان کے طور پر حلف اٹھایا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ واقعہ ہوا کہ حکومت کی سربراہی کسی خاتون کے سپرد ہوئی ہو۔

## سزائے موت کا عمر قید میں تبدیل ہونا

بے نظیر نے وزیر اعظم کا حلف اُٹھاتے ہی قیدیوں کی سزاؤں میں حیرت انگیز طور پر تخفیف کرنے کا اعلان کر دیا اگر چہ قیدیوں کو اس کا پہلے سے انتظار تھا مگر ان کی توقعات سے بھی کہیں بڑھ کر اُس سے یہ اعلان ہوگیا جس کا سب سے بڑا اور اہم پہلو ملک بھر کی جیلوں میں بند 1800 سے زائد سزائے موت کے تمام قیدیوں کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا جانا تھا۔ قانون کے مطابق تو صرف ایسے قیدیوں کی ہی سزائے موت تبدیل کی جاسکتی ہے جن کے مقدمات تمام عدالتی مراحل سے گزر چکے ہوں اور اُن کی محض رحم کی اپیل صدر پاکستان کے پاس ہو مگر بے نظیر نے شاید اپنے باپ کی سزا کا انتقام لینے کے جوش میں کچھ بھی نہ سوچا اور ایسا اعلان کر دیا جسے واپس لینا بھی مشکل ہوگیا۔ اس طرح سے ہم نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی یہ بات ایک مرتبہ پھر اپنے آپ میں پوری ہوتی دیکھی ۔

عصرِ بیمار کا ہے مرض لادوا، کوئی چارہ نہیں اب دُعا کے سوا
اے غلامِ مسیح الزماں! ہاتھ اُٹھا، موت آ بھی گئی ہو تو ٹل جائے گی

میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ایسا تقدیر الٰہی کے تصرف سے صرف اور صرف ہم چار معصوموں کی خاطر ہوا تا کہ کوئی ایسی صورت باقی نہ رہ جائے جس کا سہارا لے کر ہماری سزا برقرار رکھ سکیں۔ اس طرح سے ہم حدیث قدسی میں وارد الفاظ **اِنَّھُمْ قَوْمٌ لَایَشْقٰی جَلِیْسُھُمْ** (یعنی یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھی بھی محروم نہیں رکھے جاتے) کے بھی مصداق بن گئے۔ اس امر کا یقین کی حد تک مجھے روزِ اول سے اِدراک رہا اور میں نے ڈنکے کی چوٹ اس کا ہر کس و ناکس کے سامنے اظہار بھی کیا۔ چنانچہ ایک روز گوجرہ کا ایک بہت بڑا چوہدری الیاس (اسے بھی اسی اعلان کے ذریعہ کال کوٹھڑی

سے نجات ملی تھی) مجھ سے کہنے لگا کہ سنا ہے کہ تم کہتے پھرتے ہو کہ یہ عام معافی تمہاری وجہ سے ہوئی ہے۔ اُس چوہدری سے اُس وقت تک میرا کوئی زیادہ تعارف نہ تھا تاہم اُس کے رعب داب اور اثر درسوخ کا علم ضرور تھا۔ اس کے سوال پر مجھے اللہ کے فضل سے پوری جرأت کے ساتھ کہنے کی توفیق ملی کہ ہاں بالکل درست ہے۔ میں اس کے ردعمل کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے اس پر خاموشی اختیار کرتے ہوئے اسے تسلیم کیا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ میرے ساتھ بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا رہا۔

یہ بات کہ حکومت سے یہ اعلان جوش میں آ کر ہو گیا اور دراصل اس کے پیچھے تقدیر الٰہی کام کر رہی تھی، میں نے یونہی نہیں لکھی بلکہ بعد کے حالات نے بھی اس کی تصدیق کی۔ سب سے پہلے تو دسمبر کی تین تاریخ کو متذکرہ بالا اعلان ہوا تو اس پر عمل درآمد کھٹائی میں پڑتا گیا۔ کبھی کچھ خبر آتی تو کبھی کچھ۔ تاہم ان خبروں میں یہ حقیقت ضرور تھی کہ صدر پاکستان جس نے حتمی طور پر اس اعلان پر دستخط کرنے تھے، انہیں یہ فیصلہ اور اعلان منظور نہ تھا۔ اس بات کا اظہار انہوں نے اپنی اگست 1990ء کی اُس تقریر میں بھی کیا جو بے نظیر کی حکومت برطرف کرتے ہوئے کی تھی۔ انہوں نے اس تقریر میں بے نظیر حکومت پر لگائے جانے والے الزامات میں اس عام معافی کے اعلان کو بھی شامل کیا کہ اس نے مجھ سے ایسے حکم نامہ پر دستخط کروائے جس کے نتیجہ میں ہزاروں قیدی رہا کر دیئے گئے۔ علاوہ ازیں بے نظیر حکومت برطرف ہونے کے بعد ہائیکورٹ کے ایک فیصلہ کے نتیجہ میں عام معافی کا یہ اعلان جزوی طور پر منسوخ بھی کر دیا گیا اور سینکڑوں قیدی ایک مرتبہ پھر کال کوٹھڑیوں میں ڈال دیئے گئے جنہیں اس اعلان کے ذریعہ سزائے موت سے نجات ملی تھی۔ اگرچہ ہائیکورٹ کا یہ فیصلہ ہم پر اثر انداز نہ ہوا کیونکہ ہمارا مقدمہ خصوصی فوجی عدالت میں سنا گیا تھا اور ہمارا معاملہ پہلے مرحلہ پر ہی تمام سول عدالتوں سے بالا ہو گیا تھا تاہم اس فیصلہ نے جیلوں میں ایک مرتبہ کہرام مچا دیا کہ یک دم سینکڑوں قیدی سزائے موت کی گاڑی پر پھر سے سوار کر دیئے گئے جس کی منزل کا کسی کو کچھ علم نہ تھا۔

سزائے موت کے عمر قید میں تبدیل کئے جانے کا حکومتی اعلان تو دسمبر کے ابتدائی دنوں میں ہو گیا تھا مگر اس کا باقاعدہ سرکاری حکم نامہ 7 دسمبر 1988ء کو جیلوں میں پہنچا۔ چنانچہ قیدیوں کو بتا تو اُسی روز دیا گیا تاہم انہیں ہفتہ عشرہ تک انہی کوٹھڑیوں میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تا کہ ایک تو قیدیوں کی اتنی بڑی تعداد یک دم عام وارڈوں میں منتقل کرنے میں جیل انتظامیہ کو سہولت رہے اور دوسرے یہ کہ یہ قیدی بھی کہیں یک دم خوشی سے اپنے آپ سے باہر نہ ہو جائیں۔ اگرچہ یہ فیصلہ آنے کے کئی روز بعد تک سزائے موت سے نجات پانے والے قیدی انہی کوٹھڑیوں میں رہے مگر انہیں پہلے کی طرح بند نہ رکھا جاتا بلکہ صبح سویرے عام قیدیوں کی طرح کھول دیا جاتا اور وہ اپنے احاطہ کے اندر چلنے پھرنے، میل

ملاقات کرنے میں آزاد ہوتے۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں عام قیدی وارڈوں میں منتقل کر دیا گیا جبکہ ہم بی کلاس یافتہ قیدیوں کو اعلان ہونے کے ایک دو روز بعد ہی بی کلاس قیدیوں کی وارڈ میں بھیج دیا گیا تھا، الحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

اس طرح سے ہماری اسیری کا یہ اذیت ناک دور مکمل ہوا، یہ وقت جتنا تکلیف دہ تھا اُتنا ہی یادگار بھی۔ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

عبداللطیف کے لیے وہ دن جو اس کی سنگساری کا دن تھا کیسا مشکل تھا۔ وہ ایک میدان میں سنگساری کے لیے لایا گیا اور ایک خلقت اس تماشا کو دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ دن اپنی جگہ کس قدر قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اگر اس کی باقی ساری زندگی ایک طرف ہو اور وہ دن ایک طرف تو وہ دن قدر و قیمت میں بڑھ جاتا ہے۔ زندگی کے یہ دن بہر حال گذر ہی جاتے ہیں اور اکثر بہائم کی زندگی کی طرح گذرتے ہیں لیکن مبارک وہی دن ہے جو خدا تعالیٰ کی محبت اور وفا میں گذرے۔[1]

---

[1] ملفوظات جلد ۳ صفحہ ۵۱۶، ۵۱۷

☆ پانچواں باب

# ایامِ اسیری بطور عمر قیدی

- ☆ جیل میں تعلیم القرآن
- ☆ جیل میں تبلیغ
- ☆ سنٹرل جیل فیصل آباد میں
- ☆ بی کلاس کی سہولتوں سے محروم کیا جانا
- ☆ تین ماہ کیمپ جیل لاہور میں
- ☆ ۲۰ چکی کا ماحول اور اس میں مصروفیات
- ☆ مشقت اور بطور اُستاد تقرر
- ☆ کھیلیں اور دیگر مشاغل
- ☆ جیل کیا ہے؟
- ☆ روزانہ ڈائری کے چند یادگار اوراق

اگر کوئی میرے قدم پر چلنا نہیں چاہتا تو مجھ سے الگ ہو جائے۔ مجھے کیا معلوم کہ ابھی کون کون سے ہولناک جنگل اور پُر خار بادیہ درپیش ہیں جن کو میں نے طے کرنا ہے پس جن لوگوں کے نازک پیر ہیں وہ کیوں میرے ساتھ مصیبت اُٹھاتے ہیں۔ جو میرے ہیں وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتے نہ مصیبتوں سے، نہ لوگوں کے سبّ وشتم سے، نہ آسمانی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے۔

(انوار الاسلام، روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۲۳)

# ایامِ اسیری بطور عمر قیدی

قریباً تین سال تک سزائے موت کی کوٹھڑی میں بند رکھے جانے کے بعد محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ پُر اذیت مرحلہ طے کر کے موت کے پنجہ سے ہم نے نجات پائی تو ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہوئے، ایک نئے سفر کا آغاز ہوا، نئے تجربات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک قیدی کی حیثیت سے جیل کی زندگی کو قریبی نظر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس باب میں اسی سرگزشت کا تذکرہ ہوگا۔

## بی کلاس وارڈ

سزائے موت، عمر قید میں تبدیل کئے جانے کا فیصلہ آنے کے ایک دو روز بعد سزائے موت وارڈ کو عام قیدی وارڈ میں تبدیل کر دیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں یہاں مقید قیدیوں پر پہلے والی سختیاں نہ رہی تھیں تاہم انہیں یہاں سے عام بیرکوں میں منتقل چند دنوں بعد ہی کیا گیا تھا۔ خاکسار کی چونکہ بی کلاس تھی اس لئے مجھے فوراً ہی جیل کی بی کلاس وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس موقع پر اسی جیل میں موجود ہمارے ایک احمدی دوست مکرم محمد اسلم دھیڑ صاحب کی معرفت ان کے ایک جاننے والے مکرم صفدر صاحب سے اشتراک ہوگیا جو پہلے ہی بی کلاس وارڈ میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے تھے، اس طرح سے میں ان کا "ہانڈی وال" بن گیا، اسی وجہ سے ابتدائی دنوں میں خاکسار کو کھانے پکانے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی کیونکہ میرے ساتھی کے پاس سارا انظام موجود تھا اور میں بس اس کے ساتھ شامل ہوگیا تھا تاہم جیل میں کسی غیر از جماعت کے ساتھ میرا یہ پہلا اور آخری تجربہ تھا۔ مکرم محمد اسلم دھیڑ صاحب طویل المیعاد قیدی تھے اور اپنی صلاحیتوں کی بناء پر جیل کے ہیڈ نمبردار بن گئے ہوئے تھے بلکہ جیل کی فیکٹری کے عملاً کرتا دھرتا یہی تھے۔ موصوف کا تعلق شیخوپورہ کے ایک گاؤں چک دھیڑ سے تھا اور اپنے ذاتی مقدمات میں اپنے والد مکرم غلام رسول صاحب سمیت متعدد افرادِ خاندان کے ہمراہ جیل میں تھے۔

بی کلاس وارڈ جیل کی ڈیوڑھی کے بالکل سامنے ایک مختصر سے احاطہ پر مشتمل تھی۔ جس میں متصل غسل خانوں والے تین باسہولت کمرے تھے۔ ان کمروں کے سامنے برآمدہ تھا جس کے ایک طرف مشترکہ باورچی خانہ تھا۔ یہاں میز کرسیاں اور بیڈ وغیرہ ہر قسم کی رہائشی سہولتیں بھی میسر تھیں۔ اس عمارت کے علاوہ باقی جگہ صحن کے طور پر تھی جس میں اردگرد سایہ و پھل دار درخت لگے تھے اور درمیان میں قیدیوں نے بیڈمنٹن کا گراؤنڈ بنا رکھا تھا غرضیکہ ایک شریف

انسان کے لئے مختصر سی جگہ میں باوقار طور پر وقت گزارنے کے لئے بہت اچھا ماحول تھا۔ اگرچہ ہر کمرے میں تین تین قیدی تھے مگر اس اعتبار سے کچھ زیادہ مشکل نہ تھا کہ کمرے میں صرف رات سونے کے لئے آتے جبکہ دن کا اکثر حصہ باہر ہی گزرتا تھا۔

یہاں میں صبح سویرے اٹھتا اور گنتی کھلنے تک نماز سے فارغ ہو کر جاگنگ کے لئے تیار ہو چکا ہوتا اور گنتی کھلنے پر کچھ دیر اسی احاطہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چکر لگاتا یہاں تک کہ خوب پسینہ آجاتا پھر اگر موقع ہوتا تو بیڈمنٹن بھی کھیل لیتا۔ ناشتہ کے بعد مطالعہ اخبار، آنے جانے والوں سے ملاقاتوں، اپنے احاطہ سے باہر رابطوں، کھانے پکانے اور مختلف In door کھیلوں میں وقت گزرتا۔ یہاں آنے والوں میں مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ پاکستان میں ڈاکو کے نام سے معروف ملک محمد خان سے بھی ملاقات ہوئی۔ گو اس سے پہلے ساہیوال میں بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی مگر یہاں نسبتاً زیادہ کھلے ماحول میں ملاقات ہوئی۔ میں نے ان دنوں کے سیاسی حالات کے حوالہ سے پوچھا کہ یہ جو پیپلز پارٹی والے اسحاق خان کو صدر بنانے پر راضی ہو گئے ہیں تو اس کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس پر ملک صاحب بے ساختہ بولے ''سخت غلطی کر رہے ہیں اور یہ پچھتائیں گے'' دو سال سے بھی کم عرصہ میں ان کی یہ بات حرف حرف پوری ہوئی جس سے اندازہ ہوا کہ ملک محمد خان اچھی خاصی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی تھا۔

### بی کلاس وارڈ سے سپیشل وارڈ میں

بی کلاس قیدیوں سے باقاعدہ طور پر کوئی مشقت نہ لی جاتی تھی اس لئے میں بھی اسی کے مطابق سارا دن اپنی ذاتی مصروفیات میں ہی گزارتا تاہم چند دن بعد کسی نے شوشہ چھوڑا کہ بی کلاس قیدیوں سے بھی اب مشقت لی جائے گی۔ مجھے تو اس سے کوئی خاص فرق نہ پڑا مگر جو اپنی عزت اسی طرح فارغ رہنے میں سمجھتے تھے، وہ بھاگ دوڑ کرنے لگے کہ کسی طرح یہ بات ٹل جائے اور غالباً ان کی کوششوں سے یہ 'بلا' ٹل بھی گئی۔ لیکن چند دنوں بعد یہ بات اُٹھی کہ یہاں بی کلاس وارڈ میں قیدیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے اور جگہ کم ہے، لہٰذا بی کلاس یافتہ تمام قیدیوں کو اِسی احاطہ کے بالمقابل ایک دوسرے اِحاطہ میں منتقل کر دیا جائے جہاں رہائش کی گنجائش اس سے کہیں زیادہ ہے اور جس کو سپیشل وارڈ کہتے ہیں۔ یہ وارڈ دراصل کسی زمانہ میں قیدی خواتین کے لئے بنائی گئی تھی اور بعد میں ان کے لئے ملتان میں الگ سے وسیع جیل بن جانے کے بعد اس احاطہ کو سیاسی قیدیوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اور مارشل لاء ختم ہو جانے کے بعد سے یہ وارڈ خالی تھا۔ چنانچہ ہمیں اس سپیشل وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ جگہ بی کلاس وارڈ کی نسبت بڑے احاطہ پر مشتمل تھا جس میں ایک بڑا ہال تھا اور اس کے ایک طرف چار کمرے بنے ہوئے تھے جو غالباً سزائے موت کی قیدی عورتوں کے لئے

ہوں گے۔ ان کمروں میں اُن قیدیوں کی گنتی ڈال دی گئی جو علیحدہ رہنا چاہتے تھے جبکہ باقی سب قیدیوں کے بستر ہال میں لگا دیئے گئے۔ میں نے علیحدہ کمرے کو ترجیح دی اور آزادانہ طور پر اپنا وقت گزارنا شروع کر دیا۔ اسی دوران میں نے اپنے ''ہانڈی وال'' سے معذرت کر کے اپنا کھانا الگ سے پکانا شروع کر دیا۔ اس احاطہ میں ایک طرف نسبتاً بڑا سا کمرا بھی تھا جسے مشترکہ باورچی خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

## سپیشل وارڈ میں مشکلات کا دور

جب میں نے الگ ہو کر اپنا کھانا خود پکانا شروع کیا تو ایک طرف تو مجھے آزادی سے اپنے معاملات کو خود سے چلانا بہت اچھا لگا مگر دوسری طرف یہ بات میرے سابق ہانڈی وال کو اچھی نہ لگی اور اس نے میرے خلاف سازشیں کرنی شروع کر دی۔ ہمارے درمیان جھنگ کے سیالوں میں سے ایک نام نہاد نواب ممتاز سیال بھی تھا جو منظر سیال وغیرہ کا رشتہ میں چچا لگتا اور اپنے ہی بیٹے کے قتل میں سزا بھگت رہا تھا۔ اُسے مجھ سے خدا واسطہ کا بیر تھا اور میرے سابق ہانڈی وال نے سب سے زیادہ اسے ہی استعمال کیا۔ اس نے ہر موقع پر اور ہر جگہ خوامخواہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ عقیدۃً تو وہ شیعہ تھا اور میرا سابق ہانڈی وال سنی مگر احمدی کے مقابلہ میں تو ملّۃ واحدۃ تھے۔ ابتداء میں تو مجھے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے کیونکہ میں ایک علیحدہ کمرہ میں تھا مگر کچھ ہی عرصہ میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ میرا قافیہ تنگ کرنا ان کے لئے بہت آسان ہو گیا۔ ہوا یہ کہ اسی جیل میں گوجرہ کی ایک بہت بھاری پارٹی بھی تھی جس کا سربراہ پنجاب کا مشہور الیاس چوٹھیا (64 یا) تھا۔ انہوں نے کوشش کر کے اپنی گنتی ہمارے اسی سپیشل وارڈ میں ڈلوا لی۔ جس کے نتیجہ میں چاروں علیحدہ کمرے انہیں الاٹ کر دیئے گئے اور ہم جو اِن علیحدہ کمروں میں تھے، بڑے ہال میں منتقل کر دیئے گئے جہاں باقی سب بی کلاس قیدی تھے۔

اب یہاں ان دونوں شر پسند قیدیوں نے مجھے مختلف حیلوں بہانوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا، کبھی میرے بستر کو اُلٹ پلٹ دیتے، کبھی میرے گھڑے کو خالی کر کے الگ سے ایک کونے میں رکھ دیتے اور طرح طرح کے آوازے مجھ پر کستے۔ اپنی ان کارروائیوں میں دوسرے قیدیوں کو تماشائی کے طور پر شریک کر لیتے اور چونکہ یہ مذہب کا سہارا لیتے جس کی وجہ سے مجھے درست سمجھنے کے باوجود بھی باقی لوگ میری حمایت کرنے سے احتراز کرتے۔ ادھر میں خاموشی اور صبر کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتا چلا جاتا تو یہ بات ان کے لئے اور بھی تکلیف دہ اور پریشان کن ہوتی کہ یہ تنگ کیوں نہیں پڑتا، یہ ہمارے گلے کیوں نہیں پڑ جاتا؟ چنانچہ عدو شور و فغاں میں اور بھی بڑھتا اور میں یار نہاں میں اور بھی نہاں ہوتا چلا جاتا۔

شدید گرمیوں کی ایک دوپہر تھی کہ مذکورہ نام نہاد نواب صاحب کی ملاقات پر کوئی بڑا افسر آیا تو اس نے اس کے ذریعہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کو کہلوا کر اس بات پر منا لیا کہ الیاس منیر کو بی کلاس وارڈ کی سہولت سے محروم کر کے سزائے موت والی وارڈ میں بھجوادیا جائے جو اُس وقت قریباً خالی پڑی تھی۔ اس کا مقصد تھا کہ اسے بالکل الگ تھلگ ماحول میں رکھ کر اُسی خوفناک صورت حال سے دوچار کر دیا جائے جس سے خدا نے نجات دی تھی۔ یہ کارروائی کرنے اور اس پر باقاعدہ فیصلہ کروانے کے بعد فاتحانہ شان کے ساتھ یہ نواب صاحب واپس آ کر اب انتظار کرنے لگے کہ کب انتظامیہ کی طرف سے مجھے حکم آتا ہے کہ اپنا سامان اُٹھا کر جیل کے اُس کونے میں منتقل ہو جاؤں اور یہ مجھے جاتا ہوئے دیکھ کر جشن منائیں۔

مجھے اس کارروائی کا قطعاً علم نہ تھا لیکن دیکھئے خدا کی غیبی مدد کس طرح آتی ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی یہ بات کہ تم سو رہے ہوگے اور خدا تمہارے لئے جاگے گا، کس شان سے پوری ہوتی ہے۔ ہوا یوں کہ جب یہ نواب صاحب میرے بارہ میں مذکورہ بالا فیصلہ کروا کر ڈپٹی صاحب کے دفتر سے نکلے تو عین اُسی وقت میرے ہم نام چوہدری الیاس چوتھیا صاحب بھی اپنی ملاقات کے لئے وہاں پہنچ گئے۔ یہ صاحب بھی بڑے رعب داب اور اثر والے تھے، اس لئے ان سے بھی کہیں سرراہے ڈپٹی صاحب نے ذکر کر دیا کہ الیاس منیر کو سزائے موت وارڈ میں بھجوایا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان صاحب کے دل میں بات ڈالی اور انہوں نے غیر معمولی جوش کے ساتھ ڈپٹی صاحب سے کہا کہ اس شریف آدمی کو یہ لوگ خوامخواہ تنگ کرتے ہیں اور آپ بھی ان کے ساتھ مل کر اسے کیوں پریشان کرنے لگے ہیں؟ اس پر ڈپٹی صاحب نے پوچھا کہ پھر اس کا حل کیا ہے کیونکہ اس مشترکہ ہال میں احمدی اور مسلمان کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ اس پر الیاس چوتھیا صاحب نے فوراً حل پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے پاس چار کمرے ہیں جن میں سے ایک کو ہم سٹور کے طور پر استعمال کرتے ہیں، آپ الیاس کو یہ سٹور والا کمرا دے دیں، ہم سٹور کسی اور جگہ بنا لیں گے۔ ڈپٹی صاحب کو یہ حل پسند آیا اور انہوں نے اپنے پہلے فیصلے کو تبدیل کر کے انتظامیہ کو ہدایت جاری کر دی کہ الیاس کو ہال سے نکال کر اُس کمرے میں منتقل کر دیا جائے جہاں الیاس چوتھیا کا سٹور ہے اس طرح سے مجھے وہی کمرا دوبارہ مل گیا جس میں پہلے رہتا تھا۔ ادھر نواب صاحب اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ اِس انتظار میں تھے کہ اب میرا سامان اٹھوا کر سزائے موت وارڈ میں لے جایا جائے گا اور یہ بغلیں بجائیں گے۔ مجھے تو اس بارہ میں کسی کارروائی کا علم ہی نہ تھا مگر یہ سب لوگ اندر ہی اندر کھسر پھسر کر کے خوش ہوئے جا رہے تھے۔ اُن کی امیدوں کے عین مطابق سہ کے قریب جیل کا ہیڈ نمبردار آیا تو ضرور مگر اُس نے مجھے سزائے موت وارڈ کی بجائے اپنا سامان الیاس چوتھیا (64 یا) صاحب کے سٹور

والے کمرے میں جا کر لگانے کو کہا۔ میرے لئے یہ اچانک خبر حیرت انگیز بھی تھی اور بے پناہ خوشی کا باعث بھی! اُس نے یہ بات صرف مجھ سے ہی کی مگر میرے دشمن تو اسی لمحہ کی تاک میں بیٹھے تھے چنانچہ انہیں پتہ چلا تو وہ اپنے بستر سے اُٹھ کر خاص طور پر آئے اور متعلقہ نمبردار سے کہنے لگے کہ تمہیں غلطی لگ رہی ہے، اس کی گنتی تو سزائے موت وارڈ میں جانی ہے۔ نمبردار نے چٹ دکھائی کہ اس پر یہ نہیں لکھا ہوا۔ اس پر وہ چکرا کر رہ گئے کہ یہ کیا ہوا؟ وہ اپنے اس ''مقدس مشن'' کے پورا ہونے میں اس قدر پر یقین تھے کہ اس کے بعد انہوں نے دوپہر کی کڑکتی دھوپ کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے باہر نکل کر دوڑ دھوپ کی مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ **مکروا و مکر اللہ، واللہ خیر الماکرین۔**

میں چند لمحوں میں اپنا سامان سمیٹ کر اُسی کمرے میں منتقل ہو گیا جہاں پہلے ہوتا تھا۔ اس طرح سے ان کے منصوبے نہ صرف دھرے کے دھرے رہ گئے بلکہ ان کے سینہ پر گویا مونگ دَلنے کے مترادف صورت حال بن گئی۔ کجا مجھے ایسی جگہ بھجوانے کے منصوبے تھے جہاں میں پورے طور پر الگ تھلگ ہو کر رہ جاتا اور قید تنہائی والی صورت عود کر آتی کجا اب میں انہی کے سامنے، انہی کے درمیان بڑے مزے اور پوری آزادی سے رہنے لگا۔ اب وہ خوب تلملاتے اور مجھے تنگ کرنے کے مزید منصوبے بناتے، وہ مجھے براہ راست تو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے اس لئے کہ میں اپنے حال میں مست رہتے ہوئے ان کی ایک نہ چلنے دیتا۔

## تین ماہ کیمپ جیل لاہور میں

اسی دوران میں ایک احمدی نوجوان قیدی عزیزم محمود احمد صاحب آف فیصل آباد کے ساتھ بی اے کا امتحان دینے کے لئے کیمپ (ڈسٹرکٹ) جیل لاہور لے جایا گیا جہاں قریباً تین چار ماہ قیام رہا۔ اس سفر کے لئے ہم دونوں سپیشل وارڈ سے ماہ جون 1990ء کی ایک سہ پہر روانہ ہوئے اور روانہ ہونے سے پہلے ہمیں ایک مرتبہ پھر پابجولاں کر دیا گیا تھا۔ پولیس گارڈ ہمیں لے جانے کے لئے موجود تھی جو ہمیں فیصل آباد کے کسی ریلوے سٹیشن پر لے گئی جہاں سے ہم بذریعہ ریل لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ تاہم ریل پر سوار ہونے سے پہلے میرے ساتھی برادرم محمود صاحب کے چچا ہمیں ایک ہوٹل میں لے گئے جہاں ہم نے رات کا کھانا کھایا۔ اس ہوٹل کے ساتھ ہی واقع ان کے گھر بھی گئے جہاں محمود کی دادی جان اور دیگر اعزہ جمع تھے۔ اس بہانہ ان سب سے گھر کے ماحول میں ملاقات ہو گئی تو اس کے بعد ہم الوداع ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ بارہ بجے رات کے بعد ہم لاہور کے اُس تاریخی ریلوے سٹیشن پر اُترے جسے

دیکھتے ہی کسی سادہ لوح دیہاتی نے بے اختیار کہا تھا کہ بلے بلے کٹھا سو روپیہ لگا دتا اے۔ گاڑی سے اُتر کر باہر سڑک پر آئے تو ہمارا گارد انچارج پوچھنے لگا کہ اب جیل تک کس طرح جانا ہے؟ میں نے فوراً فرمائش داغ دی کہ تانگہ پر اور وہ بھی کھلی چھت والے! قبولیت کا وقت تھا، وہ فوراً راضی ہوگیا اور چند لمحوں بعد ہم لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر رات کے سہانے موسم اور گھوڑے کی ٹاپوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کیمپ جیل کی طرف رواں دواں تھے۔

آدھ گھنٹہ کا یہ سفر دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوا تو ہم ایک مرتبہ پھر پرانے طرز کے خوفناک آہنی گیٹ کے سامنے کھڑے تھے جو چند منٹ بعد ہمیں دبوچنے کے لئے کھلا اور ہم پھر اس مگرمچھ کے پیٹ میں دھکیل دیئے گئے۔ رات کے اُس وقت تو حقیقت میں ہر طرف فی ظلماتٍ کا منظر تھا۔ رات کے اس آخری پہر میں ہمیں ایک عارضی جگہ رکھا گیا اور اگلے روز مجھے ایک چھوٹے سے احاطہ میں الگ کمرا دے دیا گیا جہاں بی کلاس یافتہ حوالاتی رکھے گئے تھے جبکہ عزیزم محمود کو عام قیدی وارڈ میں بھیج دیا گیا تاہم ہمارا آنا جانا لگا رہتا کسی قسم کی غیر معمولی پابندی کی صورت نہ تھی۔ دن کے اوقات میں محمود میرے پاس آجاتا اور ہم اکٹھے پڑھائی بھی کر لیتے اور کھانا وغیرہ بھی کھا لیتے۔

یہاں آنے کے فوراً بعد جبکہ ابھی ملاحظہ بھی نہ ہوا تھا کہ ہمارا امتحان شروع ہوگیا، جس کی وجہ سے ہماری بیڑیاں بھی اُتاری نہ گئی تھیں۔ بیڑیاں بھی سخت قسم کی تھیں جنہوں نے ٹخنوں پر رگڑ لگنے سے زخم کر دیئے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ یہاں پرچہ دینے کے دوران بیٹھنے کے لئے کوئی میز کرسی بھی نہ تھی بلکہ نمک مرچ کے گودام میں نیچے فرش پر بیٹھ کر پرچہ دینا ہوتا۔ اس کیفیت میں بیڑیوں کے ساتھ تین گھنٹہ تک اس طرح بیٹھنا کہ گھٹنوں پر گتہ رکھے پرچہ بھی حل کرنا، خاصا مشکل اور دلچسپ تجربہ تھا۔ خاکسار کی ہمشیرہ محترمہ ناصرہ بابر صاحبہ کے ایک خط کے حوالہ سے سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی منظر کشی یوں فرمائی تھی:

> عزیزہ ناصرہ پروین صاحبہ جو ہمارے اسیر راہ مولیٰ محمد الیاس منیر صاحب واقف زندگی کی ہمشیرہ ہیں، وہ لکھتی ہیں ...... میرا پیارا بھائی عزیزم محمد الیاس منیر واقف زندگی اسیر راہ مولیٰ آج کل بی اے کا امتحان دے رہا ہے۔ اس غرض کے لئے اسے کیمپ جیل لاہور لے جایا گیا، اسے لاہور لے جاتے وقت دوبارہ بیڑیاں ڈالی گئیں جو تین دن لگی رہیں۔ بیڑیوں کے ساتھ ہی اس نے پرچے دیئے۔[1]

یہاں کیمپ جیل لاہور میں نئی قسم کے لوگوں سے تعارف ہوا۔ جن میں سے زیادہ تر سیاسی قسم کے لوگ تھے۔ ان میں ضلع شیخوپورہ کی ایک رائے فیملی تھی جن کا ایک بھائی ایم پی اے تھا اور اپنے علاقہ کا مانا ہوا چھڈے باز جانا جاتا تھا۔

---

[1] افتتاحی خطاب جلسہ سالانہ برطانیہ، جولائی 1990ء

علاوہ ازیں سکھوں کی خالصتان تنظیم کے کچھ نوجوان تھے جو طیارہ اغوا کیس میں سزا یافتہ تھے اور وہ بھی بی اے کا امتحان دینے کے لئے یہاں لائے گئے تھے۔ چند دنوں میں ہی ان سکھوں کے ساتھ خاصی دوستی ہوگئی، یہ بیڈمنٹن بھی بہت اچھا کھیلتے تھے اور یوں بھی پڑھے لکھے تھے، بڑی خودداری کے ساتھ باوقار طور پر اپنا مشکل وقت گزارتے تھے۔ ان میں سے ایک سکھ جن کا نام Lovely تھا، امرت دھاری تھے جو اپنے کردار وعمل کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ کئی سال بعد جون 1997ء میں ایک روز اچانک ملاقات ہوئی تو سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورچ کی ایک عمارت کی سیڑھیوں میں! جہاں میں ان کو دیکھتا رہ گیا اور وہ مجھے، وہ بھی حیران اور میں بھی حیران۔ وہ پوچھیں تم یہاں کیسے؟ میں پوچھوں آپ یہاں کہاں؟ بہرحال یہ ہیں دنیا کے میلے!

اس جیل میں قریباً تین ماہ قیام رہا، اس دوران جہاں جیل کی روایات کے مطابق نشیب وفراز آتے رہے وہاں اللہ تعالیٰ کے افضال کی بارش بھی جاری رہی۔ مشکلات کے ساتھ ساتھ آسانیاں بھی میسر آتی رہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ احباب جماعت اور اعزہ واقرباء کا ملاقات کے لئے تانتا یہاں بھی بندھا رہا۔ اس دوران مجھے محترم نواب عباس احمد خان صاحب کا بے حد محبت میں سرشار ہو کر آنا، محترم میاں خالد مسعود صاحب کا میرے لئے جیل انتظامیہ سے لڑائی تک مول لینا اور ہماری سب سے بڑی خالہ جان صبیحہ مبارک صاحبہ کا لاہور کی ٹرانسپورٹ پر دھکے کھاتے ہوئے کھانا لے کر پہنچنا خوب یاد ہے۔ اسی طرح یہاں ایک احمدی نوجوان بطور وارڈر ملازم بھی تھے، انہوں نے بھی میرا ہر طرح سے خیال رکھا یہاں تک کہ ایک روز وہ میری فرمائش پر شاہ عالم کی مشہور نہاری بھی ناشتہ کے وقت لے آئے تھے، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

ہم بی اے کا امتحان دینے کے بعد ابھی یہیں تھے کہ اگست 1990ء میں ''میرے عزیز ہم وطنو!'' سے شروع ہونے والی تقریر کر کے صدر پاکستان جناب غلام اسحاق خان نے بے نظیر حکومت پر اپنے آئینی اختیارات کا ہتھوڑا چلایا اور مختلف الزامات لگا کر اسے گھر چلتا کیا۔ اس کے بعد ملک کی سیاسی صورت حال ایک مرتبہ پھر بے یقینی کے گرداب میں پھنس کر رہ گئی۔ اس کا پیپلز پارٹی کو تو جو نقصان ہوا ہوگا وہ تو ہوا ہی ہوگا مگر جیل میں صدر پاکستان کی اس تقریر کا یہ فقرہ بہت تشویش کا باعث بنا کہ

''بے نظیر کی حکومت نے مجھ سے زبردستی ایسے قانون پر دستخط کرائے<br>جس کے نتیجہ میں ہزاروں جرائم پیشہ قیدی رہا کر دیئے گئے''

اس بات نے ان تمام قیدیوں کو پریشان کر دیا جنہیں اعلان عام کے نتیجہ میں سزائے موت سے نجات ملی تھی۔ چنانچہ

چند ہفتوں میں اس کے اثرات بھی ظاہر ہو گئے جب سینکڑوں ایسے قیدیوں کو جن کی اپیلیں ابھی ہائیکورٹ کی سطح پر تھیں، سزائے موت کی کوٹھڑیوں میں واپس دھکیل دیا گیا۔ اس موقع پر یہ بات اور بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بے نظیر سے یہ قدم محض ہمارے لئے ہی اُٹھوایا تھا کیونکہ ہم اس نئی صورت حال سے متاثر نہ ہوئے تھے۔

## سنٹرل جیل فیصل آباد میں واپسی

ستمبر 1990ء میں ہماری واپسی کے احکامات ہوئے تو ہم ایک مرتبہ پھر پولیس کی نگرانی میں واپس سنٹرل جیل فیصل آباد لائے گئے۔ اب کے جو یہاں آئے تو پھر یہاں سے بفضل اللہ تعالیٰ رہا ہو کر ہی نکلے اور اس طرح سے میرا سب سے زیادہ عرصہ اسیری اسی جیل میں گزرا۔ ہم لاہور سے واپس آئے تو اسی سپیشل وارڈ میں دیگر بی کلاس قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا جہاں میں حسب سابق اپنی علیحدہ چکی میں بڑے مزے سے اپنا وقت گزارنے لگا۔

اس صورت حال میں اُس وقت ایک تبدیلی آئی اور مجھ سے عناد رکھنے والے قیدیوں کے لئے مجھے تنگ کرنا آسان ہو گیا جب چند ماہ بعد ہم سب قیدیان بی کلاس کو ایک مرتبہ پھر واپس بی کلاس وارڈ میں بھجوا دیا گیا جہاں وہی تین کمرے تھے جن میں ہم سب کو گھسیڑ دیا گیا اور مجھے بطور خاص جھنگ کے اُسی نواب صاحب کے کمرے میں ڈال دیا گیا جو میرا سب سے بڑا مخالف بلکہ دشمن بن چکا تھا۔ اب میں بھی خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا اور سب کچھ برداشت کرتے ہوئے ہر ممکن طور پر اس کی ہر شرارت سے بچنے کی کوشش کرتا۔ جب میری طرف سے اسے کوئی بہانہ نہ ملا تو اُس نے انتظامیہ سے جا کر پھر مجھے کسی علیحدہ جگہ میں بند کروانے کی کوشش کی۔ اس پر ڈپٹی صاحب نے میرے ساتھ بھی مشورہ کیا اور کہا کہ تمہیں 20 چکی (جیل میں ایک احاطہ کا نام) میں بھجوا دوں تو! میں نے وہاں کی صورت حال معلوم کی اور یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ وہ جگہ بالکل ہی نچلے درجہ کے قیدیوں کے لئے مخصوص تھی، ڈپٹی صاحب سے کہا کہ آپ کی مشکل آسان کرنے کے لئے میں اس پر بھی تیار ہوں۔

### 20 چکی میں

جونہی مجھے حکم ہوا، میں نے اپنا سامان اُٹھایا اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی اَذْهَبَ عَنِّی الْاَذٰی کا وِرد کرتے ہوئے اپنے نئے مسکن میں پہنچ گیا۔ اس احاطہ میں اگرچہ صرف بیس کمرے تھے اور اسی وجہ سے اُس کا نام بھی 20 چکی تھا مگر رقبہ کے لحاظ سے بہت بڑا تھا جس کا نصف حصہ تو بالکل خالی پڑا تھا۔ کمروں کے سامنے لمبائی کے رُخ بہت وسیع صحن تھا جس کے

درمیان میں ایک نلکا نصب تھا اور اس نلکے کے سامنے پانی کا حوض بنا ہوا تھا جہاں قیدی نہاتے اور کپڑے دھوتے تھے۔اس احاطہ میں زیادہ تر کم مدت والے قیدی رکھے جاتے تھے جن کی مشقت فیکٹری کے علاوہ مختلف عارضی نوعیت کی ہوتی۔ ان کے علاوہ معذور، بیمار اور پاگل قیدی بھی یہاں رکھے جاتے جن سے کوئی مشقت نہ لی جاتی۔میرے یہاں آنے سے فرقہ وارانہ نوعیت کے قیدیوں کی نوع کا بھی اضافہ ہو گیا اور اس کے بعد جب بھی ایسا قیدی جیل میں آتا،اس کی گنتی اسی احاطہ میں ڈال دی جاتی بلکہ الیاس منیر والی وارڈ کہہ کر ڈالی جاتی۔

مجھے اس وارڈ میں پہلی چکی الاٹ کردی گئی اور ساتھ والی چکی مجھے بطور سٹور دے دی گئی جس میں میرے مشقتی کی گنتی ڈال دی گئی جو اس کمرے میں میرے لئے کھانا وغیرہ تیار کرتا۔اس طرح سے مجھے ایک کی بجائے دو کمرے مل گئے جو میرے ''خیر خواہوں'' کے لئے اَور بھی پریشانی کا باعث بن گئے۔ میں نے اپنی چکی میں فوری طور پر اچھی طرح صفائی، مرمت اور سفیدی کروا کر اسے خوب اچھی طرح سجالیا اور بڑے باوقار طور پر یہاں رہنے لگا۔ یہاں رکھے گئے سبھی قیدی معاشرہ کے پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے،اس اعتبار سے مجھے ان کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی ہوتی اور وہ بھی میرے ساتھ بہت اچھی طرح سے پیش آتے۔اس طرح سے یہاں میرا وقت نہایت پرسکون طور پر گزرنے لگا گویا گئے کو ماری لات اور اس کا ٹب نکل گیا، الحمدللہ۔

یہاں میرے شب و روز بہت جلد معمول پر آ گئے، میں صبح سویرے اُٹھتا،نماز فجر کے بعد ہمارے دروازے باقی جیل کی نسبت ذرا جلد کھول دیئے جاتے تو میں تیار ہو کر باہر نکلتا اور کھلے وسیع میدان میں جاگنگ کرتا۔اس کے بعد نہا کر ناشتہ کرتا اور حسب موسم کبھی دھوپ میں اور کبھی چھاؤں میں بیٹھ تلاوت قرآن کریم کے بعد مطالعہ اخبار و کتب کرتا۔ یہاں میرے پاس عام قیدی بھی بآسانی آ جاسکتے تھے چنانچہ جیل میں موجود بعض احمدی قیدی اکثر میرے پاس آ جاتے جن کے ساتھ بہت اپنائیت کے ماحول میں وقت گزرتا۔کھانا بھی اکھٹے کھالیتے اور نمازیں بھی باجماعت ادا کر لیتے۔

جب کبھی ضرورت ہوتی، میں بھی اپنے دوستوں سے ملنے دوسری بارکوں میں چلا جاتا۔ان میں سے ایک ہمارے بزرگ بابا محمد حیات چشتی صاحب تھے جو ضلع جھنگ کے رہنے والے تھے۔ پچاس کی دھائی میں انہیں امام الزمان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی شناخت کی توفیق ملی تھی اور اپنے خاندان میں سے ہی نہیں پورے تھانہ قادر پور کے علاقہ میں اکیلے احمدی تھے۔نہایت مخلص، محنتی اور دیانتدار مثالی پرجوش احمدی تھے۔ان کی اپنے دُور کے رشتہ داروں سے 1984ء میں اُس وقت لڑائی ہو گئی تھی جب وہ ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔جس پر ان کی جوابی اور دفاعی کارروائی سے دو افراد ہلاک ہو گئے تھے اور اب یہ اس کی پاداش میں عمر قید بھگت رہے تھے۔بابا چشتی کی مشقت سٹور پر معائنہ کرانے

کی تھی جس سے آپ صبح صبح ہی فارغ ہو جاتے اور اکثر میرے پاس آ جاتے، ہم نمازیں بھی اکھٹے ادا کرتے اور کھانے کے ساتھ ساتھ دیگر مشاغل بھی ہمارے مشترکہ ہی ہوتے۔ اُنہوں نے اپنا ایک دلچسپ اور ایمان افروز واقعہ سنایا کہ جب انہیں قبول احمدیت کی توفیق ملی تو ان کے والد اپنے گاؤں کے امام مسجد تھے جس پر لوگوں میں شدید بے چینی پیدا ہوئی کہ ہمارے امام مسجد کا بیٹا ہی نعوذ باللہ ''کافر'' ہو گیا ہے۔ اس پر حسب روایت لوگوں نے مختلف قسم کی کوششیں شروع کر دیں تا کہ انہیں کسی طرح واپس لایا جا سکے۔ ایک روز گاؤں کے لوگوں نے دوسرے علاقہ سے کسی بڑے مولوی صاحب کو بلایا کہ وہ بابا چشتی کو سمجھائیں۔ جب مولوی صاحب آئے تو اس موقع پر گاؤں کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے کہ وہ مولوی صاحب کی کارروائی دیکھیں۔ سب لوگ نیچے فرش پر بٹھائے گئے اور مولوی صاحب کے لئے ایک چارپائی بچھائی گئی۔ پھر بابا چشتی آئے تو وہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جب مجلس مکمل ہو گئی تو مولوی صاحب نے پہلا سوال ہی بابا چشتی سے یہ کر ڈالا کہ مرزائی اور سؤر میں کتنا فرق ہے؟ اس پر سب حاضرین پریشان ہو گئے کہ ہم تو چشتی صاحب کو واپس لانے کے چکر میں ہیں اور مولوی صاحب کیا کر رہے ہیں! سب پریشان تھے کہ چشتی صاحب اب اس کا کیا جواب دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے بابا چشتی کو ایسا جواب سجھایا جس سے مولوی صاحب کو ایسا کاری زخم لگا کہ پہلے مرحلہ میں ہی ان کا کام تمام ہو گیا۔ بابا چشتی کہتے ہیں کہ انہوں نے بلا توقف اپنے اور مولوی صاحب کے درمیانی فاصلے کو اپنے ہاتھ سے ناپتے ہوئے کہا کہ ایک، دو اور تین گٹھاں دا (یعنی تین بالشت)!!! اس پر سارا مجمع مولوی صاحب کو لعن طعن کرتا ہوا منتشر ہو گیا۔

بابا چشتی کی اپیل ہائیکورٹ میں سماعت ہوئی تو ان کی سزا بڑھا کر سزائے موت میں تبدیل کر دی گئی جس پر انہیں سزائے موت وارڈ میں بند کر دیا گیا جہاں آپ سے ملنا کافی دشوار ہو گیا تھا تاہم جب بھی موقع ملتا آپ سے ملنے جاتا رہتا۔ آپ یہاں کئی سال رہے پھر سپریم کورٹ میں سماعت کے بعد آپ کی رہائی ہوئی۔

**بطور اُستاد مشقت**

1991ء میں جیل انتظامیہ تبدیل ہوئی اور جناب مفتی سرفراز احمد صاحب جیل کے سربراہ ہو کر یہاں تعینات ہوئے تو انہوں نے ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت کے مصداق جو مختلف قسم کے اقدامات کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بی کلاس یافتہ قیدیوں کو مشقت کے لئے فیکٹری میں بلا لیا۔ صاحب بہادر کا دورہ تھا اور ہم سب بی کلاس قیدی بھی ایک بڑے کمرے میں ٹاٹ پر بٹھائے اور سجائے گئے تھے۔ صاحب بہادر نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ ڈپٹی ناصر وڑائچ صاحب نے بتایا کہ یہ بی کلاس قیدی ہیں۔ اس پر باری باری سب سے صاحب نے تعلیم کے بارہ میں

پوچھا۔ آخر پر میری باری آئی تو میں نے بتایا کہ بی اے کیا ہے۔ اس پر وہ ڈپٹی صاحب سے مخاطب ہو کر تختی سے بولے کہ ایسے لوگوں کو تو سکول میں ٹیچر ہونا چاہئے۔ اس پر ڈپٹی صاحب نے کہا کہ سر! یہ احمدی ہے۔ مگر صاحب نے پھر تنک کر کہا کہ میں جو کہتا ہوں کہ اسے ٹیچر لگاؤ۔ اس طرح سے بیٹھے بٹھائے بغیر کسی سفارش، بغیر کسی رشوت اور بغیر کسی حیلہ یا وسیلہ کے مفت میں مجھے سکول میں استاد مقرر کر دیا گیا جس کے لئے لوگ نا معلوم کیا کیا جتن کرتے تھے کیونکہ اس کے لئے اچھا خاصا تگڑا 'وسیلہ' درکار ہوتا تھا، الحمدللہ۔ یہاں مجھے اسیری کے آخر تک تعلیمی خدمات بجالانے کی توفیق ملی، الحمدللہ۔

## جیل میں تعلیم القرآن کی سعادت، لیکن......

اس سے قبل ساہیوال جیل کی سزائے موت وارڈ میں بھی مجھے تعلیم القرآن کی سعادت ملی تھی جب میرے والی وارڈ میں ہی مقید ایک قیدی ایک دن دوران ٹہلائی میرے پاس آیا اور بڑی لجاجت سے کہنے لگا کہ مجھ پر ایک اِحسان کریں۔ میں نے پوچھا وہ کس طرح؟ کہنے لگا کہ مجھے قرآن کریم پڑھا دیا کریں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی دِلی خواہش سے ایسا کہہ رہا ہے چنانچہ میں نے فوراً حامی بھرتے ہوئے کہا: اس میں اِحسان کی کونسی بات ہے، بڑی خوشی سے پڑھیں، میں تیار ہوں۔ حدیث نبوی خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ میرے پیش نظر تھی۔ چنانچہ وہ قیدی بڑی باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ ہر روز دوپہر کے وقت ٹہلائی کھلتی تو فوراً میرے پاس آنے لگا۔ چونکہ میری اُڑدی نہ لگتی تھی اس لئے میں اس کے اِنتظار میں بیٹھا ہوتا اور اسے فوراً قرآن کریم پڑھانے لگتا۔ پندرہ بیس منٹ میں وہ اپنا سبق سنا کر واپس چلا جاتا۔

یہ تجربہ اللہ کے فضل سے بڑا کامیاب رہا۔ اس نے بڑی محنت اور شوق کے ساتھ قرآن کریم جو پڑھنا شروع کیا تو ہر چند کہ وہ قیدی بڑی عمر کا تھا مگر بڑی تیزی سے وہ قرآن کریم سیکھنے لگا اور چند روز میں وہ رواں ہو گیا اور غلطیاں کم سے کم ہونے لگیں۔ اس پر وہ بڑی ہی اِحسان مندی کے ساتھ پیش آتا مگر ایک روز کیا ہوا کہ اس نے آکر بڑے ہی معذرت خواہانہ انداز اور شرمندگی کے ساتھ مجھے کہا کہ اب وہ قرآن کریم پڑھنے نہیں آیا کرے گا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا، کیوں کیا ہوا ہے؟ کہنے لگا کہ گو مجھ پر پہلے دِن سے ہی دباؤ تھا کہ 'مرزائی سے پڑھتے ہو اور وہ بھی قرآن؟' مگر آج تو انتہاء ہو گئی ہے، اس لئے میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ ہر چند آپ مجھے بہت اچھی طرح سے قرآن کریم پڑھا رہے تھے مگر میں اسے جاری نہ رکھوں تو بہتر ہے۔ میں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ یہ تو آپ کی مرضی اور خواہش کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے اور میں ان حالات پر انا للہ وانا الیہ راجعون کے سوا کیا پڑھ سکتا ہوں۔ چلیں قرآن

کریم پڑھنا تو دینی تعلیم میں آتا ہے، ان لوگوں کے ظرف کا یہ حال تھا کہ ایک ایسے نوجوان نے جو باہر ایف اے کا طالب علم تھا اور گردش زمانہ کا شکار ہو کر یہاں پہنچ گیا تھا، مجھ سے کہا کہ اسے انگریزی پڑھا دیا کروں تو چند روز کے بعد اس پر بھی اتنا دباؤ پڑا کہ وہ بھی چھوڑ گیا۔ ہیں ''کافروں کی زبان'' پڑھتے ہو اور وہ بھی ''کافر'' سے!!؟

علاوہ ازیں میرے ساتھ اس قسم کا ایک اور واقعہ بہت بعد میں باقاعدہ سرکاری طور پر اُس وقت بھی ہوا جب میں سنٹرل جیل فیصل آباد کے سکول میں بطور قیدی اُستاد مقرر تھا اور ساتویں کلاس کے طلبہ کو عربی پڑھاتا تھا۔ یہ 1991ء کی بات ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ مجھے سپرنٹنڈنٹ جیل جناب مفتی سرفراز صاحب کے ایک خصوصی حکم پر اُستاد لکھ دیا گیا تو یہاں شروع میں میری ڈیوٹی ساتویں کلاس کو عربی اور انگریزی پڑھانے پر لگا دی گئی۔ میرے طرزِ تدریس سے طلبہ اور انچارج سکول (جو باہر سے آتے تھے اور قاری صاحب کے لقب سے معروف تھے) بھی مطمئن اور خوش تھے اور میرے شاگرد بھی میرے ساتھ اچھا تعلق رکھنے لگ گئے تھے (بلکہ ان میں سے ایک شاگرد کا تو ابھی تک یہاں جرمنی میں مجھے خط آتا ہے بلکہ اس نے انٹرنیٹ کے ذریعہ مجھے تلاش کیا اور ایک روز سعودی عرب سے فون کر کے حیران کر دیا) میری یہ مقبولیت میرے ''فی سبیل اللہ'' مخالفوں کو کسی قیمت پر منظور نہ تھی چنانچہ یہاں بھی ایسے حاسدوں نے اپنا کام دکھایا جس پر ایک روز قاری صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ آئندہ سے تم عربی نہیں پڑھایا کرو کیونکہ بعض لوگوں کو اعتراض ہے کہ مرزائی عربی کیوں پڑھاتا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اِس کے بعد میں اپنے شاگردوں کو دوسرے مضامین پڑھاتا رہا جب کہ ان کی مسلسل خواہش رہی کہ عربی بھی پڑھاؤں مگر انہیں یہ سہولت ظالم سوچ رکھنے والوں کے ظلم کے باعث میسر نہ آ سکی۔ واہ رے جہالت!!

## 20 چکی میں رونق

مجھے یہاں 20 چکی میں منتقل کئے جانے کے کچھ عرصہ بعد جھنگ میں قتل ہونے والے مولوی حق نواز جھنگوی کے مقدمہ میں سزا ہونے والے چند قیدی اس جیل میں لائے گئے۔ ان میں سے دو تو سزائے موت تھے جنہیں سزائے موت وارڈ میں بند کر دیا گیا جبکہ دو عمر قید ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان جھنگ کی نواب سیال فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور عرف عام میں وہ کا کا بلی کہلاتا تھا، اسے بی کلاس کی سہولت بھی دی گئی تھی۔ چونکہ یہ مقدمہ بھی فرقہ وارانہ نوعیت کا تھا، اس لئے انہیں بھی کسی الگ جگہ پر رکھنا جیل انتظامیہ کے لئے ضروری تھا۔ اس اعتبار سے ان کا مسکن بھی 20 چکی ٹھہرا کہ یہاں مجھے اسی نوعیت کا قیدی ہونے کی وجہ سے رکھا گیا تھا۔ چنانچہ ان دونوں قیدیوں کو میرے برابر والی چکیاں الاٹ کر دی گئیں۔ اس طرح سے ہمارے ہاں رونق بڑھ گئی۔ کا کا بلی چھریرے بدن کا نوجوان ایک اچھا

انسان تھا، اُس کے ساتھ تعلقات بہت اچھے رہے۔ ان کے آنے کے بعد اور بہت سے بی کلاس یافتہ قیدی یہاں آئے اور بہت سے سادہ لوگ اصل بی کلاس وارڈ میں اپنی گنتی ڈلوانے کی بجائے اسی احاطہ میں آنا زیادہ پسند کرتے، گویا جہاں سے مجھے نکالا گیا تھا وہاں جانا بھی پسند نہ کرتے۔ اُنہی میں فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے دو تعلیم یافتہ چچازاد بھائی بھی تھے۔ ان میں سے ایک ماسٹر طفیل محمد صاحب 17ویں گریڈ کے سکول ٹیچر تھے اور دوسرے ان کے کزن جناب محمد اشرف صاحب ایم ایس سی فزکس تھے۔ ان دونوں کے ساتھ بہت اچھا تعلق بنا، کٹر مسلمان ہونے کے باوجود ان دونوں نے میرے ساتھ خوب نباہ کیا۔ ماسٹر صاحب سادہ مزاج مگر بہت ہی دلچسپ شخصیت کے حامل انسان تھے۔ ہر بات میں سے کوئی نہ کوئی نکتہ نکال لیتے اور ہمیشہ کہتے کہ مزا تب ہے جب ایک دوست آدھا مصرعہ یا محاورہ بولے اور اسے مکمل سننے والا کرے۔ میرے ساتھ اس قدر تعلق ہو گیا تھا کہ صبح سویرے اُٹھ کر جاگنگ کرتے اور عمر کے اعتبار سے میں کہتا کہ آپ آگے چلیں تو کہتے نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ شام کے وقت ہم کھیلتے تو بچوں کی طرح ہمارے ساتھ کھیلتے۔ کچھ عرصہ بعد انہیں جیل کی مسجد کا امام مقرر کر دیا گیا جبکہ اِس 'کلیدی اسامی' کا خواہشمند کوئی اَور بھی تھا چنانچہ اس نے ان کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور جب انہیں ہٹا کر خود امام بن جانے کی تمام کوششوں میں ناکام رہا تو اسے بہت آسان نسخہ سوجھا۔ اس نے مسجد میں یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ ہمارا امام مسجد ایسا شخص کس طرح ہو سکتا ہے جو ایک مرزائی کے ساتھ تعلقات رکھتا ہو، اس کے ساتھ اٹھتا، بیٹھتا اور کھاتا پیتا ہو۔ اس پر لوگوں نے ماسٹر طفیل صاحب سے مطالبہ کیا کہ مرزائی سے قطع تعلق کرو بصورت دیگر امامت چھوڑنا ہوگی۔ اس پر ماسٹر صاحب میرے پاس آئے اور بے حد جذباتی انداز میں مجھ سے یہ کہانی کہی، میں نے ان کے آنسو دیکھ کر تسلی دی کہ اگر آپ کے لئے ایسا ممکن نہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس پر کہنے لگے کہ میں معمول کا تعلق تو رکھوں گا صرف ان لوگوں کا منہ بند کرنے کی خاطر مجھے اپنے ساتھ کھانے پینے پر مجبور نہ کرنا! چنانچہ اس کے بعد انہوں نے میرے ساتھ کھانا پینا تو چھوڑ دیا مگر عمومی تعلق پہلے جیسا ہی رکھا بلکہ ہمیشہ اس صورت حال پر نادم اور پریشان ہی رہے حتی کہ میری رہائی کے وقت جب مجھے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ڈیوڑھی تک چھوڑنے آئے تو مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگے میں آپ سے علیحدگی میں ملنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس وقت اپنے جذبات پر قابو نہیں ہے، فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

## مکرم رانا نعیم الدین صاحب کی آمد

جب سے میں سنٹرل جیل فیصل آباد منتقل ہوا تھا، میری خواہش تھی کہ مکرم رانا نعیم الدین صاحب بھی یہیں آ جائیں کیونکہ ان کے اہل وعیال بھی ربوہ میں رہتے تھے جنہیں ملاقات کے لئے ساہیوال جانا پڑتا تھا جو فیصل آباد کی نسبت

تین گنا مسافت پر واقع تھا۔ میری یہ کوشش آخر کار 1991ء کے آخری دنوں میں بر آئی جب ایک روز مجھے ڈیوڑھی سے پیغام ملا کہ تمہارا مقدمہ وار آیا ہے۔ چنانچہ خوشی خوشی ڈیوڑھی پہنچا اور مکرم رانا صاحب کو ساتھ لے آیا۔ ان کے متعلق فوری طور پر یہی حکم جاری ہوا کہ ان کی گنتی بھی الیاس منیر کے ساتھ ڈال دی جائے۔ چنانچہ شروع میں تو انہیں بالکل اپنے ساتھ والی چکی میں رکھوایا تاہم بعد میں مزید بی کلاس قیدی آتے گئے تو رانا صاحب کو 9 نمبر چکی میں جانا پڑا جہاں انہوں نے رہائی تک کا عرصہ گزارا۔

محترم رانا صاحب کے یہاں آجانے سے رونق میں اضافہ ہوگیا، ہم نمازیں باجماعت ادا کرنے لگے جن میں بعض اوقات دیگر احمدی قیدی دوست بھی آکر شامل ہوجاتے گویا یہاں ہمارا ایک سنٹر بن گیا تھا جو جمعہ والے دن خاص طور پر آباد ہوجاتا۔ ہم نے اپنی ملاقات کا دورانیہ بھی یوں طے کرلیا کہ ایک ہفتہ مکرم رانا صاحب کے بچے آجاتے اور اگلے ہفتے خاکسار کے۔ اس طرح سے ہمیں تازہ کھانے اور سبزی گوشت وغیرہ کی ترسیل برابر جاری رہتی، الحمدللہ۔ مکرم رانا صاحب کی مشقت کا مسئلہ بھی یہاں خوبی کے ساتھ حل ہوگیا تھا تاہم کبھی کبھار تنگ کرنے والے تنگ کرنے کی کوشش تو کرتے رہتے تھے مگر ان لوگوں کو کبھی کامیابی نہ ہوئی۔

### 20 چکی میں سرگرمیاں

میں یہاں اپنے طور پر ایک طے شدہ معمول کے مطابق وقت گزارتا تھا لیکن دیگر قیدیوں کے یہاں آجانے کے بعد مجھے اپنے خول میں سے نکل کر سب کے ساتھ شامل ہونا پڑا۔ ہم نے یہاں بہت خوشگوار ماحول پیدا کیا اور مختلف قسم کی کھیلیں شروع کیں۔ بیڈمنٹن جو کھیلنی شروع کی تو اس میں ہمارے ساتھ دو پولیس افسران بھی شامل ہوگئے جو اپنے محکمانہ مقدمہ میں یہاں حوالات بھگت رہے تھے۔ ہمارا کلب اس قدر منظم ہوا کہ میری تجویز پر یہاں باقاعدہ ٹورنامنٹس منعقد کئے گئے جنہیں ہم نے وسیع پیمانہ پر منظم کیا اور اس میں جیل کے دوسرے حصوں میں موجود بیڈمنٹن کے کھلاڑیوں کے علاوہ بعض افسران کو بھی مدعو کیا۔ لیگ سسٹم پر ہونے والے ان ٹورنامنٹس کے آخر پر فائنل میچ کے موقع پر ایک تقریب تقسیم انعامات بھی منعقد کی جاتی رہی جس میں مناسب تواضع کا اہتمام بھی کیا جاتا۔

ہم نے بیڈمنٹن کی گراؤنڈ اپنے کمروں کے سامنے لمبے صحن میں بنائی تو زمین نسبتاً گہری ہونے کے باعث ذرا سی بارش یا موسم سرما میں پوچا پھیرنے سے ہی وہاں اس قدر پانی کھڑا ہوجاتا کہ کئی روز تک کھیلنا ممکن نہ رہتا۔ اس وجہ سے بڑی بے چینی ہوتی۔ دوستوں نے اس کا حل تجویز کرنے کو کہا تو گرمیوں کی ایک شام میں نے کہا کہ اگر آپ میں سے تین چار دوست میرا ساتھ دیں تو اس کا حل نکال سکتا ہوں۔ سب نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو میں نے کہا بس آپ میرا

ساتھ دینے کا وعدہ کریں! اس پر تین چار قیدی دوستوں نے حامی بھر لی۔ میں نے انہیں کہا کہ کل صبح گنتی کھلتے ہی باہر آجائیں۔ میں نے چکر میں جا کر رات ہی کسیوں اور کدالوں کے لئے بات کر لی تھی۔ صبح سویرے گنتی کھلتے ہی ہم چکر میں گئے اور کھدائی کا سامان لے آئے اور دو ساتھیوں کو اپنے احاطہ میں گندے نالے کے اُس پار زمین کھودنے پر لگا دیا جہاں جھاڑیاں سی اُگی ہوئی تھیں اور خود باقی ساتھیوں کے ہمراہ مٹی ڈھونے پر لگ گیا۔ یہ وہ سبق تھا جسے ہم نے بچپن سے وقارِ عمل کے نام سے سیکھا تھا۔ چنانچہ سارے ساتھی جوش و خروش سے اس کام میں جت گئے اور دیکھتے دیکھتے ہماری بیڈمنٹن والی گراؤنڈ میں پڑنے والی مٹی سے سطح بلند ہونے لگی۔ ہمارے جو ساتھی ابتداء میں شامل نہ ہوئے تھے اور بعد میں آئے تو اتنا سارا کام دیکھ کر حیران رہ گئے اور دیکھا دیکھی وہ بھی شامل ہو گئے جس سے ہمارے کام کی رفتار اَور بھی بڑھ گئی اور جب تک ہمارا انچارج ہیڈ وارڈر آیا تو ہم اپنا کام قریباً مکمل کر چکے تھے۔ اس نے جب وہ گڑھا دیکھا جہاں سے مٹی نکالی جا رہی تھی تو پریشان ہو گیا کیونکہ اس قسم کا کام جیل میں کسی سازش کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے اسے تسلی دی کہ دیکھو ہمارے مشقتیوں کو جو کوڑا وغیرہ پھینکنے دور جانا پڑتا ہے، اب اس گڑھے میں پھینک دیا کریں گے اور اس طرح سے یہ گڑھا بھی چند دنوں میں بھر جائے گا، اس پر وہ مطمئن ہو گیا۔ جب ساری گراؤنڈ مٹی پڑنے سے مناسب حد تک اونچی ہو گئی تو ہم نے ایک رولر اور دمو سا منگوایا اور اس مٹی کو برابر کر کے دبانا شروع کیا۔ دو تین دن تک ہم پانی چھڑکا کر یہ عمل دہراتے رہے حتی کہ یہ جگہ خوب ہموار اور پکی ہو گئی تو ہم نے اس پر کھیلنا شروع کر دیا۔ اب کے اس پر کھیلنے کا اس قدر مزا آتا کہ بی کلاس وارڈ والے قیدی بھی یہاں آ کر کھیلنا پسند کرتے۔

میں نے یہاں سبزیاں بھی اُگائیں اور ایک کیاری بنا کر اس میں بینگن کی پنیری منگوا کر لگائی۔ اس کے بیس کے قریب پودے تیار ہوئے تو ہر دوسرے تیسرے روز دو تین افراد کی ہنڈیا کے لئے سبزی تیار ہو جاتی۔ جسے کبھی خود پکا لیتا تو کبھی اپنے دیگر دوستوں کو بھجوا دیتا۔ اسی طرح گھیا توری کی بیلیں جو نکلیں تو انہیں لسوڑھے کے درخت پر چڑھا دیا جہاں ایک ایک فٹ لمبی توریاں لگتی رہیں۔ اسی لسوڑھے کے درخت میں ایک دفعہ جو بڑی مکھی نے چھتا ڈالا تو ایک ماہر قیدی نے ایک روز اس میں سے شہد نکالا اور جاتے ہوئے مجھے بھی ایک حصہ دے گیا۔ زندگی میں چند مرتبہ ہی مکمل طور پر خالص شہد دیکھنے کا موقع ملا ہے، بس یہ بھی انہی میں سے ایک لمحہ تھا۔ میں نے سوچا کہ کچھ مقدار تو اس کی کسی ایسے موقع اور ضرورت کے لئے محفوظ کر لی جائے جب خالص شہد ناگزیر ہوتا ہے مثلاً آنکھ میں ڈالنے کے لئے! چنانچہ ایک چھوٹی سی شیشی میں اسے محفوظ کرنے کے بعد سوچا کہ لطف یہ ہے کہ آدمی عام کرے بہار کو، چنانچہ اپنے دوستوں کو جمعہ کے روز ناشتہ کی دعوت دی اور اس کے لئے خصوصی طور پر ڈبل روٹی منگوا کر اہتمام کیا۔ چنانچہ ہم پانچ چھ دوست اکٹھے ہوئے

اور بڑے مزے سے ناشتہ کیا اور خالص شہد سے لطف اندوز ہوئے مگر یہ بات میرے لئے بہت بڑا مسئلہ بن گئی اور وہ اس طرح کہ ہمارے انہی دوستوں میں سے کسی نے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ سے یونہی باتوں باتوں میں ذکر کر ڈالا کہ آج ہم نے خالص شہد سے ناشتہ کیا اور بڑا مزا آیا۔ اگلے روز مجھے پیغام ملا کہ فیکٹری پہنچوں اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مظہر وحید سے ملوں۔ جب میں وہاں پہنچا تو جسے میں بہت سلجھا ہوا ہمدرد انسان سمجھتا تھا، انتہائی کرخت انداز میں بولا کہ وہ شہد کہاں ہے؟ اِس اچانک اور غیر متوقع سوال سے میں نے حیران ہو کر پوچھا کونسا شہد؟ وہ پہلے سے بھی زیادہ کرخت ہو کر کہنے لگا کہ جس سے ناشتے کرتے رہے ہو! اب مجھے جو سمجھ آئی تو میں نے کہا وہ تو ختم ہو چکا۔ لیکن وہ نہ مانا اور اسے حاصل کرنے پر اصرار کرتا رہا مگر جب میری طرف سے ایک ہی وضاحت سنی تو تنگ کر کہنے لگا کہ ہم افسر ہو کر بازار سے خریدیں اور وہ بھی خالص نہ ملے اور تم قیدی ہو کر خالص شہد کھاؤ!!!

## انگوٹھی کا چوری ہونا!

یہ ذکر تو گزر چکا ہے کہ جنرل ضیاء کی طرف سے ظالمانہ اور سفاکانہ فیصلہ سنائے جانے کے بعد جب محترم صاحبزادہ مرزا حنیف احمد صاحب ملاقات کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے اپنی ایک عزیز ترین متاع مجھے عاریۃً عطا فرمائی تھی یعنی اپنی وہ انگوٹھی جس پر نگ کی جگہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قمیص مبارک کا ایک بٹن جڑا ہوا تھا اور اس کے دونوں اطراف الیس اللہ والا الہام اُبھرے حروف میں لکھا ہوا تھا۔ یہ انگوٹھی میرے سپرد کرتے ہوئے بطور نیک شگون آپ نے کہا تھا کہ باہر آ کر مجھے واپس کرنی ہے! کچھ اس لئے بھی اور زیادہ اس لئے کہ اس میں ایک نہایت بیش قیمت تبرک ہے، میں نے ہمیشہ اس کی ہر ممکن حفاظت کرنے کی کوشش کی۔ ابتداء میں تو اسے ہر وقت پہنے رکھتا جس سے کچھ عرصہ بعد میں نے دیکھا کہ اس میں جڑا سکہ کا بٹن ماحولیات سے متاثر ہونے لگا ہے تو میں نے انگوٹھی ابا جان کو دی کہ اسے مناسب طور پر محفوظ رکھنے کا انتظام کروا دیں چنانچہ ابا جان نے اس پر شفاف قسم کے کسی کیمیکل کی تہہ چڑھوا دی۔ اس کے بعد اس کی حفاظت اَور بھی زیادہ احتیاط کے ساتھ کرنے لگا اور جب بھی ہاتھوں کو معمولی سا پانی لگنے کا احتمال ہوتا، اسے اُتار کر جیب میں ڈال لیتا کہ دوران زمانہ طالب علمی ہمارے ایک سینئر ساتھی مکرم مغفور احمد منیب صاحب مربی سلسلہ نے نصیحت کی تھی جب بھی وضو کرنے لگو گھڑی یا انگوٹھی کسی جگہ رکھنے کی بجائے اپنے جیب میں ڈالا کرو۔ ہمیشہ اسی پر میرا عمل رہا اور اس سے بہت فائدہ اٹھایا، فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

یہ 1992ء کے موسم سرما کے آغاز یعنی ماہ نومبر کے آخری ایام کی بات ہے کہ ایک رات جب میں مطالعہ کرنے کے بعد دس بجے کے قریب سونے سے پہلے کمرے میں ہی بیت الخلاء والے کونے میں جانے لگا تو میں نے حسب معمول یہ

انگوٹھی اُتاری مگر خلاف معمول اسے جیب میں ڈالنے کی بجائے اپنے کمرے میں دروازے کے ساتھ پڑی ڈولی کے اوپر رکھ دیا کہ رات کا وقت ہے اور کمرا بند ہے۔ پھر میں فارغ ہو کر سیدھا بستر میں آ دبکا، کچھ دیر میں جب بستر گرم ہو چکا تو یاد آیا کہ انگوٹھی تو دوبارہ پہنی ہی نہیں! اس پر میں نے سوچا کہ صبح اُٹھ کر پہن لوں گا اور یہ میری دوسری غلطی تھی جس کا خمیازہ مجھے اگلی صبح اُس وقت بھگتنا پڑا جب وضو کر کے تولیہ سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے بے اختیاری کے عالم میں اُسی طرف میرا ہاتھ بڑھا جہاں گزشتہ شب انگوٹھی رکھی تھی تو ہاتھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اس پر میں نے اس جگہ کی طرف دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا دل دَھک دَھک کرنے لگا۔ اِسی عالم میں اپنے بستر کو دیکھا، میز پر نظر دوڑائی، ٹیبل لیمپ روشن کر کے نیچے فرش پر انگوٹھی کو تلاش کیا غرضیکہ لمحوں میں سب کچھ چھان پھٹک لیا مگر کہیں اس کا نام ونشان تک نہ ملا۔ اس کے بعد میں اپنے خیالات کو مجتمع کر کے چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ ہوا کیا ہے؟ کہاں انگوٹھی رکھی تھی؟ اس پر میں نے گزشتہ شب کے واقعات کی فلم آنکھوں کے سامنے سے گزاری تو سب کچھ یاد آ گیا۔ ثابت ہوا کہ وضو کرنے کے بعد میرا ہاتھ یونہی اس ڈولی کی بالائی سطح کی طرف نہیں گیا تھا۔ میرے ہاتھ کی وہ حرکت ذہن میں محفوظ اُس پروگرام کے نتیجہ میں تھی جو سوتے وقت انگوٹھی کا خیال آنے پر میں نے بنایا تھا کہ صبح اُٹھ کر پہن لوں گا۔ جب یقینی طور پر یاد آ گیا کہ میں نے انگوٹھی یہیں رکھی تھی تو ایک مرتبہ پھر اس کے اوپر نیچے تلاش شروع کی جس پر سامنے بیٹھا ہوا ڈیوٹی پر موجود وارڈر مجھ سے پوچھنے لگا کہ باؤجی! صبح صبح کیا گم ہو گیا جو اس قدر بے چینی کے ساتھ تلاش کر رہے ہیں؟ میں نے پہلے تو اس سے پردہ رکھنا چاہا مگر اُس کے اصرار پر بتایا کہ اس طرح سے میری انگوٹھی غائب ہو گئی ہے اور جب مجھے کمرے کے اندر کہیں سے نہ ملی تو یقین ہو گیا کہ اسے کسی نے چوری کر لیا ہے اور ظاہر ہے کہ رات کے وقت ڈیوٹی والا کوئی وارڈر ہی یہ حرکت کر سکتا تھا۔ اسی دوران اس وارڈر کا اِنچارج جو میرا اچھا واقف تھا، راؤنڈ کرتے ہوئے وہاں آ گیا۔ اسے صورت حال بتائی اور کہا کہ اس احاطہ میں رات دس سے دو بجے کی شفٹ میں ڈیوٹی دینے والے وارڈرز کے متعلق پتہ کر کے بتاؤ کہ وہ کون کون تھے۔ اُس نے وعدہ کیا اور اس کے بعد ان کی ڈیوٹی ختم ہوئی، گنتی کھلی تو میں نے باہر ماحول کا جائزہ لیا۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری چکی کے بالکل ساتھ والے پلاٹ کی کیاری میں لگے پھولوں کے ایک پودے کی ایک شاخ تازہ تازہ ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کے گرد اگرد گوڈی کی ہوئی زمین پر بھاری بھرکم بوٹوں کے نشان بھی موجود تھے۔ یہی بوٹوں کے نشان باہر سے آ کر سیدھے چلے جانے والے راستہ پر بھی موجود تھے جبکہ اس راستہ پر رات کے وقت کسی کے جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ (یاد رہے کہ جیل میں ہر روز شام کے وقت سارے راستوں پر پوچا کیا جاتا ہے جس پر رات بھر ہونے والی نقل وحرکت کا ریکارڈ نقش ہوتا چلا جاتا ہے) چنانچہ میں ان

نقوش کے تعاقب میں ادھر گیا تو گندے پانی کے نالے کے اُس پار اسی پودے کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ایک چھوٹی سی ڈھیری کی صورت پڑی تھیں گویا پودے سے شاخ توڑنے کے بعد انگوٹھی اٹھانے کے لئے جب اسے گھڑا گیا تو اس کی یہ زائد شاخیں اس نے وہاں دور جا کر پھینکیں تا کہ ہر قسم کا ثبوت غائب کیا جا سکے۔ تاہم اس نے یہ عمل میری چکی کے پہلو میں کھڑے ہو کر کیا کیوں کہ وہاں ایک ٹکڑ پر اسی شاخ کی بالکل باریک پتیاں گری ہوئی ملیں۔ میں نے دونوں جگہوں سے یہ پتیاں اور شاخیں علیحدہ علیحدہ لفافوں میں سنبھال لیں۔ اسی دوران مجھے یاد آیا کہ صبح سویرے جب میں ٹیبل لیمپ لے کر انگوٹھی تلاش کر رہا تھا تو لیمپ کی روشنی میں ڈولی کے اوپر پڑی مٹی کی تہہ پر بالکل اسی کونے میں کسی باریک نوک کے لگنے سے کچھ آڑھی ترچھی لکیریں بھی موجود تھیں جو غالباً انگوٹھی کو باہر سے چھڑی کے ذریعہ اُٹھانے کی کوشش میں لگی ہوں گی۔ یہ لکیریں بڑی نمایاں اور تازہ تھیں۔ اِن تمام اُمور سے انگوٹھی کے چوری ہونے کی واردات کا نقشہ بڑی وضاحت کے ساتھ تیار ہو گیا۔ ہمارے انچارج وارڈر نے تو زیادہ دلچسپی نہ لی مگر دیگر بہت سے واقف کاروں نے اپنے اپنے انداز میں بہت مدد کی، فجز اہم اللہ۔

صبح کی ڈیوٹی والے انچارج نے باہر بیرک میں جا کر رات ڈیوٹی پر متعین ملازمین کے بارہ میں پتہ کیا اور تینوں متعلقہ وارڈرز سے بات کی تو اُن میں سے ایک نہایت شریف النفس وارڈر جس کا نام صوفی امین تھا، صبح دس بجے دوبارہ اپنی ڈیوٹی پر آیا تو سیدھا میرے پاس آیا۔ اس نے بتایا کہ رات پہلی دس چکیوں پر اُسی کی ڈیوٹی تھی جبکہ اگلی دس چکیوں پر نذیر فوجی نامی وارڈر کی ڈیوٹی تھی۔ اس نے مزید بتایا کہ ہم یہاں اکٹھے ہی آئے تھے اور میں تالے چیک کرنے لگا تو نذیر کی نظر آپ کی انگوٹھی پر پڑی تھی اور اس نے نہ صرف اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا بلکہ میرے ساتھ اظہار بھی کیا تھا کہ انگوٹھی تو بڑی فرسٹ کلاس پڑی ہے!!! اور اس کے کچھ دیر بعد مجھ سے کہنے لگا کہ یار! تم ذرا میرے والے حصہ میں آ جاؤ اور میں یہاں ڈیوٹی کر لیتا ہوں۔ اُس وقت میرے ذہن میں بات نہ آئی کہ کیوں کہہ رہا ہے تاہم جب میں ڈیوٹی ختم کر کے جاتے ہوئے یہاں سے گزرا اور میری نظر پڑی تو یہاں انگوٹھی نہ تھی۔ وارڈر امین نے کہا کہ وہ اپنا یہ بیان حلفاً بھی دینے کو تیار ہے۔ اس صورت حال میں مجھے اپنے چور کے متعلق تو پتہ چل گیا مگر میرے لئے اس سے زیادہ اہم بات اُس انگوٹھی کا ملنا تھا جس کی قیمت چوری کرنے والے کے نزدیک تو زیادہ سے زیادہ سو روپے تک ہو سکتی تھی جبکہ اس کی اصل قدر کا تو مجھے ہی اندازہ تھا۔ اس لئے اس مرحلہ پر بہت زیادہ حکمت کے ساتھ چلنے کی ضرورت تھی تا کہ ہر صورت میں انگوٹھی واپس آ جائے جس کا جیل سے باہر چلے جانے کے بعد بظاہر امکان بہت کم تھا۔

اس صورت حال میں ہم نے نذیر فوجی کو بلانے کی کوشش کی مگر وہ کئی روز تک ہمارے قابو نہ آیا۔ اس پر ہمارا یقین

شک حقیقت میں بدلتا گیا۔ ہمارا ایک دوست بشیر بائی تھا جو سنیئر وارڈر تھا، اس کے علم میں یہ صورت حال آئی تو اس نے نذیر فوجی سے جا کر بہت دھمکی آمیز باتیں کیں اور اسے باور کرایا کہ اس کے تعلقات بہت سے افسران کے ساتھ ہیں اس لئے اس کے پاس جا کر معاملہ سیدھا کرلو وگرنہ تمہیں مشکل کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔ اس پر کئی روز کے بعد آخر کار وہ دوپہر کے وقت میرے پاس آیا تو ہمارے بابا چشتی صاحب بھی میرے پاس موجود تھے۔ وہ تو اس کے ساتھ اس حد تک سیدھے ہوگئے کہ مجھے مداخلت کرکے معاملہ ٹھنڈا کرنا پڑا۔ پھر اُسے چکی سے باہر لے جا کر میں نے بتایا کہ میری انگوٹھی چوری کرنے والے نے سامنے والے اُس پودے سے شاخ توڑی، اُسے یہاں اس جگہ آ کر گھڑا پھر اس کی باقیات اُس سامنے والے گندے پانی کے نالے کے اُس پار جا کر رکھیں اور یہاں سے کھڑے ہو کر میری انگوٹھی اُس چھڑی سے اُٹھائی۔ میں یہ باتیں کر رہا تھا اور نذیر فوجی کا چہرہ دیکھنے والا تھا، اس کا رنگ فق ہوئے جا رہا تھا کیونکہ عین اُن حقائق کے مطابق یہ تفصیلات تھیں جن سے وہ خود گزرا تھا۔ پھر میں نے بڑے تحمل سے اُسے سمجھایا کہ دیکھو میری انگوٹھی چوری کرنے والا اُسے بیچ کر زیادہ سے زیادہ ایک سو روپے کمالے گا جبکہ میری رپورٹ پر اگر تفتیش کے باوجود چور نہ مل سکا تو بڑے صاحب نے اُس رات ڈیوٹی دینے والے چھ کے چھ ملازموں کی کم از کم ایک ایک ترقی بند کر دینی ہے کیونکہ آخر اُنہی میں سے کسی نے انگوٹھی چرائی ہے۔ اس لئے پیشکش کرتا ہوں کہ وہ سو روپیہ میں خود اس ملازم کو دیتا ہوں وہ مجھے بس انگوٹھی واپس کر دے۔ اِس کے بعد ان لوگوں کی نفسیاتی رَگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک نسخہ آزماتے ہوئے اسے کہا "اس انگوٹھی پر کلام بھی لکھا ہوا ہے" اور اسے ڈرایا کہ یہ نہ ہو کہ وہ کلام اُلٹا پڑ جائے۔ یہ بہر حال حقیقت بھی تھی کہ اس پر دو مرتبہ قرآنی آیت الیس اللہ بکاف عبدہ لکھی ہوئی تھی۔ میری اس بات سے وہ کچھ اَور گھبرایا اور کہنے لگا کہ میں باہر جا کر دوسرے ساتھیوں سے پوچھتا ہوں اور اگر مجھے اپنے پاس سے بھی کچھ دینا پڑا تو میں دینے کے لئے تیار ہوں مگر آپ کی انگوٹھی واپس دلانے کی پوری کوشش کروں گا۔ اس کے بعد وہ جلدی سے جانے لگا تو میں نے کہا ٹھہرو! ایک دو باتیں اَور بھی یاد رکھنا، ایک تو یہ کہ مجھے چور نہیں چاہئے، وہ بے شک میرے کمرے میں رات کے وقت انگوٹھی پھینک جائے اور دوسرے یہ کہ جب وہ پھینکے تو اس بات کا خیال رکھے کہ وہ دروازے سے پھینکنے کی بجائے کھڑکی کی طرف سے پھینکے تاکہ وہ میرے بستر پر آ کر گرے یہ نہ ہو کہ کہیں وہ کونہ میں بنی ہوئی ٹائیلٹ کی طرف چلی جائے۔ میری باتیں سن کر اس نے وعدہ کیا کہ ایسا ہی کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ وہ چلا گیا اور مجھے پوری تسلی ہوگئی کہ اب انگوٹھی واپس مل جائے گی، انشاء اللہ العزیز۔

اُسی روز میں نے رات پونے سات بجے نمازِ عشاء ادا کی اور اس کے بعد جائے نماز پر بیٹھے بیٹھے اپنے پیچھے بچھی

چارپائی کے ساتھ ٹیک لگا کر تسبیحات کرنی شروع کیں تو اسی دوران میری نگاہ سرسری طور پر بستر پر پڑی، مجھے وہاں کسی چیز کے پڑے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ میری انگوٹھی تھی، خوشی سے میرا سانس پھول گیا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی یہ وہی انگوٹھی ہے! وفورِ جذبات سے سمجھ نہ آئی کہ کس کس طرح الحمدللہ کہوں، اُس لمحہ تو میرے جسم کا ذرہ ذرہ حمد و شکر سے عبارت ہوگیا اور میری روح اپنے رب کے آستانہ پر بہہ پڑی کہ ایک بہت بڑا معرکہ سر ہوا تھا۔ چوری کی گئی یہ انگوٹھی جیل سے باہر چلے جانے کے باوجود مجھے واپس مل گئی تھی، الحمدللہ ثم الحمدللہ۔

انگوٹھی کی یہ واپسی میرے اُس فارمولے کے عین مطابق ہوئی تھی جو چند گھنٹے قبل میں نے نذیر فوجی کو سمجھایا تھا۔ اس کی تصدیق اس امر سے بھی ہوئی کہ اگلی صبح انہی چکیوں میں مقید ایک واقف حال اختر نامی قیدی میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ انگوٹھی مل گئی ہے؟ میں نے پوچھا تمہیں کس نے بتایا ہے۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ گزشتہ رات سات بجے سے پہلے میں نے نذیر فوجی کو اس وارڈ میں کھڑکیوں کی طرف سے گزرتے دیکھا تھا جس سے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ انگوٹھی پھینکنے ہی آیا ہوگا۔ میں نے اس کے اندازے کی تصدیق کی اور اسے یہ خوشخبری سنائی کہ واقعی مل گئی ہے۔ اس کی بات سے یہ بھی یقین ہوگیا کہ اسے اسی نذیر فوجی نے ہی چرایا تھا تاہم میں نے اس معاملہ کو مزید طول نہ دیا کہ ہمارا اصل مقصد حل ہوگیا تھا، الحمدللہ۔

## احمدی اسیران کی آمد

16 نومبر 1992ء کی بات ہے کہ گنتی بند ہونے کے وقت پتہ چلا کہ کچھ احمدی قیدی جیل آئے ہیں اور انہیں یہاں اسی وارڈ میں بند کیا جائے گا۔ اس کے بعد تھوڑی ہی دیر میں نو (۹) معصوم مخلص احمدی اسیران راہِ مولیٰ کو یہاں لایا گیا جن میں بڑی عمر کے بزرگ بھی شامل تھے اور نوجوانوں کے ساتھ ساتھ ایک دو نوعمر بھی تھے۔ یہ سب احباب فیصل آباد کے چک نمبر 88 ج ب سے تعلق رکھتے تھے اور 9 نومبر 1988ء کو ان پر اپنے گاؤں کی مسجد میں اذان دینے پر مقدمہ ہوا تھا جس کا فیصلہ آج سنایا گیا اور انہیں تین تین سال قید بامشقت کے ساتھ جرمانہ کی سزا دی گئی تھی جسے بھگتنے کے لئے انہیں جیل بھجوا دیا گیا تھا۔

یہ سب اسیران اللہ کے فضل سے دینی غیرت اور خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے اور اس سزا ملنے پر فخر کے ساتھ سر بلند کئے ہوئے تھے۔ جب ہمارے پاس پہنچے تو ان کی کیفیت ایسی تھی گویا کہیں اپنے ہی گھر میں آ گئے ہوں۔ خاص طور پر جب ہمیں اختیار دیا گیا کہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق مختلف چکیوں میں بند کروالیں۔ چنانچہ ہم نے دو تین چکیاں خالی کروا کر اپنے قریب بند کروایا اور فوری طور اپنے پاس موجود سامان میں سے ان کے کھانے کا انتظام کیا اور

اگلے روز صبح کے ناشتہ کے لئے اُسی وقت ایک ملازم سے سامان لانے کو کہہ دیا۔ چنانچہ اگلی صبح ناشتہ کرنے کے بعد انہیں ملاحظہ کے لئے لے جایا گیا اور واپس آئے تو اُن کی مشقت کے حوالہ سے ہم انتظام کر چکے تھے کہ اپنے اسی احاطہ میں کریں گے اور اس کے لئے انہیں باہر فیکٹری میں نہیں لے جایا جائے گا۔ تین چار دنوں میں ان دوستوں کی ضمانتیں ہوگئیں تو اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔ جتنے دن رہے ہمارے ہاں خوب رونق لگی رہی، با جماعت نمازیں ادا کی جاتی رہیں اور دیگر مشاغل از قسم کھیل وغیرہ میں بھی سبھی شامل ہوتے رہے۔ اس طرح سے ہم نے حتی الامکان ان اسیران کو جیل میں ہونے کا احساس نہ ہونے دیا، الحمدللہ۔

## جیل ملازمین کا رشوت مانگنا

ہمارے ملک میں جیل کیا ہر جگہ ہی رشوت ایک بنیادی ضرورت بن چکی ہے چنانچہ جیل میں بھی ہر بڑے سے بڑا کام اس کی بدولت ممکن ہو جاتا تھا اور چھوٹے سے چھوٹا کام اس کے بغیر ناممکن! اس معاملہ میں شروع سے ہی میں نے یہ طرز عمل رکھا کہ اگر کسی کو کچھ دینا ہو تو ایسے طور پر دیا جائے کہ ایک وقار بھی قائم رہے ورنہ جیل کا عملہ ایسے قیدی کی بلیک میلنگ شروع کر دیتا تھا اور ایک مرتبہ دی ہوئی رشوت اس کے لئے مستقل طور پر وبالِ جان بن جاتی تھی۔ چنانچہ میں نے کبھی ایسے موقع پر کسی کو ایک روپیہ بھی نہ دیا جو مجھے کسی بھی صورت حال سے ڈرا دھمکا رہا ہوتا۔ اللہ کے فضل سے ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے جو ہمت اور توفیق ملتی رہی اس سے یہ راہ بہت آسان ہو جاتی رہی۔

اس ضمن میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ ہدیہ قارئین ہے کہ ایک مرتبہ عباس نامی ہیڈ وارڈر جس کی ڈیوٹی ہماری وارڈ پر تھی، دوپہر کے وقت میرے پاس آیا۔ اُس وقت میں نمازِ ظہر ادا کر کے باہر بچھی چٹائی پر لیٹا دھوپ سینک رہا تھا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد کہنے لگا کہ مجھے ایک جرسی تو لے دو! میں نے کہا اب تو سردیاں ختم ہو رہی ہیں، تم نے جرسی کیا کرنی ہے؟ اس پر کہنے لگا اچھا پتلون ہی لے دو! میں نے کہا ٹھیک ہے دیکھوں گا۔ 20 چکی میں میرا معمول تھا کہ جو بھی ہیڈ وارڈر ڈیوٹی پر آتا، مہینہ کے اختتام پر اسے خود بخود سو پچاس (حسب حالات) دے دیا کرتا، اب کے بھی میرا یہی خیال تھا مگر اس نے دو تین روز بعد ہی اپنا آپ دکھانا شروع کر دیا۔ مختلف طریقوں سے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا لیکن جب مجھے علم ہوا کہ اپنے آپ کو بڑا بدمعاش سمجھنے والا ایک شخص ڈینگیں ہانکتا پھر رہا ہے کہ ہیڈ وارڈر اس کے کہنے پر الیاس کو تنگ کر رہا ہے تو مجھے احساس ہوا کہ ہیڈ وارڈر کا بدلا ہوا رویہ دراصل اس وجہ سے ہے کہ میں نے فوری طور پر اسے اس کی مطلوبہ رقم کیوں نہ دی! اس پر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ میرے ذہن میں تو اسے نہ دینے کا خیال تک نہ تھا مگر یہ کر کیا رہا ہے۔ اس پر سب سے پہلے تو میں نے ہیڈ وارڈر کو بلا کر پوچھا کہ کیا اُس نے

یہ حرکت کی ہے؟ اس نے آئیں بائیں شائیں کرنے کی کوشش کی مگر میں اُس سے اعتراف کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس پر میں نے اسے مزید کچھ نہ کہا اور اگلی صبح گنتی کھلنے کے بعد جبکہ میرے والے احاطہ کا ہفتہ وار دورہ تھا جس میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے بھی آنا تھا، میں سنٹر چکر میں گیا اور چیف ہیڈوارڈر سے کہا کہ آج دورہ کے دوران میں سکول جانے کی بجائے اپنے کمرے کے سامنے ہی کھڑا ہوں گا۔ وہ پوچھنے لگا کیوں؟ میں نے کہا کہ عباس ہیڈوارڈر مجھ سے پتلون مانگتا ہے، میں نے بڑے صاحب سے پوچھنا ہے کہ کیا اسے لے دوں؟ میری یہ بات سن کر چیف یکدم چونک کر کھڑا ہو گیا اور بڑی لجاجت سے کہنے لگا کہ ایسا نہ کرو، میں اُس خبیث کو خود پوچھ لیتا ہوں، اس کی ایسی کی تیسی وغیرہ پتہ نہیں کیا کچھ کہہ گیا۔ میں نے پھر بڑے تحمل سے کہا نہیں چیف صاحب مجھے صاحب سے پوچھ لینے دیں، اس میں حرج ہی کیا ہے؟ مگر اس نے پوری طرح یقین دہانی کرائی کہ وہ خود ہی اس کی خبر لے گا۔ چنانچہ اس کے بعد عباس ہیڈوارڈر ایسا سیدھا ہوا کہ چند ماہ بعد اس کا کسی دوسرے شہر تبادلہ ہوا تو جانے سے پہلے بطور خاص مجھے ملنے آیا اور اپنے کئے کی معافی مانگ کر گیا۔

یہ تو مشتے از خروارے ایک واقعہ ہے ورنہ اِس طرح کے متعدد واقعات ہوتے ہی رہتے تھے اور ایسے مواقع پر جس نے بھی دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا، اللہ کے فضل سے عزت بھی بڑھی، وقار بھی ملا اور روز روز کی گیدڑ بھبکیوں سے بچا بھی رہا اور جس نے ڈر کر ایک مرتبہ کچھ دے دیا، وہ ہمیشہ کے لئے وبال جان بن گیا۔ ہر دوسرے روز اس کے لئے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر کے اس سے کچھ نہ کچھ بٹورتے رہتے۔ اس کے برعکس ایسے شریف ملازم جو عزت کرتے اور باہمی تعاون سے پیش آتے، ان کے بچوں کا خیال ہم بھی رکھتے بلکہ اپنے آپ رکھتے تھے جس سے ہمارے تعلقات بھی بنتے اور یہ تعلقات بعض نازک مواقع پر ایسے کام آئے کہ ہمیں ہزاروں کا فائدہ دے گئے، الحمدللہ۔

### ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کی بیعت

جیل انتظامیہ میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں، بڑے صاحب سے لے کر سپاہی تک ایک جیل سے دوسری میں آتے جاتے رہتے تھے۔ عموماً تو سبھی جیل اہلکاروں کی ذہنیت ایک جیسی ہوتی مگر بعض نیک خصلت بھی ہوتے۔ ایسی صورت میں کبھی جانے والے کا افسوس ہوتا تو کبھی آنے والے کا۔ تاہم سالہا سال کے واقعات نے ہمیں ان باتوں کا عادی بنا دیا تھا اور اب ہمیں آنے جانے والوں سے کوئی فرق نہ پڑتا۔

اسی دوران فیصل آباد جیل میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ محترم میاں فہیم الدین صاحب تبدیل ہو کر جو آئے تو ان کے متعلق بہت شہرہ ہوا کہ وہ بہت سخت ہیں اور یہ کہ ہر وقت ان کی آنکھیں ماتھے پر رہتی ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی تو

دیکھا کہ واقعی موٹی موٹی آنکھیں جو ہر وقت سرخ رہتیں، ان کے مزاج کی نشاندہی کرتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ جیسے ہر وقت نشہ میں رہتے ہوں۔ غیر معمولی رعب کے ساتھ بات کرنا ان کا طریق تھا، یہی وجہ تھی کہ قیدی ان سے بہت خوف کھاتے۔ لیکن مجھ پر ان کی کسی بات کا اثر نہ تھا کیونکہ ایک تو مجھے ان سے کوئی واسطہ نہ پڑا علاوہ ازیں میں اپنے کام سے کام رکھتا۔

لیکن ایک روز کیا ہوا کہ مجھے ملاقات کے لیے ڈیوڑھی بلوایا گیا تو وہاں دیکھا کہ محترم صاحبزادہ مرزا فرید احمد صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں اور میاں فہیم صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ مجھے محترم میاں صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا اور اس وقت سے ایک تعلق بن گیا تھا جسے آپ خوب نبھاتے۔ ادھر میاں فہیم صاحب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی صاحبزادہ صاحب کے جاننے والے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس تعلق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے ساتھ ملاقات کا پروگرام بنالیا اور فیصل آباد چلے آئے۔ محترم مرزا فرید احمد صاحب کی یہ ملاقات میاں فہیم صاحب کے ساتھ میرے تعلق کا باعث بن گئی۔ ساری جیل جس میاں فہیم سے ڈرتی تھی، وہ میرے دوست بن گئے۔ موصوف میرے پاس آجاتے اور چائے وغیرہ نوش کرتے خصوصاً جب رات کی ڈیوٹی پر ہوتے تو دیر تک میرے پاس آکر کھڑے رہتے۔ مجھے تو صرف محترم صاحبزادہ صاحب کا حوالہ ہی معلوم تھا اس کے علاوہ مجھ کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کے پس منظر میں کیا ہو رہا ہے۔ ایک روز مجھے کہنے لگے کہ میں بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی اس بات نے مجھے چونکا کر رکھ دیا۔ ایک جیل افسر اور وہ بھی ایسا افسر جس میں پولیس افسران کی تمام ''خصائل'' موجود ہوں، کا بیعت کرنا کسی طرح بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لیکن موصوف تو میرے پیچھے ہی پڑ گئے اور ایک روز ایک کاغذ پر بیعت کا مضمون لکھ کر بھی لے آئے۔ میں نے ٹرخانے کی بہت کوشش کی مگر ان کے اصرار اور اپنے بعض بزرگوں کے مشورہ پر اس تحریر پر اپنے تصدیقی دستخط کر کے حضور کی خدمت میں ارسال کر دیا اور بہت استغفار کرتا رہا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو رہی ہو۔

بیعت کرنے کے بعد انہیں فیصل آباد کے نہایت مخلص دوست مکرم شیخ رفیق احمد صاحب کے سپرد کر دیا جنہوں نے انہیں جماعت میں متعارف کرایا اور ان کی ابتدائی تربیت کا فرض ادا کیا۔ اُن دنوں ایم ٹی اے کی نشریات کا آغاز ہو چکا تھا اور اتفاق سے محترم میاں فہیم صاحب کا سرکاری گھر جیل کی اُس دیوار کے بالکل ساتھ تھا جس کے اندر میرا احاطہ تھا۔ چنانچہ میری درخواست پر میاں فہیم صاحب نے مکرم شیخ صاحب کو اجازت دی کہ وہ ان کے گھر ڈش انٹینا لگا دیں جہاں سے ایک بوسٹر کے ذریعہ ایم ٹی اے کے پروگرام بآسانی میرے کمرے تک پہنچنے لگے۔ خاکسار کو ٹی وی رکھنے کی اجازت حکومت پنجاب کی طرف سے مل چکی تھی جس کے نتیجہ میں ایم ٹی اے کے آغاز سے ہی جیل میں ہونے کے

باوجود اس عظیم نشریاتی ادارہ کا فیض نصیب رہا، الحمدللہ وجزاہم اللہ احسن الجزاء۔ علاوہ ازیں محترم میاں صاحب کے گھر میں بھی ایم ٹی اے دیکھا جانے لگا جس کا ان کے سارے گھر والوں پر نیک اثر پڑا، الحمدللہ۔

ابتداء میں اگرچہ میاں فہیم صاحب نے اپنے احمدی ہوجانے کا ذکر عام نہ کیا مگر عشق اور مشک بھی کبھی چھپانے سے چھپے ہیں۔ آہستہ آہستہ سب کو پتہ چل گیا، کچھ میرے ساتھ تعلق کی وجہ سے اور کچھ ان کے اخلاق وکردار میں حیرت انگیز تبدیلی کی وجہ سے! لوگ حیران تو ہوتے ہوں گے کہ اچھے بھلے میاں فہیم کو کیا ہوگیا کہ ''سب کچھ'' چھوڑ چھاڑ بیٹھا ہے! اس کے جلد بعد خاکسار کی رہائی ہوگئی تو بھی محترم میاں صاحب سے رابطہ رہا۔ آپ ربوہ بھی تشریف لائے، آنے جانے والوں کے ذریعہ ان کے بارہ میں پتہ چلتا رہا۔ ان کی اہلیہ اور پھر بچوں نے بھی بیعت کی اور بڑے اخلاص کے ساتھ جماعتی نظام کے ساتھ منسلک ہوگئے۔ اس کے بعد ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہونا تھا جو عموماً ہوا کرتا ہے چنانچہ انہیں بھی سخت حالات بھی دیکھنے پڑے، دور دراز تبادلہ ہوتے رہے، محکمانہ مقدمات بنتے رہے اور مختلف انداز سے پریشان کیا جاتا رہا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپ نے استقامت کی توفیق پائی اور ایسے تمام حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اب ان حالات سے تنگ آکر اپنی ملازمت تک کو خیر باد کہہ کر برطانیہ میں آباد ہوگئے ہیں اور یہاں بھی جماعتی خدمت بجالا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے خلافت کی نعمت سے سرفراز رکھے اور اس کی برکات سے پوری طرح فیضیاب ہونے کی سعادت بخشے اور اسے ان کی نسلوں میں دور تک چلاتا چلا جائے، آمین۔

چھٹا باب:

## اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ

☆ سنٹرل جیل ملتان میں ایف اے

☆ کیمپ جیل لاہور میں بی اے

☆ سنٹرل جیل فیصل آباد میں فاضل عربی

☆ سنٹرل جیل فیصل آباد میں فاضل اردو

☆ سنٹرل جیل فیصل آباد میں ایم اے عربی کی تیاری

تمہیں خوشخبری ہو کہ قرب پانے کا میدان خالی ہے۔ ہر ایک قوم دنیا سے پیار کر رہی ہے اور وہ بات جس سے خدا راضی ہو اس کی طرف دنیا کو توجہ نہیں۔ وہ لوگ جو پورے زور سے اس دروازہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں اُن کے لئے موقع ہے کہ اپنے جوہر دکھلائیں اور خدا سے خاص انعام پاویں یہ مت خیال کرو کہ خدا تمہیں ضائع کر دے گا تم خدا کے ہاتھ کا ایک بیج ہو جو زمین میں بویا گیا خدا فرماتا ہے کہ یہ بیج بڑھے گا اور پھولے گا اور ہر ایک طرف سے اس کی شاخیں نکلیں گی اور ایک بڑا درخت ہو جائے گا پس مبارک وہ جو خدا کی بات پر ایمان رکھے اور درمیان میں آنے والے ابتلاؤں سے نہ ڈرے کیونکہ ابتلاؤں کا آنا بھی ضروری ہے تا خدا تمہاری آزمائش کرے کہ کون اپنے دعویٰ بیعت میں صادق اور کون کاذب ہے۔

(رسالہ الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۰۹)

# سرکاری امتحانات میں شرکت

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ

(علم حاصل کرو پنگھوڑے سے قبر میں جانے تک)

خاکسار نے تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ سے 1974ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد جامعہ احمدیہ ربوہ میں دینی تعلیم حاصل کی اور 1981ء میں اس عظیم ادارہ سے شاہد کی ڈگری حاصل کر کے میدانِ عمل میں قدم رکھا تھا۔ جامعہ کی تعلیم کے دوران بعض طلبہ سرکاری امتحانات بھی دیتے تھے اور فاضل عربی کے علاوہ ایف اے اور بی اے بھی کر لیتے مگر مجھے اس طرف کوئی رغبت نہ ہوئی۔ صرف ایک مرتبہ جامعہ کے آخری دنوں میں ایف اے کر لینے کا خیال آیا بھی تھا مگر کچھ دل نے ساتھ نہ دیا اور کچھ اُن دنوں مربیانِ سلسلہ پر امتحانات میں بلا اجازت شرکت کی تازہ تازہ پابندی لگی تھی اس وجہ سے بھی بات خیال سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اب جیل میں اور وہ بھی سزائے موت کے دور میں جبکہ مکمل فراغت تھی، ابا جان مرحوم نے اس طرف توجہ دلائی۔ گو ان دنیوی ڈگریوں سے اب بھی مجھے چنداں دلچسپی نہ تھی مگر 1987ء میں ابا جان نے مجھے ایف اے کا امتحان دینے کے لئے بہت زور دے کر آمادہ کر ہی لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ابا جان کے بار بار کہنے کی وجہ سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا، ویسے بھی اِس فارغ وقت سے اِستفادہ کی ایک اچھی صورت تھی۔ اس کے نتیجہ میں مجھے پہلے ایف اے پھر بی اے کے بعد فاضل عربی اور فاضل اردو کے امتحانات دینے کا موقع بھی ملا اور اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ کامیابی بھی عطا فرمائی، الحمدللہ۔ اس طرح سے حدیث نبویؐ **اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ** کی تعمیل میں اپنی تعلیم لحد تک جاری رکھی اور جیل کی سخت ترین کال کوٹھڑی کو بھی ''زندگی کا بقعہ نور'' کر ابنا دینے کی توفیق پائی۔ اِن امتحانات کے بعد ایم اے عربی کی تیاری کر رہا تھا اور داخلہ بھی بھیجا ہوا تھا کہ رہائی ہوگئی۔ بقول اُستاذی المکرم مولانا محمد احمد صاحب جلیل مرحوم، میں نے ''رہا ہونے میں جلدی کی'' ورنہ ایم اے بھی ہو جاتا تھا جو پھر کبھی نہ ہو سکا۔

## ایف اے کا امتحان

ایف اے کا امتحان دینے کا عزم کر لیا تو 26 راگست 87ء کو حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری درخواست برائے اجازت شرکت امتحان ایف اے کی منظوری آئی۔ اس کے بعد 20 ستمبر کو سپرنٹنڈنٹ صاحب کے دورہ پر میں نے

سرکاری طور پر منظوری حاصل کرنے کے لئے درخواست کی تو انہوں نے سکول ماسٹر صاحب کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ آئی جی صاحب کے نام درخواست لکھیں۔ چنانچہ اس عمل میں سے گزر کر مجھے جیل حکام کی طرف سے اجازت ملی تو ایف اے کے امتحان کے لئے باقاعدہ طور پر فارم پر کر کے بھجوائے گئے۔ جب فارم بورڈ میں پہنچے تو ان کی طرف سے ہدایت ملی کہ چونکہ میں نے میٹرک سرگودھا بورڈ سے کیا تھا اس لئے مجھے اُس بورڈ سے ایک NOC لانا ہوگا کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں کہ اب میں اپنا بورڈ تبدیل کرلوں۔ چنانچہ اس سرکاری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ابا جان نے سرگودھا بورڈ سے متعلقہ دستاویز حاصل کی اور جیل انتظامیہ کو لا کر دی پھر کہیں جا کر میرے داخلہ کا عمل مکمل ہوا۔ اس کے ساتھ ابا جان نے مجھے نصابی کتب لا دیں جن کا میں نے باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ اس طرح سے مطالعہ کی ایک اور صنف کا اضافہ ہوگیا اور میری مصروفیت اَور بھی بڑھ گئی۔ یہاں کوئی استاد تو میسر نہ تھا اس لئے اپنے طور پر کتب کا مطالعہ کرتا رہا اور لغت کی مدد سے انگریزی کی بھی تیاری کرتا رہا۔

اُن دنوں جیلوں میں تعلیم کی طرف کوئی زیادہ رُجحان نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر جیل میں امتحانی مراکز نہ ہوتے بلکہ صرف اُسی شہر کی جیل میں ہوتے جہاں بورڈ ہوتا۔ چنانچہ ساہیوال ملتان بورڈ میں تھا اس لئے میرا امتحانی مرکز سنٹرل جیل ملتان ٹھہرا۔ اس کے لئے مجھے ماہِ فروری 1987ء کے آخر پر سنٹرل جیل ملتان منتقل کر دیا گیا۔ یہاں منتقل ہونے اور اس جیل میں قریباً چھ ماہ کا عرصہ گزرنے کی تفصیل تو متعلقہ باب میں گزر چکی ہے، یہاں صرف امتحان کے حوالہ سے کچھ باتیں درج ہوں گی۔

## امتحان کی تیاری

سنٹرل جیل ملتان میں امتحان کی تیاری کے لئے مجھے ساہیوال کی نسبت کہیں زیادہ سہولت میسر آ گئی۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہاں نئے ہونے کی وجہ سے زیادہ واقفیت نہ تھی اس اعتبار سے مطالعہ کے لئے بہت زیادہ موقع ملا۔ علاوہ ازیں یہاں مجھے ماہر اساتذہ بھی میسر آ گئے تھے جن میں مکرم پروفیسر مبارک احمد مجوکہ صاحب سرفہرست ہیں۔ موصوف ایک مقامی کالج میں اٹھارویں گریڈ کے پروفیسر کی حیثیت سے انگریزی پڑھاتے تھے۔ آپ ہفتہ دو ہفتہ بعد ملاقات کے لئے تشریف لاتے اور میرے سیل کے سامنے باہر دھوپ میں ایک پیپے[1] پر بیٹھ کر مجھے سبق دیتے۔ انگریزی کے علاوہ دیگر مضامین میں بھی آپ میری رہنمائی فرماتے رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی احسن جزاء عطا فرمائے اور آپ کی نسلوں کو بھی اس سے نوازے، آمین۔ آپ اُن دنوں میرے پاس بار بار آنے کی وجہ سے افسرانِ جیل کی آنکھوں میں

---

[1] جیل میں قیدی ۱۸ کلو والے گھی کے کنستر کو ڈھکنا لگا کر اپنے صندوق کے طور استعمال کرتے تھے جو باہر سے آنے والے ملاقاتیوں کے لئے سٹول کا کام بھی دیتا تھا۔

کھٹکنے لگے۔ ایک مرتبہ تو ان کی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے پاس جو رپورٹ ہوئی تو اس سے بھی آپ کی اچھی خاصی جھڑپ ہوگئی اور آپ نے اسے کھری کھری سنادیں۔ جس پر انہیں میری ملاقات سے روک دیا گیا لیکن مجوکہ صاحب ہر ممکن کوشش کر کے ان دیواروں کو گرا کر مجھ تک پہنچتے رہے اور تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ آپ کی یہی محنت اور کوشش تھی جس کے نتیجہ میں مجھے اس امتحان میں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی، فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

محترم پروفیسر مجوکہ صاحب کے علاوہ محترم چوہدری اشتیاق احمد صاحب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل ھذا کے بیٹے مکرم طارق محمود صاحب اور بیٹی عزیزہ بشریٰ صاحبہ نے بھی میری بہت مدد کی۔ میں مشقیں حل کر کے مشقتی کے ذریعہ انہیں گھر بھجوادیتا اور وہ ان کی اصلاح کر کے واپس بھجوادیتے۔ اِس طرح سے مجھے بہت مفید رہنمائی میسر رہی، فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔ یہی وجہ تھی کہ میری تحریر میں اس قدر روانی آگئی تھی کہ ایک مرتبہ ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ راؤنڈ کرتے ہوئے میرے پاس آئے اور مجھ سے پڑھائی وغیرہ کے بارہ میں پوچھنے لگے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے تو انہوں نے پوچھا کس معاملہ میں؟ میں نے کہا کہ کم از کم میرے لکھے ہوئے مضمون ہی دیکھ لیا کریں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ کوئی لکھا ہے۔ میں نے اُسی وقت ایک مضمون انہیں دکھایا تو اسے پڑھ کر کہنے لگے کہ اس مضمون پر میں تمہیں ایم اے کی ڈگری دینے کے لئے تیار ہوں۔ اب یہ خدا ہی جانتا ہے کہ انہوں نے میرا دل رکھنے کے لئے کہا یا پھر اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے یا کوئی اَور تیسری وجہ تھی!

### امتحان کے ایام

ملتان بورڈ کی جاری کردہ ڈیٹ شیٹ کے مطابق ماہ مارچ کے اواخر میں میرے امتحان کا آغاز ہوا۔ اُس وقت موسم بہار اپنے جوبن پر تھا۔ جس روز پرچہ ہوتا، مجھے ہتھکڑی لگا کر ڈیوڑھی لے جایا جاتا اور وہاں مقررہ کمرہ میں پہنچ کر دوران امتحان ہتھکڑی کھول دی جاتی۔ میرا راستہ جیل کے مرکزی حصہ سے ہو کر گزرتا جو آموں کے گھنے پیڑوں سے جنگل بنا ہوا تھا۔ موسم بہار اور ان پیڑوں کی مناسبت سے کوئل کی سریلی اور نہایت شیریں کُوکُو کانوں میں اس طرح رَس گھولتی کہ جی خوش ہو جاتا۔ مختصر مگر ناقابل فراموش سفر طے کرنے کے بعد ڈیوڑھی پہنچتا تو ایک کمرے میں دو حضرات اپنی موجودگی میں مجھ سے پرچہ حل کرواتے۔ یہ حضرات بورڈ کی طرف سے مقرر کردہ امتحانی افسران تھے۔ ان میں سے جو صاحب ماتحت افسر تھے، وہ بالکل نوجوان اور غیر معمولی طور پر سلجھے ہوئے انسان تھے۔ میں نے غور کیا کہ جب میں پرچہ حل کر رہا ہوتا تو وہ میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہے ہوتے۔ ان کے انداز میں بہت پیار اور محبت کی جھلک ہوتی۔ خصوصاً جب مجھے ہتھکڑی میں یہاں لایا جاتا دیکھتے تو ان کی حالت ناقابل بیان ہوتی۔ اُن کے ساتھ مجھے بعد

میں بھی لمبے عرصہ تک رابطہ رہا حتی کہ ایک مرتبہ ان کا خط نہایت شکستہ تحریر میں ملا۔ پتہ کیا تو علم ہوا کہ ٹرین کے ایک حادثہ میں موصوف بری طرح جھلس کر زخمی ہو گئے تھے اور اُسی حالت میں انہوں نے مجھے یہ خط ہسپتال سے لکھا تھا، فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

میرے ساتھ ایک اور قیدی نے بھی امتحان دیا مگر وہ سزائے موت کا قیدی نہ تھا۔ دورانِ امتحان مجھے متعدد بار مدد کی بین السطور پیش کش بھی ہوئی مگر میرے تو وہم وگمان میں اس قسم کی بات نہ تھی، اس لئے اللہ کے فضل سے مجھے تمام پرچے مکمل طور پر ایسی مدد کے بغیر ہی حل کرنے کی توفیق ملی، الحمدللہ۔ جس پر ممتحن حضرات کو حیرانی بھی ہوتی تھی مگر اللہ تعالیٰ کو شاید یہی بات پسند آئی اور اُس نے میری کوشش میں برکت عطا فرمائی اور غیر معمولی طور پر مجھے اس امتحان میں شاندار کامیابی سے نوازا۔ ملتان بورڈ میں میری چوتھی پوزیشن تھی اور نیشنل ٹیلنٹ سکالرشپ کا مستحق قرار پایا، الحمدللہ۔ میری اس کامیابی کی خبر کئی اخبارات میں شائع ہوئی۔ ان میں سے ایک خبر حسب ذیل ہے:

## سزائے موت پانے والے قیدی کیلئے تعلیمی وظیفہ کا اعلان

> فیصل آباد (سٹاف رپورٹر) معلوم ہوا ہے کہ سزائے موت پانے والے ایک نوجوان قیدی الیاس منیر کو ملتان بورڈ کی جانب سے وظیفہ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس قیدی نے ایف اے کا امتحان دیا تھا جس میں اس نے 744 نمبر حاصل کئے تھے۔ اس طرح اس نے بورڈ میں چوتھی پوزیشن حاصل کی تھی۔ سابقہ مارشل لاء حکومت کے دور میں سرسری سماعت کی ایک فوجی عدالت نے الیاس منیر کو سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ وزیراعظم بینظیر بھٹو کی حکومت کی جانب سے قیدیوں کی سزا کی معافی کے نتیجہ میں اب الیاس منیر کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہو چکی ہے۔ معلوم ہوا کہ ملتان بورڈ کے سیکرٹری کی جانب سے وظیفہ پانے کی اطلاع فیصل آباد جیل میں دی گئی ہے۔[1]

---

[1] ”ڈیلی رپورٹ“ فیصل آباد 22 دسمبر 88ء

# بی اے کا امتحان

ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد جبکہ میں ملتان سے سنٹرل جیل فیصل آباد منتقل ہو چکا تھا، ابا جان نے فوری طور پر بی اے کا امتحان دینے کا کہنا شروع کر دیا اور اس کے لئے کتابیں بھی لا دیں اور داخلہ فارم بھی۔ اُس وقت میری سزائے موت عمر قید میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس اعتبار سے ایک طرف ذہنی کھچاؤ کم تھا تو دوسری طرف نسبتاً آزاد ماحول ہونے کے باعث مصروفیات زیادہ تھیں۔ تاہم میں نے اس امتحان کی بھی تیاری شروع کر دی جس کے نتیجہ میں 1990ء میں پنجاب یونیورسٹی سے B.A کا امتحان بھی پاس کر لیا، الحمدللہ۔ اس مرتبہ میں نے فیصل آباد کے رہنے والے ایک احمدی نوجوان قیدی عزیزم محمود احمد کو بھی اس امتحان کے لئے تیار کیا۔ یہ نوجوان پہلے سے ایف اے پاس تھا اور کچھ عرصہ قبل اُسے ایک قتل کے الزام میں سزائے موت سنائی گئی تھی تاہم اب اس کی سزا بھی ہمارے ساتھ ہی عمر قید میں تبدیل ہو گئی تھی۔

### امتحانی مرکز کیمپ جیل لاہور

جیسا کہ اوپر ذکر گزر چکا ہے کہ اُن دِنوں امتحانی مرکز صرف اُسی شہر کی جیل میں بنایا جاتا تھا جہاں بورڈ یا یونیورسٹی کا مقام ہوتا۔ اس اعتبار سے پنجاب یونیورسٹی سے منسلک بی اے کے قیدی اُمیدواروں کے لئے امتحانی مرکز کیمپ جیل لاہور قرار پایا۔ چنانچہ امتحان سے چند روز قبل جون 1990ء کے آخری ایام تھے کہ ایک روز لاہور کے لئے ہماری گارد لگی اور عصر کے بعد ہمیں اس کے سپرد کر دیا گیا جو ہمیں لے کر لاہور کے لئے روانہ ہوئی۔ یہاں پہنچنے کے اگلے روز ہی ہمارا پہلا پرچہ تھا۔

اس جیل میں کمرہ امتحان جیل کے سٹور (خوراک) میں بنایا گیا تھا۔ چنانچہ ہم اناج کی بوریوں اور سرخ مرچ کی ہر دم چڑھتی ہوئی نسوار کی فضا میں بی اے کا امتحان دیتے رہے۔ مزید برآں یہاں بیٹھنے کے لئے کرسی میز بھی نہ تھا بلکہ پرائمری سکولوں کی طرح ٹاٹوں پر نیچے بیٹھ کر اپنے گھٹنوں پر امتحانی گتہ رکھ کر پرچے حل کرتے رہے۔ پہلا پرچہ ہوا تو اُس وقت تک ہمیں بیڑیاں بھی لگی ہوئی تھیں جن کی وجہ سے صحیح طرح بیٹھنا بھی ممکن نہ تھا۔ اس کے فوراً بعد بیڑیاں اُتار دی گئی تھیں اور باقی پرچے ہم نے سہولت کے ساتھ دیئے۔

یہاں امتحان دینے والوں کی کافی تعداد تھی۔ ان میں ایک دو سکھ نوجوان بھی تھے جنہیں بھارتی ہوائی جہاز اغواء کر کے لاہور لانے پر سزائیں ہوئی تھیں اور اس وقت سنٹرل جیل لاہور میں اپنی سزا کاٹ رہے تھے۔ علاوہ ازیں دیگر

امیدواروں میں لاہور کا ایک طالب علم لیڈر بھی تھا جو چند روز قبل ہی گرفتار ہوا تھا۔ یہ پہلے روز کی بات ہے کہ دوران امتحان کچھ ہل چل سی ہوئی، پیچھے دیکھا تو ممتحن صاحب اُسی طالب علم لیڈر سے کچھ کہہ رہے تھے۔ چند منٹ میں معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بعد میں اصل بات کا پتہ چلا کہ اس طالب علم لیڈر کا پرچہ دراصل وہ سکھ نوجوان حل کر رہا تھا جسے سنٹرل جیل سے محض امتحان بلکہ اسی کے پرچے حل کرنے کے لئے منتقل کیا گیا تھا اور وہ خود بھی محض امتحان دینے کے لئے گرفتار ہوا تھا۔ اس پر ممتحن نے روکا کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے تو طالب علم لیڈر نے بڑی ڈھٹائی اور اعتماد سے کہا کہ اس طرح ہوگا کہ یہ پرچہ حل کرے گا اور آپ دیکھیں گے۔ اس کے بعد مزید کسی بحث کی گنجائش نہ تھی۔ یہ حال ہو چکا تھا ہمارے معاشرے کا اُس وقت، اب تو خیر سے اور بھی ترقی ہو چکی ہوگی!

ہم نے یہاں بی اے کا امتحان بھی دوسروں کے برعکس اپنی مدد آپ کے تحت دیا۔ امتحان ختم ہوا تو چند روز بعد ہمیں واپس فیصل آباد سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ نتیجہ ہمیں یہیں ملا جس کے مطابق اللہ کے فضل سے یہ امتحان بھی خاکسار نے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا، الحمدللہ۔

## فاضل عربی

بی اے کا امتحان دینے کے بعد ایک تو نتیجہ آنے میں کچھ تاخیر ہوئی اور دوسرے یہ کہ ایم اے کے امتحان میں بیٹھنے کے لئے میرا دورانیہ اگرچہ 1992ء میں پورا ہو جاتا تھا مگر یونیورسٹی کے مطابق 1990ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے والے ایم اے کے لئے 1994ء والے امتحان میں ہی بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ ابا جان نے مجھے ہدایت کی کہ اس فارغ وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فاضل عربی کا امتحان دے دوں۔ جس پر میں نے اس کی تیاری شروع کر دی۔ نصاب تو کم وبیش جامعہ میں ہی پڑھا ہوا تھا، اب تو صرف ایک قسم کی دُہرائی تھی سو وہ میں نے شروع کر دی۔ اب کے امتحانی مرکز ہماری اسی جیل میں بنا اور یہاں ایک بڑے سے ہال میں باوقار طور پر امتحان لینے کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں اب اُس احاطہ کو سکول کے لئے مختص کر دیا گیا تھا جو دراصل اے کلاس قیدیوں کے لئے سپیشل وارڈ کے طور پر تھی اور ہم بی کلاس یافتہ قیدی بھی یہاں کچھ دیر رہ چکے تھے۔ یہاں باقاعدہ سکول کی طرز پر کلاسز ہوتی تھیں جن میں خواہشمند قیدیوں کے لئے باقاعدہ تعلیم کا انتظام تھا۔ اس لئے اب یہاں سارا سال ہی کسی نہ کسی معیار کے امتحان ہوتے رہتے تھے، کبھی مڈل تو کبھی میٹرک۔ اس کے علاوہ ایف اے، بی اے اور ایم اے تک کے امتحان یہاں ہوئے۔

میں نے اللہ کے فضل سے اپریل 1992ء میں فاضل عربی کا امتحان بھی دینے کی توفیق پائی اور بعد ازاں نمایاں طور پر اللہ نے کامیابی بھی عطا فرمائی، الحمدللہ۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ بات عرض ہے کہ اس امتحان کے آخر پر زبانی حصہ کا

مرحلہ آیا تو جو صاحب امتحان لینے کے لئے باہر سے آئے تھے، وہ مجھے ایک قیدی سمجھ کر بڑی شفقت سے پیش آئے اور صرف ونحو کے آسان آسان سوال پوچھتے رہے۔ آخر پر بڑے محتاط انداز میں کہنے لگے کہ اگر میں کچھ عربی میں بھی بات کرلوں تو کیا ممکن ہے؟ میں نے کہا ضرور ضرور۔ اس پر انہوں نے کوئی سادہ سا سوال عربی میں پوچھا تو بے ساختہ جواب سن کر حیران ہو گئے اور کہنے لگے کہ کہاں کے پڑھے ہوئے ہو تم؟ میں نے جھٹ سے کہا ''ربوہ!'' تو بے اختیار بولے: تو پھر بالکل درست ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مزید کسی سوال کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس دوران ہمارے سکول کے انچارج قاری صاحب بھی موجود تھے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ بھی ایسے مرعوب ہوئے کہ باوجود کٹر اور متعصب مولوی ہونے کے، آخر تک کبھی میری مخالفت کرنے کی اُنہیں ہمت نہ ہوئی بلکہ اِس کے برعکس سکول کے معاملات میں اکثر اوقات مجھ سے مشورہ لیتے، الحمدللہ۔

## فاضل اُردو

ایم اے کا امتحان 1994ء میں ہی ممکن تھا اس لئے ابا جان نے اس وقت کو بھی ضائع نہ ہونے دیا اور مجھے فاضل اردو کے امتحان کے فارم لا دیئے۔ میں نے انہیں بھی جیل انتظامیہ کے ذریعہ پُر کر کے بھجوا دیا اور ابا جان کی مہیا کردہ کتب نصاب فاضل اردو کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہ نصاب میرے لئے وسعت مطالعہ کا باعث بنا کیونکہ اس میں دہلوی مکتب فکر کی نمائندہ مثنوی سحر البیان اور لکھنوی مکتب فکر کی نمائندہ مثنوی گلزار نسیم ایسے جامع ادبی شہ پارے شامل تھے جو اُردو کے طالب علم کے لئے اپنے اندر بہت کچھ رکھتے ہیں۔

چند ماہ کی تیاری کے بعد اپریل یا مئی 1993ء میں ہونے والے فاضل اردو کے امتحان میں پرچہ حل کرنے کے لئے بیٹھا تھا۔ اب کے ہمارے ممتحن اتفاق سے جھنگ کے رہنے والے ایک احمدی دوست مکرم سیال صاحب تھے۔ موصوف اس سے قبل ایک مرتبہ بی اے کا امتحان لینے کے لئے بھی یہاں آ چکے تھے، اس اعتبار سے ان کے ساتھ پہلے سے تعارف تھا۔ اگرچہ اردو فاضل کا امتحان دینے والا میں اکیلا ہی تھا تاہم اس کے ساتھ ایف اے کا امتحان بھی ہو رہا تھا جس کی وجہ سے کمرہ امتحان میں خاصی رونق ہوتی۔ سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ واقفیت ہونے کی وجہ سے بڑے دوستانہ ماحول میں وقت گزرتا رہا۔ موصوف کبھی کبھی میری دعوت اور درخواست پر میرے کمرے میں بھی چلے آتے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے خاکسار کو اس تعلق کا کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کا کبھی خیال تک نہ آیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس امتحان کا آخری پرچہ ایک تفصیلی مضمون پر مشتمل تھا جو دیئے گئے متعدد عناوین میں سے کسی ایک پر لکھنا تھا۔ جب عناوین پر مشتمل پرچہ مجھے ملا تو میں پریشان ہو گیا کیونکہ میرے ذہن میں کسی بھی عنوان کے بارہ میں ٹھوس بنیادی

معلومات تھیں اور نہ ہی کوئی مواد تھا۔ مجھے پریشان دیکھ کر ایک اہلکار میرے پاس آئے تو میں نے انہیں پرچہ دکھاتے ہوئے کہا کہ ان میں سے تو کسی بھی عنوان پر میرے پاس لکھنے کو نہیں۔ انہوں نے عناوین دیکھ کر مشورہ دیا کہ 'اقبال کا مردِ مومن' کے عنوان پر لکھنا شروع کرو، میں تمہاری مدد کرتا ہوں مگر میں نے ان کی پیشکش کو رد کر دیا اور ایک دوسرے عنوان ''علامہ شبلی کی علمی، ادبی اور ملی خدمات'' پر مضمون لکھنا تو شروع کر دیا مگر میری حالت یہ تھی کہ علامہ شبلی کے بارہ میں سوائے اس کہ وہ برصغیر کے ایک عظیم عالم تھے اور یہ کہ چھ جلدوں پر مشتمل سیرۃ النبی ﷺ اور الفاروق ان کی تصانیف تھیں، مجھے کچھ علم نہ تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور ان کے بارہ میں مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ مجھے صرف ان کی مذکورہ کتب سے تعارف تھا چنانچہ ان کی شخصیت کے بارہ میں اِدھر اُدھر کی باتیں لکھنے کے بعد ان کتب کا خوب اچھی طرح سے تعارف کرا دیا۔ اس طرح سے قریباً آٹھ صفحات پر مشتمل مضمون لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وقت ختم ہونے سے پہلے میں اس پر نظرِ ثانی کر رہا تھا کہ وہی صاحب میرے پاس سے گزرے تو میں نے انہیں اپنا پرچہ دکھا کر پوچھا کہ 33 نمبر آ جائیں گے؟ انہوں نے ایک نظر ڈالی اور کہنے لگے: امید تو ہے۔ اس پر مجھے اطمینان ہوا اور صاف ضمیر کے ساتھ امتحان سے فارغ ہو کر باہر آ گیا لیکن میری حیرت کی اُس وقت انتہا نہ رہی جب اِس امتحان کا نتیجہ آیا کیونکہ سب سے زیادہ نمبر اسی آخری پرچے کے تھے، اللہ تعالیٰ نے میری نیت قبول فرمائی تھی اور اس کے لئے غیر معمولی اجر سے نوازا، بعد میں پتہ چلا کہ میں اس امتحان میں بورڈ بھر میں اول رہا اور گولڈ میڈل کا حقدار بھی ٹھہرا، الحمدللہ۔

## ایم اے عربی کا امتحان

جیسا کہ اوپر تفصیل گزر چکی ہے کہ کوشش کے باوجود میں گزشتہ سالوں میں ایم اے کا امتحان نہ دے سکا۔ تاہم 1994ء میں شمولیت یقینی تھی اور اس کے لئے ہر قسم کی تیاری بھی مکمل تھی مگر اللہ کا کرنا ہوا کہ اس نے عین امتحان کے قریب رہائی عطا فرما دی جس کے بعد بعض مصروفیات اور قانونی مشکلات ایسی آڑے آئیں کہ یہ امتحان دینا ممکن نہ رہا۔ اس موقع پر استاذی المکرم مولانا محمد احمد صاحب جلیل مرحوم کی کہی ہوئی بات یاد رہے گی کہ ''رہا ہونے میں جلدی کی ورنہ ایم اے بھی ہو جاتا تھا۔''

☆ ساتواں باب:

## جب تم کو ملی رہائی کی خبر!

☆ سول ہسپتال فیصل آباد میں

☆ ہسپتال سے جیل واپسی

☆ جیل سے رہائی

☆ جیل سے ربوہ تک

☆ والہانہ استقبالیہ تقریبات

مبارک وہ قیدی جو دعا کرتے ہیں۔ تھکتے نہیں کیونکہ ایک دن رہائی پائیں گے۔ مبارک وہ اندھے جو دعاؤں میں سست نہیں ہوتے کیونکہ ایک دن دیکھنے لگیں گے۔ مبارک وہ جو قبروں میں پڑے ہوئے دعاؤں کے ساتھ خدا کی مدد چاہتے ہیں کیونکہ ایک دن قبروں سے باہر نکالے جائیں گے

(لیکچر سیالکوٹ، روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 222)

# جب تم کو ملی رہائی کی خبر

ہمارے ساتھی محترم ملک محمد دین صاحب مرحوم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ 'چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ'۔ اس مصرعہ کی ادائیگی کے وقت آپ 'چلے' کو خاص انداز میں لمبا کر کے پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی بات بالآخر پوری ہوئی اور ہمارا یہ سفر ایک روز اچانک اپنے اختتام کو پہنچ ہی گیا۔ اگر چہ محترم ملک صاحب موصوف کئی سال پہلے شہادت کا رتبہ پا کر اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہو چکے تھے مگر ان کی یہ بات ہمارے قلب و ذہن پر بڑی خوبصورتی سے نقش تھی اور نو سال پانچ ماہ اور پچیس دن گزرنے کے بعد 19 مارچ 1994ء کو پوری ہوئی، الحمدللہ۔ مسرت سے معموران پر جوش لمحات کا حال اس باب میں ہدیہ قارئین ہے۔

## سول ہسپتال فیصل آباد میں

1994ء کے آغاز میں خاکسار کو دانت کے علاج کے لئے سول ہسپتال بھجوائے جانے کا معاملہ گردش میں تھا جس پر کچھ ہفتوں کی کارروائی کے بعد بالآخر وسط مارچ میں محکمہ جیل خانہ جات نے مجھے جیل سے باہر سول ہسپتال بھجوانے کا حکم جاری کر دیا۔ چنانچہ عید الفطر سے اگلے روز مؤرخہ 16 مارچ 1994ء کو مجھے خصوصی گارد کی تحویل میں سول ہسپتال فیصل آباد منتقل کر دیا گیا۔ یہاں مجھے بی کلاس کا قیدی ہونے کی وجہ سے علیحدہ کمرے میں رکھا گیا اور فوری طور پر میرے دانت کا معائنہ کر کے اس کا علاج شروع کر دیا گیا۔ ابتدائی ایک دو دن تو نگرانی پر مامور سپاہی ٹھیک رہے اور اس دوران میں ہسپتال میں آزادی سے گھوم پھر لیتا۔ کبھی اپنے سکول کے کلاس فیلو اور دوست برادرم مکرم ڈاکٹر شمس الحق صاحب طیب شہید سے بھی ملنے چلے جاتا۔ مکرم ڈاکٹر صاحب موصوف اُس وقت اسی ہسپتال میں نہایت کامیاب آرتھوپیڈک سرجن کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ بعد میں ظالموں نے انہیں اغواء کر کے نہایت بے دردی سے شہید کر دیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے بچوں کو ان کا صحیح جانشین بنائے، آمین۔ علاوہ ازیں بعض اوقات ہسپتال کے سامنے واقع دکانوں تک چلا جاتا جہاں ہمارے نہایت مخلص احمدی دوست مکرم کرامت اللہ جنجہ صاحب مرحوم کا میڈیکل سٹور بھی تھا جو نہایت محبت کے ساتھ پیش آتے۔ ان سے واقفیت یہاں ہسپتال آنے سے پہلے کی تھی اور وہ اس طرح سے کہ قریشی مظہر نامی جیل کے ایک ملازم کی بیٹی کا اس ہسپتال میں آپریشن ہوا تو اس نے مجھ سے کہا کہ کسی ایسے میڈیکل سٹور سے متعارف کرا دوں جو خرید کی گئی دواؤں کی رسیدیں بھی

بنادے تو میں نے اسے مکرم شیخ رفیق احمد صاحب آف ٹی وی پوائنٹ کی معرفت انہی کے پاس بھجوایا تھا۔ ان کی وساطت سے اس ملازم کو بہت فائدہ ہوا اور وہ اس نیکی کو ہمیشہ یاد رکھتا اور جیل میں میرے بہت کام آتا۔ مکرم شیخ صاحب موصوف ہماری رہائی کے جلد بعد تو جوانی میں ہی وفات پا گئے، اللہ انہیں غریق رحمت و مغفرت کرے، آمین۔

ہسپتال میں اس آزادی کے دوران کئی لوگوں نے اپنے نومولود بچوں کے کانوں میں مجھ سے اذانیں بھی دلوائیں۔ شکر ہے کہ کسی ملاں کو پتہ نہ چلا ورنہ 298 C کا مقدمہ بنا بنایا تھا۔ غرضیکہ اس طرح سے یہاں وقت بڑے مزے سے گزرنے لگا مگر تیسرے دن نگرانی پر موجود سپاہیوں کی نظریں بدلنے لگیں اور انہوں نے بے تکی قسم کی سختی شروع کر دی۔ میں نے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ وہ کچھ خرچہ چاہتے تھے۔ ہم کچھ نہ کچھ تو ان کا خیال رکھ ہی رہے تھے مگر اس طرح بھونڈے انداز میں ان کے مانگنے پر انہیں کچھ دینا مجھے منظور نہ تھا۔ جس پر وہ کسی نہ کسی طرح تنگ کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہی رہتے، کبھی میرے پاس آنے جانے والوں کو پریشان کرتے تو کبھی مجھے کہتے کہ کمرے کے اندر بھی ہتھکڑی لگا کر رکھو، وغیرہ۔ بہر حال اسی طرح تین روز گزر گئے اور جب اُنیس تاریخ ہوئی تو صبح سے ہی میں سپاہیوں کے رویہ پر کسی غیبی طاقت کے زیر اثر انہیں کھری کھری سنانے لگ گیا تھا یہاں تک میں نے کہہ دیا کہ میں اب ایک دو روز میں واپس جیل چلا جاؤں گا کیونکہ میں اس طرح سے تو یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ اس پر وہ پریشان ہوئے کہ ایک تو کہیں ان کی شکایت نہ کر دوں اور دوسرے میری وجہ سے اُن کا جو کھانا وغیرہ لگا ہوا تھا، اس سے بھی جائیں گے۔ اُسی روز صبح کے وقت ہسپتال کی اِنتظامیہ نے مجھ سے پرائیویٹ کمرے کی فیس بھی طلب کر لی جو کئی ہزار تھی۔ میں نے جب کہا کہ میری تو بی کلاس ہے اور اس اعتبار سے میں اس علیحدہ کمرے کا حقدار ہوں تو انہوں نے کہا کہ جیل سے آئی ہوئی میری فائل میں بی کلاس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عین اُس وقت میرے پاس جیل ملازم قریشی مظہر صاحب بیٹھے تھے جو میرا حال احوال پوچھنے آئے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ جیل کے وارنٹی سے میری بی کلاس والی منظوری لے کر فوٹو کاپی کر کے مکرم رانا نعیم الدین صاحب کے ملاقاتیوں کو دے دیں جنہوں نے آج ان کی ملاقات سے ہو کر میری طرف بھی آنا ہے۔ اللہ بھلا کرے قریشی مظہر صاحب کا، انہوں نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ یہ کام کیا اور حیرت انگیز طور مطلوبہ کاغذ دوپہر تک مجھے مل چکا تھا جسے میں نے فوراً ہسپتال انتظامیہ کو پیش کر دیا اور اس طرح سے ہزاروں روپے کی رقم بچ گئی، الحمدللہ۔

مکرم رانا صاحب موصوف کے اہل خانہ جیل میں ان سے ملاقات کرنے کے بعد میرے پاس بھی آئے اور خوب رونق لگائی۔ میں نے اپنے پاس آئے ہوئے بعض ملاقاتیوں کو بھی ان کے ساتھ ہی واپس بھجوا دیا جسے دیکھ کر ڈیوٹی پر

موجود سپاہی اور زیادہ پریشان ہونے لگے کہ میں تو واقعی جیل واپس جانے کی تیاریاں کرنے لگا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ جب یہ ملاقاتی واپس جا رہے تھے تو سپاہی مجھ سے بڑی لجاجت سے کہنے لگا کہ انہیں واپس نہ بھیجو، اب ہم سختی نہیں کریں گے مگر مجھے کوئی غیبی طاقت باتیں کہلوا رہی تھی جس کے سہارے میں نے پورے ضبط کے ساتھ جواب دیا کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ یہ سب کچھ کیا تھا، اس کی تفصیل اسی روز چند گھنٹے بعد معلوم ہوئی جو نیچے تحریر کی جاتی ہے۔

## تاریخی یادگار لمحہ

یہ اُسی روز 19 مارچ 1994ء کی نسبتاً گرم سہ پہر کی بات ہے کہ مکرم شیخ رفیق احمد صاحب، مکرم حافظ محمد اکرم صاحب اور مکرم بلال احمد صاحب ابن استاذی المکرم فضل الرحمٰن بسمل صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ ہم باہر کی تپش سے بچنے کے لئے دروازے کھڑکیاں بند کر کے اندر بیٹھے تھے کہ ایک سپاہی نے مجھے باہر بلایا۔ میں کمرے کے سامنے کھڑا اُس سے بات کر رہا تھا کہ دُور برآمدے میں امیر جماعت فیصل آباد محترم چوہدری غلام دستگیر صاحب مرحوم آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آپ خلاف معمول اکیلے ہی چلے آ رہے تھے اور آپ کی چال میں ایک بے چینی سی بھی تھی، میرے پاس پہنچ کر مجھے ایک طرف لے گئے اور کچھ مجھے نیچے کیا اور کچھ خود بلند ہو کر میرے کان میں بڑی مشکل سے یہ فقرہ کہا:

"ہائی کورٹ نے آپ کو بری کر دیا ہے"

یہ فقرہ ایسا غیر متوقع تھا کہ خوشی سے میرے ہوش اُڑ گئے، میں ابھی اس سے سنبھل ہی نہ پایا تھا کہ دوبارہ میرے کان کے قریب ہو کر فرمانے لگے:

"حضور کا ارشاد ہے کہ ابھی کسی کو بتانا نہیں"

ہم دونوں کی زبانوں پر الحمدللہ کا ورد تھا اور سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اس کی تفصیل کیسے پوچھوں یا امیر صاحب کیسے بتائیں! خیر چوہدری صاحب نے ایک دو فقروں میں اس تفصیل کا خلاصہ بیان کیا اور ناقابل بیان خوشی کی کیفیت میں ہم دونوں کمرے کے اندر آ گئے جہاں مکرم حافظ صاحب، مکرم شیخ رفیق صاحب اور مکرم بلال صاحب بیٹھے تھے۔ اُس وقت ہماری کیا حالت ہوگی، کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف یہ دونوں دوست ایسے تھے کہ انہوں نے دورانِ اسیری اپنا سب کچھ ہمارے لئے وقف کر رکھا تھا گویا ان کا دل ہر وقت جیل کے اندر ہمارے ساتھ اٹکا رہتا تھا اور دوسری طرف حضور کے ارشاد کے تحت انہیں اِنتہائی خوشی کی یہ خبر جس کے لئے یہ دن رات تڑپتے تھے، بتا بھی نہیں سکتے تھے۔ محترم امیر صاحب سے بھی یہ خبر چھپانی مشکل ہو رہی تھی۔ اندر بیٹھنے کے بعد غیر معمولی طور پر ان کے منہ سے کبھی کچھ نکل جاتا تو کبھی کچھ۔ کبھی شیخ صاحب سے کہتے کہ بھئی کچھ کھلاؤ، کبھی حافظ صاحب سے کہتے کہ کوئی ٹھنڈی بوتلیں ہی لاؤ! مگر وہ

سب کچھ میرے کمرے سے نکال کر پیش کر دیتے۔ اِسی دوران مجھے امیر صاحب ایک مرتبہ پھر باہر لے گئے اور کہنے لگے کہ اب تم نے فوری طور پر گارڈلگوا کر واپس جیل جانا ہے کیونکہ قانون کے مطابق رہائی ہسپتال سے نہیں ہو سکتی صرف جیل سے ہی ہوگی جہاں کل صبح تک TCS کے ذریعہ رہائی کے وارنٹ پہنچ جائیں گے۔ ان کے پاس TCS (ایک تیز رفتار کوریئر سروس) کا ڈسپیچ نمبر بھی تھا جو انہوں نے مجھے دے دیا۔ ان سے تو بات کرنی مشکل ہو رہی تھی چنانچہ انہوں نے مجھے کہا کہ حافظ صاحب کے ذریعہ گارڈ لگوانے کا انتظام کروں۔ اس پر میں نے حافظ صاحب کو باہر بلا کر کہا کہ آپ جیل واپس بھجوانے کے لئے میری گارڈ لگوائیں۔ اس اچانک اور بالکل غیر متوقع مطالبہ پر وہ گھبرا کر کہنے لگے کیوں؟ آپ تو اتنی مشکل سے یہاں لائے گئے ہیں اور اب ایک مہینہ سے پہلے آپ کو واپس نہیں جانے دینا۔ میرے پرزور اصرار پر وہ پرزور اِنکار کرنے لگے۔ اسی کشمکش میں محترم امیر صاحب باہر آئے تو میں نے تجویز کیا کہ ان سے فیصلہ کروا لیتے ہیں جس پر حافظ صاحب راضی ہو گئے۔ چنانچہ ہم نے اپنا اپنا مقدمہ امیر صاحب کے سامنے پیش کیا جس پر وہ اپنے مخصوص انداز میں فرمانے لگے کہ یہ معاملہ تو ایسا ہے کہ اس پر سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد آپ نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ ان کے خیال میں جس طرح الیاس کہہ رہا ہے، درست ہی ہے۔ اس پر مکرم حافظ صاحب اگرچہ خاموش ہو گئے مگر شدید دباؤ میں چلے گئے۔ انہیں دراصل فکر پڑ گئی تھی کہ شاید وہ میرا پوری طرح خیال نہیں رکھ سکے اس لئے میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ بڑی لجاجت سے معافیاں مانگنے لگے اور یقین دلانے لگے کہ آئندہ دنوں میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ ان کی بس ایک ہی خواہش تھی کہ میں اپنے اس فیصلہ کو تبدیل کروں۔ اِس دوران دیگر دوست واپس جا چکے تھے اور حافظ صاحب بڑی بے چارگی کے عالم میں تھے، میں نے بڑی مشکل سے انہیں اس امر کے لئے تیار کیا کہ وہ جائیں اور کل صبح میری واپسی کے لئے گارڈ لگوانے کا انتظام کریں۔ ہمارے بار بار ایک طرف ہو کر خفیہ انداز میں باتیں کرنے کی وجہ سے نگرانی پر موجود سپاہی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے مجھے کمرے میں رہنے اور ہتھکڑی لگانے کو کہا۔ جس پر میں نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ جتنی مرضی سختی کر لو، بس آج کی رات میں یہاں ہوں، کل صبح میں نے ہر صورت میں واپس چلے جانا ہے۔ اس پر ان کے رویہ میں کسی قدر نرمی آئی۔ ایک حد تک تو وہ بھی سچے ہی تھے کہ ان کی نوکری کا سوال تھا جبکہ اندر کی بات کا انہیں قطعاً علم نہ تھا۔ مغرب کی نماز ادا کر کے میں باہر برآمدے میں کھڑا تھا کہ دور برآمدے میں محترم امیر صاحب اور مکرم حافظ اکرم صاحب کو ایک مرتبہ پھر آتے دیکھا تو مجھے سمجھ آ گئی کہ اب تک حافظ صاحب کو اصل خبر کا پتہ چل چکا ہے۔ چنانچہ قریب پہنچتے ہی وہ خوشی کے بے پناہ جذبات لئے میرے ساتھ بغل گیر ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ گھر جا کر ان کی بلڈ پریشر سے یہ حالت تھی کہ سر

پھٹنے والا ہو گیا تھا۔ انتہائی پریشانی میں محترم امیر صاحب سے بات کی تو انہوں نے حافظ صاحب کو یہ خبر سنا ہی دی کیونکہ اُس وقت تک حضور رحمہ اللہ کی زبان مبارک سے یہ خبر MTA پر بھی نشر ہو چکی تھی۔

یہ حافظ صاحب کی محبت تھی کہ ان کی یہاں تک حالت ہو گئی تھی مگر میں مجبور تھا کہ حضور انور کا اِرشاد تھا۔ اس کے بعد میرے ساتھ جیل میں کچھ عرصہ گزارنے والے ایک غیر از جماعت دوست جناب محمد اشرف صاحب ایم اے میرے لئے رات کا کھانا لے آئے۔ جب سے میں یہاں ہسپتال آیا تھا، اصرار کے ساتھ وہ کہہ رہے تھے کہ ایک وقت کا کھانا ان کی طرف سے ہوگا۔ چنانچہ ہم دونوں نے اُس شام کھانا اکٹھے کھایا پھر وہ رات گئے تک میرے پاس بیٹھے رہے، انہیں بھی اتنی بڑی یہ خبر سنا نہ سکنے کے باعث گفتگو عجیب سے انداز میں ہوتی رہی۔ اسی دوران اچانک برادرم مکرم شیخ رفیق صاحب اپنے بیوی بچوں سمیت مٹھائی کا ڈبہ اُٹھائے چلے آئے اور آتے ہی یوں لپٹ گئے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوں۔ خوشی و مسرت کا ایک سمندر تھا جو اندر ہی اندر طوفان برپا کئے ہوئے تھا۔ انہیں بھی کسی نے یہ کہہ کر خبر بتائی تھی کہ آگے کسی کو نہیں بتانا! ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اب یہ خبر بہت حد تک پھیل چکی ہے اور اس یقین دہانی کے ساتھ کہ "آگے نہیں بتانا" ایک دوسرے تک بڑی تیزی سے پہنچ رہی ہے۔ محترم صاحبزادہ مرزا غلام احمد صاحب نے اگلے روز ربوہ جاتے ہوئے چنیوٹ سے پہلے ایک جگہ وقفہ کرنے کے دوران مجھے یہ دلچسپ لطیفہ سنایا کہ خود حضور انور (رحمہ اللہ تعالیٰ) نے بھی MTA کے پروگرام میں یہ خبر سناتے ہوئے فرطِ جذبات سے یہی کہا تھا کہ ابھی آگے نہیں بتانا جبکہ وہ پروگرام ساری دنیا میں نشر ہو رہا تھا۔

جب سب رات گئے واپس چلے گئے تو میں نے تیاری شروع کی۔ میرے پاس اُس وقت ایک ہی نئی قمیص تھی جو پہنی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے اُتارا اور اُسی وقت دھویا کہ کل رہائی کے وقت اسے پہن سکوں۔ چنانچہ میں سب کاموں سے فارغ ہو کر لیٹا تو کچھ دیر بعد باہر ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے مجھے جگا دیا کہنے لگا کہ وہ مجھے ہتھکڑی لگانا چاہتا ہے۔ میرا دماغ ایک مرتبہ تو گھوم ہی گیا کہ یہ کیا تماشا ہے کہ اب سونے بھی نہیں دے رہا مگر پھر میں نے سوچا کہ اب چند گھنٹوں کی بات ہے، جو کچھ یہ کرنا چاہتا ہے اسے کر لینے دیا جائے۔ میں نے اسے کہا کہ لگا لو بابا۔ وہ تھا شریف النفس لیکن اپنی ذمہ داری اور نوکری کے خوف سے مجبور تھا اور میری حرکات و سکنات اور میرے پاس آنے جانے والوں کا انداز بھی خوامخواہ ایسے شریف آدمی کو پریشان کر دینے والا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ وہ بڑی لجاجت سے کہنے لگا: باؤ جی میں چاہتا تو نہیں ہوں مگر مجھے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے جس کی وجہ سے میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ چنانچہ اس نے میری ٹانگ کو سنگل لگا دیا اور میں سو گیا۔ صبح ہوئی تو اس نے اسے کھول دیا کہ نماز ادا کرنی تھی۔ نماز کے بعد دو احمدی دوست ملاقات

کے لئے آئے، ان میں سے ایک جرمنی سے گئے ہوئے تھے۔ انہیں قطعاً علم نہ تھا کہ ہماری رہائی کے احکام جاری ہو چکے ہیں اور میں نے بھی نہ بتایا۔ انہوں نے مجھے ناشتہ بھی کرایا اور میرے کپڑے بھی استری کروا کر دیئے اور کچھ دیر میرے پاس گزارنے کے بعد واپس چلے گئے، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

## ہسپتال سے جیل واپسی

20 / مارچ 1994ء کا سورج بلند ہو چکا تو مقامی جماعت کے انتظام کے تحت پہلے ہمارے ڈاکٹر ولی محمد صاحب ساغر جو سول ہسپتال میں غیر معمولی طور پر احترام سے دیکھے جاتے تھے، اچانک تشریف لے آئے۔ آپ میرے کمرے میں آئے تو چھوٹے ڈاکٹرز اور دیگر عملہ کا ایک جلوس آپ کے ہمراہ تھا۔ آپ نے آتے ہی مجھے کہا کہ اتنی جلدی واپس کیوں جانا چاہتے ہو؟ میں سمجھ گیا کہ انہیں بھی ابھی تک اصل بات کا علم نہیں ہو سکا۔ میں نے عرض کیا بس ڈاکٹر صاحب! بس میں جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ نہ جاؤ مگر میں نے اصرار سے کہا کہ جانا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے ارد گرد عملہ ہسپتال کا جو جلوس تھا، اس کی موجودگی میں اصل بات بیان کرنی نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال میرے اصرار پر انہوں نے وارڈ کے متعلقہ کارکن سے میری فائل منگوائی اور بادلِ نخواستہ اس پر مجھے ڈسچارج کر کے فوری طور پر واپس جیل بھجوانے کا حکم لکھ دیا۔ جب واپس بھجوائے جانے کا معاملہ طے پا چکا تو محترم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بات کرنے کا موقع ملنے پر میں نے حقیقت حال گوش گزار کی تو ڈاکٹر صاحب بھی خوشی سے اُچھل پڑے اور ان کے دل پر سے بوجھ کی کیفیت جاتی رہی۔ اس کے بعد اب پولیس گارد لگنے کا مسئلہ تھا تو ہسپتال انتظامیہ نے موقع پر موجود گارد کو ہی ہدایت کی کہ وہ مجھے فوراً جیل لے جائے۔ اب گاڑی کا سوال پیدا ہوا تو محترم حافظ صاحب نے فوری طور پر کرایہ کی گاڑی منگوا دی اور اس طرح سے چند منٹوں میں ہسپتال سے فارغ ہو کر جیل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس صورت حال میں اُس سپاہی کی حالت دیکھنے والی تھی جسے میں نے گزشتہ روز اس کے رویہ کی وجہ سے یونہی کہہ دیا تھا کہ اب میں نے یہاں نہیں رہنا اور بہت جلد واپس چلا جاؤں گا۔ وہ بے چارہ میری منتیں کرنے لگ گیا کہ خدا کے واسطہ ایسا نہ کرو، میں اب آپ کے ساتھ پہلے جیسا رویہ نہ رکھوں گا، وغیرہ۔ مگر اب تو معاملہ ہی ایسا تھا کہ رُکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے میری زبان سے یونہی نکلی ہوئی بات کو اپنے فضل سے کس طرح پورا کر دیا تھا، اسے کیا خبر تھی! خیر میں نے اسے پوری تسلی دلانے کی کوشش کی مگر وہ آخر تک اپنے کیے پر افسوس کا اظہار کر کے پچھتاتا رہا۔

نو اور دس بجے کے درمیان ہم ہسپتال سے جیل کے لئے روانہ ہوئے اور چند منٹ میں جیل کے سامنے پہنچ گئے۔ جونہی گاڑی بڑی سڑک سے جیل کی حدود میں جانے والی چھوٹی سڑک کی طرف مڑی، میں نے جیل کی طرف سے ایک

موٹر سائیکل سوار کو واپس جاتے دیکھا جس پر TCS[1] لکھا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ ہمارے وارنٹ پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ میں جیل کے گیٹ کے سامنے اُترا تو بھاگ کر دروازہ کی طرف گیا جہاں کھڑے میرے واقف دربان نے کسی حیل وحجت کے بغیر مجھے اندر داخل کر لیا۔ پولیس گارڈ والے بعد میں آئے اور انہوں نے میرے کاغذات متعلقہ اہلکاروں کو دیئے ہوں گے مگر میں سیدھا اوپر کلرکوں کے دفتر میں چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر ہیڈ کلرک سے پوچھا کہ ابھی TCS والا جو ڈاک دے کر گیا ہے، وہ کہاں ہے؟ اس نے مجھے دو لفافے دکھائے جن کے اوپر لکھے ہوئے نمبروں کو میں نے اپنے پاس لکھے ہوئے نمبروں سے ملایا تو وہ ہمارے ہی وارنٹوں والے لفافے تھے۔ میں دل کی گہرائیوں سے الحمدللہ کا ورد کرتا ہوا خاموشی سے مگر مچلتی ہوئی خوشی سے جیل کے اندر اپنے کمرے میں گیا۔ مجھے دیکھ کر اپنے رانا صاحب اور دیگر ساتھی حیران ہو کر مجسم سوال بن گئے کہ اتنی جلدی کیوں واپس آ گئے؟ میں نے رانا صاحب کو علیحدہ کر کے انتہائی خوشی کی یہ خبر سنائی اور اپنے مشقتی کے ذریعہ اپنے احمدی دوستوں مکرم صفدر صاحب اور محمود صاحب کو بلا بھیجا۔ اپنے بزرگ مکرم حیات محمد چشتی صاحب تو اُس وقت سزائے موت وارڈ میں تھے، ان کے لئے آنا ممکن تھا نہ ہی ہمارے لئے ان کے پاس افراتفری کے اِس عالم میں جانا ممکن ہو سکا تاہم انہیں خبر پہنچا دی۔

## جیل سے رہائی

ابھی ہم نے یہاں کسی اَور کو یہ خبر نہ بتائی تھی مگر جونہی دفتر والوں نے ڈاک کھولی تو ڈیوڑھی سے یہ خبر فوراً نشر ہو گئی۔ چنانچہ بعض غیر از جماعت دوست قیدی جو ملاقات کیلئے ڈیوڑھی گئے ہوئے تھے، یہ خبر سن کر مبارکباد کہنے دوڑے آئے اور پھر کیا تھا، آناً فاناً ساری جیل میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی۔ ہمارے ہاں قیدی کیا اور ملازم کیا، سبھی اپنے اپنے مطلب کے لئے جمع ہونے لگے۔ ہم نے اپنا سامان مستحق قیدیوں میں تقسیم کیا، کچھ انتہائی ضروری اشیاء ایک تھیلے میں ڈالیں اور ڈیوڑھی سے رہائی کے بلاوے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ اس دوران جس جس قیدی کے لئے ممکن تھا وہ آ کر ہمیں ملتا گیا۔ اس طرح سے دوپہر کے دو اڑھائی بجے تک ہمارے ہاں ایک جشن کا سماں رہا۔ آخر کار ڈیوڑھی سے رہائی کا پروانہ آیا تو ناقابل بیان کیفیت کے ساتھ ہم روانہ ہوئے تو ہمارے بہت سے قیدی ساتھی ہمیں الوداع کہنے ہمارے ساتھ ڈیوڑھی تک گئے۔ ایک طرف ہمیں ازحد خوشی تھی دوسری طرف پیچھے رہ جانے والے ساتھی قیدیوں کا خیال تھا، وہ قیدی جن کے ساتھ ایک عرصہ سے مل جل کر رہ رہے تھے اور اب وہ پیچھے رہے جا رہے تھے جبکہ ہمیں رہائی کی نعمت نصیب ہو گئی تھی۔ بہرحال ہم اپنے ان ساتھیوں کے جلوس میں ڈیوڑھی پہنچے تو سب سے گلے ملے۔ آخر پر

---

[1] ڈاک پہنچانے والی ایک کوریئر سروس

ایک نہایت مخلص ساتھی مکرم ماسٹر طفیل محمد صاحب، جو یہاں امام مسجد بھی تھے اوران کے ساتھ بہت اچھا وقت گزر تا تھا، مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے کہنے لگے کہ میں تم سے سب کے درمیان نہیں مل سکوں گا علیحدہ ہو کر ملو! ان کی آنکھوں میں خوشی اور محبت کے آنسو تھے۔ چنانچہ وہ مجھے بہت اچھی طرح سے ملے اوران کے اس طرح سے ملنے میں دراصل اُن تکلیف دہ باتوں کی معذرت تھی جو مذہبی کٹر پن کی وجہ سے انہیں اپنے دیگر مسلمانوں کے دباؤ کے باعث میرے ساتھ روا رکھنی پڑی تھیں جن کا ذکر پانچویں باب میں گزر چکا ہے۔

الوداع کہنے والے سب قیدیوں سے مل کر ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو وہاں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جناب حامد خان صاحب نے ہمیں مبارک باد دی اور تھوڑی دیر میں ضروری دفتری کارروائی مکمل ہونے پر ہمیں باہر نکلنے کی اجازت ہوئی تو ہم نے قریباً دس سال بعد آزادی کا سانس لیا، الحمدللہ ثم الحمدللہ، ثم الحمدللہ۔ ڈیوڑھی کے سامنے کچھ فاصلہ پر امیر جماعت فیصل آباد محترم چوہدری غلام دستگیر صاحب کی قیادت میں مقامی احباب جماعت ہمارے منتظر تھے۔ ان کے ساتھ ایم ٹی اے کی ٹیم بھی تھی جو ان لمحات کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کرنے میں مصروف تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی سبھی احباب وارفتگی کے عالم میں ہم سے چمٹ گئے۔ ہر کوئی الحمدللہ کے ورد سے تر مبارک بادیں پیش کر رہا تھا، ہمیں پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا، ایم ٹی اے والے اس کیفیت کی منظر بندی کرنے کے ساتھ ہمارے تاثرات بھی ریکارڈ کر رہے تھے۔

## جیل سے ربوہ تک

غرضیکہ حمد وشکر اور خوشی ومسرت کی ناقابل بیان کیفیت میں ہم گاڑیوں میں سوار ہوئے تو ہمیں بتایا گیا کہ محترم شیخ رفیق احمد صاحب قائد خدام الاحمدیہ ضلع فیصل آباد کی خواہش کے مطابق پہلے یہ قافلہ ان کی دکان TV Point پر جائے گا جہاں انہوں نے ایک مختصر سی ضیافت کا انتظام کر رکھا ہے۔ ہمیں اس سے بہت خوشی ہوئی کیونکہ یہ ان کا حق بھی بنتا تھا کیونکہ موصوف اُن خدام میں سے ایک تھے جنہوں نے ہماری اسیری کے فیصل آبادی دور میں سب سے زیادہ اخلاص، ہمت اور محبت کے ساتھ خدمت کرنے کی توفیق پائی تھی، فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں ہم سب ان کی دکان میں تھے جہاں مشروبات سے انہوں نے سب احباب کی تواضع کی اور ہماری رہائی پر اپنی اُس خوشی کا اظہار کیا جو آج ہر احمدی کے چہرہ بشرے سے پھوٹتی چلی جاتی تھی۔

ابھی سورج غروب نہ ہوا تھا کہ ہمارا قافلہ فیصل آباد سے روانہ ہو کر چنیوٹ سے پہلے ایک پٹرول پمپ پر رُکا جہاں ربوہ سے محترم صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب کی قیادت میں تشریف لائے ہوئے بزرگان سلسلہ ہمارے منتظر

تھے۔ یہاں ان بزرگان نے بڑی محبت اور شفقت سے ہمارا استقبال کیا۔ اسی موقع پر محترم مرزا غلام احمد صاحب نے مجھے حضور انورؒ کی خوشی کی کیفیت بتاتے ہوئے یہ لطیفہ بھی سنایا کہ MTA کے پروگرام میں حضور نے ہماری رہائی کی خبر بتا کر یہ ہدایت بھی فرمائی کہ ابھی آگے کسی کو نہیں بتانا! جبکہ یہ پروگرام ساری دنیا میں نشر ہو رہا تھا۔ اس جگہ ہم کافی دیر تک رُکے رہے کیونکہ یہاں ساہیوال جیل سے رہا ہونے والے اسیران کا انتظار تھا کہ وہ آئیں اور اکٹھے ربوہ کے لئے روانہ ہوں۔ مغرب کے بعد وہ ساتھی یعنی ساہیوال سے مکرم عبدالقدیر صاحب اور مکرم محمد نثار شاہد صاحب جبکہ راولپنڈی سے مکرم محمد حاذق رفیق طاہر صاحب اپنے افرادِ خانہ کے ہمراہ یہاں پہنچے تو ان کا ہمیں بھی استقبال کرنے کا موقع ملا۔ اس طرح سے ہمارا قافلہ مکمل ہو کر ربوہ کے لئے روانہ ہوا۔

## ربوہ میں والہانہ استقبال

دریائے چناب پار کر کے ربوہ کی حدود میں داخل ہوئے تو دارالیمن سے ہی سڑک کے دونوں کناروں پر احباب جماعت (مرد و زن) ہمارے انتظار میں کھڑے نظر آنے لگے۔ جسے بھی ہمارے پہنچنے کا علم ہوتا، وہ بے اختیاری کے عالم میں استقبالیہ نعرے لگانے لگتا۔ سڑک کے اطراف میں کھڑے احباب جذبات میں آکر ہماری گاڑیوں کو روک لیتے۔ اس صورت حال میں ہمارا قافلہ رُک رُک کر چلنے لگا اور اسے اپنی منزل دارالضیافت تک پہنچنے میں خاصا وقت لگا کیونکہ درّہ کے بعد اور خصوصاً سرگودھا روڈ سے اُترنے کے بعد مسجد مبارک کے سامنے پہنچے تو ہماری گاڑیاں بس کیڑی کی طرح ہی رینگنے لگیں۔ احباب کا جوش اِس قدر تھا کہ وہ ہماری گاڑیوں سے لپٹ لپٹ جاتے۔ ہم نے یہاں سے دارالضیافت تک کا فاصلہ قریباً آدھ گھنٹہ میں طے کیا اور جب وہاں پہنچے تو جذبات کا ایک اور سمندر تھا۔ امیر مقامی وناظر اعلیٰ محترم صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحبؒ کی قیادت میں دارالضیافت کا صحن احباب جماعت سے بھرا ہوا تھا جبکہ برآمدوں میں حضرت چھوٹی آپا مرحومہ کی قیادت میں خواتین کئی گھنٹوں سے ہمارے استقبال کے لئے کھڑی تھیں۔ ہم گاڑیوں سے اُترے تو محترم میاں صاحب نے حضور انور (رحمہ اللہ تعالیٰ) کی نمائندگی میں ہمیں مصافحہ ومعانقہ کا شرف عطا کیا۔ اس کے بعد تو معلوم نہیں کتنے احباب نے والہانہ محبت کے پھول نچھاور کئے۔ خواتین کی طرف سے دیکھنے کا مطالبہ ہوا تو احباب نے جوش میں ہمیں اپنے کندھوں پر اُٹھالیا اور اس طرح سے دُور تک کھڑے احباب وخواتین کے لئے ہمیں دیکھنا ممکن ہو گیا۔ اس کے بعد ہمیں دارالضیافت کے عقبی گراسی پلاٹ میں لگے شامیانوں میں لے جایا گیا جہاں چائے اور مٹھائی کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہم نے یہاں اپنے دوستوں کے ہمراہ اس ضیافت کا لطف اُٹھایا۔ اس کے بعد ہمیں اپنے اپنے گھروں میں جانے کی اجازت ہوئی۔

## نظامِ جماعت اور احباب کی طرف سے والہانہ اِستقبالیہ تقریبات

گھر پہنچا تو یہاں بھی ایک جشن کا سماں تھا۔ دور ونزدیک سے تشریف لائے ہوئے سب اعزہ واقرباء جمع تھے۔ اُس موقع پر ہمارے اُستاد اور پھوپھی زاد بھائی محترم عبدالرزاق صاحب مرحوم نے کہا کہ سب سے پہلی دعوت میری طرف سے ہوگی سوائے اس کے کہ جماعتی طور پر کوئی دعوت ہو۔ اس طرح سے پہلے لمحہ سے دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا مگر سب سے بڑی دعوت تو حضرت امیر المؤمنین رحمہ اللہ کی طرف سے ہوئی جو تین دن تک جاری رہی۔ حضور رحمہ اللہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آپ نے کئی بار گھر فون بھی کیا اور اپنی خوشی میں ہمیں شامل فرمایا، خطوط علیحدہ تھے جو آپ کی اس کیفیت کے مظہر تھے۔ علاوہ ازیں حضورؒ نے ایم ٹی اے کے پروگرام اردو کلاس اور اس کے بعد مسجد فضل لندن میں خصوصی طور پر یہ خبر سنا کر اپنے دست مبارک سے احباب جماعت میں مٹھائی تقسیم فرمائی۔ ایم ٹی اے پر نشر ہونے والے اس پروگرام میں حضور انورؒ کے خوشی ومسرت سے دمکتے ہوئے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر حضورؒ کی کیفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ماں سے بڑھ کر محبت کرنے والے اس عظیم المرتبت وجود پر ہر لمحہ اپنی رحمتوں اور برکتوں کی بے شمار بارشیں نازل فرماتا رہے، آمین۔

مبارکباد کے لیے گھر تشریف لانے والے احباب کا تو ہفتوں تانتا بندھا رہا، یہ سب احباب جماعت کی للّٰہی محبت تھی جو دراصل خلافت کی برکات کا ثمر تھا۔ اس کے ساتھ ہی مختلف جماعتی اداروں کی طرف سے استقبالیہ تقریبات شروع ہوگئیں۔ تحریک جدید، صدر عمومی ربوہ، مجلس انصار اللہ مقامی، خلافت لائبریری اور ربوہ کے صدران محلہ کے علاوہ گوجرانوالہ اور 9 چک پنیار ضلع سرگودھا کی جماعتوں نے بھی بڑی بڑی استقبالیہ دعوتوں کا انتظام کیا۔ چند دنوں کے بعد ہونے والی مجلس مشاورت کے موقع پر صدر انجمن احمدیہ پاکستان کی طرف سے استقبالیہ تقریب میں ہمیں اعزاز دیا گیا۔ میری مادرِ علمی جامعہ احمدیہ ربوہ کی طرف سے ناصر ہوسٹل کے لان میں وسیع پیمانہ پر ایک ایسی ہی دعوت کا اہتمام استاذی المحترم میر محمود احمد صاحب پرنسپل جامعہ نے بھی فرمایا۔ نصرت جہاں اکیڈمی ربوہ کے زیر انتظام بھی ایک اِستقبالیہ تقریب منعقد ہوئی جس میں محفل مشاعرہ بھی برپا ہوئی۔ اِس کے لیے سلسلہ کے شعرائے کرام دُور دُور سے تشریف لائے اور اپنا منظوم کلام پیش کیا۔

اس موقع پر سلسلہ کی معروف شاعرہ محترمہ بی بی امۃ القدوس بیگم صاحبہ کی وہ نظم درج کرتا ہے جو موصوفہ نے ہماری رہائی کے موقع پر کہی اور نصرت اکیڈمی میں ہونے والے اس مشاعرہ میں بھی پڑھی گئی۔ یہ نظم اس طویل دورِ اسیری کے دوران گزرنے والے حالات کی بڑے جامع انداز میں عکاسی کرتی ہے۔

## اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا؟

جب ملی تم کو رہائی کی خبر کیسا لگا؟ — لے کے پروانہ جو آیا نامہ بر کیسا لگا؟
ملنا پھر احباب کا با چشم تر کیسا لگا؟ — دیکھ کر اپنے مکاں کے بام و در کیسا لگا؟
اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا؟

کتنے گھاؤ کھائے ہیں کتنی مداراتیں ہوئیں — دورِ تنہائی میں کتنی یار سے باتیں ہوئیں
جب کسک پیدا ہوئی کتنی مناجاتیں ہوئیں — سوز دل کیسا لگا، سوزِ جگر کیسا لگا
اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا؟

امتحاں کا وقت، دورِ ابتلاء کیسا لگا؟ — عشق کی منزل کا یہ جادہ نیا کیسا لگا؟
یہ وفاؤں کی بقا کا مرحلہ کیسا لگا؟ — کچھ کہو اہل وفا، اہل نظر کیسا لگا؟
اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا؟

فرقتیں کیسی لگیں اور فاصلے کیسے لگے — جن میں الجھائے گئے وہ مسئلے کیسے لگے
کرب اور تسکین کے یہ سلسلے کیسے لگے — جو پسِ زنداں کیا کسبِ ہنر کیسا لگا
اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا؟

جو سلاسل میں کٹی وہ زندگی کیسی لگی؟ — بندی خانے میں خدا کی بندگی کیسی لگی؟
تیرگی میں روح کی تابندگی کیسی لگی؟ — جو وہاں دیکھا ہے وہ رنگ بشر کیسا لگا
اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا؟

مضطرب ہو کے جو اٹھی تھی صدائے اہل دل — اے خوشا کہ رنگ لے آئی دعائے اہل دل
درد کا درماں بنی وہ التجائے اہل دل — لوٹ کے آنا یہاں بارِ دگر کیسا لگا
اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا؟

یوں قفس کی تیلیوں کا ٹوٹنا کیسا لگا
بند آہن سے یکایک چھوٹنا کیسا لگا
صبح کا جلوہ ، یہ پَو کا پھوٹنا کیسا لگا
چاندنی کیسی لگی ، نورِ سحر کیسا لگا

اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا؟

یہ زمیں کیسی لگی ، یہ آسماں کیسا لگا؟
سانس آزادی کی لی تو یہ جہاں کیسا لگا؟
طے ہوئی جو یہ مسافت ، آشیاں کیسا لگا؟
جس سے تم بچھڑے رہے وہ ہمسفر کیسا لگا؟

اتنی مدت بعد آئے ہو تو گھر کیسا لگا؟

(ہے دستِ دعا در از مرا صفحہ 341-343)

## پیارے آقا کا ایک یادگار خط

خوشی کے اس موقع پر پیارے آقا نے خاکسار کی اہلیہ کو جو یادگار تہنیتی خط تحریر فرمایا، اس کا عکس پیش خدمت ہے:

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

لندن
01.6.94

پیاری عزیزہ طاہرہ الیاس منیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ساہیوال کیس کے معصوم اسیران راہ مولیٰ کو آزادی عطا فرمائی اور ہماری قبولیت دعا کا عظیم الشان نشان ظاہر ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان مجاہدوں کی قربانی کو قبول فرمائے اور یہ آزادی ساری جماعت کو مبارک فرمائے۔ مبارک باد کا شکریہ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اخلاص اور ایمان کو قبول فرمائے۔ بچوں کو بے حد پیار۔ الیاس منیر کو بہت بہت مبارک باد، سلام اور شاباش۔

والسلام
خاکسار
مرزا طاہر احمد

اس دفعہ تم نے اچھا عنوان پر بات کی بہت خوشی ہوئی۔
الحمدللہ کہ تم خیریت سے ہسپتال سے گھر آگئیں۔ ... بھی بڑی محبت سے ہمیشہ یاد کرتی ہے ...
دعا ... سلام بھیج رہی ہے

بیگم الیاس منیر

447

# اسیرانِ راہ مولیٰ ساہیوال کا مسجد فضل لنڈن میں شاندار استقبال

ہمارے استقبال کے سلسلہ میں سب سے اہم اور یادگار تقریب خاکسار کے چار ساتھیوں کے لندن پہنچنے کے فوراً بعد محمود ہال لندن میں ہوئی جس میں حضرت امیرالمؤمنین خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے بنفس نفیس شرکت فرمائی۔ اس خصوصی تقریب کا آنکھوں دیکھا جو حال مدیر الفضل انٹرنیشنل نے قلم بند کر کے سپرد اشاعت کیا تھا، ہدیہ قارئین ہے:

''27رجولائی 1994ء کو چار اسیران راہ مولیٰ مکرم رانا نعیم الدین صاحب، مکرم عبدالقدیر صاحب، مکرم محمد حاذق رفیق طاہر صاحب اور مکرم محمد نثار صاحب (ان کے پانچویں ساتھی محمد الیاس منیر کے ویزا بطور مربی کے حصول میں دیر ہونے کی وجہ سے اس سال لنڈن نہ پہنچ سکے) قریباً چار بج کر پچپن منٹ پر مسجد فضل لنڈن تشریف لائے تو تمام حاضرین نے نہایت پرجوش نعروں اور محبت وعقیدت کے آنسوؤں کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ محمود ہال لندن میں ان کی آمد پر ایک سادہ مگر نہایت عظمت اور شان رکھنے والی تاریخی نوعیت کی مختصر تقریب منعقد ہوئی۔ تقریب کا وہ منظر نہایت ہی رقت آمیز بھی تھا اور ایمان افروز بھی جب سیّدنا حضرت امیرالمومنین خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ ہال میں تشریف لائے اور باری باری چاروں اسیران کو نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ اپنے سینے سے لگایا۔ آپ نے ان اسیران کی رہائی کیلئے کس قدر بے چینی اور بے قراری سے اپنے مولا کے حضور دن رات فریاد کی تھی ۔

ہیں کس کے بدن دیس میں پابند سلاسل — پردیس میں ایک روح گرفتار بلا ہے
جس رہ میں وہ کھوئے گئے اس رہ پہ گدا ایک — کشکول لئے پھرتا ہے لب پہ یہ دعا ہے
خیرات کر اب ان کی رہائی میرے آقا — کشکول میں بھر دے جو میرے دل میں بھرا ہے

اور خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں رہا فرمایا اور آج یہ اسیران راہ مولا قریباً دس سال کی طویل اور صبر آزما قید کے بعد اپنے محبوب اور شفیق آقا کی ملاقات اور معانقہ کے شرف سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ دونوں طرف جذبات کا ایک طوفان تھا۔ تمام حاضرین بھی ایک عجیب قلبی و روحانی کیفیت میں مست تھے۔ خدا تعالیٰ کے بے انتہا فضلوں پر دل خوشی سے لبریز اور اس کے حضور سجدہ ریز تھے۔ چاروں اسیران کو شرف مصافحہ و معانقہ عطا فرمانے کے بعد حضور رحمہ اللہ کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ یہ اسیران

آپ کے پہلوؤں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تلاوت سے کارروائی کا آغاز ہوااور پھر سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے تشہد و تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے ساتھ خطاب شروع فرمایا۔ فرطِ جذبات سے حضور کی آواز گلوگیر تھی۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور احسان کے ساتھ احمدیت ایک سو سال کے بعد اس عظیم دور میں داخل ہوئی ہے جس کا گہرا تعلق حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعاؤں اور ان دعاؤں کے نتیجہ میں آسمان سے اُترنے والی برکتوں سے ہے۔ 1894ء کا سال وہ تھا جبکہ ایسے عظیم نشان ظاہر ہوئے جنہیں دنیا کبھی بھلا نہیں سکے گی یعنی چاند اور سورج کا رمضان شریف میں ان تاریخوں میں گہنایا جانا جن تاریخوں کے متعلق حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ نے تیرہ سو برس پہلے خبر دے رکھی تھی کہ ہمارے مہدی کیلئے یہ دو نشان آسمان سے ظاہر ہوں گے اور اب ایک سو سال بعد یہ سال (1994ء) بھی اللہ کے فضلوں کے ساتھ نشانات کا سال بن رہا ہے اور بنتا رہے گا اور اس صدی کے سالوں میں اسے بھی ایک امتیازی نشان نصیب ہوگا۔

حضور نے فرمایا کہ گزشتہ دس سال کے دور میں جو نشان دیکھے ہیں وہ بھی بہت نمایاں اور غیر معمولی شان کے نشان ہیں جن کے متعلق دشمن جو چاہے کہے وہ ان نشانات کے نور کو مٹا نہیں سکتا اور ان کی پھونکوں سے یہ چراغ بجھ نہیں سکتے۔ ان میں اول نشان ایک ہیبت ناک جلالی نشان تھا جو ضیاء کی ہلاکت کی صورت میں پورا ہوا جس کے متعلق اس نشان کے ظہور سے چند دن پہلے خطبہ جمعہ میں مَیں نے اعلان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خبر دی ہے کہ اب ضیاء کو خدا کی وعید سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ وہ ضیاء جس نے چند احمدی معصوموں کی جان لینے کی قسم کھا رکھی تھی، جس کا یہ خیال تھا کہ میرے قلم کا لکھا مٹایا نہیں جاسکتا اور اپنی طرف سے ان معصوم اسیران راہ مولا کی گردنیں پھانسی کے پھندے میں پھنسا بیٹھا تھا خود اس کی جان تقدیر کے چنگل میں آکر اس طرح ہلاک ہوئی کہ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ بکھر گیا اور اس کی خاک اُڑ گئی۔ یہاں تک کہ اس کے وجود کی پہچان سوائے اس بتیسی کے اور کچھ نہ رہی جو مصنوعی طور پر دندان سازوں نے بنا رکھی تھی اور اس کے بعد دوسرا نشان ہمارے اسیران راہ مولیٰ کا موت کے چنگل سے نکل آنا ہے جس پر ضیاء کے قلم کی سیاہی گواہ تھی کہ ضرور یہ موت کے چنگل میں ڈالے جائیں گے لیکن خدا کی روشنائی نے کچھ

اور آسمان پر لکھ رکھا تھا اور یہ گواہی بھی خدا کے فضل سے بڑی شان کے ساتھ حیرت انگیز طریق پر پوری ہوئی۔ اور آج ہمارے سامنے یہ زندہ سلامت موجود ہیں۔

حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ ضیاء الحق نے موت کی سزا صرف ایک شخص کیلئے نہیں رہنے دی بلکہ زیادہ معصوموں پر اس سزا کو پھیلایا ہے تو انہی دنوں میں بہت بے قراری سے دعاؤں کا موقع ملا اور میں نے ایک رؤیا میں دیکھا کہ الیاس منیر کھلی فضا میں ایک چارپائی پر میرے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اُسی وقت میں نے سب کو بتادیا اور بارہا خطوط کے ذریعہ بھی تسلی دی کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو سکتی ہے مگر الیاس منیر کی گردن میں پھانسی کا پھندا نہیں پڑے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس ایک کے سایہ میں یہ سارے بھی اللہ کے فضل سے شامل تھے۔ وہ ان کا سردار تھا۔ وہ جماعت کا نمائندہ تھا۔ اور خدا کے نزدیک اس کے وقف کی وجہ سے اس کا ایک مرتبہ تھا اور ہے۔ پس جو بات میں اُس وقت نہیں سمجھ سکا تھا وہ بعد میں حالات نے روشن کی وہ یہ تھی کہ محض ایک الیاس کی خوشخبری نہیں تھی بلکہ ان سب معصوموں کی رہائی کی خوشخبری اس ایک خوشخبری میں شامل تھی۔ پھر حالات بدلنے شروع ہوئے اور پھانسی کا وقت قریب آنا شروع ہوا۔ بہت سے لوگ مجھے گھبرا گھبرا کر لکھتے رہے مگر ایک لمحہ کیلئے بھی ایک ذرہ بھی مجھے خوف نہیں ہوا۔ میں سب کو کہتا رہا کہ یہ ناممکن ہے۔ خدا کی بات جیسے ضیاء کی موت کی صورت میں پوری ہوئی تھی اسی طرح ان کی زندگیوں کی صورت میں پوری ہوگی۔ اور دنیا کی کوئی تقدیر اسے مٹا نہیں سکتی، بدل نہیں سکتی اور پھر اس طرح اعجازی رنگ میں یہ واقعات رونما ہوئے کہ انسان کی عقل ورطہ حیرت میں پڑ جاتی ہے۔

حضور نے فرمایا کہ یہ سارے واقعات جن کی کچھ تفصیل میرے علم میں ہے مگر اس وقت بتانے کا وقت نہیں پھر انشاءاللہ جماعت کے سامنے آئیں گے اور یہ روشن تاریخ روشن تر ہو کر آپ کے سامنے آئے گی جس کی نظیر تاریخ عالم میں کم ملتی ہے۔ حضور نے فرمایا کہ یہ واقعات زندہ خدا کی صداقت کے وجود کے ثبوت ہیں اور عقل ان کی کوئی اور توجیہہ پیش نہیں کر سکتی سوائے اس کے قادر مطلق کی تقدیر کا دخل تھا جو غالب تقدیر ہے۔ پس الحمدللہ خدا نے ہمیں وہ خوشیوں کا دن دکھایا۔ اپنے پیارے اسیروں کو ہم نے چھاتی سے لگایا، اپنے پہلو میں بٹھایا وہ ساری آرزوئیں خدا نے پوری کیں جن کیلئے دل ترسا کرتا تھا کوئی امید کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک یقین تھا جو متزلزل نہیں ہوا۔ ساری دنیا ڈولتی دکھائی دیتی تھی مگر

خدا کے وعدوں پر کامل یقین تھا جو ثابت قدم رہا۔ آج وہ یقین جیتا ہے پس اللہ کے شکر کے ترانے گانے کے دن آگئے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ الحمد للہ رب العالمین۔ الحمد للہ رب العالمین۔

حضور نے فرمایا خدا کرے کہ آج کے دور کی برکتیں اور بھی پھیلتی چلی جائیں۔ یہ سال اور روشن تر نشان لے کر آگے بڑھتا رہے۔ اس نشان کی روشنی آنے والی ساری صدی کو روشن کر سکے، اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔ خدا ہمیں وہ توفیق عطا فرمائے کہ مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پورا زمانہ دیکھیں اور بعد کے زمانے میں آنے والے نشانات کا بھی مشاہدہ کر سکیں، اللہ کرے ایسا ہی ہو۔

اس کے بعد حضور انور نے ایک نہایت پر سوز دعا کروائی۔ دعا کے بعد حضور انور نے اپنے دست مبارک سے اسیران کو مٹھائی عطا فرمائی۔ اس موقع پر تمام حاضرین میں بھی شیرینی تقسیم کی گئی۔[1]

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی اسیرانِ راہ مولیٰ کے بارہ میں تڑپ ؎

سینے سے لگا لینے کی حسرت نہیں مٹتی پہلو میں بٹھانے کی تڑپ حد سے سوا ہے

پوری فرمائی۔ اس موقع پر بھی پیارے آقا کی خوشی و مسرت کی کیفیت دیدنی تھی۔

## عالمی استقبالیہ تقریب

اسیران کے اعزاز میں سب سے اہم اور بڑی تقریب اُس وقت ہوئی جب حضور خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے از راہ شفقت و محبت جلسہ سالانہ یو کے منعقدہ جولائی 1994ء کے دوسرے روز اپنے خطاب کے آخر پر غیر معمولی محبت و شفقت فرماتے ہوئے ان چاروں اسیران کا تعارف کرایا اور انہیں شرف مصافحہ و معانقہ سے نواز کر اپنے سینہ سے لگایا۔ اس یادگار تاریخی اور قابل رشک نظارہ کو دنیا بھر میں MTA کے ذریعہ دیکھا گیا۔ حضور انورؒ نے اس موقع پر فرمایا:

”آخری دعا سے پہلے ایک اور بات آپ کو بتانی چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسیرانِ راہِ مولیٰ جنہوں نے بہت لمبا عرصہ بڑے دُکھ اُٹھائے، خدا نے ان کی رہائی فرما کر تمام دنیا کے احمدیوں پر عظیم احسان فرمایا ہے۔ ان میں سے چار بنفس نفیس آج یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کا تعارف کرواؤں گا مگر ایک اسیر کا انتظار ہے (الیاس منیر، ناقل) کاش وہ جلسے سے پہلے پہنچ جائے تو پھر سب کا اکٹھا تعارف کراؤں۔ مگر خدا کی تقدیر جو بھی چاہے ہم راضی ہیں ان کو توفیق نہیں ملی کہ وہ آج اس وقت تک پہنچ سکیں، اس لئے آخری مدت تک انتظار کے بعد میرا فیصلہ تھا کہ میں تمام عالمگیر دنیا کی

---

[1] الفضل انٹرنیشنل لندن 12 تا 18 اگست 1994ء

جماعت کی طرف سے آج ان کو آپ کی آنکھوں کے سامنے سینہ سے لگاؤں گا۔ اس کے بعد ہم اجتماعی دعا کریں گے۔ (گلے ملنے کے بعد حضور نے فرمایا) جیسا کہ میں نے اِعلان کیا تھا کہ میں ان اسیرانِ راہ مولیٰ کو اپنے سینے سے لگایا آپ سب کے سینوں کی نمائندگی میں، ان کی نمائندگی میں جو یہاں موجود ہیں اور ان کی نمائندگی میں بھی جو یہاں موجود نہیں اور میں یقین رکھتا ہوں جس طرح ان کو سینہ سے لگا کر میرا سینہ ٹھنڈا ہوا ہے، خدا آپ سب کے سینے ٹھنڈے کرے گا۔ اللہ کرے کہ ہم دیکھیں ان پر رحمتوں کی بارشوں کا نزول دیکھیں اور ان پر اپنے فضلوں کو بڑھاتا چلا جائے، اِن کی آنے والی نسلوں پر بھی اپنے فضل نازل فرماتا چلا جائے...... آپ اُن اسیرانِ راہِ مولیٰ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا جو اس وقت شدید گرمی اور سخت تکلیف کی حالت میں کال کوٹھڑیوں میں اپنے زندگی اور موت کے فیصلوں کا انتظار کر رہے ہیں، ان کے اوپر جو نحوست کی تلوار ان لوگوں نے لٹکانے کی کوشش کی ہے وہ سب سے بد بخت نحوست کی تلوار ہے یعنی حضرت اقدس محمد ﷺ کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہیں مگر اللہ جانتا ہے اور خدا کی ساری کائنات گواہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت محمد مصطفی ﷺ کے عشق میں سرتاپا ڈوبے ہوئے ہیں۔ آپ کے خدام ہیں اور ان پر یہ ناپاک اور جھوٹا الزام ایک گندی تہمت لگائی گئی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور جس رنگ میں یہ تہمت لگائی گئی ہے وہ خود گواہ ہے کہ یہ بد بخت لوگ جھوٹے ہیں اُنہیں یہ توفیق نہیں ملی کہ یہ کہہ سکیں کہ انہوں نے نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں کوئی بات کی ہے۔ کچھ کہہ سکے تو اتنا کہہ سکے کہ پکڑے گئے جب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اعلان کر رہے تھے۔ یہ ایسی حالت میں پکڑے گئے جب کہ ان کے قبضے سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم دستیاب ہوئی، جب ان کے گھروں کی تلاشی لی گئی تو ان کے گھروں سے قرآن کریم کے نسخے برآمد ہوئے۔ اس لئے یہ لوگ محمد مصطفی ﷺ کے گستاخ ہیں۔ پس اس الزام میں ہی الزام کے جھوٹے ہونے کا ثبوت شامل ہے۔ پس جو بھی خدا کی تقدیر ظاہر ہو ہم اس پر راضی ہیں مگر دعا کریں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ان کے بد بخت چنگل سے نجات بخشے اور ان کی رہائی سے بھی ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں جس طرح ان عزیزوں کی رہائی سے آج خدا نے ہماری آنکھیں ٹھنڈی کی ہیں۔ اللہ کرے کہ جلد وہ دن آئیں جب کہ ذہن کی راہیں تبدیل کی جائیں گی جبکہ حالات بدلنے شروع ہوں گے اور اس سمت میں سفر ہم شروع کر چکے ہیں۔ اصل علاج ہے غلبہ کا علاج، جو مظلوم ہیں اور مغلوب ہیں کم تعداد میں ہیں، انہیں بہر حال لازماً اپنی تعداد کو بڑھانا ہے اور ان لوگوں پر غالب آنا ہے ان کی اکثریت کو لازماً اقلیت میں تبدیل کرنا ہے۔

اے مسیح موعودؑ کے شیرو! اُٹھو اور یہ کر کے دکھاؤ خدا کی تائید تمہارے ساتھ ہے، آج نہیں تو کل یہ ضرور ہوگا، یہ تو آسمان کی تحریریں ہیں جو تبدیل نہیں کی جاسکتیں کل نہیں تو پرسوں میری خلافت میں نہیں تو آئندہ آنے والے خلیفہ کے دَور میں یا اُس کے آئندہ آنے والے خلافت کے زمانے میں۔ یہ تقدیر اٹل ہے کہ ان کی اکثریتیں اقلیتوں میں تبدیل کردی جائیں گی اور جماعت احمدیہ مسیح کے سچے غلاموں کی اقلیتیں اکثریتوں میں بدل جائیں گی اور ہمیشہ کے لئے قیامت تک پھر جماعت احمدیہ کو ان منکرین پر غلبہ عطا ہوگا۔ یہ اٹل تقدیر ہے جس کو دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی۔"[1]

جس بات کو کہے کہ کروں گا میں یہ ضرور
ٹلتی نہیں وہ بات خدائی یہی تو ہے

### خاکسار اپنے آقا کے حضور

جیسا کہ اوپر ذکر گزر چکا ہے کہ خاکسار کے ویزے کے حصول کا معاملہ طویل تھا اس لئے جلسہ سالانہ 1994ء کے موقع پر لندن نہ پہنچ سکا تھا تاہم اِسی سال اکتوبر میں مجھے جرمنی آنا پڑا جہاں اگلے سال مئی میں مجلس خدام الاحمدیہ جرمنی کے سالانہ اجتماع کے موقع پر حضور انورؒ تشریف لائے تو پہلی باقاعدہ ملاقات کا شرف مجھے نصیب ہوا۔ جو ایک طویل و پرجوش اور محبت و شفقت بھرے معانقہ اور حال واحوال دریافت کرنے پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد یہاں جرمنی میں متعدد ملاقاتیں ہوتی رہیں مگر حضور انورؒ پر میں اور میرے ماں باپ قربان کہ آپ نے جلسہ سالانہ 1994ء کا موقع نہیں بھلایا بلکہ اسے ہمیشہ قرض سمجھا یہاں تک کہ جولائی 1996ء میں مجھے پہلی مرتبہ جلسہ سالانہ یوکے میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تو لوائے احمدیت لہرانے کے بعد افتتاح کے لئے پنڈال میں تشریف لے جاتے ہوئے اردگرد کھڑے ہزاروں احباب جماعت میں سے مجھے ڈھونڈ نکالا، جونہی حضور کی نظر شفقت مجھ پر پڑی، فوراً مجھے طلب فرمایا۔ میں راستہ بناتے ہوئے خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو جوش محبت اور وفور مسرت سے یک دم کئی سوال کر دیئے کہ کب پہنچے؟ کیسے پہنچے وغیرہ۔

میرے لئے تو یہی ملاقات بہت بڑی بات تھی مگر پیارے آقا کے دل میں تو یہ خواہش مچل رہی تھی کہ خاکسار کو بھی اُسی طرح اپنے سینہ سے لگائیں جس طرح دیگر اسیران کو اپنے سینہ سے لگایا تھا۔ چنانچہ خاکسار کو یہ ناقابل فراموش سعادت اُس لمحہ نصیب ہوئی جب خاکسار جلسہ سالانہ برطانیہ 1996ء کے دوسرے روز اجلاس دوم کے آغاز میں

---

1 از ویڈیو جلسہ سالانہ 1994ء

تلاوت کی گئیں آیات قرآنیہ کا اردو ترجمہ پیش کر کے اپنی جگہ واپس جانے لگا تو اچانک حضور اقدس نے فرمایا:

'کہاں جا رہے ہیں آپ! یہاں کھڑے ہو جائیں۔ آپ کا ایک قرضہ چکانا ہے۔ کھڑے ہو جائیں۔'

پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا:

'وہ جو اسیرانِ راہِ مولیٰ کے نام سے مشہور ہیں ان کے یہ سردار تھے خدا کے فضل سے اور جب ان پر ان کی گردنوں پر پھانسی کا شکنجا کس دیا گیا اور اطلاع ملی کہ اب کوئی نجات کی راہ دکھائی نہیں دیتی اور حکومت تلی بیٹھی ہے کہ ان کو ضرور پھانسی دے گی۔ اُس وقت میں نے ایک رؤیا میں دیکھا کہ الیاس منیر کو میں ایک کھلی شاداب جگہ میں جہاں درختوں کے سائے ہیں بڑی محبت سے مل رہا ہوں۔ میں نے اِس پر اُس وقت یہ اعلان کیا کہ اللہ کے فضل سے اب یہ اسیران راہِ مولیٰ آزاد ہو کر ہمیں ملیں گے اور اُس وقت کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی جب اسیران راہِ مولیٰ کا ایک گروہ جس میں چار اسیران تھے، دو سال قبل یہاں مجھ سے ملے۔ ان سب سے میں گلے لگا تھا اور الیاس منیر کی باری میں نے رکھ چھوڑی تھی اگرچہ بارہا جرمنی جانے کا مجھے موقع ملا مگر مجھے جو رؤیا میں تصور دکھایا گیا تھا وہ ایک ہی جگہ تھی اس لئے باوجود ان خبروں کے کہ ان کو یہاں آنے کا ویزا نہیں مل سکتا، ہر کوشش ناکام ہو گئی، میں ان کا اِنتظار کرتا رہا کہ یہاں آئیں گے تو ان کا قرض اُتاروں گا۔ اب میں ان کو گلے لگاتا ہوں اور اللہ کے اس انعام کا شکر ادا کرتا ہوں، شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے بہت پہلے مجھے یہ خوشخبری دی تھی، آج سارا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ اللہ کی وہ بات پوری ہوئی'' ۔

میں ذرہ خاک اور وہ سورج     یہ کون سما رہا ہے کس میں

حضور رحمہ اللہ کا یہ خواب ایک اَور موقع پر بھی پورا ہوا جب حضور رحمہ اللہ اپنے دورۂ جرمنی اگست 1996ء کے دوران میونخ سے فرانکفورٹ واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں ایک کھلی جگہ رُک کر گھاس پر چادریں بچھا کر مغرب وعشاء کی نمازیں ادا کیں اور اس کے بعد یہیں کھانا تناول فرمایا۔ اس دوران خاکسار کو حضور انور کے بالکل پہلو میں بیٹھنے کی سعادت ملی۔ اس موقع پر پیارے آقا کی خدمت میں خاکسار نے حضور کے مذکورہ بالا خواب کا بھی ذکر کیا۔

## لاہور ہائی کورٹ کا فیصلہ رہائی

رہائی کے واقعات پر مشتمل باب ختم کرنے سے قبل ضروری سمجھتا ہوں کہ لاہور ہائی کورٹ کا وہ فیصلہ بھی درج کردوں جو 19 مارچ 1994ء کو ہوا اور جس کے نتیجہ میں ہماری رہائی عمل میں آئی۔ اس فیصلہ کے متن کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

لاہور ہائی کورٹ لاہور

رٹ پٹیشن نمبر 768/87

**موجود: مسٹر جسٹس ارشاد حسن خاں۔ مسٹر جسٹس محمد عارف**

پٹیشن: زیر آرٹیکل ۱۹۹ آف دستور اسلامک ریپبلک آف پاکستان یہ التجاء کرتے ہیں کہ پٹیشنرز کو جو سزا کا حکم سنایا گیا ہے اور اس کارروائی کے نتیجہ میں جو درج بالا فیصلہ دیا گیا ہے اسے ناجائز، غیر قانونی، ناواجب، بلا جواز، کالعدم اور بغیر کسی قانونی اختیار کے قرار دیا جائے۔

یہ درخواست بھی کی جاتی ہے کہ اس پٹیشن کے فیصلہ تک ملزمان نمبر 1 اور نمبر 2 کو سنائی گئی سزائے موت کے فیصلہ پر عملدرآمد روک دیا جائے۔

۱۔ محمد الیاس منیر مربی ولد محمد اسمٰعیل منیر ذات راجپوت ساکن بیت الحمد پولیس سٹیشن اے ڈویژن ساہیوال۔

۲۔ نعیم الدین ولد فیروز دین ذات راجپوت خادم وساکن بیت الحمد ساہیوال

۳۔ عبدالقدیر ولد عبدالرحیم ذات ارائیں ساکن حسین بخش کالونی پولیس سٹیشن صدر ساہیوال

۴۔ محمد ناصر ولد گلزار محمد ذات ارائیں ساکن مکان نمبر 335/x فرید ٹاؤن ساہیوال (درست نام محمد نثار ہے)

۵۔ محمد حاذق رفیق طاہر ولد میاں محمد عاشق ذات زرگر راجپوت ساکن ۱۱۵ محلہ اسلام آباد ساہیوال

۶۔ محمد دین ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس ولد فقیر علی ذات ککے زئی ساکن سٹیڈیم روڈ ساہیوال

یہ تمام سنٹرل جیل ساہیوال میں قید ہیں۔

.........پٹیشنرز بخلاف

۱۔ وفاق پاکستان بذریعہ سیکریٹری داخلہ اسلام آباد

۲۔ صوبہ پنجاب بذریعہ ہوم سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب لاہور۔

۳۔ سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل ساہیوال

.........ریسپونڈنٹس حکم منسلک ہے، دستخط شدہ 20.03.1994

# فیصلہ

لاہور ہائی کورٹ لاہور

راولپنڈی بنچ راولپنڈی

ملتان بنچ ملتان

صیغہ عدالت

رٹ پٹشن نمبر ۱۹۸۷ / ۶۸/ ۷

تاریخ سماعت: ۱۹۹۴ـ ۳ـ ۱۶

درخواست گزاران محمد الیاس منیر مربی وغیرہ

بذریعہ عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ اور مختار احمد بٹ ایڈووکیٹ

مسئول علیہان

۱ـ وفاق پاکستان بذریعہ فقیر محمد سیکرٹری وزارت داخلہ اسلام آباد

۲ـ صوبہ پنجاب بذریعہ ہوم سیکرٹری گورنمنٹ آف پنجاب میاں عبدالستار نجم

۳ـ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب

ارشاد حسن خان جج: یہ درخواست جو اسلامی ریپبلک آف پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۱۹۹ کے تحت ہے اور سپیشل ملٹری کورٹ نمبر ۶۲ ملتان کے فیصلہ مورخہ 21.10.1985 کیخلاف ہے جس کی توثیق صدر پاکستان نے کی تھی۔

درخواست گذاران محمد الیاس منیر مربی اور نعیم الدین نمبر ا اور ۲ جن کو دُہری سزائے موت سنائی گئی تھی جبکہ عبدالقدیر، محمد نثار، محمد حاذق رفیق طاہر، اور محمد دین پٹیشنرز نمبر ۳، ۴، ۵ اور ۶ کو سات سال قید سنائی گئی۔ تاہم محمد اسحاق کو الزام سے بری کر دیا گیا تھا۔

۲ـ واقعات مختصراً اس طرح سے ہیں کہ کیس ایف آئی آر ۲۲۶ مورخہ ۱۹۸۴ـ ۱۰ـ ۲۶ زیر دفعہ ۳۰۲/ ۱۴۹ اور ۱۴۸ پی پی سی ان پٹیشنرز اور پانچ دوسرے افراد کے خلاف پولیس سٹیشن اے ڈویژن ساہیوال میں درج ہوا۔ ان میں سے چار روپوش قرار دیئے گئے۔ الزام یہ لگایا گیا کہ محمد الیاس منیر مربی

جرمنی میں اسیران کے اعزاز میں دی گئی ایک استقبالیہ تقریب، اگست 1994ء

جرمنی پہنچنے پر محمد الیاس منیر فرانکفورٹ ایئرپورٹ پر استقبال کرنے والے احباب جماعت کے درمیان

جلسہ سالانہ یوکے 1996ء کے موقع پر خاکسار پہلی دفعہ پہنچا تو جلسہ گاہ تشریف لے جاتے ہوئے حضور سے ملاقات

جلسہ سالانہ یوکے 1996ء کے دوسرے روز اپنے خطاب سے پہلے حضور رحمہ اللہ نے خاکسار کو معانقہ کا شرف عطا فرمایا

رہائی کے بعد ربوہ پہنچنے پر دار الضیافت میں احباب کا جوش وجذبہ

مولانا محمد احمد جلیل صاحب، مولانا سلطان محمود انور اور محترم یوسف سہیل شوق صاحب نمایاں ہیں

نصرت جہاں اکیڈمی ربوہ کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ کا ایک منظر

اسیران راہ مولیٰ ساہیوال کے اعزاز میں ربوہ کے مختلف اداروں کی طرف سے ہونے والی استقبالیہ تقریبات

دارالضیافت ربوہ میں ایک تقریب، دائیں طرف: عزیزم خالد الیاس، خاکسار محمد الیاس منیر، مکرم رانا نعیم الدین صاحب،
مکرم عبدالقدیر صاحب، مکرم محمد نثار صاحب اور عزیزم طارق الیاس

نے اپنی بندوق سے فائر کیا کو قاری بشیر کے بائیں کندھے اور چھاتی پر لگا اور وہ لڑکھڑا گیا۔ اظہر رفیق اسی کی مدد کو بڑھا جس پر لطف الرحمٰن اور اسحاق نے اپنے اسلحہ سے فائر کیا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے چلائی گئی ایک گولی اظہر رفیق کی پیشانی اور چہرے کے بائیں جانب لگی۔ دونوں زخمی گر گئے۔ اس موقعہ پر حفیظ الرحمٰن اور شاہد نصیر باجوہ ملزمان بھی آ گئے اور دونوں ساتھی ملزمان کو ہدایت کی کہ ہر دو زخمیوں کو جائے واردات سے ہٹا دیا جائے۔ اس وقت مضروبان دم توڑ گئے۔ ملزمان حفیظ الرحمٰن اور شاہد نصیر نے اپنے طور پر یہ کوشش کی تھی مگر یہ مجرم نہ پائے گئے دونوں الزام سے بری قرار پائے۔ دوسرے سے دو ملزمان پروفیسر طفیل اور لطف الرحمٰن ابھی تک غائب ہیں۔ محمد دین پٹیشنر مقدمہ کی سماعت کی طوالت کے دوران وفات پا گیا۔

۳۔ سپیشل ملٹری کورٹ نے مقدمہ کی سماعت کے دوران تمام ۱۶ گواہوں کے بیانات لئے۔ ان میں ۳ عدالتی گواہ بھی تھے۔ کارروائی کے اختتام پر محمد الیاس منیر اور نعیم الدین پٹیشنر نمبر ۱ اور ۲ کو سزائے موت سنائی گئی جبکہ عبدالقدیر محمد نثار، محمد حاذق رفیق طاہر اور محمد دین پٹیشنرز نمبر ۳، ۴، ۵، اور ۶ کو سات سات سال قید کی سزا سنائی گئی جبکہ محمد اسحاق کو الزام سے بری کر دیا گیا۔

۴۔ سپیشل ملٹری کورٹ کی تفتیش اور سزا کی کارروائی کی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون A کی طرف سے توثیق نہ کی گئی اور ان کی طرف سے حکم نامہ مورخہ ۱۹۸۵-۱۰-۸ میں ان کے مشاہدات کی روشنی میں فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کو کہا گیا کہ نعیم الدین کا کیس دفعہ ۳۰۲ کے تحت نہ آتا تھا بلکہ حفاظت خود اختیاری کے تحت تھا۔ اگرچہ اس نے اس میں قدرے تجاویز کیا اس لیے اُسے دفعہ ۳۰۴ پی پی سی کے تحت ملزم گردانا جاتا۔ پٹیشنرز کی دفعہ ۱۴۸ پی پی سی کے تحت سزا یابی کو قابل قبول نہ سمجھا گیا۔ یہ حکم ہوا کہ کورٹ ملزمان کی دفعہ ۱۰۹ کے تحت مناسب سزا تجویز کرے۔

۵۔ مارشل اور ایڈمنسٹریٹر زون A کے مندرجہ بالا حکم کی تعمیل میں سپیشل ملٹری کورٹ دوبارہ مؤرخہ ۱۹۸۵-۱۰-۲۱ کو بیٹھی اور اپنی پہلی تفتیش پر نظر ثانی کی تاہم محمد الیاس منیر مربی اور نعیم الدین کو پھر دفعہ ۳۰۲ کے تحت ہی سزائے موت اور دس دس ہزار روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ عبدالقدیر، محمد نثار، حاذق رفیق طاہر اور محمد دین کو عمر قید اور پانچ پانچ ہزار روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ یہ سزائیں جو سپیشل ملٹری

کورٹ نے سنائیں ان احکامات کی صریح خلاف ورزی تھی جو مارشل ایڈمنسٹریٹر زون اے نے مورخہ ۱۹۸۵۔۱۰۔۸ کو دیئے۔ تاہم ملزمان دفعہ ۱۴۸ پی پی سی کے تحت الزام نمبر ۳ کے قصور وار ثابت نہ ہوئے۔ محمد اسحاق پھر الزام سے بری الزمہ قرار دیا گیا۔

۶۔ سپیشل ملٹری کورٹ کے فیصلہ کی صدر پاکستان نے ماہ فروری ۱۹۸۶ء میں توثیق کی اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زون A کے احکامات مورخہ ۱۹۸۵۔۱۰۔۸ کو نظر انداز کر دیا۔ تاہم صدر نے فیصلہ کی توثیق کر تے ہوئے پٹیشنر ز نمبر ۳ تا ۶ کے اِلزامات کو دفعہ ۱۴۹ سے دفعہ ۱۰۹ پی پی سی میں تبدیل کر دیا۔ جہاں تک باقی دو ملزمان کا تعلق ہے ان کی سزا کی اُسی طرح توثیق کی گئی۔

۷۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وہ عام رعایت جو صدر کی طرف سے دوسرے لوگوں کو دی گئی بحوالہ خط مورخہ ۱۹۸۸۔۱۲۔۷ کے مستحق پٹیشنر ز نمبر ۱ اور ۲ بھی قرار پائے تھے جس کے تحت ان کی سزائے موت کا حکم عمر قید کی سزا میں تبدیل ہو گیا تھا، وہ اب تک ساڑھے نو سال جیل میں گزار چکے ہیں۔

۸۔ پٹیشنر ز کے فاضل وکیل مسٹر عابد حسن منٹو نے اپنے موکلوں کو دی گئی سزا کو ان وجوہات کی بنا پر چیلنج کیا ہے۔

(۱) صدر نے احکامات کی توثیق کر کے مارشل لا آرڈر نمبر ۱۰۷ جسے سیکشن ۱۲۹ پاکستان آرمی ایکٹ ۱۹۵۲ء کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے، کی کھلی خلاف ورزی کی ہے۔ مزید یہ کہ صدر کو عمر قید کی سزا پانے والوں کے کیس ڈیل کرنے کا کوئی اختیار نہیں اور یہ کہ ایسا اختیار صرف گورنر کو حاصل ہے۔

(۲) صدر نے سزا کے فیصلہ میں جو دفعہ ۱۴۹ کو ۱۰۹ پی پی سی میں تبدیل کیا، اس کا اسے کوئی اختیار نہیں کیونکہ ایسا کرنے کے لئے پہلے مارشل لا ایڈمنسٹرٹر زون A کی طرف سے سزا کی توثیق ضروری ہے۔

(۳) صدر نے عدالت کی رائے کی توثیق نہیں کی۔ حتیٰ کہ پٹیشنر ز نمبر ۳ تا ۶ کے بارے میں بھی۔ اس لئے اس کی پٹیشنر ز کی سزاؤں کے فیصلہ کی توثیق بھی غیر قانونی ہو جاتی ہے۔

(۴) ملٹری کورٹ اسی طرح صدر پاکستان نے بھی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زون A کے آرڈر ۱۹۸۵۔۱۰۔۸ کو یکسر قابل غور نہ سمجھا۔

(۵) صدر اور سپیشل ملٹری کورٹ میں سے کسی نے بھی نظر ثانی شدہ فیصلہ کی توثیق کرنے میں اپنے ذہن کو حقائق سے قریب نہیں کیا۔

۹۔ مسٹر فقیر محمد کھوکھر فاضل ڈپٹی اٹارنی جنرل نے دلیل دی کہ کیس کو وہ استثنا حاصل نہیں ہے جو فیڈریشن آف پاکستان بنام ملک غلام مصطفیٰ کھر کو تھا۔ (SC 26PLD 1989) اس میں مخالفانہ تفتیش اور فیصلہ جات کو تبدیل نہ کیا گیا تھا۔ جہاں تک ان بے قاعدگیوں کا تعلق ہے جن کی نشان دہی پٹیشنرز کے فاضل وکیل نے کی، اس کے جواب میں ڈپٹی اٹارنی جنرل نے کہا کہ وہ معمول کی کارروائی میں آجاتی ہیں اور اس کے بارے عدالت کو زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ کیس آئین کے آرٹیکل A-270 کے تحت آتا ہے اور صدر کے فیصلہ پر کوئی قانونی کمزوری اثر انداز نہیں ہوتی۔

۱۰۔ میاں عبدالستار نجم فاضل ایڈووکیٹ جنرل نے پٹیشنرز کے کیس کی اس حد تک تائید کی کہ صدر عدالت نے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زون اے کے فیصلہ کو پیش نظر نہ رکھا۔

۱۱۔ ہم نے موجودہ ریکارڈ کا جائزہ لے لیا ہے جس میں پارٹیز کے فاضل وکیل نے ہماری مدد کی۔ پٹیشنرز کے فاضل کونسل کی طرف سے اٹھائے گئے تمام نکات کی پڑتال کی ضرورت نہیں ہے۔ مسٹر عابد حسن منٹو نے آخر میں کیس کو مختصراً دُہرایا کہ صدر کا وہ حکم بلا اختیار تھا جس میں اس نے سپیشل ملٹری کورٹ کی طرف سے سنائی گئی اُس فیصلہ کی توثیق کی جس کے بعد کورٹ کے ممبرز کا پہلا اجلاس مورخہ ۱۹۸۵۔۱۰۔۲۱ کو ہوا، جبکہ مارشل لا ایڈمنسٹر زون اے کی خصوصی رائے کے مطابق کہ پٹیشنرز پر کسی ایسے جرم کا ارتکاب ثابت نہ تھا جو دفعہ ۳۰۲ پی پی سی کے تحت ہو اور ان کا کیس دفعہ ۳۰۴ پی پی سی پارٹ ۲ کے تحت آتا تھا لیکن سپیشل ملٹری کورٹ نے اس رائے سے کلیتہً چشم پوشی کی اور پٹیشنرز کو دوبارہ دفعہ ۳۰۲ پی پی سی کے تحت سزا دے دی اور اِسی سزا کی صدر پاکستان نے بھی توثیق کردی۔ کیا پٹیشنرز کو مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زون اے کے حکم کے مطابق دفعہ ۳۰۴ پارٹ ۲ پی پی سی کے تحت سزا نہ دی جاتی تھی جو زیادہ سے زیادہ دس سال تھی جو اکتوبر ۱۹۹۴ء تک ہوتی اور وہ تو ساڑھے نو سال کی سزا ویسے بھی کاٹ چکے ہیں۔ کیس کے حالات وواقعات کو دیکھتے ہوئے ہم پٹیشنرز کے فاضل وکیل اور فاضل ایڈووکیٹ جنرل سے اتفاق کرتے ہیں کہ سپیشل ملٹری کورٹ اور صدر پاکستان کی طرف سے مارشل لا ایڈمنسٹریٹر زون اے کے ریکارڈ شدہ احکامات مؤرخہ 1985.10.8 کو زیر غور لانے میں ناکامی نے انصاف کا خون کر دیا ہے۔

۱۲۔ ہم نے غلام مصطفیٰ کھر کا کیس بھی دیکھا ہے جو اپنی اہمیت ایسے کھو دیتا ہے کہ جب نظر ثانی کے لئے

بیٹھنے والی ملٹری کورٹ کو مارشل لا ایڈ منسٹریٹر زون اے کے احکامات پر عمل کرنے میں ناکامی ہوتی ہے جو ۸۔۱۰۔۱۹۸۵ کو ریکارڈ پر لائے گئے تھے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ عدم شہادت کے کیس جن میں بد گمانی اور غلط ہدایات شامل ہوں یا قانونی طریق کار اپنانے میں ناکامی ہو وغیرہ وغیرہ، ایسے ہی سمجھے جاتے ہیں جن میں اختیارات سماعت کا غلط استعمال کیا گیا ہو۔ یہاں زیر اعتراض فیصلہ جو سپیشل ملٹری کورٹ نمبر ۶۲ کے دوبارہ جمع ہونے پر ہوا جس کی صدر نے بھی توثیق کر دی، واضح طور پر ایسی ہی تعریف میں آتا ہے۔ ہم بلاشک وشبہ زیر اعتراض فیصلہ کو غیر قانونی قرار دیتے ہیں۔

۱۳۔ اس ساری صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے جو اوپر گزر چکی ہم اس کیس کو مارشل لا ایڈ منسٹریٹر زون اے پنجاب کے حکم مورخہ ۸۔۱۰۔۱۹۸۵ کی تعمیل کے لئے کسی عام عدالت کو ارسال کر دیتے تاہم ہمارے نزدیک یہ طریق انصاف کے لئے مددگار نہ ہوتا۔ دفعہ ۳۰۴ پارٹ ۲ کی زیادہ سے زیادہ سزا دس سال ہے اور نعیم الدین ملزم ساڑھے نو سال جیل میں گزار چکا ہے۔ اس طرح سزا تو پہلے ہی کاٹی جا چکی ہے جو انصاف کے تقاضے پورے کرتی ہے۔ جہاں تک دوسرے پٹیشنرز کا تعلق ہے جن میں متوفی بھی شامل ہے کو مارشل لا ایڈ منسٹرز زون اے پنجاب نے دفعہ ۳۰۴ پی پی سی کے تحت مجرم ٹھہرایا تھا نہ کہ دفعہ ۳۰۲ پی پی سی لاگو کی تھی اور ان کے حق میں بھی سزا پہلے ہی پوری ہو چکی ہے اس طرح سارے قانونی تقاضے پورے ہو چکے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث کے مدنظر یہ پٹیشن اِس حد تک منظور کی جاتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کے نتیجہ میں پٹیشنرز کو فی الفور رہا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ کسی اور کیس میں مطلوب نہ ہوں۔ خرچ کے بارے کوئی حکم نہیں۔

| دستخط شد | دستخط شد |
| --- | --- |
| ارشاد حسن خان جج | محمد عارف جج |
| 19.03.1994 | 19.03.1994 |

کھلی عدالت میں سنایا گیا

IN THE LAHORE HIGH COURT LAHORE.
WRIT PETITION NO.768/87
PRESENT:
MR JUSTICE IRSHAD HASAN KHAN
MR JUSTICE MUHAMMAD ARIF

PETITION: under article 199 of the constitution of Islamic republic of Pakistan praying that the petitioner have been ordered to suffer as also the proceedings as a consequence of which the aforesaid sentences have been passed be declared to be mala fide, of no legal effect, unwarranted void and without jurisdiction and being without lawful authority.

It is also prayed that pending the final disposal of this case the execution of the sentence of death passed against petitioners No.1 and 2 be stayed.

1. Muhammad Ilyas Munir Murabbi son of Muhammad Ismail caste Rajput r/o Bait ul Hamad, P.S. A Division Sahiwal.
2. Naeem ud Din son of Feroze Khan caste Rajput, r/o Khadim ul Bait ul Hamad, Sahiwal.
3. Abdul Qadir son of Abdul Rahim caste Arain, r/o Hussain Bakhsh colony P.S.Sadar Sahiwal.
4. Muhammad Nasir son of Gulzar Muhammad caste Arain, r/o House No.335/X Farid Town Sahiwal.
5. Muhammad Haziq Rafique Tahir son of Mian Muhammad Ishaq caste Zargar Rajput, r/o 115 Mohallah Islamabad Sahiwal.
6. Mohammad Din Retd: Sub Inspector of Police s/o Faqeer Ali caste Kakey Zai r/o Stadium Road Sahiwal.
All confined in central Jail Sahiwal.

....Petitioners

Vs.

1. The Federation of Pakistan through Secretary Interior, Islamabad.
2. The Province of Punjab, through Home Secretary Government of the Punjab Lahore
3. Superintendent Central Jail Sahiwal.

....Respondents

ORDER ATTCHED

20.2.95

**JUDGMENT SHEET**

**IN THE LAHORE HIGH COURT LAHORE/ RAWALPINDI BENCH RAWALPINDI/ MULTAN BENCH MULTAN**

**JUDICIAL DEPARTMENT**

WRIT PETITION .. No. .. 768 .......... of 1987

**JUDGMENT**

DATE OF HEARING 16.5.1994

Petitioners No.1 (Muhammad Ilyas Munir, Murabbi etc.) by Mr. Abid Hassan Minto Advocate and Mr. [illegible] Ahmad Butt Advocate.

RESPONDENT No.1 (The Federation of Pakistan) by Mr. Pervez Muhammad [illegible] D.A.G.

Respondents No.2 & 3 (Province of Punjab through Home Secretary Govt. of Punjab etc.) by Mian Abdul Sattar Najam, Advocate General, Punjab.

IRSHAD HASAN KHAN, J.- This petition under Article 199 of the Constitution of Islamic Republic of Pakistan, 1973, calls in question the judgment dated 21.10.1985 passed by Special Military Court No.62, Multan, and confirmed by the President of Pakistan, thereafter, whereby Muhammad Ilyas Munir Murabbi and Naeem-ud-Din, petitioners No.1 and 2, were sentenced to death on two counts, while Abdul Qadir, Muhammad Nasir, Muhammad Haziq Rafique Tahir and Muhammad Din, petitioners Nos.3, 4, 5 and 6 were sentenced to seven years' imprisonment each. Muhammad Ishaq, however, was acquitted of the charges.

2. The facts in brief are that case FIR No.226 dated 26.10.1984 under sections 302/109 and 148 PPC was

registered against the petitioners and five others at Police Station A-Division, Sahiwal. Four of them were declared absconder. It was alleged that Muhammad Ilyas Munir Murabbi, accused, fired from his gun hitting Qari Bashir Ahmad on his left arm and chest. While Qari Bashir Ahmad staggered Azhar Rafique advanced to help him whereupon Lutfur Rehman and Ishaq fired from their respective weapons. One of the shots fired by each of them did hit Azhar Rafique on the left of his forehead and the left side of his face. Both the injured fell down and in the meantime accused Hafeezuddin and Shahid Naseer Bajwa also come their exhorting the co-accused to remove the two injured from the place of incident. The injured breathed their last thereafter. Accused Shahid Naseer Bajwa and Hafeezuddin were separately tried and were found not guilty. They were acquitted of the charges. Two others, namely, Professor Tufail and Lutufur Rehman are still at large. Muhammad Din, petitioner, has died during the pendency of this petition.

3. In support of the prosecution case, the Special Military Court examined 16-witnesses in all, including three court witnesses. On conclusion of the trial,

Muhammad Ilyas Munir Murabbi and Naeem-ud-Din, petitioners No.1 and 2, were sentenced to death on each count, while Abdul Qadir, Muhammad Nasir, Muhammad Hasiq Rafique Tahir and Muhammad Din, petitioners No.3, 4, 5 and 6, were sentenced to seven years' imprisonment each. However, Ishaq was acquitted of the charges.

4. The findings and sentence recorded by the Special Military Court were not confirmed by the Martial Law Administrator Zone "A", who by order dated 8.10.1985, directed it to revise its findings and sentence in the light of the observation made by him which were to the effect that Naeem-ud-Din's case did not fall under section 302 as he acted in self-defence though he might have exceeded the right of self-defence, so he was liable to be convicted under section 304-PPC. The conviction of the petitioners under section 148 PPC was held to be not sustainable. It was directed that they be convicted under section 109 PPC by awarding appropriate sentence.

5. Pursuant to the aforesaid direction of the Martial Law Administrator, Zone-A, the Special Military Court re-assembled on 21.10.1985 and revised its earlier findings. However, Muhammad Ilyas Munir Murabbi and

Naeem-ud-Din were again sentenced to death and fine of Rs.10,000/- each on each count under section 302 PPC. Abdul Qadir, Muhammad Nasir, Muhammad Haniq Rafique Tahir and Muhammad Din were sentenced to life imprisonment and fine of Rs.5,000/- on each count under section 302 PPC. These convictions were recorded by the Special Military Court in violation of the express direction/order passed by the Martial Law Administrator Zone-A, Punjab, on 8.10.1985. However, the accused were not found guilty of charge No.3 under section 148 PPC. Muhammad Ishaq accused was again acquitted of the charges.

6. The findings of Special Military Court as above, were confirmed by the President of Pakistan in February, 1986, without adverting to the order of Martial Law Administrator Zone-A dated 8.10.1985. The President, however, substituted the charges in respect of petitioners No.3 to 6 from section 149 to 109 PPC and confirmed the sentence accordingly. As regards the other two accused, their sentences were confirmed.

7. It is admitted position that as a result of general amnesty granted to persons similarly placed as petitioners No.1 and 2 by the President of Pakistan vide

letter dated 7.12.1988 their death sentences were commuted to imprisonment for life and, as already stated in the above, they have also undergone 9½-years of imprisonment so far.

8. Mr.Abid Hassan Minto, learned counsel for the petitioners challenged the conviction and sentence of the petitioners on the following grounds:-

(i) The order passed by the President of Pakistan in confirmation is violative of the provisions of Martial Law Order No.107 read with section 129 of the Pakistan Army Act, 1952, inasmuch as the President had no power to deal with the cases of those who were awarded life imprisonment and that their cases could only be confirmed by the Governor.

(ii) The President has no power to substitute the findings from conviction under section 149 PPC to 109 PPC before the confirmation of the original sentence by the Martial Law Administrator Zone-A.

(iii) The President has not confirmed the findings of the court even with regard to petitioners No.5 to 6, therefore, the confirmation of the said sentence of the petitioners, was illegal.

(iv) The Military Court as well as the President of Pakistan did not take notice of the order dated 8.10.1985 passed by the Martial Law Administrator, Zone-A.

(v) Neither the Military Court nor the President in the matter of revised findings or in the matter of confirmation had applied their minds to the facts of this case.

9. Mr.Faqir Muhammad Khokhar, the learned Deputy

by the exception laid down in Federation of Pakistan and another v. Malik Ghulam Mustafa Khar (PLD 1989 SC 26), in that the impugned convictions and sentences were not coram non judice. As to the procedural irregularities pointed out by the learned counsel for the petitioners, it was argued that they pertain to the domain of factual enquiry which need not be gone into by this Court in the exercise of its Constitutional jurisdiction. According to Mr.Faqir Muhammad Khokhar, the case is covered by the provision of Article 270-A of the Constitution. He submitted that order by the President does not suffer from any legal infirmity.

10. Mian Abdus Sattar Najam, learned Advocate General, supported the case of the petitioners insofar as the plea regarding the failure ~~on the part~~ of the President to consider the decision of Martial Law Administrator Zone-A, Punjab, is concerned.

11. We have perused the material available on record with the assistance of the learned counsel for the parties. It is not necessary to examine all the points raised by the learned counsel for the petitioners. Mr.Abid Hasan Minto eventually confined his submissions

to the effect that the order passed by the President confirming the sentences awarded by the Special Military Court after it re-assembled on 21.10.1985 is wholly without jurisdiction for the reason that a specific finding recorded by the Martial Law Administrator Zone-A, Punjab that the petitioners were not guilty of any offence under section 302 PPC and their case fell under section 304 PPC Part-II still hold the field but the Special Military Court, in complete disregard of the same, re-convicted the petitioners under section 302 PPC which in turn was also confirmed by the President of Pakistan, in that, had the petitioners been convicted under section 304 PPC Part-II in terms of the order of Martial Law Administrator Zone-A, they would serve out the maximum sentence of 10-years by October, 1994 and they have undergone more than 9½-years sentence. Having regard to the facts and circumstances of the case, we are inclined to agree with the learned counsel for the petitioners and the learned Advocate General that failure on the part of the Special Military Court and the President of Pakistan to consider the findings dated 8.10.1985 recorded by the Martial Law Administrator Zone-A Punjab, has resulted in grave miscarriage of justice.

12. We also find that the case of Ghulam Mustafa Khar (supra) loses its significance altogether when viewed in the context of failure on the part of the re-assembled Military Court and the Confirming Authority to take into account the findings recorded by the Martial Law Administrator Zone-A in his order dated 8.10.1985. It is well settled that cases of no evidence, bad faith, misdirection or failure to follow judicial procedure etc. are treated as acts without jurisdiction. Here the impugned judgment rendered by the re-assembled Special Military Court, No.62, Multan, and the confirmation of the same by the President manifestly falls in this category. We are in no manner of doubt that the impugned orders cannot but be held to be coram non judice.

13. After holding as above, we would have remitted the cause to the ordinary courts for compliance of the order of Martial Law Administrator Zone-A, Punjab, dated 8.10.1985. However, we find that such a course would not be in aid of justice. The maximum sentence under section 304-Part-II PPC is 10- years and Naeem-ud-Din accused has spent 09-years in jail, therefore, the sentence already undergone by him meets the ends of justice. An

regards rest of the petitioners, including deceased, suffice it to say that they were held guilty by the Martial Law Administrator Zone-A, Punjab, under section 304 PPC and not under section 302 PPC and even in their case the sentence already undergone meets the ends of justice.

In view of the above discussion, this petition succeeds to the extent indicated above. The result is that the petitioners shall be released forthwith, if not required in any other case. There shall be no order as to costs.

Sd/- (IRSHAD HASAN KHAN)
JUDGE

Sd/- (MUHAMMAD ARIF)
JUDGE

Announced in open Court.

Sd/- (MUHAMMAD ARIF)
JUDGE
19/3

Sd/- (IRSHAD HASAN KHAN)
JUDGE
19.3.1994.

TRUE COPY
20.3.94
EX.JCB.SECTION COPY BRANCH

☆ آٹھواں باب

# تم سے مجھے اِک رشتہ جاں سب سے سوا ہے

☆ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کی غیر معمولی محبتوں اور شفقتوں کا تذکرہ

☆ ابا جان مرحوم کی طویل جان توڑ محنت و مشقت کی تفصیل

☆ عزیزوں اور رشتہ داروں کا پیار بھرا سلوک

☆ دوستوں اور احباب جماعت کا ولولہ انگیز تعلق

میں دیکھتا ہوں کہ جس قدر یہ سلسلہ بڑھتا جاتا ہے اس قدر میرے تعلقات بڑھتے جاتے ہیں
اور متعلقین کا غم اور فکر بڑھ رہا ہے اور ہر روز کسی نہ کسی عزیز یا دوست کی تکلیف کی
کوئی نہ کوئی خبر آ جاتی ہے تو میں اس سے سخت کرب اور بے آرامی میں رہتا ہوں
اور بعض وقت تو یہانتک حالت ہوتی ہے کہ نیند بھی نہیں آتی۔

(ملفوظات حضرت مسیح موعود علیہ السلام جلد ۲ صفحہ ۲۸۸ جدید ایڈیشن)

## تم سے مجھے اِک رشتہ جاں سب سے سوا ہے

اگر سچ پوچھیں تو کسی بھی قیدی کے اس تلخ اور کٹھن سفر کا زادِراہ اس کے اعزہ و اقرباء اور دوست احباب کا مسلسل رابطہ اور سہارا ہوتا ہے۔ جس قیدی کو یہ زادِراہ میسر رہے اسے بہت حد تک سکون کے ساتھ یہ مشکل وقت گزارنے کی توفیق مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیں یہ نعمت روزِ اول سے نصیب رہی جس کا اعتراف ہمیں بھی تھا اور جس کا اظہار ہر دوسرے قیدی کی زبان پر بھی تھا۔ اس باب میں اسی حوالہ سے بعض ایمان افروز واقعات پیش کئے جائیں گے۔

### ہمارا زادِراہ: پیارے آقا کی محبتیں اور شفقتیں

اِس کٹھن سفر کے آغاز سے ہی پیارے آقا نے مختلف رنگوں میں اپنی شفقتوں اور اِحسانات کے ذریعہ ہماری ہمت بندھائی، ہمارے حوصلوں کے دِل بڑھائے۔ کبھی قسم قسم کی نوازشات سے ہمارے دامن چھلکاتے تو کبھی اپنے خصوصی نمائندے بھجوا کر ہماری حوصلہ افزائی فرماتے۔ جب کوئی دوست ہمیں مل کر لندن جاتے تو حضور سب کچھ چھوڑ کر ان سے ہمارے حالات سننے لگتے اور حسبِ ضرورت ہدایات سے نوازتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر حضورؒ نے کیسا خوبصورت انداز اختیار کیا، ایک دوست جو مجھے ملنے آئے اور بتانے لگے کہ واپسی براستہ لندن ہے تو میں نے ان سے کہا کہ جب حضور سے ملو تو میری طرف سے بھی معانقہ کرنا۔ چنانچہ جب انہوں نے حضور کی خدمت میں میری درخواست پہنچائی تو پہلے تو حضورؒ فوراً معانقہ کے لئے اُٹھ پڑے مگر اُسی لمحہ رک کر فرمانے لگے کہ الیاس منیر کے حصہ کا معانقہ تم سے کیوں کروں۔ یہ سب خدا تعالیٰ کا فضل ہے، الحمدللہ۔ مگر ہماری خوش قسمتی کی حد ایک اَور لازوال نوعیت کی نوازش تک بھی پھیلی ہوئی ہے جو اِن سب سے بڑھ کر ہے اور وہ یہ کہ پیارے آقا اپنے قلم اور دستِ مبارک سے ہم ادنیٰ خدام کو مخاطب کر کے آبِ حیات مہیا فرماتے اور اپنے جذبات، بیش بہا موتیوں جیسے الفاظ میں ڈھال کر ارسال فرماتے یعنی ناقابلِ بیان گہرے درد میں ڈوب کر خطوط تحریر فرماتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ہر لمحہ اس قدر بے چین اور بے قرار رہتے کہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا کہ ہماری جگہ گویا آپ پابندِ سلاسل ہیں اور یہ کہ آپ نے ہمارے غم کو اپنے آپ پر پوری طرح طاری کر لیا ہوُا ہے، اس کا اظہار خود حضور انور نے بھی 'پردیس میں اک روح گرفتار بلا ہے' کہہ کر فرمایا۔ ہم حضور کے خطوط سے اُن جذبات کا تصور کرتے ہیں جن کا اظہار آپ ہمارے لئے فرماتے تو سچ مچ پریشان ہو جاتے ہیں کہ ہم گنہگاروں کے ساتھ حضور کی یہ شفقت، ہم ایسے پُرتقصیر غلاموں کے ساتھ حضور کا یہ سلوک؟ واللہ! ہم تو اس کے

عشرِ عشیر کے بھی لائق نہیں۔ ہمارے آقا کے خطوط ہمارے لئے ایک عظیم سرمایہ ہیں اور ہم اس سرمایہ کے ملنے پر خدا تعالیٰ کا جتنا بھی شکر کریں کم ہے۔ یہ خطوط محض شفقت و پیار کا مرقع ہی نہیں، اُردو ادب میں بھی ایک بیش بہا اضافہ ہیں اور تصوف کے گہرے نکات بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور روحانی و جسمانی ہر دو لحاظ سے بے پناہ توانائی کا منبع بھی کیونکہ جب حضور کے خطوط ہمیں ملتے تو قلب و روح اور دل و دماغ کے علاوہ جسم میں بھی بے پناہ قوت اور توانائی کا احساس ہوتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حضور رحمہ اللہ کے یہ خطوط ہمارے دلوں کو گرما دیتے، ہمیں نئی امنگ، نیا ولولہ اور نیا حوصلہ عطا کرتے۔ ہمیں ایمان کی دولت سے مالا مال کرتے، ہمیں ثبات قدم کے لئے بھی تیار کرتے اور سب سے بڑھ کر پیارے آقا کی محبت عطا کرتے۔ چنانچہ خط پڑھ کر ہمارے قلب و روح سے حضور سے محبت اور والہانہ عقیدت کے نئے سے نئے سوتے پھوٹ کر بہنے لگتے۔ ہمارے رگ و ریشہ میں بجلی کی سی لہر دوڑنے لگتی۔ یہ محض لفاظی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور اس کا واضح ثبوت حضور کے وہ الفاظ ہیں جو ہر پڑھنے والے کے دل پر بھی ایسا ہی اثر کریں گے۔ حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس کیفیت کی ایک جھلک اپنے اور اپنے ساتھیوں کے نام آپؒ کے خطوط کے بعض اقتباسات کی صورت میں پیش کرتا ہوں جو آپ نے ہمارے پابندِ سلاسل ہونے اور سزا سنائے جانے کے بعد رقم فرمائے۔ حضور نے جیل میں پہلی عید الفطر سے قبل ہمیں مبارکباد کے خطوط ارسال فرمائے تو محترم ملک صاحب کے خط پر حضور نے اپنے قلم مبارک سے جو نوٹ تحریر فرمایا اُس کا ایک فقرہ یہ تھا:

”آپ کی قید مظلومیت میں منائی جانے والی عید کی یاد میری عید پر غم کا سایہ رکھے گی“

سادہ سے الفاظ میں اپنی چاہتوں کا اتنا گہرا مضمون ہے کہ اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ جب بھی حضور رحمہ اللہ کے یہ الطاف و عنایات دیکھتے اور حضور کے اپنے بارہ میں پیار محبت کے کلمات سنتے ہیں اور پیارے آقا کے خطوط پڑھتے ہیں تو ایک طرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ہم کوئی قربانی پیش کر رہے ہیں؟ حیرانگی کے ساتھ یہ سوالیہ کیفیت اس لئے پیدا ہوتی کہ ہم پہلے بھی بہت گناہ گار اور پُر غفلت و پُر تقصیر بندے تھے اور اب بھی اسی طرح کی کیفیت ہے۔ ایسے میں ہماری کیا اہمیت اور حیثیت! پھر خیال جاتا کہ ایسے میں خدا کے خلیفہ کے یہ الفاظ، آپ کے یہ تاثرات اور پیار بھرے جذبات ہم پر دُہری تہری ذمہ داری عائد کر دیتے ہیں۔ ہم گھبرا کر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتے مگر بساط بھر ذہنی کیفیت، نفسانی زنجیروں اور گناہوں کے خول میں بالکل بے بس ہوتے۔ اس حالت میں میرے دل سے یہ دعا نکلتی کہ اے رب کریم! ہمارا انجام بخیر کر دینا۔ ہم آخری لمحہ تک ایمان کے مضبوط کڑے کو تھامے رکھیں، اگرچہ ہم اس لائق تو

نہیں ہیں پھر بھی قبول کر لینا۔ بس ہمیں ردّ نہ کرنا، ہمیں ایمان کے حوالہ سے کوئی ابتلا نہ آوے، ہمیں کوئی ٹھوکر نہ لگے۔ ہمارے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہ آئے اور ایمان وایقان کا یہ سلسلہ ہماری نسلوں میں جاری ہو جائے، آمین ثم آمین۔ ہمارے ایک ساتھی مکرم چوہدری اسحق صاحب مرحوم کے نام آپ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

'میری فکر میں آپ کا رونا اور بے قراری میرے دل پر قیامت ڈھا گئے، مجھے تو بعض دفعہ لگتا ہے کہ میرا جسم آزاد مگر اسیرانِ راہِ مولا کے ساتھ قید میں رہتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ میں کہاں کہاں رہتا ہوں'[1] گویا آپ اپنے ہی اس شعر کی تصویر تھے ؎

ہیں کس کے بدن دیس میں پابند سلاسل    پردیس میں ایک روح گرفتار بلا ہے

آپ کی یہ کیفیت بہرحال بشریت کا تقاضا تھی۔ اس کی وضاحت بھی آپ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو، حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے خاکسار کے نام اپنے خط میں تحریر فرمایا:

'بارہا تمہیں اور تمہارے اسیر ساتھیوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا مگر وفورِ جذبات کے سامنے کچھ پیش نہیں گئی۔ اللہ کی تقدیر اسلام کے احیائے نو کی خاطر ہم سے جو قربانی لینا چاہتی ہے، ہم حاضر ہیں، وہی ہے جو ہمیں ہمت اور صبر اور ثبات قدم بھی عطا فرمائے گا۔ لیکن میرا دل، دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت۔ اپنے پیاروں کا دکھ میرے لئے ناقابل بیان اذیت کا موجب بنتا ہے۔'[2]

## پیارے آقا کی پرسوز دعائیں

ہماری اسیری سے متعلق سب سے بڑا واقعہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کا لمبے عرصہ تک اس رنگ میں دعائیں کرنا تھا کہ گویا ساری فضا میں ایک شورِ قیامت برپا تھا اور ان دعاؤں میں آپ کے ساتھ دنیا کے کونہ کونہ میں بسنے والا ہر احمدی خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت شامل ہو چکا تھا۔ آپ ان دعاؤں میں اپنا خونِ جگر بھر کر ایسی ایسی اداؤں کے ساتھ اپنے خالق و مالک کے حضور گریہ کناں رہے کہ ان کیفیات کا تصور بھی جسم پر کپکپی طاری کر دیتا ہے، آپ اس کا نہایت معمولی سا حال یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

'بعض اوقات اس درد کے ساتھ دل سے دعا نکلتی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ رحمت باری اسے ٹھکرا سکے گی'[3]

---

[1] مکتوب مؤرخہ 25.09.1985

[2] مکتوب مؤرخہ 03.12.1984

[3] مکتوب مؤرخہ 03.03.1985

آپ کی دعاؤں کا حال پڑھ کر یا سن کر یوں لگتا ہے کہ آپ ہمارے لئے دعائیں کرتے ہوئے کبھی صحراؤں، جنگلوں کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں تو کبھی دریاؤں کی تہ میں غوطہ زن ہیں اور کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں اور وادیوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں کہ کہیں سے توان کی رہائی کی خیرات مل ہی جائے! آپ نے ایک مرتبہ خاکسار کو تحریر فرمایا:

'میرے پیارے رب کی جو تقدیر بھی تمہارے حق میں جاری ہو وہ فضل ہی فضل اور رحمت ہی رحمت ہے۔ مگر میرا بھکاری دل اس سے دونوں جہان کی حسنات مانگ رہا ہے۔ یہ عارضی زندگی بھی مانگ رہا ہے اور وہ لافانی زندگی بھی۔ اپنے مولا کی شان کے نثار اس کے قدموں میں ایسے ایسے گنہگار اور پاگل دل بھی پڑے ہیں اور وہ انہیں ٹھکرا نہیں رہا۔'[1]

برادرم عزیزم محمد نثار صاحب کے نام حضور رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی اس کیفیت کو یوں بیان فرماتے ہیں:

'بعض دفعہ دل سے ایسے درد کے ساتھ دعا نکلتی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ رحمت باری اسے ٹھکرا سکے گی لیکن وہ حکمتِ کُل ہے اور ہم نادان جاہل بندے۔ وہ ہماری فلاح اور بہبود کو ہم سے بہتر سمجھتا ہے۔ اگر اسلام کے اِحیائے نَو کے لئے وہ ہم ناکارہ بندوں کو قربانی کی سعادت بخشنا چاہتا ہے تو ہم بسر و چشم حاضر ہیں لیکن بڑے خوش نصیب وہ جنہیں اس کی نظرِ عنایت پھولوں کی طرح چُن لے لیکن اُن بے کسوں کا کیا حال ہوگا جن کے دل کے نصیبے میں اپنی محرومی کا احساس اور اپنے پیاروں کی یادوں کے کانٹے رہ جائیں۔

جب یہ باتیں سوچتا ہوں تو دل سے بڑی بے قرار آواز اُٹھتی ہے کہ اے حکمتِ بالغہ اور عقلِ کُل کے مالک تو قدرتِ کاملہ کا بھی تو مالک ہے۔ ہم پر رحم فرما اور ہمیں دُکھ کی ہر آزمائش سے نجات بخش اور دُنیا اور آخرت کی حسنات سے نواز اور اپنے پیاروں کے دُکھ میں مبتلا نہ فرما۔ اے ارحم الراحمین! رحم فرما۔ اے ارحم الراحمین! رحم فرما۔ اے ارحم الراحمین! رحم فرما۔'[2]

خاکسار کے نام خطوط میں حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون یوں بیان فرمایا:

'اپنے دل کی کیفیت مزید کچھ نہیں لکھتا کہ تم بے چین نہ ہو جاؤ۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ کروڑوں احمدیوں کے دِلوں کا چین تم چند مظلوم احمدیوں کے دِلوں سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔'[3]

---

[1] مکتوب مؤرخہ 1986.05.31

[2] مکتوب مؤرخہ 03.03.1985

[3] مکتوب مؤرخہ 1986.05.01

پھر فرماتے ہیں:

'دنیا والوں کی تو زندگی بھی موت اور موت بھی موت ہوتی ہے مگر میرے خوش نصیب اسد اللہ الغالب تمہاری تو زندگی بھی زندگی اور موت بھی زندگی ہے۔ تم خاک بسر تھے میرے مولا کی رضا نے تمہیں عرش نشین بنا دیا۔ مسیح کی غلامی میں تم بھی زمین کے کناروں تک شہرت پا گئے۔ آج ایک کروڑ احمدیوں کے دھڑکتے ہوئے دل تمہیں دعائیں دے رہے ہیں اور دو کروڑ نمناک آنکھیں تم پر محبت اور رشک کے موتی نچھاور کر رہی ہیں۔ میرا دل بھی اُن دلوں میں شامل ہے، میری آنکھیں بھی اُن آنکھوں میں گھل مل گئی ہیں۔'[1]

میرے جیسے معتبر اس کی گواہی سے ہوئے    جیسا وہ تھا ناتواں پرور، زمانے میں نہیں

اس طرح حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہر خط میں ہمیں ہر حال میں اپنے خالق و مالک ربّ کے ساتھ وفا کرنے کی تلقین ہوتی۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ساری اسیری کے دوران کبھی کسی انسان کے سامنے سر جھکانے کا خیال تک نہ آیا۔ بڑے بڑے افسر ہمیں آ آ کر ڈراتے رہے کہ تم رحم کی اپیل صدرِ پاکستان کے سامنے کرو گے تو بچ جاؤ گے مگر حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے اِن ولولہ انگیز الفاظ کے سامنے جو آپ نے خاکسار کے ابا جان محترم محمد اسمٰعیل منیر صاحب (مرحوم) کے نام ایک خط محررہ 19.02.1986 میں رقم فرمائے، ان باتوں کی کیا وقعت ہو سکتی تھی:

'بہت دعا کریں کہ میرا اور خدا کی اس پیاری جماعت کا سر ہر ابتلاء میں بلند رہے اور کبھی غیر اللہ کے سامنے نہ جھکے۔ خدا حافظ!'

اسی طرح ایک خطبہ جمعہ میں حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا:

احمدیوں کا سر اِن ظالمانہ سزاؤں کے نتیجے میں جھکے گا نہیں بلکہ اَور بلند ہوگا، اَور بلند ہوگا یہاں تک کہ خدا کی غیرت یہ فیصلہ کرے گی کہ دنیا میں سب سے زیادہ سر بلندی احمدی کے سر کو نصیب ہوگی کیونکہ یہی وہ سر ہے جو خدا کے حضور سب سے زیادہ عاجزانہ طور پر جھکنے والا سر ہے۔[2]

نیز حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے ابا جان کے نام اسی مذکورہ بالا خط میں جان کا نذرانہ پیش کرنے کا انداز بھی سکھا دیا:

میرے پیارے عزیزم محمد الیاس منیر اور نعیم الدین تک میرے دل کا حال پہنچا دیں اور بتا دیں کہ یہ چار دن کی زندگی تو بہت سخت ناقابل اعتبار ہے اور یہ بھی پتہ نہیں کہ کیسے انجام کو پہنچتی ہے۔ ہم ہرگز نہیں چاہتے

---

[1] مکتوب مؤرخہ 31.05.1986

[2] خطبات طاہر جلد 5 صفحہ 162

کہ وہ ہم سے اتنی جلد جدا ہوں مگر مرضیِ مولا اگر یہی ہے تو اے خوش نصیبو! جو رضائے باری تعالیٰ کی لافانی زندگی پانے والے ہو اور آسمانِ احمدیت کے درخشندہ ستارے بن کر چمکنے والے ہو اور جو تاریخ احمدیت میں ہمیشہ محبت اور عظمت اور پیار اور احترام کے ساتھ یاد کئے جاؤ گے، دمِ واپسیں احمدیت یعنی حقیقی اسلام کی فتح اور غلبہ کی دعا کرنا اور اس عاجز ناکارہ انسان کی بخشش کی بھی دعا کرنا۔ تم تو ہر امتحان میں کامیاب و کامران ٹھہرے اور ہر ابتلاء سے سرخرو ہو کر نکلے، کاش میری بھی یہ فریاد قبول ہو کہ رَبَّنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الاَبْرَارِ۔[1]

## پیارے آقا کی نوازشات

دعاؤں کے ساتھ ساتھ حضور رحمہ اللہ پاکستان آنے والے احباب کے ہاتھ کوئی نہ کوئی تحفہ بھجواتے رہتے۔ علاوہ ازیں پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کے ذریعہ بھی حضور کی طرف سے محبت بھرے تحائف کا سلسلہ جاری رہتا۔ جب ہم مقدمہ کی سماعت کے بعد ملتان سے ساہیوال واپس آئے تو میری سب سے پہلی ملاقات مؤرخہ 13 جون 1985ء کو ہوئی۔ اُس روز مقامی احباب کے علاوہ ربوہ سے صرف ابا جان اور گوجرانوالہ سے ماموں عبدالمجید صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ اُس موقع پر میرے لئے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہوئی کہ حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کا لندن سے ارسال فرمودہ شربت RIBENA ملا۔ میں نے اُس روز سے افطاری اسی شربت سے کرنی شروع کی اور دُہرا لطف اُٹھایا یعنی شربت کا مزہ اور اُس میں گھلی ہوئی پیارے آقا کی شفقتوں کا حظ بھی۔ کہاں ہم ناچیز اور گنہگار بندے اور کہاں پیارے آقا کے پیار کرنے کے یہ نرالے انداز، فالحمدللہ رب العالمین۔

حضورؒ بے شک ایتائے ذی القربیٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ان نوازشات پر شکریہ بھی ادا نہ کرنے دیتے، یہ ابتدائے اسیری کی بات ہے کہ ایک مرتبہ حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نہایت قیمتی، خوبصورت اور مزیدار ٹافیوں کا تحفہ بھجوایا جس پر خاکسار نے شکریہ کے چند الفاظ لکھے تو حضور کی طرف سے نہایت پیار بھرا عارفانہ جواب ملا کہ:

دکبھی کسی نے ''موت'' کی سزا پانے والوں کو بھی ''ٹافیوں'' کا تحفہ بھجوایا ہے؟ یہ تو دیوانہ پن ہے مگر وہ جو ''زندگی کی بقعہ نور کوٹھری'' میں مقید ابدی زندگی کے سزاوار ٹھہرائے گئے ہیں، میں انہیں کیوں خوبصورت

---

[1] مکتوب مؤرخہ 19.02.1986

ٹافیوں کا تحفہ بھیج کر اس عزم اور یقین کا اظہار نہ کروں کہ تم موت کے لئے نہیں، ہمیشہ کی زندگی کے لئے چنے گئے ہو۔'[1]

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر واجب ہوتا ہے جس نے ہمیں اس تفرقہ اور گمراہی و بے راہ روی کے تاریک و تار زمانہ میں خلافت ایسی نعمت عظمیٰ سے نوازا ہوا ہے اور اس نظام کی برکت سے ہمیں ماں باپ سے بڑھ کر پیار اور شفقت کرنے والا وجود میسر ہے، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ خدا کرے ہم اور ہماری نسلیں خلافت سے ہمیشہ وابستہ رہیں اور اس کے گھنے، ٹھنڈے اور فرحت بخش سایہ تلے ہی زندگی کا سفر طے ہوتا چلا جائے جہاں ہمیں کوئی خوف ہے اور نہ ہی کوئی خطرہ۔ فی الحقیقت یہی اِس زمانہ میں عافیت کا سب سے مضبوط حصار ہے جہاں معاشرہ کی تلخیوں اور مروجہ فضولیات سے ہم کلی طور پر بچے ہوئے ہیں ؎

'بس یہی اِک قصر ہے جو عافیت کا ہے حصار'

## ''زندگی کی بقعہ نور کوٹھری''

سزائے موت سنائے جانے کے بعد ہم نے حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں دعائیہ خط لکھا تو ابتداء میں ایڈریس کے طور پر 'پھانسی کوٹھڑی' لکھ دیا۔ اس پر حضور کا اپنے دست مبارک سے لکھا ہوا جو جواب آیا وہ کچھ یوں تھا:

میرے پیارے عزیزم نعیم الدین، اسیر راہ مولا۔ مجاہد احمدیت    السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

'تم تو'' کال کوٹھری'' کے نہیں حجرۂ نور کے مکین ہو۔ یہ تم نے کیا لکھ دیا۔ رضائے باری تعالیٰ کے قیدی تو جس زنداں میں بھی رہیں اُسے بُقعۂ نور بنا دیتے ہیں۔ ایک اور بات بھی تم نے اپنے خط میں غلط لکھ دی، تم تو لافانی زندگی کے سزاوار ٹھہرائے گئے ہو، کون ہے جو تمہیں 'سزائے موت' دے سکے۔ وہ تو خود مردہ ہیں۔ کبھی مُردوں نے بھی زندوں کی شہ رگ پر پنجہ ڈالا ہے۔ اگر شہادت تمہارے مقدر میں لکھ دی گئی ہے تو کسی ماں نے وہ بچہ نہیں جنا جو تمہیں مار سکے۔ شہادت کی دائمی زندگی موت کی منزل سے ہو کر نہیں گذرتی'[2]

اس کے بعد حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے خاکسار کے نام ایک خط میں ہماری ان بظاہر تاریک کوٹھریوں کو'' زندگی کی بقعۂ نور کوٹھری'' کا نام عطا فرمایا، چنانچہ اس کے بعد ہم نے ہمیشہ اپنے خطوط میں اپنا یہی پتہ درج کیا۔

---

[1] مکتوب مؤرخہ 31.05.1986

[2] مکتوب مؤرخہ 1986.03.31

## حوصلہ افزائی کا بے مثال انداز

آنیوالی ہر ممکنہ صورت حال کے لئے ہمیں تیار کرنے کے ساتھ ساتھ پیارے آقا ہمارے حوصلوں کے دل بھی ایمان و یقین سے پُر ہو کر بڑھاتے رہے۔ یہ بھی ایک لمبی تفصیل ہے تاہم اس کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔ آپ نے ہماری ہی طرح سزائے موت کا حکم سنائے جانے والے سکھر کے ایک مجاہد محترم پروفیسر ناصر احمد قریشی صاحب مرحوم کے نام ایک خط میں لکھا:

میرے پیارے بھائیو! آپ مجھے بے حد عزیز ہیں اور آپ کا غم ہر لحہ میرے دل میں جاں گزیں ہے اگرچہ جانتا ہوں کہ اگر خدا کی تقدیر آپ کو ایک عظیم شہادت کا مرتبہ عطا کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے تو یہ ایک سعادت ہے جو قیامت تک آپ کا نام دین و دنیا میں روشن رکھے گی اور آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور کوئی نہیں جو آپ کو مار سکے، قیامت تک آنیوالی نسلیں آپ کے ذکر پر روتے ہوئے اور تڑپتے ہوئے آپ کے لئے دعائیں کیا کریں گی اور حسرت کیا کریں گی کہ کاش آپ کی جگہ وہ ہوتے۔

میرے اپنے دل کا یہ حال ہے کہ آپ کے گذشتہ خط کو پڑھ کر جس میں اپنی اور اپنے بچوں کی دل گداز حالت کا دردناک بیان تھا، میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو یہ معلوم کر کے میرا دل حمد اور شکر سے بھر گیا کہ اگر آپ کو بچانے کے لئے مجھے تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا تو میں بخوشی اپنے آپ کو اس کے لئے تیار پاتا'[1]

یہی بات حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے خاکسار کی اہلیہ کے نام خط میں ایک اور انوکھے انداز میں یوں بیان فرمائی:

میں جانتا ہوں کہ شہادت اور پھر ایسی عظیم شہادت ایک قابلِ صد رشک سعادت ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ظاہری جان لئے بغیر بھی لازوال زندگی عطا کر سکتا ہے۔ وہ مالک اور قادر اور قدیر اور مقتدر ہے۔ اسمٰعیلی قربانی اپنی آن بان اور شان میں اس بناء پر کم تو نہیں ہوگئی کہ قد صَدَّقْتَ الرُّؤيا کی پر شوکت آواز نے اسمٰعیل کی گردن پر چلنے والی چُھری کی حرکت سلب کر لی۔ پس میرا بھکاری دل اگر مالک کون و مکان سے اپنے پیارے الیاس اور نعیم اور ناصر اور رفیع کے لئے اس دنیا کی بھیک بھی مانگتا ہے اور آخرت کی بھی تو تعلیم قرآن کے منافی تو نہیں۔ ہم تو گداگر ہیں، راہ مولا کے گداگر۔ جب تک ہمارا آقا آخری تقدیر ظاہر نہیں فرماتا ہم رَبِّ اِنِّی لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ کی صدا بلند کرتے رہیں گے اور

---

[1] مکتوب 1986.03.11

جب وہ تقدیر خیر کو ظاہر فرما دے گا تو وہ جس بھیس بھی آئے ہم حمد و شکر کے ترانے گاتے ہوئے اس کا خیر مقدم کریں گے۔ مؤمن کا تو کوئی سودا بھی نقصان اور خوف اور حزن کا سودا نہیں۔ ہمیں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کی معرفت کا جام لبالب پلایا گیا ہے۔[1]

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو، ڈر کیسا گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

میرے اسیر ساتھی برادرم حاذق رفیق صاحب کے نام اپنے ایک خط میں حضور ہمیں یوں حوصلہ دلاتے ہیں:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ سب بلا قصور پکڑے گئے لیکن اس سے قبل اللہ تعالیٰ کے بزرگ تر بندوں پر بھی تو اس سے بڑھ کر ناحق مظالم توڑے جاتے رہے ہیں۔ اور سید المعصومین حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ سے بڑھ کر تو کوئی معصوم نہیں ہو سکتا۔ لیکن سب سے بڑھ کر دکھ آپ کو ہی دیئے گئے۔ پس جہاں ایک طرف آپ سخت مظلوم ہیں اور دردناک مصائب کا شکار ہیں وہاں خوش نصیب بھی تو اتنے ہیں کہ لاکھوں آزادیاں آپ کی اس قید پر نثار، آپ تو ان خوش نصیبوں میں جا ملے جن پر ہمیشہ خدا تعالیٰ انعام فرماتا رہا۔[2]

## خطوط دیکھ کر عالمِ وارفتگی

اسیران راہ مولا کے خطوط حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت اقدس میں پہنچنے کا لمحہ بھی بڑا دردانگیز لمحہ ہوتا۔ بعض اوقات حضور نے اُس لمحہ طاری ہو جانے والی کیفیات کا کچھ کچھ اظہار بھی فرمایا ہے۔ ہمارے ساتھی اسیر ساہیوال برادرم نثار احمد صاحب کا خط ملا تو حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کیفیت یوں بیان فرمائی:

'آپ کا جیل سے لکھا ہوا محبت بھرا پر خلوص خط اس وقت میرے سامنے ہے اور وفور جذبات سے آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔ یوں تو ہر دم آپ بھائیوں کا خیال دل میں پھانس کی طرح اٹکا رہتا ہے مگر جب کسی کے خط میں آپ کا ذکر آئے یا کسی اسیر راہ مولا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملے تو دل میں ایک طلاطم بپا ہو جاتا ہے۔[3]'

خاکسار کے نام حضور رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دل کا حال ان الفاظ میں بیان فرمایا:

---

1 مکتوب مؤرخہ 1988.03.31

2 مکتوب مؤرخہ 1984.12.24

3 مکتوب مؤرخہ 1985.03.03

راہِ مولا کے اسیروں کے خطوط میرے دل پر اتنا گہرا اثر کرتے ہیں کہ جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرا دل آپ سب کے لئے بہت زخمی ہے اور جان کو فکر لگا رہتا ہے۔ آپ کے مجبور، غمزدہ، ترساں عزیزوں کے خیال سے اور بھی زیادہ غمناک ہو جاتا ہوں اور آپ سب کے لئے اور آپ کے سب عزیزوں کے لئے دل کی گہرائیوں سے دعائیں نکلتی ہیں۔

اللہ مجھے آپ کی طرف سے کوئی مزید صدمہ نہ دکھائے اور پہلے غموں کو بھی اس طرح زائل فرمادے گویا وہ کبھی نہ تھے۔ اللہ ہر آن آپ پر اپنے فضلوں اور رحمتوں کی بارشیں برساتا رہے اور آپ کے کانوں میں ''نہ ڈر۔ قریب ہوں مَیں'' کی پیار بھری سرگوشیوں کے رَس گھولتا رہے۔[1]

دوسری طرف جب ہمیں حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے خطوط ملتے تو ہماری کیفیت بھی اس سے مختلف نہ ہوتی، گویا 'دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی' کا معاملہ تھا۔ قلب و روح اور دل و دماغ کے علاوہ جسم میں بھی بے پناہ قوت اور توانائی کا اِحساس ہوتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 3 جنوری 1985ء کو مجھے حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کا اپنے دست مبارک سے لکھا ہؤا سب سے پہلا خط موصول ہؤا۔ حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ نامہ مبارک پڑھ کر طبیعت میں ناقابل بیان اضطراب پیدا ہو گیا اور اس خط کی سطروں میں، اس کے الفاظ اور حروف میں پیارے آقا کی درد بھری تصویریں نظر آئیں اور آپ کے جذبات کی موجزن لہریں دکھائی دینے لگیں۔ آپ کے تڑپنے اور آپ کے سینہ کے ہنڈیا کی طرح اُبلنے کی آوازوں نے بے چین کر کے رکھ دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان تصورات کی وجہ سے اُس رات نیند قریب آنے کا نام نہ لیتی تھی اور باوجود جنوری کے جاڑے کے گرمی محسوس ہوتی رہی، میرے تو کبھی تصور میں نہ آیا تھا کہ میں اس لائق ٹھہروں گا کہ خلیفہ وقت اپنے قیمتی ترین لمحات میں سے وقت نکال کر خاص طور پر مجھے اس قسم کے خطوط سے نوازیں گے، ڈھیروں ڈھیر نہایت درجہ پر درد اور پرسوز دعاؤں سے نوازیں گے۔ حضور اقدسؒ کے الفاظ ملاحظہ ہوں جو حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکرم تنویر احمد صاحب قریشی ابن مکرم ناصر احمد صاحب قریشی کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں سے لئے گئے ہیں:

میرے پیارو! میرے دل کی کیفیت ناقابل بیان ہے۔ مجھ میں طاقت نہیں کہ تم میں سے ہر ایک کو الگ الگ خط لکھوں اور وہ سب کچھ بیان کروں جو میرے دل پر گذر رہی ہے، جیسے تپتے ہوئے لوہے پر گراہؤا پانی کا ایک قطرہ ایک عجیب آواز پیدا کرتا اور بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے، آپ کی اور دوسرے راہ مولیٰ میں

---

[1] مکتوب مؤرخہ 06.01.1984

دُکھ اُٹھانے والوں کی ہر یاد میرے دل سے غبار بن بن کر اُٹھتی ہے۔'[1]

جلسہ سالانہ کا موقع ہو یا عید کا یا کوئی اور اہم موقع، حضور رحمہ اللہ تعالیٰ اسیران راہ مولیٰ کا ذکر ضرور فرمایا کرتے تھے اور ایسے پیار سے ذکر فرماتے کہ آپ کے الفاظ سن کر حاضرین تڑپ اُٹھتے۔ مثلاً حضرت اقدس نے خطبہ جمعہ فرمودہ 19 جون 1987ء میں اسیران راہ مولیٰ کے حالات بتاتے ہوئے تحریک فرمائی تھی کہ:

'اِن کو دعاؤں میں یاد رکھنا ہمارا فرض ہے، ان کے ذکر کو زندہ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ اپنی محافل میں بھی، اپنے دیگر مشاغل میں بھی، ذکر کے ذریعے بھی ان کو زندہ رکھیں اور دعاؤں کے ذریعے بھی ان کی مدد کرتے رہیں کیونکہ وہ ہم سب کا فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں، ہم سب کا بوجھ اُٹھانے والے لوگ ہیں۔ اللہ ان کی نصرت فرمائے اور ان کی مشکلات کو جلد تر آسان فرمادے، آمین۔'[2]

حضور رحمہ اللہ تعالیٰ ہماری دِلداری یوں بھی فرماتے کہ دُنیا بھر میں جماعت کو ملنے والی ترقیات، فتوحات اور کامیابیوں کو اسیران کی قربانیوں کی طرف منسوب فرما دیتے۔ اِس امر کا اظہار آپ نے اپنے متعدد خطبات، خطابات اور خطوط میں فرمایا ہے۔ خاکسار کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

'آپ اور عزیزم نعیم الدین کے خطوط موصول ہوئے۔ یہاں پر جو فضلوں کی بارشیں ہو رہی ہیں۔ ان میں آپ کی قربانیوں کا بڑا دخل ہے۔ یہ بالواسطہ پھل ہے۔ آپ لوگوں کی جو عمر عزیز ہے، ہرگز اس کا لحہ بھی ضائع نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ جو اجر عطا فرمائے گا وہ لامتناہی ہوں گے اس کے مقابل پر یہ تکلیف کچھ بھی نہیں ہوگی۔'[3]

بے مثال حوصلہ افزائی کے اِس ماحول میں ہمارا وقت ایسے شاندار طور پر گزرتا چلا گیا کہ لوگ ہمیں دیکھ کر پریشان ہو جاتے کہ انہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے! کئی مواقع پر مجھے بعض قیدیوں نے بڑی تشویش سے کہا کہ آپ لوگوں کو اپنے لئے کچھ کرنا چاہئے، کوئی سفارش وغیرہ لڑانی چاہئے۔ مگر ہر مرتبہ ہمارا جواب سن کر ان کی حیرانی میں اضافہ ہی ہوتا۔ البتہ بعض مواقع ایسے ضرور آتے کہ ہم اُداس ہو جاتے اور انہی میں سے ایک موقع جلسہ سالانہ کے مبارک ایام کا تھا۔

یہ تو تھا دل و جان سے پیارے آقا کی محبتوں کا مختصر سا خاکہ، محبتوں کے کا یہ سمندر کس قدر وسیع اور کتنا گہرا تھا، اس کا

---

[1] مکتوب مؤرخہ 11.03.1986

[2] خطبات طاہر جلد 6 صفحہ 420

[3] مکتوب مؤرخہ 11.11.86

کسی قدر اندازہ لگانے کے لیے حضورؒ کے اُن خطوط کا عکس ہدیہ قارئین کرتا ہوں جو آپؒ نے وقتاً فوقتاً ہم کمزوروں کی ڈھارس بندھانے کے لیے ازراہِ شفقت و محبت اپنے دستِ مبارک سے رقم فرمائے:

لنڈن
3.12.1363
1964

میرے پیارے راہِ مولا کے اسیر محمد الیاس منیر
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بارہا تمہیں اور تمہارے اسیر ساتھیوں کو خط لکھنے کا
ارادہ کیا مگر وفورِ جذبات کے سامنے کچھ پیش نہ گئی

اللہ کی تقدیر اسلام کے احیائے نو کی خاطر ہم
سے جو قربانی لینا چاہتی ہے ہم حاضر ہیں۔ وہی ہے
جو ہمیں ہمت اور صبر اور ثبات قدم بھی عطا فرمائے گا۔
لیکن میرا دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔
اپنے پیاروں کا دکھ میرے لئے ناقابلِ بیان
اذیت کا موجب بنتا ہے۔

اگر ممکن ہو تو اپنے باقی ساتھیوں
تک بھی میرا پیغامِ محبت پہنچا دیں اور بتا دیں کہ
انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ۔

اللہ آپ سب کو صدق و صفا اور ثبات
قدم نصیب فرمائے اور اس کے قرب اور اس کے پیار کی
جنت آپ کو نصیب ہو۔ اللہ آپ کے ہر غم کو خوشی
میں اور ہر ظلمت کو نور میں بدل دے۔ اللہ جلد تر
مجھے آپ کی خوشیاں دکھا کر میرے دل کو قرار نصیب
فرمائے۔ آمین۔ والسلام خاکسار
مرزا طاہر احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

لندن

5-6-85

پیارے عزیزم محمد الیاس

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط مورخہ 17/4/85 موصول ہوا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کو جلدی رہا کرے اور ہر قسم کے
دکھ درد سے بچائے۔ آپکی قربانی کو شرف قبولیت بخشے۔ اور اپنے
فضلوں سے نوازے۔ رحمٰن خدا آپکے ماموں جان کو صحت عطا فرمائے
بعد ازاں کاروبار میں برکت ڈالے۔

اللہ ہمیشہ آپکے ساتھ ہو اور آپکی حفاظت کرے۔ آمین

والسلام

خاکسار

سب اسیران راہ مولا کو میرا دل کی گہرائیوں سے
نکلا ہوا محبت بھرا السلام اور عید مبارک۔
آپ سب کے نام الگ پیغام عزیزم
نعیم الدین سلمہ اللہ کے خط میں بھجوا
رہا ہوں۔ خدا حافظ

خلیفۃ المسیح الرابع

محمد الیاس

مربی سلسلہ احمدیہ

حال ملتان جیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

31.3.1365
1986

میرے پیارے الیاس منیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دنیا والوں کی تو زندگی بھی موت اور موت بھی
موت ہوتی ہے مگر میرے خوش نصیب اسیرانِ راہِ مولا
تمہاری تو زندگی بھی زندگی اور موت بھی زندگی ہے۔
تم خاک بسر تھے میرے مولا کی رضا نے تمہیں عرش نشین
بنا دیا۔ مسیح کی غلامی میں تم بھی زمین کے کناروں
تک شہرت پا گئے۔ آج ایک کروڑ احمدیوں
کے دھڑکتے ہوئے دل تمہیں دعائیں دے رہے
ہیں اور دو کروڑ نمناک آنکھیں تم پر محبت
اور رشک کے موتی نچھاور کر رہی ہیں۔ میرا دل
بھی اُن دلوں میں شامل ہے۔ میری آنکھیں بھی
اُن آنکھوں میں گھل مل گئی ہیں۔

میرے پیارے رب کی جو تقدیر بھی تمہارے
حق میں جاری ہو وہ فضل ہی فضل اور رحمت ہی
رحمت ہے مگر میرا صبر بھی بیقراری دل کو بس سے
دونوں جہان کی سزا سے مانگ رہا ہے۔ یہ عارضی

زندگی بھی مانگ رہا ہے اور وہ رفقاء کی زندگی بھی ۔
اپنے سر لے کر شان رحمت کے نثار اس کے قدموں میں
ایسے ایسے گنہگار ۔ آمر بالکل دل بھی بڑے ہی امر وہ
انہیں گھٹکا نہیں رہا ۔

کبھی کسی نے موت کی سزا پانے والوں کو
بھی "عمر قیدیوں" کا تحفہ بھجوایا ہے؟ یہ تو دیوانہ پن
ہے ۔ مگر وہ بھٹو زندگی کی اندھی کوٹھڑی میں مستقل ابدی
زندگی کے سزاوار ٹھہرائے گئے ہیں میں انہیں کیوں
خوش نصیب "عمر قیدیوں" کا تحفہ بھیج کر اس عزم
اور یقین محکم کا اظہار نہ کروں کہ تم سب کے
لیے باہر ہمیشہ کی زندگی کے لیے پہنچے ہو ۔
خدا وہ دن جلد لائے کہ میں اپنے اس عظیم
رفاقتی فرزند کو سینے سے لگا کر اس کی نورانی
پیشانی پر بوسہ دوں ۔

خدا حافظ ۔ میرے بہت پیارے
الیاس ۔ میرے لیے مغفرت بخشش کی دعا نہ
بھولنا

والسلام ناکارہ

نذر محمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

15.1365
1986

میرے پیارے الیاس

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تمہارا خلوص اور سچائی اور ایثار کی روشنائی میں لکھا ہوا خط ملا۔ میری نگاہیں تیری محبت سے سرشار ہو کر تمہاری تحریر کے ایک ایک لفظ کو چومتی رہیں۔

اسیران راہ مولا کی تکلیف ساری جماعت کے لئے مسلسل درد کا باعث بنی ہوئی ہے۔ انگلستان کا چینل 4 ٹیلی ویژن نے جب وہ پروگرام دکھایا جس میں تم اور نعیم جیل کی سلاخوں سے جھانکتے ہوئے دکھائی دے رہے ہو تو انگلستان کے ہزارہا احمدیوں کے دل کس طرح تڑپ اٹھے۔ جیسے وہ جیل کی سلاخیں کسی نے اُن کے سینے میں ٹھونک دی ہوں۔

اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ اللہ تمہیں ظالم کے پنجے سے جلد تر رہائی دے۔ [illegible]

عطا فرمائے۔ اللہ تمہیں رحمت دارین نصیب کرے
اللہ تمہیں اور تمہارے سب پیاروں کو اپنی رحمت کی
بانہوں میں لپیٹ لے۔

اپنے دل کی کیفیت مزید کچھ نہیں لکھتا کہ
تم بے چین نہ ہو جاؤ۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ
کروڑوں احمدیوں کے دلوں کا چین تم چند
مظلوم احمدیوں کے دلوں سے وابستہ کر دیا
گیا ہے۔

رات اللہ تعالیٰ نے مجھے دعا میں
رب کل شیء خادمک۔ رب فاحفظنا وانصرنا
وارحمنا کی دعا کی طرف بار بار متوجہ فرمایا
ہے کہ اس دور کی سب بلاؤں کو ٹالنے کے
لیے اس سے مؤثر اور کوئی دعا نہیں۔ تم بھی
میرے ساتھ بکثرت اس دعا کا ورد کرنے میں
شامل ہو جاؤ تاکہ تمہاری بلائیں ٹلیں تو
میرے دل کی بلائیں ٹل جائیں۔
خدا حافظ اور یہ خط تمہارے علاوہ باقی سب اسیروں
کے لیے بھی ہے۔ والسلام خاکسار مرزا طاہر احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وعلی عبدہ المسیح الموعود

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ ھو الناصر

زندگی کی لقمہ دانور کوٹھڑی
ساہیوال جیل
6.7.1366
1987

دل وجان سے پیارے آقا!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

[illegible]
15.7.87

پرسوں ملاقات تھی، آپ کے خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۹ جون کا خلاصہ بھی ملا۔ جسے پڑھ کر کئی کیفیات دل میں پیدا ہوئیں، کئی جذبوں نے سینہ کو گرمایا، مگر سب سے غالب کیفیت یہ تھی کہ انتہائی شرمندگی ہوئی۔ اپنے آپ پر بہت غصہ آیا، استغفار کیا، دل کو آنسوؤں سے دھونے کی کوشش بھی کی۔ کیونکہ میں پورے یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ خواب میں جو بعض تھکے ہوئے اسیران دکھائے گئے وہ ہماری کوتاہیوں، کمزوریوں اور دل کی حالتوں کا عکس تھا۔

پیارے آقا! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے نظام جماعت کی طرف سے ہونیوالی کوششوں پر پورا اعتماد ہے۔ اور میں کبھی بھی اس بارہ میں شک یا شکوہ کرنے کی جسارت نہیں کرونگا۔ ماضی میں بھی کوشش کر رہی رکھی ہے مگر اپنی نالائقیوں کیوجہ سے کوئی ذرہ برابر بھی اس قسم کا اظہار ہوا ہو تو سچے دل سے معافی کا طلبگار ہوں۔

سیدی! جہاں تک میری سوچ کا تعلق ہے تو وہ آپ کے ارشادات کی روشنی میں کچھ یوں ہے کہ ایک تو فرعون اور اسکے اتباع سے کسی قسم

کی خیر کی توقع ہی نہیں ہے اور یہ ظاہری کوشش تو صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی
تعمیل میں ہیں۔ اور دوسرے خدا کی جو تقدیر بھی ظاہر ہوگی وہ ہمارے لئے
بھی اسی کی قسم، وہ بہرحال خیر ہی خیر اور برکت ہی برکت ہوگی۔ ان شاء اللہ۔
اور میرا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے ضرور بضرور کوئی نشان دکھائیگا۔
اور معجزانہ طور پر سب احمدیوں کے لئے راحت و سکون کے سامان ہونگے۔ ان شاء اللہ۔

حضور سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان کی پختگی،
توکل کی لازوال دولت، استقامت اور صبر و رضا کی نعمت اور ہر حال میں
اس کا شکر بجالاتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ خدا حافظ!

والسلام
خاکسار حضور کی جوتیوں کا غلام
محمد الیاس منیر
سنٹرل جیل ساہیوال 6/7/66/87

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

لندن
7-6-88

PK/11230

پیارے محمد الیاس منیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا۔ عید آئی اور گزر گئی۔ الحمد للہ رمضان اور عید کی خوشیاں ہمیشہ ہمارے ساتھ قائم رکھے اور اب آپ لوگوں کی رہائی کی خوشی بھی دکھا دے کہ اس وقت دن میں اور رات میں بھی دھیان رہتا ہے۔ آپ نے اپنے خط میں ایک ایسے دوست کا ذکر کیوں نہیں کیا جس نے رمضان المبارک میں آپ کا خاص خیال رکھا ایک مبشرہ نے اس کا ذکر کر دیا تھا۔ بہرحال ان کو جزاکم اللہ کا پیغام پہنچا دیں۔ ایسے لوگ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں جو آپ لوگوں کی قربانیوں کا اس جہان میں بدلہ چکا رہے ہیں۔

اللہ جلد تر آپ کی رہائی کا دن دکھائے
اور میری آنکھیں آپ کی طرف سے
مزید ٹھنڈی کرے

والسلام
خاکسار
مرزا طاہر احمد
خلیفۃ المسیح الرابع

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم
خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ
ھو الناصر

امام جماعت احمدیہ

لندن
18.7.88

PK/1782

پیارے عزیزم محمد الیاس منیر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا فیکس مورخہ 13-7-88 موصول ہوا۔ اللہ تعالیٰ حامی و ناصر ہو اور ان جیلوں اور اس کے ماحول سے جلد رہائی ملے۔ مسلم قریشی کے مل ہونے کی خبر سے جس رنگ میں آپ نے خوشی کا اظہار کیا ہے وہ حقیقۃً تھا۔ اس کا مستحقہ حقیقت لطف آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سچائی کو جلد جلد غالب فرماتا چلا جائے۔ یہ تو ایک نشان ہے۔ یہ قوم خدا کی قہری تجلی کے بغیر سمجھنے والی نہیں لگتی۔ بہرحال ہر سعید فطرت اور شریف آدمی کے لئے یہی نشان کافی ہے۔ احمدیت کے جھوٹے ہونے پہ دعویٰ اٹھایا ہے دعویٰ اٹھانے والے خود داغدار ہو رہے ہیں اور اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔ اپنے ان کو میری طرف سے السلام علیکم اور بچوں کو بہت پیار۔ سب کو عید مبارک۔

والسلام
خاکسار

مرزا طاہر احمد
خلیفۃ المسیح الرابع

سنٹرل جیل فیصل آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

15.6.92

میرے نہایت پیارے الیاس سیٹھ سلمکم اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آصفہ بیگم کے وصال پر آپکا پرخلوص دلگداز خط ملا۔ میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ آپکو اپنے ہاتھ سے خط لکھنے میں مجھے دیر ہو رہی تھی کہ اچانک اس خط نے آج۔ کل کی کیفیت کو ابھی میں بدل دیا۔

کیونکہ صرف یہ بتانے کے لئے دو حرف لکھ رہا ہوں کہ آپکے ذوق یوسف میں ایکدن مجھے کبھی ایسا بار نہیں گیا کہ آپ یاد نہ آئے ہوں۔ بارہا اکثر اوقات اور صحبت میں اس گداز دعا سے میرا دل پگھل پگھل کر بہتا رہا ہے کہ اے میرے پیارے رب مجھے جلد تر اپنے پیاروں کی رہائی دکھا کر اس جان گسل غم سے رہائی بخش جس نے مجھے یرغمال بنا رکھا ہے اور جو میری آزادی کی خوشی میں ایسی تلخی گھولتا ہے کہ یہ آزادی جرم دکھائی دینے لگتی ہے۔ اسیران راہ مولا سب مجھے بہت پیارے ہیں لیکن تم سے مجھے ایک رشتہ دوجاں سب سے سوا ہے

والسلام خاکسار مرزا طاہر احمد

2.9.92

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

بہت پیارے عزیزم محمد الیاس منیر
اسیر راہ مولا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آصفہ بی بی کی وفات پر آپکا غم میں ڈوبا ہوا
خط ملا۔ ہر چند کہ غم ہلکا کرنے کے لئے لکھا گیا تھا
بہت غم انگیز ثابت ہوا جس کے لئے میں آپکا تہہ دل
سے ممنون ہوں۔ اس خاص کیفیت میں جو دعائیں دل سے
اٹھیں ان میں بی بی کے ساتھ آپ بھی برابر کے شریک
رہے۔

اسیران راہ مولا میں آپکی ایک الگ شان ہے
سب مجھے بہت پیارے ہیں اور سب کا درد دل میں اٹھتا
ہوں اور تصور کی آنکھوں سے جب ان پیارے سب کو
دیکھتا ہوں تو الیاس پر نظر ٹھہر جاتی ہے اور [illegible]
[illegible] چلتی رہے۔

[illegible] آپکے حق میں میری دعا جلد قبول فرمائے
جب چوہدری ناصر صاحب کی رہائی کی خبر ملی تو بے حد خوشی ہوئی مگر
تعجب بھی تھا کہ [illegible] رہائی کے لئے [illegible]

کیپٹن ناصر صاحب مرحوم [illegible] کے انا للہ [illegible]

[illegible] ہے۔ ناصر صاحب کی اچانک وفات پر [illegible] اللہ

کی حکمتیں سمجھ آتی ہیں۔ اسیر جلد رہائی کا معجزہ [illegible] ہوا۔

میں خدا تعالیٰ کی رضا کے سامنے [illegible]

[illegible]

خدا حافظ

والسلام خاکسار

[illegible]

سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ بھی اسیران کو اپنی محبت اور شفقت سے برابر نوازتے رہے۔ چنانچہ آپ گاہے گاہے دیگر اسیران کے نام بھی اپنے دست مبارک سے خطوط تحریر فرما کر اس کا اظہار فرماتے۔ خاکسار نے ان تبرکات کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور جس قدر اور جس حالت میں ملے ہیں، ہدیہ قارئین ہیں کہ ان کا ایک ایک لفظ اور ہر ہر جملہ آبگینہ ہی نہیں آبِ حیات ہے آبِ حیات!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

31.3.1986

میرے پیارے عزیزم نعیم الدین
اسیر راہ مولا ۔ مجاہد احمدیت

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تم تو کال کوٹھڑی کے نہیں حجرۂ نور کے مکین ہو ۔ یہ تم نے ثابت کر دیا ۔ رضائے باری تعالیٰ کے قیدی تو زنداں میں بھی رہیں تو اسے بقعۂ نور بنا دیتے ہیں ۔ ایک اور بات بھی تم نے اپنے خط میں ظاہر کر دی تم تو ابدی زندگی کے سزاوار ٹھہرائے گئے ہو کون ہے جو تمہیں سزائے موت دے سکے ۔ وہ تو خود مردہ ہیں ۔ کبھی مُردوں نے بھی زندوں کی قسمت پر پنجہ ڈالا ہے ۔ اگر شہادت تمہارے مقدر میں نہیں لکھی گئی ہے تو کسی ماں نے وہ بچہ نہیں جنا جو تمہیں مار سکے ۔ شہادت کی دائمی زندگی بھی موت کی منزل سے ہو کر نہیں گذرتی ۔

میری دعا اور عاجزانہ دردبھری پکار یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عارضی زندگی بھی عطا فرمائے اور دائمی بھی ۔ دنیا کی جزا سے بھی نوازے اور آخرت

ہیں۔ اصل مقصد تو مختلف ممالک میں سے شائع شدہ

تائید اور مدح کی انتہا ذکر کرنا تھا جو اللہ تعالیٰ

نے اس ابتلاء کے دور میں دلداری کے رنگ

میں جماعت احمدیہ کو عطا فرمائے ہیں لیکن

اس کے ساتھ ہی جہاں جہاں جاتا ہوں وہاں پریس

کانفرنس کے ذریعہ اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن

انٹرویو کے ذریعہ پاکستان میں احمدیوں پر

کئے جانے والے مظالم کا ذکر کرتا

ہوں اور اسلام یعنی احمدیت کی تبلیغ اور

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور

آپ کے عاشق صادق کامل حضرت مسیح موعود

علیہ السلام کا نام مختلف قوموں تک پہنچانے

کا موقعہ بھی مل رہا ہے۔ یورپ کے متعدد کثیر

الاشاعت اخبارات نے ایسے عمدہ تبصرے

شائع کئے ہیں کہ اللہ کی حمد سے دل لبریز ہوگیا

کروڑہا انسانوں تک اس ذریعہ سے احمدیت

کا پیغام پہنچ رہا ہے اور بفضلہ تعالیٰ ہر جگہ

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

لندن
12.8.90

پیارے عزیزم رانا نعیم الدین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا۔ آپ مجھے ہمیشہ یاد رہتے ہو
آپ کا حوصلہ، جرأت اور صبر قابل داد ہے
اللہ تعالیٰ اپنی غیر معمولی برکتوں سے نوازے اور رہائی
کے سامان عطا فرمائے۔ اپنے ساتھیوں کو بھی میرا
محبت بھرا سلام دیں۔ بچوں اور گھر میں سب کو بھی سلام دیں
دیکھئے تو آپ ہمیشہ یاد رہتے
ہیں لیکن عید کے ایام میں
تو یہ یاد بہت ہی رنگ دکھانے
لگتی ہے۔ اللہ اپنے فضل سے
آنکھیں ٹھنڈی عطا کرے اور ہماری
بھی آنکھیں آپ سب کی طرف سے
ٹھنڈی کرے۔ یاد رکھیں آپکی بے بسی
صرف آپ ہی کو تکلیف نہیں پہنچا رہی۔ لاکھوں احمدی شب و روز
اس احساس میں آپکے شریک اور آپکے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ ان کی
دعا میں بھی شامل ہوں۔

والسلام
خاکسار
مرزا طاہر احمد
خلیفۃ المسیح الرابع

ساہیوال جیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم • نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھو الناصر

واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا

خلیفۃ المسیح الرابع

امام جماعت احمدیہ

1.11.88

عزیزم

پیارے مکرم عبد القدیر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط موصول ہوا۔ اللہ تعالیٰ معجزانہ رنگ میں رہائی کے سامان پیدا کرے۔ آپ کو اور آپ کی والدہ کو لگنے والے دکھ اور ان کی پریشانیوں کو دور فرمائے اور اپنے بے حساب فضلوں کا وارث بنائے۔ اسیران کے لئے جماعت خصوصی طور پر دعائیں کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد بہتری کی صورت پیدا کرے۔ تمام ساتھیوں کو میرا محبت بھرا سلام دیں۔

والسلام

خاکسار

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع

ضیاء کی ہلاکت کے بعد آپ کو جو ناکردہ انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا اور ہر قسم کا ظلم و ستم روا رکھا گیا اس پر مجھے شدید تکلیف تھی اور آپ کے لئے باقاعدہ درد دل سے دعا کرتا رہا ہوں۔ کر رہا ہوں اور آئندہ بھی ان شاء اللہ کرتا رہوں گا۔ میں اللہ کی رحمت سے امید رکھتا ہوں کہ اب اس ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔

سنٹرل جیل

ساہیوال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

[illegible]

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ
ھو الناصر

[illegible]

خلیفۃ المسیح

[illegible]

25.6.1366
۱۹۸۷

پیارے عزیزم نثار احمد شاہد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دیگر تحریری مصروفیات کے علاوہ سینکڑوں
خطوط مجھے روزانہ پڑھنے پڑتے ہیں اور کسی خط کا
بار بار پڑھنا بظاہر ممکن نہیں۔ لیکن آپ کے محبت
بھرے خط کو میں نے بار بار پڑھا ہے اور ہر بار
میری آنکھوں نے محبت اور شکر اور حمد کے آنسو بہائے۔
جب بھی کسی اسیر راہ مولا کا خط مجھے دعاؤں
کے لئے تحفوں کا زاد مہیا کرتا ہے تو
میرا دل اس کے لئے جذبۂ امتنان سے بھر جاتا
ہے کیونکہ دعاؤں میں رونے سے دل کی بے چینی
کچھ کم ہو جاتی ہے اور اللہ کی طرف سے سکینت
عطا ہوتی رہے۔ میری کوئی خوشی اور
خالی لذت ایسی نہیں جو مظلوم احمدیوں کی
یاد سے زخم خوردہ نہ ہو

[illegible]

ہیں۔ اصل مقصد تو مختلف ممالک میں مضبوط
شاندار مرکز کا انتخاب کرنا تھا سو اللہ تعالیٰ
نے اس ابتلاء کے دور میں دلداری کے تحت
ہمیں جماعت احمدیہ کو عطا فرمائے ہیں لیکن
اس کے ساتھ ہی جہاں جماعتیں ہیں وہاں پریس
کانفرنس کے ذریعہ اور ایڈیٹرز ٹیلیویژن ریڈیو
انٹرویوز کے ذریعہ پاکستان میں احمدیوں پر
کئے جانے والے مظالم کا ذکر کرنا
ہے اور اسلام یعنی احمدیت کی تبلیغ اور
اب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور
آپ کے عاشق صادق کامل حضرت مسیح موعود
علیہ السلام کا نام مختلف قوموں تک پہنچانے
کا موقعہ بھی مل رہا ہے۔ یورپ کے متعدد کثیر
الاشاعت اخبارات نے ایسے عمدہ تبصرے
شائع کئے ہیں کہ اللہ کی حمد سے دل لبریز ہوتا
کروڑہا انسانوں تک اس ذریعہ سے احمدیت
کا پیغام پہنچ رہا ہے اور سلسلہ تعارف بیرونی

بیٹیوں کو رخصتانہ پڑھا رہا ہے۔

آپ خود بھی اس امر پر اللہ کا شکر کریں اور
اپنے دیگر خاندان کے افراد یعنی میرے پیارے اسیران راہ
مولا کو بھی بتا دیں کہ ان کی قربانیاں رائگاں
نہیں جا رہیں بلکہ سب دنیا میں ان کو پھل لگ رہے
ہیں۔ اللہ تمہیں آپ کی طرف سے بھی جلد
خوشخبری دکھائے۔ آپ کی آزادی کا دن
میرے لئے بھی ایک جانگسل غم سے آزادی کا
دن ہوگا۔

سب کو نہایت محبت بھرا سلام۔

خدا حافظ۔

والسلام خاکسار

مرزا طاہر احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

3.3.1364
1985

پیارے عزیزم محمد شاہد اسیرِ مولا
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا جیل سے لکھا ہوا محبت بھرا پر خلوص خط اس
وقت میرے سامنے ہے اور وفورِ جذبات سے آنکھیں
ڈبڈبا گئی ہیں۔ یوں تو ہر دم آپ بھائیوں
کا خیال دل میں پھانس کی طرح اٹکا رہتا ہے مگر
جب کسی کے خط میں آپ کا ذکر آئے یا کسی
اسیرِ راہِ مولا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ملے تو
دل میں ایک تلاطم بپا ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ
دل سے ایسے درد سے دعا نکلتی ہے کہ یقین نہیں
آتا کہ رحمتِ باری اسے ٹھکرا سکے گی لیکن
وہ حکمتِ کُل ہے اور ہم نادان جاہل بندے
وہ ہماری فلاح اور بہبود کو ہم سے بہتر سمجھتا
ہے۔ اگر اسلام کے احیائے نو کے لئے وہ
ہم ناکارہ بندوں کو قربانی کی سعادت بخشنا
چاہتا ہے تو ہم بسر و چشم حاضر ہیں لیکن بڑے
خوش نصیب ہیں وہ جنہیں اس کی نظرِ عنایت

محبوبوں کی طرح چھین لے لیکن اُن لوگوں
کے دکھوں کا کیا حال ہوتا جن کے دل کبھی نصیب
میں اپنی محرومیوں کا احساس اور اپنے پیاروں
کی یادوں کے کانٹے رہ جاتیں ہیں ۔

جب یہ باتیں سوچتا ہوں تو دل سے
بڑی بے قرار آواز اٹھتی ہے کہ اے حکمت بالغہ
اور عقل کے مالک تو قدرت کاملہ کا بھی تو
مالک ہے ۔ ہم پر رحم فرما اور ہمیں دکھوں کی اس
آزمائش سے نجات بخش اور دنیا اور آخرت
کی حسنات سے نواز اور اپنے پیاروں کے دکھ
میں مبتلا نہ فرما ۔ اے ارحم الراحمین رحم
فرما ۔ اے ارحم الراحمین رحم فرما ۔ اے
ارحم الراحمین رحم فرما ۔

اپنے سب سعید بخت بالکوں کو بے حد محبت
بھرا سلام پہنچا دیں ۔ یہ خط آپ سب کے
لئے ہے ۔ آپ میں سے ہر ایک میرا مخاطب ہے ۔
آپ کو میری بھیجی ہوئی ٹافیوں کا مزا آیا ۔
جزاکم اللہ احسن الجزاء شکر ہے تو جب مزا آئے
گا جب اپنے ساتھ اپنے ساتھ بٹھا کر اپنے پیاروں
کو کچھ کھلاؤں گا ۔ خدا حافظ ! ۔ والسلام خاکسار مرزا طاہر احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

MIRZA TAHIR AHMAD
HEAD OF THE AHMADIYYA COMMUNITY
IN ISLAM

فرانکفورٹ

24.12.1363
1984

پیارے عزیزم میاں محمد صادق

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قیدی کوٹھری سے لکھا ہوا آپ کا دردناک خط ملا
جس نے دل پر گہرا اثر کیا۔ راہ مولا میں قید ہونے والے
اپنے سب بھائیوں کے لئے میرا دل بہت بے قرار ہے۔
اور صبح شام آپ کے لئے دعائیں کر رہا ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ سب بلا قصور پکڑے
گئے لیکن اس سے قبل اللہ تعالیٰ کے بزرگ ترین بندوں پر
بھی تو اسی طرح کے ناحق مظالم توڑے جاتے رہے
ہیں۔ سید المعصومین حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
سے بڑھ کر تو کوئی معصوم نہیں ہو سکتا لیکن سب سے بڑھ کر
ظلم آپ ہی پر توڑے گئے۔ پس جہاں ایک طرف آپ سخت
مظلوم ہیں اور دردناک مصائب کا شکار ہیں وہاں خوش
نصیب بھی تو اتنے ہیں کہ اس دور کے آزاد دنیا والوں کو آپ کی اس قید
پر رشک ہے۔ آپ قرآن کریم کی ان آیتوں میں جا ملے جن پر ہمیشہ
خدا تعالیٰ انعام فرماتا رہا۔

اللہ آپ کا حامی و ناصر رہے۔ ہر دم آپ کو پیار

نوٹ: اس خط میں غلطی سے حاذق صاحب کی جگہ ان کے بڑے بھائی کا نام لکھا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

31.3.1365
1986

میرے نہایت پیارے محمد حاذق رفیق طاہر

اسیر راہ مولا ساہیوال۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تمہارے حوصلے اور عزم کا سر ہمیشہ بلند رکھے اور جلد تر تمہیں ظلم کے پنجے سے رہائی بخشے۔

تمہارے سب خطوط ایمان اور خلوص اور ایثار اور صبر و رضا کا پیکر ہوتے ہیں جیسے تم اپنی تحریر کا لباس اوڑھ کے خود چلے آئے ہو۔ ایسے احمدیت کے شیر دل بہادر نوجوان ہیں تمہارے ہر خط کو بڑی محبت اور پیار، اور فخر سے پڑھتا ہوں اور جان کی بے اختیار محبت کی طرح دل سے بے اختیار تم سب کے لئے دعائیں اچھلتی ہیں۔ میں اپنے رب کریم کی رحمت پر بھروسہ رکھتے ہوئے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ ظلم کی زنجیروں میں زیادہ لمبا عرصہ قید نہیں رہنے دے گا اور جلد خدا تعالیٰ کی تقدیر تعزیرات ظلم کی ان زنجیروں کو توڑ دے گی۔ یہی میری دعا اور یہی میرے دل کی تمنا ہے کہ میں جلد تر تمہیں

[illegible]

نورِ ایمان سے درخشندہ پیشانی کو بوسہ دوں۔

میرا یہی پیغام تم سب کے لیے ہے۔ تمہیں میں نے
خاص محبت اور پیار سے اپنے بیٹوں ممبر کے طور پر
چنا ہے۔

ہر لمحہ انشاء اللہ رحمت اور فضل کی رفاقت
تمہارے ساتھ۔ تم خدا کے رفیق اور خدا تمہارا
رفیق ہو۔

خدا حافظ!

والسلام خاکسار

مرزا طاہر احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

15.9.91

پیارے عزیزم محمد حاذق رفیق طاہر
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یورپ سے واپسی پر آپکے تین خطوط
رکھے ملے - اسیران راہ مولیٰ - بالخصوص اسیران پیاروں
کے خطوط دیکھ کر دل بہت بے چین ہو جاتا ہے.
کوئی دن ایسا نہیں گذرتا کہ آپ لوگ یاد نہ آتے
ہوں اور دل کی گہرائی سے دعائیں نہ نکلتی ہوں -
اللہ مجھے جلد آپکی رہائی کا دن دکھائے - اپنی آنکھوں
سے آپکو دیکھوں تو میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں -
اپنے سینے سے آپکو لگاؤں تو تسکین دل و جان ملے -
آپکا ایثار - آپکا حوصلہ - آپکا
ثبات قدم ہمیشہ تاریخ احمدیت میں سنہری حرفوں
سے لکھا جائیگا اور آئندہ آنے والی نسلیں
آپکے کردار سے روشنی پائیں گی اور ہمیشہ بڑی
عزت اور احترام اور رشک سے آپکا نام
لیا کریں گی -
اس میں تو مجھے ایک ذرہ بھی شک نہیں کہ

اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ امام کی قیادت میں کی جانے والی دعائیں ہمارا زادِ راہ تھیں تو ہماری تسکین کا سر چشمہ بھی۔ علاوہ ازیں بعض اور ذرائع سے بھی اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے برکات کے دَر کھول رکھے تھے۔ ایسے ہی باعث برکت ذرائع میں سے تبرکات حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یہ بشارت دے رکھی ہے کہ

بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے

چنانچہ افرادِ خاندان سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی یہ غیر معمولی شفقت و احسان ہے کہ انہوں نے خاکسار کو نیک خواہشات کے ساتھ نیک شگون کے طور پر حضور علیہ السلام کے مختلف تبرکات بھجوائے۔ ان میں سے ایک تو حضرت سیدہ ام متین صاحبہ (مرحومہ) حرم حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی طرف سے ملنے والا حضور علیہ السلام کی قمیص مبارک کے استر کا ایک ٹکڑا تھا۔ یہ تبرک ارسال کرتے ہوئے حضرت چھوٹی آپا مرحومہ نے اپنے ہاتھ سے لفافہ کے اوپر تحریر فرمایا کہ حضور علیہ السلام کی قمیص کے اُستر کا یہ ٹکڑا اُنہیں حضرت میر محمد اسحاق صاحبؓ کے ذریعہ ملا تھا۔ چنانچہ خاکسار نے اس تبرک کو ہمیشہ اپنی جیب میں رکھا۔ علاوہ ازیں محترم صاحبزادہ مرزا حنیف احمد صاحب ابن حضرت مصلح موعودؓ نے سزائے موت کا حکم سنائے جانے کے فوراً بعد مارچ 1986ء میں ملاقات کے لئے تشریف لا کر مجھے ایک ایسی انگوٹھی پہنائی تھی جس کے نگ والی جگہ میں سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی قمیص مبارک کا بٹن جڑا تھا اور اس کے دونوں اَطراف اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ کا اِلہام اُبھرے ہوئے لفظوں میں درج تھا۔ اس کے ساتھ ہی موصوف نے بالوضاحت کہا تھا کہ یہ انگوٹھی 'عاریۃً' پہنا رہا ہوں اور مجھے واپس کرنی ہے۔ خاکسار نے یہ انگوٹھی ہر قسم کی مشکل صورت حال کے باوجود بے شمار احتیاطی تدابیر کرتے ہوئے ہمیشہ پہنے رکھی اور اس اعتبار سے کہ اس میں نصب سکہ کا 'بٹن' بیش بہا ہونے کے ساتھ ساتھ نایاب بھی تھا، اس کی حفاظت کے حوالہ سے بھی ایک الگ کہانی ہے جسے علیحدہ باب بیان کر دیا گیا ہے۔

ایسے تبرکات کے ساتھ ساتھ ان بزرگان کی ملاقاتیں بھی اپنی جگہ باعث برکت تھیں۔ یوں تو محترم صاحبزادہ مرزا حنیف احمد صاحب کا خاکسار کے ساتھ زمانہ طالب علمی سے ہی شفقت بھرا تعلق تھا مگر دورانِ اسیری موصوف کی اس شفقت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اپنی نہایت قیمتی اور عزیز ترین انگوٹھی میرے حوالہ کر دینا اس کا واضح ثبوت ہے۔ آپ جب ملاقات پر تشریف لاتے رہتے تو نہایت مفید نصائح سے نوازتے۔ جب مؤرخہ 22 فروری 1987ء کو

ملاقات کے لئے تشریف لائے تو ہمیشہ کی طرح نہایت شفقت اور پیار کے ساتھ مجھے ملے۔ بڑی محبت سے باتیں کرتے رہے اور اس دوران آپ نے یہ نصیحت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو زیادہ سے زیادہ جذب کرو اور اس کی محبت حاصل کرو تا کہ لقائے الٰہی کی نعمت سے نوازے جاؤ۔ گو کہ یہ منزل بہت دور اور بہت ہی کٹھن اور دشوار گزار ہے مگر حقیقی خواہش یہی ہونی چاہئے اور دعاؤں کا بھی مغز یہی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَالْعَمَلَ الَّذِی یُبَلِّغُنِی حُبَّکَ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِی وَ اَھْلِی وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ۔[1]

یعنی اے اللہ! میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اور اُس کی محبت بھی جو تجھ سے محبت کرتا ہے اور میں تجھ سے ایسے عمل کی توفیق مانگتا ہوں جو مجھے تیری محبت تک پہنچا دے۔ اے اللہ! اپنی محبت میرے دل میں اتنی ڈال دے جو میری اپنی ذات، میرے حال، میرے اہل اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ ہو۔ آپ نے اس موقع پر سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ شعر ایسے مؤثر انداز میں سنایا کہ ہمیشہ کے لئے یاد ہو گیا ؎

اِس جہاں میں خواہشِ آزادگی بے سود ہے      اِک تری قیدِ محبت ہے جو کر دے رستگار

## ابا جان مرحوم کی طویل جان توڑ محنت و مشقت کی تفصیل

میرے پیارے ابا جان محترم مولانا محمد اسماعیل منیر صاحب مرحوم سابق مبلغ سری لنکا، مشرقی افریقہ، ماریشس و سیرالیون نے ہماری اسیری کا دور اس قدر صبر و ہمت کے ساتھ گزارا، اس دوران میں اس قدر محنت کی اور اپنے وجود کو اتنا کھپایا کہ ان کے ذکر کے بغیر یہ داستان نامکمل رہے گی۔ آپ کی خدمات کا آغاز گھر سے ہوتا ہے جہاں خاکسار کی اہلیہ اور دونوں بیٹے آپ کی کفالت میں رہے اور آپ نے اللہ کے فضل سے کفالت کا حق ادا کیا۔ پھر گھر سے باہر ہر جگہ، ہر ملنے والے دوست تک ہمارے حالات پہنچانا اور دعا کی درخواست کرنا آپ کا معمول تھا۔ جیل میں ملاقات کے لئے نہ صرف خود باقاعدگی سے آنا بلکہ ہمارے بچوں اور دیگر اعزہ و اقرباء اور احباب کو ساتھ لانا۔ دوران سماعت عدالت میں پہنچنا، سرکاری دفاتر میں پہنچ کر ہمارے مسائل حل کرانا، ہماری ضروریات کا نہایت باریک بینی سے خیال رکھنا، مجھے سرکاری امتحانات دلوانا، ہمارے چاہنے والوں کو تسلیاں دینا، حضرت امیر المومنین رحمہ اللہ کو تازہ ترین صورت حال سے مسلسل باخبر رکھنا۔ ابا جان کی ان تھک محنت کے یہ چند پہلو ہیں جن کی تفصیل اس کتاب کے ہر باب میں پھیلی ہوئی ہے، جسے پڑھ کر وَابْیَضَّتْ عَیْنَاہُ مِنَ الْحُزْنِ اور حَتّٰی تَکُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَکُوْنَ مِنَ الْھَالِکِیْنَ

---

[1] جامع ترمذی، کتاب الدعوات

کا نظارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے صرف آنکھیں ہی روزنِ دیوارِ زنداں نہیں بلکہ آپ مجسم دیوارِ زنداں رہے مگر کسی ایک لمحہ ایمانی کمزوری تو بہت دور کی بات جسمانی کمزوری کا بھی احساس تک نہ ہونے دیا بلکہ بے مثال ہمت اور بلند حوصلہ کے ساتھ ایک مضبوط چٹان کی طرح ہر قسم کی آندھیوں اور طوفانوں کے سامنے سینہ سپر نظر آئے۔

ہر دوسرے ہفتہ بچوں کو لے کر آنا تو آپ نے اپنے آپ پر فرض کر ہی لیا ہوا تھا مگر درمیان میں بھی موقع کی تلاش میں رہتے اور کوئی نہ کوئی صورت ملاقات کی نکال لیتے۔ اس راہ میں سردی، گرمی، سفر کی طوالت یا صعوبت جیسی کسی رکاوٹ کو حائل نہ ہونے دیتے یہاں تک کہ اپنی بیماری اور خراب صحت کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ ایک مرتبہ تو ملاقات سے محض ایک روز قبل سڑک کے خوفناک حادثہ میں زخمی بھی ہوئے مگر اگلے ہی روز آپ میری ملاقات پر موجود تھے۔ مجھے جب کسی کی زبانی اس حادثہ کا علم ہوا اور میں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ آرام کرتے تو میری بات کو اس طرح ٹال دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو حالانکہ آپ اُس وقت بھی سخت تکلیف میں تھے۔ اسی طرح 1989ء کے جلسہ سالانہ کے موقع پر لندن جانے کا جو پروگرام بنایا تو وہ بھی ایسا کہ ایک ملاقات کر کے جائیں اور اگلی ملاقات سے پہلے واپس آجائیں گویا پندرہ دن سے بھی کم آپ اس سفر لندن میں گزاریں۔ خاکسار کو علم ہوا تو بڑی زوردار درخواست کی کہ اتنی دور جانا ہے جہاں جلسہ ہے اور حضور ہیں تو مہینہ بھر کا پروگرام تو رکھیں، اس پر بڑی مشکل سے مانے اور اس دوران نہ ہو سکنے والی ایک ملاقات کا بھی انہیں افسوس رہا۔ اسی طرح گھر میں بچوں کی پرورش، ان کی ضروریات کا خیال رکھنا، ان کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ غرضیکہ ایسے طور پر یہ فرض ادا کرتے رہے کہ انہیں کسی قسم کی کمی کا احساس نہ ہو۔

زمانہ اسیری کے دوران ہماری دوسری والدہ محترمہ نجمہ منیر صاحبہ مرحومہ کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ انہوں نے بچوں کی تربیت و نگہداشت نیز میری بیگم طاہرہ کو سہارا دینے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ مسلسل ملاقات کے لئے آنا ان کا بھی معمول تھا اور گھر میں ہر طرح سے بچوں کا خیال رکھنے میں طاہرہ کا پورا ساتھ دیا۔ حیرت کی بات ہے میری رہائی کے جلد بعد ان کی اچانک وفات ہوگئی تو یوں لگا جیسے وہ ہماری زندگی میں بس یہی مشکل وقت گزارنے کے لئے آئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت اور رحمت کا سلوک فرمائے، آمین۔

اس موقع پر خاکسار پیارے آقا رحمہ اللہ تعالیٰ کے اُن خطوط کا عکس ہدیہ قارئین کرتا ہے جو میرے پیارے ابا جان کے نام حضورؒ نے مختلف اوقات میں تحریر فرمائے۔ ان خطوط سے بھی ابا جان مرحوم کی ان خدمات کا علم ہوتا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا
انا فتحنا لک فتحا مبینا

MIRZA TAHIR AHMAD
HEAD OF THE AHMADIYYA COMMUNITY
IN ISLAM

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

لندن
6.1.1364
1985

پیارے برادرم مولانا محمد اسمٰعیل منیر صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عزیزم الیاس منیر کی طرف سے اور اُن کے مظلوم
افتاد کی طرف سے دل بہت فکرمند اور حزیں رہتا
ہے۔ ان کے اہل وعیال اور اقرباء کا خیال مزید چرکے
لگاتا رہتا ہے۔ اللہ جلد تر میرے حزن اور خوف
دور کر دے اور ان سب کی طرف آنکھیں ٹھنڈی
ہو جائیں اور سینہ خوشیوں سے بھر جائے۔

عزیزم کے لئے ایک خط بھجوا رہا ہوں
اُن کی بیگم کو محبت بھرا سلام اور بچوں کو پیار۔
ان کی بیگم کا خط بھی مل گیا ہے۔ جس صبر اور
حوصلے کا وہ اظہار کر رہی ہیں اس سے دل حمد و شکر
سے لبریز ہو گیا اور اس مجاہدہ بچی کے لئے
بہت درد دل سے دعا کی توفیق ملی۔
اُن کے ابا جی اور دیگر عزیزوں کو بھی اور آپ کی
بیگم صاحبہ اور سب عزیزوں کو بھی میرا محبت بھرا سلام
پہنچا دیں۔ خدا حافظ۔ والسلام خاکسار
مرزا طاہر احمد

MIRZA TAHIR AHMAD
HEAD OF THE AHMADIYYA COMMUNITY
IN ISLAM

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

لندن
3.12.1363
1984

پیارے برادرم محمد اسمٰعیل منیر
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ساتھ کا خط عزیزم الیاس منیر سلمہ اللہ کو
پہنچانے کا انتظام کر کے ممنون فرمائیے۔
میری دعائیں ہر لمحہ اسیرانِ احمدیت
کے ساتھ ہیں اور ان کے اقرباء اور لواحقین کا خیال
بھی مجھے بے قرار رکھتا ہے۔
ہر حال میں راضی برضا رہنے کا عزم
کر کے عظیم منزل ایمان اور توکل کے ساتھ اللہ
کے دامن رحمت سے خیرات کے طلبگار رہیں۔
فی امان اللہ۔

والسلام خاکسار
مرزا طاہر احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ
ھو الناصر

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا

خلیفۃ المسیح

19.2.1365
1986

پیارے برادرم اسمٰعیل منیر صاحب
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جب سے ملٹری کورٹ نے ساہیوال کیس کا انتہائی ظالمانہ اور بہیمانہ فیصلہ سنایا ہے میرے دل کا [illegible] حال ہے۔ انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ

آپ جانتے ہیں یقیناً کہ میرا روحانی بیٹا الیاس منیر سلمہ اللہ مجھے کتنا پیارا ہے۔ ایک طرف اس کی عظیم سعادت پر رشک آرہا ہے تو دوسری طرف بشری کمزوری نے دل کا وہ حال کر رکھا ہے کہ اظہار ممکن نہیں۔

ہر چند کہ ہم اس وقت تک کہ خدا تعالیٰ کی تقدیر ظاہر ہو جائے اس فیصلہ کو کالعدم کروانے کے لئے دعا اور تدبیر کو انتہا تک پہنچانے کی کوشش کرتے رہیں گے لیکن اگر خدا تعالیٰ نے یہ مقدر فرما دیا ہے کہ عزیزم الیاس سلمہ اللہ اور عزیزم نعیم الدین سلمہ اللہ کو [illegible] کے پیالے [illegible] تقدیر خیر [illegible] ہے تو پھر میری دعا اور التجا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اور ان سب کو جو ان دونوں مظلوموں سے محبت رکھتے ہیں ایسا حوصلہ

عطا فرمائے اور اپنی راہ میں ثابت قدم اور
صادق مجاہد بنائے اور اپنی ہر رضا پر ہر حال
میں راضی رہنے کی توفیق بخشے ۔
اب مجھے سمجھ آگئی ہے کہ میں کتنا کمزور اور
ناکارہ انسان ہوں اور اپنے پیاروں کا غم
برداشت کرنے کا کتنا پست حوصلہ رکھتا
ہوں ۔ میں جہاں میں آپ کے لئے اور متعلقین
نانی وال کے سب عزیزوں کے لئے بڑے درد دل
سے دعا کرتا ہوں آپ بھی میرے لئے دعا کریں
کہ اللہ تعالیٰ مجھے کسی ابتلا میں ناکام نہ فرمائے
اور قیامت کے دن کی رسوائی سے بچائے ۔

میرے پیارے عزیزم محمد الیاس منیر اور نعیم احمد
تک میرے دل کا حال پہنچا دیں اور بتا دیں کہ یہ بار
دل کی زندگی تو سخت ناقابل اعتبار ہے اور
یہ بھی پتہ نہیں کہ کیسے انجام کو پہنچتی ہے ۔
ہم تو ہرگز نہیں چاہتے کہ وہ ہم سے اتنی جلد جدا ہوں
مگر ہر نفس کا مقدر آخر یہی ہے تو اسے خوش نصیب
جو رضائے باری تعالیٰ کی خاطر فانی زندگی پانے والے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ہیرا اور آسمان احمدیت کے درخشندہ ستارے
بن کر چمکنے والے ہیں۔ اور جو تاریخ احمدیت میں
ہمیشہ محبت اور عظمت اور پیار اور احترام کے ساتھ
یاد کیے جاتے رہیں گے۔ دم واپسیں احمدیت یعنی حقیقی اسلام
کی فتح اور غلبہ کی دعا کرنا اور اس عاجز ناکارہ
انسان کی بخشش کی بھی دعا کرنا۔ تم تو ہر امتحان میں
کامیاب و کامران ٹھہرے اور ہر ابتلاء سے
سرخرو ہو کر نکلے کاش میری بھی یہ فریاد قبول
ہو کہ ربنا و توفنا مع الابرار۔

ان دونوں کے اہل خانہ کو خود حاضر ہو کر
میرا محبت بھرا سلام پہنچا دیں۔ کہ میری طاقت نہیں کہ
میں ان کو الگ الگ خط لکھ سکوں۔ ان کو سمجھا دیں
کہ جو کچھ انسانی بس میں ہے کیا جا رہا ہے لیکن اگر
تقدیر الٰہی مبرم ہے تو ہر حال میں ثابت قدم رہنا اور
صدق کے نمونے دکھانا ہے۔ یاد رکھیں کہ وہ بے سہارا
نہیں اور اُن کے بچے کبھی یتیم نہیں ہوں گے۔ جب
میں مر جاؤں گا تو آنے والا خلیفہ اللہ کی رحمت
کا مظہر بن کر اُن کے سر پر دست شفقت رکھے گا

بہت دعا کریں کہ میرا وجود خدا کی اس پیاری جماعت
کی سر بلندی ہر ابتلاء میں سلامت رہے اور کبھی غیر اللہ کے سامنے
سر نہ جھکے۔

خدا حافظ۔

والسلام خاکسار

مرزا طاہر احمد

پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے اپنے سفرِ ماریشس کے آخری خطبہ جمعہ فرمودہ 23 ستمبر 1988ء میں ماریشس کے ابتدائی مبلغین احمدیت کی قربانیوں اور خدمات کا تذکرہ فرمایا۔ اس خطبہ جمعہ میں حضورؒ نے عاجز کے اباجان محترم مولانا محمد اسماعیل منیر صاحب (مرحوم) کی ماریشس میں مبلغ سلسلہ کے طور پر خدمات کا اِن الفاظ میں ذکر فرمایا:

”ان بزرگوں کے بعد پھر دوسری نسل کے بہت سے مبلغین یہاں مختلف وقتوں میں تشریف لاتے رہے اور ان کی یادوں میں کچھ تلخیاں بھی ہیں، بہت سی اچھی باتیں بھی ہیں، حسب توفیق سب نے وقف زندگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی اور مختلف رنگ میں محنتیں کرتے رہے۔ یہ جو آج جماعت کی عمدہ حالت ہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سب گزشتہ خدمت دین کرنے والوں کی محنتوں کا اثر اس میں موجود ہے لیکن یہاں کچھ عرصہ ٹھہر کر لوگوں سے ملنے کے بعد اور خصوصاً غیر احمدی اور غیر مسلم عیسائیوں اور ہندو بڑے لوگوں سے ملاقات کے بعد بعض مدبرین، مفکرین جو اپنے اپنے مقام کے لحاظ سے سرداری رکھنے والے لوگ تھے، اُن سے ملنے کے بعد میرا یہ تاثر ہے کہ سب سے زیادہ دائمی اور نیک اثر مولوی اسماعیل صاحب منیر

نے چھوڑا ہے اور کوئی ایسا آدمی مجھے وہاں نہیں ملا جو اُن کے زمانے میں کوئی بھی حیثیت رکھتا ہو اور اُس نے نہایت ہی محبت کے ساتھ نہایت خلوص کے ساتھ اُن کا ذکر نہ کیا ہو۔ عیسائی پادری اور بڑے بڑے پادریوں نے بھی اُن کا ذکر بڑی محبت سے کیا اور کافی عرصہ تک ان کی بڑی پرانی باتیں اپنے دلی تعلق کے ساتھ کرتے رہے اور ہندو پنڈتوں نے بھی اُن کا ذکر کیا اور سیاسی لیڈروں نے بھی اُن کا ذکر کیا اور عدلیہ کے ججوں نے بھی اُن کا ذکر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب تک یہاں رہے اللہ تعالیٰ کے فضل سے گردوپیش ہر قسم کے ماحول میں نفوذ پیدا کرتے رہے اور بہت اچھے نیک اثرات چھوڑ گئے ہیں۔ اس لئے جہاں باقی سب مبلغین کو اُن کی عمومی خدمات میں ہمیں یاد رکھنا چاہئے۔ خصوصیت کے ساتھ مولانا اسماعیل صاحب منیر کی نیک خدمات کے نتیجے میں اُن کو یاد رکھنا چاہئے۔''

ابا جان مرحوم کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا:

''اور اِس مضمون کو خاص طور پر باندھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہمارے اسیرانِ راہِ مولا میں ان کا بیٹا بھی شامل ہے۔ محمد الیاس منیر اُن کا صاحبزادہ جو واقفِ زندگی ہے اور میں اُس کو بچپن سے جانتا ہوں۔ نہایت ہی نیک صفات اور بہت ہی مخلص انسان ہے خالصۃً للہ وقف کرنے والا، ایک جھوٹے الزام میں پھانسی کا پھندا اُس کے سر پر لٹکایا گیا اور ابھی تک وہ انتہائی تکلیف میں بے جا مظالم کا نشانہ بنا ہوا کال کوٹھڑی میں قید ہے لیکن اُس کے خطوط آپ دیکھیں تو اُن میں کال کوٹھڑی کے اندھیرے کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ خدا کی محبت میں روشن اور منور ہیں اور اُن میں دین اور ایمان اور محبت اور خلوص کی ایسی روشنی پائی جاتی ہے کہ اُن خطوں کو دیکھ کر انسان حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں پیدا ہوئے ہیں کہ کوئی دنیا کی طاقت اُن کو مرعوب نہیں کر سکتی۔ ایسا زندہ ایمان بخش دیا ہے کہ اُس ایمان پر کبھی موت نہیں آسکتی بلکہ موت کے خطرات میں اور زیادہ چمکتا ہے اور زیادہ دمکتا ہے اور زیادہ روز روشن کی طرح نمایاں ہو کر آفتاب نصف النہار کی طرح چمکتا اور دمکتا ہوا ظاہر ہوتا ہے۔ اندھیرے اُس کی روشنی کو دھندلا نہیں سکتے اور بھی زیادہ تیز کر دیتے ہیں۔ ایسے اور بھی راہِ مولا کے اسیر ہیں۔ اُن سب کے ذکر کا یہاں موقع تو نہیں لیکن اس ذکر میں اُن سب کو بھی شامل سمجھیں اور خصوصیت کے ساتھ اُن بزرگوں کے لئے دعاؤں کے وقت اُن کی اولادوں اور اور ان کے آئندہ آنے والی نسلوں میں پیدا ہونے والے واقفین زندگی کو بھی یاد رکھیں۔ خدا تعالیٰ ہمیشہ اُن کی

نیکیوں کو اُن کے خون میں قائم رکھے۔ اور خصوصیت کے ساتھ الیاس منیر کو یاد رکھیں اور اُن کے ساتھی جن کے اوپر اسی طرح ایک جھوٹے الزام کے طور پر موت کی تلوار لٹکائی گئی ہے اور دیگر اسیران راہ مولا جنہوں نے مختلف موقعوں پر پاکستان میں دین کی عظمت کے لئے قربانیاں دی ہیں اور آج بھی دے رہے ہیں۔ اُن سب کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ آپ اُن کے لئے دعائیں کریں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ خدا کے فضل سے آپ کے لئے دعائیں کریں گے۔‘‘[1]

## خاکسار کی اہلیہ اور اُن کے والدین

اس دورِ یوسفی کے دوران خاکسار کی اہلیہ طاہرہ الیاس نے کامل وفا کے ساتھ میرا ساتھ دیا۔ بچے چھوٹے اور معصوم تھے انہیں تو کچھ علم نہ تھا کہ کیا اور کیوں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، ایسے میں انہیں سنبھالنا، ملاقاتوں کے لئے پوری باقاعدگی سے آنا، گھریلو معاملات کو چلانا اور بے شمار ملنے والوں کے ساتھ حوصلہ اور ہمت سے ملنا اور کوہ وقار بنے رہنا۔ یہ چند نمایاں جھلکیاں ہیں اُس عظیم کردار کی جس کا سہارا مجھے تمام دور اسیری میں رہا، الحمدللہ۔ ہماری شادی ہوئے محض اڑھائی سال ہوئے تھے کہ اس سانحہ کے نتیجہ میں ایک ایسے دور کا آغاز ہو گیا جس کے اختتام کا کچھ بھی علم نہ تھا مگر اللہ کی اس بندی نے بھی ہر چہ بادا باد کا نعرہ لگاتے ہوئے کمال حوصلہ، استقامت اور صبر کے ساتھ اس راہ پر میرے شانہ بشانہ سفر شروع کر دیا اور ہر قدم پر مجھے حوصلہ دلایا، میرا ساتھ دیا اور میرے لئے ہر طرح سے سہارا بنی۔ فجزاہا اللہ احسن الجزاء۔

اسی طرح میرے سسر محترم محمد شفیق صاحب اور خوشدامن صاحبہ مرحومہ بھی کمال محبت واپنائیت کے ساتھ اسیری کے اس دور میں ہمارے ہم سفر رہے۔ پندرہ روزہ ملاقات کے لیے باقاعدگی سے آنے والوں میں دونوں بزرگ بھی ہوتے اور بڑی محبت اور حکمت کے ساتھ حوصلہ دِلاتے۔ خاکسار انہیں بھی حقیقی والدین کی طرح ہی بے چین اور بے قرار دیکھتا۔ اپنی کمزور صحت کے باوجود شدید گرمی میں بھی ہر جگہ پہنچتے اور شدید سردی کو بھی اس راہ میں آڑے نہ آنے دیتے۔ میں جب انہیں دیکھتا تو صاف نظر آتا کہ متواصل الاحزان والی کیفیت ہے اور اپنی ساری ساری توانائیاں بس ہماری خاطر وقف کئے ہوئے ہیں۔ سماعت مقدمہ کے دوران تو آپ کا جوش وجذبہ دیکھنے کے قابل تھا۔ آپ کارروائی کے باقاعدہ نوٹس بناتے اور حضور انور رحمہ اللہ کی خدمت میں بھی بھجواتے۔ اسی طرح خاکسار کے بچوں کی دیکھ بھال میں بھی پوری طرح اپنا کردار ادا کرتے رہے، فجزاھما اللہ احسن الجزاء۔

دوران اسیری خاکسار کی اہلیہ کے نام حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے تحریر فرمودہ خطوط ہدیۂ قارئین ہیں۔

---

[1] (خطبات طاہر جلد 7 صفحہ 645 تا 647)

واجعل لي من لدنك سلطانا نصيرا
إنا فتحنا لك فتحا مبينا

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

MIRZA TAHIR AHMAD
HEAD OF THE AHMADIYYA COMMUNITY
IN ISLAM

لندن
1.12.1363
1984

عزیزہ طاہرہ الیاس

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تمہیں صبر اور حوصلہ نصیب فرمائے اور
اس دردناک ابتلاء سے اپنی رحمت کے طفیل سے
کسی گزند کے بغیر صحیح سلامت نکال لائے ۔
قربانی کرنے والے تو اللہ کی راہ میں قربانی کے
مقدس احساس سے لذت یاب ہو رہے ہوتے
ہیں تو باہر سے دیکھنے والوں کے دلوں پر قیامت
گزر رہی ہوتی ہے ۔ یہی حال آجکل میرا ہے ۔
ساہیوال کے اسیروں کا خیال سخت بے قرار
کر دیتا ہے ۔ صرف ان کا ہی نہیں ان کے عزیزوں
اہل و عیال اور بزرگوں اور بچوں ۔ بیویوں اور بہنوں کی
جدائی کی تکلیف کا خیال اور بھی بے چینی کو بڑھا دیتا
ہے اور زخمی دل کو مٹھی میں جکڑ کے ستاتا ہے ۔
عزیزم الیاس منیر تو ویسے بھی مجھے
بہت پیارا ہے ۔ اللہ ان سب کو اپنی حفاظت اور
رحمت کے سائے تلے رکھے اور ہر شر سے بچائے
ان کے دلوں کو سہارا دے ۔ ان کے عزم اور حوصلوں

سے دل بڑھائیے۔ ان سے محبت اور پیار کا اظہار

فرمائیے اور ان کے محبوب عزیزوں کا بھی خاص ذکر

میرا پیر و محسن اور رفیق اسمٰعیل بنا رہے۔

عزیزم الیاس کا جیل سے لکھا ہوا خط

ملا تو دل بے قابو ہو گیا۔ میرے دل کی آنکھیں

بھی [illegible] راہ مولا کے ان معصوم قیدیوں کے

روزن زنداں سے لگی رہتی ہیں۔ اللہ مجھے ان سب کی

طرف سے خوشیاں دکھائے اور وہ دن جلد لائے

کہ میں انہیں سینے سے لگا کر ان کی پیشانیوں کے

بوسے لوں۔

کئی دفعہ ارادہ کرتا ہوں کہ سب کو اپنے

ہاتھ سے خط لکھوں لیکن میرے جذبات کی

شدت میرے قلم کو مبہوت کر دیتی ہے

اگر ممکن ہو تو میرے اس خط کی

عکسی تصویر عزیزم الیاس کو بھجوا دو۔ شاید

یہ اس کے اور اس کے رفقاء کے لئے تسکین

کا موجب بنے۔

برادرم اسمٰعیل جبیر کو بھی یہ خط پڑھا

دینا۔ اللہ تم سب کی طرف سے مجھے جلد تر

خوشیاں دکھائے۔

فی امان اللہ۔ فی امان اللہ۔ فی امان اللہ۔

دونوں بچوں کو بہت بہت پیار۔ والسلام خاکسار

مرزا طاہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

31.3.1365
1966

پیاری عزیزہ بیٹی طاہرہ الیاس

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اس عظیم الشان ابتلاء کے تاریخی دور میں تمہیں میرے مولا نے عزم وہمت اور صبر و رضا کا پیکر بنانے کے لئے چن لیا۔ غم کے لباس میں رضائے باری تعالیٰ کی بے بہا خلعت تمہیں عطا کی گئی۔ درد والم کی چادر کے پردے میں اللہ تعالیٰ کی لازوال رحمتوں اور برکتوں کے سائے نے تمہارے سر کو ڈھانپ لیا۔ آج ثبات قدم تمہارے پاؤں کی جھانجن ہے۔ قربانی اور ایثار تمہارے بدن کے زیور ہیں، نور ایمان تمہارے ماتھے کا جھومر ہے۔ میرا پیارا الیاس تمہارا سرتاج ہے۔ اللہ تمہارا سرتاج تمہارا سہاگ سلامت رکھے۔ آمین۔

میں جانتا ہوں کہ شہادت اور پھر ایسی عظیم شہادت یقیناً قابل صد رشک سعادت ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ظاہری جان لیے بغیر بھی لازوال زندگی عطا کر سکتا ہے۔ وہ مالک اور قادر اور قدیر اور مقتدر ہے۔

اسمٰعیلی قربانی اپنی آن بان اور شان میں اس بنا
پر کم تو نہیں ہو سکتی کہ خدا حقیقت اثر ڈیا کی پرشوکت
آواز نے اسمٰعیل کی گردن پر چلنے والی چھری
کی حرکت سلب کر لی۔ پس میرا گنہگار دل آخر
مالک کون و مکان سے اپنے پیارے الیاس اور نعیم
اور ناصر اور رفیق کے لئے اس دنیا کی لمبی
بھی مانگتا ہے اور آخرت کی بھی تو تعلیم قرآن
کے منافی تو نہیں۔ ہم تو الحمدللہ کہیں گے۔ راہ مولا
کے الحمدللہ۔ جب تک ہمارا آقا آخری تقدیر
ظاہر نہیں فرمایا تا ہم رب انی لما انزلت الیّ من خیر
فقیر کی صدا بلند کرتے رہیں گے اور جب وہ
تقدیر خیر کو ظاہر فرما دے گا تو وہ جس بھیس
میں بھی آئے ہم حمد و شکر کے ترانے گاتے ہوئے
اس کا خیر مقدم کریں گے۔ مومن کا تو کوئی
سودا بھی نقصان اور خوف اور حزن کا سودا نہیں۔
ہمیں لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون کی معرفت
کا جام لبالب پلا دیا گیا ہے۔
میری پیاری طاہرہ بیٹی جس طرح 2ء2 میں
تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیارے الیاس کے سبب پیار رہا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

کو اور ان ماؤں میں دکھ اٹھانے والے اپنے اور کے
سب عزیزوں کو نعیم کو اور ناصر کو اور رفیع کو اور ان سب
کو دیکھ رہا ہوں جو پس زندان عصیہ یوسفی کی یاد دن
کو زندہ کر رہے اور حسن یوسف کی شمعیں فروزاں کیے
ہوئے ہیں۔ جب میں ان کو اور ان کے ہجر میں
تڑپتے ہوتے ان کے سب عزیزوں اور پیاروں کو
سراپا فخر اور درد میں ڈوبی ہوئی محبت کی
نظر سے دیکھتا ہوں تو بے اختیار میرے دل سے
یہ دعا نکلتی ہے میں کیا اور میری محبت کی نظر
کیا اے میرے مولا اے میرے مالک میرے معبود،
میرے مسجود خدا تو خود ان کو اپنی دائمی محبت
کی نظر سے سرفراز فرما اور دنیا اور آخرت کی
حسنات سے ان کے ظروف بھر دے اور نسلاً بعد نسل
ان کی اولاد در اولاد کو اپنے فضلوں اور رحمتوں اور
برکتوں سے سرفراز فرماتا رہ۔
اللّٰھم صل علی محمد و آل محمد و بارک وسلم انک حمید مجید۔

والسلام خاکسار مرزا طاہر احمد

اپنے پیارے بلند نصیب کبیروں کو دیکھ میں بیٹھا ہوں میرے دل کا پیار

[illegible]

یوں تو ابتداء سے ہی احباب جماعت اور اعزہ واقرباء نے ملاقاتیں کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مگر سزا سنائے جانے کے بعد تو اس میں غیر معمولی جذباتی کیفیت اور شدت آ گئی تھی۔ چنانچہ ہمارے لئے تڑپنے والے ہمارے پیارے ہر وقت اِسی تلاش میں رہتے کہ کوئی موقع ملے، کوئی راہ نکلے، کوئی وسیلہ ہاتھ آئے تو وہ جیل پہنچ کر ہم سے ملاقات کر لیں۔ افرادِ خانہ تو ہر پندرہ دن کے بعد ملنے آتے ہی تھے مگر ان پندرہ دِنوں کے دوران واقف و ناواقف دوست احباب مختلف حیلوں سے ملاقاتیں کرتے رہتے۔ بعض اوقات تو یوں ہوتا کہ سارا سارا دِن ہی ہماری ملاقات ہوتی رہتی۔ شام تک بعض دوست ہمارے پاس بیٹھے رہتے، کھانا بھی ہم اکٹھا کھاتے، نمازیں بھی باجماعت ادا کرتے۔ گاہے گاہے تشریف لانے والے ان سب کے نام تو مجھے یاد نہیں رہے اس لئے ان سب کے لئے مجموعی طور پر اللہ کے حضور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے فضل سے جزائے خیر فی الدنیا والآخرۃ عطا فرمائے، آمین۔

گوجرانوالہ سے خاکسار کی پیاری نانی جان بیماری اور بڑھاپے کے باوجود ہر ممکن حد تک ملاقات کے لئے تشریف لاتی رہیں اور یہ سلسلہ 1989ء تک جاری رہا پھر جب آپ پر بیماری کا ایسا حملہ ہوا جس میں بستر سے اُٹھنا تو درکنار بات کرنا بھی ممکن نہ رہا تو ایسے میں بھی اِشاروں کے ساتھ سمجھاتیں کہ ملاقات پر جانا ہے۔ چنانچہ آپ کی نمائندگی میں کبھی ماموں عبدالمجید صاحب یا عبدالحمید صاحب تو کبھی سب سے چھوٹے ماموں عبدالباسط صاحب آتے، کبھی ایسا نہ ہوا کہ ان میں سے کوئی بھی نہ آیا ہو۔ جب کبھی میرے بچے میری نانی جان سے ملنے گوجرانوالہ جاتے تو انہیں دیکھتے ہی آپ بے قرار ہو جاتیں، آپ کی آنکھیں مچلنے لگتیں مگر بیماری ایسی تھی کہ اپنی کیفیت کا واضح اظہار نہ کر پاتیں۔ اس طرح سے آپ نے ماں کی کمی کا احساس بھی نہ ہونے دیا، جزاہا اللہ احسن الجزاء واغفرلہا وارفع درجاتہا۔

اسی طرح میری اکلوتی ہمشیرہ باجی ناصرہ اور بھائی جان ظہور الدین بابر صاحب بھی اسی کوشش میں ہوتے اور جب بھی موقع ملتا پہنچ جاتے۔ پیاری باجی نے تو ماں بن کر میرا درد اپنے سینے میں بسائے رکھا۔ ایک مرتبہ بھائی جان بابر صاحب ملاقات کے لیے آئے تو بتانے لگے کہ پہلے تو بہنوں کی محبت کے واقعات قصے کہانیوں میں پڑھے سنے تھے لیکن اب اپنے گھر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ جس طرح تمہاری بہن محبت کے ساتھ ہمیشہ تمہاری یاد زندہ رکھتی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں اجر عظیم بخشے، صحت و عافیت والی خوشیوں سے معمور عمر دراز نصیب کرے، آمین۔ پیارے آقا نے بھی ان کی اس محبت کو محسوس کیا اور انہیں اسیری کے اس دور میں نہایت درجہ شفقت کے ساتھ اپنے دست مبارک سے ایک خط تحریر فرمایا، اس کا عکس پیش ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا
انا فتحنا لک فتحا مبینا

31.3.1365
1986

میرے پیارے الیاس کی لاڈلی بہن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں کن الفاظ میں تمہارا شکریہ ادا کروں
کہ تمہارے اور تمہارے ابا اور تمہارے خاندان
کے دیگر افراد کے پرخلوص خطوط نے مجھے کتنا راضی
کیا ہے۔

راہ مولا کے اسیر اور ان کے اقربا دار اور اعزاء
اور پیارے میرے خلوتوں کو جلوتیں بنائے
ہوئے ہیں اور میری دعاؤں کو آباد کئے ہوئے ہیں۔
مجھ میں طاقت نہیں کہ رو برو کسی فرد بشر
سے تمام قیدیوں کی باتیں کر سکوں۔ خطبوں میں بھی
زیادہ ذکر اس لئے نہیں کرتا کہ جب ضبط
کا یارا نہیں رہتا تو بہت شرمندہ ہوتا ہوں۔
ہاں ایک یاد کا ہی وسیلہ ہے جو کبھی دعا بن کر
اور کبھی خیالات میں گھل مل کر اپنے دور افتادہ
عزیزوں کی رفاقت عطا کرتا ہے یا پھر کبھی کبھی
بہت مجبور ہو کر خطوط کے پردے میں اپنے

مافی الضمیر کا کچھ اظہار کر کے سینہ کا دباؤ کم کرتا
رہتا۔

یہی نہیں کہ تمہیں تسلی دینا میرا فرض اور تمہارا
حق ہے بلکہ میرے دل کے بے ساختہ طبعی تقاضے
بھی یہی ہیں کہ راہ مولا میں دکھ اٹھانے والوں
میں سے ایک ایک کو میں تسلی دوں لیکن تم لوگ
بھی عجیب اور نئے لوگ ہو اور خلوص و محبت کی یہ
الٹی گنگا بہا رہے ہو کہ اپنے زخموں سے بڑھ کر
میرے زخم دل کا خیال ہے اور مجھے تسلیوں کے
خط لکھ رہے ہو۔

اللہ اللہ! میں اس پیاری جماعت کا
بھلا کیسے حق ادا کر سکوں گا۔ کاش وہ مجھ سے
عفو اور مغفرت کا سلوک فرمائے۔

سب عزیزوں کو نہایت محبت
بھرا سلام۔ خدا حافظ!

والسلام خاکسار
مرزا طاہر احمد

خاکسار کے دونوں بھائی مکرم محمد داؤد منیر صاحب اور مکرم ڈاکٹر محمد ادریس منیر صاحب امریکہ میں تھے اور وہاں سے ہر ممکن ذریعہ سے خاکسار کے ساتھ رابطہ میں رہے اور سب اسیران کی رہائی کے لئے دعاؤں کے ساتھ ساتھ رائے عامہ کو بیدار کرنے کی تدابیر میں مصروف رہے۔ انہیں جب بھی موقع ملا پاکستان آکر بھی ملاقاتیں کرتے رہے جو کوئی آسان کام نہ تھا۔ اسی طرح خاکسار کی سب سے چھوٹی خالہ ناصرہ صاحبہ بھی امریکہ سے تشریف لاتی رہیں، جرمنی سے میرے ماموں مکرم عبدالسمیع صاحب اور اسی طرح دیگر ممالک میں آباد بھی رشتہ داروں میں سے جس کا بھی پاکستان آنا ہوتا مجھ سے ضرور مل کر جاتا۔ اس داستان میں بھی مختلف مقامات پر بہت سے اعزہ کا ذکر موجود ہے جو موقع بہ موقع ملاقات کے لیے تشریف لاتے رہے۔

## دوستوں اور احباب جماعت کا ولولہ انگیز تعلق

احباب جماعت جن میں بزرگان سلسلہ، عہدیداران جماعت اور دوست احباب بھی شامل ہیں، بڑی کثرت اور تواتر سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے رہے۔ ان میں ایک کثیر تعداد ایسے احباب کی بھی ہوتی جن کے ساتھ پہلے کبھی ملاقات نہ ہوئی ہوتی، کسی بھی قسم کا ذاتی تعارف نہ ہوتا حتی کہ ایک دوسرے کا نام تک نہ سنا ہوتا مگر اس دورِ ابتلاء میں ان سب کی طرف سے والہانہ محبت واخوت کا ایک سیلاب جاری رہا جس میں ہم بس بہتے ہی چلے گئے۔ اس محض للہ تعلق محبت واخوت کا اظہار ملاقات کر کے یا خطوط لکھ کر ہوتا اور جن احباب کو یہ دونوں ذرائع میسر نہ آتے وہ اپنی سجدہ گاہوں کو ہماری لئے تر کر کے محبت کے موتی نچھاور کرتے رہتے جو بخارات بن کر اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی بارشوں کی صورت میں ہم پر برستے رہتے۔

ملاقات کے لئے تشریف لانے والے سب احباب کا نام بنام ذکر تو ممکن نہیں تاہم میری یادداشتوں میں جن کا ذکر مل سکا ان میں سے مسلسل آنے والے احبابِ جماعت میں برادرم حاذق صاحب کے والد محترم میاں محمد عاشق صاحب مرحوم اور برادرم عبدالقدیر صاحب کے والد محترم عبدالرحیم مجاہد صاحب مرحوم کے علاوہ بزرگوارم محترم چوہدری عبدالرحیم احمد صاحب آف ملتان مرحوم، محترم میاں خالد مسعود صاحب لاہور، محترم برادرم عبدالودود صاحب آف لاہور (یکے از شہیدانِ وفا لاہور 2010ء)، محترم ملک حمید احمد صاحب (داماد مکرم ملک محمد دین صاحب)، محترم منیر الدین مسعود صاحب آف لاہور اور فیصل آباد کے محترم ڈاکٹر منیر احمد صاحب، برادرم محترم شیخ رفیق احمد صاحب ٹی وی پوائنٹ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض احباب کے متعلق تو یوں لگتا جیسے انہوں نے جیل کے باہر مستقل طور پر ڈیرہ لگا رکھا ہو۔ اگر یہ احباب خود نہ آتے تو ان کی سفارش پر بہت سے دیگر احباب ملاقات کر رہے

ہوتے۔ ان کے علاوہ بعض اور بھی مخلص دوست احباب تھے جن کے نام بوجوہ شائع کرنے ممکن نہیں ہیں۔ غرضیکہ ہم بلا مبالغہ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہمارا شمار اُن قیدیوں میں ہوتا تھا جن کی اللہ تعالیٰ کے فضل سے جیل میں سب سے زیادہ ملاقاتیں ہوتی تھیں، الحمدللہ۔

اسی طرح ساہیوال کے مکرم ملک نعیم الدین صاحب ابن مکرم ملک محمد دین صاحب، مکرم میجر بشیر احمد صاحب، مکرم رانا مبارک علی صاحب مرحوم، فیصل آباد کے مکرم حافظ محمد اکرم صاحب، مکرم سہیل مشتاق صاحب اور ملتان کے مکرم ڈاکٹر محمد شفیق صاحب اور ایک احمدی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل ہمارے ساتھ ملاقاتیں کرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے ملاقاتیوں کی خدمت کرنے اور ہمیں اشیائے ضرورت کی ترسیل کی ذمہ داری مستقل طور پر ادا کرتے رہے، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

## درویشان قادیان

قادیان سے بھی گاہے گاہے کوئی نہ کوئی بزرگ ملاقات کے لئے تشریف لاتے ہی رہتے تھے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو ہرگز غلط نہ ہوگا کہ جنہیں بھی پاکستان آنے کا ویزا ملتا ہمیں ملنے ضرور آتے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب امیر جماعت احمدیہ بھارت بھی متعدد مرتبہ تشریف لائے اور ہمیشہ غیر معمولی شفقت و محبت کا اِظہار کرتے ہوئے گرانقدر تحفے بھی لاتے۔ ایک مرتبہ آپ کشمیر کا خاص قسم کا شہد بھی لائے جسے اُس کے مخصوص سفید رنگ کی وجہ سے میں کئی روز تک دیسی گھی سمجھتا رہا۔ اسی طرح پیارے تایا جان مکرم ماسٹر محمد ابراہیم صاحب مرحوم تو خاص مجھے ملنے کے لئے ہی ویزا لے کر آتے رہے۔

## ایک ایمان افروز ملاقات

سزا سنائے جانے کے چوتھے روز مجھے نہانے کا موقع ملا، اُسی روز کپڑے بھی تبدیل کئے تھے اس لئے میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ Fresh تھا۔ میں نے حسبِ پروگرام تلاوت قرآن کریم کی پھر کھانا آیا تو کھانا کھا کر لیٹ گیا اور بے فکر ہو کر سو گیا کہ یہاں یہ وقت سب سے زیادہ خاموشی کا ہوتا اور خوامخواہ نیند آنے لگتی اور یوں بھی آج میری ملاقات آنے کا اِمکان نہ تھا لیکن اِسی دَوران میرے دروازے پر کھڑکا ہوا۔ میں اُٹھا تو مجھے بتایا گیا کہ تیاری پکڑو ملاقات ہے۔ مجھے خوشی کے ساتھ ساتھ حیرانی بھی ہوئی کہ آج مسلسل چوتھے روز بھی ملاقات؟ جلدی سے تیاری کر کے باہر نکلا، ہتھکڑی لگوائی اور اپنے ''ڈرائنگ روم'' یعنی کمرہ ملاقات جو ساتھ والی کنڈم وارڈ میں تھا، پہنچ کر بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں محترم رانا نعیم الدین صاحب بھی اُدھر لائے گئے۔ مجھے یاد آیا کہ پہلے روز تو میں رانا صاحب سے اس طرح الوداع

ہوا تھا کہ اب جانے کب ملاقات ہو مگر اللہ تعالیٰ کتنا رؤف و رحیم ہے کہ وہ ہر روز ہی اپنے فضل سے ملاقات کے سامان کر دیتا ہے، الحمد للہ رب العالمین۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ آج کون ملاقات پر آئے ہوں گے کہ تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے چند نوجوان آ کھڑے ہوئے۔ اُنہیں دیکھ کر ہم حیران و پریشان رہ گئے کہ یہ ربوہ کے وہ نوجوان تھے جو عام طور پر آزاد طبع تصور کئے جاتے تھے مگر ان سب کے چہروں پر محبت تھی، خلوص ٹپکتا تھا۔ اِن میں میرے نسبتی بھائی مکرم طارق محمود صاحب بھی تھے، پروفیسر پروازی صاحب کے بیٹوں عزیزان ماہر، طاہر کے علاوہ رحمت محلہ کے پانچ چھ اور نوجوان بھی تھے جنہیں ہم پہلے سے نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے ایک بڑی ہی ایمان افروز اور روح پرور بات کہی کہ ہم تو صرف اپنے ایمانوں کو تازہ کرنے یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے اور باتوں کے علاوہ محترم مبشر احمد صاحب راجیکی کا سلام اور یہ پیغام بھی دیا کہ جتنی مرتبہ ہو سکے سورۃ یٰسین کی تلاوت کیا کرو۔ چنانچہ اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کوشش ہوتی ہے کہ کم از کم ایک سے زائد مرتبہ اس سورۃ کی تلاوت روزانہ کروں۔

یہ ملاقات اس لحاظ سے بہت ہی اثر انگیز رہی کہ وہ نوجوان جن کے متعلق خیال بھی نہ تھا کہ وہ ملاقات کے لئے آئیں گے یا ہمارے لئے کبھی اس قدر بے قرار اور مضطرب ہوں گے، وہ بھی ماہی بے آب کی طرح تھے۔ مشتے از خروارے کے مصداق ان کے چہروں سے باقی جماعت کے اضطرار اور اضطراب اور فکر مندی کا بخوبی احساس ہوا۔ غرضیکہ ان نوجوانوں کی ملاقات نے دل کو بہت گرمایا، فالحمد للہ۔

ان نوجوانوں سے مل کر میں نے سوچا کہ ہمارے اس فیصلے سے نوجوانوں میں کس قدر بیداری پیدا ہوئی ہے، کس قدر روحانیت میں ترقی ہوئی ہے کہ جو باتیں یہ دوست کرتے رہے یا جو تاثرات ان کے تھے وہ عام حالات میں ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اس بات نے ہمارے عزم و ہمت، حوصلہ، جذبہ اور ولولہ کو ایک نیا رنگ اور نیا رُخ دیا۔ میں نے سوچا کہ ہماری اتنی سی تکلیف کا یہ پھل ہے جو اپنی کیفیت کے لحاظ سے بہت عظیم اور شیریں ہے جو انسانی پیدائش کی اصل غرض اور مقصد کی خوشبو سے معطر ہے اور اس سے عبادت اور تعلق باللہ کی بہت ہی شاندار اور خوشگوار مہک آ رہی ہے۔ اس سے توکل علی اللہ اور رجوع الی اللہ کی لپٹیں اُٹھ رہی ہیں۔ ہماری معمولی سی قربانی کا اِتنا عظیم نتیجہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، یہ حسین اور شیریں پھل ہماری جھولیوں کو بھرے ہوئے ہیں تو پھر ہمیں کیا پرواہ کہ ہمارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میں نے وسیع تر منظر پر نگاہ ڈالی اور سوچا کہ یہ تو ظاہر ہے کہ میں نے زندگی وقف کر رکھی ہے مگر اس کے جملہ تقاضوں کے مطابق خدمت دین ایک ذرہ بھی نہیں کر پایا۔ اس لئے اگر اللہ قبول کرے تو اس طرح سے ایک عمدہ نمونہ

پیش کر کے اور اس سے جماعت کے نوجوانوں اور بوڑھوں اور بچوں میں بیداری کی لہر ہی پیدا کر جاؤں تو شاید اسی طرح میرا عہد وقف کسی حد تک پورا ہو اور آخرت کے مؤاخذہ سے بچ جاؤں۔ اس پس منظر میں ایک بات کا مزید یقین ہو گیا کہ ہماری یہ قربانی کسی بھی صورت میں رائیگاں نہیں جائے گی، یہ بہر حال رنگ لا کر رہے گی۔ یہ دودھاری تلوار ثابت ہوگی، اپنوں کو بھی جھنجوڑے گی اور دوسری طرف مخالفوں کو بھی تباہ و برباد اور خاکستر کر کے رکھ دے گی اور ان نادان دشمنوں کو ہماری جانوں کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

## آنا ایک فوجی افسر کا ملاقات کے لئے!

یہ 16 مارچ 1987ء کی بات ہے کہ میں معمول کے مطابق صبح سویرے اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد تیار ہو کر اپنی چکی میں بیٹھا مصروف مطالعہ تھا کہ اچانک شور پڑ گیا کہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ شیخ جاوید آ گیا ہے۔ جو قیدی کھلے تھے دوڑ بھاگ کر کے اپنی اپنی چکیوں میں جا بند ہوئے، مشقتی صفائیوں میں لگ گئے اور ہر طرف ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ ایسے میں بھاری بھر کم بوٹوں کی آوازیں قریب آتی ہوئی سنائی دیں۔ پھر یہ آوازیں میری چکی کے سامنے آ کر رُک گئیں۔ دروازے پر چونکہ پردہ لٹکا کر میں اندر بیٹھا تھا اس لئے کسی کا چہرہ تو نظر نہ آیا تاہم سامنے سے گزرتے ہوئے کسی شخص کی فوجی وردی دروازہ کی دَرز سے دکھائی دی۔ ساتھ ہی مجھے شیخ جاوید کی یہ سوالیہ آواز سنائی دی کہ الیاس کی یہی چکی ہے؟ میں نے سمجھا کہ میرے مقدمہ کے حوالہ سے فوج کو کسی کمی کا شک گزرا ہے جس کی وجہ سے وہ اب یہاں آ کر اس کمی کو پوری کرنا چاہتی ہے۔ چند ثانیوں میں تالا کھلا تو میں نے دیکھا کہ وردی میں ملبوس فوجی افسر کے چہرہ پر تو اپنائیت کے آثار ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جذبات کی رَو میں بہہ کر انہوں نے مجھے اپنے سینہ سے لگا لیا۔ پھر میری دعوت پر اندر تشریف لا کر بیٹھ گئے اور علیک سلیک کے بعد چند عمومی باتیں کیں۔ میرا اُن کی باتوں کی طرف بہت کم دھیان تھا کیونکہ میرا ذہن پوری طرح ان کے چہرہ اور ان کی شناخت کے نکتہ پر مرکوز تھا۔ جب بعد از کوشش بسیار بھی سرخرو نہ ہو سکا تو مجھے ہتھیار پھینکنے ہی پڑے اور آخر میں نے یہ کہتے ہوئے اس جمود کو توڑ ہی دیا کہ میں ابھی تک آپ کو پہچان نہیں سکا تو انہوں نے تعارف کروایا۔ یہ بزرگ میری بڑی بھابھی جان کے چچا مکرم چوہدری عبدالکریم صاحب ڈوگر تھے جو فوج میں لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ تب مجھے تیزی کے ساتھ ان نشستوں کی یاد آنے لگی جو مختلف مواقع اور مقامات پر ان کے ساتھ ہو چکی تھیں لیکن آج انہیں پہلی مرتبہ وردی میں دیکھا تھا جس کی وجہ سے پہچانے نہ جا سکے اور بالکل بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس کے بعد ان کے ساتھ خوب کھل کر اور گھل مل کر باتیں ہوئیں۔ بہت سے موضوعات زیر بحث آئے اور یہ ڈرامائی اور دلچسپ ملاقات بڑی خوشگوار رہی۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر سے

نوازے، اُنہیں دینی و دنیوی ترقیات عطا فرمائے اور قوم اور ملک کی بہترین رنگ میں خدمت کی توفیق بخشے۔ آمین۔
اس موقع پر اُنہوں نے جیبی سائز کا قصیدہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام در شانِ حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ مجھے دیا جسے وہ عموماً اپنے پاس رکھتے تھے۔ ایسی ملاقاتوں سے جیل انتظامیہ اور قیدیوں کے دلوں میں ہمارا رعب قائم ہو جاتا اور ان لوگوں کو ہمارے خلاف سازش کرتے ہوئے کچھ نہ کچھ سوچنا پڑتا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خاص فضلوں اور اس کی تائید و نصرت کا ایک انداز تھا۔

## مختلف ملاقاتوں کی یادیں

17 مارچ 87ء کا دن اسی شوق اور تشنگی کو بجھا کر اور زیادہ بھڑکا دینے اور زیادہ تیز کر دینے کا دن تھا یعنی آج معمول کی ملاقات کا پروگرام تھا۔ اس لئے کئی روز سے دھڑا دھڑ خطوط لکھ رہا تھا تا کہ سب کو جواب چلے جائیں۔ ملاقات سے پہلے بھی مصروفیت رہی اور ملاقات سے ذرا ہی پہلے فارغ ہوا۔ ملاقات کے لئے حسب معمول گھر کے جملہ افراد ابا جان، آپا جان، طاہرہ بیگم اور میرے سسر مکرم شفیق صاحب اور خوشدامن صاحبہ آئیں۔ ان کے علاوہ مربی سلسلہ خوشی محمد شاکر صاحب، خوشاب سے مکرم صادق محمد طاہر صاحب اور کراچی سے فضائیہ کے ایک ریٹائرڈ افسر تشریف لائے۔ آج کے اس ملاقاتی قافلہ کو ایک حافظ قرآن حافظ فخر احمد صاحب ابن مکرم منیر الدین احمد صاحب کی رفاقت اور معیت بھی حاصل تھی! یہ ننھے منے حافظ قرآن اپنے سعادت مند چہرہ اور معصوم کردار سے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ مجھ سے اس بات کا ذکر ایک 25 سالہ غیر از جماعت قیدی نے بھی کیا جو ڈیوڑھی میں ان سے ملے تھے۔ آج پہلی مرتبہ عزیزم خالد نے کچھ الفاظ سنائے۔ اللہ تعالیٰ اسے صاف اور پاک زبان کی صلاحیت عطا فرمائے، آمین۔ عزیزم طارق نے بھی بعض اشعار اور دعائیں سنائیں۔ الحمدللہ۔ ملاقات کے بعد اطلاع آئی کہ برادرم افضل صادق صاحب (چچا جان مکرم محمد اسحاق صاحب مرحوم کے بیٹے) بھی لاہور سے ملنے آئے تھے مگر لیٹ ہو گئے، جس وجہ سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ چنانچہ ان کا ارسال کردہ سامان مل گیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

27 مئی 1987ء کو ملاقات آئی تو دو لڑکے تھے جنہیں میں نے پہچانا ہی نہیں۔ چکی کھلنے پر بیٹھے اور ابتداء ہی میں اپنی اُلجھن انہیں بتادی۔ اس پر نسبتاً بڑے لڑکے نے بتایا کہ ناصر ہوں۔ تب مجھے یاد آ گیا اور تین چار سال کے عرصہ میں بدلا ہوا چہرہ شناسا لگنے لگا۔ یہ میرے پھوپھی زاد بھائی مکرم محمد لئیق صاحب کے بیٹے تھے اور ان کے ساتھ جو لڑکا تھا وہ میرے لئے واقعی نیا تھا۔ یہ خواجہ ارشاد احمد صاحب، انکم ٹیکس آفیسر کا بیٹا تھا۔ جو حال ہی میں ساہیوال تعینات ہو کر آئے ہیں۔ ان دونوں لڑکوں کا انداز بہت ہی مؤثر تھا۔ دیر تک دل اس ملاقات سے مسرور رہا۔ الحمدللہ عزیزم ناصر

انجینئرنگ یونیورسٹی کے سال اول کا طالب علم ہے، اللہ اسے اعلیٰ کامیابی عطا کرے اور الیکٹرونکس میں اسے اعلیٰ درجہ کا انجینئر بنائے۔ آمین۔ (موصوف اس وقت کینیڈا میں ایک بڑی فرم کے مالک ہیں جس کے دفاتر اور شاخیں متعدد ممالک میں ہیں)

## عید کے تحائف اور انوکھی ملاقات

اسیری میں تیسری عید الفطر 29 مئی 1987ء کے موقع پر حضور (رحمہ اللہ تعالیٰ) کا لندن سے آیا ہوا محبتوں بھرا اسلام اور مقوی عزم و ہمت پیغامِ روح افزا لے کر محترم محمد سلیم صاحب کارکن دفتر پرائیویٹ سیکرٹری آئے۔ موصوف حضور انور کے تحفوں کے ساتھ امریکہ سے بھائی جان کا بھجوایا ہوا ایک خوبصورت ریڈیو بھی ساتھ لائے۔ بھائی جان ادریس صاحب نے یہ ریڈیو کئی دن ہوئے بھجوایا تھا مگر عین عید کے موقع پر پہنچ کر اس نے عید کے تحفہ کی شکل اختیار کر لی جس سے بے حد خوشی ہوئی۔ یہ ریڈیو میری خواہش کے عین مطابق بلکہ کئی لحاظ خواہش سے بھی بہت بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے اور مجھے اس سے صحیح طور پر استفادہ کی توفیق بخشے، آمین۔ اس موقع پر مقامی احباب جماعت میں سے قائمقام امیر جماعت محترم میجر بشیر احمد صاحب کے ساتھ مکرم چوہدری عبدالرحیم مجاہد صاحب، مکرم ملک غلام احمد صاحب اور مکرم میاں محمد صادق صاحب (برادر حاذق رفیق صاحب) بھی تشریف لائے۔

اس عید کے روز بھی ہم نے عید منانے کے لئے بھرپور انتظامات کئے۔ خصوصی طور پر سویاں تیار کروائیں، وافر مقدار میں برف منگوا کر ٹھنڈے شربت اور پانی کا سارا دن انتظام رکھا، نماز عید پڑھنے کے لئے کنڈم وارڈ میں سب ساتھیوں کو بلایا اور اس کے بعد اپنے سیل میں سب ساتھیوں اور دوستوں کے ساتھ دیر تک محفل لگائی۔ جب سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے تو اپنے بستر پر لیٹ کر چشم تصور سے دنیا بھر میں اپنے لئے بے تاب اعزہ و اقارب اور دوست احباب سے لمبی ملاقاتیں کیں اور دن کے آخری لمحات کا بہترین مصرف اپنے پیارے آقا حضرت امیر المومنین (رحمہ اللہ تعالیٰ) کی خدمت میں خط لکھنے کو جانا۔ چنانچہ ڈوبتے سورج کے اُداس لمحوں کو حضور انور کی یاد سے بسالیا کہ حضور کی بے قراری اور بے چینی و اضطراب خون سے آنسوؤں میں سمٹ سمٹ کر قدرت کاملہ کے مالک رب کائنات کے حضور اِنما أشکو بثی و حزنی الی اللّٰہ کے مصداق بنی ہوگی اور قلب و جگر کو چیر کر رکھ دینے والی اس قسم کی صوتی اور جذباتی لہریں آپ کے دل و دماغ اور زبان اور آنکھوں سے پھوٹ رہی ہوں گی ؎

| | |
|---|---|
| دن چڑھا ہے دشمنانِ دیں کا ہم پر رات ہے | اے میرے سورج! نکل باہر کہ میں ہوں بے قرار |
| کچھ خبر لے تیرے کوچہ میں یہ کس کا شور ہے | خاک میں ہوگا یہ سر، گر تو نہ آیا بن کے یار |

11 اپریل 1987ء کو ہماری باقاعدہ ملاقات تھی اور حسبِ دستور و معمول سب سے پہلے بچوں کا قافلہ بلکہ ہراوَل دستہ، شوق کا پیکر بنے پیار اور محبت کی پیاس لئے بڑے شور کے ساتھ آیا۔ ہیرا، صائمہ (محترم رانا نعیم الدین صاحب کے بچے) پھر عزیزان عبدالعلیم (ابن ماموں عبدالحمید صاحب) اور طارق ایک دوسرے پر جھپٹتے، آگے بڑھ کر چمٹ گئے۔ اتنے میں دروازہ میں دیکھا کہ عزیزم خالد بھی ان کی دیکھا دیکھی اکیلا ہی دوڑا چلا آیا تھا مگر دروازہ کی نالی چھوٹی سی ہونے کے باوجود اس کے لئے عبور کرنی مشکل ہوئے جا رہی تھی، تاہم اس سے یہ دیکھا نہ گیا کہ وہ چند قدم صرف اس نالی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا ہے چنانچہ اس نے دیوار کو تھام کر اسے عبور کرنا چاہا مگر رونے کی آواز کے ساتھ ہی گھوم کر زمین پر گرنے لگا۔ میں نے بڑھ کر اُسے راستہ میں ہی تھام لیا اور وہ مچل کر میری گردن کے ساتھ چمٹ اور لپٹ گیا۔ مجھے یہ نظارے پیار اور محبت کی یہ کیفیت زندگی بھر یاد رہے گی۔ یہ یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ ان سے انسانی جذبوں کا جس شدت سے احساس ہوتا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ پھر باقی سب افراد بھی تشریف لے آئے۔ آج کی یہ ملاقات بین الملکی ہی نہیں بلکہ بین البراعظمی بھی تھی۔ براعظم افریقہ کے ملک کینیا سے برادرم محترم محمد اسلم ناصر صاحب (چچا اسحٰق صاحب کے بڑے بیٹے) آئے تھے۔ جو آسٹریلیا جاتے ہوئے ایک ہفتہ کے قیام پر تھے اور یورپ کے ملک ہالینڈ سے بھابھی نصرت کے بھائی عبدالحفیظ صاحب بھی اپنے ابا جان محترم چوہدری محمد طفیل صاحب ڈوگر (مرحوم) کے ہمراہ آئے تھے۔

عزیزم طارق نے تو آج کمال کر دیا۔ اس نے خوب نظمیں اور دعائیں سنائیں۔ ایک موقع پر وہ سناتے سناتے رک گیا جیسے اپنے ذہن پر زور دے رہا ہو۔ ابا جان اسے کبھی کہہ رہے تھے کہ فلاں شعر فلاں دعا، تو وہ خاموش تھا، بے چینی سی تھی۔ ایک موقع پر ابا جان نے جو 'اسلام سے نہ بھاگو......' کہا تو وہ چونک کر اور اچھل کر بولا یہی تو میں یاد کر رہا تھا، اس پر مجھے بہت پیار آیا اور دل سے دعا نکلی اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔ آج طارق کو سن کر ابا جان، آپا جان اور طاہرہ کی محنت کا بھی احساس ہوا جو اس کی تربیت کے لئے کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے اور ان دونوں معصوم بیٹوں کو بہت بلند نصیب بنائے اور طارق اور خالد یعنی اسم بامسمّٰی بنا دے، آمین۔

ملاقاتی ملاقات کر کے چلے گئے اور ہمیں اداس ہی نہیں فکر مند بھی کر گئے کیونکہ دن کا گرم ترین حصہ شروع ہو گیا تھا جس میں دھوپ کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ذرا سی دیر کے لئے بھی باہر نکلو تو بھیجا پگھل جائے۔ ایسے میں ہمارے ملاقاتیوں نے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے نہ صرف جیل کی ڈیوڑھی عبور کرنا تھی بلکہ کسی نے ربوہ تو کسی نے لاہور و

گوجرانوالہ سے پہنچنا تھا گویا اس شدت کی گرمی میں کئی کئی سو میل کا سفر طے کرنا تھا! اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اس نقطہ نظر سے ہم سوچتے تو نظر آتا کہ اصل سزا تو ہمارے لواحقین کو ملی ہوئی تھی جو ہر قسم کی پریشانیوں اور تکالیف کے ساتھ ساتھ اِس صعوبت سفری کے اِمتحان میں سے بھی گزرتے۔

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وساطت سے آپ کے غلاموں کو بھی لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ یعنی (نخوت سے) انسانوں کے لئے اپنے گال نہ پُھلا، کی خدائی ہدایت ہے۔ اِس لحاظ سے جب کثرت سے احباب تشریف لاتے تو بہت خوشی ہوتی اور خوشی کی یہ کیفیت اِس قدر بڑھ جاتی کہ فرطِ مسرّت سے قلب وذہن بے لگام گھوڑے کی طرح اِدھر اُدھر سرپٹ دوڑنے لگتے اور کسی سے بھی تسلی سے بات نہ ہو پاتی چنانچہ جب ملاقات ختم ہوتی تو تشنگی کا ہی اِحساس ہوتا لیکن دوسری طرف یہ مشکل مسئلہ تھا کہ پندرہ روز میں سرکاری طور پر صرف ایک دفعہ ہی ملاقات ہوسکتی تھی۔ اس لئے مضطرب اور بے قرار دوست احباب کی کوشش ہوتی کہ اس موقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھالیا جائے۔ اکثر دوست پہلی دفعہ مل رہے ہوتے اور یوں لگتا گویا جذبات کے سمندر ہوں۔ وہ بے حد خلوص، چاہت، اِنتہائی جوش اور بے پناہ شوق کے ساتھ ہمارے گلے لگ جاتے۔ اللہ تعالیٰ ان کے جذبات اور اخلاص کو قبول فرمائے، آمین۔ اُس روز شام تک ان دوستوں کی خوشگوار اور سہانی یاد میں وقت گزر جاتا۔

16 اگست 87ء

آج اگرچہ معمول کے مطابق ملاقات کا دن تھا اور میں نے اس کی تیاری بھی کر رکھی تھی مگر پرچہ آیا تو اس میں ہمارا نام ونشان نہ تھا۔ تاہم میں اِنتظار میں رہا اور آخری وقت جب اُمید ٹمٹمانے لگی تھی اچانک میرے دروازے پر آکر دو افراد کے رُکنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی مجھے کسی نے آواز دی یہ اُس وقت کا ہمارا اِنچارج تھا اور بھائی جان ظہور الدین صاحب بابر کو ساتھ لے کر آیا تھا۔ میں اُٹھا اور اِس اچانک ملاقات سے بہت خوش ہوا۔ بھائی جان اکیلے ہی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپ سابقہ اطلاع کے مطابق آج آگئے تھے جبکہ ملاقات کی تاریخ 16 کی بجائے 18 اگست کردی گئی تھی جس کا علم ہمیں بھی نہ تھا۔

بھائی جان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کی ایک تو وجہ یہ تھی کہ کافی عرصہ سے اپنی والدہ کی وجہ سے نہیں آسکے تھے۔ پھر اکیلے بیٹھ کر گھنٹہ بھر خوب گپ شپ ہوئی۔ کئی قسم کے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ بھائی جان نے بڑے پیار بھرے اور رقت بھرے انداز میں بتایا کہ اس سے پہلے بھائیوں کے لئے بہنوں کی محبت کے واقعات صرف سنے ہوئے تھے، عجیب وغریب داستانیں مشہور ہیں مگر اس تعلق اور اس محبت کا عملی نظارہ اب کرنے کا موقع ملا ہے تو یقین آیا

کہ وہ بھی سچے واقعات اور سچی داستانیں ہوں گی۔ پھر باجی کے متعلق بتانے لگے کہ وہ کس طرح مجھے یاد کرتی رہتی ہیں، ہر وقت انہیں میرا ہی خیال رہتا ہے نماز میں دعا کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

## غیر معمولی ملاقات

31 اگست 1987ء کا دن ڈھیر ساری خوشیاں دے کر گیا۔ آج اگرچہ حضرت بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے باعث مقامی تعطیل تھی لیکن اس امر کا ہمارے خالو جان مکرم محمود احمد خان صاحب آف لاہور کو علم نہ تھا چنانچہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق خالہ جان اور جملہ بچگان کو لے کر ملاقات کے لئے خصوصی کار کے ذریعہ لاہور سے تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ باجی اور عزیزہ ویمہ (ماموں عبدالمجید صاحب کی بیٹی) بھی تھیں۔ گویا گجرات، گوجرانولہ اور لاہور کے نمائندگان تھے۔ جیل کے سامنے پہنچ کر انہیں علم ہوا کہ آج تو تعطیل ہے تاہم یہ کچھ نہ کچھ انتظام بھی کر کے آئے تھے۔ موقع پر موجود افسر صاحب نے کہا کہ ان کے ساتھ چند اور قیدیوں کی بھی ملاقات کروادی جائے۔ چنانچہ ان سب کو بھی ملاقات کرنے کی اجازت مل گئی، یہ لوگ میرے پاس پہنچے تو خوب رونق ہوگئی۔ اسی ملاقات پر یہ خوشخبری ملی کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے بھائی جان کو بھی پہلی بیٹی (مصلحہ) عطا فرمائی ہے، الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ سات سال کے بعد اللہ کے اس فضل نے بے حد خوشی دی، الحمدللہ۔ علاوہ ازیں عزیزم احسن محمود نے میرے کہنے کے مطابق یاد رکھنے کی باتیں مکمل یاد کرلیں اور میں نے ایک دو جگہ سے پوچھا تو عزیز نے قریباً صحیح صحیح سنا دیا۔ اب باقاعدہ امتحان کے بعد اسے انعام بھی بھجواؤں گا۔ انشاء اللہ۔ اس سے بھی بہت خوشی ہوئی۔ عزیزم افتخار محمود نے بھی اسے یاد کرنا شروع کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے بھی توفیق دے، آمین۔

## استاذی المکرم قاری محمد عاشق صاحب

14 اکتوبر 84ء کو ملاقات ہوئی تو اُس روز سب سے زیادہ خوشی اُستاذی المکرم قاری محمد عاشق صاحب کے آنے کی ہوئی۔ موصوف سے میں نے درجہ ممہدہ جامعہ احمدیہ اور پھر درجہ سادسہ میں قرآن کریم ناظرہ پڑھا ہوا ہے۔ آپ نے ہمیں بڑی محبت و پیار اور شفقت سے قرآن کریم پڑھایا اور ہماری تصحیح کرائی۔ ان کا وجود جہاں بہت قیمتی ہے وہاں ہمارے لئے مشعل راہ اور قابل تقلید بھی ہے۔ انہوں نے حق و صداقت کو قبول کیا اور پھر ہزاروں کی آمد چھوڑ کر معمولی گزارہ الاؤنس پر قناعت کرتے ہوئے اپنے آپ کو مکمل طور پر وقف کر دیا۔ جس پر جامعہ احمدیہ کے زیر انتظام قائم مدرسۃ الحفظ کے مہتمم مقرر ہوئے جہاں سے ان کے سینکڑوں شاگرد حافظِ قرآن بن کر دُنیا بھر میں پھیل چکے ہیں۔ بہت

پیاری شخصیت کے مالک ہیں اور نہایت اخلاص اور محنت کے ساتھ قرآن کریم سکھانے والے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ان کا شمار خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ میں سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ میرے اس محترم شفیق اُستاد کو صحت و عافیت والی لمبی عمر عطا فرمائے اور آخر دم تک ان کے وجود اور فن سے احباب جماعت کو استفادہ کرنے کی توفیق و سعادت بخشتا رہے، آمین۔

11 نومبر 87ء

آج میرے لئے بہت خوشی کا دن تھا۔ صبح سویرے خواب میں دیکھا کہ برادرم مکرم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب ابن محترم مولوی غلام باری سیف صاحب میرے پاس گیٹ پر آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ باہر تمہاری ملاقات آئی ہوئی ہے مگر آنے نہیں دے رہے۔ یہ خواب اس طرح تو پورا نہیں ہوا البتہ ملاقات ضرور آئی اور اس میں پیارے احباب جماعت جن میں تین مربیان سلسلہ مکرم ہادی علی صاحب، مکرم مغفور احمد قمر صاحب اور مکرم طارق محمود صاحب جاوید اور مشیر قانونی صدر انجمن احمدیہ محترم مبارک احمد صاحب طاہر شامل تھے۔ مکرم ہادی علی صاحب انگلستان سے رخصت پر تشریف لائے تھے یعنی حضور کے پاس سے۔ انہیں ہجرت کے ایام میں حضور کی خصوصی خدمت کرنے کی سعادت اور توفیق نصیب ہوئی اور ان خدمات کی صورت میں سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا وہ کشف بھی پورا ہوا جو حضور نے 1900ء میں دیکھا تھا کہ آپ علیہ السلام نے ایک مخالف کی کتاب کو دھویا اور اس دھونے کے لئے ایک شخص نے پانی ڈالا تھا۔ اس کشف کی نشاندہی حکومت پاکستان کی طرف سے شائع کئے گئے قرطاسِ ابیض کے جواب میں حضور رحمہ اللہ کے خطبات سننے کے بعد امیر صاحب جماعت احمدیہ ضلع سیالکوٹ نے کی اور اس حوالہ سے حضور رحمہ اللہ نے اس کو اپنے ایک خطبہ جمعہ میں بیان فرمایا اور اس کشف کو اس صورت حال پر پوری طرح چسپاں کیا۔ الحمدللہ۔

### ملاقات، قیدی کا سہارا

جیل کا محاورہ ہے کہ عام قیدی کی قید کٹتی ہے معافی کے ذریعہ اور سزائے موت کے قیدی کا وقت گزرتا ہے ملاقات کے سہارے! سزائے موت کا قیدی ایسی سوچ اور آس کے سہارے وقت کو لمحہ لمحہ دھکا دیتا رہتا ہے کہ اگلے ہفتہ ملاقات آئے گی، چار دن بعد ملاقات ہوگی، پرسوں ہوگی اور پھر کل کے بعد اس کی ملاقات کا دن، اس کی امیدوں اور تمناؤں کا لمحہ آن پہنچتا ہے اور وہ قیدی جو کئی روز سے اپنی متوقع خوشیوں کو سمیٹنے میں مصروف ہوتا ہے، اپنے عزیز و اقارب، اپنے دوست احباب کو اپنے سامنے پا کر خوشی سے پھولے نہیں سماتا اور بعض اوقات وفورِ جذبات سے اسے اپنے اعصاب پر پوری طرح قابو بھی نہیں رہتا۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے، اس کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں تو دل شاد

ہو کر زور زور سے دھڑ کنے لگتا ہے اور اُسے کچھ سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا کیا باتیں کرے۔ اُسے ہفتہ عشرہ کی وہ تمام باتیں یاد ہی نہیں رہتیں جو اس نے ملاقات کے موقع کے لئے جمع کر رکھی تھیں۔ غرضیکہ قیدی کے دل و دماغ، اس کے جسم و روح حتی کہ ماحول تک میں ایک شدید ہنگامہ سا بپا ہو جاتا ہے اور اس خوشگوار ہنگامہ میں ایک کرخت سی آواز سناٹا طاری کر دیتی ہے کہ "بس! وقت ختم ہو گیا"۔ اس پر اپنے پیاروں کی دید کو ترستی آنکھیں، تشنگی کے ساتھ دیکھتی رہ جاتی ہیں، ان کا پیچھا بھی کرتی ہیں مگر مضبوط آہنی سلاخوں کے پار چند میٹر کے فاصلہ تک پہنچ کر دن کی روشنی کے باوجود تاریکی میں ڈوب جاتی، وقت اور فاصلہ کی ریت میں دھنس کر رہ جاتی ہیں اور قیدی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اگلی ملاقات تک بے شمار تفکرات، مسموم خیالات اور خوفناک حالات کے سمندر کے سپرد کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنے وجود، اپنی ذہنی صلاحیتوں اور جسمانی قویٰ کو گھول گھول کر اُس ماحول، اُس سمندر کو اور بھی کڑوا اور بھی تلخ کرنے لگتا ہے۔

کچھ روز تک اِس ملاقات کی یاد باقی رہتی ہے اور جدائی کی تمام تر تلخیوں کے باوجود کچھ نہ کچھ خوشگوار اثر بھی قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے اگلی ملاقات کا شوق اور انتظار شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے قید کی ایک اور اکائی مکمل ہوتی ہے اور ایک ایک دن کی اکائی مہینوں، چھ مہینوں اور سالوں میں ڈھلنے لگتی ہے اور ساتھ ساتھ گبھرو جوانوں کے خوبرو اور بھرے پُرے جسم ہڈیوں کے ڈھانچوں میں ڈھلنے لگتے ہیں لیکن اِن ڈھانچوں میں اس حد تک زندگی کی رمق باقی رہتی ہے کہ یہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اُمید اور آس کے سہارے ان کا عزم بھی جوان ہوتا ہے۔ ان میں جہادِ زندگی کی خواہش اور تمنا کی جھلک بھی روشن ہوتی ہے اور میرے تجزیہ کے مطابق اس جوان عزم، اس حال میں بھی زندگی کی جھلک اور زندہ رہنے کی خواہش اور تمنا کا سبب قید کی یہی بنیادی اکائی ہے جسے "ملاقات" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یوں تو بہت سے قیدیوں کی ملاقات پر دوست اور دیگر تعلق والے بھی آتے ہیں مگر بچوں کی ملاقات کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اِس ملاقات کی خوشی میں ایک خمار سا ہوتا ہے۔ کچھ اس لئے کہ اس کا پندرہ دن سے انتظار ہوتا ہے اور ہر کسی کو اس کا شوق ہوتا ہے، بے چین شوق اور بے قرار کر دینے والا انتظار!

## آدھی ملاقات خطوط کے ذریعہ

جن احباب کے لئے جیل پہنچ کر ہم سے ملاقات کرنا ممکن نہ تھا وہ خطوط کے سہارے پہنچ جاتے اور ہم سے آدھی ملاقات ہی کر لیتے۔ ایسے خطوط میں سب سے بڑھ کر تو پیارے آقا کے خطوط ہوتے جن کی ایک الگ تفصیل بیان ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں کتنے ہی احباب تھے جنہوں نے ہمیں باقاعدگی سے خط لکھنا اپنے اوپر گویا فرض کر لیا ہوا تھا۔ ان کے خطوط ڈاک کے ذریعہ بھی ملتے اور ملاقات پر آنے والوں کے ہاتھ بھی آتے۔ جیل میں ڈاک متعلقہ افسران

پڑھنے کے بعد ہی قیدیوں کو دیتے ہیں مگر مجھے آنے والے مسلسل خطوط کھولنے کے بغیر ہی ملنے لگے تھے کہ متعلقہ افسر لکھائی دیکھ کر ہی سمجھ جاتے کہ یہ کس کا خط ہے اور اس میں کیا لکھا ہوگا۔ اس مضمون کے حوالہ سے میری یادداشتوں میں جو کچھ ملا، ہدیہ قارئین ہے:

آج 27 جنوری 87ء کی ڈاک میں بھائی جان کے خط کے علاوہ میرے قدیمی بزرگ محترم حسن محمد خان صاحب عارف کا خط بھی شامل تھا جنہوں نے ابتداء سے ہی ہماری تربیت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اسی طرح ان کے بیٹے اور خاکسار کے بچپن کے دوست برادرم نصیر احمد خاں عارف (کاکو) کا خط بھی آیا۔ ان سب کے خطوط ہمیشہ بڑی سادگی سے میرے ماضی کے ساز کو چھیڑا کرتے۔ خلوص اور اپنائیت کے جذبہ سے لکھے ہوئے ان کے خطوط ہمیشہ ہی میرے لئے حوصلہ افزائی کا باعث ہوتے، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

ان کے علاوہ محترم ہدایت اللہ صاحب ہیوبش (Hübsch) آف جرمنی اور ان کی بیٹی عزیزہ عطیۃ النور کے خطوط اور محترم ہیوبش صاحب کی انگریزی نظم بھی شامل تھی۔ ان کے خطوط بڑے دلچسپ تھے، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے، آمین۔ یہ دوست سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت اور جماعت احمدیہ کی حقانیت کا روشن نشان ہیں۔ یہ بھی ان سفید پرندوں میں سے ہیں جنہیں سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے رؤیا میں لندن میں خطاب کرتے ہوئے پکڑا تھا۔ اللہ انہیں زیادہ سے زیادہ خدمت دین کی توفیق بخشے اور اپنے نیک نمونہ سے بہتوں کی ہدایت کا باعث ہوں، آمین۔

## لاہور سے محترم عبدالرحمان خان صاحب کا خط

یوں تو بزرگوں اور عزیزوں دوستوں کے خطوط مختلف ذرائع سے ملتے رہتے مگر 11 فروری 1987ء کی ڈاک میں ایک خط جو لاہور سے روانہ ہوا تھا، نامعلوم کہاں کہاں سے ہوتا ہوا مجھ تک پہنچا، کھول کر دیکھا تو یہ خط محترم عبدالرحمٰن خان صاحب کا تھا۔ یہ ساہیوال کے ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ ساری عمر گوگیرہ صدر میں 'قانون گو' رہے تھے اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی گوگیرہ ہوتے تو کبھی ساہیوال آجاتے۔ یہاں کے اکثر بچے انہی سے قرآن کریم پڑھے ہوئے تھے اس لئے ہر گھر میں ایک فردِ خاندان کی طرح آتے جاتے تھے۔ میرے قیامِ ساہیوال کے دوران جب موصوف وہاں آتے تو میرے ساتھ بھی بے حد شفقت فرماتے اور یہ تعلق اسیری کے دوران اور بھی پختہ ہوگیا۔ چنانچہ آج جو اُن کا خط ملا تو اُسے پڑھ کر میرے جذبات کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ مجھے محترم خان صاحب کی مالی حالت کا بخوبی علم تھا۔ جس نے ساری عمر دیانتداری کے ساتھ ملازمت کی ہو، اُس کے پاس مادی طور پر کیا ہوسکتا ہے۔ پھر 70 سال کی عمر میں

ایک بیمار، ضعیف اور مضمحل شخص کی کیا طاقت ہوگی لیکن اس سب کچھ کے باوجود ان کے سینہ میں ایک ایسا دھڑکتا ہوا دِل تھا جس نے کبھی سلسلہ خط وکتابت منقطع نہ ہونے دیا حتی کہ ایک سال پہلے ان کی بصارت بھی قریبا ختم ہو چکی تھی مگر ٹیڑھا میڑھا جیسے بھی ممکن ہوا، انہوں نے مجھے خط ضرور لکھا۔ میرا ہی نہیں میرے بچوں کا بھی مسلسل خیال رکھتے، مجھے ایک مرتبہ لکھا کہ

'دِلی خواہش ہے کہ وہ مسبّب الاسباب سابق کی طرح ساہیوال یا جہاں اوسکو منظور ہو برخورداروں کے ساتھ کچھ دِن گزارنے کا موقع نصیب ہو۔ میں اپنی خصوصی نمازوں میں دعا گو ہوں، منظور کرنا نہ کرنا اوسکا اختیار ہے'

اِن فقرات پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ الفاظ خود بول رہے ہیں، مشک آنست کہ خود ببوید۔ لیکن اس خط کے آخر پر جو الفاظ انہوں نے لکھے انہوں نے جسم وجاں کو لرزا کے رکھ دیا۔ آپ نے لکھا:

'اگر آپ منظور فرماویں تو =/100 یک صد روپیہ ماہوار پیش کرسکتا ہوں۔

اگر ایسا ہو جاوے، بے حد خوشی ہوگی! میں یہ قسمیہ عرض کرتا ہوں'

اور ایک بار تو آپ نے یہاں تک لکھا کہ میرے پاس 459 روپے موجود ہیں، مجھے خوشی ہوگی کہ آپ کے یا آپ کے بچوں کے کسی کام آجائیں۔ اللہ اللہ! خود معلوم نہیں کیسے گزارہ کر رہے ہیں مگر سچے خلوص اور حقیقی پیار میں ڈوب کر کتنی عظیم پیش کش کی ہے۔ اس پیش کش کو اس کی مادی شکل میں وصول کرنے کا تو سوال نہیں تھا، اصل بات جذبات کے اِس سمندر میں غوطہ لگا کر اس کی گہرائی معلوم کرنے کی تھی مگر اِسے تو کبھی معلوم کیا ہی نہیں جاسکتا، ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ میرے اس بزرگ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے کہ ہماری راہیں تکتے تکتے مدت ہوئی اللہ کو پیارے ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تفصیل لکھنے سے میرا مقصد جہاں محترم عبدالرحمٰن خان صاحب کے لئے دعا کی تحریک ہے وہاں آپ ایسے لاکھوں پیاروں کے مقدس جذبات کی ترجمانی بھی ہے۔ یہ ساری کیفیت محض جذباتی کیفیت نہیں۔ منٹ دو منٹ میں تحلیل ہو جانے والی خوشی نہیں بلکہ یہ تو ٹھوس اور پائیدار حقیقت کی حامل کیفیت ہے۔ ہاں باہمی اُخوت ومحبت کی وہی کیفیت جسے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنی جماعت میں پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس اعتبار سے اِسے بجا طور آپ علیہ السلام کی صداقت کی نا قابل تردید دلیل اور مہتم بالشان عظیم نشان قرار دیا جاسکتا ہے۔ اُن کی اور اُن جیسے لاکھوں پیاروں کی لاکھوں آنکھوں سے ہر روز نہ جانے کتنے موتی درگہ رب کریم میں نذرانہ دعا پیش کرتے ہوں گے۔ مجھے تو اس سارے

ماحول اور ساری کیفیت میں اپنے پیارے آقا رحمہ اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ جو آپ نے میرے نام اپنے ایک پیار بھرے خط میں تحریر فرمائے، گونجتے ہوئے سنائی دے رہے ہیں:

''تم خاک بسر تھے، میرے مولا کی رضا نے تمہیں عرش نشیں بنا دیا، مسیح کی غلامی میں تم بھی زمین کے کناروں تک شہرت پا گئے۔ آج ایک کروڑ احمدیوں کے دھڑکتے ہوئے دل تمہیں دعائیں دے رہے ہیں اور دو کروڑ غمناک آنکھیں تم پر محبت اور رشک کے موتی نچھاور کر رہی ہیں۔ میرا دِل بھی ان دِلوں میں شامل ہے میری یہ آنکھیں بھی ان آنکھوں میں گھل مل گئی ہیں۔''[1]

دو خط

13 ستمبر 87ء کو ایک خط آیا جس نے بہت ہی لطف دیا۔ بہت ہی روحانی خوشی کا موجب ہوا کیونکہ وہ ایک بہت ہی محبت کرنے والی شخصیت، حضرت چھوٹی آپا صاحبہ کے بھائی محترم سید محمد احمد صاحب نے لکھا تھا یہ خط انہوں نے اپنے امریکہ کے سفر کے دوران بڑی محبت اور شفقت سے لکھا تھا اور اس میں ازراہِ ذرہ نوازی بے حد پیار کے ساتھ اپنے اس سفرِ مغرب کی تفصیلات لکھی تھیں اور یہ سب اُمور میرے جیسے حقیر انسان کے لئے بہت زیادہ فخر اور خوشی کا باعث تھے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو جزائے خیر سے نوازے اور ہر طرح کے شر سے محفوظ رکھے۔ ہر طرح کی پریشانیوں سے نجات دے، آمین۔

شام کے وقت ایک ایسا خط میرے میز پر پڑا تھا جس نے بہت زیادہ افسردہ اور غمزدہ اور غمگین کیا۔ وہ خط ایک ایسے شخص کا تھا جو ایک دو روز میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر جائے گا یعنی اسے پھانسی دے دی جائے گی وہ خط لکھنے والا ساہیوال جیل میں ایک لمبا عرصہ گزار کر لاہور جیل منتقل ہو جانے والا شفیع احمد ناگی (غیر احمدی) ہے۔ میرے سزائے موت وارڈ میں آنے کے وقت وہ یہاں ہوا کرتا تھا اور لاوارثی کی زندگی گزار رہا تھا کیونکہ اس کا جرم بہت بھیانک اور سخت ناقابلِ معافی تھا یعنی اپنی ماں کا قتل! مگر ایک انسان ہونے کے ناطہ وہ بھی اُس وقت جبکہ وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ رہا تھا، دل میں جذبات کا طوفان سا برپا کر گیا یعنی ایک طرف اس کے جرم سے انتہائی نفرت اور دوسری طرف اس لاوارث انسان سے ہمدردی کا جذبہ! اس نے یہ خط منشی سے لکھوا کر بھجوایا۔ اس میں اس نے بڑی ہی جرأت اور ہمت کے ساتھ بعض فقرات لکھے اور کہا کہ میرا یہ آخری خط ہے۔ میرا سب دوستوں اور جاننے والوں کو سلام کہہ دیں اور اب بروزِ محشر پھر ملاقات ہوگی۔

---

[1] مکتوب 31 مارچ 1986ء

مصنف کتاب اپنے والد محترم مولانا محمد اسماعیل منیر صاحب کے ساتھ

# تین بھائی

دائیں طرف مکرم ماسٹر محمد ابراہیم صاحب درویش، مکرم ماسٹر عبد السلام صاحب اور کھڑے مکرم محمد اسماعیل منیر صاحب

دائیں سے بائیں: خاکسار محمد الیاس منیر، مکرم محمد داؤد منیر صاحب، مکرم ڈاکٹر محمد ادریس منیر صاحب

مصنف کتاب کے سسر مکرم محمد شفیق صاحب، ریٹائرڈ ٹیکنیشن PAF
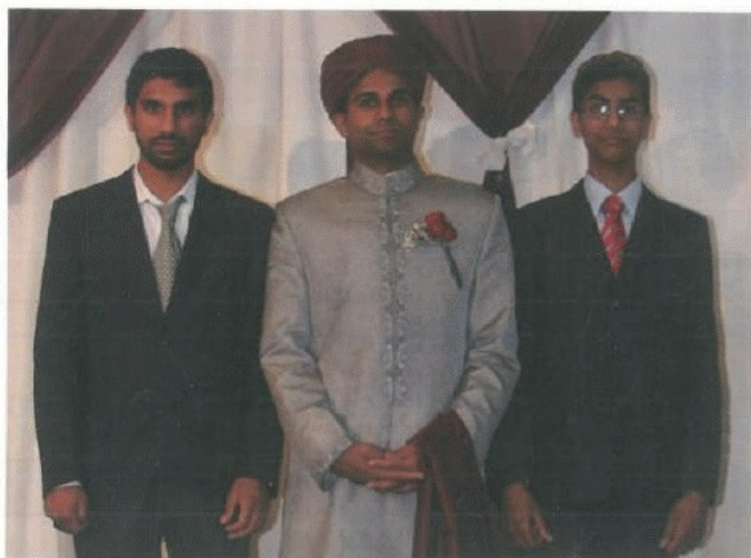
عزیزان رستگار احمد، طارق الیاس منیر، خالد الیاس مٹھر

ابا جان مرحوم نے دس سال تک مصنف کتاب کے بچوں کی پرورش کے لئے بے پناہ محنت کی

اُس وقت انسان کی کیا حالت ہوتی ہوگی، اس کے کیا خیالات ہوتے ہوں گے اور اُس کے جذبات اور احساسات کی تصویر کشی کیونکر ہوسکتی ہے! ہر چند کہ اس قسم کے تجربہ سے ہم بھی گزر چکے ہیں مگر بہت ہی بڑے فرق کے ساتھ! یہ لوگ تو ایسی حالت میں اپنے آپ کو، اپنے ضمیر کو کوستے ہوں گے، سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہوں گے، موت کے خوفناک پنجوں سے ڈر ڈر کر اپنا خون خشک کرتے ہوں گے مگر ہم نے اس مرحلہ کو بڑے اطمینان اور سکون سے طے کیا تھا۔ ہمارا ضمیر مطمئن تھا، ہمارا ذہن پر سکون تھا اور ہم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے کھیلتے رہے تھے۔ اس طرح سے ایک بھرپور، مفید اور اعلیٰ روحانی تجربہ اور اس کے ثمرات کے ساتھ ہم اس حالت سے باہر نکلے تھے، الحمد للہ۔ بہر حال میں آج کے دن کے آخری لمحات کو اس پرانے ساتھی کے لئے وقف کرتا ہوں جس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مجھ سے دعائے مغفرت کرنے کی خواہش کی۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے اور اس کے لئے اس دنیا کی یہ دس بارہ سالہ سخت اذیت ناک سزا ہی اس کے لئے کفایت کر جائے، آمین۔

# پیارے آقا کے پیارے خطوط

حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسیرانِ راہ مولیٰ اور اُن کے عزیزان کے نام اِن دس سالوں میں سینکڑوں خطوط بھجوائے جن میں سے درجنوں اپنے ہاتھ سے بھی لکھے۔ پیارے آقا کے یہ خطوط ہمارے لئے ایک عظیم سرمایہ ہیں اور ہم اس سرمایہ کے ملنے پر خدا تعالیٰ کا جتنا بھی شکر کریں کم ہے یہ خطوط محض شفقت و پیار کا مرقع ہی نہیں، اردو ادب میں بھی ایک بیش بہا اضافہ ہیں اور تصوف و معرفت کے گہرے نکات بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور جب حضور کے خطوط ہمیں ملتے تو قلب و روح اور دل و دماغ کے علاوہ جسم میں بھی بے پناہ قوت اور توانائی کا احساس ہوتا۔ اُن میں سے حضورؒ کے دست مبارک سے رقم فرمودہ خطوط تو اس سے پہلے پیش کیے جا چکے ہیں۔ ذیل میں اُن خطوط کا مضمون درج کیا جاتا ہے جن پر پیارے آقا نے اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ ان خطوط کے مطالعہ یہ امر بھی سامنے آتا ہے کہ حضورؒ نے ہمیں حوصلہ دینے کے ساتھ ساتھ ہماری تربیت بھی فرمائی اور ہر مرحلہ پر سمجھایا کہ کس مومنانہ شان کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔

مکتوب نمبر:1 محررہ: 15.11.84

پیارے برادرم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا، ساہیوال میں عزیزم الیاس منیر اور دوسرے احمدیوں کو خدا اور اس کے پیارے نبی ﷺ کی عزت کو قائم کرنے کے جرم میں دشمنوں نے قید میں ڈالا ہے۔ یقیناً یہ قید ہزاروں آزادیوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ معجزانہ رنگ میں میرے پیاروں کو باعزت بری فرمائے اور دشمن اپنے ناپاک عزائم میں ناکام ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کو عزم و ہمت اور صبر و استقلال سے یہ دور پار کرنے کی توفیق دے۔ میری ساری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ عزیزم الیاس منیر اور اس کی اہلیہ کو میری طرف سے تسلی دیں اور پیار بھرا سلام اور بچوں کو پیار۔ اللہ انہیں اپنی حفاظت میں رکھے۔ والسلام

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع

مکتوب نمبر:2 محررہ:13.5.85

برادرم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خطوط موصول ہوئے جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ اللہ تعالیٰ کی صبر ورضا کی راہوں پر چلائے اور آپ کے بیٹے کی قربانیاں رنگ لائیں۔ آپ جیسے والدین اور آپ کے بیٹے جیسے جوانمرد جماعت احمدیہ کیلئے ہمیشہ فخر کا باعث رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ تمام اہل خانہ کا حامی وناصر ہو اور پیارے عزیزم الیاس منیر کے بچوں کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔

مکتوب نمبر: 3 محررہ:10.7.85

برادرم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خطوط مورخہ 24 جون وکیم جولائی موصول ہوئے۔ آپ نے ماشاء اللہ خوب حالات سے آگاہ رکھا ہوا ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء اللہ تعالیٰ آپ کی متضرعانہ دعاؤں کو قبولیت کا شرف عطا کرے اور عزیزم الیاس اور اس کے ساتھی خیریت سے واپس آئیں خوابوں کی تعبیر ان کے اور سلسلہ کے حق میں ظاہر ہو اور احمدیت کو ترقی نصیب ہو اور لوگ احمدیت کے حقیقی نور سے اپنے گھروں کو روشن کریں۔ میں اپنے اللہ کے حضور مسلسل دعائیں کر رہا ہوں۔ ساہیوال جماعت میرے لئے قابل فخر ہے۔ انہوں نے بہت عمدہ نمونہ صبر وتحمل کا دکھایا ہے۔

مکتوب نمبر: 4 محررہ:24.3.86

برادرم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے پر خلوص خطوط مورخہ 18,20 فروری موصول ہوئے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ۔ آپ نے میرا خطبہ جمعہ سن لیا ہوگا۔ جن خاندانوں سے قربانی لی جارہی ہے ان میں خدا تعالیٰ نے خاص خوبی دیکھی ہے۔ عظیم الشان ابتلاء دیکھنے بھی سعادت مندوں کو ہی نصیب ہوتے ہیں۔ فکر نہ کریں دشمن کو ان ظلموں کا نتیجہ دیکھنا ہوگا۔ خوش نصیب ہیں وہ جو خدا کی راہ میں صعوبتیں اٹھاتے اور دکھ پاتے ہیں۔ عزیزم اور اس کے بیوی بچوں کو میرا خاص طور پر محبت بھرا اسلام دیں۔ الحمد للہ ساری جماعت دعاؤں میں مصروف ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

مکتوب نمبر: 5 محررہ: 30.3.86

پیاری عزیزہ طاہرہ الیاس سلمہا اللہ تعالیٰ          السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کو اللہ تعالیٰ نے جس عظیم الشان ابتلاء سے گذرنے کی سعادت اور ہمت بخشی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر اور قابل تحسین ہے۔ خدا تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے آپ نے بہت عمدہ نمونہ دکھایا ہے۔ اللہ اس کا بہترین بدلہ دے اور آپ کی تکلیف کو معجزانہ رنگ میں دور فرمائے آپ کا دکھ ساری جماعت کا دکھ ہے اس لئے تسلی رکھیں۔

عزیزہ فائزہ نے بھی لکھا ہے اور آپ کی بہت تعریف کی ہے آپ کی ہمت پر رشک آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے لازوال فضلوں سے نوازے تدبیر سے بڑھ کر دعاؤں کی طرف توجہ ہے۔ خدا کی تقدیر سے راضی رہیں گے جب تک آسمانی فیصلہ ظاہر نہیں ہوتا اس وقت تک کسی قسم کی نا امیدی میں مبتلاء نہیں ہونا۔ بچوں کو میرا بہت پیار دیں تمام عزیزوں کو میرا محبت بھرا سلام دیں۔

مکتوب نمبر: 6 محررہ: 03.03.86

پیاری عزیزہ ناصرہ پروین          السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا پر خلوص خط محررہ 11 مارچ موصول ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے خاندان کو بہت بڑا اعزاز بخشا ہے اور کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ الحمدللہ

مکتوب نمبر: 7 محررہ: 26.02.93

پیاری عزیزہ ناصرہ پروین          السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

.........آپ نے اپنے بھائی عزیزم الیاس کے بارہ میں جن پر خلوص جذبات کا اظہار کیا ہے خدا ان کو جلد پورا فرمائے اور ایسی صورت نکل آئے کہ آپ سب کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اب تو مجھے بھی اپنے یوسف کی تھوڑی تھوڑی خوشبو آنے لگی ہے اور اب اس کی رہائی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ خدا ایسا ہی کرے۔ گھر میں سب کو محبت بھرا سلام بچوں کو پیار

مکتوب نمبر:8 محررہ: 08.04.86

پیارے عزیزان نعیم الدین صاحب محمد الیاس منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عظیم الشان ابتلاء کی عظمت آپ اور آپ جیسے دوسرے قابل فخر وجودوں سے ہے۔ آپ کے خطوط میرے لئے قابل رشک ہیں اللہ تعالیٰ کا مقرب بننے کیلئے ہر ایذاء رسانی سہل ہو جاتی ہے۔ خدا کے بندے جو پہلے وقتوں میں دار پہ گئے تھے ان کی روحیں مطمئن تھیں اور جسموں نے درد کے لطف لئے تھے۔ مجھے آپ دونوں پر فخر ہے۔ ہم ظاہری تدابیر کے علاوہ دعاؤں کے ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ ساری جماعت دعا گو ہے۔ میرا دھیان آپ کی طرف رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے اور دشمن کو منصوبہ پورا نہ کرنے دے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ آمین۔

مکتوب نمبر:9 محررہ: 01.05.85

برادرم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے دو خطوط محررہ 21,23/اپریل موصول ہوئے جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ خدا تعالیٰ معجزانہ رنگ میں مدد فرمائے اور ان دونوں کے غموں کو خوشیوں میں بدل دے۔ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر خوش ہیں جس رنگ میں بھی ظاہر ہو۔ مجھے ان پیاروں کا خیال ہی رہتا ہے اور دعا کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ دشمن کے شر سے بچائے۔

یہاں چینل فور پر 8 منٹ کا پروگرام دکھایا گیا۔ آپ نے جو نکتہ بیان کیا وہ پسند کیا گیا۔ اسیران کو بھی دکھایا گیا۔ سب سے پہلے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصویر دکھائی گئی۔ بڑے عمدہ طریقہ سے انہوں نے پروگرام ترتیب دیا اور دکھایا۔ 7:30 شام گھر گھر میں یہ پروگرام دیکھا گیا۔ اللہ کا فضل ہے تبلیغ کی نئی نئی راہیں عطاء ہو رہی ہیں۔

مکتوب نمبر:10 محررہ: 28.05.85

عزیزم محمد الیاس منیر صاحب و نعیم الدین صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

زندگی کی پرسکون کوٹھڑی کو آپ کے وجودوں نے جو شرف اور مرتبہ بخشا گیا ہے اور آپ نے خدا کو یاد کر کر کے جس طرح اس کو رونق بخشی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اللہ اپنے لطف و کرم کی بارشیں نازل فرمائے۔

ساری جماعت کی دعاؤں کو قبول فرما کر عید کا سماں پیدا کر دے۔ آپ کے ابا اور اہلیہ کے خطوط آتے رہتے ہیں۔ سب ہی برابر کے شریک ہیں۔ ثواب کمانے میں کوئی بھی پیچھے نہیں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ تمام ساتھیوں کو میرا محبت بھرا اسلام کہہ دیں اور عید مبارک کُلّ عامٍ و انتم بخیر۔

مکتوب نمبر:11 محررہ: 11.11.86

پیارے عزیزم محمد الیاس منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ اور عزیزم نعیم الدین کے خطوط موصول ہوئے یہاں پر جو فضلوں کی بارشیں ہو رہی ہیں ان میں آپ کی قربانیوں کا بڑا دخل ہے۔ یہ بالواسطہ پھل ہے۔ آپ لوگوں کی جو عمر عزیز ہے ہرگز اس کا لمحہ بھی ضائع نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ جو اجر عطا فرمائے گا وہ لامتناہی ہوں گے اس کے مقابل پر تکلیف کچھ بھی نہیں ہوگی۔

سب ساتھیوں کو میرا محبت بھرا اسلام کہہ دیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے بچوں کو خیریت سے پروان چڑھائے۔ عزیزم نعیم الدین کو خاص طور پر محبت بھرا اسلام کہہ دیں۔

مکتوب نمبر:12 محررہ:12.06.90

عزیزم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خطوط موصول ہوئے۔ اللہ تعالیٰ عزیزم الیاس کو صحت دے فکر نہ کریں انشاء اللہ مجھے تو یقین ہے کہ انشاء اللہ میری رؤیا ضرور پوری ہوگی۔ پہلا مرحلہ جب اعجازی طور پر پورا ہوگیا تو دوسرا بھی انشاء اللہ پورا ہوگا۔ میری طرف سے عزیزم کو تسلی دیں اور محبت بھرا اسلام دیں اس کے بچوں کو پیار اور بیگم کو سلام دیں۔ اللہ تعالیٰ حامی وناصر ہو۔

مکتوب نمبر:13 محررہ:07.12.90

عزیزم محمد الیاس منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خطوط موصول ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے فضلوں سے نوازے۔ دین ودنیا کی حسنات عطا کرے۔ امتحان میں غیر معمولی نمایاں کامیابی عطا فرمائے اور دشمن کے ہر بد ارادے اور اس کے شر سے

ہمیشہ آپ کو اپنی حفاظت اور رحمت کے سائے تلے رکھے۔ اللہ کے فضل سے تقدیر کی چکی چل پڑی ہے اور دشمن کی تدبیریں اُسی پر اُلٹ رہی ہیں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ انشاء اللہ آپ پر اور دیگر احمدی بھائیوں پر ظلم کرنے والے ظالم بھی عنقریب اس چکی کی زد میں آئیں گے اور پھر کوئی ان کو بچا نہ سکے گا۔ خدا انہیں سمجھ و ہدایت دے کر توبہ کی توفیق دے دے، ہماری تو یہی دعا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اپنی کرتوتوں سے باز نہ آنا انہیں عبرتناک انجام تک پہنچا کر ہی دم لے گا۔ اللہ آپ کو جلد سچی اور حقیقی آزادی عطا فرمائے اور آپ کی رستگاری فرمائے۔ خدا حافظ و ناصر ہو۔

مکتوب نمبر:14 محررہ:22.01.91

عزیزم محمد الیاس منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا اللہ تعالیٰ جلد رہائی کا سامان پیدا فرمائے اور راحت وسکون عطا کرے اور اس طویل صبر آزما قربانی کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور بچے بھی نیک تربیت پائیں۔

آپ کے والد صاحب کا خط بھی آیا ہے۔ ان کی مساعی قابل قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوشش کو بارآور کرے۔ انہوں نے تو کافی اچھی خبر سنائی ہے۔ امتحان میں کامیابی کی بھی مبارک ہو۔

مکتوب نمبر:15 محررہ: 17.02.91

پیارے محترم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط موصول ہوا۔ مجھے بھائی مظفر صاحب سے رپورٹ ملی ہے۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت خوشکن ہے مگر اسے کہیں ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل فیصلہ تو آسمان پر ظاہر ہونا ہے جب وہاں فیصلہ ہو جائے گا تو نتائج خود بخود سامنے آنے لگیں گے اللہ تعالیٰ آپ کی پریشانی کو خوشی میں بدل دے۔ گھر میں سب کو سلام دیں اور بچوں کو پیار۔

مکتوب نمبر:16 محررہ: 02.04.91

پیارے محترم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خطوط موصول ہوئے عزیزم الیاس کے خطوط بھی ملے۔ ماشاء اللہ بڑی ہمت اور استقلال کے

ساتھ حالات کا مقابلہ کر رہا ہے اور آپ بھی اسی روح اور جذبہ سے وقت کاٹ رہے ہیں، مجھے آپ اور دیگر اسیران راہ مولیٰ اور ان کے لواحقین سے دلی ہمدردی ہے۔ رمضان میں خاص دعا کی توفیق پا رہا ہوں ناراضگی کا تو کوئی سوال ہی نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ایک لمبے عرصے تک اپنے معصوم بچے سے جدائی اور اس کے درد کو دیکھنا کوئی معمولی بات نہیں بے اختیاری ہے ورنہ ساری جماعت ان کے درد کو محسوس کرتی اور دعائیں کر رہی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ دعائیں کس رنگ میں مقبول ہوں گی دعا اور صبر کی ہی تلقین کر سکتا ہوں جس سے اللہ کے فضل کو جذب کیا جا سکتا ہے۔ اللہ آپ کے ساتھ ہو۔

عزیزم الیاس کے بچوں کو میرا پیار دیں اور ان کی بیگم اور دوسرے عزیزوں کو سلام دیں اور سب کو عید مبارک کا پیغام

مکتوب نمبر:17 محررہ: 11.10.91

پیارے عزیزم محمد الیاس منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا ہمیشہ کی طرح بڑا پر خلوص اور بلند حوصلوں اور ولولوں پر مشتمل خط ملا ہے۔ اسے پڑھ کر آپ سب اسیران راہ مولیٰ کیلئے دل کی گہرائی سے دعائیں نکلتی ہیں۔ دعا تو میں اکثر کرتا رہتا ہوں اور میری تمنا ہے کہ خدا جلد تر اس اسیری کے دور کو ختم کر دے لیکن خدا کی رضا تو ہر بات پر مقدم ہے۔ اللہ آپ کو دین و دنیا کی حسنات سے نوازے اور سب نیک مرادیں پوری فرمائے۔ خدا حافظ و ناصر ہو اور اپنی قربتوں کے دائمی انعام سے سرفراز فرمائے۔

مکتوب نمبر:18 محررہ:15.07.93

پیارے مکرم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط محررہ 21.6.93 موصول ہوا۔ الحمد للہ کہ آپ نے اسیران کیلئے بھی ڈش انٹینا لگوانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو دوسروں کیلئے مفید بابرکت فرمائے اللہ تعالیٰ عزیزم الیاس اور نعیم صاحب کو جلد رہائی بخشے اور ان کے بچوں کا حامی و ناصر ہو۔ گھر میں سلام اور بچوں کو پیار۔

مکتوب نمبر:19 محررہ: 09.01.94

مکرم محمد اسماعیل منیر صاحب　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط موصول ہوا، جزاکم اللہ تعالیٰ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس موذی مرض سے نجات دے اور صحت کاملہ سے نوازے۔ اسیران راہ مولیٰ تو احمدیت کے وہ چراغ ہیں جو قید خانوں میں بیٹھے ہیں۔ میرے دل سے آپ کیلئے دعا نکلتی ہے کہ آپ ان کا اور ان کی فیملیز کا خیال رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

الحمدللہ عزیزی الیاس منیر صاحب کے کمرے میں M.T.A پہنچ گیا ہے۔ اللہ کرے یہ ملاقات کا ذریعہ ان کو سکون و اطمینان عطا فرمائے۔ اور مکرم محمد نعیم[1] صاحب کو اس نیک کام کی احسن جزاء دے۔ اللہ آپ کے ساتھ ہو اور بیشمار فضلوں کا وارث بنائے۔

مکتوب نمبر:20 محررہ: 21.03.94

پیارے عزیزم اسماعیل منیر صاحب　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ، ثم الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ساہیوال کیس کے معصوم اسیران راہ مولیٰ کو آزادی عطا فرمائی اور ہماری قبولیت دعا کا عظیم الشان نشان ظاہر ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان مجاہدوں کی قربانی کو قبول فرمائے اور یہ آزادی ساری جماعت کو مبارک فرمائے۔ مبارک باد کا شکریہ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اخلاص اور ایمان کو قبول فرمائے۔ بچوں کو پیار۔ عزیزم الیاس منیر کو سلام اور پیار گھر میں سب کو سلام۔

مکتوب نمبر:21 محررہ: 23.03.94

پیارے برادرم محمد اسماعیل منیر صاحب　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خطوط ملے۔ الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے خوشی کا دن دکھایا، ہماری دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشا اور انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور اسیران راہ مولیٰ باعزت طور پر رہا ہو کر گھر پہنچے۔ بیحد مبارک ہو۔ صبر و رضا

---

[1] سہو کاتب ہے کیونکہ یہ خدمت مکرم شیخ رفیق احمد صاحب آف ٹی وی پوائنٹ فیصل آباد کے حصہ آئی تھی۔ (مصنف)

اور دعاؤں کا یہ شیریں پھل پوری جماعت کیلئے خدا کی ایک عطا ہے۔ ہم اس پر جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے لازوال فضلوں سے نوازے۔ عزیزم الیاس منیر صاحب کو محبت بھرا اسلام۔ اس کی بیگم اور بچوں کو محبت بھرا اسلام دعا اور مبارکباد۔

مکتوب نمبر:22 محررہ:28.03.94

پیارے مکرم محمد اسماعیل منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط محررہ 5.3.93 ملا جس میں رؤیا کو بیان کیا گیا ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ رؤیا کی تعبیر عظیم الشان خوشخبری کے روپ میں پوری ہوئی۔ مبارک ہو۔ عزیزم الیاس منیر اور اس کی بیگم و بچوں کو بہت بہت مبارکباد اور سلام و پیار۔ امید ہے کہ ان کو میری طرف سے مبارک باد کا خط مل گیا ہوگا۔ ٹیلیفون پر بات کر کے بہت خوشی ہوئی تھی۔ ساری جماعت خوش ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں مبارکیں آرہی ہیں۔

مکتوب نمبر:23 محررہ:08.05.94

پیارے عزیزم محمد الیاس منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے جن خیالات کا اظہار اپنے خط میں کیا ہے بعینہٖ یہی کیفیت ہے انسان کے ہاتھوں انسان کے قید ہونے کی تاریخ میں اور پھر اس کی رہائی میں ایسا واقعہ کہیں نہیں ہوا کہ ساری دنیا سے لوگوں کو پہلے قید پر غم لگا ہو اور پھر رہائی کی خوشیاں منائی ہوں۔ یہ سب اللہ کا احسان ہے۔ خدا آپ کو اپنی رضا کی دائمی خوشیوں سے معمور لمبی زندگی عطا فرمائے گھر میں محبت بھرا اسلام اور بچوں کو پیار۔

مکتوب نمبر:24 محررہ:17.05.94

پیارے عزیزم الیاس منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا۔ خدائی جماعت کی یہی تو علامت ہے کہ وہ دعاؤں، محبت اور اپنے پاک نمونہ سے بےمثال مثال قائم کرتی ہے۔ مجھے تو اس سے زیادہ کی توقع تھی یہ آپ پر احسان نہیں ہے۔ آپ نے وفا کی راہ پر ثابت قدمی دکھائی اور جماعت نے اپنے ہیروز کا خیر مقدم کر کے حوصلہ افزائی کی۔ اصل تو یہ ہے کہ خدا نے قبولیت دعا کا نشان ظاہر فرمایا یہ سب خدا کی نعمت کی شکر گذاری کے طور پر کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلسلہ کی

خدمت کی توفیق بخشے، گھر میں سب کو سلام اور بچوں کو پیار۔

مکتوب نمبر:25 محررہ:8.06.94

پیارے عزیزم محمد الیاس منیر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا۔ الحمدللہ آزادی میں عید منانے کی خوشیاں نصیب ہوئیں۔ مبارک ہو۔ قید کی عیدیں بھی حقیقی عیدیں تھیں جو ہمیشہ یادرہیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خیریت سے لائے۔ سب کام ہو جائیں اور دین کی راہوں پر چلنے کی توفیق پائیں۔ گھر میں بہت بہت سلام اور بچوں کو پیار

والسلام

خاکسار

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع

# دل و جان سے پیارے آقا کے نام خطوط

خاکسار نے اپنی اسیری کے دوران اپنے پیارے آقا حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت اقدس میں "زندگی کی بقعہ نور کوٹھڑی" سے جو خطوط لکھے، ان میں سے چند نمونے پیشِ خدمت ہیں:

خط نمبر: 1 محررہ: 20.02.1986

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم　　　　وعلیٰ عبدہ المسیح الموعود

حضرت امیر المومنین مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع ایدکم اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

میرے پیارے آقا!　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

15 رفروری کو جب ہمیں سہ پہر کے وقت ڈیوڑھی میں طلب کیا گیا تو ہمیں پورا علم تو نہیں تھا کہ ہمارا فیصلہ ہونے والا ہے تاہم جس قسم کے انتظامات میں ہمیں لے جایا گیا اس سے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں آپس میں باتیں ہو رہی تھیں اور میری زبان پر سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا شعر جاری ہو رہا تھا ۔

اگر وہ جاں کو طلب کرتے ہیں تو جاں ہی سہی　　　　بلا سے کچھ تو نپٹ جائے فیصلہ دل کا

پھر ہمیں 4 بجے کے قریب باری باری بلا کر فیصلہ سنایا جانے لگا۔ آخر میں رانا صاحب سے پہلے مجھے بلا کر جب فیصلہ سنایا گیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تسکین میرے سارے جسم میں بھر دی گئی ہے۔ بے اختیار الحمدللہ کے کلمات منہ سے نکلے اور یوں لگا جیسے سارے بوجھ اتر گئے ہیں۔ ارد گرد سخت افسوس کا ماحول تھا اور ہم خوش ہو رہے تھے۔ دیکھنے والے ہمیں خوش ہوتا دیکھ کر حیران بھی ہوتے ہوں گے مگر ہم تو افسانہ بنی ہوئی تاریخ کو زندہ کر رہے ہیں۔

پھر ہمیں بظاہر جیل کی سخت ترین جگہ میں لے جایا گیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد ثناء اور درود شریف پڑھتے ہوئے دو تین دن گزارے۔ اور اب پھانسی کی کوٹھریوں میں الگ الگ وارڈ میں ہیں۔ اور دو تین دن کی بے قرار

جدوجہد کے بعد اب میں آپ کو خط لکھنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔

میرے پیارے آقا! ہم جو خادم کے عہد میں جان قربان کرنے کا وعدہ کیا کرتے تھے آج وقت آیا ہے اس وعدہ کو نبھانے کا۔ بیشک ہم بہت کمزور ہیں۔ بہت گناہ گار ہیں۔ لیکن آج جب ہمارے مولیٰ نے اسلام کے احیائے نو کیلئے ہمیں چنا ہے تو ہم اپنی پوری ہمت اور طاقت کے ساتھ لبیک لبیک کہتے ہوئے اپنے مولیٰ کے حضور حاضر رہیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ایک وجود کے بدلہ میں ہزاروں لاکھوں وجودوں کو زندگی ملے گی۔ جو قیامت تک دشمنوں کیلئے جلن اور سخت سوزش کا موجب بنے رہے گی۔

پیارے آقا! یہ بجا ہے کہ ہمارے عزم بڑے مضبوط اور ارادے بلند اور مشن عظیم ہے مگر امتحان بھی تو بہت کڑا ہے۔ اور اس پر صعوبت اور کٹھن سفر میں کامیابی کیلئے اسی قدر خدا تعالیٰ کے فضل عظیم کی سخت ضرورت ہے۔ حضور سے عاجزانہ درخواست دعا ہے کہ اللہ کا وہ فضل عظیم ہر لمحہ اور ہر آن ہمارے شامل حال رہے۔ آمین ثم آمین۔

والسلام

خاکسار حضور کی جوتیوں کا غلام

محمد الیاس منیر

پھانسی کوٹھڑی، سنٹرل جیل فیصل آباد

خط نمبر 2: محررہ: 17.01.89

سیدی ومولائی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضور پرنور کی صحت وعافیت اور درازی عمر کیلئے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زیادہ سے زیادہ خدمتِ دین کی توفیق بخشے ہمیں آپ کی توقعات پر پورا اُترنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور آپ کی کامیاب وطن مراجعت کے سامان کرے، آمین۔

پیارے آقا! اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے حالات میں تبدیلی لا رہے ہیں۔ ہر چند کہ شرارت پسند عناصر اب بھی خوفناک بیان دے رہے ہیں اور اخبارات شائع کر رہے ہیں مگر ان سے نہ پہلے کبھی خوف محسوس ہوا تھا اور

نہ اب ہوتا ہے۔ میرے ساتھی خبریں پڑھ کر مجھے بتاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے بھرپور اعتماد ہی دیکھتے ہیں۔ حضور سے عاجزانہ درخواست دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضلوں کے سایہ میں رکھے، اپنی رحمتوں کا سہارا عطا فرمائے رکھے اور ہمارا سانس بھی ایمان کی حالت میں آئے۔ آمین۔

خط نمبر 3 محررہ: 19.02.1989

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ پیارے آقا!

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے خاکسار اور اس جیل میں مقید دیگر احمدی دوست بخیر وعافیت ہیں الحمد للہ ہم سب کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پیارے آقا کو صحت وسلامتی والی عمر دراز عطا فرمائے اور ہر لحہ خدمتِ اسلام کی بیش از پیش سعادت عطا فرماتا رہے، دشمن کی ہر سازش اور شر سے محفوظ ومامون رکھے، آمین۔

پیارے آقا! یہاں اگرچہ ملاں پھر سازشیں کرنے کی کوشش کر رہا ہے مگر ان سیاہ بادلوں سے اس کے فضلوں اور رحمتوں کی بارشیں ہی برس رہی ہیں۔ چند روز قبل ایک شخص نے شرارت کی اور میرے ساتھیوں کو گندے اعتراضات پر مشتمل ایک پمفلٹ دے کر ورغلانے کی کوشش کی مگر میں نے مباہلہ والا پمفلٹ سامنے رکھ دیا، جس نے ہر کسی کو مبہوت کر کے رکھ دیا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ۔ اب ان میں سے ہر کوئی حیران ہے کہ اگر مولوی سچا ہے تو پھر دستخط کیوں نہیں کرتا۔

سیّدی! دعا کی درخواست ہے تا ہم سب ساتھی دشمن کے شر سے محفوظ ہیں اور اگر کوئی ابتلاء بھی آئے تو استقامت کا مظاہرہ کرنے کی توفیق پائیں۔ آمین۔

خط نمبر 4 محررہ: 30.03.91

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سیّدی وآقائی!

حضور پرنور کی صحت وعافیت اور درازیٔ عمر کیلئے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضور کی کامیاب وکامران مراجعت کے سامان بھی اب جلد ہی کر دے۔ آمین۔

سیّدی! مجھے علم ہوا ہے کہ تحریک وقفِ نو میں توسیع کر دی گئی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم دونوں نے بھی اس میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور نیت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اب جو بھی بچہ عطا فرمائے گا،

اسے خدمت دین کیلئے نظام سلسلہ کو پیش کر دیں گے۔ حضور سے درخواست ہے کہ ہماری اس پیشکش کو منظور فرمائیں اور دعا کی بھی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ اولاً اس نیت کو پورا کرنے کی توفیق دے اور پھر ہمارے اس بچہ کو وقف میں قبول بھی فرمالے اور وقف کی برکات کو ہماری نسلوں میں دور تک ممتد کرتا چلا جائے، آمین[1]۔ حضور سے رمضان المبارک کے حوالہ سے خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔ اور عید مبارک بھی پیش ہے۔ خدا حافظ۔

خط نمبر:5 محررہ: 27.06.86

پیارے آقا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم سب اسیران نے پورے جوش و جذبہ اور بھرپور انداز میں عیدالفطر منائی۔ اور ایک نامعلوم لذّت کے احساس سے لذت یاب ہوتے رہے۔ ہماری عید کی خوشی میں آپ کے تحائف نے اور بھی اضافہ کر دیا۔ چنانچہ ہم سب نے آپ کے بھجوائے ہوئے کپڑے پہنے، مٹھائی کھائی اور پھل کھایا۔ اور اس سے پہلے آپ کے ارسال کردہ نہایت فرحت بخش شربت سے افطاری کرتے رہے۔ الحمدللہ وجزاکم اللہ احسن الجزاء۔ اور سب سے بڑھ کر آپ کے دست مبارک سے لکھے ہوئے خطوط پڑھ کر آپ کی ہمارے لئے تڑپ اور بے قراری کا تصور کر کے دل میں آپ کیلئے پیدا ہونے والے بے پناہ جذباتِ محبت کو دعاؤں میں ڈھالتے رہے۔ اللہ کرے آپ کے ساتھ ہماری یہ محبت بڑھتی رہے اور ہمیں اس محبت کے تمام تقاضے اور ذمہ داریاں پوری کرنے کی توفیق بھی ملے۔ اور پھر خلیفۂ وقت کے ساتھ حقیقی محبت ہماری نسلوں میں سرایت کرتی چلی جائے اور کبھی اس محبت سے ہم اور ہماری نسلیں محروم نہ ہوں کہ ہماری یہی متاع ہے یہی ہمارا اثاثہ ہے۔

خط نمبر:6 محررہ: 03.01.86

دل وجان سے پیارے آقا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضور پرنور کی صحت وسلامتی اور درازئ عمر کیلئے دن رات دعا گو ہوں اور آپ کیلئے ہر ہر لمحہ جو پیار اور محبت

---

[1] اللہ تعالیٰ نے یہ بچہ عطا فرمایا جس کی خوشخبری حضور نے خاکسار کی رہائی کے بعد 20رمارچ 1994ء کو خاکسار کی اہلیہ کے نام اپنے خط میں دی تھی اور آنے والے بچے کا نام ز ستگار احمد عطا فرمایا تھا جو 14رفروری 1995ء کو پیدا ہوا، الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ اسے وقف نو کے تقاضوں کو پورا کرنے والا بنائے آمین۔

کے جذبات پھوٹتے رہتے ہیں، خدا کرے کہ وہ دعاؤں کی شکل میں عرش الٰہی تک پہنچ کر مقبولیت کا شرف حاصل کریں۔ آمین

آج نئے سال عیسوی کا تیسرا دن ہے۔ اس موقع پر بندہ کی طرف سے ڈھیروں دعاؤں میں لپٹی ہوئی مبارکباد قبول فرمائیں۔ اللہ کرے کہ یہ نیا سال تمام بنی نوع انسان کیلئے خوشیوں، خوشحالیوں اور مسرتوں اور شادمانیوں اور حقیقی گرمائش لے کر طلوع ہو اور مادی برف میں ڈھکے ہوئے انسان کو قوت عمل اور قوت فہم و قبول عطا فرمائے۔ آمین۔

خط نمبر: 7 محررہ: 4.1.89

پیارے آقا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جس شخص کو جس شخص کی عمر لگی ہوئی ہے، اب وہ وہی حرکتیں کر رہا ہے جو اس کا گاڈ فادر کرتے کرتے قہر الٰہی کا نشانہ بنا اور رہتی دنیا تک عبرت کا نشان بن گیا۔ ان ظالموں نے تو ہم سے ہمارے تمام تر بنیادی حقوق چھین لئے، مگر ہم سے ہماری خوشیاں نہ چھین سکے، ہم نے جونہی حمد و شکر کرتے ہوئے اپنی پہلی صدی کو وداع کہا تو اللہ تعالیٰ نے اچانک آپ کی آواز کی صورت میں ہمیں نوید سحر عطا فرمائی اور آپ کا انٹرویو سن کر ہم نے اگلی صدی کی خوشیوں کا آغاز کیا۔ جن جن دوسرے دوستوں نے بھی سنا بہت متاثر ہوئے اور بہت اچھے ریمارکس کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ باہر تو جو کچھ ہو سکا ہوگا اس کی رپورٹ آپ کو پہنچ چکی ہوگی۔ جیل کے اندر ہم نے اپنے پروگرام کے مطابق بھرپور جشن تشکر کا اہتمام کیا۔ سب دوستوں کو اپنے پاس مدعو کیا اور کھانا کھایا اور اس تقریب کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی اور دعا کیساتھ اس کو آباد کیا۔

پیارے آقا! اس موقع پر میں نے جیل کی فیکٹری سے ایک احمدی 25 سالہ قیدی کے تعاون سے ایک حقیر سا تحفہ تیار کروایا ہے۔ جیل کے ماحول اور حالات کے مطابق یہی تیار ہو سکا ہے، امید ہے بلکہ یقین ہے کہ حضور انور ازراہِ ذرہ نوازی ہمارے جذبات کو قبول فرمائیں گے۔ اور ہم سب قیدیان کو اپنی خاص دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ اس جیل میں ہم نو احمدی قیدیان ہیں۔ خدا حافظ۔

خط نمبر: 8 محررہ: 18.03.86

پیارے آقا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہوں کہ وہ اپنے فضل سے آپ کو صحت و عافیت اور سلامتی والی عمر دراز عطا فرمائے،

خدمت دین کی بے انتہاء توفیق وسعادت عطا فرمائے اور آپ کی راہنمائی میں غلبۂ اسلام کا قافلہ تیزی کے ساتھ اپنی منزلیں طے کرتا چلا جائے۔ آمین ثم آمین۔

سیّدی! آپ کی ہمارے لئے بے چینی و بے قراری کی اطلاعات برابر مل رہی ہیں۔ اسی طرح خلافت کی برکت سے احباب جماعت جس تڑپ کا اظہار کر رہے، اسے دیکھ کر ایک طرف تو حمد و ثناء کے بے پناہ جذبات پیدا ہوتے ہیں تو دوسری طرف طبیعت آپ سب کیلئے سخت مضطرب ہو جاتی ہے۔

حضور سے درخواست دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صبر واستقامت اور بشاشت کا شاندار مظاہرہ کرنے کی توفیق بخشے، ہمیں حضرت سید عبداللطیف صاحب ؓ شہید جیسا نور ایمان بخشے، اور ہم ساری جماعت کیلئے عمدہ ترین نمونہ ٹھہریں وبس!

خط نمبر: 9 محررہ: 2.04.1986

دل وجان سے پیارے آقا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابّا جان کے نام آپ کا شفقت نامہ محررہ 19.02 پڑھا۔ اور دو خطبات کے خلاصے بھی پہنچے۔ ان سب سے حضور کے اضطراب کا تصور جو ہمارے ذہنوں میں تھا حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ پھر ایک خبر سے اور بھی تشویش ہوئی جس کے مطابق ہمارے فیصلوں کے بعد حضور کی صحت گر گئی ہے۔ پیارے آقا! یہ بجا کہ ہم آپ کو اپنی خیر وعافیت سے کتنا بھی مطلع کریں، آپ کا اضطراب کبھی کم نہ ہوگا۔ آپ کو کبھی قرار نہیں آئے گا۔ آپ کو اُسی وقت سکون ملے گا جب ہم ظلم واستبداد کے پنجوں سے نجات پاکر آپ کے پہلو میں آ بیٹھیں گے۔ لیکن پیارے آقا! آپ نے خود ہی تو اس ظلم وستم کو ''شر کے پردہ میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر خیر'' کا نام دیا ہے۔ حقیقت سے بھرے ہوئے آپ کے یہ الفاظ ہمیں تو ہر تکلیف اور مشکل سے مشکل مرحلہ سے بے پرواہ کر دیتے ہیں۔

سیّدی! آپ نے جس پیار اور شفقت کے ساتھ خطبات میں ہمارا ذکر فرمایا ہے ہم تو اپنے آپ کو اس سے بہت دور پاتے ہیں۔ اس لئے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں استقامت عطا فرمائے اور عیوب ونقائص اور گناہوں سے چھلنی ہمارے وجودوں کو اپنے کمال فضل سے قبول فرمالے اور شماتت اعداء سے محفوظ رکھے۔

میرے سقم وعیب سے اب کیجئے قطع نظر تا نہ خوش ہو دشمن دیں، جس پہ ہے لعنت کی مار

خط نمبر:10 محررہ: 20.04.1986

سیّدی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کی لاتعداد رحمتوں اور اس کے بے پایا فضلوں کا سایہ ہر لحہ آپ پر رہے۔ اس کی عافیت اور فرشتوں کے ہالہ میں رہیں اور اپنی بھرپور جسمانی اور ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کے ساتھ غلبۂ اسلام کے اس قافلہ کو تیزی کے ساتھ منزل کی طرف لے کر چلتے چلے جانے کی توفیق پائیں آمین۔

سیّدی! آپ اپنے خطوط کے ذریعہ جس دلنشین انداز میں ہماری تربیت فرمارہے ہیں وہ یقیناً خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ خلیفہ کا ہی حصہ ہوسکتا ہے۔ آپ کے خطوط نے ہمیں نئی سوچ، نیا ولولہ اور نئی امنگ بخشی ہے۔ آپ کے خطوط نے ہمیں موت سے بالکل بے پرواہ کردیا ہے کہ یہ موت نہیں یہ تو ابدی زندگی ہے۔
-----حقیقی زندگی!

پیارے آقا! مجھے علم نہیں کہ علمی وادبی حلقوں میں اس شعر کا کیا مقام ہے مگر مجھے بہت پسند آیا ہے کہ اس راہِ مولا میں جان دینے کی حقیقت سمجھ آجاتی ہے ؎

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا      میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

پیارے آقا! آپ کی طرف سے خوبصورت اور بہت ہی خوبصورت ٹافیوں کا پیار بھرا تحفہ بھی ملا۔ آپ کے خط میں ان کا ذکر پڑھ کر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ واقعی ہمارے وارڈ میں کسی کو کبھی بھی تو ایسا خوبصورت تحفہ نہیں آیا۔ اور آئے بھی کیوں؟ وہ تو سب اپنی دنیا کی خاطر کئے ہوئے جرائم کی پاداش میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔

پیارے آقا! آخر میں عاجزانہ درخواست دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف فرمائے۔ جب اس کے حضور حاضر ہوں تو میرے تمام گناہوں، لغزشوں اور کوتاہیوں سے مکمل طور پر صرف نظر فرما کر اپنے قرب سے نوازے کہ اس کے بغیر ہماری بخشش کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ آمین۔

خط نمبر:11 محررہ:04.05.1986

نہایت ہی پیارے آقا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپنے خالق ومالک اور قادر ومقتدر ربّ سے پیارے آقا کی صحت وعافیت اور درازیٔ عمر کیلئے ملتجی ہوں۔

نیز یہ کہ وہ قادرِ مطلق اُس لمحہ کو قریب تر کر دے جبکہ ہم اور ہمارے لاکھوں پاکستانی احباب جماعت حضور پرنور کا شاندار استقبال کریں گے۔ حضور کیلئے اپنی آنکھیں فرشِ راہ کریں گے۔ قدرت کاملہ کے مالک ربّ! وہ لمحہ ہمیں جلد نصیب فرما۔ آمین ثم آمین۔

پیارے آقا! یہ بھی اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے وعدوں اور پیش خبریوں پر ایمان وایقان سے نواز رکھا ہے۔ ہمارے دلوں کی گہرائیوں سے یہ صدا بلند ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی باتیں جو کل پوری ہوئی تھیں آج بھی پوری ہوں گی اور پہلے سے بڑھ کر شان سے پوری ہوں گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

سیّدی! ہمارا حال بھی عجیب ہے، قرآن کریم کے جس حصہ کی بھی تلاوت کرتے ہیں اپنی ہی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کے کھینچے ہوئے یہ خاکے اور نقشے جب ابتدائی پہلوؤں میں جماعت احمدیہ پر پورے ہو رہے ہیں تو انتہائی لحاظ سے بھی اس جماعت پر ضرور بہ ضرور صادق آئیں گے۔ جماعت احمدیہ ماضی میں گزری ہوئی الٰہی جماعتوں کی طرح لازماً کامیاب وکامران ہوگی۔ اور اگر اس عظیم فتح اور کامیابی کیلئے ہم ایسے نکمے اور نالائق افراد کے وجود اور جانیں کھاد کے طور پر اللہ تعالیٰ کام میں لے آئے تو پیارے آقا! یہ کب گھاٹے اور نقصان کا سودا ہے۔ اسلئے عاجزانہ درخواست دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عظیم الشان مقصد کے شایانِ شان ہی نمونہ پیش کرنے کی سعادت عطا فرمائے۔ آمین۔

خط نمبر: 12 محررہ: 19.05.1986

سیّدی ومولائی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے پرشفقت اور نہایت بلیغ اندازِ تربیت والے خطوط پڑھ کر دل میں دو جذبے جنم لیتے ہیں۔ پہلے جذبہ سے شہیدِ اُحد حضرت جابرؓ کی یاد آتی ہے جنہوں نے خدا سے اس لئے زندگی چاہی تھی کہ بار بار راہِ مولیٰ میں جان دیں۔ مرنے کے بعد چونکہ یہ درخواست قبول نہیں ہو سکتی اس لئے موت وحیات کی اس دلچسپ کشمکش کے دوران ہی خدا سے یہ التجاء کرتا ہوں کہ اس لئے زندگی دے کہ بار بار، بار بار راہِ مولیٰ میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے مواقع آئیں۔

یا ربّ زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے  لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

دوسرا جذبہ راہِ مولیٰ میں قربان ہوجانے کا بڑے جوش سے پیدا ہوتا ہے اور میری خواہش اور تمنا اور آرزو ہے کہ ایسی صورت میں غالب ہی کے اس شعر کو حقیقی اور لافانی شکل میں ڈھالوں ؎

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے　　کہ اپنے سائے سے سر پانو سے ہے دو قدم آگے

بہر حال خدا کی جو تقدیر بھی ظاہر ہو، جس پردہ میں بھی ظاہر ہو، ہماری التجاء ہے کہ ہمیں اس خدائی تقدیر کا غیر معمولی عدیم المثال خیر مقدم کرنے کی توفیق عطا ہو۔ آمین یارب العالمین۔

سیّدی! آج نواں روزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے روزے رکھنے کی توفیق عطا فرما رہا ہے۔ خدا کرے کہ اس کے فضلوں اور احسانات کی یہ بارش ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی رہے آمین۔

پیارے آقا! گذشتہ ہفتہ خدا تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام اور فضل اس صورت میں ظاہر ہوا کہ مجھے ابا جان کی کوششوں سے B کلاس مل گئی اور بعد میں محترم رانا صاحب کی گنتی بھی میرے کمرے میں مستقل طور پر ڈال دی گئی اور یوں ہمیں بہت سے مسائل اور مشکلات سے نجات مل گئی ہے اور اب پہلے سے بہت بڑھ کر خوشگوار وقت گزر رہا ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔

حضور سے درخواست دعا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بے شمار فضلوں کو شکر کے ذریعہ سمیٹنے اور ان سے کما حقہ استفادہ کی توفیق پاتے رہیں۔ آمین۔

خط نمبر:13 محررہ: 02.06.1986

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ　　پیارے آقا!

چند دنوں کے بعد عید الفطر ہوگی۔ اور اس عید مبارکباد کا خط ایسی جگہ سے اور ایسی کیفیت میں تحریر کر رہا ہوں جو ہمارے لئے ایک جاری وساری عید کا حکم رکھتی ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس ظاہری عید کے موقع پر ہماری یاد غم کا گہرا سایہ بن کر آپ پر چھائی رہے گی۔ مگر پیارے آقا! آپ کو بہت مبارک ہو کہ آپ کے خدام کو اوّلین والی عید میسر ہے جس کا ہم سے کہیں زیادہ خود آپ کو احساس ہے۔ اور اسی احساسِ درد کی وجہ سے آپ بیحد مضطرب و مضطر ہیں۔ میری دعا ہے کہ آپ کی اور ہماری اس عید سے دکھ، درد اور غم غرضیکہ تمام منفی پہلوؤں اور اثرات کو اللہ تعالیٰ جلد دور کر کے آپ کو قرار اور سکون نصیب فرمائے۔ آمین۔

خط نمبر:14 محررہ: 04.02.1986

سیّدی و آقائی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضور پرنور کی صحت و عافیت اور درازیٔ عمر کیلئے دعا گو ہوں۔ میرا مولیٰ حضور کو اپنی حفاظت خاص میں رکھے، ہر شر اور تکلیف سے محفوظ رکھے اور پرسکون ماحول میں خدمت اسلام کا فریضہ سرانجام دیتے چلے جانے کی توفیق ملے۔ آمین۔

پیارے آقا! جس قسم کے انعامات سے اللہ تعالیٰ ہمیں نواز رہا ہے اور جس قسم کی ذمہ داریاں ہم پر عائد ہو رہی ہیں ان کے مقابلہ میں آپنے آپ کو بہت نااہل پاتا ہوں۔ آپ سے دردِ دل سے اپنی کمزوریوں، سُستیوں اور نالائقیوں کے دور ہونے کیلئے عاجزانہ درخواست دعا ہے۔

گوجرانوالہ سے گذشتہ ہفتہ نانی جان ملاقات کیلئے تشریف لائی تھیں، ان کی صحت و عافیت اور درازیٔ عمر کیلئے بھی درخواست دعا ہے نیز ماموں جان کو شدید نوعیت کی کاروباری اُلجھن کا سامنا ہے۔ ان کیلئے بھی درخواست دعا ہے۔

خط نمبر:15 محررہ: 07.12.1988

پیارے آقا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی حکومت کی طرف سے فوجی اور دوسری عدالتوں سے موت کی سزا یافتہ افراد کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کرنے کے احکامات آنے کی ثقہ اطلاع ملی ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اور ساری دنیا میں پھیلے ہوئے احباب جماعت کی چار سالہ لمحہ لمحہ کی دعاؤں کو شرف باریابی بخشا اور دعاؤں کی کثرت کے حساب سے ہمارے ساتھ اور بھی ہزاروں قیدیوں کو باریاب کر دیا۔ یہ روز کر مبارک سبحان من یرانی۔

اس موقع پر میری طرف سے آپ کو اور تمام پیارے احباب جماعت کو بہت بہت دلی مبارک باد پیش ہے۔ اس وقت میرے سامنے آپ کے وہ محبت بھرے خطوط ہیں جو آپ نے اس عرصہ میں اپنے دست مبارک سے لکھے ہوئے ہیں۔ آپ کے سب سے پہلے خط محررہ 19.02.86 کا آخری فقرہ بھی خدا نے بڑی شان کے ساتھ پورا فرما دیا ہے کہ

''بہت دعائیں کریں کہ میرا اور آپ کا خدا اس پیاری جماعت کا سر ہر ابتلاء میں بلند رکھے اور کبھی غیر اللہ کے سامنے نہ جھکے''

اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد و بارك وسلم انك حمید مجید۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ توفیق دی اور اس خوفناک ابتلاء سے سر بلند رکھتے ہوئے نکال لیا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ خدا تعالیٰ مزید بھی اپنا فضل رکھے اور اپنی رحمت کا سہارا نصیب کرے اور ہم کامل طور پر اس ابتلاء سے سرخرو ہو کر نکلیں اور آپ کے سینہ کے ساتھ لپٹ کر آپ کو بھی ٹھنڈ پہنچائیں اور اپنے دل کو بھی آمین۔

آج رات کسی بھی وقت ہماری یہاں سے آزادی متوقع ہے۔ اگر نہ ہو سکی تو کل صبح تو لازماً یہاں سے نکال کر عام قیدیوں میں شامل کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ

خط نمبر: 16 محررہ: 03.02.1987

دل وجان سے پیارے آقا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپنی زندگی کے یہ تاریخی ایام اسلام کے غلبہ، احمدیت کی فتح اور ترقی، ملک کے استحکام اور اپنے پیارے آقا کی صحت و عافیت اور درازیٔ عمر کیلئے دعائیں کرتے ہوئے گزار رہے ہیں۔ حضور سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بحرِ معرفت میں اور بھی زیادہ گہرائی تک غوطہ خوری کی توفیق بخشے۔ آمین۔

سیّدی! گذشتہ دنوں قرآن عظیم کی تلاوت کے دوران میری نظریں ان آیات پر گڑ گئیں۔

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ۔ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ۔[1]

ان آیات کے معانی پر غور کرنے کی کوشش کی۔ پھر خیال آیا کہ آپ سے استفسار کروں۔ مجھے تو یوں لگا جیسے ان میں آج کے حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے جبکہ مسلمان کہلانے والے کو مجرم گردانا جا رہا ہے۔ حضور سے اس کے صحیح معانی کیلئے عاجزانہ درخواست ہے، خدا حافظ!

---

[1] القلم

خط نمبر:17 محررہ: 23.02.1987

حضرت امیر المومنین ایدکم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج جلسہ یو۔کے کا دوسرا دن ہے۔کل سے ہی اس جلسہ کی یاد بہت ستا رہی ہے اور خیالات کے سہارے، دعاؤں کے ذریعہ میں اس جلسہ گاہ میں ہی گھوم رہا ہوں ۔اللہ کرے کہ یہ جلسہ ہر لحاظ سے بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا اور اس میں شریک ہونے والے طیور ابراہیمی اپنے دل ودماغ اور جسم وروح کو بے پناہ انوار و برکات سے منور کر کے اپنے اپنے گھروں کو بخیریت لوٹیں کہ اس طرح بھی ہم تک انوار خلافت کی کرنیں پہنچیں اور ہم بھی اس سے فیضیاب ہو سکیں آمین ثم آمین۔

سیّدی! یہاں فیصل آباد جیل میں خیریت سے ہوں الحمدللہ۔حضور کی دعاؤں کا محتاج ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمت وطاقت اور استقامت و بشاشت عطا فرمائے۔آمین۔عید الاضحیٰ کے موقع کی مناسبت سے میری طرف سے دلی عید مبارک پیش ہے۔خدا حافظ۔

والسلام خاکسار آپ کی جوتیوں کا غلام

محمد الیاس منیر ساہیوال جیل

## پیارے احباب کے نام خاکسار کے خطوط

خاکسار کو ہوم سیکرٹری پنجاب کی طرف جیل میں باقاعدہ لکھنے پڑھنے کی اجازت تھی جس سے استفادہ کرتے ہوئے عزیزم نے جیل کی "زندگی کی بقعہ نور کوٹھڑی" سے ہزاروں خطوط احباب کو لکھے جن سے پھانسی کے سزا یافتہ قیدی پر افضالِ الٰہی کی بارش کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے چند ایک نمونے پیش ہیں:

خط نمبر: 1 بتاریخ: 29.05.85

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از: ساہیوال جیل

بزرگوارم مکرم ومحترم میاں منصور احمد صاحب ناظر اعلیٰ وامیر مقامی ربوہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے فضل سے صحت والی اور خدمت دین سے مزین عمر دراز عطا فرمائے۔ آمین۔
ایک عرصہ سے آپ ہماری اور ہمارے اہل خاندان کی مختلف انداز سے خدمت فرما رہے ہیں اور پورے ذرائع سے ہمارا ہر طرح سے خیال رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالے اور آپ کو اس کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔
محترمی میاں صاحب! رمضان المبارک کے اہم ترین ایام میں آپ سے عاجزانہ درخواست دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کمزوریوں اور نقائص کی پردہ پوشی فرمائے اور محض اپنے فضل سے ہمیں قبول فرمالے۔ اپنی محبت اور قرب سے نوازے۔ اور ہمارے ساتھ جن ایک کروڑ دلوں کا چین وابستہ کر دیا گیا ہے انہیں قرار دے، سکون بخشے۔ اور سب سے بڑھ کر ہمارے دل وجان سے پیارے آقا کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے سامان پیدا ہوں۔ آمین۔

والسلام

خادم سلسلہ

محمد الیاس منیر

خط نمبر: 2 بتاریخ: 02.08.1987

محترم مولوی دوست محمد شاہد صاحب مؤرخ احمدیت! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا پر شفقت گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ آپ نے اپنے ملفوف میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے بارہ میں جو تعطیر الانام کا صفحہ بھجوایا ہے، وہ واقعی بے حد ایمان افروز اور روح پرور ہے۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے مجھے یقین ہے کہ ہماری رہائی بھی اللہ تعالیٰ کے کسی خاص اقتداری نشان کے ذریعہ ہی ہوگی۔ انشاءاللہ۔ گو کہ ہم ایسے گناہگار اور پر تقصیر بندے اس لائق تو نہیں۔ مگر میرے مولیٰ کو اپنے پیارے محمد مصطفیٰ ﷺ اور پیارے مہدی علیہ السلام کی خاطر ہم ایسے ناچیز بندوں کو نوازنا کچھ مشکل نہیں ہے

تیری عنایتوں کے تصدق مجھے نواز ہاں مرد فارسیؑ سے تعلق مرا بھی ہے

سب اسیران کی طرف سے مٹھائی بھجوانے اور تاریخ اسلام کے ایک عظیم اور زندہ واقعہ سے روحانی تواضع کرنے پر بیحد شکریہ قبول فرمائیں۔ سبھی اسیران بفضل خدا صحت و عافیت سے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ساتھی محترم ملک محمد دین صاحب ہمیشہ ہی آپ کا بڑے شوق اور خلوص اور چاہت کے ساتھ ذکر فرمایا کرتے ہیں۔

آخر میں دعا کی عاجزانہ درخواست ہے تا ہم سب کو مثالی استقامت توفیق و سعادت نصیب ہو اور حضرت سید عبداللطیف شہید ایسا ایمان پیدا ہو جائے ہمارے دلوں میں۔ اور ہمارے دماغ میں، ہماری روح اور ہمارے جسم کا ذرہ ذرہ اس ایمان سے چھلکنے لگے۔ آمین

خط نمبر: 3 بتاریخ: 23.07.1988

بزرگوار محترم چوہدری اشتیاق احمد صاحب ملتان السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ میرا پہلا خط آپ کو مل گیا ہوگا۔ اب تفصیلاً حاضر خدمت ہوں۔ اللہ کرے کہ آپ سب بخیرو عافیت ہوں اور سب کی ترقیات کے سامان ہوں، دین و دنیا کی حسنات آپ کو عطا ہوں آمین۔

آپ سے وِداع ہو کر اب تک اداسی کی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ آپ نے اِن پانچ ماہ کے دوران جس طرح میری خدمت کی، جس طرح میری خاطر آپ نے کئی قسم کی قربانیاں دیں، جس طرح میرے آرام

اور ضروریات کا خیال رکھا، ان کا شکریہ ادا کرنا تو دور کی بات ہے، میں تو ان کی فہرست بھی نہیں بنا سکتا۔ ہاں دعا کر سکتا ہوں، اور پورے جوش کے ساتھ میرے دل سے آپ سب کیلئے دعا پھوٹتی ہے۔ یقین جانئے آپ کا تصور کر کے جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں...... میں نے یہ پانچ ماہ آپ کے فیملی ممبر کی حیثیت سے گزارے ہیں، ان کی یاد میں میری خواہش ہے کہ میں آئندہ بھی ہمیشہ آپ کا فیملی ممبر رہوں۔ اللہ کرے کہ مجھے اس عہد کو نبھانے کی توفیق ملے۔ آمین

یہاں پر حالات آہستہ آہستہ درست ہو رہے ہیں۔ آئی جی صاحب کے دورہ کے باعث کافی سختی رہی ہے اور اب بھی ہے۔ تاہم بھٹی صاحب سے آپ کا حوالہ دے کر کافی مسائل حل ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہاں حالات بہتر ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہاں کوئی ''ملک'' نہیں ہے۔ انشاء اللہ۔

گھر میں خالہ جان کی خدمت میں میرا بے حد پر خلوص مودبانہ دلی سلام اور دعا کی درخواست اور عید مبارک پیش ہے۔ اسی طرح دیگر عزیزان کی خدمت میں بھی، برادرم محترم طارق صاحب کا کیا بنا۔ کوئی پیش رفت ہوئی ہے؟ خالد صاحب عید پر آئے ہوں گے انہیں بھی سلام اور عزیزم محمد احمد صاحب کا نتیجہ تو اب تک باقاعدہ طور پر آچکا ہوگا۔ خدا کرے کہ ان کی یہ کامیابی آئندہ کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ آمین۔ خدا حافظ!

خط نمبر: 4 بتاریخ: 31.03.1987

محترم عبدالمنان ناہید صاحب راولپنڈی　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے پر خلوص جذبات کا مظہر آپ کی ایک پیاری سی نظم پہنچی۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ میں اپنی کم مائیگی کے باعث آپ کی خدمت میں عریضہ لکھنے سے گھبراتا ہوں مگر آپ نے جس تڑپ اور درد کا اظہار فرمایا ہے، اس نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور غلط سلط فقروں کے ساتھ ہی حاضر ہو جاؤں۔ سراپا تشکر بن کر حاضر ہو جاؤں!

آپ نے اپنی اس نظم میں ہمارے کندھوں پر بڑی بھاری ذمہ داریاں لا ڈالی ہیں۔ جن سے عہدہ برآ ہونا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس لئے نہایت عاجزانہ درخواست دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں ہمت اور طاقت، حوصلہ اور صبر اور ضبط اور صدق وصفا بھی عطا فرمائے تا ہم اس سفر کو مکمل کر سکیں۔ اور

شاندار اسلامی روایات کے مطابق سرخرو ہو سکیں۔ آمین۔

جب سے اس ابتلاء میں ڈالے گئے ہیں۔ ہر لحہ و ہر آن اللہ تعالیٰ کے نئے سے نئے افضال دیکھے ہیں۔ اس کے اس سلوک کے پیش نظر ہمیں امید ہی نہیں، یقین کامل ہے کہ آئندہ بھی اس کی رحمت کا سہارا ہر لمحہ ہمیں نصیب رہے گا۔ انشاء اللہ۔ لیکن اس کیلئے آپ کی دعاؤں کی بے حد ضرورت ہے۔ آپ سے اور دیگر احباب سے یہی عاجزانہ درخواست ہے۔ خدا حافظ!

خط نمبر:5 بتاریخ: 02.11.1985

بزرگوارم مولانا سلطان محمود انور صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپنی ماہانہ کارگزاری کی رپورٹ تو پھر پیش کروں گا۔ اس وقت یورپی ممالک کے طویل دورہ سے آپ کی کامیاب مراجعت کی خبریں سن کر مبارکباد پیش کرنے کیلئے حاضر خدمت ہو رہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر لمحہ بیش از پیش خدمات دین کی توفیق سے نوازتا رہے۔ اور پھر ان خدمات کو قبول بھی فرمالے، آمین۔

آپ کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے جو اس پر آشوب دورِ ابتلاء میں پیارے آقا کے قرب میں ایک عرصہ گزارنے کی سعادت نصیب ہوگئی۔ ہمیں تو حضور کی پیاری آواز بھی سنے ایک طویل عرصہ ہوگیا ہے۔ دل تو بہت چاہتا ہے مگر اپنے پاس تو صرف حیثیتِ بیکسی ہی ہے۔ لیکن مجھے اپنے مولیٰ سے پوری امید ہے کہ وہ اب زیادہ دیر نہیں ترسائے گا۔ انشاء اللہ العزیز۔

سب کارکنانِ دفتر کی خدمت میں محبت بھرا السلام علیکم عرض ہے۔ نیز درخواست دعا کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو کامل صبر و رضا، استقلال اور ثباتِ قدم کی توفیق سے نوازے۔ اور ہم اپنے مولیٰ کی نظروں میں اس کے وفا شعار بندے ٹھہریں۔ آمین۔

خط نمبر:6 بتاریخ: 29.03.1987

استاذی المکرم حضرت میر محمود احمد صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کچھ عرصہ ہوا آپ کے پرنسپل جامعہ بننے کی خبر ملی۔ اللہ تعالیٰ آپ کیلئے یہ منصب مبارک کرے اور اس عظیم ذمہ داری کو کما حقہ نبھانے کی توفیق، ہمت اور سعادت نصیب کرے۔ آمین۔ آپ کے پر شفقت جذبات

کسی نہ کسی طرح ہمیں پہنچتے رہتے ہیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ مزید دعا کی بیحد ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان تمام تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق بخشے جو اسلام کا غلبہ اور احمدیت کی ترقی اور فتح ہم سے کرتی ہے۔ ہم اس تربیت پر پورے اتریں جو جامعہ نے ہماری کی ہے۔ آمین۔

تمام اساتذہ کرام، طلبہ اور کارکنان کی خدمت میں محبت بھرا اسلام پر خلوص جذبات اور عاجزانہ درخواست دعا خدا حافظ۔

خط نمبر: 7 بتاریخ: 20.04.1986

مکرم و محترم سیّد محمد احمد صاحب! لاہور — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بے پناہ محبت، شفقت اور خلوص سے بھرا ہوا آپ کا گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ جس نے دل میں حضرت امام مہدی علیہ السلام کی عظمت کی ایک اور شمع روشن کردی۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء۔

آپ ایسے بزرگوں کی بے چینی گھبراہٹ اور سب سے بڑھ کر پیارے آقا رحمہ اللہ کی بے قراری کا تصور کر کے خدا تعالیٰ کو اس کی قدرت کاملہ کے واسطے دیتے ہیں، مگر ہمارا ربّ حکیم بھی تو ہے!

خاکسار اور خاکسار کے دیگر ساتھی آپ کے بے حد ممنون ہیں، ہمیں یقین ہے کہ آپ سب کی بے قرار کیفیت اور جگر گداز دعائیں ضرور رنگ لائیں گی، اور ابتلاء کا یہ پر صعوبت سفر ساری جماعت فخر کے ساتھ بلند سروں کے ساتھ طے کرنے کی توفیق اور سعادت پائے گی، انشاء اللہ۔

آپ سے انتہائی عاجزانہ درخواست دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں فوقِ عادت استقامت، صبر وثبات اور کامل وفا اور صدق وصفا کا وہ نمونہ پیش کرنے کی سعادت بخشے کہ آئندہ نسلوں کیلئے مشعل راہ بنا رہے، آمین۔

خط نمبر: 8 بتاریخ: 18.12.85

برادرم امداد الرحمٰن صاحب بنگالی! — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا 9 دسمبر کا تحریر کردہ شفقت نامہ کل ہی ملا۔ شکریہ آپ نے اپنے اس شوق کا اظہار فرمایا ہے کہ آکر ملنے کو جی چاہتا ہے۔ تو جناب عرض ہے کہ آپ آئیں گے، صعوبت سفر برداشت کریں گے پھر پندرہ بیس منٹ تک کی ملاقات کے دوران دو چار باتیں کریں گے۔ ٹھیک ہے دل کو کچھ تسلی ہو جاتی ہے مگر مجھے اس کی

نسبت آپ کے خطوط کا زیادہ مزا آجاتا ہے۔ اس لئے آپ ایسی بات کبھی بھی ذہن میں نہ لائیں اور ہمارے لئے دعائیں کردیا کریں۔ آج محترم صدر صاحب خدام الاحمدیہ اور مرزا لقمان صاحب ملاقات کیلئے تشریف لائے۔ چنانچہ بڑی اچھی طرح ملاقات ہوگئی۔ الحمدللہ۔ آپ کا بھی محمود صاحب سے کچھ ذکر ہوا۔

آپ کی صحت کیوں خراب ہوگئی......... اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت سے رکھے۔ اور خوشگوار اور پرسکون لمحاتِ زندگی عطا فرمائے۔ اور تمام خواہشات کو پورا کردے۔ دیارِ حبیب کی زیارت بھی نصیب ہو اور بچوں کو ننھیال جانا بھی نصیب ہوجائے۔ اور پھر یہ امور بہت زیادہ برکتوں والے ہوں۔ آپ کی یہ تمام قربانیاں قبول ہوجائیں۔ اور ان کے کئی گنا اجر اسی دنیا میں بھی آپ کو مل جائیں۔ مکرمی مبارک بسراء اور سید طاہر محمود صاحب کو بہت بہت مبارکباد پیش کردیں۔ اور السلام علیکم بھی۔

خط نمبر: 9 بتاریخ: 14.10.1985

مکرم ومحترم قمر داؤد صاحب مربی سلسلہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ لوگوں کے دل ہمارے لئے بیقراری کے ساتھ بے تحاشا دھڑک رہے ہوتے ہیں اور ہمیں یہاں اس جزیرہ نما میں اس دھڑکن کی دھمک محسوس ہورہی ہوتی ہے۔ پھر آپ کی آنکھوں کا پانی مسلسل بخارات بن کر دن رات ہم پر آکر برس رہا ہے۔ ہمیں اپنے قدرتِ کاملہ کے ربّ سے کامل امید ہے کہ وہ ہر احمدی کے دعاؤں میں ڈھلے ہوئے تمام جذبات کو شرفِ قبولیت بخشے گا۔ ایک ایک آنسو اور درد کی ایک ایک ٹیس ہماری ابدی اور حقیقی خوشیوں اور سکون وقرار میں بدل جائے گی۔ انشاء اللہ۔ لیکن ہمارا ربّ حکمت بالغہ کی صفت سے بھی موصوف ہے۔ اور ہم جاہل نادان بندے اس کی حکمتوں کو کیا سمجھیں!

آپ کی ملاقات کیلئے تشریف آوری میرے لئے بیحد خوشی اور حوصلہ افزائی کا موجب ہوئی، جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ اسی طرح پرسوں آپ کی طرف سے پیار بھرا شفقت نامہ موصول ہوا۔ جو مہکتی خوشبو کے تحفے ساتھ لایا۔ میں آپ کا اس محبت وشفقت کے اظہار پر بھی بہت ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی بہترین جزاء عطا فرمائے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر اور کیا جزاء ہوسکتی ہے کہ مولا کریم آپ کا وقف قبول فرمالے اور اپنے فضل سے اس عہد وقف کو کامل وفا کے ساتھ نبھاتے ہوئے آپ مقبول ومستحسن

خدمت دین کی توفیق سے آراستہ رہیں، آمین۔ میں بھی آپ سے ایسی ہی دعا کی درخواست کرتا ہوں۔

بزرگوار واستاذی المکرم دہلوی صاحب، مخدومی آغا صاحب کی خدمت میں اور شوق صاحب کے ساتھ باقی تمام کارکنان کی خدمت میں محبت بھرا اسلام عرض کردیں۔

خط نمبر:10 بتاریخ: 14.12.1988

محترم ملک لطیف احمد سرور صاحب شیخوپورہ      السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ نے آپ کی چار سالہ تضرعات کو یکجا کر کے ان سب کا نقشہ اور اس کا نتیجہ آپ کو ۴ / ۵ دسمبر ۸۸ء کی درمیانی شب خواب میں دکھایا ہے۔ چنانچہ اس کے عین مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنا عظیم الشان فضل فرمایا اور ہم تو اس کا شکر ادا کرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے۔

کس طرح تیرا کروں اے ذوالمنن شکر و سپاس      وہ زبان لاؤں کہاں سے جس سے ہو یہ کاروبار

یہ آپ کے تڑپتے ہوئے جذبات ہی ہیں اور دل ہلا دینے والی آہ و بکا ہی ہے جس نے عرش کے کنگروں کو ہلا کر رکھ دیا اور اللہ کی رحمت اس قدر جوش میں آئی کہ تمام قیدیان سزائے موت اس کی رو میں بہہ گئے، الحمدللہ ثم الحمدللہ۔

آپ کی خدمت میں اور آپ کی وساطت سے تمام احباب جماعت کی خدمت میں، مَیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا گو ہوں کہ اللہ آپ سب کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔ آپ سب نے یقیناً بہت بڑی خدمت کی ہے اور ہمارے تو اس سفر کا زادِ راہ ہی آپ کے جذبات اور آپ کی پرسوز دعائیں تھیں اور انہیں دعاؤں کو ہم نے ہر دم آسمان سے اللہ کے فضلوں کی صورت میں موسلا دھار بارش کی طرح برستا ہوئے دیکھا اور اس سے پوری طرح حظ اٹھانے کی کوشش کی، الحمدللہ۔

خط نمبر:11 بتاریخ: 14.12.1988

بزرگوار محترم کمال یوسف صاحب      السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا شفقت نامہ ملا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سب احباب جماعت کی ارب ہا دعاؤں اور تضرعات کو سنا اور اپنی رحمت اور مغفرت کی ایسی بارش برسائی کہ پورے ملک میں ایک بھی

سزائے موت کا قیدی اس سے محروم نہ رہا۔ الحمدللہ۔ آپ نے اپنے جس رؤیا کا اپنے گرامی نامہ میں ذکر فرمایا ہے، میرے نزدیک وہ چار سالہ اضطرابی کیفیات کا مجموعی نظارہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا، الحمدللہ۔ خدا کرے کہ اب ہمیں اللہ کے ان افضال و برکات کو سمیٹنے اور ان کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ آپ کی سویڈن میں نئی تقرری آپ کو بہت مبارک ہو اور اللہ تعالیٰ آپ کو ان سرد علاقوں کو حرارت ایمانی سے گرمانے کی بیش از پیش توفیق عطا فرماتا رہے۔ آمین

سب احباب جماعت سویڈن اور ناروے اور ڈنمارک کی خدمت میں میری طرف سے محبت بھرا اسلام اور عاجزانہ دعاؤں کی درخواست پہنچا دیں اب ہم اللہ کے فضل سے آزاد ہیں اور عام جیل میں رہ رہے ہیں جو کال کوٹھڑیوں سے بہت مختلف اور بہت اچھی ہے تاہم جیل، جیل ہی ہوتی ہے۔ خدا حافظ!

خط نمبر:12 بتاریخ: 19.04.1986

محترم شیخ محمد یونس صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے اپنے شفقت نامہ محررہ 14.04.86 میں اس بات کی پوری احتیاط کی ہے کہ آپ کا مربی سلسلہ کی حیثیت سے تعارف نہ ہو سکے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ دو تین سال پہلے آپ کی تقرری گوجرخان ہی تھی اس لئے آپ یقیناً وہی شیخ محمد یونس صاحب ہیں جو ہر سال مجھے رنگ کا میچ ہراتے رہے۔...... بہر حال یہ پرانی باتیں ہیں لیکن ان کی یاد فارغ اور تنہائی کی گھڑیوں کا بڑا خوشگوار مصرف ہے۔ آپ نے اپنے خط میں بڑی پختگی کے انداز میں اپنے جذبات کا خوبصورت اظہار فرمایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک کروڑ سینوں سے اُبل اُبل کر پھوٹنے والے ان جذبات کو لازماً قبول فرمائے گا۔ وہ لازماً ہمیں فتح و ظفر سے سرفراز فرمائے گا۔ ہم رہیں نہ رہیں ہمارے مشن کو دنیا کی کوئی طاقت ناکام نہیں بنا سکے گی بلکہ یہ قافلہ اپنے عظیم تر سالار کی قیادت میں آگے سے آگے بڑھتا چلا جائے گا، انشاءاللہ العزیز۔

خط نمبر:13 بتاریخ: 17.11.1986

بزرگوارم محترم حسن محمد خان صاحب کینیڈا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی سال ہوئے آپ نے ایک نشست میں مجھے How to read fast کے متعلق بے بہا معلومات سے

نوازا تھا۔ بعدہٗ آپ نے اسی موضوع پر جامعہ احمدیہ میں ایک لیکچر بھی دیا تھا۔ اس میں آپ نے ایک امر یہ بیان فرمایا تھا کہ پڑھتے ہوئے ہاتھ میں قلم رکھا جائے اور اس کے اشارہ کے ساتھ الفاظ کے سیٹ بنا بنا کر پڑھتے جائیں۔ اُس وقت سے میری یہ عادت بن گئی ہے اور جب بھی سنجیدہ قسم کا مطالعہ کرتا ہوں تو میرے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے۔ لطیفہ یہ ہوا کہ یہاں مجھے اس طرح پڑھتے ہوئے دیکھ کر بعض شکی اور وہمی قسم کے مخالفوں نے یہ شوشا چھوڑ دیا ہے کہ یہ بیٹھ کر قرآن کریم کے حروف بدلتا رہتا ہے۔ نعوذ باللہ وانا للہ و انا الیہ راجعون افسوس اپنی جگہ مگر بے اختیار ہنسی چھوٹ جاتی ہے اس بات پر! اس کے ساتھ آپ کی بے تحاشہ یاد آئی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازے آپ نے مجھے اور بے شمار مفید نصائح کے علاوہ یہ نصیحت بھی فرمائی تھی اور اس سے میں نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔ یہ الگ بات ہے کہ شر پسند اس کو شرکی عینک لگا کر دیکھے! اس تمہید با تفصیل کے بعد آپ کے شفقت نامہ کا ذکر ہو جائے۔ آپ کیلئے میرے دل میں بہت احترام اور جوش مارتی ہوئی محبت ہے۔ یقین جانئے آپ کے خط سے آپ کا حال پڑھ کر اور آپ ایسے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے پیار کرنے والوں کا تصور کر کے دل بہت بے قرار ہوا۔ کیفیت اضطراب سے گذر کر اضطرار کی حدوں کو چھونے لگی۔ اللہ آپ سب کی جگر گداز دعاؤں اور پُر درد و کرب جذبات کو قبول فرمائے۔ ساری جماعت کو سکون اور قرار اور مسرت اور شادمانی کے دن دکھائے سب سے بڑھ کر ہمارے پیارے آقا کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرے اور انہیں ہماری طرف سے کبھی کوئی تکلیف دہ خبر یا بات نہ پہنچے۔ آمین یارب العالمین۔ آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اس ناچیز کا عریضہ حضور اقدس کی خدمت میں دستی پیش کیا۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہمارا ذکر آتے ہی حضور بیحد غمگین ہو جاتے ہیں اور اس غم سے اور ہی تڑپ جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں نئے پروجیکٹ کے افتتاح کی خبر بہت خوشکن ہے۔ میری طرف سے آپ کو اور آپ کی ساری جماعت کو مبارکباد پیش ہے۔ میری دعا ہے کہ اسے احسن طریق مکمل کرنے کی آپ سب کو بہت جلد توفیق ملے۔ اور اسے ہمیشہ شجر سایہ دار اور ثمر بار بنائے رکھے، آمین۔

گھر میں سب کی خدمت میں السلام علیکم اور درخواست دعا۔ کبھی کبھی کسی رسالہ میں آپ میں سے کسی نہ کسی کا ذکر پڑھنے میں آتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اعلیٰ روحانی ترقیات سے نوازتا چلا جائے۔ دنیوی نعماء بھی عطا کرے۔ خوشیاں نصیب میں رہیں۔ ہر طرح کی برکات آپ کا گھر بھرے رکھے، آمین۔ بس انہی ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور جذبات کیساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ!

خط نمبر:14 بتاریخ: 31.3.1989

برادرم محمد احمد و محمود احمد اشرف صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی تھوڑی دیر پہلے قریباً آٹھ بجے شب آپ کے پیارے ابا جان کے سانحہ ارتحال کی افسوسناک خبر ملی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مرنا تو ہم سب کو ہے مگر بعض وجود ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے متعلق ایسی المناک خبر سننے کیلئے دل و دماغ ہرگز تیار نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ ایسے ہی واقعات میں سے ہے۔ رَضِینَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَ بِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا بِمَا یَرْضٰی بِہٖ رَبُّنَا۔

ہم سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہوجانے والا یہ پیارا وجود آپ سے جسمانی تعلق کے باوجود آپ سے کہیں زیادہ بلکہ بہت ہی زیادہ جماعت کا اور سلسلہ کا وجود تھا۔ وہ ہمیشہ خادمِ سلسلہ کی درویشانہ شان کے ساتھ نظر آتا، ایک جید عالم اور باذوق ادیب وشاعر کی حیثیت سے اپنی علمی وذہنی استعدادیں اس سلسلہ کی راہ میں لٹاتا، ایک اچھے منتظم اور معاملہ فہم کے طور پر اپنی تمام تر انتظامی اور عملی صلاحیتیں صرف کرتا بلکہ اس اعلیٰ ترین مقصد کیلئے اپنی تمام تر طاقتوں کو نچوڑتا رہا۔ اس راہ میں نہ اپنی صحت کا خیال رکھا اور نہ اپنی بیماری اور تکلیف کی پرواہ کی۔

میرے اس دورِ اسیری کے دوران متعدد بار ملاقات کیلئے تشریف لاتے رہے۔ خطوط کے ذریعہ رابطہ تو ہمیشہ رہا۔ آپ نے اس عرصہ میں ہر لحاظ سے میرے ساتھ بیحد شفقت فرمائی، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔ مگر آپ کی شفقت کا دائرہ انہی ایام تک تو محدود نہیں بلکہ اس کی یاد مجھے کبھی دفتر وقف عارضی میں لے جاتی ہے تو، کبھی دفتر الفضل میں، کبھی میں ان کی شفقتوں کا مورد آپ کے گھر کے اندر ہو رہا ہوں تو کبھی باہر۔ غرضیکہ جہاں بھی ملے، جہاں بھی آپ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ آپ نے پدرانہ شفقت ومحبت کے ساتھ مجھے سلیقہ سکھایا۔ ہدایات دیں اور بیش بہا مشوروں سے نوازا۔ مجھے آپ سے یہی تعلق خاطر تھا کہ آپ کی وفات کی یہ تکلیف دہ خبر سننے پر خیال آیا کہ آپ بھی ہمیں داغِ مفارقت دے سکتے ہیں!؟

یہ موقع آپ کیلئے کس قدر تکلیف دہ ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ مگر میرے لئے بھی، بطورِ خاص اس حالت میں، کچھ کم نہیں۔ میں انہی بھیگے ہوئے الفاظ اور جذبات کے ذریعہ آپ کے گلے ملتا ہوں مگر صرف اس لئے ہی نہیں کہ آپ کو دلاسا دوں بلکہ اس لئے بھی کہ آپ مجھے بھی حوصلہ دیں۔ میرے غم

کو بھی بانٹیں۔ کل صبح اس جیل میں موجود تمام احمدی دوستوں تک یہ افسوسناک خبر پہنچادوں گا تا تمام
دوست دعا کر سکیں۔ خدا حافظ!

خط نمبر:15 بتاریخ: 23.08.1988

برادرم محترم عبدالودود صاحب۔ لاہور (شہید وفا لاہور مئی ۲۰۱۰ء)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پرسوں ایک بیحد پیارا خط موصول ہوا۔ اس پر لکھا ہوا ایڈریس ہی پیارانہ تھا بلکہ اس میں لکھے ہوئے خط کے ہر ہر لفظ سے پیار اور محبت اور الفت کے سوتے پھوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہوئے۔ میری نگاہیں للّٰہی محبت سے سرشار ہو کر اب بھی آپ کی عبارت سے لفظ لفظ چن رہی ہیں۔ آپ کا یہ خط کیا تھا، عید کا بہترین تحفہ! تحفہ بھی ایسا کہ بڑے ہی دلنشین، شیریں اور خوبصورت انداز میں ہمارے حوصلوں کے دل بڑھانے والا، ہمارے عزم و ہمت کو اور بھی مضبوط کرنے والا۔ ہمیں شہادت کا عرفان عطا کرنے اور اس کے شوق سے سرشار کر کے مردانہ وار باطل کی چٹانوں سے ٹکرا جانے کیلئے تیار ہونے والا تحفہ!

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے آپ کو اس کی جزاء خیر عطا فرمائے۔ ہماری قربانی میں یقیناً آپ لوگوں کا بھی پورا پورا حصہ ہے جو ہمارا ہر طرح سے خیال رکھے ہوئے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ آہنی سلاخیں اور یہ بلند دیواریں ہم سے زیادہ آپ کے سینوں میں ٹھکی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ اور ہماری نسبت آپ کو زیادہ گھٹن اور حبس محسوس ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ ساری جماعت کی ان مشکلات کو دور فرمائے او روہ وقت جلد لائے جب ہم اپنے پیارے آقا کو ایک دفعہ پھر اپنے درمیان رونق افروز پائیں۔ وہ شمع پھر ہمارے ہاں روشن ہو اور ہم اس پر عملاً دیوانہ وار فدا ہوں۔ آمین۔

اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے اور ترقیات سے نوازے آمین۔ اپنی والدہ محترمہ اور گھر میں سب افراد کی خدمت میں میری طرف سے مؤدبانہ پر خلوص سلام عرض کر دیں۔ اسی طرح برادرم جاوید صاحب اور دیگر احباب کی خدمت میں بھی!

مجھے آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ آپ کا جماعت احمدیہ کے نستعلیق رنگ میں رنگین وجود باعث فخر ہے۔ میں دل میں کہا کرتا ہوں کہ یہی وہ خوش قسمت ہیں جنہوں نے نظام جماعت کی تربیت سے صحیح حصہ

لیاہے اور اس کے نور سے اپنے آپ کو منور کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس لحاظ سے بھی آپ کو بے پناہ برکت دے اور یہ سلسلہ آپ کی نسلوں میں بھی جاری وساری رہے، آمین۔ خدا حافظ!

خط نمبر:16 بتاریخ:02.02.1988

برادرم محترم منیر احمد جاوید صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی چاہت، آپ کا خلوص، اپنائیت کا جذبہ، آپ کی محبت کا سمندر ایک خط کی تمثیل میں مجھ تک پہنچا، جہاں میری آنکھیں اس خط، پیارے خط کو دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھیں، وہاں اس خط کو پڑھ کر میرا دل بھی آپ کی محبت سے بھر گیا۔ اس قدر بھرا کہ آنکھوں سے چھلک گیا۔ میرا ذہن جہاں ماضی کے گلزاروں کی، آپ کی رفاقت میں، سیر کرنے لگا، وہاں حال کے ایوانوں میں بھی آپ کے ساتھ گھومنے لگا۔ آپ کا یہ خط مجھے لے کر علم وفضل کے سمندر میں آپ کے مقام کی طرف روانہ ہوا تو مجھے راستہ میں بے تحاشا غوطے آنے لگے۔ تب مجھے پتہ لگا کہ میں اپنے اس بھائی سے بہت پیچھے ہوں۔ میرا یہ بھائی علم وہنر کی بہت سے منازل طے کر کے بہت دور ڈیرے جما چکا ہے۔ اللھم زد فزد۔

مجھے آپ کا یہ خط پڑھ کر بڑی شدت سے احساس ہوا کہ مجھے بھی سنجیدگی سے کم ازکم ابتدائی منازل کا قصد کرنا چاہئے کہ سیانے کہتے ہیں کہ

"نااہل کو ڈھانپنے کا سنجیدگی سے بہتر کوئی لبادہ نہیں"

آپ نے میرے نام کے حوالہ سے جو باتیں لکھیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کا مصداق ہونے کیلئے نام کی مطابقت اور موافقت ضروری نہیں ہے۔ اس کیلئے تو عمل چاہئے اور یہی عمل ہمارے ہاں مفقود الخبر ہے۔ آپ لاکھ کہیں، لیکن میری نسبت میرے متعلق مجھ سے زیادہ آپ نہیں جانتے۔ اس لئے براہ کرم آپ میرے لئے اور میرے ساتھیوں کیلئے دردِ دل سے استقامت کی، صبر وثبات اور صدق وصفا کی دعا کیا کریں۔ فی الحال تو اپنا زادِ راہ صرف یہی ایک خیال ہے کہ ہم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام امام آخرالزمان کی طرف منسوب ہونے والے ہیں اور منادی کی آواز پر لبیک کہنا ہی ہمارا جرم ہے! اس لئے ہمیں حوصلہ ہے، ہمیں تسلی اور اطمینان ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے پیارے مہدیؑ کے صدقے ہم سے رحمت کا سلوک فرمائے گا انشاءاللہ

میں بے عمل سہی پر وفا آشنا تو ہوں　　میرے خبیر! اس طرف بھی اک نگاہ ناز

ہاں مرد فارسی سے تعلق مرا بھی ہے　　تیری عنایتوں کے تصدق مجھے نواز

آپ کے والدین اور دیگر افرادِ خاندان کے یورپ سدھارنے کا آپ کے خط سے ہی علم ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کیلئے فلاح و بہبود اور آسودگی کے سامان کرے..... دین کی رفعتیں بھی عطا فرمائے اور دنیا کی ترقیات بھی! آمین۔ میرے دعائیہ جذبات اور تحیات پیش کر دیجئے۔ شکریہ۔

یہاں ہم تیشۂ بے کسی کاندھے پر اُٹھائے، اللہ کی حمد و شکر کے ترانے گاتے ہوئے، اسلام کے کے غلبہ اور احمدیت کی ترقی کیلئے دعائیں کرتے ہوئے، آگ اور خون کے اس جنگل کا سفر طے کئے جا رہے ہیں اور آگ کے شعلوں کو اپنے پسینوں کے قطروں اور چھالوں کے پانی سے سوں سوں بجھتے ہوئے سن اور دیکھ رہے ہیں۔ تاہم ہر لحہ یہ خوف اور خشیت ہم پر کپکپی طاری کئے ہوئے ہے کہ راہِ وفا کے اس سفر میں کسی مقام پر ہمارا قدم چوک نہ جائے۔ اُدھر پیارے امام (رحمہ اللہ) کے خطبہ جمعہ نے ساری جماعت کے سر اور ایمان کے امتحان کی ذمہ داری ہمارے ہی شل کاندھوں پر ڈال دی ہے۔ اس لئے ہم دعاؤں کے بہت محتاج ہیں۔

اب رخصت ہونے سے پیشتر اس امر کی معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے جواب آں خط کی رعایت سے کچھ پرتکلف الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے اور میں یہ نہیں جانتا کہ اس کا استعمال برمحل ہے یا بے محل، میں نے انہیں کسی تمیز کے بغیر ہی جڑ دیا ہے۔ اسلئے آپ میرے جذبات کی روشنی میں صحیح زبان میں ترجمہ کرلیں۔

امید ہے کہ آپ اگلے خط میں اپنی روزمرہ مصروفیات اور مصر میں زندگی کے رنگ ڈھنگ سے بھی نوازیں گے۔ اللہ آپ کے ساتھ ہو اور آپ کو زیادہ سے زیادہ فن اور علم جذب کرنے کی توفیق دے اور پھر جب آپ واپس آئیں تو ہم دیسی لوگ آپ کو جتنا نچوڑتے جائیں اتنا ہی علم آپ سے بہتا چلا جائے اور بہتوں کو سیراب کر کے سرسبز و شاداب کھیتیاں اُگانے اور بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرنے کی توفیق پائیں۔ آمین۔

خط نمبر: 17 بتاریخ: 10.02.1986

بزرگوارم محترم رشید احمد چغتائی صاحب ربوہ　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

استاذی المکرم کے خط سے معلوم ہوا کہ میرے ایک استفسار کے سلسلہ میں آپ نے نوٹ تیار کیا ہے۔

جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ نوٹ پڑھ کر علم ہوا کہ آپ نے اس کی تیاری کیلئے اچھی خاصی عرق ریزی کی ہے۔ اس نوٹ میں آپ نے دو امور واضح فرمائے ہیں۔ ایک تو روایت کا ضعف اور دوسرے اس روایت میں عموم نہیں بلکہ خصوص ہے۔ جہاں تک روایت کے ضعف کا تعلق ہے، وہ تو تسلیم اور اس سے تو مسئلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک اس میں خصوصی کا معاملہ ہے یہ کچھ کھٹکتا ہے اور وہ یوں کہ آپ نے جو لانرث ولا نورث والی روایت کا حوالہ دیا ہے اس میں تو دو امور مفہوم کو واضح کر دیتے ہیں۔

☆ جمع کے صیغہ کے ساتھ شاہانہ طرز کلام۔

☆ حضرت عائشہؓ کی وضاحت **یرید نفسه**۔

جبکہ اس زیر بحث حدیث میں یہ دونوں امور موجود نہیں۔ اس لئے میرے خیال میں اس روایت کو خاص نہیں قرار دیا جا سکتا کیوں کہ اس میں قطعی طور پر عمومی طرز بیان بھی ہے قطُّ اور ما من کے الفاظ کے ساتھ، باقی اس کے ضعف والی بات درست ہے۔ اور اس کی فعلی شہادت انبیاء و سابقین کی تدافین کے واقعات سے ملی ہے۔ جن کی آپ نے متعدد مثالیں لکھی ہیں۔ فجز اکم اللہ احسن الجزاء۔
آپ کی صحت کیسی ہے اور کیا ڈیوٹی مستقل طور پر قضاء میں ہے؟ محترم شیخ نعیم صاحب کے متعلق اطلاع تھی کہ سیرالیون جا رہے تھے۔ کیا وہ چلے گئے ہیں ان کے والد کی وفات ہو گئی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اگر وہ یہاں ہی ہوں تو میری طرف سے تعزیت کا پیغام پہنچا دیں۔ نیز السلام علیکم اور درخواست دعا ہے۔

خط نمبر: 18 بتاریخ: 17.05.1987

محترم عبدالحلیم طیب صاحب۔ لاہور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں آپ کا بیحد ممنون ہوں کہ آپ ہمارے لئے بیحد تڑپ، درد، الحاح اور اضطراب کے ساتھ مجسم دعا بنے ہوئے ہیں۔ اور ہر لمحہ محبت کے موتی ہمارے لئے نچھاور کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تضرعات کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اور جوش اور جذبہ اور پر سوز دعاؤں کا یہ سیلاب دوام اختیار کرے اور صرف موسم برسات میں ہی نہیں بارہ مہینے پورے زور وشور کے ساتھ بہتا رہا کرے۔ آمین۔
ٹھیک ہے کہ یہ وقت بڑا سخت ہے اور کسی احمدی کو اس وقت تک قرار اور سکون نہیں آ سکتا جب تک ہمیں ظلم کے اِس پنجہ سے مکمل نجات نہیں مل جاتی، لیکن اس میدانِ خارزار سے گزرتے ہوئے ہمیں ساری جماعت

اور ساری جماعت کے امام ایدہ اللہ تعالیٰ کی دعاؤں کے طفیل نہ تو دھوپ کی تیزی اور شدت وحدّت تنگ کرتی ہے اور نہ ہی وادیٔ خارزار کے کانٹے اور ظالم کے کنکرے ہمیں تکلیف پہنچا پاتے ہیں۔ آپ کی دعائیں بخارات میں تبدیل ہو ہو کر گھنے بادلوں کی صورت میں ہم پر ٹھنڈا سایہ کئے ہوئے ہیں تو یہ زمینی کانٹے موجب راحت بنے ہوئے ہیں ؎

جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر — ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں

اُمید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ بھی ہمیں پہلے کی طرح بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اپنی جگر پاش دعاؤں سے نوازے رکھیں گے کہ اب تو دعاؤں کا اور قبولیت کا مبارک مہینہ ہے۔

خط نمبر:19 بتاریخ: 16.06.1986

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ — محترم حبیب الرحمٰن زیروی صاحب

توقع کے عین مطابق آپ لائبریری کے ریکس کے درمیان اپنا بیشتر وقت گزار کر بے شمار تشنگان علم وادب کی سیرابی کیلئے خدمات سرانجام دے رہے ہوں گے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آمین۔ میرے دل میں آپ کے اس انداز کی بڑی قدر ہے کہ آپ ہر کسی کی ہر ممکن منزل تک راہنمائی کرتے ہیں خاص طور پر لائبریری سے استفادہ کرنے والے ایک خاص گروہ کیلئے آپ کے جذبۂ خدمت اور اظہارِ ہمدردی سے بہت متاثر ہوں۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔ لائبریری کا نیا بلاک تو چالو ہو کر اب تک پرانا بھی ہو چکا ہوگا۔ کیسا انتظام جارہا ہے۔ خیال ہے کہ اس کی وجہ سے لائبریری کے اصل ہال پر بوجھ میں کافی کمی آگئی ہوگی اور یہاں بڑے ریکس کے درمیان اب اتنا فاصلہ ضرور ہو گیا ہوگا کہ..........

اچھا اب آمدم برسر مطلب کہ یہاں ہمارے ساتھ بہاولنگر کے کچھ قیدی مارشل لاء کے ڈسے ہوئے ہیں جنہیں ہائیکورٹ میں رٹ کے سلسلہ میں اپنے وقوعہ کا اخباری مواد درکار ہے اس کا حوالہ حسب ذیل ہے۔

7/5/82 کی اخبار جنگ کے صفحہ اوّل یا آخر پر موضع بہاول گڑھ تحصیل منچن آباد کے قتلوں کا واقعہ۔

9/5/82 کی اخبار نوائے وقت کے صفحہ اوّل یا آخر پر مذکورہ بالا وقوعہ کی خبر۔

براہِ کرم ذرا تکلیف کر کے ان ہر دو تراشوں کی فوٹو کاپی کر کے ارسال کر دیں۔ میں اپنے بچوں سمیت تاعمر آپ کا ممنون احسان رہوں گا۔ شکریہ۔

خط نمبر: 20 بتاریخ: 02.05.1986

استاذی المکترم ماسٹر احمد علی صاحب ربوہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی دعاؤں اور مضطرب جذبات کو الفاظ میں ڈھال کر جو ملفوف آپ نے ارسال کیا تھا، ملا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء میں تو حیران ہوتا ہوں کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں، لیکن آپ لوگ مجھے اس قدر محبت اور شفقت سے نواز رہے ہیں۔ میرے قالب میں بھی تو اسی قسم کی انسانی جان ہے، جو ہر جیل میں محبوس ہزاروں قیدیوں کے جسموں میں ہے۔ پھر یہ کیا عجیب نظارہ سارے جیل والے ہی کیا قیدی اور کیا انتظامیہ دیکھتی رہی کہ ہر روز محبت والفت بڑھ کر فدائیت کے پیکر ملاقات کیلئے چلے آرہے ہیں تو دوسری طرف عقیدت کے خطوط انہیں سنسر کرنے پڑ رہے ہیں۔ میں انہی خیالوں میں گم جب اس نکتہ پر پہنچتا ہوں کہ یہ تو امام مہدی علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ ہاں اسی مہدی کا زمانہ جس کے فرقہ کے متعلق، سرور کائنات فخر موجودات ﷺ نے فرمایا تھا کہ اَلاَ وَھِیَ الْجَمَاعَۃُ اور جماعت کی دوسری جگہ یہ تشریح فرمائی کہ وہ ایک جسم کی طرح ہوتی ہے۔ جس کے ایک حصے کو تکلیف پہنچے تو سارا بدن مضطرب و بے حال ہو جاتا ہے۔ پس آج ہم صرف اسی ایک پہلو سے خدا کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے کہ اُس نے ہمیں اس پاک مہدی کی غلامی سے سرفراز فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے آباء پر بھی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے جنہوں نے امام الزمان کو شناخت کر کے قبول کرنے کی توفیق پائی اور اس طرح سے مفت میں ہمیں اس نعمت سے حصہ مل گیا۔ فالحمدللہ علیٰ ذلک۔

پیارے ماسٹر صاحب! میرے لئے بہت دعا کریں کہ مجھے اس پہلو سے خدا تعالیٰ کا بہت زیادہ شکر کرنے کی توفیق ملی۔ گو حق ادا کرنا تو ہے ہی ناممکن کہ وہ زبان لاؤں کہاں سے جس سے ہو یہ کاروبار۔

اس کے ساتھ ساتھ استقامت کیلئے بھی درخواست دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو غیر معمولی بشاشت کے ساتھ صبر و رضا اور صدق وصفا کا شاندار نمونہ پیش کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔ برادرم نصیر صاحب کے پاس ہونے کی میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ برادرم موصوف کو بھی پیش کر دیجئے۔ آپ کی سعادت بھی قابل رشک ہے۔ ایک بیٹا واقفِ زندگی اور مربی سلسلہ ہے تو دوسرا حافظ قرآن۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔ سب بچوں کی خدمت میں بھی میرا سلام اور حسب مراتب پیار۔

اور حمہ جانا ہو تو سب احباب جماعت تک میرا محبت اور خلوص بھرا اسلام پہنچا دیں۔ شکریہ۔ اسی طرح اردگرد کے سب دکانداروں اور سکول میں ماسٹر عبدالرشید صاحب، ماسٹر عبدالرب اور ماسٹر ستار چوری صاحب، ماسٹر مسعود صاحب کی خدمت میں میرا مؤدبانہ سلام اور جذبات تشکر پہنچا دیں کہ ان بزرگوں نے مجھے زیور علم سے آراستہ کرنے میں اپنا خون پسینہ ایک کیا۔ یہ سب بزرگ زندگی کے ہر موڑ پر یاد آتے رہیں گے۔

خط نمبر: 21 بتاریخ: 04.05.1986

میرے پیارے بھائی بشیر الدین صاحب وطلبہ جامعہ انڈونیشیا وملائشیا!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط پڑھ کر مجھے بیحد سرور آیا۔ آپ نے جس محبت اور پیار کے ساتھ یہ خط لکھا ہے، وہ اس خط کے لفظ لفظ سے چھلک رہا ہے۔ آپ ایسے پرانے ساتھیوں اور دوستوں کے خطوط آتے ہیں تو پرانی یادوں کی فلم چل پڑتی ہے اور گزرے ہوئے دن یاد آنے لگتے ہیں اور میں اپنے آپ کو جیل کی بجائے آپ لوگوں کے درمیان پاتا ہوں۔ خیر آپ لوگ تو ہر وقت ہی ہمارے روزنِ زنداں سے آنکھیں لگائے رہتے ہیں۔ آپ کی اس کیفیت کا تصور ہمیں بیحد مضطرب کر دیتا ہے۔ ایک طرف تو آپ کے قرار اور سکون کیلئے خدا سے دعا مانگتے ہیں تو دوسری طرف اس کی حمد کے ترانے گاتے ہیں کہ اُس نے آج کے اِس تاریک زمانہ میں اپنے پیارے مہدی کو بھیجا، جس نے ہمیں ایک بدن بنا دیا۔ اور آج اس کی غلامی کا نتیجہ ہے کہ چوبیس گھنٹوں کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں جس میں دنیا کے کسی نہ کسی حصہ میں کوئی نہ کوئی آنکھ ہمارے لئے آنسو نہ بہا رہی ہو۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب احباب کی دعاؤں اور مخلصانہ جذبات کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اور آپ کو اس کی بہترین جزاء سے نوازے اور سب کو خلافت احمدیہ کا دامن مضبوطی اور بہت ہی مضبوطی سے تھامے رکھنے کی سعادت عطا فرمائے۔ اور باقی دنیا کو بھی اس سچے مامور زمانہ کو شناخت کر کے اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی توفیق بخشے۔ تا سب لوگ اس شیریں چشمہ سے پانی پئیں اور اس دنیا کو جنت بنا دیں۔ آمین۔

آپ نے خط لکھ کر جہاں موجودہ طلبہ جامعہ انڈونیشیا کی یاد دلائی وہاں طلباء سابق کی یاد بھی خوامخواہ آ گئی۔

محترم سفنی ظفر صاحب، پھر منیر الاسلام صاحب اور برادرم عبدالباسط صاحب، خیر الدین صاحب یہ سب بڑے پیارے وجود ہیں۔ان کیلئے میرے دل میں بے پناہ محبت اور احترام کے جذبات ہیں۔ برادرم عبدالباسط صاحب اور خیر الدین صاحب تو خیر سے میرے کلاس فیلو بھی رہے ہیں۔اور بڑے ہی اچھے اور نیک دوست تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضلوں سے نوازے۔ انہیں خدمت دین کی شاندار رنگ میں توفیق بخشے اور وقف کا سلسلہ ان کی نسلوں میں جاری رہے۔ آمین۔ ان سب تک اگر ہو سکے تو میرا اسلام اور مخلصانہ پیار بھرے جذبات پہنچا دیں۔شکریہ۔

اس وقت زیر تعلیم طلبہ کے نام تو مجھے یاد نہیں ہیں۔صرف احمد سپر جا حسن کا نام یاد ہے۔اس لئے سب طلبہ تک میرا اسلام پہنچا دیں۔اب معلوم ہوتا ہے کہ مالی قربانی کے بعد جانی قربانیوں کا وقت آرہا ہے۔ اس لئے جامعہ سے فارغ ہوں تو اپنے آپ کو اس عظیم فدیہ کیلئے تیار کر چکے ہوں۔اور جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہے کہ آپ کے انڈونیشیا میں اب پاکستان ایسے حالات پیدا کئے جا رہے ہیں۔اس لئے صحابہ کرامؓ کے واقعات کو بار بار پڑھ کر اپنے ایمانوں کو تازہ کریں۔اور ساتھ ساتھ ہمارے لئے خاص طور پر یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں غیر معمولی استقامت سے نوازے کیونکہ الاستقامة فوق الکرامة۔ ہم صبر و رضا کا پیکر بن کر صدق وصفا کے وہ نمونہ چھوڑ جائیں کہ قیامت تک ان کی روشنی سے آنے والے استفادہ کرتے رہیں۔ہماری سب سے بڑی یہی خواہش ہے یہی تمنا ہے اور یہی دعا ہے۔

جامعہ کے دیگر طلبہ تک بھی میرا محبت بھرا اسلام پہنچا دیں۔اسی طرح جملہ اساتذہ اور سٹاف کی خدمت میں بھی۔خاص طور پر میجر نذیر صاحب اور مکرم سلیم صاحب کو۔آپ تو اب واپس جانے والے ہوں گے۔خدا کرے کہ آپ کی کامیاب وطن واپسی کیلئے، آپ کے خاندان کیلئے اور آپ کے وطن اور قوم کیلئے ہر لحاظ سے باعث برکت ہو۔اور آپ کو بہتوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا دے، آمین۔

خط نمبر: 22 بتاریخ: 17.03.1986

محترم میجر منظور احمد صاحب۔ساہیوال　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط پرسوں موصول ہوا جزاکم اللہ احسن الجزاء۔اس سے قبل 13 فروری کو آپ کی طرف سے برادرم

زاہد صاحب کی دعوت ولیمہ کا کارڈ ملا تھا۔ جس میں شمولیت کرنی تھی مگر نہ کر سکے............ یہ نہ تھی ہماری قسمت! لیکن ہماری قسمت تو اُس وقت تاریخ اسلام کا ایک پورا باب زندہ کر رہی تھی، اس لئے ہمیں عدم شرکت کا بالکل افسوس نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے دو روز بعد 17 فروری کو آپ کو خصوصی طور پر السلام علیکم اور مبارکباد ارسال کی تھی، پتہ نہیں گردِ راہ کی نذر ہوگئی یا آپ تک اس کی رسائی ہوئی۔

عجیب اتفاق ہے کہ جب آپ کا مرسلہ کارڈ ملا تو بعض ساتھی کہنے لگے ہمیں کارڈ بھیجنے کا کیا فائدہ؟ میں نے کہا عین ممکن ہے کہ ہمارا فیصلہ ہوجائے اور ہم دعوت میں شرکت بھی کرلیں...... کنری کے ڈاکٹر منصور صاحب کی نظم سے خوب محظوظ ہوئے ہیں بلکہ ایمانوں کو تازہ کرنے، نیا جوش قربانی اور نیا ولولہ پیدا کرنے والی ہے۔ میں نے تو بڑی دیر سے یہ شعر یاد کیا ہوا ہے اور اکثر اسے دہراتا رہتا ہوں ؎

اب راہِ صداقت میں ہم نے یہی ٹھانی ہے ایماں کا بھرم رکھیں یہ جان تو جانی ہے

برادران ماہد صاحب، زاہد صاحب اور طارق صاحب کو میرا محبت بھرا اسلام پیش ہے۔ مجھے پتہ نہیں کیوں ان تینوں بھائیوں سے بہت زیادہ اُنس بلکہ محبت ہے: بڑھتی رہے یہ محبت خدا کرے۔

خط نمبر:23 بتاریخ: 31.05.1986

محترم حافظ مظفر احمد صاحب۔ ربوہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی صحت سے متعلق ایک عرصہ تک کوئی تسلی بخش اطلاع نہ مل سکی تھی۔ پچھلے دنوں کسی رسالہ میں مجلس مشاورت کی کارروائی کے سلسلہ میں پڑھا کہ آپ کو کسی اجلاس کی تلاوتِ قرآن کریم کی سعادت ملی۔ اس سے اندازہ کرلیا کہ اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے پہلے کی نسبت صحت بہرحال اچھی ہے، الحمدللہ۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ سے نوازے اور لا یغادر سقمًا کے مطابق جسم کے ہر رگ و ریشہ سے بیماری کے تمام ذرات اور اس کے اثرات کو نکال باہر کرے۔ آمین ثم آمین۔

محترم حافظ صاحب! یوں تو 26 اکتوبر 84ء سے ہی خاکسار آپ سب احباب جماعت کی محبت کا مورد بنا ہوا ہے مگر گزشتہ اڑھائی ماہ سے تو بطور خاص اُن کروڑوں محبت کے موتیوں کو سمیٹنے کی بیحد فکر میں رہتا ہوں جو دنیا بھر میں بسنے والے پیاروں کی آنکھیں ہر لحظہ ہم پر نچھاور کر رہی ہیں۔ میں جب اپنے ماضی کا حال

کے ساتھ اور جماعت کی خدمت کرنے کی کوشش کا احباب کے موجودہ اضطراب اور عقیدت کی حد تک محبت اور پیار کی صورت میں ملنے والے بے بہا صلہ کا موازنہ کرتا ہوں تو دم بخود ہو کر رہ جاتا ہوں۔ ان نسبتوں کے کنارے ملتے ہوئے دکھائی دینے تو کجا قریب ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے۔ یہ سب میرے مولیٰ کا فضل اور اس کی رحمت کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے بحر بے کنار کا حسین نظارہ ہے۔ میں اس کی قدرتوں پر قربان کہ وہ جانے اپنی کیسی کیسی حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت ہم ایسے کیڑوں کو بھی اپنے حضور کچھ پیش کرنے کی اجازت اور موقع دے دیتا ہے۔

ایسے میں میری آپ سے عاجزانہ درخواست دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر ہم سے جو قربانی بھی طلب کرے ہمیں وہ قربانی پوری بشاشت، وفا اور مثالی صدق وصفا کے ساتھ بے دھڑک پیش کر دینے کی توفیق بھی خود ہی عطا فرما دے کہ ہم تو بہت ہی کمزور ہیں۔ ہمارے جسم گناہوں سے چھلنی ہیں تو ہماری روحیں طرح طرح کی آلائشوں سے آلودہ ہیں۔ وہی ہے جو ہمارے ساتھ عفوانہ مغفرت فرماتے ہوئے ہمیں قبول فرمالے۔ آمین ثم آمین۔

گھر میں سب کی خدمت میں حسب مراتب السلام علیکم عرض کر دیں۔ والد محترم کی خدمت میں خصوصی سلام اور درخواست دعا اور عید الفطر کے قرب کے پیش نظر میری طرف سے دلی عید مبارک بھی قبول فرمایئے، ہاں وہی عید مبارک جس سے اوّلین کی تین سو سالہ تاریخ معطر ہے اور جس کی صدائے بازگشت آج آخرین کی بستیوں سے سنائی دے رہی ہے، خدا حافظ!

خط نمبر: 24 بتاریخ: 26.02.1986

بھائی جان صاحبان و بھابیاں صاحبات! (امریکہ) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تذکرۃ الشہادتین میں بڑے ہی درد اور تڑپ کے ساتھ یہ بیان فرمایا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ میرے بعد میری جماعت کے افراد استقامت کا کیا نمونہ دکھائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے اس پیارے بندے کا یہ انداز اتنا بھایا کہ اس نے اپنے فضل سے آپ کی جماعت کو ایسے خلفاء عطا فرمائے جنہوں نے ہماری ایسی تربیت فرمائی کہ اس وقت صرف ہم دو ہی نہیں بلکہ جماعت کے بیشمار احباب حضرت سیّد عبد اللطیف صاحب شہید کی دکھائی ہوئی راہ پر قدم مارنے کیلئے بے قرار اور

مضطرب ہیں۔ الحمدللہ کہ وہ امر جس کا ایک لحاظ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے حسرت کے طور پر ذکر فرمایا حقیقت بن چکا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو جماعت کی اس کیفیت سے آگاہ کرتے ہوں گے تو حضور کا دِل طمانیت اور سرور سے بھر جاتا ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو، آمین ثم آمین۔

پھر سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس زمانہ میں اسلام کے احیائے نو کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ اسلام کا زندہ ہونا ہم سے ایک فدیہ مانگتا ہے وہ کیا ہے اُس کی راہ میں مرنا۔ اِن امور کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ کیفیت کا خوف اور ڈر کافور ہوجاتا ہے۔ بلکہ بے پناہ سکینت اور اطمینان کا احساس سارے جسم میں سرایت کر جاتا ہے کہ ہمیں اِن باتوں کو عمل میں ڈھالنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی تحریرات میں بڑی کثرت کے ساتھ غالبؔ کا شعر درج ہے اور ایک جگہ تو آپ لکھتے ہیں کہ تھا تو وہ بے دین مگر بات بڑی سچی کہہ گیا ہے ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی　　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس لئے آج اگر کوئی ظالم ہمارے مستقبل سے ظلم کی راہ سے کھیلتا ہے تو ہمیں قطعاً کوئی ملال اور دکھ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہمارا جرم صرف اور صرف سمعنا منادیاً ینادی ہے اور یاد رہے کہ ہم قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں وہ بھی صرف اس لئے کہ تم جس جرم کا لیبل لگا کر ہمیں مارنا چاہتے ہو ہم وہ لیبل نہیں لگنے دیں گے۔ تم دنیا کو دھوکہ دینا چاہتے ہو، ہم یہ دھوکہ نہیں چلنے دیں گے۔ ہم ثابت کریں گے کہ ہم قاتل نہیں ہیں بلکہ قاتل تم خود ہو جنہوں نے ان کو بھیجا تھا کہ جاؤ اور کلمہ مٹاؤ۔

بڑے بھائی جان کا 27.01 کا لکھا ہوا خط ساہیوال ڈاکخانہ کی 25.02 کی مہر کے ساتھ کل شام ملا۔ یعنی تاخیر ڈاک والوں کی مہربانی سے ہوئی۔

میں یہاں اپنے وارڈ میں بالکل ٹھیک ہوں اور رانا صاحب اپنے وارڈ میں، ہماری ملاقات صرف اسی روز ہوتی ہے جس روز باہر سے ملاقات آئے۔ باقی چاروں دوست بھی قریب ہی ہیں۔ ان سے کبھی کبھار ملاقات ہوجاتی ہے۔ ہمیں صبح و شام دو دفعہ ایک ایک گھنٹہ کیلئے کھولا جاتا ہے۔ جس سے ذرا سیر و تفریح ہوجاتی ہے مگر اپنے وارڈ کے اندر اندر۔ کھانے کا سلسلہ بھی ٹھیک چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چائے کا

انتظام بھی کر دیا ہے، لالیاں کا رہنے والا ہمارا ایک مشقتی ہے جو میری خدمت کرتا رہتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب پر بے شمار افضال نازل فرمائے اور جلد خوشی کی خبروں سے آپ کو سکون عطا فرمائے، آمین۔

خط نمبر: 25 بتاریخ: 04.10.1987

بھائی جان و بھابھی جان و عزیزہ مصلحہ! ہیوسٹن USA السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزشتہ جمعرات آپ کا خط ملا جس میں آپ کی اور عزیزہ مصلحہ کی خوبصورت تصاویر تھیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ تصاویر ہی نہیں عزیزہ مصلحہ بھی ماشاء اللہ بہت پیاری ہے ''بس ذرا یہ ہے کہ اپنی امی کی مکمل نقل ہے''۔ اللہ تعالیٰ عزیزہ کا وجود برکتوں والا کرے۔ اس کے آنے کے ساتھ خوشیوں اور راحتوں کا سماں ہمیشہ کیلئے بندھا رہے، آمین۔ گزشتہ دنوں محترم سہیل شوق صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے پہلا بیٹا عطا فرمایا ہے۔ امید ہے کہ آپ کو خبر مل چکی ہوگی۔ آپ سے خط لکھنے میں بیشک دیر ہوگئی مگر مجھے اس کی خوشخبری ۱۳ راگست کو ہی مل گئی تھی۔ آپ نے حضور (رحمہ اللہ) کے پیچھے خوب دوڑ لگائی۔ حضور (رحمہ اللہ) کی طرف سے جو ہمارے لئے شفقت اور محبت کے دھارے بہتے رہتے ہیں ان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم اپنی خوشیوں میں سب سے پہلے حضور کو ہی شامل کریں اور حضور سے مزید سے مزید برکتیں حاصل کریں۔

میرے ایک کلاس فیلو نعمت اللہ بشارت صاحب ان دنوں ڈنمارک میں ڈینش زبان کے طالب علم ہیں۔ بالکل وہی جن کے ساتھ جانے کی میری بھی منظوری ہوئی تھی۔ اور نعمت اللہ جاوید صاحب جن کی آپ سے بات ہوئی ہے وہ غالباً سویڈن میں ہیں اور مجھ سے دو سال جونیئر تھے تاہم ان سے بھی دوستی تھی کیونکہ بہت شریف اور سادہ انسان ہیں۔ محترم کمال یوسف صاحب کا ایک بہت پیارا خط مجھے رمضان کے آس پاس ملا تھا۔ میں نے انہی دنوں ان کیلئے جوابی خط ارسال کر دیا تھا جو یقیناً انہیں مل نہیں سکا۔ اگر رابطہ ہو تو سلام بھی عرض کر دیں۔ اس کے علاوہ محترم سعید احمد صاحب چٹھہ کا خط ابا جان کے نام آیا ہوا ہے۔ جواب تو اس کا ابا جان نے دے دیا ہوا ہے، آپ سے رابطہ ہو تو میری طرف سے بھی شکریہ ادا کر دیں اور سلام، دعا کی درخواست اور دلی جذبات پیش کر دیں۔ انہوں نے میرے لئے اپنے بیحد مخلصانہ اور پر درد جذبات کا اظہار اپنے خط میں کیا ہوا ہے۔

آپ تو تعلیمی سرگرمیوں میں بہت مصروف ہوں گے۔ یہ سمیسٹر بھی قریباً آدھا گذر چکا ہے۔ اللہ کرے باقی کی دم بھی خیریت سے گزر جائے اور اپنے پیچھے خوشگوار اثرات اور شاندار مستقبل کے سامان چھوڑ جائے۔ آمین۔

جیل کے حالات بالکل درست سمت میں جارہے ہیں۔ ماحول بہت پرسکون ہے۔ مگر جیل میں آنے والے لحہ کا قطعاً اعتبار نہیں ہوتا۔ کسی بھی لحہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس لئے جیل کے پرسکون حالات پر کبھی بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی کرنا چاہئے۔ اور جہاں تک فون پر بات کرنے کا تعلق ہے تو وہ بالکل ناممکن ہے۔ کیونکہ ہم لوگ ڈیوڑھی نہیں جاسکتے ڈیوڑھی تو دور ہے اپنی وارڈ سے باہر نہیں نکل سکتے۔

موسم بارش نہ ہونے کے باعث سارے علاقہ میں ہی خراب ہورہا ہے۔ سردی کا آغاز خشکی کے ساتھ ہے۔ چنانچہ نزلہ وزکام اور کھانسی کی وبا عام ہورہی ہے۔ ان دنوں میں بھی اس کی لپیٹ میں ہوں تاہم اتنی لپیٹ نہیں ہے کہ بستر میں لپٹا ہی رہوں۔ اللہ کا فضل ہے۔ الحمدللہ۔ گوجرانوالہ میں امی جان کی صحت بدستور گرتی جارہی ہے۔ ان کی صحت کیلئے اور درازی عمر کیلئے دعا کی سخت ضرورت ہے۔ اور اس کے ساتھ اب اجازت چاہتا ہوں سب کو سلام اور عزیزہ مصلحہ کو پیار۔ خدا حافظ!

خط نمبر: 26 بتاریخ: 31.03.1987

تایا جان وتائی جان وبرادران! قادیان السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے کئی خطوط ایک ساتھ ملے۔ خطوط کیا تھے، پیار، محبت، شفقت، حوصلہ افزائی، ہمت بندھائی، توکل کی تلقین، استقامت کی نصیحت غرضیکہ وہ تمام پہلو اور تمام باتیں جن کی ہمارے زخمی دلوں کی مرہم پٹی کیلئے ضرورت تھی آپ کے خطوط میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ پھر دیار مسیح کی فضاؤں اور اس مقدس درو دیوار میں بیٹھ کر لکھے ہوئے ان الفاظ نے جسم وروح اور دل ودماغ میں ایک تلاطم برپا کردیا۔ اُس روز آپ سب کے خطوط پڑھ کر میں آپ کی یاد میں بہت گداز ہوا۔ پیاری بہن امۃ المتین کا خط روشنائی سے نہیں خون سے لکھا ہوا محسوس ہوا۔ ان خطوط کے سمندر سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب میں نے آخری فقرہ پڑھا اور کچھ دیر بعد اپنی دنیا میں واپس آیا تو مجھے اپنے عزم میں اپنے حوصلہ میں بے پناہ بلندی محسوس ہوئی ایک طرف میں اپنے رب کی حمد وشکر کے ساتھ پگھلا جارہا تھا تو دوسری طرف باطل کی چٹانوں سے ٹکرا

کر ان کو پاش پاش کر دینے کی طاقت اور قوت اپنے جسم میں محسوس کر رہا تھا۔ آپ لوگوں کی آمد کا بے چین شوق سے انتظار رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ملاقات کیلئے ہر قسم کے سامان کر دے۔ آمین۔

بہت خواہش اور مچلتی ہوئی تمنا ہے کہ سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مزار پر حاضر ہو کر حضور اکرم ﷺ کا سلام پہنچاؤں۔ یہ بجا کہ میرے ایسے گناہگار اور سخت پر تقصیر بندے کی اس پاک وجود سے کوئی نسبت ہی نہیں، میرے سلام پہنچانے کی کوئی حیثیت نہیں، مگر میرے دل کی خواہش اور تڑپ تو اپنی جگہ! دعا کریں اللہ ہمارے لئے بھی اس ننھی منی معصوم خواہش کے پورا کرنے کے سامان جلد کر دے۔ آمین۔

آخر میں اپنی ہر طرح سے خیریت کی اطلاع عرض ہے۔ براہِ کرم سب احباب جماعت تک یہ اطلاع پہنچا دیں۔ اللہ تعالیٰ ضرور فضل فرمائے گا، دیر اگر ہو تو اندھیر ہرگز نہیں۔

خط نمبر: 27 محررہ: 02.12.1988

پیارے تایا جان وتائی جان! (ماسٹر محمد ابراہیم صاحب) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا 24-10 / 88 کا خط ملا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔ آپ کی دورہ سے واپسی، اس دوران بارش کے باعث ہونے والی پریشانی اور عزیزان کی صحت سے متعلق آگاہی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ سب پر غیر معمولی فضل فرمائے، عزیزم سعید احمد اور عزیزہ شاکرہ کو اپنے فضل سے جلد صحت کاملہ عطا فرمائے اور دیگر تمام پریشانیوں سے نجات بخشے۔ آمین۔ جہاں تک آپ کو میری وجہ سے لاحق پریشانی کا تعلق ہے تو وہ ایک فطری لہر ہے۔ اس قسم کے معاملہ میں کوئی ہزار تسلی اور حوصلہ دلائے مگر: دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت کے مصداق جذبات پر قابو پانا بیحد مشکل ہے۔ مگر اس کا ایک حل بھی ہے۔ اور میں نے تو شروع سے اسی پر عمل رکھا، اور وہ یہ کہ یہ سارا معاملہ خدا تعالیٰ کی خاطر ہے، اس لئے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں، بس ہمت کے ساتھ برداشت کرنے اور بشاشت کے ساتھ استقامت کی ضرورت ہے۔ اور اس کیلئے خدا تعالیٰ نے بیحد فضل فرمائے رکھا۔ اس لئے آپ بھی کوشش کریں کہ پریشان خیالات نزدیک نہ آنے پائیں، اس کا نتیجہ صرف اور صرف اپنے آپ کو بھلا دینا ہی تو ہے۔ میں نے ذوقؔ کی نصیحت کو بھی سامنے رکھا ہے۔

اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار، یا اسے رو کر گزار دے

آپ کی مبارک باد بھی ملی جزاکم اللہ۔ میں نے تو از راہ تفریح امتحان دیا تھا۔ اللہ نے یہ کامیابی بھی عطا فرمادی۔ الحمدللہ۔ قادیان، گردونواح کے جملہ احباب جماعت اور سب افراد خانہ کی خدمت میں پرخلوص سلام پیش ہے اور درخواست دعا بھی۔ خدا حافظ!

خط نمبر:28 محررہ: 05.02.1989

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ　　　　پیارے تایا جان و تائی جان!

گذشتہ اطلاعات کے مطابق تو آپ دہلی میں ہی زیر علاج اور روبصحت تھے خدا کرے اب تک آپ بخیر وعافیت واپس گھر آچکے ہوں اور پوری طرح صحت یاب ہو چکے ہوں۔ آمین ثم آمین۔

برادرم سعید صاحب کی صحت کا کیا حال ہے۔ امید ہے وہ بھی اب تک کافی حد تک صحت یاب ہو چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی بھرپور صحت والی فعال عمر دراز عطا فرمائے اور دین کا مجاہد بنائے آمین۔

یہاں پر حالات بہت اچھے ہیں، الحمدللہ۔ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ ہم کال کوٹھڑیوں سے آزاد ہو کر B کلاس وارڈ میں رکھے گئے اور اس کے بعد اس سے بھی اچھی جگہ پر شفٹ کر دیئے گئے ہیں۔ یہ سپیشل وارڈ ہے جو سیاسی لیڈروں وغیرہ کیلئے مخصوص ہے۔ یہ ڈیوڑھی کے بالکل ساتھ ہے۔ گویا اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اب عنقریب اگلا مرحلہ اس ڈیوڑھی کو عبور کرنا ہوگا۔ انشاء اللہ۔ ہمارے اس اذیتناک ابتلاء کے دوران آپ سب نے جس طرح ہمارے لئے تڑپ تڑپ کر بلکہ بلک بلک کر دعائیں کی ہیں انہیں دیکھ کر اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ یہ اذیت ہم نے کم اور آپ نے زیادہ برداشت کی ہے۔ کیونکہ آپ کی اِن دعاؤں نے اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو کچھ اس طرح جذب کیا اور پھر وہ ہم پر اس طرح نازل ہوئے کہ ہمیں اس سختی اور مصیبت اور اذیت کا ذرہ برابر احساس نہ ہوا۔ جبکہ آپ ہر لحہ اپنے آپ کو قید میں محسوس کرتے رہے۔ آپ کی یہ کیفیت تاریخ احمدیت میں ہمیشہ کیلئے رقم ہوگئی ہے اور آئندہ پیش آنے والے ابتلاؤں میں ان لوگوں کیلئے مشعل راہ بنی رہے گی جو ان میں براہِ راست مبتلاء نہیں ہوں گے۔ میرے لئے بہت دعاؤں کی ضرورت ہے کہ بہت سست اور نکما ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کمزوریوں او رنالائقیوں کی پردہ پوشی فرمائے اور اپنے پیار کی نگاہ سے نوازے۔ آمین۔ سبھی بزرگ درویشان کی خدمت میں میرا محبت بھرا اسلام اور درخواست دعا عرض کر دیں۔ میں صرف 313 احباب کو ہی درویش نہیں گنتا بلکہ آپ سب کی اولادوں کو بھی برابر کا درویش سمجھتا ہوں۔ اللہ آپ سب کی قربانیوں کو قبول فرمائے آمین۔

خط نمبر: 29 محررہ: 30.07.1994

ممانی جان و عزیزان احسن صاحب، فریدہ و صائمہ، جرمنی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک لمبا اذیت سے بھرپور بیماری کا دور گزار کر پیارے ماموں جان اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ کیلئے دیار غیر میں یہ صدمہ کتنے گنا بڑا ہو کر ظاہر ہوا ہوگا، اس کا اندازہ ہمارے لئے ناممکن ہے تاہم سخت غم کے اس عالم میں سیّدنا حضرت اقدس محمد مصطفی ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہی ہمارے پیش نظر ہونا چاہیئے۔ ایسے ہی ایک موقع پر حضورؐ نے فرمایا تھا:۔

"دل سخت غمناک ہیں، آنکھیں آنسو بہاتی چلی جاتی ہیں لیکن ہمارے منہ سے راضی ہیں یارب، راضی ہیں یارب کے سوا کوئی کلمہ نہیں نکلتا"۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیارے ماموں جان مرحوم کو اپنی مغفرت و رحمت کی چادر میں لپیٹ لے، ان سے بغیر حساب کا سلوک فرمائے اور ہر لمحہ ان کے درجات بلند فرمائے نیز ہمیں آپ کی نیکیوں، قربانیوں اور خوبیوں کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی توفیق بھی عطا فرمائے، آمین۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ ایک پیارا وجود جو دس سال تک میرے لئے تڑپتا رہا، میرے لئے درد و سوز سے دعائیں کرتا رہا، میری رہائی کی خوشی میں خانہ کعبہ میں نوافل ادا کر کے اور اس مرکز عظیم میں شیرینی بانٹ کر خود تو خوشی منا گیا مگر مجھے سینہ سے لگائے بغیر اور میرے دل کو ٹھنڈا کئے بغیر رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں ان کے اس احساس عظیم کا بدلہ تو نہیں چکا سکتا مگر اسے ہمیشہ کیلئے یاد رکھتے ہوئے، اس کا واسطہ دے کر ان کیلئے دعا کرنے کی ضرور کوشش کرتا رہوں گا۔ انشاء اللہ

آخر میں اپنے لئے اور بچوں کیلئے آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں۔ رہائی کے بعد اب خدمت دین کا نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ اور یہ بڑا ہی نازک نظر آتا ہے اس لئے بہت دعا کریں کہ میرا اللہ مجھے ہر لغزش سے بچائے اور ایسی خدمت کی توفیق دے جس سے وہ خود بھی راضی ہو، اس کا رسولؐ اور مہدی موعودؑ بھی اور اس کے مقرر کردہ خلیفۂ وقت کی آنکھیں بھی راحت پائیں اور دل بھی قرار پائے، آمین۔

خاکسار محمد الیاس منیر، ربوہ

## سینٹرل جیل فیصل آباد سے راہِ مولا کے ایک اسیر کا (اخبار احمدیہ جرمنی کے لیے) پیغام

آپ نے "اخبار احمدیہ" کی جشنِ تشکر کے سلسلہ میں اشاعتِ خصوصی کے لئے پیغام بھجوانے کا ارشاد فرمایا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر قطعاً اس لائق نہیں ہوں مگر گذشتہ کئی سالوں کے مسلسل ابتلاء نے ہمیں جذباتی طور پر آپ کے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ آپ کے ارشاد کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں، سو حاضر ہوں۔ پیارے احباب جماعت! گزشتہ 52 مہینوں میں اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ پابند سلاسل ہونے کے باوجود آپ سے پوری طرح منسلک ہوں۔ آپ کی دل گداز دعاؤں کو اپنے اوپر اللہ کی رحمتوں اور اس کے فضلوں کی صورت برستے ہوتے دیکھتا رہا ہوں۔ آپ کے جذبات کی تپش کو اب بھی محسوس کر رہا ہوں اور آپ کے دلوں کی دھڑکنیں مسلسل سنے جا رہا ہوں روحانی ہی نہیں، جسمانی اور مادّی ذرائع سے بھی آپ کے ساتھ مسلسل رابطہ ہے سب سے مقدم تو پیارے آقا ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کی زبانی آپ لوگوں کے حالات و واقعات ہیں جو آپ اپنے خطبات اور تقاریر میں بیان فرماتے رہتے ہیں، ان واقعات کے مسلسل مطالعہ سے جماعت احمدیہ جرمنی کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے۔ اس مناسبت سے آپ سب کو مبارک باد پیش ہے کہ آپ کی جماعت میرے آقا کی آنکھیں ٹھنڈی کرنے والی جماعت ہے، الحمد اللہ۔

آپ کے نیشنل امیر محترم عبد اللہ صاحب ہر سال اپنے دورہ پاکستان کے دوران خاکسار کو خاص طور پر ملاقات کا شرف بخشتے رہے ہیں، ان کی بھی زبانی آپ کے حالات کا علم ہوتا رہا ان کے علاوہ بھی بہت سے دوست آپ کے ہاں سے آتے اور ملاقات پر آپ سب کے جذبات اور سلام پہنچاتے فجز اکم اللہ احسن الجزاء

مجھے یاد ہے کہ جب نمرود وقت نے ہمارے مقدمہ کا ظالمانہ حکم سنایا تھا تو آپ احباب جماعت نے ہمارے لئے فرینکفرٹ میں ایک بھرپور احتجاجی جلوس بھی نکالا تھا اس طرح سے دیارِ مغرب کے گلی کوچوں کو بھی غلامان مسیح الزماںؑ کی مظلومیت کا گواہ بنا دیا تھا اس سلسلہ میں آپ کی طرف سے کی جانے والی دیگر کوششوں کا ثبوت ایمنسٹی انٹرنیشنل مغربی جرمنی کی اپیل پر مشتمل اخبار جنگ کا تراشہ بھی میرے پاس موجود اور محفوظ ہے میں ان حد درجہ پُرخلوص جذبات کے لئے آپ سب احباب جماعت کا بے حد ممنون ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم سے نوازے، آمین۔

آج جماعتِ احمدیہ پوری ایک صدی کا جو سفر طے کر کے اپنی دوسری صدی میں داخل ہو رہی ہے تو یہ موقع، یادگار تاریخی موقع ہمیں بہت کچھ یاد دلاتا ہے مصائب و آلام اور ابتلاؤں سے بھری ہوئی صدی کا نقطہ آغاز یعنی چند درویشوں کا ایک سیدھے سادے اللہ کے بندے کے ہاتھ پر بیعت کرنا، ہمارے دلوں کو اس یقین سے بھر دیتا ہے کہ بیعت لینے والا اللہ کا وہ بندہ یقیناً سچا ہے، جو اپنے دعووں کے عین مطابق ان سو سالوں میں ایک سے ایک کروڑ ہو گیا مگر بغیر

ظاہری اور مادی وسائل کے اس عظیم الشان ہدف کو حاصل کرنے کیلئے ہمارے بزرگوں کو کیسے کیسے ہولناک ابتلاؤں اور مشکلات سے گزرنا پڑا، اس کی ہلکی سی جھلک ہم نے اس صدی کے اختتام پر دیکھی ہے، جو اس طرف اشارہ کررہی ہے کہ ابھی راہ میں کچھ اور بھی جنگل اور پرخار بادیہ درپیش ہوں گے اور آئندہ اس بھی زیادہ ابتلاؤں کا سامنا ہوسکتا ہے اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو ہروقت کسی بھی ابتلا کا زبردست استقامت کیساتھ مقابلہ کرنے کیلئے تیار رہنا چاہئے۔

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے استقامت کے باب میں کیا عمدہ ارشاد فرمایا ہے کہ بعض اوقات مومن پر ایسے ابتلاء آتے ہیں کہ وہ تمام ظاہری اسباب سے بکلی محروم کردیا جاتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اُسے سچے خوابوں کے ذریعہ تسلی دینا بھی چھوڑ دیتا ہے تب جو ثابت قدم رہے وہ سچا وفا شعار قرار پاتا ہے پس میں حضور اقدس اس ارشاد کی روشنی میں میں عرض کروں گا ہر احمدی اپنے آپ کو کسی بھی ابتلاء کیلئے اس حد تک تیار کرے کہ ہر قسم کے دنیوی تعلقات منقطع ہوجائیں اور وقتی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی بطور آزمائش کوئی امر موجب تسلی نہ ہو تب بھی وہ اپنے عہد وفا پر پوری ہمت اور طاقت اور پوری صلاحیت کے ساتھ اور پورا زور لگا کر اور پوری کوشش کرکے قائم رہے آمین۔

احبابِ جماعت! آج ساری دنیا میں غلبہ واحیائے اسلام کی مہم جماعت احمدیہ کے سپرد کی گئی ہے اور اس کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان نظامِ خلافت قائم فرمایا ہے اور آج اس قدر مخالفت، حتیٰ کہ اعلیٰ سطحی حکومتی مخالفت کے باوجود اگر ہماری جماعت زندہ اور پہلے سے بھی زیادہ متحرک ہے تو وہ خلافت کی برکت سے ہی ہے اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ ہم یہ دعا بکثرت کرتے رہیں کہ خدا تعالیٰ ہمارے درمیان اس بابرکت نظام کو تا ابد جاری رکھے اور ہم سب کو اس کے ساتھ نہایت مضبوطی اور پختگی کے ساتھ وابستہ رکھے اور ہم نسلاً بعد نسلٍ اس عظیم الشان نعمت سے متمتع ہوتے رہیں اس کیلئے لازمی بنیادی شرائط کے مطابق ہر احمدی حقیقی ایمان اور عملِ صالح پر قائم رہے اور نیکی اور تقویٰ کے بلند ترین معیار پر سرفراز ہو اور ہم اُن شرائط سے کبھی بھی محروم نہ ہوں آمین ثم آمین۔

والسلام خاکسار محمد الیاس منیر، سینٹرل جیل، فیصل آباد[1]

دس سالہ دور اسیری کے دوران میں ایسے بے شمار خطوط ملتے رہے جن سب کا یہاں فرداً فرداً ذکر ناممکن ہے۔ اللہ ان سب احباب کو اپنے فضل سے اجر عظیم بخشے، آمین۔ علاوہ ازیں رہائی کے موقع پر دس سال تک دعائیں کرتے چلے جانے والے احباب جماعت نے وسیع پیمانہ پر جشن بھی منایا اور ہماری خوشی میں شامل ہونے کے لئے دُور دُور سے ہمارے ہاں تشریف بھی لاتے رہے اور جو خود نہ پہنچ سکے اُن کے خطوط سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میل کا سفر کرکے

---

[1] اخبار احمدیہ جرمنی جشن تشکر نمبر 1989ء

آئے۔ اُن سب کی خدمت میں ابا جان نے شکریہ کا ایک تفصیلی خط ارسال کیا۔ یہ خط اُن تمام احباب کے نام یہاں بھی درج کیا جاتا ہے جو دورِ اسیری میں ہم اسیرانِ راہ مولیٰ کیلئے کسی بھی صورت مضطرب رہے، جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از ربوہ

مکرمی ومحترمی برادرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مبارک نامہ آیا اور ہمارے لئے باعث مسرت بنا۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ اسیرِ راہِ مولیٰ عزیزم محمد الیاس منیر مربی سلسلہ اپنے چار ساتھیوں (مکرم رانا نعیم الدین صاحب، مکرم حاذق رفیق صاحب، مکرم عبدالقدیر صاحب، مکرم محمد نثار صاحب) سمیت سنت یوسفی والی 'بِضعَ سِنِینَ' کی آخری حد نو سال پوری فرما کر 20 مارچ 1994ء کو بخیریت بخشۃ گھر واپس پہنچ گئے۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک

ہ

قادر ہے وہ بارگاہ ٹوٹا کام بناوے بنا بنایا توڑ دے کوئی اس کا بھید نہ پاوے

قریباً دس سال آپ نے مستقل مزاجی سے جو دعائیں ان اسیران اور ان کے لواحقین کیلئے کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی مقبولیت کا عظیم نشان دکھایا اور ان کی معجزانہ رہائی سے ہم سب کو نوازا۔ اور اس طرح یہ اسیران بھی حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کی اس بشارت کا مصداق ٹھہرے:

"مبارک ہیں وہ قیدی جو دعائیں کرتے تھکتے نہیں آخر وہ رہائی پائیں گے۔"

اللہ تعالیٰ نے حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ کلام بھی سچ کر دکھایا۔

غیر ممکن کو یہ ممکن میں بدل دیتی ہے اے میرے فلسفیو! زورِ دعا دیکھو تو

لائق صد مبارک ہیں ہمارے پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع (ایدہ اللہ تعالیٰ) جو اسیرانِ راہِ مولیٰ کیلئے دعاؤں کی تحریک کرتے کرتے تھکتے نہیں تھے۔

"خیرات کر اب ان کی رہائی میرے آقا
کشکول میں بھر دے جو میرے دل میں بھرا ہے"

نیز دوسرے شعر ؎

''ہیں کس کے بدن دیس میں پابند سلاسل
پردیس میں ایک روح گرفتار بلا ہے''

کے مطابق آپ کی روح بھی ان اسیران کے ساتھ ہی اب رہا ہوئی ہے جس سے آپ کا دل خوشیوں سے معمور جو آپ کے چہرہ سے چھلک چھلک رہی ہیں۔MTA پر اسے ساری احمدی دنیا نے دیکھا اور محسوس کیا اور اس پر خوشی کے شادیانے بجائے شکرانے کے نفل ادا کئے اور خوب جی بھر کر مٹھائیاں کھائیں اور کھلائیں اور اب یہ طویل اسیری محض افسانہ بنا ہوا لگتا ہے۔آخر ایسا کیوں نہ ہوتا دنیا کی تاریخ کا یہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ان اسیران کیلئے دنیا کے سارے براعظموں میں پھیلے ہوئے احمدیوں نے گذشتہ دس سال اپنے آقا کی اس نصیحت ''اے غلام مسیح الزماں ہاتھ اُٹھا، موت آبھی گئی ہو تو ٹل جائے گی'' پر عمل کرتے ہوئے دعاؤں میں دن رات ایک کر رکھے تھے۔اب انہوں نے دعاؤں کی قبولیت کا ایک عظیم الشان نشان دیکھا تو ان کے سر اپنے ربّ کے حضور جھک گئے، سچ ہے ؎

ہے شکر ربّ عزّ و جل خارج از بیاں
جس کے کلام سے ہمیں اس کا ملا نشاں

آخر میں خاکسار آپ سے عاجزانہ درخواست کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ان سب معصوم اسیران راہِ مولیٰ کی قربانی کو قبول فرمائے اور یہ آزادی ساری جماعت کیلئے مبارک فرمائے اور مزید فتوحات کے دروازے کھولے اور ہمیں مقبول خدمتِ دین کی توفیق دے، آمین۔

والسلام ، خاکسار

محمد اسماعیل منیر

سیکرٹری حدیقۃ المبشرین ربوہ

☆ نواں باب

# تحدیث نعمت اور شکریہ احباب

☆ خوابیں اور الٰہی بشارتیں

☆ ہماری رہائی کے لئے عالمی سطح پر ہونے والی کوششوں کا مختصر تذکرہ

☆ اخبارات کے تراشے اور تبصرے

یادرکھوانسان کو چاہئے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں دعا کا طالب رہے اور دوسرے اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ پر عمل کرے۔ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کی تحدیث کرنی چاہئے۔ اس سے خدا تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہے اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کے لیے ایک جوش پیدا ہوتا ہے۔ تحدیث کے یہی معنے نہیں کہ انسان صرف زبان سے ذکر کرتا رہے بلکہ جسم پر بھی اس کا اثر ہونا چاہئے۔

تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ السلام، سورہ ضحیٰ صفحہ ۴۰۹)

# تحدیثِ نعمت

اس آخری باب میں خاکسار اپنے خالق و مالک آقا کے بے پایاں افضال و برکات کا مختصراً تذکرہ کرنا چاہتا ہے جو بارش کی طرح اس عرصہ اسیری کے دوران ہم پر برستے رہے۔ اگرچہ یہ ساری داستان ہی اس تفصیل پر مشتمل ہے مگر اس کے الطاف کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جس کا یہاں خصوصیت سے ذکر ہوگا۔ اسی طرح ارشاد نبوی ﷺ کہ جس نے بندوں کا شکر ادا نہ کیا، اس نے گویا اللہ کا بھی شکر ادا نہ کیا، کے مطابق اپنے ساتھ بے پناہ محبت اور شفقت کرنے والے احباب جماعت کی خدمت میں بھی اپنے پر خلوص جذبات تشکر پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

## الٰہی بشارات

یوں تو بہت سے بیرونی عوامل بھی تھے جو ہمارے لئے ڈھارس کا باعث بنتے ، ہمیں حوصلہ دلاتے اور اس راہ پر آگے بڑھتے چلے جانے کے لئے زادِ راہ بنتے مگر کوئی بھی بیرونی عامل اُس وقت تک کارگر نہیں ہوا کرتا جب تک اندرونی قوت اور طاقت انسان کو نصیب نہ ہو۔ اس حوالہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں غیر معمولی طور پر نوازا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کا ذکر میری یادداشتوں میں جگہ جگہ ملتا ہے چنانچہ اس مقصد کے لئے خاکسار نے اپنی انہی یادداشتوں سے استفادہ کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ انہیں من وعن یہاں درج کیا جائے تاکہ قارئین اندازہ لگا سکیں کہ بے یقینی کے اُس ماحول میں ہمارا پیارا اللہ کس طرح ہمارے ساتھ رہا اور اس نے کبھی بھی ہمیں تنہا نہیں چھوڑا بلکہ 'نہ ڈر، قریب ہوں میں' کی لوریاں دیتا رہا۔ خاکسار نے ابتدائی ایام میں جب ڈائری لکھنی شروع کی تو اس کے صفحہ 97 سے شروع ہونے والا یہ مضمون کئی صفحات پر اس طرح سے پھیلا ہوا ہے:

”انہی واقعات پر 14 چکی کی یاد ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ابھی کچھ اور باتیں بھی ہیں جن کی یاد انمٹ ہی نہیں بلکہ وہ ہمارے روشن مستقبل کی امین بھی ہیں اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دِکھائے جانے والے نظاروں کی حسین یادوں کا خزانہ! یہ درست ہے کہ ہم انتہائی نالائق اور نااہل بندے ہیں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں الطاف کی بارشیں ہم پر برسائیں جنہیں دیکھتے ہی ہمارے دل و دماغ اور ہماری روحیں بارگاہِ ایزدی میں سربسجود ہو جاتیں اور ہمارے وجودوں کا ذرہ ذرہ بزبانِ حال کہتا ؎

کس طرح تیرا کروں اے ذوالمنن ! شکر و سپاس　　　وہ زباں لاؤں کہاں ؎ جس سے ہو یہ کاروبار

انتہائی بے کسی اور بے بسی کے اس عالم میں ہمارا پیارا رب عظیم الشان ترقیات کی بشارات پر مشتمل خوابیں دکھا کر ہماری ڈھارس بندھاتا رہا۔ رات کی خاموشی اور تاریکی و تنہائی میں آ آ کر ہمیں تسلیاں دیتا رہا۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر ایسے حالات میں ہماری طرف سے ثابت قدمی کا کوئی مظاہرہ ہوا تو اس میں ہماری کونسی خوبی تھی؟ کیونکہ ہم تو ہر تکلیف اور اذیت کو برداشت کرتے چلے جانے پر مجبور تھے جبکہ اللہ تعالیٰ ان معمولی مشکلات کے مقابل پر ہمارے لئے درخشاں اور تابناک مستقبل کے سامان کرتا ہوا دِکھائی دے رہا تھا،

فَالحَمدُللّٰہ علیٰ ذٰلک، اَللّٰھمّ سَجَدَ لَکَ جَسَدِیْ، رُوحِی وَجَنَانِی۔

ایک روز میں نماز مغرب کے بعد اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ میرا سر دیوار کے ساتھ (فرش سے ذرا اوپر) ٹکا ہوا تھا اور میں نے اپنی گرم چادر منہ پر ڈالی ہوئی تھی تا آنکھوں میں پڑتی ہوئی بلب کی روشنی سے ذرا روک رہے۔ اِسی اثناء میں عجیب واقعہ ہوا کہ میری آنکھیں اگرچہ بند تھیں مگر ایسا لگا جیسے بجلی چلی گئی ہے اور یکدم سخت اندھیرا ہو گیا ہے۔ میں نے جب اندھیرا محسوس کیا تو ہڑ بڑا کر اُٹھا اور ایسے لگا جیسے میں نے چادر سے باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں بھی مارے ہیں۔ اُس وقت میں سخت ڈرا لیکن اِسی اثناء میں میری نظر دروازے کی طرف اُٹھی تو ادھر سے بالکل ایسی روشنی ظاہر ہوئی ہے جیسی فجر کے فوراً بعد ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اس روشنی کو پا کر فوراً تسلی پاتا ہوں اور دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کشمکش میں میری آنکھیں کھل گئیں۔ چادر ہٹائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ بلب بدستور روشن ہے اور کسی قسم کا اندھیرا نہیں۔ اس پر میں حیران ہو کر رہ گیا کہ یہ سب کیا تھا؟ فوری طور پر تفہیم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے ہماری ہی کیفیت سمجھائی ہے اور بتایا ہے کہ پہلے تمام مادی اور دنیاوی ذرائع تم پر خوفناک اندھیرا کر کے سخت تاریک رات کی طرح ہو جائیں گے اور کوئی دنیوی ذریعہ تمہارے کام نہیں آئے گا لیکن اِس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا نمونہ دکھلائے گا اور مادی طور پر جو اندھیرا ہو گیا تھا وہ کافور ہو جائے گا اور سپیدۂ سحر تمہارے لئے اطمینان کا موجب ہوگا۔

یہ نظارہ اللہ تعالیٰ نے اُس وقت دِکھایا تھا جب ہمیں مقدمہ کے بارے میں تفصیلات کا بھی علم نہ تھا مگر خدا کی قدرت کہ جب ہمارا مقدمہ شروع ہوا تو اس کا پورا نقشہ سامنے آ گیا۔ ہمارے لئے ہر طرف سے مکمل اندھیرا کرنے کی کوشش کی گئی اور دنیا اور اس کے ذرائع و وسائل کو ہی سب کچھ سمجھنے والوں نے گھناؤنے

عزائم کے ساتھ خطرناک منصوبے تیار کر کے ہمیں خودساختہ تاریکی میں غرق کرنا اور اتھاہ تاریک گھاٹیوں میں ہمیشہ کے لئے دفن ہی کر دینا چاہا تو اس قسم کے نظاروں نے ہر موقع پر ہماری ہمت بندھائی اور خدا کی قسم! ہم نے ان کے ہر ناپاک منصوبہ کے مقابل پر اپنے بے انتہا پیار کرنے والے مولیٰ کو سپیدۂ سحر کی صورت میں دیکھا ؎

ہے سرِ راہ پر مرے وہ خود کھڑا مولیٰ کریم　　پس نہ بیٹھو میری رہ میں اے شریرانِ دیار

کیا دشمنوں کی تیار کردہ سرتاپا جھوٹی ایف آئی آر، کیا جھوٹے گواہوں کے بیانات، کیا نقشہ موقع ملاحظہ، کیا پوسٹ مارٹم رپورٹ، اور کیا رانا صاحب کی بندوق کے کیمیکل ٹیسٹ کا نتیجہ غرضیکہ ہر بنیادی دستاویز میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کلام کی نہایت واضح اور صاف تصویر نظر آتی رہی۔ اِن بنیادی دستاویزات کا لفظ لفظ ہمارے لئے حضور علیہ السلام کے اس شعر کی منہ بولتی تصویر اور شہادت ہے ؎

مجھ کو پردے میں نظر آتا ہے اِک میرا مُعیں　　تیغ کو کھینچے ہوئے اُس پر جو کرتا ہے وہ وار

اِن اِجمالی باتوں کی تفصیل تو اپنے اپنے موقع پر آتی رہی ہے تاہم اِن واقعات کو دیکھ کر ہمارا کل بھی دُشمنانِ احمدیت کو یہ ناصحانہ پیغام تھا اور آج بھی ہے کہ ؎

جو خدا کا ہے اُسے للکارنا اچھا نہیں　　ہاتھ شیروں پر نہ ڈال اے رُوبہِ زار و نزار

ایک خواب میں دیکھا کہ ہم کچھ ساتھی (غالباً اسیرانِ ساہیوال) کسی ایسی جگہ پر ہیں جو کافی کھلی ہے اور دُور چھوٹی چھوٹی دیوار نظر آرہی ہے جیسے بہشتی مقبرہ ربوہ میں ہے۔ ہم اس احاطہ کے اُس حصہ میں ہیں جہاں ایک آدھ کمرا بھی ہے اور ایک نلکا بھی لگا ہوا ہے۔ دِن کا وقت ہے اور دُھوپ نکلی ہوئی ہے کہ یک دم زلزلہ کا احساس ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی زلزلہ اتنا شدید ہوتا جاتا ہے کہ ہم ایک جھولے کی طرح اِدھر سے اُدھر جھولنے لگتے ہیں۔ اُس وقت میں اپنے ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ ہم تو بالکل محفوظ جگہ میں ہیں، ہم تو بالکل محفوظ ہیں اور اس کے ساتھ ہی سامنے دیوار کی طرف نظر کرتا ہوں تو اُس کے پار مجھے بڑی بڑی عمارتیں اور مینار اس طرح گرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے یہ عمارتیں گارے سیمنٹ کے بغیر ہی بنی ہوئی ہوں اور ان کی اینٹیں یونہی رکھی ہوئی ہوں اور یہ بڑی تیزی سے گرتی ہیں اور بڑی تباہی آتی ہے لیکن میرا دل اپنی طرف سے بالکل مطمئن رہتا ہے حالانکہ ہم زلزلے کی وجہ سے جھولے کی طرح جھول رہے ہیں۔

خوابوں کے ذکر میں اس سانحہ ساہیوال سے چند ماہ پہلے جولائی 84ء میں دیکھے ہوئے ایک دو اَور خوابوں کا ذکر باعث ازدیادِ ایمان ہوگا جن کا تعلق اسی واقعہ کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ ایک خواب تو میں نے اُسی وقت اپنی ڈائری میں بھی درج کیا تھا، اس کا مختصر ذکر یہاں کرتا ہوں۔

میں خواب میں اپنے آپ کو ساہیوال کے مربی ہاؤس میں ہی دیکھتا ہوں جہاں ایک کمزور اور لاغر سی بلّی مجھے بار بار تنگ کرتی ہے لیکن میں اپنے کام میں مشغولیت نیز بلّی کی لاغر حالت کی وجہ سے اسے کچھ نہیں کہتا، اس پر رحم کھاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اسے کیا کہوں! ذہن میں بلّی کے متعلق وہ تصور بھی بہر حال ہے کہ اسے مارنا نہیں چاہئے لیکن جب یہ بلّی مجھے زیادہ ہی تنگ کرنے لگتی ہے تو میں اُٹھ کر اس کے پیچھے ہو لیتا ہوں جس پر وہ بھاگ کر سیڑھیاں چڑھنے لگتی ہے اور باوجود اس کے کہ وہ میرے بالکل قریب اور میری پہنچ میں ہوتی ہے مگر اس کو مارتا نہیں صرف اس کے پیچھے پیچھے چھت پر چڑھتا چلا جاتا ہوں اور چھت پہ جا کر وہ اُس دیوار پر چڑھ جاتی ہے جو مسجد کے صحن کی طرف ہے۔ اُس دیوار پر ایک اونچا سا مینار نما ستون ہوتا ہے جس کے اوپر وہ چڑھ کر مجھ سے چھپنے کی کوشش میں اس کی دوسری طرف جا چمٹتی ہے۔ اِتنے میں میرے سامنے فضا میں ایک کالے رنگ کا پرندہ جس کی کالی چونچ بہت ہی لمبی اور خوفناک قسم کی ہے، اُڑتا ہوا آتا ہے اور اُس ستون کے ساتھ (بلّی سے ذرا نیچے) آ کر چمٹ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بڑی ہوشیاری سے اُونچائی کی طرف سرکنے لگتا ہے اور بلّی کے قریب پہنچ کر اچانک اُس کو گردن سے دبوچ لیتا ہے جس پر اس بلّی کا خون بہنے لگتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اُس کا نام ونشان ختم ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ چند لمحوں میں مکمل ہو جاتا ہے جس کا نظارہ کر کے میں بہت خوش ہوتا ہوں کہ مجھے اُس بلّی کو کچھ نہیں کہنا پڑا، خود ہی اللہ میاں نے اس کا اِنتظام کر دیا۔

اس کے بعد میں خوشی خوشی چھت سے نیچے آنے لگتا ہوں اور ابھی نصف سیڑھیاں ہی اُترتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ سیڑھیوں کے درمیان موڑ پر جو چوڑی سی جگہ ہوتی ہے وہاں دو فربہ اور لمبے گھنے بالوں والے بکرے خون میں لت پت ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں اور بھی زیادہ خوش ہوتا ہوں اور دل میں کہتا ہوں کہ شکر ہے خدا کا کہ بغیر میری کسی کوشش کے اللہ میاں نے انہیں بھی ٹھکانے لگا دیا۔ بکرے تو ٹھکانے لگ چکے ہیں اب دیکھئے بلّی پر کب کوئی آسمانی آفت نازل ہو کر اسے ٹھکانے لگاتی ہے،

فانتظروا انّا معکم منتظرون۔[1]

اِس کے کچھ دنوں بعد خواب میں دیکھا کہ میں کسی راجباہ کے کنارے پر ہوں اور ذہن میں ایسا تاثر ہے جیسے بلّے والے بنگلہ نزد ساہیوال کا راجباہ ہے۔ میں اس کے شرقی کنارہ پر ہوں اور میرے ساتھ عزیزم رانا منور احمد ابن مکرم رانا مبارک علی صاحب آف ساہیوال (مرحوم) ہیں۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ دو مست اور خطرناک بیل مجھ پر حملہ کرنے کے لئے تیار نظر آتے ہیں۔ اِتنے میں اپنے آپ کو اس راجباہ سے ذرا دُور ایک کھیت میں پاتا ہوں تو پہلے ایک بیل بڑے زور سے دوڑتا ہوا میری طرف آتا ہے۔ میں دُور سے اسے دیکھ کر سوچتا ہوں کہ اس سے بچنے کے لئے کیا کروں؟ کیونکہ مجھ میں تو اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں! اُس وقت فوری طور پر ذہن سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے خواب اور آپ کی الہامی دعا کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ میری سوچ اسی خواب کے زیر اثر ہے۔ چنانچہ میں زور زور سے

رَبِّ کُلُّ شَیْءٍ خَادِمُكَ رَبِّ فَاحْفَظْنِي وَانْصُرْنِي وَارْحَمْنِي

کا وِرد کرنے لگتا ہوں، اتنے میں حملہ آور بیل میرے بالکل قریب آ کر مجھ پر حملہ کر دیتا ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ کس طاقت کی وجہ سے میرا جسم اُوپر کو اُٹھتا ہے اور بالکل سیدھا قریباً سات آٹھ فٹ تک فضاء میں بلند ہوتا چلا جاتا ہے اور جب بیل میرے بالکل قریب پہنچتا ہے تو میں اپنا دایاں پاؤں بڑے زور سے اس کے ماتھے پر مارتا ہوں اور ساتھ ساتھ رَبِّ کُلُّ شَیْءٍ خَادِمُكَ رَبِّ فَاحْفَظْنِي وَانْصُرْنِي وَارْحَمْنِي پڑھتا جاتا ہوں۔ اُس وقت میرے پاؤں میں نہ معلوم کہاں سے غیر معمولی طاقت آ جاتی ہے کہ اُس کے لگتے ہی بیل کئی قلابازیاں کھاتے ہوئے دور جا گرتا ہے اور میں پھر زمین پر آ کھڑا ہوتا ہوں۔ اب دوسرا بیل حملہ آور ہوتا ہے تو قریب آنے پر میرا جسم پھر سے ہَوا میں بالکل سیدھا بلند ہو جاتا ہے اور دعا پڑھتے ہوئے میں اپنا دایاں پاؤں اُس کے بھی ماتھے پر مارتا ہوں جو عین نشانہ پر لگتا ہے اور یہ بھی پہلے بیل کی طرح کئی قلابازیاں کھاتے ہوئے دور جا گرتا ہے۔ پھر میرے ذہن میں آتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی اسی طرح حملہ آور بیلوں کو اِسی دعا کے ذریعہ پچھاڑا تھا۔ چنانچہ میں اس واقعہ پر

---

[1] یہ خواب جولائی یا اگست 1984ء کا ہے جبکہ تحریر وسط 1985ء کی ہے

بہت خوش ہوتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اِس خوفناک اور خطرناک صورتِ حال میں کیسے حیرت انگیز طور پر میری حفاظت اور مدد فرمائی، فالحمد للہ رب العالمین۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ دو بیل وہی ہیں جو ہمارے خلاف عدالت میں گواہی دینے کے لئے آئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایسے سامان کئے کہ گواہی دینے اور دعویٰ ثابت کرنے میں ان کی خوب قلابازیاں لگیں اور اپنے منصوبہ اور مقصد میں بری طرح ناکام ہوئے جبکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ہمیں پوری جرأت اور ہمت کے ساتھ فضا میں نمایاں طور پر بلند ہوکر ان کے ماتھوں اور پیشانیوں پر کاری ضربیں لگانے کی توفیق بخشی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ گو خواب میں میرے ساتھ عزیزم منور (ابن مکرم رانا مبارک علی صاحب مرحوم) بھی ہے مگر وہ بیل اسے کچھ نہیں کہتے صرف مجھ پر ہی حملہ کرتے ہیں اور ہمارے مقدمہ کی نوعیت بھی یہی ہے کہ سب سے بڑا حملہ میری ذات پر ہی کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں انہیں بری طرح ناکامی ہوئی۔

اِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا وَأَكِيدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا

یہ دونوں خوابیں میں نے اپنے واقعہ (سانحہ مسجد احمدیہ ساہیوال) سے پہلے جولائی یا اگست 1984ء میں دیکھی تھیں۔ میرا ذہن تو اسی طرف جاتا ہے کہ ان میں واضح طور پر پیش آنے والے اِنہی واقعات کا ذکر ہے گویا اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلے سے ہی ان کے لئے تیار کر دیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی سمجھ کے موافق ان کی کسی قدر تعبیر بھی لکھ دی ہے، حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا کیا مطلب ہے۔

## خوفناک مستقبل مگر حسین انجام

اپنے مستقبل کے حوالہ سے جہاں تک میری ذاتی کیفیت کا تعلق ہے تو یہ بیم و رجا کی دونوں انتہاؤں کو چھو رہی تھی اور اس پر میں پوری طرح راضی برضا تھا کیونکہ حضور رحمہ اللہ تعالیٰ کے اِرشادات کے مطابق ہمارا ہر سودا نفع کا ہی سودا تھا۔ علاوہ ازیں اِس کی وجہ میری بعض خوابیں بھی تھیں جن میں ہمارے مستقبل کے بارہ میں واضح اشارے موجود تھے۔ ان کا بھی اس موقع پر اپنی روزانہ ڈائری کے حوالہ سے ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

85ء کی گرمیوں کے اختتام کی بات ہے کہ میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ میں ایک پختہ اور صاف ستھری سی چکی میں بند ہوں اور لیٹا ہوا ہوں بلکہ سویا ہوا ہوں اور ایک دم شدید قسم کے زلزلہ سے میں اُٹھ

پڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کمرے کی دیواریں، چھت اور فرش اس زور سے گردش میں ہیں کہ لگتا ہے جیسے کسی تیز رفتار ٹرین میں ہوں۔ میں خواب میں ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگتا ہوں کہ یا اللہ! یہ کیا ہو گیا ہے، میں تو اس سخت زلزلہ کے وقت اِس کمرے سے باہر بھی نہیں نکل سکتا (کیونکہ کمرا بند تھا)۔ اس پر چند سیکنڈ میں وہ زلزلہ تھم جاتا ہے اور بہت ہی پرسکون ماحول ہو جاتا ہے، الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ اِس سے آنے والے زلزلہ اور اس کی شدت کا احساس اور اُس ماحول کا تصور ذہن میں قریباً ہر وقت ہی رہتا ہے۔

اِسی دَوران کی میری دو اَور خوابیں بھی ہیں جن میں خاکسار نے دونوں مرتبہ خطرناک سانپوں کو اپنے پاؤں پر ڈستے دیکھا۔ پہلی خواب میں اپنے آپ کو ایک کمرے میں پاتا ہوں۔ اُس کمرے کے درمیان میں ایک چارپائی پر امی جان مرحومہ (مبارکہ نسرین صاحبہ مرحومہ) کو خاموش بیٹھا ہوا دیکھتا ہوں اور اُسی چارپائی پر بستروں وغیرہ کا ڈھیر بھی لگا ہوا ہے جیسے عموماً گھر کے سٹور میں ہوتا ہے۔ اس کمرے میں سامنے کی دیوار میں دو الماریاں ہیں جن میں برتن بھی سجے ہوئے ہیں۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک الماری میں سے سانپ نکلتا ہے اور دیوار پر چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہاں کمرے میں اللہ دتہ نمبردار (ساہیوال جیل میں ایک قیدی نمبردار) بھی اپنی سرکاری سرخ ٹوپی میں موجود ہوتا ہے، وہ ایک ڈنڈا لے کر سانپ کی طرف بڑھتا ہے تو سانپ اِدھر اُدھر ہونے کے بعد اُڑ کر چارپائی پر آتا ہے اور پھر بڑی پُھرتی سے میرے دائیں پاؤں کے تلوے کے بالکل درمیان میں ڈس کر تیزی سے اُڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا جاتا ہے اور اِس کے بعد آنکھ کھل جاتی ہے۔

دوسری خواب میں دیکھا کہ میں فضل عمر ہسپتال ربوہ کے سامنے سڑک کے کنارہ کھڑا ہوں کہ ایک سانپ میری طرف آتا ہے۔ میں اُس سے بچنے کے لئے وہاں اُگے ہوئے سفیدے کے پُرانے درخت پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہوں اور ابھی پانچ سات فٹ کی بلندی تک ہی پہنچا ہوں گا کہ وہ مجھے آلیتا ہے اور درخت پر چڑھ کر میرے دائیں پاؤں کی چھنگلی پر ڈس لیتا ہے۔ اس کے بعد تیزی سے درخت سے اُتر کر سڑک پار کر کے بجلی کے کھمبے کے ذریعہ اوپر چڑھنے لگتا ہے۔ میں سفیدے کے درخت پر اُسی جگہ سے یہ منظر دیکھ رہا ہوتا ہوں۔ سانپ آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ بجلی کے تاروں تک جا پہنچتا ہے اور جب ایک تار سے دوسری تار کو چھوتا ہے تو تڑاک کی آواز آتی ہے جس کے ساتھ ہی میری آنکھوں

کے سامنے وہ سانپ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر آ گرتا ہے اور بالخصوص سڑک پر اس کی تڑپتی ہوئی دُم ابھی بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ پھر میں سفیدے کے درخت سے اُتر کر بسوں کے اڈہ پر جاتا ہوں اور چونگی کے برآمدہ میں ایک محرر کو جا کر اپنی ٹانگ دکھاتا ہوں جس پر سوجن کا احساس ہوتا ہے اور اُسے کہتا ہوں کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ پھر غالباً خود ہی ایک بلیڈ لے کر چھنگلی پر کٹ لگانے لگتا ہوں تا کہ زہر نکل جائے۔ اِس کے بعد یاد نہیں کہ کیا ہوا۔

اس خواب نے جہاں دشمن کی طرف سے پہنچنے والے ضرر کی خبر دی وہاں یہ بھی بتا دیا کہ دشمن ہماری آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے انجام کو بھی پہنچ جائے گا۔ اگرچہ حملہ کرنے کے بعد وہ بظاہر اور بھی بلند ہو گا مگر اس کی یہ بلندی سراسر مادی اور عارضی ہو گی بلکہ اس کی یہ بلندی ہی اس کی موت کا موجب ہو گی اور پھر اس کا انجام ایسا صاف اور واضح ہو گا کہ ایک شارع عام کے عین درمیان ہو گا، انشاء اللہ۔

اپنے مولا کی دی ہوئی اس خبر میں مجھے اسی کی ذات کی قسم ایک ذرہ بھی شک نہیں ہے چنانچہ اب جبکہ ہم پر دشمن اپنے دانت تیز کر چکا ہے اس کے بعد اس کمینہ کا انجام بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ضرور بضرور رہو گا۔ پہاڑ ٹل سکتے ہیں، موسم بدل سکتے ہیں، دریاؤں کے رخ تبدیل ہو سکتے ہیں مگر ہمارے رب کے وعدے کبھی پورے ہونے سے نہیں رہ سکتے۔ وہ ضرور بالضرور دشمن کو ذلیل و خوار کرے گا اور ہماری آنکھوں کے سامنے اسے کیفر کردار کو پہنچائے گا اور ہم اس کا انجام دیکھ کر کہیں گے۔ فسبحان الذی اخزی الاعادی ہم سورہ مطففین کی ان آیات کی عملی تفسیر بنے کھڑے ہونگے۔ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ، (وہ آراستہ تختوں پر متمکن نظارہ کر رہے ہوں گے، کیا کفار اُس کی پوری جزاء دیئے گئے ہیں جو وہ کیا کرتے تھے) انشاء اللہ العزیز۔"

خاکسار نے مندرجہ بالا الفاظ جولائی 1986ء میں اپنی ڈائری میں سپردِ قلم کئے تھے جبکہ نمرودِ وقت اور فرعونِ زمانہ ضیاء الحق کا طوطی بول رہا تھا اور وہ اپنے پورے جوبن پر تھا جبکہ میں اُس جگہ تھا جسے دنیا والے کال کوٹھڑی کہتے ہیں مگر پیارے آقا حضرت امیر المؤمنین خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اُسے زندگی کی بقعۂ نور کوٹھڑی کا نام عطا فرمایا تھا۔ گویا ہم دونوں میں بظاہر کوئی نسبت ہی نہ تھی اور ایسے میں ایسی بات کو دیوانے کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ دی جا سکتی تھی مگر ایک عالَم نے دیکھا کہ کال کوٹھڑی میں لکھی گئی بات کس شان سے پوری ہوئی جب اِس خواب میں دکھائے گئے

نظارے کے عین مطابق جنرل ضیاء الحق نے پھانسی کی سزا سنائی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں محفوظ رکھا اور آج ہم سب ساتھی حقیقتاً عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ کے مصداق بن کر دیکھ رہے ہیں کہ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۔ اور دوسری طرف ہماری تباہی کے خواب دیکھنے والا یہ نمرودِ وقت 17 اگست 1988ء کو C130 جیسے محفوظ ترین طیارے میں بھی محفوظ نہ رہ سکا اور سب کے سامنے جل کر اس طرح تباہ و برباد ہو گیا کہ اُس کا نام و نشان تک نہ رہا۔ یہ بات کیوں نہ پوری ہوتی کہ مسیح محمدیؑ کے غلام کے قلم سے نکلی ہوئی بات تھی، جس کا اپنا تو کچھ بھی نہیں، سب آقا کی برکت سے ہے اور جس کا ایمان ہی یہ ہے کہ سب کچھ تری عطا ہے، گھر سے تو کچھ نہ لائے۔

21 اپریل 1987ء کی رات ایک خواب دیکھا۔ نظارے میں یہ تو واضح ہے کہ میں جیل میں ہی ہوں مگر وہ ہے کوئی نئی جگہ۔ ایک مختصر سا احاطہ ہے جس کی دیواروں سے باہر کا نظارہ بھی ہو رہا ہے۔ میں صحن میں کھڑا ہوں کہ یکا یک سامنے فضا میں ایک جہاز اڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کے ساتھ ہی دھماکہ ہوتا ہے۔ میری نگاہیں جائے دھماکہ کی طرف دوڑتی ہیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ دُور جہاں سے جہاز بم گرا کر آیا ہے، وہاں گرد و غبار ہی نہیں بلکہ بڑی بڑی عمارتیں اور لمبے لمبے ستون گرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نظارہ کافی دیر تک رہتا ہے، گڑگڑاہٹ اور دَھم دَھم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ساتھ ہی ایک دو اَور جہازوں کو اپنے اوپر پرواز کرتے دیکھتا ہوں تو یقین ہو جاتا ہے کہ جنگ لگ گئی ہے۔ خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں بھی بم نہ گرادیں مگر ہم پوری طرح محفوظ رہتے ہیں، واللہ اعلم بالصواب۔

ایک اَور خواب کا منظر ایک گہرے کنویں پر مشتمل تھا۔ جو پختہ اینٹوں اور پلستر والی دیواروں پر مشتمل تھا۔ اس کی سطح زمین سے صرف تین چار فٹ بلند منڈیر کی طرح تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ اس کنویں سے پانی نکالنے کی بجائے ایک 4 یا 5 اِنچ کا ٹیوب ویل اُلٹا اس میں پانی پھینک رہا تھا۔ پہلے اس میں سطحِ آب بہت نیچی تھی اور اس کا قریباً پانچواں حصہ خالی تھا۔ مجھے نہ جانے کس وجہ سے اس کنویں کے اوپر سے ہو کر اُس کے پار جانا پڑا۔ اس کے لئے جب میں لکڑی کے تختوں کے اوپر چلتا ہوا اُسے عبور کرنے لگا تو آگے جو خالی جگہ تھی وہاں سے میں اس کنویں میں جا گرا۔ اُس وقت ٹیوب ویل پورے زور شور سے چل رہا تھا اور اس میں پانی پوری رفتار سے گر رہا تھا۔ اس لمحہ میں نے دیکھا کہ اس کنویں میں پانی کی سطح کافی اونچی ہو گئی ہے قریباً زمین کے برابر ہو چکی تھی اور یہ بات میرے لئے حیرانی کا باعث بھی ہوتی ہے۔ تاہم میں اس جوش مارتے ہوئے پانی میں جا گرتا ہوں مگر پانی مجھے یک دم اُوپر اٹھاتا ہے۔ میں اپنا دایاں ہاتھ منڈیر کی

طرف بھینے کی غرض سے بلند کرتا ہوں اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں صدیق (ایک قیدی سزائے موت) کھڑا ہے، وہ میری طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے اور میری بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ میرا باز و پکڑ کر مجھے باہر نکال لے کیونکہ بصورت دیگر میرے غرقاب ہونے کے سوا کچھ نہیں ہوگا لیکن وہ بالکل قریب ہونے کے باوجود میری انگلیوں کے صرف پوروں کو چھوتا ہے اور مزید کوئی کوشش نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے میں پھر نیچے پانی میں چلا جاتا ہوں اور جاتے جاتے اپنے دِل میں افسوس کرتا جاتا ہوں کہ وہ مجھے بچا سکتا تھا مگر اس نے کوئی مدد نہیں کی۔ میں پانی میں نیچے جا کر پھر اَچانک پانی کے زور سے اوپر اُبھرتا ہوں۔ وہ قیدی پھر بھی وہیں کھڑا ہوتا ہے مگر اب کے مجھے منڈیر کے آخر پر سیمنٹ کی ایک بالشت بھر راڈ نظر آ جاتی ہے۔ بالکل ویسی جیسے سیمنٹ کی جالیاں وغیرہ ہوتی ہیں چنانچہ میں اس قیدی کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اس راڈ پر ہاتھ ڈالتا ہوں اور اس کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ اور پھر زور لگا کر جسم کو ایک جھٹکے کے ساتھ باہر نکالنے کی کوشش میں ہوتا ہوں کہ آنکھ کھل جاتی ہے۔ گو خواب نامکمل رہی اور ابھی باہر نہیں نکلا تھا مگر ذہن میں خوف کی بجائے امن ہوتا ہے کہ اس طرح ڈوبنے سے بچ گیا، الحمد للہ۔ اِس خواب کی حقیقی تعبیر کیا ہے، یہ تو کوئی صاحب علم بزرگ ہی بتا سکتے ہیں مگر میں نے اسے اِنذاری بھی سمجھا اور تبشیری بھی! اس لیے صدقہ بھی دے دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے اِنذاری حصہ سے محفوظ رکھے اور اس کو ماضی سے متعلق کر دے اور آئندہ کا تعلق اس کے تبشیری حصہ سے کر دے۔ آمین۔

غرض یہ چند ایک نظارے بطور نمونہ ہدیہ قارئین کئے گئے ہیں جن کے طفیل ہمیں اندرونی قوت نصیب رہی اور سہارا ملتا رہا اور ہمارے حوصلے اللہ کے فضل سے بلند رہے۔ ان نظاروں میں اللہ تعالیٰ نے واضح رنگ میں اس راہ میں آنے والے خوفناک حالات کی خبریں ہمیں دیں تو اس کے ساتھ ساتھ تسلی اور تسکین کے سامان بھی فرمائے۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے اس دس سالہ دورِ اسیری میں کوئی سرکاری اہلکار، قیدی یا ملاقاتی ہمارے بارہ یہ تاثر قائم نہ کر سکا کہ ہم گھبرائے ہوئے ہیں، الحمد للہ۔

خاکسار کے ابا جان محترم مولانا محمد اسمٰعیل منیر صاحب مرحوم نے ہماری رہائی کے بارہ میں مختلف احباب کو دی جانے والی الٰہی بشارات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

سب سے پہلی خوشخبری ہماری چینی ہمسائی محترم مولانا عثمان چو چنگ شی صاحب کی اہلیہ محترمہ نے اپنی خواب سنائی جس کی تعبیر یہ تھی کہ حکومتِ وقت سے الیاس منیر صاحب کو منفعت ملے گی اس خواب کو عملی طور

پر پورا کرنے کے لئے محترمہ خود ہمارے ساتھ جیل گئیں ۔ اسی طرح الیاس منیر صاحب کے سکول ٹیچر مولانا محمد ابراہیم صاحب بھامبڑی کی صاحبزادی نے 1985 میں خواب دیکھی کہ ملٹری والے اسیران ساہیوال کو پھانسی گھاٹ کی طرف لے جا رہے ہیں مگر سول پولیس نے روک ڈال دی ہے اور انہیں واپس لے آئے ہیں چنانچہ 1986 اور 1987 میں دو دفعہ ملٹری والوں نے پھانسی دینے کی تیاری کی مگر ہائی کورٹ نے حکم امتناعی جاری کر دیا اور بعد میں رہائی کا حکم بھی دے دیا۔ محترم شیخ مبارک احمد صاحب امیر و مشنری انچارج امریکہ کے داماد بھی اس کیس میں جیل میں تھے، اللہ تعالیٰ نے شیخ صاحب کو امریکہ میں خبر دی کہ سب اسیران رہا ہو جائیں گے چنانچہ پہلے اُن کے داماد رہا ہوئے اور بعد میں باقی اسیران بھی رہا ہو گئے، اسی طرح ملک محمد شریف صاحب آف محمود آباد جہلم ہمارے محلہ تحریکِ جدید کوارٹرز کے دعا گو بزرگ تھے جن کی خدمت میں عاجز اکثر اسیران کی رہائی کے لئے درخواستِ دعا عرض کیا کرتا تھا، ایک دن فرمانے لگے کہ آج اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی وہ آیت الہاماً بتائی ہے جس میں بنی اسرائیل کا فرعون سے نجات پانے کا ذکر ہے پس یقیناً ہمارے اسیرانِ ساہیوال بھی نجات پائیں گے۔

یہ سب خلافت کی برکات ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ایدہ اللہ تعالیٰ کو خود بھی بتایا کہ الیاس منیر صاحب رہا ہو کر لنڈن کی فضا میں آن ملیں گے پھر خلافت کی برکت سے ہی آپ کے ماننے والوں کو اس خبر کی تصدیق عطا فرمائی ۔........... انہی پیش خبریوں نے مجھے ہمیشہ اسیرانِ راہِ مولا ساہیوال کے بارہ میں پر امید رکھا۔

## ہماری رہائی کے لئے عالمی سطح پر ہونے والی کوششوں کا مختصر تذکرہ

دنیا میں ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو ظاہر ہونے والے حالات وواقعات پر منصفانہ نگاہ رکھتے ہیں اور جہاں ظلم اور زیادتی دیکھیں، اس کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کے ان علمبرداروں کی یہ آواز اگرچہ نقار خانہ میں طوطی کی سی ہوتی ہے مگر اس کے باوجود ان کی مسلسل محنت کے نتیجہ میں رائے عامہ ضرور بیدار ہوجاتی ہے اور ظالموں کے لیے کسی نہ کسی حد تک پریشانی کا باعث ضرور بنتی ہے۔ اللہ ایسے انسان دوست لوگوں اور تنظیموں کو ان کی اس نیکی کی جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

ہماری اسیری کے دوران بھی ایسے لوگوں، تنظیموں اور اداروں نے بہت سی کوششیں کیں، پاکستان کے دورے کیے، ہمارے اعزہ واقرباء سے ملاقاتیں کر کے حقائق معلوم کیے اور ان کی روشنی میں اپنی رپورٹیں مرتب کیں۔ ان کا مختصر تذکرہ ہدیۂ قارئین ہے۔

### ایمنسٹی انٹرنیشنل کی جدوجہد

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے آسٹریلین گروپ نمبر 310 کے ممبران ہم اسیران کی رہائی کے لئے مختلف ذرائع سے متواتر دس سال کوشاں رہے، اُن کا ایک خط بطور نمونہ ملاحظہ ہو جس میں اُنہوں نے ہمارے لئے انصاف مہیا کرنے کی اپیل کی اور یہ خط اسلام آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ The Muslim کی اشاعت 30 مارچ 1991ء میں ان الفاظ کے ساتھ شائع ہوا:

**An unjustly accused prisoner**

I am writing on behalf of an Amnesty International group in Australia. For many years now we have been concerned about the situation of Ilyas Munir, presently (to the best of our knowledge) being held in Faisalabad Central Jail.

Ilyas Munir was arrested in Sahiwal on October 26,1984,after an incident in an Ahmadi mosque. He was tried for murder and sentenced to death by a Special Military Court(No. 62, Multan). Following this trial and sentence, there was considerable alarm and consternation-both in your country's press and by members of the legal profession. Seventy-seven members of the bar association protested the court's findings, and the mandatory review carried out by the Martial Law Administration gave strong. Objection to both the findings and the sentence.

According to the Revision Order signed by the MLA on October 8,1985,the court was required to"reconsider the conviction on all the charges which is based on doubtful evidence and as such is not legally sustainable."With the election Benazir Bhutto this man's death sentence was commuted to life imprisonment-although this was not the consequence of a new and impartial hearing.

This case is particularly relevant at the moment because it is in front of the Divisional Bench of Lahore High Court Justice Manzoor Sial is the chair man and he is assisted by Justice Munir Sheikh.

I am writing to you because I am convinced that one of the cornerstones of justice in our world is a free and responsible press. I urge you to take an interest in this man's situation, an unjustly accused prisoner for some seven years. Please bring it to the attention of your readers and do all in your power to make sure that Ilyas Munir has a prompt and just hearing.

-KERRY FLATTLEY, Amnesty International Group-310,Australia.

جرمن ایمنسٹی انٹرنیشنل والے بھی متواتر دس سال ہم اسیرانِ راہِ مولا ساہیوال کے متعلق فکر مند رہے۔ انسانی حقوق کی خاطر برسرِ پیکار اس جرمن تنظیم کی قریباً ہر سالانہ رپورٹ میں ہی ہماری باعزت بریت کے لئے مطالبات شائع ہوتے رہے۔ اُن کی سالانہ رپورٹ 1993ء مطبوعہ اگست 1994ء کے صفحہ 428 پر بھی ذکر ہے کہ حکومتِ پاکستان نے اپنے سیاسی چکر میں بہت سے احمدیوں کو جیل میں ڈال رکھا ہے ساہیوال میں عبدالقدیر، محمد حاذق رفیق، محمد الیاس منیر اور نثار احمد وغیرہ پر 1984ء میں جھوٹے الزامات لگا کر جیل میں ڈال دیا۔ اُن سے انصاف نہیں کیا گیا انہوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کر رکھی ہے بار بار کی کوششوں کے باوجود اُن کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔

## احتجاجی جلوس

ہماری اسیری کے دوران اگرچہ مختلف ممالک میں اپنے اپنے انداز میں کوششیں ہوتی رہیں مگر جماعت جرمنی نے ایک انوکھا طریق اختیار کیا۔ احباب جماعت جرمنی اپنے امیر صاحب کی قیادت میں ملک بھر سے بسوں کے ذریعہ جرمنی کے اُس وقت کے دارالحکومت بون پہنچے اور یہاں مروجہ طریق کے مطابق ایک احتجاجی جلوس نکالا اور متعلقہ اداروں کو یادداشتیں پیش کیں جن میں ہمارے خلاف ظالمانہ فیصلے پر احتجاج کرتے ہوئے حکومت جرمنی سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس سلسلہ میں حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالے کہ ایسے غیر منصفانہ اور ظالمانہ فیصلوں کو واپس لیا جائے۔ اسی طرح فرانکفورٹ میں بھی جلوس نکالا گیا۔

جرمنی کی طرح کینیڈا میں بھی احباب جماعت نے ٹورنٹو میں ہماری سزاؤں کے خلاف ایک پُرامن احتجاجی جلوس نکالا

گیا اور حکام کو یادداشتیں پیش کی گئیں۔ اس طرح سے رائے عامہ کو محض مذہبی بنیاد پر پاکستان میں ہونے والے مظالم سے آگاہ کیا گیا۔

ان جلوسوں میں شامل ہونے والے بچے، بوڑھے اور جوان سبھی کے دلوں میں دراصل ہمارے لئے ایک درد تھا اور ان کا یہ عمل دراصل ہمارے لئے دعائیں بن کر عرش تک پہنچتا رہا اور بس اجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

## اعلیٰ صحافتی قدروں کے حامل اخبارات

اگرچہ پاکستان میں آزادیٔ صحافت کے تعلق میں بہت سے تحفظات کا اظہار کیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود بعض اخبارات نے ہمارے مقدمہ کے بارہ میں نہایت درجہ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقائق پر مشتمل خبریں شائع کیں۔ ان میں سے بعض خبریں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں۔

### ایک ایسی عدالت کا فیصلہ جس کا وجود ہی نہیں

ہمارا فیصلہ سنائے جانے کے فوراً بعد فرنٹیئر پوسٹ پشاور Frontier Post Peshawar نے اپنی فروری 1986ء کی ایک اشاعت میں ہمیں سنائی جانے والی سزاؤں کی خبر شائع کرتے ہوئے یہ دلچسپ تبصرہ کیا کہ یہ ایک ایسی عدالت کا فیصلہ ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یعنی تمام فوجی عدالتیں مارشل لاء اٹھائے جانے سے 30 دسمبر 1985ء کی شب ختم ہو چکی تھیں جبکہ فوجی عدالت کی طرف سے کیا گیا یہ فیصلہ ہمیں 16 فروری 1986ء کو سنایا گیا۔

### جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے قاری اور طالب علم کا قتل

### چھ قادیانیوں کو فوجی عدالت سے ملنے والی سزا کے خلاف عارضی حکم امتناعی

ہائی کورٹ نے اپیل کی درخواست سماعت کیلئے منظور کر لی (امروز کے نامہ نگار سے)

ساہیوال 7 مارچ لاہور ہائی کورٹ کے ملتان بینچ نے ساہیوال کے مشہور قادیانی کیس کے ملزموں کی درخواست پر مارشل عدالت سے ملنے والی سزا کے خلاف عارضی حکم امتناعی جاری کرتے ہوئے ان کی درخواست سماعت کیلئے منظور کر لی ہے۔ ملزموں نے 26 اکتوبر 1984ء کو فائرنگ کر کے جامعہ رشیدیہ کے قاری بشیر احمد اور ایک طالب علم اظہر رفیق کو ہلاک کر دیا تھا۔ بعد میں پولیس نے ملزموں نعیم الدین، محمد الیاس، نثار، قدیر، حاذق رفیق اور ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس محمد دین کو گرفتار کر لیا تھا جبکہ دو ملزمان لطف

الرحمٰن اور پروفیسر محمد طفیل مفرور ہوگئے تھے۔ مارشل لاء عدالت ملتان نے نعیم الدین اور محمد الیاس کو سزائے موت کا حکم سنایا تھا اور نثار، قدیر، حاذق رفیق اور محمد دین کو عمر قید سنائی گئی تھی۔ ان سزاؤں کے خلاف مجرموں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے اپیل کی تھی جو انہوں نے مسترد کرتے ہوئے سزا کی توثیق کردی۔ مگر اب مجرموں نے مارشل لاء کی عدالت کی سزاؤں کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی جو سماعت کیلئے منظور کرلی گئی، مجرموں کی طرف سے عابد حسین منٹو پیش ہوئے۔[1]

یہی خبر روزنامہ ڈان نے مندرجہ تفصیل کے ساتھ شائع کی:

Six Ahmadis' conviction

## LHC directs AG to seek Govt. instructions

Dawn Lahore Bureau

FEBRUARY 18: A division bench of the Lahore High Court has directed the Advocate-General, Punjab, to seek instructions on a writ petition filed by six Ahmadis, two of whom were sentenced to death, and four to life imprisonment, by a Special Military Court. The court also directed the Advocate General that the petitioners should not be executed till the decision of the writ.

Petitioners, Mohammad Ilyas, Mr. Naeemuddin, Abdul Qadir, Mohammad Nasir, Muhammad Haziq Rafique and Mohammad Din, in their petition challenged the validity of the order of the Special Military Court.

Brief facts of the case are that a case was registered against the petitioners on Oct 26, 1984, under Section 302 PPC for opening fire on a mob that was removing Kalima Tayyaba and other Quranic inscriptions from the Ahmadia Mosque. The first Information Report said that the deceased, Qari Bashir Ahmad and complainant, Abdul Latif, discussed the Ahmadis were violating the Ahmadi Ordinance in as much as their Centre in Sahiwal was still being called a mosque and they were calling Azan. On Oct 26 they went with a group to Ahmadi Mosque where they heard Azan being called from inside the Centre. Petitioners submitted that on the day of occurrence about half-an-hour before the morning prayers a mob comprising about 25/30 persons including Qari Bashir Ahmad and Azhar Rafiq, deceased, raided Baitul Hamd (Ahmadia place of worship). The mob, first of all, wiped of Kalma Tayyaba inscribed on the outer main gate of Baitul Hamd with blue paint. They then entered the premises and started wiping off the other Quranic verses written above the doors inside the Biatul Hamd. On this desecration for the Quranic verses and

---

[1] (روزنامہ امروز 8 مارچ 1987ء)

the Kalima and defiling of the place of worship, Naeemuddin, who was present inside, was highly provoked and by using his 12-bore licensed gun fired in the air to scare away the trespassers. The raiding party did not desist, and instead advance towards Naeemuddin in a hostile and violent manner creating grave apprehension in his mind that children and women living in the quarters of Baitul Hamd may also be harmed by the group. Naeemuddin, therefore, fired a second shot from his gun in the exercise of his right of self-defence. Qari Bashir Ahmad, deceased, was inside the premises of Baitul Hamd. The said Qari Bashir Ahmad staggered across the premises leaving behind a trail of blood and fell a few paces outside the main gate. The mob seemed to be infuriated and instead of withdrawing adamantly went ahead which obliged Naeemuddin to fire from his gun again thereby hitting Azhar Rafiq who fell within the compound of Baitul Hamd.

TRIAL BY SMC:

The petitioners were tried in a Special Military Court which on June 16, 1985, found all the petitioners guilty of all the charges and awarded death sentences to Naeemuddin and Ilyas, while seven years' imprisonment to remaining four petitioners.

The matter was referred to Martial Law Administrator, Punjab, who declined to confirm the sentences with the direction that the court re-assemble for the purpose of revising its finding and sentences in the light of the observations made by him in his order. The order of the Martial Law Administrator pointed out the deficiencies and inadequacies in the prosecution evidence and observed that findings and sentences of all the convicted persons required to be reconsidered on all the charges.

It was also observed that in view of the circumstances emerging from the evidence, petitioner No. 2, Naeemuddin, was not guilty of offence under Section 302 PPC and he was required to be dealt with under the section 304. Further the Martial Law Administrator observed that the conviction of all the petitioners under Section 148 PPC was not sustainable.

In pursuance of the direction of MLA, Punjab, the court reassembled on Oct 21, 1985 and instead of reducing the sentences as observed by the MLA, maintained the death sentences of two petitioners and enhanced the sentences of four petitioners form seven years to life imprisonment.

The petitioners submitted that they had reasons to believe that after the Martial Law Administrator, Zone "A" had declined to confirm the original findings and sentences and had asked the court to revise its finding, pressure was brought to bear upon all concerned from quarters actively opposed to the Ahmadia sect. When the Martial

Law Administrator, Zone "A" did not approve of the so-called revised finding and sentences the case was kept back and ultimately sent to the President, who had met delegation of the religious groups opposing the Ahmadis and asking for their death purely on religious grounds.

The petitioner, therefore, submitted that if the record of the entire case and the proceedings after the court trial are brought before this learned court, the malafides of the respondent Government and its functionaries dealing with this case shall become apparent. They prayed the court to declare the sentences and conviction unlawful. Mr. Abid Hasan Minto, Mr. A. Waheed Salim and Mr. Mukhtar Butt appeared for the petitioners.

روزنامہ ڈان کراچی مؤرخہ 19 فروری 1987ء میں شائع شدہ مذکورہ بالا خبر کا اُردو ترجمہ

## چھ احمدیوں کی سزا

## لاہور ہائی کورٹ کی طرف سے ایڈووکیٹ جنرل کو حکومت سے ہدایات حاصل کرنے کا حکم

18 فروری: لاہور ہائی کورٹ کے ایک ڈویژن بنچ نے ایڈووکیٹ جنرل پنجاب کو ہدایت کی ہے کہ وہ ان چھ احمدیوں، جن میں سے دو کو سزائے موت اور چار کو ایک خصوصی فوجی عدالت نے عمر قید کی سزا دی ہے، کی طرف سے دائر کردہ رٹ درخواست پر حکومت سے ہدایات حاصل کریں۔ عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل کو یہ بھی ہدایت کی کہ درخواست کنندگان کی سزاؤں پر اس رٹ کے فیصلے تک عملدرآمد نہ کیا جائے درخواست دہندگان محمد الیاس، نعیم الدین، عبدالقدیر، محمد نثار، محمد حاذق رفیق اور محمد دین نے اپنی درخواست میں خصوصی فوجی عدالت کے فیصلے کے جواز کو چیلنج کیا۔

اس مقدمے کے مختصر واقعات یہ ہیں کہ درخواست دہندگان کے خلاف 26/ اکتوبر 1984ء کو زیر دفعہ تعزیرات پاکستان ایک ہجوم پر فائرنگ کرنے کے الزام میں مقدمہ درج کیا گیا، یہ ہجوم احمدیہ مسجد سے کلمہ طیبہ اور دیگر آیاتِ قرآنیہ مٹا رہا تھا۔ ابتدائی پولیس رپورٹ (ایف آئی آر) میں کہا گیا کہ متوفی قاری بشیر احمد اور مدعی عبداللطیف نے آپس میں یہ مشورہ کیا کہ احمدی لوگ احمدی آرڈیننس کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور ابھی تک ساہیوال میں ان کے مرکز کو مسجد کہا جاتا ہے اور وہ ابھی تک اذان بھی دے رہے ہیں۔ 26 اکتوبر کو وہ لوگ ایک گروپ کی شکل میں احمدیہ مسجد گئے جہاں انہوں نے اس مرکز کے اندر سے اذان کی آواز آتی ہوئی سنی۔ رٹ درخواست دائر کرنے والوں نے یہ کہا کہ وقوعہ کے روز صبح کی نماز سے قبل

25/30 افراد پر مشتمل ایک ہجوم نے جس میں قاری بشیر احمد اور اظہر رفیق متوفیان شامل تھے بیت الحمد (احمدیہ عبادت گاہ) پر حملہ کیا۔ ہجوم نے سب سے پہلے نیلے رنگ کے روغن سے بیت الحمد کے بیرونی بڑے دروازے پر لکھا ہوا کلمہ طیبہ مٹایا۔ اس کے بعد وہ احاطے کے اندر داخل ہوئے اور بیت الحمد کے اندر دروازوں کے اوپر لکھی ہوئی دیگر آیات قرآنیہ مٹانی شروع کر دیں۔ اس پر قرآنی آیات اور کلمہ طیبہ کی اس بے حرمتی اور عبادت کے تقدس کو پامال کرنے پر نعیم الدین جو کہ اندر موجود تھا، شدید طور پر مشتعل ہو گیا اور اپنی بارہ بور کی لائسنس شدہ رائفل سے ہوائی فائر کیے تاکہ دخل اندازی کرنے والوں کو ڈرایا جا سکے لیکن حملہ آور پارٹی باز نہ آئی اور اس کی بجائے وہ لوگ نعیم الدین کی طرف سخت غصے اور اشتعال کے رنگ میں آگے بڑھے جس سے اُس کو اس بات کا شدید خطرہ محسوس ہوا کہ بیت الحمد کے کوارٹروں کے اندر موجود بچے اور عورتیں بھی اس حملہ آور گروپ کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس پر نعیم الدین نے اپنے دفاع کا حق استعمال کرتے ہوئے اپنی بندوق سے دوسرا فائر کیا۔ قاری بشیر احمد متوفی کو بندوق کی گولی اس وقت لگی جبکہ وہ بیت الحمد کے احاطے کے اندر موجود تھا۔ مذکورہ قاری بشیر احمد لڑکھڑاتا ہوا گزرا اور اس کے خون کی بوندوں کی ایک لکیر اس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی وہ بیرونی گیٹ سے باہر نکل کر چند قدم کے فاصلے پر جا کر گر گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہجوم اس سے طیش میں آ گیا اور پیچھے ہٹنے کی بجائے مشتعل ہو کر آگے بڑھا جس کی وجہ سے نعیم الدین کو اپنی بندوق سے دوبارہ فائر کرنا پڑا اس کے نتیجے میں اظہر رفیق کو گولی لگی اور وہ بیت الحمد کے صحن میں گر گیا۔

## خصوصی فوجی عدالت میں سماعت

درخواست دہندگان کے خلاف ایک خصوصی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا جس نے 16 جون 1985ء کو تمام درخواست دہندگان کو تمام الزامات کے تحت مجرم قرار دے کر نعیم الدین اور الیاس منیر کو سزائے موت اور باقی چار کو سات سات سال قید کی سزا سنائی۔ معاملہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پنجاب کو بھیجا گیا جنہوں نے سزائے موت کی توثیق کرنے سے انکار کیا اور یہ ہدایت کی کہ عدالت دوبارہ سماعت کرے اور اُن کے ریمارکس کی روشنی میں اپنے فیصلے اور سزا پر نظر ثانی کرے۔ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے حکم میں استغاثہ کی شہادتوں میں کمزوریاں اور بے جواز باتوں کی نشاندہی کی گئی اور یہ لکھا کہ تمام افراد جن کو سزا دی گئی ہے

ان کی تمام الزامات کے تحت دی گئی سزاؤں پر دوبارہ غور کرنا ضروری ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ شہادتوں کی روشنی میں جن حالات وواقعات کا پتہ چلتا ہے ان کے مطابق درخواست دہندہ نمبر 2 نعیم الدین پر جرم زیر دفعہ 302 تعزیرات پاکستان کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ صرف سیکشن 304 تعزیرات پاکستان کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اور اس کو اسی دفعہ کے تحت زیر غور لایا جائے۔ اس کے علاوہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے یہ بھی لکھا کہ تمام درخواست دہندگان کی سزا زیر دفعہ 148 تعزیرات پاکستان بھی مناسب نہیں ہے۔

ایم ایل اے پنجاب کی ہدایات کی روشنی میں (فوجی) عدالت نے 12 اکتوبر 1985ء کو دوبارہ سماعت کی اور بجائے اس کے جیسا کہ ایم ایل اے نے کہا تھا، سزا میں کمی کی جاتی، عدالت نے یہ کیا کہ دونوں درخواست دہندگان کی سزائے موت برقرار رکھی اور دیگر چار درخواست دہندگان کی سزا کو سات سال سے بڑھا کر عمر قید میں تبدیل کر دیا۔

درخواست دہندگان نے اپنی درخواست میں کہا کہ ان کے پاس اس امر کے یقینی شواہد موجود ہیں کہ جب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون "اے" نے عدالت کے ابتدائی فیصلہ اور سزاؤں کی توثیق سے انکار کیا تھا اور عدالت کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کو کہا تھا تو تمام متعلقہ افراد پر جماعت احمدیہ کے سرگرم مخالف عناصر کی طرف سے دباؤ ڈالا گیا۔ جب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون "اے" نے نام نہاد نظر ثانی شدہ فیصلے اور سزاؤں کی توثیق سے بھی انکار کیا تو کیس کو زیر التوا رکھا گیا اور آخر کار صدر کو بھیج دیا گیا۔ جنہوں نے ایسے مذہبی گروہوں سے ملاقات کی جنہوں نے احمدیت کی مخالفت کی اور احمدیوں کی موت کا فیصلہ خالصتاً مذہبی بنیادوں پر کرنے کا مطالبہ کیا۔

درخواست دہندگان نے عدالت سے درخواست کی اگر اس کیس کا سارا ریکارڈ اور سماعت کرنے والی عدالت کی ساری کارروائی اس فاضل عدالت کے سامنے لائی جائے تو مدعا علیہ حکومت اور اس کیس سے عہدہ برآ ہونے والے متعلقہ اہلکاروں کی بدنیتی واضح ہو جائے گی۔ انہوں نے عدالت سے درخواست کی کہ سزائے موت اور سزائے قید کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔ درخواست دہندگان کی طرف سے مسٹر عابد حسن منٹو، مسٹر اے وحید سلیم اور مسٹر مختار بٹ پیش ہوئے۔[1]

[1] بحوالہ ضمیمہ ماہنامہ خالد مارچ 1987ء

## ساہیوال کے مشہور مقدمہ میں ملوث

## تمام سزا یافتگان کو ہائی کورٹ کی طرف سے باعزت رہا کرنے کا حکم

### روزنامہ جنگ لاہور کی ایک خبر

ربوہ (نامہ نگار) گزشتہ روز جامعہ رشیدیہ ساہیوال کے مشہور مقدمہ میں ملوث تمام سزا یافتگان کو ہائی کورٹ کی طرف سے باعزت رہا کرنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ واقعات کے مطابق 26 اکتوبر 1984 کو نمازِ فجر سے پہلے سینکڑوں افراد نے ساہیوال میں قادیانیوں کی ایک عبادت گاہ پر اچانک حملہ کر دیا اور اس دوران دو افراد کلمہ طیبہ مٹانے کیلئے عبادت گاہ میں داخل ہو گئے جہاں فائرنگ کر دی گئی جس سے وہ ہلاک ہو گئے۔ بعد ازاں ہلاک شدگان کے ورثاء کی طرف سے رانا نعیم الدین، الیاس منیر، نثار احمد، عبد القدیر، حاذق رفیق، چوہدری اسحاق اور محمد دین ریٹائرڈ سب انسپکٹر پولیس کے خلاف مقدمہ کا اندراج ہوا۔ چنانچہ رانا نعیم الدین اور الیاس منیر صاحب کو سزائے موت اور دیگر مبینہ ملزموں کو عمر قید کی سزا سنائی۔ 1988ء میں رانا نعیم الدین اور الیاس منیر کی سزائے موت کو بھی عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا اس سے پہلے صدر کے پاس اپیل دائر ہوئی لیکن صدر مملکت نے مبینہ ملزموں کی اپیل خارج کر دی۔ اس کے بعد ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی چنانچہ 19 مارچ کو تمام مبینہ ملزموں کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔[1]

برصغیر میں باقاعدگی سے شائع ہونے والے قدیم اردو اخبار روزنامہ الفضل ربوہ نے خاکسار کی تعلیمی کامیابی پر مندرجہ ذیل اداریہ لکھا۔

### محمد الیاس منیر

عزیزم مکرم محمد الیاس منیر ہمارے سلسلہ کے ایک نوجوان مربی ہیں ساہیوال کے قتل کے مقدمہ میں ماخوذ ہوئے اور فوجی عدالت نے انہیں سزائے موت سنائی ایک لمبے عرصہ سے وہ قید میں ہیں اور اس قید کا خاصا طویل عرصہ انہوں نے موت کی کال کوٹھڑی میں گزارا ہے اس دوران انہوں نے اپنی تمام تکالیف کے باوجود تعلیم جاری رکھی اور اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے 744 نمبر لے کر انٹرمیڈیٹ بورڈ میں چوتھی پوزیشن

[1] روزنامہ جنگ لاہور، 22 مارچ 1994ء

حاصل کی ہے۔ محکمہ تعلیم نے جیل میں انہیں یہ خوشخبری سنائی ہے کہ انہیں حکومت نے ٹیلنٹ سکالرشپ دیا ہے ہم اس خوشخبری کی عزیزم مکرم محمد الیاس منیر کو تہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں اور اُن کے والد محترم مولانا محمد اسماعیل منیر اور اُن کے خاندان کے دیگر افراد کو بھی ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ جن حالات میں انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی وہ انتہائی طور پر غیر معمولی تھے اور انہیں دیکھ کر حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ کی وہ پیشگوئی نظروں میں گھوم جاتی ہے کہ میرے فرقہ کے لوگ دوسروں سے تعلیم میں بہت آگے نکلیں گے۔ اس میں کیا شک ہے کہ اس باہمت اور باحوصلہ نوجوان نے اس پیشگوئی کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ سچی کر دکھایا ہے حقیقت یہ ہے کہ احمدیہ جماعت حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ ہی کی طرح ایسی چیز سے نہیں بنی ہوئی جس کا مقدر شکست ہو بلکہ اس کی تقدیر میں فتح کی شان نمایاں ہے باہمت باحوصلہ محنت کر کے دوسروں سے آگے نکل جانے والے نوجوان اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہیں۔ ہمارے اس نوجوان مربی نے جس عزم اور حوصلہ اور محنت کا اظہار کیا ہے وہ جماعت کے لئے مثال بن جانی چاہئے۔ ہمیں ایسے ہی باہمت اور عزم کے پختہ نوجوانوں کی ضرورت ہے جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکیں اور جن کی زندگی موت پر خوف طاری کر دے موت کی کال کوٹھڑی میں تو انسان کا ویسے ہی دم گھٹنے لگتا ہے اور موت اسے اتنا قریب نظر آتی ہے کہ وہ دنیا کی ہر بات سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے لیکن اس نوجوان نے نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو دل برداشتہ نہیں ہونے دیا بلکہ اپنے عزم اور اپنے حوصلہ کا اس طرح اظہار کیا ہے کہ دنیا اس کی اس بات کو ہدیہ تبریک پیش کرنے پر مجبور ہے۔[1]

[1] (روزنامہ الفضل ربوہ، 20 دسمبر 1988 تحریر محترم مولانا نسیم سیفی صاحب مرحوم)

سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں

وہ سب لوگ جو اخیر تک صبر کریں گے اور اُن پر مصائب کے زلزلے آئیں گے اور حوادث کی آندھیاں چلیں گی اور قومیں ہنسی اور ٹھٹھا کریں گی اور دنیا اُن سے سخت کراہت کے ساتھ پیش آئے گی وہ آخر فتح یاب ہوں گے اور برکتوں کے دروازے اُن پر کھولے جائیں گے۔ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ میں اپنی جماعت کو اطلاع دوں کہ جو لوگ ایمان لائے ایسا ایمان جو اُس کے ساتھ دنیا کی ملونی نہیں اور وہ ایمان نفاق یا بزدلی سے آلودہ نہیں اور وہ ایمان اطاعت کے کسی درجہ سے محروم نہیں ایسے لوگ خدا کے پسندیدہ لوگ ہیں اور خدا فرماتا ہے کہ وہی ہیں جن کا قدم صدق کا قدم ہے۔ اے سننے والو سنو!! کہ خدا تم سے کیا چاہتا ہے بس یہی کہ تم اُسی کے ہو جاؤ اُس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرو نہ آسمان میں نہ زمین میں۔ ہمارا خدا وہ خدا ہے جو اب بھی زندہ ہے جیسا کہ پہلے زندہ تھا اور اب بھی وہ بولتا ہے جیسا کہ وہ پہلے بولتا تھا اور اب بھی وہ سنتا ہے جیسا کہ پہلے سنتا تھا۔ یہ خیال خام ہے کہ اس زمانہ میں وہ سنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ بلکہ وہ سنتا ہے اور بولتا بھی ہے، اس کی تمام صفات ازلی ابدی ہیں کوئی صفت بھی معطل نہیں اور نہ کبھی ہوگی۔ (رسالہ الوصیت، روحانی خزائن جلد ۲۰ صفحہ ۳۰۹)

## اے شہر خرد والو!

بے باکی و بے ادبی ہر دور کی بولہبی
عَربی ہو کہ ہو عجمی کس کام کی بوالحکمی
اے شہرِ خرد والو! ماضی پہ نظر ڈالو
اقوامِ گزشتہ کی تاریخ کبھی دیکھی؟
اب نام و نشاں اُن کا دنیا میں نہیں ملتا
کیا زُعم تھا کثرت کا یا طنز 'اَرَاذِلُنَا'
یا 'اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِی مِلَّتِنَا' کیا تھا
کب حق سے نہ ٹکرائی رسم و رہِ آبائی
کب عاد و ثمود اُٹھے ہیں شہر کہاں اُن کے
کیوں بہرِ پذیرائی تقدیر سدوم آئی
کِس نے یہ کیا دعوٰے 'اَنَا رَبُّکُمُ الاَعلٰے'
مقتل میں مسیحا بھی کیوں لایا صلیب اپنی
کِس آگ کو حکم آیا 'بَرْداً وَّ سلماً' کا
ایمان رہا غالب یا شعب ابی طالب
دانش ورو داناؤ! کچھ غور تو فرماؤ؟
یہ دشتِ جنوں میرا کیوں تم نے اِسے گھیرا

کیوں دار و رَسَن لائے
کیوں خشت بدست آئے

(عبدالمنان ناہید)

## شکریہ احباب

اس کتاب کی تصنیف و ترتیب کے دوران بہت سے دوستوں نے میری معاونت اور رہنمائی فرمائی نیز بہت سے دوستوں نے اس کی طباعت کی طرف مسلسل توجہ دِلا دِلا کر مجھے مجبور کیا کہ اسے شائع کروں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے فضل سے اجر عظیم بخشے، آمین۔ ان سب دوستوں کا تذکرہ تو طویل ہے تاہم اس ضمن میں سب سے بنیادی محنت اور کاوش خاکسار کے اباجان محترم مولانا محمد اسمٰعیل منیر صاحب سابق مبلغ سلسلہ سیلون، تنزانیہ، ماریشس و سیرالیون نے کی، حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اباجان اصرار کے ساتھ توجہ نہ دلاتے اور اس پر بنیادی کام نہ کرواتے تو شاید یہ کتاب مرتب ہی نہ ہوتی۔

علاوہ ازیں محترم منیر الدین شمس صاحب ایڈیشنل وکیل التصنیف لندن نے حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی روشنی میں میری رہنمائی فرمائی، اسی طرح بزرگوارم محترم مجیب الرحمٰن صاحب ایڈووکیٹ، محترم ڈاکٹر ناصر پروازی صاحب کینیڈا، برادرم محترم منیر احمد منور صاحب مبلغ سلسلہ آسٹریا، محترم ملک محمود احمد صاحب سابق ممبر سی بی آر پاکستان حال لندن اور برادرم نوید حمید صاحب کا خصوصی طور پر شکرگزار ہے جنہوں نے مسودہ کو بڑی عرقریزی سے پڑھا، اصلاحات کیں اور بہت سے مفید مشورے دیئے، عزیزم طارق محمود صاحب نے کتابت، ڈیزائنگ اور سیٹنگ فنی مہارت کے ساتھ کرکے اسے قارئین کے لیے خوبصورت اور آسان بنایا ہے۔ فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء

# Hikayat e Daar o Rasn

It was the morning of 26th October 1984, when the Ahmadiyya mosque in Sahiwal, Pakistan was attacked by the malevolent Mullahs and their disciples. They attempted to erase the Kalima (The Islamic declaration of faith) that was inscribed on the facade of the mosque. Those invaders also endeavoured to remove the Quranic verses and the sayings of the Holy Prophet Muhammad (PBUH) from the mosque arches. This precarious situation compelled an Ahmadi to use his weapon. That resulted in instantaneous death of two attackers.For committing the "crime" of safeguarding the kalmia, eleven members of the Ahmadiyya Muslim community were charged and therefore blessed with the honour of being kept behind bars for ten years for Allah's sake. The recollections of the adversities faced by these "prisoners in the way of Allah" have been penned by Muhammad Ilyas Munir. At the time of the attack on the mosque, Mr. Munir was serving as an Ahmadi missionary there. As a result, he was also blessed with the honour of becoming a prisoner in the way of Allah.

ISBN # 978-3-00-046217-7